U 9147

جلد (۴)　　بابتہ دسمبر ۱۹۴۲ء　　شمارہ (۱)

طلبائے نظام کالج کا ششماہی رسالہ

پروفیسر آغا حیدر حسن (مدیر)

اسرائیل احمد مینائی (معتمد)

قاضی عبدالرشید (شریک معتمد)

اراکین

بادشاہ حسن صاحب (نمائندہ سابق طلبا)　　سید ناظم الدین صاحب (نمائندہ سابق طلبا)

محمد عبدالولی صاحب (سال چہارم)　　حامد علی صاحب (سال چہارم)　　سیف الدین عبدالحبیب صاحب (سال سوم)

قاضی محمد بشیر الدین صاحب (سال دوم)　　مس فرحت قطب الدین صاحبہ (سال دوم)　　غلام محمود صاحب (سال اول)

سالانہ چندہ تین روپیہ

مضامین

اور

چندہ ارسال کرنے کا پتہ

معتمد نظام ادب نظام کالج حیدر آباد دکن

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پڑھنے والوں سے

ہمارا سلام لیجئے۔ اور سال نو کی مبارکباد قبول کیجئے۔ جنگ و جدال کی حسین و خونخوار ساحرہ اپنی آہنی اور بلا کا آتشیں پلو ممالک عالم پر ڈالے کھڑی ہنس رہی ہے۔ عالم والے ہیں کہ دیوانے ہو رہے ہیں، آپس میں مصروف پیکار ہیں اور نظامِ زندگی سارا کا سارا درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس پر آشوب دور میں کوئی شمارہ نکل کر آپ کے ہاتھوں میں آجائے تو دیر سویر کا خیال نہ کیجئے، ادارہ کو کچھ نہ کہئے البتہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے ہم خود نہایت عاجزی کے ساتھ اس میں آپ کے ہم آواز ہیں۔

ہر پڑھنے والے سے ادارہ کو یہ کہنا ہے کہ مضامین جو آپ کی نذر کئے جا رہے ہیں، ان میں بعض بالکل نئے انداز کے ہیں۔ معتمد کے ذاتی کتب خانہ سے حاصل کئے ہوئے امیرؔ و داغؔ و شادؔ کے یہ قیمتی خطوط پہلی بار زیور طباعت سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ امیرؔ کی دونوں غیر مطبوعہ غزلیں اس رنگ کو چمکا کر پیش کر رہی ہیں جو ان کا اپنا اور اصلی رنگ تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ امیرؔ کی شاعری کے ایک نئے پہلو سے بھی اردو دنیا کو روشناس کرا رہی ہیں۔ موجودہ مشاہیر کے جو خطوط ہم پیش کر رہے ہیں، اس قسم کی کوئی چیز ہمارے علم کی حد تک کسی اور اردو رسالہ میں پیش نہیں کی گئی۔

کالج والوں سے کہنا ہے کہ اس بار کا شمارہ اپنی دیگر خصوصیات کے علاوہ ضخامت[۱] اور طلبا کے مضامین میں نمایاں اضافہ کے اعتبار سے بھی خاص امتیاز کا مالک ہے۔

ان تمام کوششوں سے ہمارا مدعا صرف یہی نہیں تھا کہ "نظامِ ادب" کا موجودہ معیار بلند ہو، اور پڑھنے والے لطف اٹھائیں بلکہ یہ بھی کہ آنے والے اس معیار کو گھٹنے نہ دیں، قائم رکھیں یا اس کو اور بڑھائیں۔ امید ہے کہ یہ مضامین ان لوگوں کی تفریح طبع کا بھی باعث ہونگے جو رسالوں میں عام دلچسپی ڈھونڈھتے ہیں، اور ان لوگوں کو بھی اپنی طرف خاص طور پر متوجہ کریں گے جو اردو زبان میں تنقیدی و تحقیقی عنصر کے متلاشی رہتے ہیں اور ہر نقاب رخ الٹ کر محبوبۂ ادب کا چہرہ صاف و برملا دیکھنا چاہتے ہیں۔ عجب نہیں جو اس شمارہ کے بعض مضامین آئندہ چل کر ادب کے تذکرہ نویس کے لئے ماخذ قرار پائیں۔

ادارہ کو جن اصحاب کا شکریہ ادا کرنا ہے ان میں سب سے پہلے حضرات اہل قلم ہیں اور ان میں بھی خاص طور پر وہ ادیب جنہوں نے وقت نکالا، زحمت فرمائی، اور ہمارے خطوں کا جواب دیا۔ بلا شک انہوں نے ہم پر بڑا کرم کیا۔

---

[۱] ضخامت ۹۰ صفحات سے بڑھا کر ایک سو پچاس صفحات کر دی گئی ہے۔

مشاہیر شعرا نے ہمیں جس انداز سے نوازا اور اپنا کلام عنایت فرمایا اُس کا قرار واقعی شکریہ ادا کرنے کے لئے ہمیں الفاظ نہیں ملتے۔

پرنسپل صاحب نے آئندہ سے "نظام ادب" کے لئے بھی چندہ دینا طلبا پر اسی طرح لازم کر دیا ہے' جس طرح انگریزی میگزین کے لئے عرصہ سے تھا' اس طرح گویا اس رسالہ کی بقا کا سامان ہو گیا اب سال میں "نظام ادب" کے دو شمارے نکلا کریں گے پرنسپل صاحب نے یہ مبارک قدم اٹھا کر نہ صرف اپنے عملی تجربہ و دانش مندی کا ثبوت دیا ہے' بلکہ نہایت موثر انداز میں بتلا دیا کہ خود انھیں اس رسالہ کی بقا' اور ترقی بے حد عزیز ہیں اور نخل ادب کی آبیاری میں وہ کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرنا چاہتے۔ باوجود اپنی گوناگون مصروفیات کے اردو اور انگریزی شماروں کو ہر ممکن طور پر کامیاب بنانے میں ان کا ذاتی انہماک و دلچسپی بالخصوص کالج والوں سے کوئی راز نہیں' اس لئے ہم اپنے صدر کلیہ کا بطور خاص شکریہ ادا کرتے ہیں' اور امید کرتے ہیں کہ کالج کی قدیم و جدید طلبا و طالبات میں اس کا گرم جوشانہ خیر مقدم کیا جائیگا۔

آپ شائد سمجھیں کہ ادارہ شکریہ ہی ادا کرنے پر تلا ہوا ہے' ایسا نہیں ہے اُسے شکایت بھی کرنی ہے' وہ بھی غیروں سے زیادہ اپنوں سے کرنی ہے پہلے اپنے محترم اساتذہ سے نہایت ادب سے اور ذمہ داری کے کامل احساس کے ساتھ عرض کرنا ہے کہ "نظام ادب" آپ سے اس سے کہیں زیادہ تعاون و امداد کا متمنی و مستحق تھا اور ہے جتنی آپنے اس بار فرمائی اپنی بہنوں کے ہم جتنے شکر گزار ہیں' بھائیوں کے اتنے ہی شاکی کیونکہ بہنوں نے رسالہ سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا' اور ہمیشہ سے زیادہ مضامین لکھے لیکن بھائیوں میں سے اکثر نے اول تو توجہ کم کی' پھر اس معیار تک پہنچنے کی پوری کوشش نہ فرمائی جس کی ان سے امید کی جاتی تھی' ہم نے اپنا سمجھ کر ان سے شکایت کی ہے اور اپنا ہی سمجھ کر انکو اس طرف بھی متوجہ کرتے ہیں کہ یہ رسالہ آپ ہی کا رسالہ ہے' اس لئے آپ کی خاص توجہ اور قلمی اعانت کا محتاج ہے تا کہ ہم عصروں میں معزز اور ہم چشموں میں سربلند رہے۔ ساتھ والوں میں نمائندگان سے معتمد کو شکایت ہے کہ انہوں نے رسالہ کی تہذیب و ترتیب وغیرہ میں کسی قسم کی اعانت نہیں فرمائی حالانکہ ان سے امید کامل تعاون و امداد کی تھی' اس کے بعد بھی اگر شکریہ کا موقع ہے تو معتمد ان کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہے۔ "گر قبول افتد زہے عز و شرف"، راقم الحروف اپنے محترم و شفیق استاد جناب پروفیسر آغا حیدر حسن مدیر "نظام ادب" اور پروفیسر احمد عبد اللہ صدیقی صدر بزم اتحاد اردو کی اس رسالہ اور شمارہ سے غیر معمولی دلچسپی اور علمی و عملی امداد بے حد کا شکر گزار ہے۔ بزم اتحاد اردو کے نائب صدر اور "نظام ادب" کے شریک معتمد بھی راقم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ آخر میں ادارہ کی جانب سے معتمد کالج کے بھائیوں اور بہنوں سے استدعا کرتا ہے کہ وہ آئندہ شمارے کے لئے (جو مارچ کے پہلے ہفتہ میں چھپکر شائع ہوگا) مضامین بر وقت روانہ فرمائیں اور ہمارے مشوروں کو ایک ہمدرد کا مشورہ تصور کرتے ہوئے آئندہ اشاعت کو یاد رکھیں' بھلا نہ دیں۔

خاکسار

اسرائیل احمد مینائی۔

معتمد

بارش اور شاعر (غیر مطبوعہ)

اقبالؒ (سے زباں پہ بار خدایا یہ کس کا ذکر آیا) کی روح پر برکتوں اور انوار کی بارش ہو۔ بال جبرئیل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز سے پہلے بھی سیدھے سادے آسان لفظوں میں ایسی پتے کی الہامی باتیں بتا گئے ہیں جن پر "تا دورِ شمس و قمر" فہم و ادراک سر دھنتے رہیں گے، بانگ درا کے دور میں فرمایا ہے۔ ؎

عجیب شے ہے صنمخانۂ امیرؔ اقبالؔ میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

اشارہ امیر مینائیؒ کے دیوان ثانی "صنم خانۂ عشق" کی طرف ہے، اقبالؔ اور امیرؔ دونوں اہل اللہ تھے "صنم خانے" میں اللہ جانے کیا کیا اور کہاں کہاں معارف الٰہی جھلک ایک نے پوشیدہ رکھی اور دوسرے نے پہچان لی، یہ راز سربستہ ہم عامیوں کے حدودِ خرد، سے ماورا ہے، لیکن امیرؔ مینائیؒ کے دونوں دیوان "مراۃ الغیب" اور "صنم خانہ عشق" ہم عامیوں ہی کے نقطۂ نظر سے امیرؔ مینائیؒ کی "خدا رسیدگی" کے اس نمونے سے تہی دامن رہے جو اقبالؒ کے الہامی کلام کی الہامیت کی روشن دلیل بننے کی صلاحیت اتم رکھتا ہے۔ بانگ درا ہی میں اقبالؒ نے کہا ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے،
پر نہیں، طاقت پرواز، مگر رکھتی ہے،

امیر مینائیؒ کی جو دو نظمیں "نذر ناظرین" کی جا رہی ہیں ان کے متعلق "شاعر فطرت" (اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) کی مندرجہ بالا بیت، شعر نہیں، الہام معلوم ہوتی ہے "عہد خلد آشیانی کے غالباً آخر میں اہل روہیلکھنڈ" قحط و امساک باراں کے سخت آزمایشی دور سے گزرے نہ پانی تھا، نہ دانہ، خلق خدا قیامت کی دعائیں مانگنے لگی، نماز استسقا کے سب مراحل رام پور کی پابند صوم وصلوٰۃ رعایا نے طے کر لیے، مگر دامن رحمت کو جنبش نہ ہوئی، نہ ابر رحمت کو ؎

کہیں جبرئیل اشارے کئے ہاں بسم اللہ سمت کاشی سے چلے جانب متھرا بادل

امیر کا خدا ترس اور گداز دل، اس قہر الٰہی پر تڑپ اٹھا۔ اسی کیفیت میں چند گھنٹوں کے اندر یہ "مسلسل غزل نما" نظمیں تیار کیں، اور چاندنی رات میں جب دنیا بقعۂ نور و انوار بنی ہوئی تھی، فطرت کے "نیلے سائبان" کے سائے میں اپنے مخلص قدیم "شیر زماں خاں مغفور" سے بہ لحنِ داودی، بارگاہ ایزدی میں پیش کرائیں۔ پھر کیا تھا۔

ذات باری تو ہمیشہ سے ہے رحمٰن و رحیم
اپنے بندوں پہ کیا کرتی ہے الطاف عمیم

گو گنہگار تھے لیکن تھے گنہگارِ قدیم
جوش پر آ ہی گیا قلزمِ اکرامِ کریم

بارش ہوئی، جل تھل بھر گیے، دنیا سیراب ہوئی اور امیر مینائی مرحوم کی ان نظموں کو 'بقائے دوام' کا خلعت مل گیا، خدا اُن کے مرقد پر رحمت کے پھول برسائے۔ فقط

اسرائیل احمد مینائی (نبیرۂ امیر مینائی)

یا خدا خلق کو جینے کا سہارا ہو جائے
ابرِ رحمت کو برسنے کا اشارا ہو جائے

بجلیاں چمکیں، فلک پر ہو گھٹاؤں کا ہجوم
بوند جو آئے وہ قسمت کا ستارا ہو جائے

جوش میں ابرِ کرم آئے تو جل تھل بھر جائیں
کب سے ناکام ہیں اب کام ہمارا ہو جائے

باغ شاداب ہوں کھیتی ہو ہری دل ہوں نہال
عیش و آرام سے خلقت کا گزارا ہو جائے

اس تباہی میں ہے تھوڑی سی عنایت ہی بہت
ڈوبتے کے لیے تنکے کا سہارا ہو جائے

التجا کرتے ہیں تجھ سے ترے عاجز بندے
رحم کو بندہ نوازی کا اشارا ہو جائے

ایک چھینٹا جو پڑے ابرِ کرم کا تیرے
درد و دکھ دور ہمارا ابھی سارا ہو جائے

یا نبیؐ تجھ پہ تصدق، ترا مداح امیر
اک نظرِ لطف کی امت پہ خدارا ہو جائے

امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ

اب تو برسا دے خدا ان کی دعا سے پانی
دیر سے مانگ رہے ہیں ترے پیاسے پانی

آب و تاب اپنا دکھا دیں ہمیں ساون بھادوں
موتی برساتا ہوا آئے گھٹا سے پانی

لے چل اب جلد مجھے ہند کے پیاسوں کی طرف
چپکے چپکے یہی کہتا ہے ہوا سے پانی

جوش پر آئے نہ دریائے کرم کیا ممکن
بندے رو رو کے اگر مانگیں خدا سے پانی

خشک سالی کا یہ عالم ہے کہ اطفالِ نبات
صبح کو مانگتے ہیں روز صبا سے پانی

گرمیاں شاہِ رحمت جو دکھا دے اپنی
آگ دوزخ کی بھی ہو جائے حیا سے پانی

لاکھ جانیں ہوں تری شان کرم کے صدقے
ایک چلو ہمیں دریائے عطا سے پانی

کتنے بندے ہیں ترے دھوپ میں جلتے بھنتے
اب برس جائے کسی کی تو دعا سے پانی

کربلا میں جو رہے پیاسے انھیں کا صدقہ
اب چھڑا دے ہمیں اس کرب و بلا سے پانی

شوق کی آگ سے جلتے ہوئے دل ہوں ٹھنڈے
آئے محبوب کے انداز و ادا سے پانی

سن لیا جب سے کہ پانی سے ہے ہر شے کی حیات
ناز کرتا ہے ہر اک شاہ و گدا سے پانی

ہم نے پانی سی جو نعمت کی نہ کی قدر امیرؔ
چھپ رہا ابر کے پردے میں حیا سے پانی

امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ

قطعہ

ارباب کمال چل بسے سب
سوئیں کہیں ایک دو رہے ہیں

محفل برخاست ہے پتنگے
رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں

ہے کوچ کا وقت آسماں پر
تارے کہیں نام کو رہے ہیں

ان کی بھی نمود ہے کوئی دم
یہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں

دنیا کا یہ حال اور ہم کو
کچھ دھیان نہیں ہے سو رہے ہیں

امیر مینائیؒ

مکاتیب رفتگاں

مشاہیر اردو کے تین مکاتیب ہدیۂ قارئین کئے جاتے ہیں، ان میں ایک خصوصیت مشترک ہے دو خطوط امیر مینائیؒ کے نام ہیں، تیسرا امیر مینائی کے نام سے ہے۔

شاد عظیم آبادی مرحوم کا مکتوب منظوم اکیس بیتوں پر مشتمل ہے، ان میں سے بخیال اختصار صرف بیالیس ابیات پیش ہیں، شاد مرحوم کے مرتبے اور عظمت سے قطع نظر بھی یہ مکتوب اس بناء پر خاص اہمیت رکھتا ہے کہ لیلائے شاعری کے "دل دادگان قدیم" کے آخری نمایندے نے اس مکتوب میں آج سے تقریباً نصف صدی پہلے "عروس شاعری" کی "آراستگی اور زیبائی" کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں اس وقت بھی کوئی اصلاح اور اضافہ ممکن نہیں۔ اور اسی "دلیل کمال" میں اس "قدیم شاعری" کے "آخری تاجدار" کی عظمت کا راز مضمر ہے:

نواب مرزا خاں داغ مرحوم، مدتوں اسی "بساط شاعری" کے حاشیہ نشین رہے جہاں امیر مینائیؒ کی حیثیت "فرزیں" سے کم نہ تھی، دونوں کی یگانگت اور اخلاص دیرینہ کو داغ کے دکن میں فائز المرام ہونے کے بعد امیر مینائی کی ضروریات امیر اللغات نے دھبہ لگا دیا، امیر مینائیؒ کے اتقا اور استغنا کو داغ کی "فصیح الملکیت" اور "ناظم الدولگی"، ٹھیس نہ لگا سکتی تھی، مگر "امیر اللغات" کی تکمیل، کا مسئلہ صرف امیر مینائی کا نہیں، ملک و قوم کا معاملہ ہونے سے "کائناتی مسئلہ" تھا، اور اس سے بے اعتنائی یا تغافل برتنا "مجرمانہ غفلت" کے مرادف، محض اسی لگن نے ضعیفی کے رنج و محن میں امیر مینائی کو "ترک وطن" اور "سفر دکن" پر آمادہ و مجبور کیا، اور فطری طور پر یہ عمل داغ کو بہت گراں گزرا، داغ کا یہ مکتوب امیر کے سفر سے دس سال پہلے کا ہے، مگر ہوا کا رخ پہچاننے میں اس سے بھی مدد ملتی ہے، یہ مسئلہ بہت تفصیل و شرح طلب ہے

لیکن یہاں وہ شرح اور وہ تفصیل بہت بے موقع ہوگی۔
امیر مینائیؒ "کا خط" دنیائے ادب" کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ اُن کا رنگ تحریر ثاقب" کے لایق ہاتھوں سے" مکاتیب امیرؒ کی کتابی صورت میں جلوہ گر ہو کر مدت ہوئی، اہل علم و اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے، یہ مکتوب بھی ان کے" امتیاز طرز" کا آئینہ دار ہے، جو میری دانست میں "مقولیت" غالب" کے بعد سب سے زیادہ دل نشین ہے غالب تو غالب ہی تھے، اُن سے کسی کا کیا مقابلہ، مگر امیر مینائیؒ کے قلم کی روانی اور شستہ بیانی بھی اس خط میں قسم کھانے کے قابل ہیں، ان کی پاکیزہ باطنی اور نیک نفسی کا بھی اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ خدا کرے یہ اندازہ ان اصحاب کے قلب سے "زنگ وساوس" کو دور کر دے، جو اصلاح دیوان مصحفی" اور" ناظم کی شاگردی مومن" کے مسائل میں امیرؒ پر افترا پردازی کی تہمت لگاتے ہیں فقط

اسرائیل احمد مینائی

بندہ نواز، سلام و نیاز۔ اس وقت نوازش نامہ آیا۔ ممنون فرمایا۔ اگرچہ جواب طلب نہیں مگر باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے اس لیے کچھ لکھنا ضرور ہے۔ میری افسردہ دلی کی نسبت جو آپ نے افسوس ظاہر کیا میں اُس کا شکر گزار ہوں اور اس پر افسوس بھی کرتا ہوں اس وجہ سے کہ آپ بڑھاپے میں بھی دنیا سے افسردہ دلی کو پسند نہیں کرتے حالانکہ یہ عمر اس قابل ہے کہ دنیا سے دل اُٹھ جائے اور آخرت کا خیال پیدا ہو۔ بغیر معرفت علیٰ وجہہ الکمال اور بغیر درستیٔ احوال وحسن اعمال محض رحمت پر بھروسہ کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی کسان جوتے بوئے کچھ نہیں اور اس کی رحمت پر بھروسہ کرکے سمجھ لے کہ وقت پر میں بھی کھیت کاٹ لوں گا اور جوتنے بونے والوں کی طرح متمتع ہوں گا۔ اگرچہ قدرت الٰہی میں ضرور یہ بات ہے کہ بے جوتے بوئے کھیت کو سرسبز کردے مگر اتنی عمر گزری کبھی دیکھا بھی ہے کہ ایسا ہوا ہو، اور جب نہیں دیکھا تو کیونکر اعتماد کیا جائے کہ اس دنیا میں جو مزرعہ آخرت ہے جوتے بوئے کچھ نہیں۔ اور محض رحمت الٰہی پر بھروسہ کرکے آخرت میں امیدوار متمتع رہے۔ توبہ و استغفار کر لینا بیشک گزشتہ معاصی کے بخشوانے کو میں بھی کافی سمجھتا ہوں مگر ہائی وہ توبہ اور وہ استغفار بھی تو ہو جس کی نسبت قرآن شریف میں اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ آیا ہے، کیا محبوب الٰہی ہو جانا اس توبہ سے ہو سکتا ہے جو دنیا داروں کے غافل دل کیا کرتے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔
سلوک میں کوئی کتاب اُٹھا کر دیکھو تو معلوم ہو کہ توبہ و استغفار کیسی کڑی منزل ہے، یہ نماز پڑھ لینا

بیشک افضل عبادت ہے اور سب جرائم صغیرہ اس سے معاف ہو جاتے ہیں مگر وہ نماز بھی جب نصیب ہو' غافل دل جو نماز پڑھا کرتے ہیں وہ نماز کی صورت ہے اور حقیقت نماز کی اس کے وراء ہے' یہاں صورت سے کیا کام نکل سکتا ہے' بھائی اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ نماز صوری چھوڑ دی جائے بلکہ آرزو یہ ہے کہ مجھ کو اور میرے سب عزیزوں دوستوں بلکہ جملہ مومنوں کو وہ نماز نصیب ہو جس کے لیے قرآن شریف میں آیا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ آخر میں عذر کرتا ہوں کہ ان مضامین کے لکھنے کو یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کیونکہ جو خود فضیحت ہوگا وہ کسی کو کیا نصیحت کرے گا' البتہ ایک عمر کا تم سے یارانہ ہے اس لیے جیسی اپنے لیے آرزو کرتا ہوں ویسی تمہارے لیئے بھی دعا مانگتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ تمھاری فارغ البالی کو اپنی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ کردے اور ارحم الرّاحمین بتصدق حضرت رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ و علیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین مجھ کو بھی بار قرض اور فکر معیشت متعلقین سے سبکسار کرکے اپنی طرف بلائے۔ میاں وسیم کی زار نالی نے دل وجگر کو پانی پانی کر رکھا ہے' منشی نثار حسین اپنی طرف روٹھے بیٹھے ہیں مگر کیا کروں کہ جب شعر کہا ہی نہ جائے تو کیا خاک کہوں۔

یار تمھاری تنہائی بیشک قابل افسوس ہے اور اس تنہائی کی حالت میں ایسے شعر کہنا جیسے تم کہتے ہو تمھارا ہی کام ہے' تنہائی مٹانے کی تدبیر اس سے بہتر نہیں کہ اچھی کتابوں سے صحبت رکھو' اگر تم متوجہ ہوگے تو ایسی کتابیں مختصر و مطول جن کا مطالعہ آسان ہو اور رفتہ رفتہ ایسا جی لگے کہ ان کے دیکھنے سے جی بھرے ہی نہیں میں بتلاوں گا بلکہ کسی مطبع سے منگوا کر دو ایک کتابیں بھیج بھی دوں گا بشرطیکہ مطالعہ میں رکھنے کا وعدہ بھی کرو' یار اگر پوری کتاب ایک دفعہ دیکھ جاؤ اور پھر جو کچھ مجھے لکھا ہے' لکھو' تو جانوں۔

آخر میں پھر تمھاری دردمند نوازی کا شکر گزار ہوں' بندہ پرور۔ یہاں تک لکھ کر آپ کے خط کو پھر دیکھا تو نصیب دشمناں آپ کی ناچاقیٔ طبیعت کی کیفیت پر نظر پڑی اگرچہ یہ مرضِ سوء ہضم کا آپ کا قدیمی رفیق ہے اور علت اس کی عمدہ کھانوں کی طرف مزید رغبت ہے مگر نصیب دشمناں جب عارض ہوتا ہے تو جی ڈرتا ہے ذرا اس مزدور یعنی غریب معدے سے اب بوجھ کم اٹھوایا کیجئے' اللہ تعالیٰ دیرگاہ آپ کا بال بیکا نہ کرے' میں تو آنکھ کھول کر جو دیکھتا ہوں تو یارانِ گزشتہ میں اب سوائے تمھارے کوئی نظر ہی نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ تمھاری عمر دراز کرے' امید ہے کہ اپنی صحت کاملہ سے جلد جلد مطمئن کرتے رہو اور مجھ کو اپنا دلی خیر خواہ سمجھ کر بھلا نہ دو' زیادہ کیا لکھوں فقط ۱۳ رجولائی ۱۸۹۳ء تمھارا منت پذیر

امیر فقیر

نظام ۱۰۳   ۹   دسمبر ۱۹۲۲ء

ریاست رامپور افغانان۔ ملک روہیلکھنڈ   از حیدر آباد ۔ محبوب گنج

جناب منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی ملاحظہ فرمائیں

راقم داغؔ دہلوی

حضرت سلامت ۔ آپ کا عنایت نامہ مدت کے بعد مدت سے آیا ہوا ہے ۔ جنرل مرحوم کا واقعہ واقعی حیرت افزا ہے۔ میرے روزوں کا حال شب بیدار، تہجد گزار۔ خدا شناس جانتے ہیں، آپ نے تو نہ کبھی پڑھی نہ تمنا کی، میں نے آسمان و زمین کے چودہ طبق ڈھونڈھے امیر اللغات کا کہیں پتا نہ لگا۔ اتنا سنا کہ مولوی سیف الحق صاحب ادیب نے ایک جلد منگوائی ہے میں نے مستعار طلب کی جواب ملا کہ مستعار گئی ہے ڈاکٹر مہدی حسن صاحب آلم نے گولکنڈے سے آپ کو لکھا کہ ویلوپے ایبل بھیجدو، اس کا جواب ابتک نہ ملا آج وہ شاکی تھے امیر اللغات کے عیب و صواب کو دیکھنا میرا فرض منصبی ہے شائد شاگردوں کو بھی اسکی خریداری کے واسطے لکھوں اسی شہر میں چند نسخے آتے تو چرچا ہوتا۔ آپ نے کتنے نسخے چھپوائے، کتنے بک گئے، کتنے باقی ہیں میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ آپ کو خدا نے توفیق نہ دی۔ برابر ہوئے کہیں نہ کہیں سے کوئی نسخہ دیکھنے کو آہی جائے گا۔ مگر اب میرے نام نہ بھیجنا ورنہ میں واپس کردوں گا۔

اعلیحضرت حضور پرنور کی نوکری بجا رہا ہوں۔ غزلیں اصلاح ہو رہی ہیں، فرمان سلطانی بوعدۂ پرورش بقلم خاص میرے نام صادر ہے۔ سنتا ہوں کہ حسب دستور جاگیر کی تجویز درپیش ہے اور یہی باعث تعویق کا ہے ۔ الطاف خسروانی تحریری و زبانی بہت کچھ امید دلا رہے ہیں۔ عمل خوانوں سے چارہ نہیں، حکم الہٰی کی دیر ہے ۔ مگر تم عمل پڑھنا چھوڑ دو تو اجرائی کار جلد ہو۔ آپ کے طرفدار ضیغم صاحب وغیرہ وغیرہ اہل لکھنؤ اپ کی تعریف میری ہجو چھاپ رہے ہیں۔ ایک گلدستہ جاری کیا ہے، یقین ہے کہ وہ آپکے ملاحظہ سے ضرور گزرا ہے ۔ بر سر فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد۔ دیواروں پر انگاروں پر ۔ اس زمین میں مجھ پر سخت فرمائش ہے۔ آتش کی غزل تو میں نے دیکھی کیا عجب ہے کہ اسیرؔ مرحوم کی بھی غزل ہو۔ آپ کی بھی غزل ہو سنتا ہوں کہ بہت اہل لکھنؤ کی غزلیں ہیں۔ دو چار کی نقل بھجوا دو تو مہربانی ہوگی۔ دو غزلیں ملفوف حاضر ہیں۔ برخوردار محمد احمد صاحب کو دے دینا زیادہ نیاز، بچوں کو دعا۔ نواب خلد آشیاں کا اردو کلام یعنے سب دیوان میں نے حضور میں نذر کردیئے۔ انتخاب یادگار بھی نذر ہو گیا مدعا یہ تھا کہ آپ کی فضیلت ظاہر ہو۔ یہ کتابیں مجھ کو منگانی ہیں۔ ان کی قیمت دریافت کر کے اطلاع دیجئے۔ لفظ چٹنی بمعنی ڈنڈیا و تنک مین دلی کی زبان ہے۔ آپ کو اس کی سند کہیں ملی یا نہیں؟ لفظ بیلوٹ جولے کرنہ دے اس معنی پر کہیں آپ کو ملا فقط آثم راقم

۱۶ر ذیقعدہ سنہ ۱۳۱۰ھ   دستخط نواب مرزا خاں داغؔ عفی عنہ   حیدر آباد دکن۔ محبوب گنج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

این قطعہ بطریق نیاز نامہ در ستمبر ۱۸۹۶ء خدمت اکمل الکملا افصح الفصحا مخدومی و محترمی۔
جناب منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی دام لطفہٗ العالی ـــ از قلم عجز شیم علی محمد شاد عظیم آبادی نگارش یافت۔

ملاذِ اہلِ کمال و مکرم و مخدوم　　امیرِ کشورِ معنی و اکملِ کملا۔
ادیب افصح و شیوا زبانِ سحر بیاں　　سخن خدائے سخن گستر و سخن پیرا۔
شفیق محترم دام لطفہٗ العالی　　پس از سلام و تحیت بالتماس دعا۔
کمینہ آپ کا خادم علی محمد شاد　　جواب نامۂ نامی میں یوں ہے نغمہ سرا۔
کہ خط کے ساتھ امیر اللغات بھی پہونچی　　زبان و دل سے بجا لا رہا ہوں شکر عطا
عجب نہیں جو مری آپ نے لکھی تعریف　　بُرا کسی کو نہیں کہتے اہلِ صدق و صفا
کہاں میں ہیچمداں آپ سا کہاں تحریر[1]　　کہ یہ ثنا بحقیقت خود آپ کی ہے ثنا
بہت ہیں نظم کے بارے میں مختلف رائیں　　کسی کا قول ہے کچھ اور کسی کا کچھ دعوا
مقدم اِس میں ہے خود شاعروں کی چھان بنان　　کہ شعر کس کو مناسب ہے کس کو نا زیبا
تو حق یہی ہے کہ شاعر ہو فطرتی شاعر　　بغیر کسب کے ہو جوش اُس کے دل میں بھرا
غرض سے پاک ہو یہ عشق فطرتی اُس کا　　کہے جو شعر تو سامع کی بھی نہو پروا
رموزِ علم سے بھی بے خبر نہو تا وسع　　فنونِ شعریہ حاوی ہو اُس کی طبعِ رسا
علاوہ علم کے ادراک میں بھی تیزی ہو　　رہیں بیاں کے نتائج پہ اُس کی آنکھیں وا
ہو اختلافِ مذاہب پہ بھی نظر اُس کی　　خصوص ہو فنِ تاریخ میں ید طولیٰ۔
خدا نے دیں جسے یہ نعمتیں ز راہِ کرم　　اگر وہ اِس میں ریاضت کرے تو ہو یکتا
کئی زبانوں سے مل کر بنی تو ہے اُردو　　زیادہ اُس میں فقط فارسی ہے یا بھاشا
زبانِ فارس کی تحصیل سب سے اَقدم ہے　　بغیر اس کے کوئی اُس کو لکھ نہیں سکتا
بہت ضرور ہے اُردو کو فارسی دانی　　نہ جانتا ہو جو بھاشا تو کچھ نہیں پروا
جُدا کرے بھی اگر کوئی فارسی سے اُسے　　یہ لا علاج تعلق مٹا نہیں سکتا
جہاں تلک ہے میری دستگاہ اس فن میں　　مجھے پسند ہے انداز اہل پورب کا
قلم سے لیتے ہیں اکثر وہ مو قلم کا کام　　اُتار لیتے ہیں گویا وہ ہو بہو نقشا

[1] یہ لفظ اصل نسخہ میں مٹ جانے سے صاف طور پر پڑھا نہ جا سکا۔

نمک کلام میں اتنا کہ اہلِ ذوق ہوں خوش — بلیغ اصل مضامین سلیس طرزِ ادا
بعینہٖ مگر ان کی ضرور کیا تقلید — کہ مقتضٰے بھی تو ہر ایک ملک کا ہے جدا
مذاقِ ملک کو سمجھے ضرورتیں دیکھے — کرے وہ امر جو ہو مقتضا زمانہ کا
محاوروں میں متانت ہو اور دل آویزی — مفیدِ خلق ہو مضموں و حاصلِ معنٰے
یہ حسن وعشق، مجازی نہ ہو حقیقی ہو — جسے عبادتِ روحی سمجھتے ہیں عرفا
بیان اصل حقیقت کرو مگر کیونکر — کہ ہو مجاز کا ہلکا سا بیچ میں پردا
علاوہ اس کے قصیدوں میں کیا ضرورت ہے — کہ ہر امیر کو کہہ دیں سکندر و دارا
بخیل وظالم و غدار کو بحکمِ طمع — بنائیں نظم میں ہم رشکِ حاتم و کسریٰ
کچھ ان سے بحث نہیں جو نہیں ہیں واقفِ بحث — کلام ہوتے ہیں جن کے ہمیشہ بے سروپا
غرض مری ہے اُن ایسوں سے جو ہیں فہمیدہ — سمجھ کے چلتے ہیں وادیٔ نظم کا رستا
میں برخلاف نہیں شاعری کے بلکہ اِسے — کئی فنون سے سمجھتا ہوں اشرف و اعلیٰ
تو شاعری نہیں اک قسم کی عبادت ہے — اسی کا نام ہے عرفاتِ مصعد اعلیٰ
ہیں کیوں نفاق میں بدنام ہند کے شاعر — نہ اتحاد نہ آپس میں اِن کے مہر و وفا
ہر اک بجا آ ہے کوس اَنَا وَلا غیری — ترانہ غیر کا دل کھول کر نہیں سنتا
اگر نتیجۂ علم وکمال ہے انصاف — تو خود پسندی وخود بینی وتعصب کیا؟
بعینہٖ ہے گویّوں کی تان کی تقلید — وہی ادا وہی ترکیب ہے وہی کینڈا
یہ اپنی رائے ہے اس شاعری کے بارے میں — اگرچہ من یکجا و شعورِ شعر کجا
میرے زمانہ میں اب آپ سا کہاں شاعر — کہ فن میں بھی ہو اُسے اس قدر یدِ طولیٰ
جواب خط میں یہی سوچ کر کیا اطناب — کہ اپنی رائے کا اظہار آپ سے اچھا
شمار میں شعرا کے میں آسکوں کیونکر — کہاں ہیں مجھ میں شروطِ نوشتہ بالا
معاف کیجیے خط میں جو ہوگئی تطویل — وقد ختمتُ کتابی بالتماسِ دعا

افکارِ عالیہ

زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے — یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے

وہ اُٹھے درد اُٹھا حشر اُٹھا — مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

زمانے پر ہنسے کوئی کہ روئے — جو ہونا ہے وہ ہوتا جا رہا ہے

لگی تھی ان کے قدموں سے قیامت — میں سمجھا ساتھ سایا جا رہا ہے

بہار آئی کہ دن ہولی کے آئے — گلوں میں رنگ کھیلا جا رہا ہے

ع رواں ہے عمر اور انسان غافل — مسافر ہے کہ سوتا جا رہا ہے

مرے داغِ جگر کو پھول کہکر — مجھے کانٹوں میں کھینچا جا رہا ہے

گئے وہ دن کہ کہلاتا تھا قاتل — مسیحا اب وہ سمجھا جا رہا ہے

بہارِ گل گئی ابتک رگوں میں — جنوں نشتر چبھوتا جا رہا ہے

جو کچھ اس کی نگاہیں کر رہی ہیں — وہ دل پر نقش ہوتا جا رہا ہے

سرِ میت یہ عبرت کا ہے نوحہ — محبت کا جنازا جا رہا ہے

جلیلؔ اب دل کو اپنا دل نہ سمجھو
کوئی کر کے اشارا جا رہا ہے

استاد السلطان
امام فن نواب فصاحت جنگ بہادر جلیلؔ جانشین حضرت امیرؔ مینائی

خطابہ

از

عالی جناب نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ آسمان جاہی

جامعہ عثمانیہ اپنے جن سپوتوں پر بجا طور سے فخر کرسکتی ہے ان میں عالی جناب نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ آسمانجاہی کی ذات غیر معمولی محاسن کی حامل ہے، سرآسمانجاہ کے مراتب و مناقب کے بارے میں اس موقع پر تفصیل کرنا بہت بے محل ہوگا، لیکن یہ صراحت کرنا ضروری ہے کہ نواب ظہیر یار جنگ بہادر ان ہی سرآسمان جاہ کے قابل ناز نبیرے ہیں۔ تعلیمی مسائل سے اُن کو ذاتی طور پر غیر معمولی دلچسپی ہے، "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کا اجلاس اس سال اُن ہی کی صدارت میں گلبرگہ شریف میں منعقد ہوا تھا، اور اب "کل ہند مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا سالانہ اجلاس علیگڑھ میں آیندہ ماہ نواب صاحب موصوف ہی کی صدارت میں منعقد ہونے والا ہے۔ ان کی سادہ معاشرت، اُن کا حسن اخلاق، اور اُن کی بلند کرداری ہمارے اُمراء اور فقراء دونوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ جامعاتی تعلیم ایسی ہستیوں کے کمالات پر صرف جلا کرتی ہے، اصل جوہر فی الحقیقت منجانب اللہ اُن کو ودیعت ہوتا ہے، نواب صاحب موصوف نے بمصداق "فسیروا فی الارض" دنیا کا سفر بھی کیا ہے۔ اس لیے ان کا یہ خطابہ ان کے مرتبے، ان کی تعلیم اور ان کے تجربوں کے پیش نظر، ناظرین اور بالخصوص ان ناظرین کے لیے خصوصی توجہ کا محتاج ہے جو طلب علم کی شاہراہ پر گام زن ہو چکے ہیں۔

اسرائیل احمد مینائی

میں پہلے یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ بزم اتحاد اردو کے ارکان نے جب مجھ سے خواہش کی کہ میں آج اُن کے سالانہ افتتاحی جلسہ میں شریک ہوں تو میں نے ان کی استدعا کو اور جو اعتبار مجھے اُنھوں نے دیا ہے اُس کو خوشی سے اس لیے قبول کیا کہ اس انجمن کا مقصد اولین جو اردو ادب کا ارتقا ہے اُس سے مجھے خاص دلچسپی ہے میں اس وقت زبان اردو کے اُن سیاسی پہلوؤں کو نظر انداز کرتا ہوں جو بدقسمتی سے بجائے ہم آہنگی کے تفرقہ اندازی کے لیے استعمال کیے جارہے ہیں۔ یہ بالکل مسلمہ ہے کہ ہندوستان کو اگر دنیا کے سامنے ایک متحدہ قوم کی شکل میں آنا ہے تو ہندوستان کو ایک مشترکہ زبان کی ضرورت ہے جو اس ملک کی قومی زبان کہلائی جاسکے۔ بلا خوف تردید میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان صرف اردو ہی ہوسکتی ہے مجھے اس کے لیے زیادہ منطق پیش کرنے کی

ضرورت نہیں ہے اس خصوص میں طویل مباحث ہو چکے ہیں یہ بالکل صاف بات ہے کہ اتحاد ملک کے لیے وہی زبان کار آمد ہو سکتی ہے جس کی ابتدا اور جس کا نشو و نما خود مختلف اقوام کے اتحاد سے ہوا ہو۔ اردو زبان جس طریقہ سے وجود میں آئی وہ ظاہر ہے اور یہی اس کی خصوصیت ہے کہ اس نے تمام ہندوستان میں Lingua Franca کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ اس زبان کی خدمت سے ملک میں اتفاق و اتحاد پھیلایا جا سکتا ہے اس لحاظ سے یہ خود ملک کی ایک طرح کی بڑی خدمت ہے۔

۲۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ نظام کالج میں جہاں تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہے ایک انجمن اردو لٹریچر کی ترقی کے لیئے قائم ہے ایک دیدہ زیب رسالہ ”جو نظام ادب“ سے موسوم ہے سال میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے۔ اس انجمن کا جو پروگرام میری نظر سے گزرا ہے اُس سے ظاہر ہے کہ اس انجمن کے مصروفیات گزشتہ سال نہایت مفید رہے ہیں۔ تقاریر اور مباحث کے علاوہ مشاعرے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ اور یہ سب کاروبار خود طلبا ہی انجام دیتے ہیں

۳۔ مولوی قادر حسین خاں صاحب پرنسپل نظام کالج کی توجہات قابل تبریک ہیں کہ کالج کی اہم مصروفیات کے باوجود جہاں طلبار کی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہو چکی ہے مختلف شعبہ جات کے طلبار کو انھوں نے موقع دیا ہے کہ اپنے اپنے شعبہ کے لحاظ سے وآزادی کے ساتھ انجمن قائم کر کے اپنے مشاغل میں اضافہ کریں۔ اس سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طلبار کو اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کی عادت ہوتی ہے اور اپنے اساتذہ کی قیادت وسیادت میں صحیح و غلط راستہ کا امتیاز اُن کو حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ آج کے فاضل مقرر نے اپنی عالمانہ اور بسیط تقریر سے میرے بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے۔
میں ان اثرات کو جو اس تقریر کی سماعت سے رونما ہوے ہیں زائل نہیں کرنا چاہتا۔ اس لحاظ سے کہ میں حیدرآباد ہی کے جامعہ کا طیلسان ہوں اور خود اسی کالج کی ایک شاخ مدرسہ عالیہ کا پرانا طالبعلم رہ چکا ہوں مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں ان طلبار سے جو یہاں موجود ہیں یہ خطاب کروں کہ دنیا کے اہم واقعات میں طلبار کا ہمیشہ نمایاں حصہ رہا ہے۔
وہ نوجواں طلبار جن کے ہاتھوں میں آج کتابوں کا بوجھ ہے کل وہی طلبار دنیا کے اس میدانِ عمل میں اپنے کندھوں پر بھاری بوجھ اپنی ذمہ واریوں کا لیے ہوئے ہوں گے۔ آیندہ ان کا بوجھ خاصتہً اس لیے بھی بھاری رہے گا کہ دنیا ایک عجیب ہنگامہ خیز دور سے اس وقت گزر رہی ہے۔
آنے والے واقعات کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ صحیح طریقۂ عمل یہ ہوگا کہ موجودہ حالات میں سیاسیات کی جو بوقلمون اور نیرنگ تبدیلیاں ہو رہی ہیں اُن کی شعبدہ بازی سے طلبار کو دور رہنا چاہیے۔ اور ان میں دخل دے کر اپنے قیمتی وقت کو ضائع نہ کرنا چاہیے۔
خاص کر نظام کالج کے ان روایات کو یاد رکھیئے کہ اس کے طویل زمانہ حیات میں کیسی کیسی اعلیٰ وارفع ہستیاں

اس کی پیداوار میں داخل ہیں۔

مثال کے طور پر مہاراجہ آنجہانی کشن پرشاد کی یاد ابھی ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔
آپ کو چاہیے کہ اُن قیمتی ہستیوں کے اسوہ کو اپنے پیش نظر رکھیں اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کو اپنا نصب العین بنائیں۔

خاتمہ پر میں بانیانِ انجمن کو اُن کی توجہات اور ان کی مساعی پر مبارکباد دیتا ہوں اور مجھے یہ توقعات ہیں کہ یہ سال اس انجمن کا کامیاب رہے گا اور جب آپ اختتام سال پر اپنے کاموں پر تبصرہ کریں گے تو آپ کے کاروبار آپ کے لیے موجب طمانیت ہوں گے۔

میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس کالج کے طلباء سے رابطہ و اتحاد قائم کرنے کا موقع دیا جس کا میں بھی ایک قدیم طالب علم ہوں۔

عجب نقشہ عالم ایجاد رکھا ہے
جو آنکھیں دیکھتی ہیں آئینہ دل کا دیکھا ہے
امیر

دل میں نئے طرز سے ہے یاد کسی کی
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی
داغ

رنگِ تغزل

ہر لحظہ وظیفہ ہے جان و دلِ آگہ کا
الحسن ہو الحق کا، والعشق ہو اللہ کا

ہم بادہ پرستی کے ہر حال میں ہیں قائل
وہ ابر کی ظلمت ہو یا نورِ شبِ مہ کا

کیوں کر نہ کہے دنیا مقبولِ خدا اس کو
مطبوعِ رعایا ہو فرمان اگر شہ کا

بے عشق رہی آخر محرومِ حق آگاہی
انجام نظر آیا یہ دانشِ گمرہ کا

پرسش کو وہ آئے ہیں یا سرزنشِ غم کو
کیا عقدہ کھلے حسرتؔ اس آمدِ ناگہ کا

امیر التغزلین

جناب مولانا حسرت موہانی

سلطان عبداللہ قطب شاہ سابع والئے گولکنڈہ کے گیت

(نشرشدہ لاسلکی حیدرآباد دکن)

سلطان عبداللہ قطب شاہ المتخلص بہ عبداللہ۔ سلطان محمد قطب شاہ المتخلص بہ سلطان ظل اللہ وظل الٰہی کی پیٹھ سے اور حیات بخشی بیگم کے پیٹ سے اٹھائیسویں شوال سنہ ۱۰۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ دادا کا نام شہزادہ محمد امین ہے جو ابراہیم قلی قطب شاہ چہارم کے فرزند تھے۔ عبداللہ قلی قطب شاہ کی دادی خانم آغا تھیں۔ پھپھی چاند سلطانہ المعروف بہ ملکہ جہاں زوجہ ابراہیم عادل شاہ ثانی والئے بیجاپور مصنف نورس نامہ۔ سلطان عبداللہ کے پھپا تھے۔ نانا محمد قلی قطب شاہ پنجم بانئے بھاگ نگر المعروف بہ حیدرآباد۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ دکنی اردو کا مشہور شاعر تھا۔ اس زمانے میں حیدرآباد اور بیجاپور۔ علم و فضل کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ گھر گھر علم و ہنر کا چرچہ تھا۔ ایسی علمی فضا میں سلطان عبداللہ قطب شاہ نے آنکھیں کھولیں۔ ابھی پورے بارہ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ ان کے شاہ باوا نے بدھ ۱۳ر جمادی الاول سنہ ۱۰۳۵ھ کو سفر آخرت کیا۔ چودھویں جمادی الاول سنہ ۱۰۳۵ھ میں تخت نشین ہوئے۔ اسی سال حیات نگر حیات بخشی بیگم المعروف بہ ماں صاحب نے بسایا۔ ۲۶ر رجب سنہ ۱۰۴۱ھ میں جب عبداللہ قلی قطب شاہ نے پہلی دفعہ داڑھی منڈوائی تو بخشی بیگم نے بڑی دھوم دھام سے بارہ دن حیات نگر میں جشن منایا اور اس خوشی میں دو لاکھ ہن خرچ کئے۔ انہی عبداللہ قطب شاہ کو مست ہاتھی لے بھاگا تھا اور ماں صاحب نے منت مانی تھی کہ صحیح سلامت واپس آئے تو سونے کا لنگر چڑھاؤں گی سرکاری اہتمام سے ابتک یہ لنگر نکلتا ہے۔ کیا خلوص کی منت اور عقیدت کی نیاز ہوگی کہ تین سو برس ہوگئے اور اب تک جاری ہے بروز اتوار تیسری محرم سنہ ۱۰۸۳ھ میں وفات پائی۔ اور قطب شاہی قبرستان میں اپنے بنائے ہوئے گنبد میں دفن ہوئے۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں گھر گھر ہن برستا تھا۔ دنیا کی دولت کھنچی چلی آتی تھی۔ عبداللہ قطب شاہ کی دو قلمی تصویریں میرے ذخیرے میں ہیں۔ ایک تصویر میں سفید کرسی پر جس کی پشت بنگڑی دار ہے۔ اور دونوں طرف کے ہتے سہ برگے کی ٹھیکول پر جمے ہیں۔ کرسی کے چار پائے بھی سہ برگے کے خمیدہ ہیں۔ سفید فرش پر نیلے آسمان کے نیچے کرسی دھری ہے۔

پیش منظر میں دو کو کنار کی کیاریوں کے بیچ میں مطبب حوض ہے۔ جس کے بیچوں بیچ فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ دو سیڑھیاں چڑھ کے چبوترا ہے۔ سیڑھیوں کے پاس کا کٹھرا سرخ الغی ہے جس کے کنگوروں میں اوپر سرخ انار بنے ہیں۔ پس منظر میں نیلا آسمان ہے اور سفید لوزاتی جالی کا کٹہرا ہے۔ اس کے پیچھے سفید سیوتی کے پھول لگے ہیں۔ اسی کا ایک سفید پھول ہاتھ میں عبداللہ قلی قطب شاہ لیے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ شنگرفی چست ازار ہے۔ پاؤں میں سفید کفش ہے۔ بن اڈی کی سفید جامہ ہے۔ چست آستین پہنچوں کے گٹے تک چنت۔ گھیر میں سنہری دھنک ٹکی کمر میں زرین پٹکا بندھا اور سنہری قبضے کا جمدھر لگا۔ اس پر سنہری زمین کی کمخواب گلاب کے بوٹے پڑے۔ اس کی نیمہ آستین ہے۔ کھلے گلے کی۔ جس کو فرجی کہتے تھے۔ اس کے گلے میں شتری رنگ کی سمور لگی ہے۔ سر پہ پنچی بینی کی فالسائی دستار ہے۔ گوش پیچے کی گوش پیچ پھولدار سنہری ہے۔ اور پورے کانوں پر سے گیا ہے کہ صرف لویں باہر نکلی رہ گئی ہیں۔ کلغی میں سیاہ پر ہیں۔ جن کے سروں پر موتی لگے ہیں۔ سر کے گرد سنہری ہالہ ہے۔ الٹا ہاتھ کرسی کے ہتے پر رکھا ہے اور سیدھے ہاتھ کی چٹکی میں سفید پھول ہے۔ رنگ صاف ہے۔ چہرہ بیضاوی ہے۔ بلند کشادہ پیشانی ہے۔ بڑی آنکھیں ہیں۔ اونچی ناک ہے۔ کھنچی ہوئی بھویں ہیں۔ لمبی قلمیں ہیں۔ آدھے آدھے رخسار اور ٹھوڑی بالکل منڈی ہوئی ہے۔ پتلی موچھیں گالوں کے پاس باچھوں کی سیدھ میں چوڑی ہو گئی ہیں۔ ٹھوڑی چوڑی ہے۔ لب گداز ہیں۔ گھٹنوں پر زرین چادر اپڑا ہے۔ انگلیوں میں انگوٹھیاں ہیں۔ ہاتھ گلے کا گہنا ندارد ہے اس تصویر میں کوئی تیس بتیس کی عمر معلوم ہوتی ہے۔ دوسری تصویر میں سلطان عبداللہ کرسی پر جلوہ افروز ہیں۔ اسی قسم کا لباس ہے۔ سیدھے ہاتھ میں گلاب کا پھول ہے۔ سامنے ایک عورت۔ پاؤں میں پازیب۔ روپہلی زمین پر گلاب کی بوٹیوں کا لہنگا۔ زرین کمر پٹکا پنچوں تک لٹکا۔ آدھے بازوں تک آستینوں کی سرخ دکنی محرم۔ باریک دوپٹہ جس کے چاروں طرف سنہری بیل ٹکی۔ ایک پلو لہنگے میں ارسا۔ دوسرا پلو۔ بغل کے نیچے سے نکال کر سینے پر سے کھولے پرے جا کر گاتی سی مار کر اوڑھا ہے۔ جس کا آنچل سر پر سے ڈھلکا ہوا ہے۔ عورت طرحدار بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ ماتھے پر ٹیکا۔ اور موتیوں کی مانگ سر پر چاند۔ کانوں میں جھمکے کرن پھول۔ موتیوں کے بھٹے اور سہارے۔ گلے میں کنٹھی۔ کنٹھے اور ست لڑا۔ ہاتھوں میں چوڑا۔ بازوؤں پر بازو بند اور نو رتن۔ دونوں ہاتھوں میں ایک سونے کی تھالی میں سیندوریا آم لیے۔ ادب سے جھکی بادشاہ کے سامنے کھڑی ہے۔ ٹھاٹ باٹ سے تو بھاگمتی معلوم ہوتی ہے۔ جو کہتے ہیں سلطان عبداللہ کی محبوبہ تھی۔

کرسی کے پیچھے دو عورتیں۔ کھڑی ہیں۔ جو پیش منظر میں ہے۔ اس کا لہنگا بیجنبی اور مخرم زرد ہے اور جو پس منظر میں ہے وہ سبز مخرم اور سرخ لہنگا پہنے ہے۔ دونوں کے ہاتھ میں سنہری مٹھوں کے سفید چنور ہیں۔ ایک ڈھلا رہی ہے۔ دوسری سنہری اگالدان لیے۔ چنور ڈھلکائے کھڑی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس بادشاہ کی ہزار سہیلیاں تھیں۔ یا سمجھ لو کہ ہزاروں پیش خدمتیں تھیں یہی سلطان عبداللہ کی سواری اٹھائے اٹھائے لیے پھرتیں۔ پیم متی اس کی محبوبہ تھی۔ جس کی تعریف میں ایک گیت ہے اسی پیما متی کی قبر پہ گل فردوس بود پیما متی سنہ۱۰۸۰ھ تاریخ ہے۔ یہ بادشاہ اردو میں صاحب دیوان ہے اس کا قلمی نسخہ میرے کتاب خانے میں ہے۔ مغلوں نے ان کی طاقت کو کمزور کر دیا ہے۔ اور عیش و عشرت نے غفلت کا پردہ بھی آنکھوں پر ڈال دیا تھا۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو خدا کی یاد آئی۔ اکثر غزلیں معرفت کے رنگ میں ہیں۔ حافظ کے کلام نے خوب اثر ڈالا ہے۔ پورانوں کی تلمیحیں اور اور ہندو مت کی تلمیحیں اکثر جگہ استعمال کی ہیں۔ اس کی غزلیں۔ صحیح معنوں میں غزلیں ہیں۔ اور تشبیہیں تو اس مزے سے استعمال کر جاتا ہے کہ مزا ہی آجاتا ہے۔ ایک قدیم بیاض نواب نصیرالدین خاں بہادر فرزند نواب رحیم یار جنگ مرحوم کی میرے پاس ہے۔ جو درویش محمد بندہ درگاہ کی ہے سنہ۱۰۹۵ھ کی مہر ہے۔ اس میں سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کی بنائی ہوئی راگنیاں ہیں۔ جن کو نقش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ہر نقش کا مقام راگ یا راگنی میں بتا دیا ہے۔ یعنی یہ گیت ہیں جو سلطان عبداللہ قطب شاہ نے بنائے ہیں۔ اور جن راگ راگنیوں میں گائے جانے چاہئیں وہ راگ راگنیاں لکھدی گئی ہیں۔ نقش از کیشر پناہ سلطان الشعرا، حضرت سلطان عبداللہ قطب شاہ خلد اللہ در مقام بھیرو

سکھی منج سوں کچھ بات کیتی	دو بات بھی نین منج سات کیتی
بین　توں ہے البیلی مدن کی ماتی	تجے یو بات کہاں یاد آتی
بین　نبی کے صدقے منجے یو ماتی	علی کی محبت کا پیالا پلاتی
بین　اس کی اثر منجکوں یوں آتی	ہرگز اتر کر نہیں جاتی
بھوگ　اسی تھے شاہ عبداللہ کے منکوں بھاتی	یک پل منجکوں بسری نہیں جاتی　تمت

بھاگڑا۔ کانڑا۔ رام کلی۔ کیدارا۔ رام گری۔ بھیری گوری۔ نٹ۔ کلیان۔ دھناسری۔ بھیری اساری۔ ملہار۔ بلاول۔ (نقش شکار بند)۔ سیندھرا۔ (نقش چوگاں بازی در مقام ملہار) مالی گورا ملتانی دھناسری۔ (ملہار۔ در زبان فارسی۔ کافی۔ اساوری۔) سری راگ۔ آہیری تلنگی۔ مداوتی گوری۔ بسنت۔ ماوری۔ سریراگ۔ تودی۔ سارنگ۔ کلیان۔ دھناسری۔ پربی۔ راگنیوں میں

ہیں۔ نقش یا گیت کے پہلے دو بول عقدہ کہلائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دوہوں سے ملتے ہوئے دو دو مصرع ہیں۔ ان کو بین کہا ہے۔ یہ بین ہر نقش میں ہیں۔ کسی میں دو ہیں۔ کسی میں تین۔ کسی میں چار۔ کسی میں پانچ۔ آخر کا بند بھی دو مصرع کا ہوتا ہے۔ اور دوہرے سے ملتا ہوا اس کو ابھوگ کہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے نقش میں۔ جیسے غزل میں مقطع۔ کیونکہ ہر ایک ابھوگ میں سلطان عبداللہ کا تخلص آتا ہے۔ کسی میں سلطان عبداللہ۔ کسی میں شاہ عبداللہ کسی میں عبداللہ شاہ۔ یہی عالم نورس نامہ میں ابراہیم عادل شاہ کے گیتوں کا ہے۔ ان میں بھی بین ہیں۔ اور آخر میں ابھوگ ہے۔ جس میں سلطان ابراہیم کا نام آتا ہے۔ جیسے درمقام بھیرول نورس گاؤ گیت کنچن گن کج پتی جم جم جیو آتش خاں سدا سین خاں گسائیں ایسورا۔ کاس کرت کنجر پر شبہ چرم دیا کر۔ (ابھوگ) دنیاں گھڑا بھرے چندنا ودو۔ اوپر نرمل سکا سو چاند سورست اہستے۔ بین۔ بارو ے ہو وا اہوت چتر شیا نا گیت نا دسنا جگ کیا دو انا۔ اب ویپک ہونا سورتج نانو آتش خانا۔ بین۔ دھنی دھرتری داماں وائم دھرے ہا تانت خوشیاں اول بجاوے بھوئیں پتر۔ مارے وانتا۔ باجے نصرت انیت ابکھانا۔ ابھوگ یسونڈا چائے نفیری بجائے جگ رجھاوے وید ابراہیم۔ انبرلوک اپ پرائے راکھیں میل یوگج نانو تج کیوں سانچے اسرافیل۔ دوہرا......اس میں بین ایسی ہے جیسے ہمارے زمانے میں انترہ۔ اور ابھوگ گویا اس زمانے کی استائی ہوئی۔ نورس نامہ میں اکثر جگہ بین کی بجائے انترہ بھی استعمال ہوا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے ایک راگنی خود ایجاد کی نورس اس کا نام رکھا اسی نورس میں نوروز بنایا ہے۔ درمقام نوروز نورس۔ سید محمد پتی میرا جیوں رتن میں اتم ہیرہ بین۔

محل محل صدر سنوارے — اس نونے بہشت اتارے
انند ہوتا ہے۔ سیدا بھارے — ارتی لیائے انبر بھر تارے
کدم کستوری۔ چوا چندن لائے — بالک کانسی ہر رنگ دس پڑائے
شمامے عنبر بتیاں پھرائے — شربت گھول امرت پلائے
بادل دمامے بجلیاں بجاوے — باجے جاو ثنائی کے پاوے
سہلا نورس کلیاں بدھاوے — ابراہیم گر گنی گاوے

یہ میرے کتب خانے کے نورس نامہ کا آخر گیت ہے۔ اس کے بعد خاتمہ کتاب ہے میں نے یہ گیت ابراہیم عادل شاہ ثانی کا اس لیے لکھدیا کہ پڑھنے والے نورس نامے کا اندازہ لگاسکیں

اور پھر سلطان عبداللہ قطب شاہ کے گیتوں کی زبان ملاحظہ کریں کہ کتنی صاف اور سلجھی ہوئی ہے۔ سلطان عبداللہ کے گیتوں کا اب تک کسی کو علم نہیں ہے ابراہیم عادل شاہ جگت گرو اپنے نورس نامہ کی وجہ سے شمال میں مشہور ہے۔ یہاں تک کہ جب واجد علی شاہ آخر والئے اودھ نے معزولی کے بعد کلکتہ کے مٹیا برج میں بیٹھ کر بنی کتاب لکھی اور اپنے مطبع سلطانی میں رئیس الدولہ کے اہتمام سے چھپوائی۔ لوگوں نے تاریخی تقریظیں لکھیں ان میں سے ایک قطعہ تاریخ بنی پر شیو پر دھان مہاراجہ جے گوپال سنگھ نے بھی کہا اور اس میں نورس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

فضل خالق سے یہاں تو تین نسخے ہو چکے ایک نورس پر فقط تھا دعوے شاہ دکن

غیب سے ثاقب پئے تاریخ آتی ہے صدا یہ بنی ایسی بنی جس پر ہیں مفتوں اہل فن

یہاں تین نسخوں سے مراد واجد علی شاہ کی وہ تین کتابیں ہیں۔ جو انھوں نے موسیقی پر لکھیں۔ ایک کا نام ناجو ہے۔ دوسری کا دلہن اور تیسری کا بنی ہے۔ یہ تینوں کتابیں چھپ چکی ہیں اور میرے مطالعہ میں رہی ہیں۔ بنی میں کا ایک گیت ملاحظہ ہو۔ آستائی۔

میری مہارانی رادھا رانی

انترہ کیا موسے کچھ چوک پڑی میری رانی۔ اکھتر کدر نہ جانی

واجد علی شاہ کا تخلص اختر اور ہندی میں اکھتر تھا۔

یوں تو اور بادشاہوں نے بھی گیت بنائے ہیں مثلاً سلطان حسین شرقی والیے جون پور۔ باز بہادر والیے مالوہ۔ علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی والیے بیجاپور۔ شہنشاہ اکبر سے بھی بعض گیت منسوب کیے جاتے ہیں۔ محمد شاہ کا بھی نام گیتوں کی دنیا میں روشن ہے۔ حضرت بہادر شاہ ثانی کے بھی گیت بڈھے بڈھوں کو یاد ہیں۔ ہمارے جہاں پناہ سلامت کی بھی ٹھمریاں۔ ہولیاں بسنت صاحب نظروں کی نگاہوں کے لیے کحل الجواہر ثابت ہوئے ہیں۔ اگر ان کن رس بادشاہوں کے گیت جمع کیے جائیں تو ایک عمدہ اور ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں تو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے گیت ناظرین کو سناتے ہیں۔ اب یہاں سے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے گیت ملاحظہ فرمائیے۔ در مقام کیدارا۔ عقد۔

پیاری مد بھر دینا مجکوں کھڑی کرتی ہوں منت تجکوں

بین۔ ہات میں تیرے جڑت صراحی پیالا پاج کا زنگا ری

مجکوں پلا توں آپنے ہاتوں — توج آپر میں واری
بین — مج سوں لاگی اور خماری — ہوں ری حسن کی میں پیاسی
اپنے نین میں بھرے بھرے لیئوں — تو موج کتی مد واسی
ابھوگ — کیا آج مو نجے مست دیوانی — سلطان عبد اللہ ساقی
اس ری کیا ہیں رگ رگ تو ہیں — ناؤں رھیا مج باقی ۔ تمت

در مقام رام گیری ۔ عقدہ

پرت کا مشکل نیاؤ ہے — پیاری تو نج نیباڑی
دھرتا ہے اسے عشق نے — بھوت دھات کو ہاری
بین — تج پکڑے جن جہان سٹ — اور برہ سوں لوجی
تن من جانے جو جن لو — سب تیری کر بوجے
اسے تو یاں کا نیاؤ نہوے — ملائے ہیں دو جے
بیں — بھیدن سارے پرت کے — سمجھے کے میں بھاتی
منتاں کریں بلاوں — تو اہیں بھی کیئں جاتی
نکو آؤ کی تو ناسن — ستم دھس دھس آتی
ابھوک — سلطان عبد اللہ سبحانی — کریں پرت آ کھاڑی
چھاتی سوں لا سیج میں — میرا نیاؤ نیباڑے
سنجیں تجیں پرت — بن کہے کوئی نین آڑے ۔ تمت

در مقام کیدارا ۔ عقد

شب برات تازی — تازہ عشرت لیائی
مشعل باؤتیاں گند نے — سب محلاں روشنائی
بین — لمکیاں رنگین باجیں — اور طبلاں نقارے
ریشمی صدر ان تے — بہشتاں کون بسارے
حوراں تھے فاضل — ہر یک ناری سنگارے
زمین آسمان لک — خوشبو کے مہکارے

بین　ٹپکتے میوے ہیں ہر ہر جنسی ایا را　　جنّت کے طبقاں میں بھرے لاک ہزارا
سرپوشاں مو‌را صا چپو گلشن بنگارا　　جھم جھم جیوائے شب رات کر نہارا
بین　چندر جوتاں بھریاں پانی جوت کا اچارے　　چو گرو تلے اچھلیں جوں نوری ہیلارے
گلزیاں جھیلے ملایک لیا اوتارے　　اے تماشا تج بن نین دیکھیا کوئی سارے
ابھوگ　سلطان عبداللہ اچھو تج تخت ارزانی　　تیرا راج قایم دائم تجے سلطانی
ہر نس ہر دن رہو تج گھر بھانی　　عیش عشرت کرو تم صاحب قرانی　تمت

در مقام کیدارا۔ عقدہ۔

اچھے گوری ہوئی متوالی　　زر زری چیر باندی ہے آلی
بین　تال گت سیتی ٹھمکتی آتی　　پایل گھنگرو گھل گھل بجاتی
گھولندی نینا نازوں گھلاتی　　ارت دکھلا شاہ کوں رجھاتی
بین　سیس پک لگ زر نیا سہاوے　　متوالی مت دیکھا سودا ہراوے
البیلی گت لے باہاں ڈلاوے　　نیالے (جھنڈو کھا) (تجھا) دل بھولاوے
ابھوگ　شاہ عبداللہ راجی کیتی منج ماتی　　ماتی سنبھال لاونا چھاتی
تیری پیالی کی مستی موں نجے ڈولاتی　　لٹ پٹ ہول رہیں ری ساتی　تمت

ملہار　تن دھرتی میں ندیاں خط کیاں بھایا
بین　بیر بہوٹیاں جیسیاں گوریاں پریاں ہیں　　کسوت ہری جیوں سروان کریاں ہیں
باغ جنت کیاں یا یو اچھریاں کھڑیاں ہیں
ابھوگ　سلطان عبداللہ ہرت کے بھوگی دھنی ہیں　　رنگ رس باس لینے سب کا فنی ہیں
پرس پرت لا سبکوں دیتے بنی ہیں　تمت

در مقام پھری گوری

توں بالی بن کا دھنی　　نت کروں میں تیری جینی
بین　توں اچھا بنا میں تیری بنی　　توں بھولا مج کیتا ری اپنی
لاؤں کلی کو ہنست کھنی
بین　راحت دینا موں نجے تیرا ہنسا　　تلتل پاؤں میں رنگ رسا
دیکھ تیرا مکھ یوسف سا تسا۔

ابھوگ　شریف شا عبداللہ میرا ہتا　پیاروں برلا منجے وصل دیتا
اب شا سوں مل رہونگی نتا　تمت

در مقام کانڑا

سکی جاناتوں بگیدی بلالال کوں لیایرے　یدی اتا کرآئے نمن یتا موبنح پرکیارے
بین　دیسے لاگے باٹ کوں　ہور اے جیو پی جپتیا
جوبن او بھی امنگ سوں　دیکھن دل ہے تپتا
منجے نہیں اتپتا
بین　باٹہاں بھرکیان میراں. بنا ہوسوں بھریا　نیالاں برجاں دوڑتے ابل شوق کے دریا
وعدہ اس کا موبخ کوں محیط ہیم میں دھریا
ابھوگ　سلطان عبداللہ ہے سدا نوشو بالا　نیکا اب دیدار دے کیا موبنح نیہا لا
کیوں نا کرسوں راج میں. سدا خوش حالا　تمت

در مقام کیدارا

انچل چھوڑو شا میری سیج بستیا　تیری لیوں گی بلستیا
بین　آؤں گی تیری سیج میں ہنستی　پائی ہوں تیرے من کا سمتیا
بین　پیارے دل کوں آنکھوں سوں منتر　اے چھند تجکوں کن رے سکیا
بھوگ　عبداللہ شا توں اوتار بھوگی　تج سار جگ میں کن رے رستیا

در مقام نٹ

سکی تیری نیناں کی نپٹ باٹ پارے　دل کی پینٹ آ میری مارے
بین　سپرلی اکیلی آپ موں پردے　کھینچی تھی سوکی سکٹاری
منتر پر پلکوں جیسے ساحر　شد کینا توتی لنگاڑی
بین　لال کرانکھیاں گھورن لاگی　بیڈر چوریاں کرن ہاری
مجھ ستٹ دشتی کا میرا ہوش لیتی　ایسا عاجز کیسے پکاری
ابھوگ　دا فریاد کوں کوئی نہیں انپڑے. عبداللہ شا بن پیاری
میرے شا بن جگ میں کوئی نا دیسے ہم دو کوں سنبھا لنہاری
تمت

درمقام کلیان۔

سو من آئی آئی ماتی مد پیالی سوں دیونا ساقی

بین لٹ چھٹی موں پر البیلی چال۔ نیاری چھندا پاتی

کوچ سکوچ سب ہیں چھوڑ آنکھ یں آنکھ جپاتی

بین صورت پسکا مور تھے آلا۔ پدمنی ذات سُجاتی۔

صراحی پیالی کے تکتی ساری۔ ماتی کو ں آج سہاتی

ابھوگ چنچل ویسی دیکھاوت چھب سوں گیت پر بند سناتی۔

عبداللہ شاہ کی عاشق ہو کر (دل کوں ہے لبھاتی؟)

پروفیسر آغا حیدر حسن استاد اردو نظام کالج

قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھلے

جواب قصر سلیماں غریب خانہ ہوا

لذت سیر و گردش چشم تماشا لے گئی

یک بار اور بھی دنیا ابھی بٹیا لے گئی

داغ

مرقعِ جذبات

مانا کہ ہم پہ جور و جفا، کیجئے گا آپ
لیکن ہمیں نہ ہو سکے تو کیا کیجئے گا آپ

ہر چند ضبط حد سے سوا کیجئے گا آپ
آنسو نہ تھم سکیں گے تو کیا کیجئے گا آپ

ہوتا ہے ایک دن جنھیں مشہورِ خاص و عام
کس دل سے وہ فسانے سنا کیجئے گا آپ

زلفِ رمیدہ بوجہ پریشاں نہ رہ سکی
روئے پریدہ رنگ کو کیا کیجئے گا آپ

آنکھوں کی نیند دل کی خلش کا نہیں علاج
بستر سے آہ کر کے اُٹھا کیجئے گا آپ

اکثر تو انتہائے تصور میں ناگہاں
آغوشِ شوق کھول دیا کیجئے گا آپ

چہروں پہ ہمسنوں کی تبسم تو کیا مگر
اک فرض ناگوار ادا کیجئے گا آپ

جب کچھ نہ بن پڑے گا مداوائے دردِ ہجر
رو رو کے مغفرت کی دعا، کیجئے گا آپ

رئیس المتغزلین حضرت جگر مراد آبادی مدظلہٗ

اقبال و فنون لطیفہ

نوٹ :- "ذیل میں علامہ اقبال مرحوم کے اس انگریزی لفظ کا ترجمہ درج کیا جا رہا ہے جو آپ نے مرقع چغتائی میں لکھا ہے۔"

جناب محمد عبدالرحمن صاحب چغتائی نے دیوان غالب کا ایک مصور مرقع (ایڈیشن) شائع کیا ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ہندوستان کی جدید مصوری اور طباعت میں یہ ایک نادر کارنامہ ہے بدقسمتی سے میں اس موقع پر فنی انتقاد کا اہل نہیں ہوں۔ ناظرین سے ڈاکٹر کزن کے گراں قدر دیباچہ کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہوں۔ انھوں نے ان اہم محرکات کا تجزیہ کیا ہے جو چغتائی صاحب کے فنی نصب العین کی تشکیل پر اثر انداز ہیں۔

مجھے جو کچھ کہنا ہے۔ اس کا حاصل بس اسی قدر ہے کہ میں سارے فنون لطیفہ کو زندگی اور خودی کے تابع سمجھتا ہوں۔ عرصہ ہوا میں نے اس باب میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار ۱۹۱۴ء میں اپنی مثنوی اسرار خودی میں کیا تھا۔ اس کے تقریباً بارہ سال بعد زبور عجم کی آخری نظم میں بھی اسی زاویۂ نگاہ کی ترجمانی کی ہے۔ میں نے اس نظم میں ایک ایسے صاحبِ فن کی معنوی تحریک کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے اندر محبت جلال اور جمال کی جامعیت کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ ؎

دلبری بے قاہری جادوگری است

دلبری با قاہری پیغمبری است

اس نقطۂ نظر سے جناب چغتائی کی بعض جدید تصویریں نمایاں امتیاز کی حامل ہیں کسی قوم کی معنوی صحت زیادہ تر اس روح کی نوعیت پر منحصر ہے جو اس کے اندر اس کے شعرا اور صاحبان فن پیدا کرتے ہیں لیکن اس روح کی نوعیت کا سوال محض ان کے شخصی ذوقِ انتخاب پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ ایک وہبی عطیہ ہے۔ جس کی نوعیت کا فیصلہ خود اس عطیہ کا حامل بھی حصول سے پہلے نہیں کر سکتا۔ یہ فیض فرد کو بے طلب حاصل ہوتا ہے تاکہ اسے وہ وقف عام کرے۔ اسی اعتبار سے اس معنوی روح کی حیات بخش قوت اور اس کی حامل شخصیت نوع انسانی کے لئے نہایت اہمیت رکھتے ہیں کسی اہل فن کا مائل بہ انحطاط ضمیر اور تصور ایک قوم کے لئے اٹیلا اور چنگیز کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ہو سکتا ہے

بشرطیکہ اس کی تصویریں یا اس کے نغمے جذب وکشش کی طاقت بھی رکھتے ہوں۔
جیسا کہ پیغمبر اسلام نے قبل از اسلام عہد کے عربی شاعر اعظم ..... امراء القیس کی بابت فرمایا۔ اشعر الشعراء و قائدھم الی النار۔
"وہ افضل ترین شعراء ہے اور دوزخ کی طرف لیجانے میں انکا امام ہے"۔
مشہود کو غیر مشہود کی تشکیل کی اجازت اور اس صورتِ حال کی طلب جس کو علمی اصطلاح میں فطرت کے ساتھ توافق (Adjustment with Nature) کہا جاتا ہے دراصل روح انسانی پر طبیعی ماحول کے تسلط و تسخیر کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ طاقت طبیعی ماحول کے مقابلہ سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ اس کے آگے سر تسلیم خم کرنے سے۔ "جو چاہیئے" (معیاری نصب العین) کی نمود کی خاطر "جو ہے" کا مقابلہ ہی صحت اور قوت کا سرچشمہ ہے۔ اس کے ماسوا انحطاط اور موت ہے۔ خدا اور انسان دونوں کا تسلسل حیات متواتر تخلیق سے وابستہ ہے ؎

حسن را از خود بروں جستن خطاست
آنچہ می بایست پیش ما کجاست

جو اہل ہنر نوع انسان کے لئے رحمت ثابت ہوتے ہیں ان کا ربط اپنے ماحول حیات کے ساتھ ع بازمانہ ستیز کا ہوتا ہے۔ ایسا بلند رتبت ہنر در صبغۃ اللہ (الٰہی رنگ) میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنی روح میں وہ زمان کی حقیقت اور ابدیت کو محسوس کرتا ہے۔ بقول فشٹے (Fichte) اسے فطرت نہایت عمیق، وسیع، اور کامل دکھائی دیتی ہے۔ برخلاف اس شخص کے جس کی نگاہ میں اشیاء نفس الامری سے ناتمام ضعیف تر اور ناقص تر دکھائی دیتی ہیں وہ حاضر فطرت (طبعی ماحول) ہی کو سرچشمہ فیضان قرار دیتا ہے لیکن یہ فطرت (Nature) تو صرف "ہے" سے زیادہ کچھ نہیں اور اس کا منصب "چاہیئے" کے لئے ہماری جستجو کا حجاب بنتا ہے۔ صاحب ہنر کو اس کا شعور اپنے ہی نفس کی گہرائیوں میں حاصل کرنا چاہئیے
جہاں تک اسلام کی تہذیبی تاریخ کا تعلق ہے میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ سوائے فن تعمیر کے استثناء کے اسلامی فنون لطیفہ، موسیقی، مصوری بلکہ کسی حد تک شاعری بھی ہنوز ظہور کے طالب ہیں۔ وہ فن، وہ ہنر جس کا مطمع نظر اخلاق الٰہی کو اپنے اندر جذب کرنا (تخلقوا باخلاق اللہ) ہے، دراصل انسان کے اندر ایک غیر محدود طلب (اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ) پیدا کرتا ہے اور انجام کار اسے اس زمین پر اللہ کی خلافت کا مستحق ٹھہراتا ہے ؎

مقام آدم خاکی نہاد دریابند
مسافران حرم را خدا دہد توفیق

اس امر کے آثار نمایاں ہیں کہ پنجاب کا یہ نوجوان اہلِ ہنر اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتا ہے۔ خیر سے ابھی تو وہ زندگی کی انتیسویں منزل طے کر رہا ہے مستقبل ہی اس کا جواب دیگا۔ کہ چالیس برس کی پختہ عمر میں اس کا کمال کیا رنگ اختیار کریگا! اور کس درجہ پر فائز ہوگا۔ اس عرصہ میں اُس کے ہنر سے دلچسپی رکھنے والے سارے اہلِ نظر اُس کی ترقی کے منازل پر اپنی نظریں جمائے رہیں گے۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۲ جون ۱۹۳۰ء

مترجمہ

پروفیسر غلام دستگیر رشید استاد فارسی نظام کالج

چمک ہے برق کی شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں

بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

امیر

کبھی ذرا پہ تبسم نہ کبھی نکل آئی دل کی آرزو بھی

غبار ذرا اس ملال میں ہے جو صبح ہو جائے جنگل ہو کر

داغ

شانِ علم

معنی و لفظ کے پیچوں میں اُلجھنے والو! تم نے سمجھا ہی نہیں علم کا منشا، و مقام
کششِ نقش و دوائر پہ تمھاری ہے نگاہ تم نے کاغذ کے تراشوں کو بنایا ہے امام
علم کو تم نے لکیروں میں کیا ہے محدود تم پرستار ہو اعداد کے نقطوں کے غلام
اصطلاحات کے جادو کا اثر ہے تم پر ایک ہی شئے کی بنائی ہیں بہت سی اقسام
تم نے الفاظ کو برتا ہے کھلونوں کی طرح تم نے تخئیل سے تعمیر کیے ہیں اصنام
ان پہ تم علم و بصیرت کا سمجھتے ہو مدار وہ مسائل جو بہت دن سے ہیں مشہور عوام

علم ہے منزلِ عرفاں و ہدایت کا چراغ علم ہے معرفتِ انفس و آفاق کا نام
علم سے تربیتِ فکر و نظر ہوتی ہے علم فطرت کی صدا، علم خودی کا پیغام
علم سے رمزِ حقایق کی گرہ کھلتی ہے علم کی زد میں لرزتے ہیں شکوک و اوہام
علم بے چین بھی کرتا ہے بہ عنوانِ عمل علم تسکین بھی دیتا ہے بہ شکلِ الہام
علم ہر غیب کے پردے کو بناتا ہے شہود علم مستقبل و ماضی میں ہے اک ربطِ تمام
علم ہے مرہم دل، علم ہے تسکینِ ضمیر علم سب کچھ ہے اگر اُس سے لیا جائے کام
علم سے رومیؒ و عطارؒ نے پایا تھا فروغ علم نے فکرِ غزالیؒ کو بنایا تھا امام
علم ہے فقر میں بھی رُتبۂ شاہی سے بلند اُس کی تقدیر! جسے علم کا حاصل ہو مقام
"ربِّ زِدنی" کی صدا علم کی آوازِ جرس علم کے رہبر و رہرو پہ ٹھہرنا ہے حرام
علم بے سوزِ یقیں کیا ہے حجابِ اکبر اس میں منطق ہو کہ سائنس ہو یا علم کلام

علم بے جذبِ خودی کچھ نہیں جز مکر و فریب
جس طرح جوہرِ شمشیر سے خالی ہو نیام

شاعرِ حیات

جناب مولانا منظور حسین ماہر القادری

مینا بازار

مرتبہ اسرائیل احمد مینائی

اقلیم حواسِ خمسہ کا شہنشاہ، ایک رات وزیرِ فہیم کے ہمراہ، فنون و ادب کے فرمان روا کا مہمان ہوا۔ اُس رات کو سلطان بڑی سج دھج سے، مصاحبانِ خاص ذہنِ نکتہ نواز کے حلقہ میں اپنے دار السلطنت کا مینا بازار دیکھنے اور دکھانے نکلے۔

چھ رُخی بازار تھا، ہر رُخ نادر و نایاب نمونوں سے آراستہ و پیراستہ، علم کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ مصوری، خطاطی اور مجسمہ سازی کے اسٹال، موسیقی کے ہال، نثر و شعر کے کتاب گھر اور فنِ تعمیر کے نگار خانے، ایک دوسرے کے مقابل بڑا لطف دے رہے تھے۔

شاہ نے مصوری کے اسٹال ملاحظہ کئے تو وزیر باتدبیر کی طرف دیکھا اور وزیر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ:۔

"پیر و مرشد، یہاں فن کاروں نے نقل کو اصل کا جامہ پہنایا ہے، تصور کو مصوّر کیا ہے، جذبات و خیالات کو شکل دینی چاہی ہے۔"

مجسمہ سازی کے اسٹال پر عرض کیا کہ:۔

"صناعوں نے اپنی دانست میں حقیقت کو مجسم کر دیا، زندگی کو جمادات کے سینہ پر تراش کر رکھ دیا، تخیل و تصور کے نقوش کو اک ذرا اُبھار کر پیش کیا ہے۔"

شہنشاہ و سلطان فنِ تعمیر کے نمونوں کی طرف آئے تو وزیر کو کہتے سُنا کہ:۔

"ذہنِ انسانی نے روحِ منزل کو اینٹ چونے اور گارے میں ڈھالا ہے۔"

موسیقی کے نگار خانے، طبلے کی تھاپ، پائل کی جھنکار، بنسری کے بین، ستار سارنگی کے نغموں اور گانے والوں کی تانوں سے گوگل بنے ہوئے تھے، وزیرِ فہیم نے عرض کیا کہ:۔

سرکار، یہاں کرشن کنہیوں اور تان سینوں نے سوز و گداز کو شیرینی و اثر کے ساتھ خمیر کر کے بڑے لطف سے آواز میں رچایا ہے

سلطان و شاہ اب نثر و شعر کے کتاب گھروں میں آئے اور میزبان نے مہمان کو چند شعر پڑھ کر سنائے

شہنشاہ نے بہت لطف اُٹھایا اور مڑ کر وزیر سے پوچھا کہ
"اے رہبرِ اقلیمِ دانش و ہنرمندی اس کو کیا کہو گے"؟
دانش ور وزیر نے ہاتھ جوڑے اور کہا مالک! روح کے سوز کو روپ دے دیا گیا ہے۔"
سلطان پھڑک گیا اور شہنشاہ بکمال محظوظ ہوئے۔
آگے بڑھے تو نثر کے نمونے ملاحظہ میں گذرنے لگے۔ معاشیات اور سیاسیات، تاریخ اور جغرافیہ، منطق اور فلسفہ، ادب اور انشاء، غرض ہر قسم کے علوم و فنون ایک ہی لباس میں پیش نظر تھے۔ کہیں خشک، سنجیدہ طرزِ بیان اور بے لاگ تنقید، کہیں تیز و تند جذباتی تبصرے، کہیں من گھڑت خوش پیرایہ، دلآویز افسانے، کہیں میٹھے بول، دل کش باتیں، کسی نمونے کا لب ولہجہ ایسا صاف و شیریں و خوش جیسے شیر و شہد، کسی میں ایسا لطیف طنز جیسے حنظل و شہد، کسی کا مزہ اتنا کڑوا جیسے حنظلِ خالص۔ کوئی کوئی فقرہ ایسا لطیف جیسے موجِ نسیم صبح کے دوش پر بوئے گلاب و یاسمن، کوئی کوئی ایسا چبھتا، چٹکیاں لیتا ہوا جیسے بیری و ببول کے کانٹوں کی چبھن۔ کوئی نثر ایسی جیسے نتھرا، ٹھنڈا، میٹھا پانی، طرزِ نگارش ایسا زیر و بم لیے ہوئے جیسے گہری گنگا کہیں آہستہ کہیں زور سے بہتی جائے یا پہاڑی چشمہ شور مچاتا بلندی سے وادی میں اُترے اور سبزہ پر نرم رو ہو جائے۔
—— شاہ کی آنکھیں بے اختیار وزیر کی طرف اُٹھیں، وزیر نے سر جھکا لیا۔ سلطان کے ایک مصاحب نے جرأت کی اور کہا کہ:-
"اے تاجدارِ گرامی پایہ! یہاں شاہدِ معنیٰ کو لباس فاخرہ پہنایا گیا ہے"
دوسرے نے کہا:-
"روحِ خیال نے قالب قوسِ قزح کا اختیار کر لیا ہے"
تیسرے نے کہا:-
"ہمہ رنگیِ مفہوم کی شراب، بیان کے جاموں میں بھری رکھی ہے"
شاہ نے پھر وزیر کی طرف دیکھا اور بڑی اُمید سے دیکھا، وہ جو دانش مندی میں یگانۂ روزگار تھا پھر بھی سر نہ اُٹھا سکا، زمین پر آنکھیں گاڑے پیشانی سے پسینہ پوچھتے ہوئے رُک رُک کر کہا
پیر و مرشد، کچھ عرض نہیں کر سکتا......
سلطان و شہنشاہ حیران حیران ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ اللہ الصمد! اللہ الصمد! ہمیں اشتیاق ہوا کہ نثر کے ان نادر و نایاب نمونوں کے چند تیار کرنے والوں سے کچھ باتیں

اُن کے ہنر اور اُن کے کمال سے متعلق پوچھئے اور جو کچھ معلوم ہو اُس سے صاحبانِ ذوق کو واقف کرائیے، چنانچہ ہم نے تین سوال کئے اور جواب بہت دلچسپ، معلومات آفریں اور کارآمد پائے، پڑھنے والوں کی نذر ہیں
تیرہ۱۳ اصحاب نے ہمیں جواب سے نوازا، ان میں سے کتنے ہی آسمانِ اُردو ادب کے مہر و ماہ ہیں، ہر ایک نے اپنے مخصوص انداز میں بعض اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے، پڑھنے والوں سے اُن کا تعارف کرانا چاند سورج کو روشناس غلط کرانا ہے۔ نام حسبِ ذیل ہیں:-
(۱) مولانا سیّد سلیمان ندوی (۲) مولانا عبد الماجد دریا آبادی (۳) خواجہ حسن نظامی (۴) سیّد مسعود الحسن رضوی ادیب لکھنوی (۵) آغا حیدر حسن دہلوی (۶) میاں بشیر احمد (۷) سیّد محی الدین قادری زور (۸) پروفیسر محمد مجیب (۹) خواجہ غلام السیدین (۱۰) ایم اسلم صاحب (۱۱) سعادت حسن صاحب منٹو (۱۲) ماہر القادری صاحب (۱۳) غلام دستگیر رشید صاحب۔
ان سب نے اپنی عزیز کتابیں مختلف نام کی اور مختلف تعداد میں گنائی ہیں۔ سب ملا کر ستّر ہوتی ہیں (۲۹) نظم کی (۴۱) نثر کی، نام بجنسہ درج ہیں:-

نثر (۱) تنقیدی و ادبی:- خطوط غالب۔ نیرنگِ خیال۲۔ ہماری شاعری۔ روحِ انیس۔ لیلےٰ کے خطوط۔ طلسمِ زندگی۶۔ مضامین فلک پیما۔ پس پردہ۔ مضامین چکبست۔ بہارستانِ سخن۔ اُردوئے معلیٰ۱۱۔ موازنہ انیس و دبیر۔ نظامی بنسری۱۳۔
(۲) علمی و تحقیقی:- شعر العجم۔ آبِ حیات۔ سخندانِ فارس۔ مقدمۂ شعر و شاعری۴۔ یادگارِ غالب۔ مضامین ابو الکلام۶۔ الجہاد فی الاسلام۔ پردہ۔ افلاطون کی جمہوریت۔ اقبال کا فلسفۂ تعلیم۔ افاداتِ مہدی۔
(۳) تاریخی:- دربارِ اکبری۔ دُنیا کی کہانی۔ قصص الہند۳۔ صراط الحمید۴۔ ارض القرآن۔ سیر گول کنڈہ۶۔ بیگماتِ کے آنسو۔ الفاروق۔ سفرنامہ حجاز۹۔
(۴) ناول و افسانے:- خارو گل۔ شمہ۲۔ پہچان۔ حسنِ معاشرت۔ دلّی کا سنبھالا۔
(۵) سیرت:- رحمۃ اللعالمین۔ سیرت النبیؐ۔
(۶) ترجمہ قرآن:- قرآن مجید کا ترتیبی ترجمہ۔

نظم:- (۱) مسدّس حالی۔ دیوانِ غالب۔ بانگِ درا۳۔ بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم۔ زہرِ عشق

ترانۂ شوق[7]۔ کلامِ اکبر الہ آبادی[8]۔ کلامِ نظیر اکبر آبادی[9]۔ مراثی انیس[10]۔ کلیاتِ میر[11]۔ دیوانِ آتش[12]۔ دیوانِ تعشق[13]۔ کلیاتِ اسمٰعیل[14]۔ دیوانِ حسرت موہانی[15]۔ صحیفۃ الملت از مولوی لکھنوی[16]۔ صبحِ وطن[17]۔ شعلۂ شبنم[18]۔ فکر و نشاط[19]۔ سحر البیان[20]۔ گلزار نسیم[21]۔ شہر لیلےٰ بول[22]۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ[23]۔ باقیاتِ فانی[24]۔ قصائدِ محسن کاکوری[25]۔ منتخب داغ[26]۔ پیامِ مشرق[27]۔ جاوید نامہ[28]۔ زبورِ عجم[29]۔

مندرجہ بالا اعداد سے اندازہ کیا جائے تو :۔

(۱) نثر کی کتابیں نظم کی کتابوں سے زیادہ پسند رہیں۔

(۲) نثر کی کتابوں میں تنقیدی و ادبی کتابیں سب سے زیادہ پسند رہیں۔ پھر علمی و تحقیقی کتابوں کی باری ہے۔ اور پھر تاریخی کی۔ افسانوں اور ناولوں کا نمبر ان سب کے بعد آتا ہے۔

(۳) تیرہ میں سے (۶) حضرات نے دیوان غالب کو پسند کیا (۵) نے آبِ حیات کو (۵) نے بالِ جبرئیل کو (۳) نے الفاروق کو (۳) نے مقدمۂ شعر و شاعری کو اور (۲) نے شبلی کی لکھی ہوئی سیرۃ النبیؐ کو۔

(۴) مصنف کے اعتبار سے (۸) حضرات نے اقبال کو پسند کیا، (۷) نے شبلی کو (۶) نے غالب کو اور (۵) نے آزاد کو۔

گویا کتابوں میں سب سے زیادہ مقبول کتاب دیوانِ غالب رہی اور پھر بالِ جبرئیل و آبِ حیات۔ مصنفین میں سب سے زیادہ نام اقبال کا گنا گیا، پھر شبلی۔ پھر غالب۔ اور پھر آزاد کا۔

اُمور بالا سے ایک حد تک اُس مخصوص طبقہ کے رُجحان کا اندازہ ہوتا ہے جسے ہم بلا تامل صاحبِ علم و صاحبِ نظر، صاحبِ الرائے و صاحبِ الرائے کہہ سکتے ہیں۔

عزیز ترین کتابوں کی کُل تعداد (۷) ہے اور وہ کتابیں یہ ہیں :۔

(۱) کلامِ غالب (۲) آبِ حیات (۳) بالِ جبرئیل (۴) الفاروق (۵) کلیات محمد قلی قطب شاہ (۶) لیلےٰ کے خطوط (۷) صراط الحمید۔

(۱۳) میں سے (۳) حضرات نے آبِ حیات کو سب سے زیادہ پسند کیا اور (۳) نے بالِ جبرئیل کو۔ (۲) نے الفاروق کو اور (۲) نے کلامِ غالب کو۔

اس اعتبار سے سب سے زیادہ عزیز کتاب نثر میں آبِ حیات رہی اور نظم میں بالِ جبرئیل ان کے بعد نثر میں الفاروق کا نمبر ہے اور نظم میں دیوانِ غالب کا۔

(۲) جواب دینے والے سب حضرات صاحب تصنیف ہیں۔ پوچھا گیا تھا کہ آپ کی عزیز ترین تصنیف کونسی ہے؟ نام جو لئے گئے وہ ذیل میں درج ہیں:-

(۱) سیرۃ النبیؐ جلد ۴۔ ۵۔ ۶۔ از سلیمان ندوی۔ (۲) سفر حجاز از عبدالماجد دریابادی
(۳) قرآن مجید کا ترتیلی ترجمہ از خواجہ حسن نظامی۔ (۴) ہماری شاعری از مسعود الحسن ادیب
(۵) پس پردہ از آغا حیدر حسن (۶) جھلکیاں از میاں بشیر احمد
(۷) سیر گولکنڈہ از محی الدین قادری زور (۸) اقبال کا فلسفۂ تعلیم از غلام السیدین
(۹) خار و گل از ایم اسلم۔ (۱۰) پہچان از سعادت حسن منٹو
(۱۱) تنقیدی و ادبی مضامین از ماہر القادری (۱۲) شمس معنوی از غلام دستگیر رشید

(۳) تیسرے سوال کے جواب میں ہر لکھنے والے نے مختلف نثار و نقاد حضرات کے نام گنائے ہیں جو سب ملا کر (۲۳) ہوتے ہیں:-

(۱) شبلی۔ (۲) ابوالکلام آزاد (۳) محمد علی جوہر مرحوم (۴) مولانا احمد سعید
(۵) مولانا آزاد سبحانی (۶) حبیب الرحمٰن خان شروانی (۷) مہدی افادی مرحوم
(۸) عبدالسلام ندوی (۹) عبدالماجد دریابادی (۱۰) رشید احمد صدیقی (۱۱) سلیمان ندوی (۱۲) فرحت اللہ بیگ (۱۳) امیر احمد علوی (۱۴) محمد حسین آزاد
(۱۵) حالی (۱۶) نذیر احمد (۱۷) سید احمد (مؤلف فرہنگ آصفیہ) (۱۸) منشی فیض الدین
(۱۹) فلک پیما (۲۰) سجاد حیدر (۲۱) نیاز فتحپوری (۲۲) قاضی عبدالغفار (۲۳) مسعود الحسن ادیب۔

ان میں سے (۹) حضرات آغوشِ رحمتِ پروردگار میں ہیں (خدا ہمیشہ اُن پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) اور (۱۴) حضرات بفضلہٗ بقید حیات ہیں۔ گویا زندہ نثار و نقاد گزرے ہوؤں کی نسبت زیادہ تعداد میں پسند کئے گئے۔

تیرہ میں سے (۸) حضرات نے شبلی نعمانی کا نام لیا ہے (۵) نے آزاد دہلوی کا (۲) نے ابوالکلام آزاد کا (۲) نے سلیمان ندوی کا (۲) نے عبدالماجد دریابادی کا (۲) نے نیاز فتحپوری کا اور (۲) نے فرحت اللہ بیگ کا۔

گویا شبلی کا نام سرفہرست رہا اور اُن کے بعد ہی آزاد کو جگہ ملی۔

ع۱ اس کتاب کو تصانیف کی فہرست میں جگہ دیتے ہوئے ہمارا قلم ذرا رکتا ہے، وہ بہرحال ترجمہ ہے اور خواجہ صاحب مترجم ہیں۔

ہم نے ان ادیبوں کے خطوط کو بجنسہٖ شائع کرنے کے علاوہ ہر سوال سے متعلق جوابات کو اپنے خصوصی تعارف و تبصرہ کے ساتھ ایک جگہ پیش کیا ہے تاکہ پڑھنے والا بیک نظر تمام آراء سے واقف ہو جائے اور تطابق و تقابل کے سلسلے میں نہ ورق گردانی کی ضرورت پیش آئے نہ انتشار خیال کا اندیشہ رہے۔

پہلا سوال یہ تھا ۱۔ اُردو زبان میں آپکی عزیز کتابیں کونسی ہیں؟ —— نظم کی ہوں یا نثر کی —— ایک جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے اُس کے وجوہ مختصراً کیا ہیں؟

جیسا کہ خیال تھا اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضراتِ اہلِ قلم کو بڑے حزم و احتیاط سے کام لینا پڑا ہے۔ گو سوال میں "پسند ہے" کا لفظ بتلاتا ہے کہ واسطہ حال سے رکھا گیا ہے، پھر بھی لکھنے والے کو ماضی کے معیار بھولتے نہیں اور مستقبل کا خیال دامن گیر رہتا ہے یعنی یہ حقیقت پیش نظر رہتی ہے کہ انفرادی پسند ناپسند رائے عامہ سے زیادہ اپنے جذبات و بصیرت پر منحصر ہے اور جذبات کا مزاج حد درجہ تغیر پسند و تغیر قبول ہوتا ہے اس لئے ہم اس رائے کو بے تامل قبول کرتے ہیں کہ :-

"کسی ایک کتاب کا نام بتانا جو عمر کے ہر دور میں عزیز ترین محبوب ترین وہی ہو ناممکن ہے حالات اور سن کے اقتضا سے مذاق علم و ادب بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے"۔ (عبدالماجد)

اکثر حضرات نے کتابوں کے نام گنائے ہیں لیکن مولانا دریابادی نے نیا ڈھنگ اختیار کیا ہے اور جواب میں اختصار نہیں، تفصیل کی ہے، کتابوں کے ناموں کے بجائے مصنفوں کے نام گنائے اور اُنکی تحریر کی طرف اشارہ کرکے بالواسطہ طور پر مختلف زمانوں میں اپنی پسند کے اسکول مقرر کئے گویا کتابوں کی گروہ بندی کر دی ہے۔ "سنجیدہ عنوان پر شریفوں کی طرح لکھنے والوں" کا معیار جدا بیان کیا ہے اور "خالص ادب و انشاء" کا معیار جدا قرار دیا ہے۔

کونسی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے؟ اور کیوں؟ کا جواب بیشتر حضرات نے نہایت سیدھے موثر اور دلچسپ پیرایہ میں دیا ہے۔

حسن نظامی صاحب کا کہنا ہے کہ

" مولانا آزاد دہلوی کی کتاب آبِ حیات اور دربار اکبری سب سے زیادہ پسند اس لئے ہیں کہ وہ بے اصل چیز کو حقیقی اور اصلی بنا دیتی ہیں"۔

پروفیسر ادیب نے اپنی پسند کا معیار مقرر کرتے ہوئے فرمایا کہ

"مجھے ادبی تحقیق و تنقید سے خاص دلچسپی ہے اور میں حسنِ انشا کا دلدادہ ہوں
اس لئے میری عزیز کتابیں انہی موضوعات سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ وہ کتابیں
میرے انتخاب میں نہ آسکیں گی جن کے اسلوب تحریر میں کوئی دل کشی نہیں ہے"

خواجہ حسن نظامی، آغا حیدر حسن، اور پروفیسر زور کی طرح، پروفیسر ادیب نے بھی آزاد کی تصنیف
آب حیات، کو اپنی سب سے زیادہ پسندیدہ کتاب تبلایا ہے اور اُسے "اُردو شاعری کی
تاریخ کا وہ نقش، قرار دیا ہے، جو بقول اُنہی کے، اوّلیں ہونے کے ساتھ ساتھ بعض حیثیتوں
سے بہترین بھی ہے، اور بقول پروفیسر آغا حیدر حسن کے

"کتاب کیا ہے ایک چہکتا ہوا بلبل ہزار داستان ہے"

کسی زمانہ میں لوگوں کے دل و دماغ پر اس کتاب اور اُس کے اسلوبِ تحریر کا جادو ایسا
چلا ہوا تھا کہ اُسے، اُس کے جائز مرتبہ سے بلند مقام دیا گیا اور تنقید کا خیال تک دلوں میں
نہ آیا، پھر ردِ عمل ہوا اور تنقید و تبصرہ کی رَو میں لوگ ایسے بہے کہ اُسے، اُس کے جائز مقام
سے نیچے جگہ دی گئی۔ پروفیسر ادیب کے خط کو بین السطور پڑھیے تو موصوف نے قبول کیا ہے
کہ خامیاں بہرحال اس کتاب میں بھی موجود ہیں، لیکن اپنے الفاظ کو، ایک خاص انداز سے
کہیں بند بند اور کہیں کھل کر، اُن لوگوں کے خلاف رجز بنایا ہے جو دوسرے اسکول سے
متعلق ہیں۔ عجب نہیں جو علمی حلقوں میں پروفیسر ادیب کے یہ دعاوی خاص دلچسپی پیدا کردیں گا۔

(۱) "اس کتاب نے ہماری تمدنی تاریخ کے بعض نہایت اہم پہلوؤں کو ابدی گمنامی سے بچا لیا"۔

(۲) "اُردو میں ادبی تحقیق کا شوق اور شعر و ادب کی تاریخ لکھنے کا خیال سب سے
پہلے "آب حیات" نے پیدا کیا"۔

(۳) "اُردو زبان کی تاریخ سب سے پہلے اسی کتاب نے پیش کی اور اسی نے ہم
کو لسانی تحقیق کا راستہ دکھایا"۔

(۴) "اُردو نثر جو استعارے اور مبالغے کی کثرت سے بوجھل ہو رہی تھی، اس میں سادگی
اور اصلیت کی خوبیاں پیدا کرنا بہت کچھ 'آب حیات' ہی کا کام ہے"۔

(۵) "اُردو نثر کی طرح اُردو شاعری بھی، اپنی اصلاح کے لئے آب حیات کی منت گزار
ہے۔ اُردو شاعری، خاص کر اُردو غزل کے نقائص کی طرف سب سے پہلے اسی کتاب
نے متوجہ کیا اور کچھ دنوں سے غزل گوئی کے خلاف جو آوازیں بلند کی جا رہی ہیں وہ

آب حیات ہی کے بعض بیانوں کی صدائے بازگشت ہیں۔"

(۶) آب حیات پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں، میں اُن سے واقف ہوں مگر اس واقفیت کے بعد بھی، ذمہ داری کے کامل احساس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ یہ کتاب غیر معمولی تحقیق و تدقیق اور نہایت وسیع و عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اُردو کی شاید ہی کوئی اور ادبی تصنیف ہو جو اس محنت اور اس تحقیق سے لکھی گئی ہو۔"

دوسری کتاب بالِ جبرئیل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر مسعود الحسن ادیب میاں بشیر احمد، پروفیسر مجیب اور ایم اسلم صاحب نے ایک آواز ہو کر اس کو پسند کیا ہے۔ اقبال کے اس دیوان میں جگہ جگہ اُن کی روح اور اُن کے دل کے سارے سوز، ان کی حکمت کی ساری گہرائی، اور اُن کے فکر و خیال کی بے پناہ وسعت و بلندی کا پتہ چلتا ہے ہے۔ اپنی پسند کی وجہ میاں بشیر احمد یہ بتلاتے ہیں کہ :۔

" اس میں حیات بخش اور روح پرور خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جن کی ہماری قوم کو سخت ضرورت ہے۔"

سیدین صاحب لکھتے ہیں :۔

" علاوہ اس کی فنی خوبیوں کے وہ اپنے جذبات و خیالات کے اعتبار سے زندگی کی لہر کو تیز اور انسان کو اُس کے بلند، بے اندازہ طور پر بلند مرتبہ سے روشناس کراتی ہے۔"

اسلم صاحب کا کہنا ہے کہ

" یہ، نوجوانوں کو زندگی عزت و وقار سے بسر کرنا سکھلاتی ہے۔"

ماجد صاحب، مجیب صاحب اور ادیب صاحب ایک بار اس کتاب کا نام لیتے ہیں اور خاموش ہو جاتے ہیں، گویا کہتے ہیں کہ زبان گنگ ہے تعریف کیا کیجئے۔

اُردو کے منظوم ادب میں پروفیسر ادیب نے مراثی انیس کو اس لئے پسند کیا ہے کہ

" اُردو شاعری کے ذخیرے میں اگر کوئی چیز ایسی ہے جو فارسی، انگریزی یا کسی دوسری زبان سے مستعار یا ماخوذ نہیں ہے تو وہ صرف مرثیے ہیں اور انیس ہی کے مرثیے ایسے ہیں جو دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں کے شاہکاروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور ساری دُنیا سے اُردو شاعری کی عظمت تسلیم کرا سکتے ہیں۔"

پروفیسر صاحب کا یہ دعویٰ اہل نظر و اہل الرآے کو خاص طور پر دعوتِ توجہ دے رہا ہے۔
اب تفصیل ملاحظہ ہو :۔

مولانا سید سلیمان ندوی :۔ "الفاروق جلد اول سیرۃ النبیؐ مولانا شبلی۔ آبِ حیات آزاد
مقدمۂ حالی، مسدس حالی، دیوانِ غالب، بانگِ درا اقبال"

مولانا عبدالماجد دریابادی :۔ "آپ کا پہلا سوال ذرا تفصیل چاہتا ہے — کسی ایک کتاب کا نام بتانا جو عمر کے ہر دور میں عزیز ترین، محبوب ترین رہی ہو، ناممکن ہے۔ حالات اور سن کے اقتضا سے مذاقِ علم و ادب بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ایک زمانہ میں مولانا شبلی کی نثر بہت ہی مرغوب تھی۔ اُس دور میں کوشش کر کرکے اُس کی نقل و تقلید کی۔ اب بھی انہیں کی نثر مبتدیوں کے حق میں بہترین سمجھتا ہوں، خصوصاً اُن کے لئے جو کسی سنجیدہ عنوان پر مضمون کی طرح لکھنا چاہتے ہوں۔

نذیر احمد دہلوی، راشد الخیری، شرر لکھنوی، اور مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ایک خاص امتیاز نظر میں رہا۔ خالص ادب و انشار کے معیار سے، رسوا لکھنوی، رتن ناتھ سرشار، ریاض خیرآبادی، امیر مینائی، اکبر الہ آبادی، عشرت لکھنوی، حسن نظامی دہلوی، کے رنگ کی وقعت دل میں رہی بعض سے بہت کچھ حاصل بھی کیا۔

اردو شاعری کی دُنیا میں تین شخص میرے لئے کافی ہیں، غالب، اکبر، اقبال۔ ان کے بعد کی فہرست خاصی طویل ہے۔ سب کے نام کہاں تک گن سکتا ہوں، چار نام محض نمونہ کے طور پر اور سُن لیجیے۔ فانی، جگر، حسرت، اصغر، متفرق طور پر اور بھی شاعروں کی بعض بعض چیزیں بہت پسند رہیں۔ مثلاً نواب مرزا شوق کی بدنام مثنوی، زہرِ عشق، احمد علی شوق کی مثنوی، ترانۂ شوق،

نثر میں غالب کی تحریروں پر اب بھی رشک آ جاتا ہے، نظم و نثر ملا کر بہ حیثیت مجموعی، ادبی حیثیت سے غالب سب پر غالب ہیں، اور معنوی حیثیت سے اقبال و اکبر"

(۳) خواجہ حسن نظامی :۔ "میں حضرت اکبر الہ آبادی، اور نظیر اکبرآبادی کا کلام سب شعرائے اُردو کے کلام سے زیادہ پسند کرتا ہوں کیونکہ اس میں دُنیا والوں کے دل کی حالت ہے۔ باقی شعرا اپنی حالت اس طرح لکھتے ہیں کہ ہم عوام سمجھ نہیں سکتے۔"[1]

---

[1] ضروری نہیں کہ ہم خواجہ صاحب کی رائے سے حرف بحرف اتفاق کریں، البتہ ہمیں یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کے الفاظ یارانِ نکتہ دان کو دعوتِ فکر و نظر دے رہے ہیں۔

نثر میں مجھے مولانا آزاد کی کتاب آبِ حیات اور دربارِ اکبری بہت پسند ہے کیونکہ وہ بے اصل چیز کو حقیقی اور اصلی بنا دیتے ہیں۔"

(۴) پروفیسر مسعود الحسن ادیب :- اُردو میں میری پسندیدہ کتابوں کی تعداد اچھی خاصی ہے مگر مجھے ادبی تحقیق و تنقید سے خاص دلچسپی ہے، اس لئے میری عزیز ترین کتابیں انہیں موضوعوں سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ اور میں حسنِ انشار کا دلدادہ ہوں اس لئے وہ کتابیں میرے انتخاب میں نہ آسکیں گی جن کے اسلوبِ تحریر میں کوئی دلکشی نہیں ہے۔ اس تمہید کے بعد میں اپنی عزیز کتابوں کے نام لکھتا ہوں۔

نثر - آبِ حیات، سخندانِ فارس، نیرنگِ خیال، موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم، شعر و شاعری، یادگارِ غالب، اُردوئے معلّیٰ۔ بہارستانِ سخن معروف بہ کاشف الحقائق - مضامینِ چکبست - افاداتِ مہدی،

نظم - مراثی انیس، کلیاتِ میر، دیوانِ غالب، دیوانِ آتش، دیوانِ مصحفی، کلیاتِ اسمٰعیل، کلیاتِ اکبر - دیوانِ حسرت موہانی، صحیفۃ الملت از مولانا صفی لکھنوی، بانگِ درا، بالِ جبریل، صبحِ وطن از چکبست لکھنوی، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، سحر البیان - گلزارِ نسیم، زہرِ عشق،

اُردو نثر کی کتابوں میں آبِ حیات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کے وجوہ حسبِ ذیل ہیں:-

آبِ حیات تذکرہ نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ شاعروں کے حالات کی تفصیل کے ساتھ اُن کے زمانے اور ماحول کی اُردو میں تصویر کشی کی ضرورت اصولی طور پر اسی کتاب نے محسوس کروائی اور عملی طور پر اس تصویرکشی کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جیسا اُردو کی کوئی دوسری کتاب اب تک پیش نہیں کر سکی۔

یہ کتاب اُردو شاعری کی تاریخ کا وہ نقش ہے جو اوّلیں ہونے کے ساتھ بعض حیثیتوں سے بہترین بھی ہے۔ اُردو کے بہت سے قدیم شاعروں کا نام اسی کتاب کی بدولت زندہ ہے ہمارے ممتاز شعرار کے متعلق جو روایتیں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں اُن کو محفوظ کر لینا ایک اہم ادبی خدمت تھی اور آبِ حیات نے اس ادبی خدمت کو اس خوبی سے انجام دیا ہے کہ کوئی دوسری کتاب اس خصوص میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

آبِ حیات ایک طرف اُردو شاعری کے ارتقار کی تاریخ پیش کرتی ہے تو دوسری طرف ہماری قدیم سوسائٹی کے ادبی رُخ کی ایسی روشن تصویر دکھاتی ہے جس کی نظیر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتی۔ اس کتاب نے ہماری تمدنی تاریخ کے بعض نہایت اہم پہلوؤں کو ابدی گمنامی سے

بچا لیا۔ اُردو ادب آبِ حیات کے اس عظیم احسان سے کبھی سبک دوش نہیں ہو سکتا۔

اُردو میں ادبی تحقیق کا شوق اور شعر و ادب کی تاریخ لکھنے کا خیال سب سے پہلے آبِ حیات نے پیدا کیا۔ اُس کے علاوہ اُردو زبان کی تاریخ سب سے پہلے اسی کتاب نے پیش کی اور اسی نے ہم کو لسانی تحقیق کا راستہ دکھایا۔ آبِ حیات کے بعد کئی کتابوں میں اس مضمون سے بحث کی گئی لیکن آبِ حیات کا طرزِ بحث اب بھی بعض حیثیتوں سے بے نظیر ہے۔

فارسی کی رنگین اور تخئیلی انشا کی تقلید سے اُردو کو جو نقصان پہنچ رہا تھا، اُس کی طرف آبِ حیات نے سب سے پہلے توجہ دلائی۔ اُردو نثر جو استعارے اور مبالغے کی کثرت سے بوجھل ہو رہی تھی، اس میں سادگی اور اصلیت کی خوبیاں پیدا کرنا بہت کچھ آبِ حیات ہی کا کام ہے۔ اس کتاب نے ایک طرف اُردو نثر کی اصلاح کی ضرورت سمجھائی اور دوسری طرف انشا پردازی کا ایک نیا اور بے نظیر اسلوب پیش کر دیا۔

اُردو نثر کی طرح اُردو شاعری بھی اپنی اصلاح کے لئے آبِ حیات کی منت گزار ہے۔ اُردو شاعری، خاص کر اُردو غزل کے نقائص کی طرف سب سے پہلے اسی کتاب نے متوجہ کیا۔ ادھر کچھ دنوں سے غزل گوئی کے خلاف جو آوازیں بلند کی جا رہی ہیں وہ آبِ حیات ہی کے بعض بیانوں کی صدائے بازگشت ہیں۔

آبِ حیات پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں میں اُن سے واقف ہوں مگر اس واقفیت کے بعد بھی ذمہ داری کے کامل احساس کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ کتاب غیر معمولی تحقیق و تدقیق اور نہایت وسیع و عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اُردو کی شائد ہی کوئی اور ادبی تصنیف ہو جو اس محنت اور اتنی تحقیق سے لکھی گئی ہو۔

اُردو کے منظوم ادب میں مجھے مراثی انیس سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ اُردو شاعری کے ذخیرے میں اگر کوئی چیز ایسی ہے جو فارسی، انگریزی یا کسی دوسری زبان سے مستعار یا ماخوذ نہیں ہے تو وہ صرف مرثیے ہیں اور انیس ہی کے مرثیے ایسے ہیں جو دُنیا کے بڑے سے بڑے شاہ کاروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور ساری دُنیا سے اُردو شاعری کی عظمت تسلیم کروا سکتے ہیں۔ انیس کے مرثیوں میں وہ وسعت و جامعیت ہے کہ معنوی حیثیت سے یا تاثرات کے اعتبار سے شاعری کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں اُن سب پر حاوی ہیں۔ انیس کے مرثیے قارئین کو ایسی فضا میں پہنچا دیتے ہیں جو تمام تر نیکی ہے اور نیکی کی طرف مائل کرنے والی۔ انیس کے مرثیے زندگی

تصویریں جو رفعت پیدا کر سکتے ہیں وہ کسی اور چیز سے ممکن نہیں"۔
(۵) آغا حیدر حسن دہلوی :- "مجھے مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "آب حیات" سب سے زیادہ پسند ہے۔ اُس کی فرو گذاشتوں پر سے لوگوں کی جا بے جا تحقیق و تفتیش قربان ہے۔ کتاب کیا ہے ایک چھلکتا ہوا بلبل ہزار داستان ہے"۔
(۶) میاں بشیر احمد :- "اُردو میں مجھے جو کتابیں عزیز ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں :-
الفاروق (مصنفۂ شبلی) نیرنگِ خیال (آزاد)۔ دیوانِ غالب۔ بانگِ درا، بالِ جبرئیل (اقبال) مضامینِ فلک پیما (میاں عبدالعزیز فلک پیما)۔ شعلہ و شبنم (جوش) سُریلے بول (عظمت اللہ خان۔ ان کتابوں میں آج کل مجھے بالِ جبرئیل سب سے زیادہ پسند ہے کیونکہ اُس میں حیات بخش اور روح پرور خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جن کی ہماری قوم کو اشد ضرورت ہے۔
(۷) جناب محی الدین قادری زورؔ :- "اُردو زبان کی کتابوں میں مجھے کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ سب سے زیادہ پسند ہے کیونکہ اس بادشاہ شاعر نے اپنے کلام میں زندگی کے ہر پہلو پر نہایت کمال اور لطافت کے ساتھ خیال آرائی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب برائے ادب کے ساتھ ساتھ۔ ادب برائے زندگی کا بھی قائل تھا"۔
"میری دوسری پسندیدہ کتابیں یادگارِ غالب از حالی اور روحِ انیس مرتبہ مسعود حسن رضوی ہیں"۔
(۸) خواجہ غلام السیدین :- "مجھے اقبال کی اُردو اور فارسی شاعری کے مجموعے سب سے زیادہ عزیز ہیں کیونکہ علاوہ ان کی فنی خوبیوں کے وہ اپنے جذبات اور خیالات کے اعتبار سے زندگی کی لہر کو تیز اور انسان کو اُس کے بلند، بے اندازہ طور پر بلند مرتبہ سے روشناس کرتے ہیں۔ شاید ان سب میں بالِ جبرئیل اور پیامِ مشرق سب سے افضل ہیں"۔
(۹) ایم اسلم :- "غالب۔ بالِ جبرئیل۔
غالب اس لئے کہ ایک انسان کے تخیل پرواز کا آئینہ دار ہے۔
بالِ جبرئیل اس لئے کہ یہ نوجوانوں کو زندگی عزت اور وقار سے بسر کرنے کا طریق سکھلاتی ہے"۔
(۱۰) سعادت حسن منٹو :- "اُردو زبان میں مجھے صرف ایک کتاب عزیز ہے اور وہ قاضی عبد الغفار

کی تصنیف "میلیلا کے خطوط" ہے۔ یہ کتاب مجھے اس لئے پسند ہے کہ یہ میرے محبوب موضوع پر نہایت ہی اثر انگیز انداز میں لکھی گئی ہے۔"

(۱۱) ماہر القادری :— "اردو کی مندرجہ ذیل کتابوں نے مجھے متاثر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہی کتابیں مجھے عزیز بھی ہونی چاہئیں :—

الف۔ (۱) سیرۃ النبیؐ (شبلی نعمانی) (۲) الفاروق (شبلی نعمانی) (۳) ارض القرآن (سلیمان ندوی) (۴) الجہاد فی الاسلام (ابوالاعلیٰ مودودی) (۵) مضامینِ ابوالکلام آزاد (۶) افلاطون کی جمہوریت (مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین) (۷) دیوانِ غالبؔ (۸) بالِ جبریل (۹) ضربِ کلیم (اقبال) (۱۰) باقیاتِ فانی۔ (۱۱) محسن کاکوری کے نعتیہ قصیدے اور مثنویاں۔"

ب۔ ان کتابوں میں جس کتاب کو میں نے بار بار پڑھا ہے اور مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی شاہ کار تصنیف الفاروق ہے۔

یہ کتاب مجھے کیوں پسند ہے؟ اس کے وجوہ بھی لگے ہاتھوں سُنتے جایئے۔

فنِ تاریخ کی کوئی کتاب اس وقت تک معیاری تصنیف نہیں سمجھی جاسکتی جب تک اس میں مندرجہ ذیل عناصر شریک نہ ہوں :—

(۱) ضروری، مفید مطلب اور موضوع کے مطابق مواد کی فراہمی۔

بہت سے مورخین ہر رطب و یابس کو کتاب میں شریک کر دیتے ہیں، فراہم شدہ مواد پر نقد و نظر کرنے کی یا تو اُن میں صلاحیت نہیں ہوتی یا پھر کتاب کا حجم بڑھانے کے شوق میں اس چیز کو وہ دانستہ نظر انداز کر دیتے ہیں، اہلِ عرب اس قسم کے مصنفین کو "حاطب اللیل" کہتے ہیں۔

(۲) مواد فراہم کرنے کے بعد اُس کو حُسن و سلیقہ کے ساتھ مرتب کرنا۔

جو مورّخ مواد کو سلیقہ کے ساتھ پھیلانا نہیں جانتا اُس کی کتاب کو کباڑی کی دوکان سمجھنا چاہئے جہاں کام کی چیزیں تو مل جاتی ہیں مگر وجدان و نظر پریشاں و مشوش ہو جاتے ہیں۔

(۳) زبان و بیان کی نفسیاتی و ادبی خوبیوں کا پایا جانا۔

شعر و ادب کی دنیا میں سارا کھیل الفاظ کا ہے، الفاظ اچھے اور دلکش نہ ہوں تو عمیق سے عمیق معنویت بھی بیکار ثابت ہوتی ہے۔

الفاروق میں یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ علامہ شبلیؔ مرحوم کی چشمِ جوہر شناس نے بہترین

مواد فراہم کیا ہے۔ اُردو، فارسی، انگریزی کیا عربی زبان میں بھی کوئی ایسی کتاب نہیں پائی جاتی جس میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات سے متعلق اس قدر مواد موجود ہو۔ مولانا ظفر علی خان، انگریزی میں الفاروق کا ترجمہ کرچکے ہیں اور اب سے ڈیڑھ دو سال پہلے رسالہ معارف میں یہ اطلاع میری نظر سے گذری تھی کہ فارسی اور ترکی زبان میں بھی "الفاروق" کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ اُردو زبان کی غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس کے ترجمہ کی طرف ترکی اور یورپ توجہ کی ہو۔ شبلی نعمانی کو مواد پھیلانے میں یدطولیٰ حاصل ہے اور اُردو ادب میں عنوانات کی تبویب Chapterization اور مضامین کی ترتیب کے تو وہ موجد ہیں۔ الفاروق میں خاص طور پر انہوں نے مضامین کے تنوع اور عنوانات کی ترتیب کا خیال رکھا ہے۔

تاریخ خشک مضمون ہے مگر شبلی ان سنگلاخ وادیوں میں بھی پھول برساتے ہیں۔ اُردو زبان میں اُن سے بہتر شگفتہ قلم مورخ اب تک پیدا نہیں ہو سکا۔ الفاروق میں زبان ادب کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں سنجیدگی اور شگفتگی کا اتنا اثر انگیز امتزاج کم از کم اُردو زبان کی تو کسی تاریخی کتاب میں نظر نہیں آتا۔"

(۱۲) دستگیر رشید :— "اُردو زبان میں میری چند عزیز کتابیں یہ ہیں :—

(۱) رحمۃ اللعالمین (از مولانا سلمان منصورپوری) (۲) خطبات مدراس (از مولانا سید سلیمان ندوی) (۳) النبی الخاتم (سید مناظر احسن صاحب گیلانی) (۴) آبِ حیات (۵) قصص ہند (۶) ہماری شاعری (۷) پردہ۔ (۸) مقدمہ شعر و شاعری (۹) شعر العجم (۱۰) حسنِ معاشرت (ڈپٹی بشیر احمد مرحوم) (۱۱) بانگِ درا (۱۲) ضربِ کلیم (۱۳) دِلّی کا سنبھالا۔ (۱۴) کلیات میر تقی میر (۱۵) صراط الحمید (از مولوی الیاس برنی صاحب ناظم دار الترجمہ) (۱۶) منتخب داغ (۱۷) دُنیا کی کہانی۔

یوں تو میں دردِ میر، فکر اقبال، زبان داغ اور انشائے آزاد کا گرفتار ہوں لیکن میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ سب سے زیادہ عزیز کتاب کون ہے؟ البتہ میری عزیز ترین کتابوں میں سے ایک کتاب صراط الحمید ہے۔ اصل میں یہ مخدومی مولٰنا الیاس برنی صاحب کا سفرنامہ حج ہے۔ یہ کتاب انتہائی لطیف وارداتِ قلبی کا ایک غیر معمولی مجلّی آئینہ ہے۔ نفسیات اور احساسات کی نزاکتوں، لطافتوں اور حکمتوں کی ایک ایسی تعبیر ہے جسے دیکھ کر حیرت اور مسرت کے جذبات ایک ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اُس کے اشارات حد درجہ بلیغ ہیں۔ کتابِ دل کی یہ

ایک نہایت فصیح تفسیر ہے۔ ایک صاحب نے اس کی بابتہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جو کچھ اس میں مندرج ہے اُس سے زیادہ اُس کے بین السطور میں ہے۔ اس باب میں' میں بھی اُن کا ہم خیال و ہم نوا ہوں۔ یہ مطلب نہیں کہ کتاب انسانی نقص کا شائبہ تک نہیں رکھتی ہے' مقصود یہ ہے کہ باوجود کمزوریوں کے فی الجملہ مجھے یہ کتاب حد درجہ پسند ہے۔ اُس کی خصوصیا۔ حق' حکمت' سوزِ دل اور سادگی و پُرکاری بیان"۔

(۱۳) پروفیسر مجیب :— "کتابوں کی جو تقسیم آپ نے کی ہے وہ صحیح نہیں۔ نثر کی کتابیں سب ایک قسم کی ہوتی ہیں نہ نظم کی۔ پھر کتاب کے عزیز ہونے کے کیا معنی؟ انجمن ترقی اُردو کی لغت ہر وقت میری میز پر رہتی ہے اور دن میں کئی کئی بار اس کے ورق اُلٹتا ہوں اور کام کے الفاظ اس میں ڈھونڈھ ڈھونڈ کر نکالتا ہوں۔ بالِ جبریل سال میں چند بار ہی پڑھنے کا موقعہ ملتا ہے لیکن اس سبب سے اُس کی قدر کچھ کم نہیں ہوتی۔ اب میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ ان دو کتابوں میں مجھے زیادہ عزیز کونسی ہے؟ یہ دونوں مختلف قسم کی کتابیں ہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں بتلا سکتا کہ مجھے بالِ جبریل زیادہ عزیز ہے یا مثنوی اسرار و رموز"۔*

دوسرا سوال یہ تھا ۵ اگر مصنف ہیں —— چاہے آپ کی تصنیف چھپ چکی ہو یا نہ چھپی ہو —— تو آپ کی مرغوب ترین تصنیف کونسی ہے؟ کیا آپ کوئی خاص وجہ ترجیح بتلا سکتے ہیں؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سیّد سلیمان ندوی سے جب یہ سوال کیا گیا تو فرطِ انکسار سے سیّد صاحب نے سر جھکا لیا کہ میں کیا اور میری تصانیف کیا؟ لیکن جب پوچھنے والا کہہ اُٹھا کہ' ہیں حضرت' آپ کی تصانیف کی تو اقطاعِ ہندوستان میں دھوم ہے' جواب میں بھلا سکوت کیونکر قبول ہو سکتا ہے؟ تو سر اُٹھایا پر منہ سے اب بھی کچھ نہ فرمایا' صرف اُنگلی سے الماری میں دھری ہوئی' قرآنِ کریم و حدیث شریف سے نیچے اپنی تصانیف میں سب کی سرآمد' تین سنہری جلدوں کی طرف اشارہ کر دیا جن کی پشت پر دیدہ زیب الفاظ میں

---

* پروفیسر مجیب نے ہمارے اس سوال کو پڑھ کر' جو اب جو زیادہ نہایت پرخلوص تنقید کی صورت میں ہے' ہم اُن کی اس تنقید کی قدر کرتے ہیں لیکن دیگر اہلِ قلم حضرات کا جواب نہ پانے پر ماتم' اور پروفیسر صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ وہ اس تنقید کے جواب میں' عبدالماجد صاحب دریابادی' خواجہ حسن نظامی' پروفیسر مسعود الحسن ادیب' آغا حیدر حسن اور خواجہ غلام السیدین وغیرہم کے خطوط ملاحظہ فرمائیں۔ بارے ہم خوش ہیں کہ پروفیسر صاحب کے پاس سے سوالات کا جواب نہ آیا نہ سہی' خط کا جواب تو آیا۔ اُن کی شکایت کس سے کیجے جنھوں نے نہ یوں جواب دیا۔ نہ ووں۔ ساتھ ہی ساتھ ہم نہایت ادب اور کمال متانت و سنجیدگی کے ساتھ پروفیسر صاحب سے یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر اُن کے مکان میں آگ لگ جاتی اور کوئی فرشتہ غیب سے آکر اُن سے یہ پوچھتا کہ' قرآن شریف و حدیث شریف وغیرہ متبرک کتابوں سے قطع نظر اور جائداد کے قبالوں کے پلندوں اور کسی محبوبہ کے خطوط کو چھوڑ کر' کسی کتاب کا نام لو جو تمہیں سب سے زیادہ پسند ہو تا میں اُسے نکال لاؤں' تو اُس وقت مجیب صاحب نادر قلمی نسخہ' "انجمن ترقی اُردو" کی لغت کا اُس سے منگواتے یا بالِ جبریل کا؟

لکھا تھا ۔ " سیرۃ النبیؐ جلد چہارم ، پنجم ، ششم "

اس اختصار و بلاغت پر قربان جائیے ۔ 'کیوں' کا جواب لاکھ لاکھ طلب کیا نہ ملا پر نہ ملا۔ مگر امید ہے کہ پڑھنے والے خود اس کا جواب دے لیں گے ۔

مولانائے دریا بادی کے انکار کو ہمارے اصرار اور رہٹ نے توڑا تو جواب ملا کہ :-

" آپ کو عزت بڑھانا ہی مقصود ہے تو عرض کرتا ہوں کہ اپنی مطبوعہ کتابوں میں سفرِ حجاز کو سب پر ترجیح دیتا ہوں "۔

کیوں کا جواب یہاں بھی خاموشی ہے ۔ البتہ مولانا حسن نظامی نے مختلف اعتبار و معیار سے مختلف کتابیں گنائیں ، ہر ایک کے متعلق خود ہی پوچھا کہ کیوں ؟ اور خود ہی جواب دیا کہ 'یوں' ۔ اُن کے خط کی یہ بڑی خصوصیت ہے چنانچہ ایک کتاب کو پسند کرنے کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ :-

" ہر چھوٹے بڑے ، کم علم اور عالم کو یکساں دلچسپ معلوم ہوتی ہے "۔

دوسری کے لئے کہا کہ :-

" ہنسنے والی قوم کے پاس رُونے والی کتاب کوئی نہ تھی ، اس لئے "۔

زورؔ صاحب نے کیا خوب وجہ ترجیح بتلائی ہے ۔ کہتے ہیں :-

" شاید اس لئے کہ اس میں افسانوں کے پیرایہ میں انسانوں کے ایسے کردار پیش کئے گئے ہیں جو ہر دور اور ہر ملک میں مہر و وفا اور خلوص و عطا کے نمونے ثابت ہو سکتے ہیں "۔

پروفیسر ادیبؔ کو اپنی تصنیف " ہماری شاعری " اس لئے سب سے زیادہ پسند ہے کہ اپنے ادبیات کے " ماضی کی تفسیر و تعبیر " ہے ۔

آغا حیدر حسن صاحب کا مجموعہ مضامین " پس پردہ " اُنھیں اس لئے سب سے زیادہ پسند ہے کہ " شاہی خاندان کی بیگمات کی بولی " میں یہ مضامین لکھے گئے اور اس میں " شہر آبادی کی زبان کتابت میں لا کر محفوظ کر لینے کی کوشش کی ہے "۔ جو لوگ آغا صاحب کی شوخیٔ طبع سے واقف ہیں وہ اس جملہ کا لطف اُٹھا سکیں گے کہ " اپنی کتاب ہے اس لئے پسند ہے "۔

سیّدینؔ صاحب کو اپنی ایک کتاب اس لئے " کسی قدر عزیز ہے " کہ اُسے " اقبال سے نسبت ہے "۔ اللہ اللہ ایسے عقیدتمند بھی موجود ہیں ۔

ایم اسلم صاحب نے اپنے افسانوں کا مجموعہ اس لئے پسند کیا کہ

اُردو ادب میں اس طرز کے افسانے ابھی تک لکھے نہیں گئے"

سعادت حسن صاحب منٹو کو اپنا افسانہ "پہچان" اس لئے بہت پسند ہے کہ حال ہی میں دو موقر پرچوں نے اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا ہے، کہتے ہیں کہ

"افسانوں کے مقابلہ میں میرے ڈرامے زیادہ مقبول ہوئے ہیں کیونکہ افسانوں جیسے معیاری نہیں" منٹو صاحب کے جواب کو شوخی و طنز نے مل کر خوب چٹپٹا کر دیا ہے۔

جواب دیتے ہوئے تنقیدی نکتے صرف دو حضرات نے نکالے ہیں چنانچہ ماجد صاحب دریابادی کہتے ہیں:۔

"سچی بات یہ ہے کہ اپنی ہر کتاب کچھ ہی روز بعد خود اپنی نظر میں نہایت درجہ تک حقیر و ناقص معلوم ہونے لگتی ہے[1]

زور صاحب فرماتے ہیں کہ:۔ "اس سوال کا جواب مشکل ہے والدین شائد ہی بتلا سکیں کہ اُنھیں اپنی کون سی اولاد زیادہ عزیز ہے"

اب تفصیل ملاحظہ ہو:۔

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی:۔ "سیرۃ النبی جلد ۴-۵-۶"

(۲) مولانا عبد الماجد دریابادی:۔ میری ناچیز خامہ فرسائیاں ہیں کس شمار و قطار میں، تاہم آپ کو عزت بڑھانا ہی مقصود ہے تو عرض کرتا ہوں کہ اپنی مطبوعہ کتابوں میں سفر حجاز کو سب پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور اگر "کتاب" کی قید نکال دی جائے، صرف "تحریر" کو رکھا جائے تو پھر اپنی صدق اور سچ (مرحوم) کی تحریروں کے لئے عرض کروں گا۔ اُن کے مقالات، شذرات، سچی باتوں، سب کے لئے۔

"سچی بات یہ ہے کہ اپنی ہر کتاب کچھ ہی روز بعد خود اپنی نظر میں نہایت درجہ تک حقیر و ناقص معلوم ہونے لگتی ہے"

(۳) خواجہ حسن نظامی:۔ "مجھے اپنی تصنیف "دو سو کتابوں" میں قرآن مجید کا ترجمہ سب سے زیادہ پسند اس لئے ہے کہ اُس سے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان قران کا مطلب سمجھ کر پڑھنے لگیں گے۔

اور روحانی ادب میں مجھے اپنی نئی تصنیف نظامی بنسری اس لئے بہت پسند ہے کہ وہ ہر چھوٹے بڑے، کم علم اور عالم کو یکساں دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور بعض لوگوں نے

---

[1] ممکن ہے بعض لوگ اس سے اتفاق نہ کریں۔

گن گن کر اُس کو اکیس اکیس بار پڑھا ہے اور لکھا ہے کہ ہر بار نئی کتاب معلوم ہوئی اور سیاسی ادب میں مجھے "بیگمات کے آنسو" کتاب اس لئے پسند ہے کہ اس میں ایک ایسے خاندان کی حکومت کے زوال کا ذکر ہے جس کا سچا حال بیان کرنا جرم سمجھا جاتا تھا، اور اس لئے بھی کہ ہنسنے والی قوم کے پاس رونے والی کتاب کوئی نہ تھی اور میں نے یہ کتاب لکھ کر یہ کسر پوری کر دی۔"

(۴) مسعود الحسن صاحب ادیب:- "حال کی ترجمانی اور مستقبل کی رہنمائی کی ضرورت تو مسلم ہے لیکن اپنے ماضی کی تفسیر و تعبیر کی اہمیت کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ادبیات کی حد تک اس کام کو انجام دینا اپنا خاص مقصد قرار دیا ہے۔ چونکہ میرے ادبی کاموں میں ہماری شاعری اس مقصد کو سب سے زیادہ پورا کرتی ہے اس لئے مجھے اپنی یہ تصنیف سب سے زیادہ پسند ہے۔"

(۵) آغا سید حیدر حسن دہلوی:- "میرے مضمونوں کا مجموعہ پس پردہ کے نام سے چھپا ہے اس میں مختلف عنوان ہیں۔ اکثر میرے لکھے ہوئے نہیں، مضمون میں نے لکھا، نام دوسروں نے رکھا۔ اس میں شہری آبادی کی زبان کتابت میں لا کر محفوظ کر لینے کی کوشش کی ہے شاہی خاندان کی بیگمات کی جو بولی تھی اس میں یہ مضمون لکھے گئے ہیں۔ اپنی کتاب ہے اس لئے پسند ہے۔"

(۶) میاں بشیر احمد:- میرے اکثر مضامین اپنے رسالہ "ہمایوں" میں چھپے ہیں۔ ان میں سے صرف تخیل کے مضامین کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب کا نام "طلسم زندگی" ہے۔ اس کتاب کے جس حصے پر "جھلکیاں" کا عنوان ہے وہ مجھے سب سے زیادہ مرغوب ہے۔

(۷) محی الدین قادری صاحب زورؔ:- اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ والدین شاذ ہی بتلا سکیں کہ ان کو اپنی کون سی اولاد زیادہ عزیز ہے۔ تاہم میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری ایک چھوٹی کتاب سیر گولکنڈہ مجھے بہت مرغوب ہے شاید اس لئے کہ اس میں افسانوں کے پیرائے میں انسانوں کے ایسے کردار پیش کئے گئے ہیں جو ہر دور اور ہر ملک میں مہر و وفا اور خلوص و عطا کے نمونے ثابت ہو سکتے ہیں۔ دکن کی بین قومی تہذیب اور مشترکہ کلچر کا ایسا بہتر مرقع شاذ ہی تیار ہو سکے۔"

(۸) خواجہ غلام السیدین:۔ میری تصانیف ناقابل ذکر ہیں۔ زیادہ تر تعلیم اُن کا موضوع ہے۔ ایک کتاب اقبال کے فلسفۂ تعلیم پر انگریزی زبان میں لکھی ہے جو اقبال کی نسبت کی وجہ سے کسی قدر عزیز ہے۔"

(۹) ایم اسلم صاحب:۔"جی ہاں اگر مصنف اسی چیز کا نام ہے کہ اُس کے نام سے کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہوں تو یہ فخر اس ناچیز کو بھی حاصل ہے کم و بیش ایک صد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

مجھے اپنی تصانیف میں سے "خار و گل" اور "شمسہ" سب سے زیادہ پسند ہیں۔

"خار و گل" میرے چند افسانوں کا مجموعہ ہے، میرا خیال ہے کہ اُردو ادب میں اس طرز کے افسانے ابھی تک نہیں لکھے گئے ہیں نے اس کتاب میں تقدیر اور تدبیر کے مسئلہ پر بقدر ہمت کچھ اظہار خیال کیا ہے۔ ہر ایک افسانہ ایک سوال سے شروع ہوتا ہے اور ختم بھی اسی بحث پر ہوتا ہے۔ ہر دلیل کے جواب میں ایک افسانہ ہے۔ فیصلہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیا ہے۔

"شمسہ" ساقی بک ڈپو سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ کتابت ہو رہی ہے۔ یہ ایک لڑکی کی سرگزشت ہے جو تہذیب نو کی دل دادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ

"جو سو رہے ہیں اُن کو رونا مرا جگائے"

(۱۰) سعادت حسن صاحب منٹو:۔"میں مصنف ہوں ــــ میں نے اب تک ساٹھ کے قریب مختصر افسانے اور سو کے قریب ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں ــــ افسانوں کے مقابلہ میں میرے ڈرامے زیادہ مقبول ہوئے ہیں چونکہ وہ افسانوں جیسے معیاری نہیں۔ میرے افسانے سب کے سب چھپ چکے ہیں سوائے ایک کے، جسے حال ہی میں ہندوستان کے دو موقر پرچوں نے شائع کرنے سے انکار کر دیا ہے ــــ یہ غیر مطبوعہ افسانہ مجھے بہت پسند ہے شائد اس لئے کہ یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ــــ اس افسانے کا نام "پہچان" ہے۔"

(۱۱) مولانا ماہر القادری:۔"میں پہلے شاعر ہوں اور اُس کے بعد مضمون نگار اس لئے فطری طور پر مجھے اپنی غزلوں اور نظموں کی کتاب عزیز ہونی چاہیئے۔ بعض لوگ مجھ سے ناراض ہیں کہ میں مضامین کیوں لکھتا ہوں، مجھے تو صرف شعر کہنے چاہئیں ــــ آہ! دنیا

لہ۔ اس کا ترجمہ متعدد رسالوں میں چھپ چکا ہے۔

تصویر کے صرف ایک رخ کو دیکھتی ہے۔

"میرے تنقیدی اور ادبی مضامین کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ اور مجھے اپنی یہی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے ان مضامین میں ایک مضمون مذہب کے متعلق ہے جو میرے کئی سال کے مطالعہ اور غور و فکر کا حاصل ہے۔ بعض تنقیدی اور ادبی مضامین بالکل اوریجنل اور تخلیقی ہیں۔"

(۱۲) غلام دستگیر صاحب رشید:۔ "میری اپنی مرغوب ترین تصنیف "شمس معنوی" ہے۔ یہ مولانا روم کے دیوان غزلیات پر تاریخی نقد اور ادبی تبصرہ ہے۔ تیسرا باب غزلیات کی روشنی میں مولانا روم کے مسلک تصوف سے متعلق ہے۔ میں نے شبلی مرحوم کی کتابوں سے فارسی شاعری کے مطالعہ کا جو ذوق پیدا کیا ہے اور بعض کیمیا اثر اہل نظر سے سلوک و تصوف میں جو نعمت پائی ہے، اُس کا اظہار حتی الامکان حسن و خوبی سے اس کتاب میں ہوا ہے، بعض اہل کمال نے میری اس خوش گمانی کی آزادانہ توثیق فرمائی ہے۔"

(۱۳) پروفیسر مجیب:۔ میں نے ایک دو کتابیں لکھی ہیں اور وہ شائع بھی ہو چکی ہیں لیکن ان خامیاں رہ گئی ہیں کہ ان میں سے کوئی مجھے اب پسند نہیں۔ یہ امید البتہ رکھتا ہوں کہ آئندہ اور کوئی کتاب لکھی تو اس میں اتنی خامیاں نہ ہوں گی مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ اُمید پوری نہ ہوگی۔"[1]

تیسرا سوال یہ تھا کہ "اُردو کے نثار نقاد انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، اس مختصر فہرست میں آپ کو علی قدر مراتب سب سے زیادہ کون پسند ہیں۔

جواب میں مولانا سلیمان ندوی نے تفصیل بھی کی ہے اور تشریح بھی شائد اس لئے کہ بقول مولانا عبد الماجد دریابادی:۔

"سوال ذرا ٹیڑھا ہے، لکھنے والوں کی حیثیتیں مختلف ہیں۔ کوئی کسی حیثیت سے پسند ہے، کوئی کسی اعتبار سے" اُن کے خیال میں

---

[1] پروفیسر صاحب کا انکسار قابل قدر ہے لیکن مجیب صاحب جیسے ذہین اور بالغ نظر شخص کے لئے ہم اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ سطور بالا میں جس امید کا ذکر کیا گیا ہے وہ پوری نہ ہوگی۔ کیوں نہ ہوگی۔ ہونی چاہیئے۔

"دلچسپ اور شوخ لکھنے والے تو اس وقت خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن دلچسپ فقروں اور شوخ ترکیبوں کے ساتھ صحت زبان کا التزام رکھنے والے بہت ہی کم ہیں.... ادبی ومعنوی حیثیتیں ملا کر سید سلیمان ندوی کی ذات اس وقت اُردو کے لئے باعث فخر ہے"[۵۱]

پروفیسر مسعود الحسن نے اس سلسلہ میں صرف تین نام لئے ہیں۔ آزاد، حالی، شبلی۔ انھوں نے اپنی اس مختصر فہرست میں حال کے کسی لکھنے والے کا نام نہیں گنایا، یہ چیز ذرا تعجب انگیز ہے، ممکن ہے پروفیسر صاحب نے ماضی ہی سے واسطہ رکھا ہو اور حال سے بحث نہ کی ہو۔

آغا حیدر حسن کا کہنا ہے کہ۔

"آبحیات پسند ہے تو محمد حسین آزاد آپ سے آپ ہی پسند ہوں گے، ان کے بعد مولانا نذیر احمد کی زبان پسند ہے کیوں کہ انھوں نے دلی کے دولت مند گھرانوں کی بولی میں اپنی کتابیں لکھی ہیں"۔

دستگیر رشید صاحب مولانا حالی اور پروفیسر ادیب کے خاص طور پر معترف ہیں اور "نقد سخن" میں شبلی کو معیار جانتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو کو "اُردو کے زندہ نثر نگاروں میں قاضی عبد الغفار ہر لحاظ سے پسند ہیں" لیکن ان کا کہنا ہے کہ:۔

"اردو زبان کا نقاد، جسے صحیح معنوں میں نقاد کہا جا سکے ابھی تک پیدا نہیں ہوا، اور اگر ہو چکا ہے تو وہ یقیناً انگوٹھا چوس رہا ہوگا"[۵۲]

ماہر القادری صاحب کا کہنا ہے کہ:۔

"دنیا میں ہزاروں شعراء اور مصنفین پیدا ہوئے ہیں مگر صاحب طرز دو چار ہی ہوئے ہیں مولانا عبد الماجد دریا بادی ایک خاص طرز کے مالک ہیں، آسان اور سہل زبان میں فلسفہ وعلم کلام کے مسائل بیان کرنا بس اُنہی کا حصہ ہے۔ اُن کے مضامین میں سلجھاؤ ہوتا ہے اور اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کافر ادب بھی ایمان لائے بغیر

---

[۵۱]۔ یہ دور حاضر کے ایک بہترین نثار کی رائے ہے یقین ہو کہ متعلقہ حلقوں میں بہت غور و دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

[۵۲]۔ منٹو صاحب کا یہ خیال کافی بحث کا موضوع بن سکتا ہے

نہیں رہ سکتا"[1]

اب تفصیل ملاحظہ ہو:۔

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی:۔"اپنے دیکھنے والوں اور سننے والوں میں"۔

(۱) بحیثیت مقرر:۔ مولانا احمد سعید (۲) مولانا آزاد

(۲) انشا پرداز:۔ ۱۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، (۲) مہدی افادی مرحوم

(۳) مولانا عبد السلام ندوی، (۴) مولانا عبد الماجد دریابادی، (۵) رشید احمد صدیقی۔

(۳) مقرر و انشا پرداز:۔ ۱۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم (کامریڈ)

(۲) مولانا عبد الماجد دریابادی:۔"سوال ذرا ٹیڑھا ہے، لکھنے والوں کی حیثیتیں مختلف ہیں۔کوئی کسی حیثیت سے پسند ہے کوئی کسی اعتبار سے ـــــ دلچسپ اور شوخ لکھنے والے تو اس وقت خاص بڑی تعداد میں ہیں لیکن دلچسپ فقروں اور شوخ ترکیبوں کے ساتھ صحت زبان کا التزام رکھنے والے بہت ہی کم ہیں ـــ ان میں ایک فرحت اللہ بیگ دہلوی ہیں، دوسرے امیر احمد علوی کاکوروی ـــــ ادبی و معنوی حیثیتیں ملا کر مولانا سلیمان ندوی کی ذات اس وقت اُردو کے لئے باعث فخر ہے"۔

(۳) خواجہ حسن نظامی:۔ × × × ×

(۴) مسعود الحسن صاحب ادیب:۔ "آزاد، حالی، شبلی"۔

(۵) آغا حیدر حسن دہلوی:۔"آبحیات پسند ہے تو محمد حسین آزاد آپ سے آپ ہی پسند ہوں گے ان کے بعد مولانا نذیر احمد کی زبان پسند ہے، کیوں کہ اُنھوں نے دتّی کے دولت مند گھرانوں کی بولی میں اپنی کتابیں لکھی ہیں۔ مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ نے دتّی کے نوابوں کی بولی میں اپنی کتاب بزم آخر لکھی ہے۔ مولانا شبلی نے ایسی طرز اختیار کی ہے کہ دتّی، لکھنؤ کا تفرقہ ہی مٹا دیا۔دتّی والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری زبان کا تتبع

---

[1] قاضی عبد الغفار جیسے شگفتہ قلم نثر نگار کو ادب کا کاد مجلا کون کہے گا ہمیں جہاں تک خیال ہے ماجد صاحب کی نثر پر وہ بھی ایمان لائے ہیں اور جس حد تک ہم نے اندازہ کیا، ماجد صاحب بھی قاضی صاحب کی نثر کے قائل ہیں۔ ہم ایک زمانہ سے ان دونوں حضرات کی تحریروں کو دیکھ رہے ہیں، دونوں ہم عصر اخبارات میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن اہل قلم کی حیثیت سے ایک دوسرے کے معترف معلوم ہوتے ہیں۔

[2] ۔بلاشک اخیر کا نام اسی تحسین کا مستحق ہے۔

کیا ہے اور لکھنؤ والے اپنی بولی کا سمجھتے ہیں۔"

(۶) میاں بشیر احمد:۔ "اُردو کے نثر نگار مصنفین میں جو مجھے پسند ہیں ان میں چند یہ ہیں ۔
۱۔ محمد حسین آزاد ۔ ۲۔ شبلی ۔ ۳۔ فلک پیما ۔ ۴ ۔ فرحت اللہ بیگ ۔ ۵ ۔ سجاد حیدر"

(۷) محی الدین قادری صاحب زور:۔ "اردو کے نثر نگاروں اور نا قدوں میں میری نظر سب سے پہلے شبلی اور ان کے بعد نیاز فتح پوری پر پڑتی ہے ۔ یہ دونوں پختہ نثار و نقاد ہیں"

(۸) خواجہ غلام السیدین:۔ "اردو کے نثر نگاروں میں ابو الکلام مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ باقی ادب عالیہ کے اراکین کو سب لوگ خود ہی جانتے ہیں۔ ان کے نام دہرانے سے کیا حاصل "

(۹) ایم اسلم صاحب:۔ " ۱۔ جناب مولنا سید سلیمان ندوی۔ ۲۔ حضرت نیاز فتح پوری "

(۱۰) سعادت حسن صاحب منٹو:۔ " اردو کے زندہ نثر نگاروں میں قاضی عبدالغفار مجھے ہر لحاظ سے پسند ہیں ۔ اردو زبان کا نقاد جسے صحیح معنوں میں نقاد کہا جا سکے ابھی تک پیدا نہیں ہوا اور اگر ہو چکا ہے تو وہ یقیناً انگوٹھا چوس رہا ہو گا "

(۱۱) مولانا ماہر القادری:۔ " اردو کے نثر نگاروں میں مجھے مولانا عبدالماجد دریا بادی سب سے زیادہ پسند ہیں ۔ دنیا میں ہزاروں شعراء اور مصنفین پیدا ہوتے ہیں مگر "صاحب طرز" دو چار ہی ہوتے ہیں ۔ مولانا عبدالماجد ایک خاص طرز کے مالک ہیں۔ آسان اور سہل زبان میں فلسفہ و علم و کلام کے مسائل بیان کرنا بس انہی کا حصہ ہے ۔ ان کے مضامین میں سلجھاؤ ہوتا ہے اور اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کافر ادب بھی ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا "

(۱۲) غلام دستگیر صاحب رشید ۔ " اردو کے نقادوں میں مولانا شبلی، حالی، اور پروفیسر مسعود حسن ادیب کا خاص طور پر معترف ہوں ۔ نقد سخن میں شبلی کو معیار جانتا ہوں"

نوٹ :۔ یہ امر قابل حیرت ہے کہ اہل قلم حضرات میں سے کسی ایک نے بھی نہ تو بحیثیت نثار کے منشی پریم چند سورگ باشی کا نام لیا اور نہ ان کی کوئی تصنیف گنائی۔ ہم اس کی توجیہہ کرنے سے قاصر ہیں ۔

ف ۔ آغا صاحب نے یہ ایک نہایت باریک اور قابل قدر نکتہ نکالا ہے ۔

خطوط سے متعلق بعض دلچسپ باتیں:۔

(۱) سب سے زیادہ غیر رسمی طرز جواب مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے جو کمال شفقت میں القاب لکھنا بھول گئے سوالات کے محاذی، حاشیہ پر سرخ روشنائی سے جوابات تحریر کئے اور خاتمہ تحریر پر بزرگانہ و پرمحبت لہجہ میں کہا کہ:۔

"فقیر بھی امیر (مرحوم)، اور "امیر زادوں" کا دلدادہ ہے"

(۲)۔خواجہ حسن نظامی اپنے خط کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:۔

"اندھا ہو گیا ہوں مگر یہ خط ایمانداری سے لکھا ہے تاکہ اندھا بے ایمان نہ سمجھا جاؤں۔"

(۳) سعیدین صاحب نے فرمایا کہ:۔

"آپ نے سوالوں کا جواب لینے پر اصرار کیا لہٰذا اب انھیں بھگتیئے۔"

(۴) سب سے زیادہ رسمی آغاز منٹو صاحب کا ہے جو ٹھیٹ دفتری زبان میں ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں کہ:۔

"بجواب مراسلۂ گرامی مورخہ ۲۴۔ ستمبر ۱۹۴۲ء ترقیم ہے کہ آپ کے سوالیہ کا جواب حسب ارشاد حاضر ہے۔.......اور ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:۔

"مجھے امید ہے کہ ان مختصر جوابوں سے آپ کا مطلب حل ہو جائے گا۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ اس قدر رسمی آغاز و انجام کے درمیان اصل خط میں خوب بے تکلفانہ انداز اختیار کیا جائے گا۔ مگر کیا گیا اور ہم اس کے لئے منٹو صاحب کے شکر گزار ہیں۔

(۵) جن ادیبوں[1] نے ہمیں جواب نہ دیا، ستم کیا لیکن اس ستم ظرفی کا بھی کوئی جواب ہے کہ:۔

"جناب محترم آداب۔
میں نہایت نادم ہوں۔ مجھے بالکل یاد نہ رہا کہ آپ نے "جوابی لفافہ" کس لئے بھیجا تھا، محض اس خیال سے کہ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے لفافہ بھی ہضم کر لیا، یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ میں آپ کی یادآوری کا کمال ممنون ہوں۔" یہ رشید احمد صاحب صدیقی ہیں۔ ہم ادارہ کی طرف سے رشید صاحب کی خدمت میں ہدیہ تشکر گذارتے ہیں۔

---

[1] حضرات کے نام یہ ہیں۔ سیماب [illegible]، قاضی عبدالغفار، سید عبدالقادر، ڈاکٹر عبدالحق، مرزا عزت اللہ بیگ، ڈاکٹر تارا چند۔

ادارہ "نظام ادب" کالج کے طلبا اور طالبات کی جانب سے آپ کی خدمت گرامی میں ہدیہ آداب نیاز و عقیدت گذرانتا ہے۔

جناب والا۔ ہر ملک اور ہر دور کے مفکرین۔ شاعر ہوں یا ادیب نقاد ہوں یا فلسفی۔ در اصل زبان ادب اور فلسفہ کے چمن بند ہوتے ہیں۔ اور بحیثیت مجموعی ترجمان جذبات قوم سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں عامی کی آنکھ ذہن اور انگلیاں بکار ثابت ہوتی ہیں۔ مفکرین ہر رنگ کو دیکھتے ہر خیال کو پرکھتے اور نبض جذبات کی رفتار کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ چاہے کہیں ہوں اور کسی حال میں ان خیالات سے غافل نہیں رہتے بلکہ نہیں رہ سکتے۔

آپ کو۔ اسی گروہ کا ایک فرد تصور کرکے میں بحیثیت معتمد مجلہ بڑی آرزو کے ساتھ آپ سے دو تین سوالات کرنا چاہتا ہوں اور چونکہ جوابات مختصر درکار ہیں اور دینا آپ جیسے مشاقین کو ہی اس لئے امید کرتا ہوں کہ کمترین کی یہ فرمائش بار خاطر نہ ہوگی اور جواب خط سے پورا مطلب حاصل ہوگا۔

سوالات۔ (۱) اردو زبان میں آپ کی عزیز کتابیں کونسی ہیں۔ نظم کی ہوں یا نثر کی۔ ایک جو آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے اس کے وجوہ مختصراً کیا ہیں۔

۲۔ اگر مصنف ہیں۔ چاہے آپ کی تصنیف چھپ چکی ہو یا نہ چھپی ہو۔ تو آپ کی مرغوب ترین تصنیف کونسی ہے۔ کیا آپ کوئی خاص وجہ ترجیح بتلا سکتے ہیں۔

۳۔ اردو کے نثار و نقاد انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ان کی اس مختصر فہرست میں آپ کو علی قدر مراتب سب سے زیادہ کون پسند ہیں۔

آپ کے جواب نہایت شکریہ اور کمال خوشی کے ساتھ نظام ادب میں چھاپنا مقصود ہیں۔ یہ رسالہ حیدرآباد کے مشہور و معروف نظام کالج کی قدیم بزم اردو کا واحد ہر دلعزیز ترجمان ہے۔ ادارہ اس قسم کی اپیل ملک کے تمام بڑے ادیبوں۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نیاز فتح پوری وغیرہم سے کر رہا ہے اور پوری امید رکھتا ہے کہ یہ خطوط چھپنے کے بعد نہ صرف کامیاب بلکہ مفید ثابت ہوں گے۔

عقیدت کیش
اسرائیل احمد مینائی معتمد

اب ہم ذیل میں حضرات اہل قلم کے خطوط کو بجنسہ نقل کرتے ہیں:۔

مولانا سید سلیمان ندوی:۔

۱۔ الفاروق و جلد اول سیرۃ النبی از مولانا شبلی۔ آب حیات آزاد۔ مقدمہ حالی۔ مسدس حالی۔ دیوان غالب۔ بانگ درا اقبال۔

۲۔ سیرۃ النبی جلد ۴۔ ۵۔ ۶۔

۳۔ بہ ترتیب دیکھنے والوں اور سننے والوں میں۔ مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام۔ مولانا محمد علی مرحوم (کامریڈ) بحیثیت مقرر و انشا پرداز۔

مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا آزاد سبحانی بحیثیت مقرر۔

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی۔ مہدی افادی مرحوم۔ مولانا عبدالسلام ندوی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ رشید احمد صدیقی بحیثیت انشا پرداز۔

یہ فقیر بھی امیر اور امیرزادوں کا دلدادہ ہے۔

خاکسار

سید سلیمان ندوی۔ ۶ شوال ۱۳۶۱ھ

از مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۴۲ء م ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ

وعلیکم السلام۔

(۱) آپ کا پہلا سوال ذرا تفصیل چاہتا ہے۔ کسی ایک کتاب کا نام بتانا جو عمر کے ہر دور میں عزیز ترین، محبوب ترین رہی ہو، ناممکن ہے۔ حالات اور سن کے اقتضائے سے۔ مذاق علم و ادب بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

ایک زمانہ میں مولانا شبلی کی نثر بہت ہی مرغوب تھی۔ اس دور میں کوشش کر کے اس کی نقل و تقلید کی۔ اب بھی انھیں کی نثر مبتدیوں کے حق میں بہترین سمجھتا ہوں۔ خصوصاً ان کے لئے جو کسی سنجیدہ عنوان پر شریفوں کی طرح لکھنا چاہتے ہوں۔

نذیر احمد دہلوی۔ راشد الخیری۔ شرر لکھنوی اور مولانا ابوالکلام کا بھی ایک خاص امتیاز نظر میں رہا۔ خاص زبان وانشاء کے معیار سے۔ رسوا لکھنوی، رتن ناتھ سرشار، ریاض خیرآبادی، امیر مینائی، اکبر الٰہ آبادی، عشرت لکھنوی، حسن نظامی دہلوی، کے رنگ کی وقعت دل میں رہی۔ بعض سے بہت کچھ حاصل بھی کیا۔

اردو شاعری کی دنیا میں تین شخص میرے لئے کافی ہیں۔ غالب، اکبر و اقبال۔ ان کے بعد کی فہرست خاصی طویل ہے۔ سب کا نام کہاں تک گنا سکتا ہوں۔ چار نام محض نمونہ کے طور پر اور سن لیجئے۔ فانی جگر، حسرت، اصغر، متفرق طور پر اور بھی شاعروں کی بعض بعض چیزیں بہت پسند رہیں، مثلاً نواب مرزا شوق کی بدنام مثنوی زہر عشق، احمد علی شوق کی مثنوی ترانہ شوق۔

نثر میں غالب کی تحریروں پر اب بھی رشک آ آجاتا ہے۔ نظم و نثر ملا کر بحیثیت مجموعی ادبی حیثیت سے۔ غالب سب پر غالب ہیں۔ اور معنوی حیثیت سے اقبال، اکبر۔

۲۔ میری ناچیز خامہ فرسائیاں ہیں کس شمار و قطار میں۔ تاہم آپ کو عزت بڑھانا ہی مقصود ہے۔ تو عرض کرتا ہوں اپنی مطبوعہ کتابوں میں سفر حجاز کو سب پر ترجیح دیتا ہوں اور اگر کتاب کی قید نکال دی جائے، صرف تحریر کو رکھا جائے تو پھر اپنی صدق اور سچ (مرحوم) کی تحریروں کے لئے عرض کروں گا۔ ان کے مقالات، شذرات، سچی باتیں، سب کے لئے۔

سچی بات یہ ہے کہ اپنی ہر کتاب، کچھ ہی روز بعد، خود اپنی نظر میں نہایت درجہ سبک، حقیر، ناقص معلوم ہونے لگتی ہے۔

۳۔ سوال ذرا ٹیڑھا ہے۔ لکھنے والوں کی حیثیتیں مختلف ہیں۔ کوئی کسی حیثیت سے پسند ہے کوئی کسی اعتبار سے۔ دلچسپ اور شوخ لکھنے والے تو اس وقت خاصی بڑی تعداد میں ہیں لیکن دلچسپ فقروں اور شوخ ترکیبوں کے ساتھ صحت زبان کا التزام رکھنے والے بہت ہی کم ہیں۔ ان میں سے ایک فرحت اللہ بیگ دہلوی ہیں۔ دوسرے امیر احمد علوی کاکوروی۔ ادبی معنوی حیثیتیں ملا کر مولانا سید سلیمان ندوی کی ذات اس وقت اردو کے لئے باعث فخر ہے۔ والسلام

دعاگو عبدالماجد دریابادی۔

از مولانا خواجہ حسن نظامی

جناب اسرائیل احمد صاحب مینائی۔

السلام علیکم۔ آپ کا خط رسالے کے لئے پہنچا آپ کے سوالات کے جوابات ارسال ہیں

(۱) میں حضرت اکبر الہ آبادی اور نذیر اکبر آبادی کا کلام سب شعرائے اردو کے کلام سے زیادہ پسند کرتا ہوں کیونکہ اس میں دنیا والوں کے دل کی حالت ہے۔ باقی شعرا اپنی حالت اس طرح لکھتے ہیں کہ ہم عوام کچھ نہیں سکتے۔

نثر میں مجھے مولانا آزاد کی کتاب آب حیات اور دربار اکبری بہت پسند ہے۔ کیونکہ

وہ بے اصل چیز کو حقیقی اور اصلی بنا دیتے ہیں۔

(۲) مجھے اپنی تصنیف دوسو کتابوں میں قرآن مجید کا ترتیلی ترجمہ سب سے زیادہ اس لئے پسند ہے کہ اس سے ہندوستان کے دس کرور مسلمان قرآن کا مطلب سمجھ کر پڑھنے لگیں گے۔

اور روحانی ادب میں مجھے اپنی نئی تصنیف "نظامی بنسری" اس لئے بہت پسند ہے کہ وہ ہر چھوٹے بڑے کم علم اور عالم کو یکساں دلچسپ معلوم ہوتی ہے اور بعض لوگوں نے گن گن کر اسکو اکیس اکیس بار پڑھا ہے اور لکھا ہے کہ ہر بار نئی کتاب معلوم ہوئی۔

اور سیاسی ادب میں مجھے بیگمات کے آنسو کتاب اس لئے پسند ہے کہ اس میں ایک ایسے خاندان کی حکومت کے زوال کا ذکر ہے جس کا سچا حال بیان کرنا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اور اس لئے بھی کہ ہنسنے والی قوم کے پاس رلانے والی کتاب کوئی نہ تھی اور میں نے یہ کتاب لکھکر یہ کمی پوری کر دی۔ اندھا ہو گیا ہوں مگر یہ خط ایمانداری سے لکھا ہے تاکہ اندھا بے ایمان نہ سمجھا جاؤں۔

راقم حسن نظامی دہلوی
۱۵ دسمبر ۱۹۴۲ عیسوی

از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب

مکرمی تسلیم۔

آپ کے گرامی نامے کے جواب میں بے حد تاخیر ہوئی میری دلی معذرت قبول فرمائیے۔ آپ کا رسالہ غالباً تیار ہو چکا ہوگا اور آپ کے استفسارات کے جواب جو میں اب لکھنے بیٹھا ہوں، ان کے لئے شائد گنجائش باقی نہ رہی ہوگی پھر بھی انگریزی کے مقولے "Better late than never" کے مطابق تعمیل ارشاد کر رہا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنے رسالہ کے آئندہ پرچہ میں میرے جوابات شائع فرما دیں۔

(۱) اردو میں میری پسندیدہ کتابوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ مگر مجھے ادبی تحقیق و تنقید سے خاص دلچسپی ہے اس لئے میری عزیز ترین کتابیں انھیں موضوعوں سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور میں حسن انشا کا دلدادہ ہوں اس لئے وہ کتابیں میرے انتخاب میں نہ آسکیں گی۔ جن کے اسلوب تحریر میں کوئی دلکشی نہیں ہے۔ اس تمہید کے بعد میں اپنی عزیز کتابوں کے نام لکھتا ہوں۔

نثر۔ آب حیات۔ سخندان فارس۔ نیرنگ خیال۔ موازنہ انیس و دبیر۔ شعر العجم۔ شعر و شاعری یادگار غالب۔ اردوے معلیٰ۔ بہارستان سخن معروف بہ کاشف الحقائق۔ مضامین چکبست۔ افادات مہدی

نظم۔ مراثی انیس۔ کلیات میر۔ دیوان غالب۔ دیوان آتش۔ دیوان تعشق۔ کلیات اسمٰعیل۔ کلیات اکبر۔ دیوان حسرت موہانی۔ صحیفۂ الملت از مولنا صفی لکھنوی۔ بانگ درا۔ بال جبریل۔ صبح وطن از چکبست لکھنوی۔ شعلہ و شبنم۔ فکر و نشاط۔ سحرالبیان۔ گلزار نسیم۔ زہر عشق۔

اردو نثر کی کتابوں میں آب حیات مجھ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں

اب حیات اردو میں تذکرہ نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ شاعروں کے حالات کی تفصیل کیساتھ ان کے زمانے اور ماحول کی تصویر کشی کی ضرورت اصولی طور پر اسی کتاب نے محسوس کروائی اور عملی طور پر اس تصویر کشی کا ایسا نمونہ پیش کیا جیسا اردو کی کوئی دوسری کتاب اب تک پیش نہیں کرسکی

یہ کتاب اردو شاعری کی تاریخ کا وہ نقش ہے جو اولین ہونے کے ساتھ بعض حیثیتوں سے بہترین بھی ہے۔ اردو کے بہت سے قدیم شاعروں کا نام اسی کتاب کی بدولت زندہ ہے۔ ہمارے ممتاز شعرا کے متعلق جو روایتیں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں ان کو محفوظ کرلینا ایک اہم ادبی خدمت تھی اور آب حیات نے اس خدمت کو اس خوبی سے انجام دیا ہے کہ کوئی دوسری کتاب اس خصوص میں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

آب حیات ایک طرف اردو شاعری کے ارتقار کی تاریخ پیش کرتی ہے تو دوسری طرف ہماری قدیم سوسائیٹی کے ادبی رخ کی ایسی روشن تصویر دکھاتی ہے جس کی نظیر کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتی۔ اس کتاب نے ہماری تمدنی تاریخ کے بعض نہایت اہم پہلوؤں کو ابدی گمنامی سے بچا لیا۔ اردو ادب آب حیات کے اس عظیم احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

اردو میں ادبی تحقیق کا شوق اور شعر و ادب کی تاریخ لکھنے کا خیال سب سے پہلے آب حیات نے پیدا کیا۔ اس کے علاوہ اردو زبان کی تاریخ سب سے پہلے اسی کتاب نے پیش کی اور اسی نے ہم کو لسانی تحقیق کا راستہ دکھایا۔ آب حیات کے بعد کئی کتابوں میں اس مضمون سے بحث کی گئی۔ لیکن آب حیات کا طرز بحث اب بھی بعض حیثیتوں سے بے نظیر ہے۔

فارسی کی رنگین اور تخیلی انشا کی تقلید سے اردو کو جو نقصان پہنچ رہا تھا، اس کی طرف آب حیات نے سب سے پہلے توجہ دلائی۔ اردو نثر جو استعارے اور مبالغے کی کثرت سے بوجھل ہوئی تھی۔ اس میں سادگی اور اصلیت کی خوبیاں پیدا کرنا بہت کچھ آب حیات ہی کا کام ہے۔ اس کتاب نے ایک طرف اردو نثر کی اصلاح کی ضرورت سمجھائی اور دوسری طرف انشاپردازی کا ایک نیا اور بے نظیر اسلوب پیش کردیا۔

اردو نثر کی طرح اردو شاعری بھی اپنی اصلاح کے لئے آب حیات کی منت گزار ہے۔ اردو شاعری خاص کر اردو غزل کے نقائص کی طرف سب سے پہلے اسی کتاب نے متوجہ کیا۔ ادھر کچھ دنوں سے غزل گوئی کے خلاف جو آوازیں بلند کی جا رہی ہیں۔ وہ آب حیات ہی کے بعض بیانوں کی صدائے بازگشت ہیں۔

آب حیات پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں میں ان سے واقف ہوں۔ مگر اس واقفیت کے بعد بھی ذمہ داری کے کامل احساس کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ کتاب غیر معمولی تحقیق و تدقیق اور نہایت وسیع و عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے اردو کی شاید ہی کوئی اور ادبی تصنیف ہو جو اس محنت اور اتنی تحقیق سے لکھی گئی ہو۔

اردو کے منظوم ادب میں مجھے مراثی انیس سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ اردو شاعری کے ذخیرہ میں اگر کوئی چیز ایسی ہے، جو فارسی، انگریزی یا کسی دوسری زبان سے مستعار یا ماخوذ نہیں ہے تو وہ صرف مرثیے ہیں۔ اور انیس ہی کے مرثیے ایسے ہیں جو دنیا کے بڑے سے بڑے شاعروں کے شاہکاروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اور ساری دنیا سے اردو شاعری کی عظمت تسلیم کروا سکتے ہیں۔ انیس کے مرثیوں میں وہ وسعت اور جامعیت ہے کہ معنوی حیثیت سے یا تاثرات کے اعتبار سے شاعری کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں ان سب پر حاوی ہیں۔ انیس کے مرثیے قارئین کو ایسی فضا میں پہنچا دیتے ہیں جو تمام تر نیکی ہے اور نیکی کی طرف مائل کرنے والی۔ انیس کے مرثیے زندگی کے تصور میں جو رفعت پیدا کر سکتے ہیں وہ کسی اور چیز سے ممکن نہیں۔

۲۔ حال کی ترجمانی اور مستقبل کی راہ نمائی کی ضرورت تو مسلم ہے لیکن اپنے ماضی کی تفسیر و تعبیر کی اہمیت کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ادبیات کی حد تک اس کام کو انجام دینا اپنا خاص مقصد قرار دیا ہے۔ چونکہ میرے ادبی کاموں میں ہماری شاعری۔ اس مقصد کو سب سے زیادہ پورا کرتی ہے اس لئے مجھے اپنی یہ تصنیف سب سے زیادہ پسند ہے۔

۳۔ آزاد۔ حالی۔ شبلی۔

آخر میں اتنی گزارش کروں گا کہ اگر آپ یہ میرے جوابات شائع فرمائیں تو براہ کرم ان کا کوئی جز حذف نہ فرمائیں۔ پہلے استفسار کے جواب میں جو چند سطریں تمہید کے طور پر لکھی گئی ہیں وہ بھی جواب کا ضروری جز ہیں۔ براہ عنایت اس خط کی رسید سے ضرور مطلع فرمائیے۔

نیاز کیش سید مسعود حسن رضوی۔

از پروفیسر آغا حیدر حسین

اسرائیل صاحب! دعا!

آپ کے سوالوں کا جواب دے رہا ہوں۔ نام کی نسبت نے تقاضوں کی بوچھاڑ کی ہے۔ اس نے

مجھ جیسے کوتاہ قلم کو جواب دینے پر مجبور کر دیا۔ آپ کی خوشی مختصر جوابوں میں ہے۔ اس لئے سست نویسی اور کاہلی پر بھی پردہ پڑ جاتا ہے۔

مجھے مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کی فروگزاشتوں پر سے لوگوں کی جدید تحقیق تفتیش قربان ہے۔ کتاب کیا ہے ایک چہکتا ہوا بلبل ہزار داستان ہے۔

۲۔ میرے مضمونوں کا مجموعہ پس پردہ کے نام سے چھپا ہے۔ اس میں مختلف عنوان ہیں۔ اکثر میرے لکھے ہوئے نہیں۔ مضمون میں نے لکھا نام دوسروں نے رکھا۔ اس میں شہر آبادی کی زبان۔ کتابت میں لاکر محفوظ کر لینے کی کوشش کی ہے۔ شاہی خاندان کی بیگمات کی جو بولی تھی۔ اس میں مضمون لکھے گئے ہیں۔ اپنی کتاب ہے اس لئے پسند ہے۔

۳۔ آب حیات پسند ہے تو محمد حسین آزاد آپ سے آپ ہی پسند ہوں گے۔ ان کے بعد مولانا نذیر احمد کی زبان پسند ہے۔ کیونکہ انہوں نے دلی کے دولت مند گھرانوں کی بولی میں اپنی کتابیں لکھی ہیں۔ مولوی سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ نے دلی کے نوابوں کی بولی میں کتابیں لکھی ہیں۔ منشی فیض الدین حجن نے بھی لال قلعہ کی بولی میں اپنی کتاب بزم آخر لکھی ہے۔ مولانا شبلی نے ایسی طرز اختیار کی ہے کہ دلی لکھنؤ کا تفرقہ ہی مٹا دیا۔ دلی والے یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری زبان کا تتبع کیا ہے اور لکھنو والے اپنی بولی کا سمجھتے ہیں۔

دعاگو آغا حیدر حسین۔

از میاں بشیر احمد اڈیٹر ہمایوں۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۴۲ء

مکرمی تسلیم۔

والا نامہ مورخہ ۲۴ ستمبر ملا۔ "نظام ادب" کے سوالات کے سلسلہ میں مفصلہ ذیل جوابات ارسال خدمت ہیں:۔

۱۔ اردو میں مجھے جو کتابیں عزیز ہیں ان میں سے چند یہ ہیں! الفاروق (مصنفہ شبلی۔ نیرنگ خیال (آزاد)۔ دیوان غالب، بانگ درا (اقبال)، بال جبریل (اقبال) مضامین فلک پیما شعلہ و شبنم (جوش)، سریلے بول (عظمت اللہ خاں)۔

ان کتابوں میں آج کل مجھے بال جبریل سب سے زیادہ پسند ہے کیونکہ اس میں حیات بخش اور روح پرور خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جن کی ہماری قوم کو اشد ضرورت ہے۔

۲۔ میرے اکثر مضامین اپنے رسالے ہمایوں میں چھپے ہیں۔ ان میں سے صرف تخیل کے مضامین

کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب کا نام "طلسم زندگی" ہے۔ اس کتاب کے جس حصہ پر جھلکیاں کا عنوان ہے وہ مجھے سب سے زیادہ مرغوب ہے۔

۳۔ اردو کے نثر نگار مصنفین میں جو مجھے پسند ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

محمد حسین آزاد۔ شبلی۔ فلک پیما۔ فرحت اللہ بیگ۔ سجاد حیدر۔

نیاز مند بشیر احمد۔ (ایڈیٹر ہمایوں لاہور)

از پروفیسر سید محی الدین قادری زور

جناب مکرم۔

آپ کے سوال کے جواب یہ ہیں:۔

۱۔ اردو زبان کی کتابوں میں مجھے "کلیات محمد علی قطب شاہ" سب سے زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ اس بادشاہ شاعر نے اپنے کلام میں زندگی کے ہر پہلو پر نہایت کمال اور لطافت کے ساتھ خیال آرائی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب برائے ادب کے ساتھ ساتھ ادب برائے زندگی کا بھی قائل تھا۔

میری دوسری پسندیدہ کتابیں۔ یادگار غالب از حالی۔ اور روح انیس۔ مرتبہ مسعود حسن رضوی ہیں

۲۔ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ والدین شاہد ہی بتاسکیں گے ان کو اپنی کونسی اولاد زیادہ عزیز ہے۔ تاہم میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری ایک چھوٹی سی کتاب سیر گولکنڈہ مجھے بہت مرغوب ہے۔ شائد اس لئے کہ اس میں افسانوں کے پیرایہ میں انسانوں کے ایسے کردار پیش کئے گئے ہیں جو ہر دور اور ہر ملک میں مہر و وفا اور خلوص و عطا کے نمونے ثابت ہوسکتے ہیں۔ دکن کی بین قومی تہذیب اور مشترکہ کلچر کا ایسا بہتر مرقع شائد ہی تیار ہوسکے۔

۳۔ اردو کے نثر نگاروں اور ناقدوں میں میری نظر سب سے پہلے شبلی اور ان کے بعد نیاز فتحپوری پر پڑتی ہے۔ یہ دونوں پختہ نثار اور نقاد ہیں۔

مخلص۔ سید محی الدین قادری زور

از سید خواجہ غلام السیدین

مکرمی۔ تسلیم۔

خط کا جواب تاخیر سے دے رہا ہوں۔ جس کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ کے سوالات بظاہر بہت سادہ ہیں لیکن دراصل کافی مشکل ہیں۔ کیونکہ "بہترین" کا قطعی انتخاب کافی ذمہ داری کا کام ہے۔ علاوہ اس کے آپ جن "شاعروں، ادیبوں، نقادوں، فلسفیوں اور مفکروں" سے استصواب

کرنا چاہتے ہیں ان میں میرا شمار کسی طرح نہیں کیا جا سکتا، لہذا اس الزام کو تسلیم کئے بغیر محض ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جسے کتابیں پڑھنے سے اور ذہنی چیزوں میں دلچسپی ہے، آپ کے سوالوں کے مختصر جواب حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مجھے اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کے مجموعے سب سے زیادہ عزیز ہیں کیونکہ علاوہ ان کی فنی خوبیوں کے وہ اپنے جذبات اور خیالات کے اعتبار سے زندگی کی لہر کو تیز اور انسان کو اس کے بلند بے اندازہ طور پر بلند مرتبہ سے روشناس کرتے ہیں۔ شاید ان سب میں بال جبریل اور پیام مشرق سب سے افضل ہیں۔

۲۔ میری "تصانیف" ناقابل ذکر ہیں۔ زیادہ تر تعلیم ان کا موضوع ہے۔ ایک کتاب اقبال کے فلسفۂ تعلیم پر انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ جو اقبال کی نسبت کی وجہ سے کسی قدر عزیز ہے۔

۳۔ اردو کے نثر نگاروں میں ابو الکلام مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں۔ باقی ادب عالیہ کے اراکین کو سب لوگ خود ہی جانتے ہیں۔ ان کے نام دہرانے سے کیا حاصل۔

آپ نے سوالوں کا جواب لینے پر اصرار کیا۔ لہذا اب انھیں بھگتیئے۔ حمید حسن صاحب کو میرا اسلام شوق۔

نیاز مند۔ خواجہ غلام السیدین۔

از ایم۔ اسلم صاحب

۳۰ ستمبر ۱۹۴۲ء

مکرم محترم بندہ!

السلام علیکم۔ گرامی نامہ ملا دلی شکریہ! آپ کے سوالات کا جواب عرض کرتا ہوں۔

۱۔ غالب۔ بال جبریل۔

غالب اس لئے کہ ایک انسان کے تخیل پرداز کا آئینہ دار ہے۔

بال جبریل اس لئے کہ یہ نوجوانوں کو زندگی عزت اور وقار سے بسر کرنے کا طریق سکھلاتی ہے۔

۲۔ جی ہاں! اگر مصنف اسی چیز کا نام ہے کہ اس کے نام سے کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہوں تو یہ فخر اس ناچیز کو بھی حاصل ہے کم و بیش ایک صد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

مجھے اپنی تصانیف میں سے "خار و گل" اور "دشمن" سب سے زیادہ پسند ہیں۔

"خار و گل" میرے چند افسانوں کا مجموعہ ہے میرا خیال ہے کہ اردو ادب میں اس طرز کے افسانے ابھی تک نہیں لکھے گئے۔ میں نے اس کتاب میں تقدیر اور تدبیر کے مسئلہ پر بقدر ہمت کچھ اظہار

خیال کیا ہے۔ ہر ایک افسانہ ایک سوال سے شروع ہوتا ہے اور ختم بھی اسی بحث پر ہوتا ہے۔ ہر دلیل کے جواب میں ایک افسانہ ہے فیصلہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیا ہے۔ "وشمہ" ساقی بک ڈپو دہلی سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ کتابت ہو رہی ہے۔ یہ ایک لڑکی کی سرگذشت ہے جو تہذیب نو کی دلدادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ شائد جو سو رہے ہیں ان کو رونا میرا جگا ئے!

تقریباً ۲۰۰ صفحہ کی کتاب ہے۔ اور زمانہ کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

۲۔ جناب مولٰنا سید سلیمان ندوی۔ حضرت نیاز فتحپوری۔

کیا "نظام ادب" کی مجھے بھی زیارت ہو سکے گی والسلام۔

نیازمند۔ ایم۔ اسلم۔

ازسعادت حسن صاحب منٹو۔

بخدمت اسرائیل احمد صاحب مینائی معتمد رسالۂ "نظام ادب" نظام کالج۔ حیدرآباد دکن۔

جناب من تسلیم۔

بحوالۂ مراسلۂ گرامی مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۲ء ترقیم ہے کہ آپ کے سوالیہ کا جواب حسب ارشاد حاضر ہے۔

۱۔ اردو زبان میں مجھے صرف ایک کتاب عزیز ہے اور وہ قاضی عبدالغفار کی تصنیف "لیلیٰ کے خطوط" ہے۔ یہ کتاب مجھے اس لئے پسند ہے کہ یہ میرے محبوب موضوع پر نہایت ہی اثرانگیز انداز میں لکھی گئی ہے۔

۲۔ میں مصنف ہوں میں نے اب تک ساٹھ کے قریب مختصر افسانے اور سو کے قریب ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں۔ افسانوں کے مقابلے میں میرے ڈرامے زیادہ مقبول ہوئے ہیں۔ چونکہ وہ افسانوں جیسے معیاری نہیں۔ میرے افسانے سب کے سب چھپ چکے ہیں۔ سوائے ایک کے جسے حال ہی میں ہندوستان کے دو معتدر پرچوں نے شائع کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ غیر مطبوعہ افسانہ مجھے بہت پسند ہے۔ شائد اس لئے کہ یہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس افسانہ کا نام "پہچان" ہے۔

۳۔ اردو کے زندہ نثر نگاروں میں قاضی عبدالغفار مجھے ہر لحاظ سے پسند ہیں۔ اردو زبان کا نقاد جسے صحیح معنوں میں نقاد کہا جا سکے ابھی تک پیدا نہیں ہوا اور اگر ہو چکا ہے تو وہ یقیناً انگوٹھا چوس رہا ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ ان مختصر جوابوں سے آپکا مطلب حل ہو جائے گا۔

نیازکیش۔ سعادت حسن منٹو۔

از مولٰنا ماہر القادری۔

عزیزِ گرامی قدر جناب اسرائیل احمد صاحب مینائی۔

ہدیۂ آداب و رحمت! مودت نامہ وصول ہوا یاد فرمائی کا شکور ہوں، آپ کے نظام کالج کے متعدد ادبی اجتماعوں میں شریک ہو کر وہاں کے علمی و ادبی ماحول سے مستفید ہو چکا ہوں۔ مجلۂ "نظام ادب" کے دو شمارے بھی میری نظر سے گذر چکے ہیں، آپ کے گھرانے کا اردو زبان پر احسان ہے اور آپ اسی خانوادۂ علم و ادب کے چشم و چراغ ہیں یقین ہے کہ آپ کے زمانۂ معتمدی میں "نظام ادب" اور زیادہ فروغ پائیگا خوش قسمتی سے آپ کے رسالہ کو پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب جیسے قابل قدر ادیب مل گئے، جو اپنی طرزِ نگارش کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی!

اپنے مرسلہ سوالات کے جوابات ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ اردو زبان کی مندرجۂ ذیل کتابوں نے مجھے متاثر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہی کتابیں مجھے عزیز بھی ہونی چاہئیں۔

الف۔ (۱) سیرۃ النبی (شبلی نعمانی) (۲) الفاروق (شبلی نعمانی)، (۳) ارض القرآن (سلیمان ندوی (۴) الجہاد فی الاسلام (ابو الاعلیٰ مودودی) (۵) مضامین ابو الکلام آزاد (۶) افلاطون کی جمہوریت (مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین) (۷) دیوان غالب (۸) بال جبریل (اقبال) (۹) ضرب کلیم (اقبال) (۱۰) باقیات فانی (۱۱) محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدے اور مثنویاں .... وغیرہ۔

ب۔ ان کتابوں میں جس کتاب کو میں نے بار بار پڑھا ہے اور جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی شاہکار تصنیف "الفاروق" ہے۔

یہ کتاب مجھے کیوں پسند ہے؟ اس کے وجوہ بھی لگے ہاتھوں سنتے جائیے۔

فن تاریخ کی کوئی کتاب اس وقت تک معیاری تصنیف نہیں سمجھی جا سکتی جب تک اس میں مندرجۂ ذیل عناصر شریک نہ ہوں۔

(۱) ضروری مفید مطلب اور موضوع کے مطابق مواد کی فراہمی۔

بہت سے مورخین ہر رطب و یابس کو کتاب میں شریک کر دیتے ہیں، فراہم شدہ مواد پر نقد و نظر کرنے کی یا تو اُن میں صلاحیت ہی نہیں ہوتی یا پھر کتاب کا حجم بڑھانے کے شوق میں اس چیز کو وہ دانستہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اہل عرب اس قسم کے مصنفین کو حاطب اللیل کہتے ہیں۔

(۲) مواد فراہم کرنے کے بعد اس کو حسن سلیقہ کیساتھ مرتب کرنا۔

جو مورخ مواد کو سلیقہ کیساتھ پھیلانا نہیں جانتا، اس کی کتاب کو کباڑی کی دوکان سمجھنا چاہیئے۔ جہاں کام کی چیزیں تو مل جاتی ہیں مگر وجدان و نظر پریشان و مشوش ہو جاتے ہیں۔

۳۔ زبان و بیان کی نفسیاتی اور ادبی خوبیوں کا پایا جانا۔

شعر و ادب کی دنیا میں سارا کھیل الفاظ کا ہے۔ الفاظ اچھے اور دلکش نہ ہوں تو عمیق سے عمیق معنویت بھی بیکار ثابت ہوتی ہے۔

"الفاروق" میں یہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ علامہ شبلی مرحوم کی چشم جوہر شناس نے بہترین مواد فراہم کیا ہے، اردو فارسی اور انگریزی کیا عربی زبان میں بھی کوئی ایسی کتاب نہیں پائی جاتی جسمیں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات سے متعلق اس قدر مواد موجود ہو، مولنا ظفر علیخاں انگریزی میں "الفاروق" کا ترجمہ کر چکے ہیں، اور اب سے ڈیڑھ دو سال پہلے رسالہ معارف میں یہ اطلاع میری نظر سے گذری تھی کہ فارسی اور ترکی زبان میں بھی "الفاروق" کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ اردو زبان کی غالباً یہ پہلی کتاب ہے۔ جس کے ترجمہ کی طرف ترکی ادیبوں نے توجہ کی ہے۔

شبلی نعمانی کو مواد کے پھیلانے میں یدطولیٰ حاصل ہے اور اردو ادب میں عنوانات کی تبویب "chaptrisation" اور مضامین کی ترتیب کے تو وہ موجد ہیں۔ الفاروق میں خاص طور پر انھوں نے مضامین کے تنوع اور عنوانات کی ترتیب کا خیال رکھا ہے۔

تاریخ خشک مضمون ہے، مگر شبلی ان سنگلاخ وادیوں میں بھی پھول برساتے ہیں۔ اردو زبان میں ان سے بہتر شگفتہ قلم مورخ اب تک پیدا نہیں ہو سکا "الفاروق" میں زبان و ادب کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ سنجیدگی اور شگفتگی کا اتنا اثر انگیز امتزاج کم از کم اردو زبان کی تو کسی تاریخی کتاب میں نظر نہیں آتا۔

۲۔ میں پہلے شاعر ہوں اور اس کے بعد مضمون نگار، اس لئے فطری طور پر مجھے اپنی غزلوں اور نظموں کی کتاب عزیز ہونی چاہیئے۔ بعض لوگ مجھ سے ناراض ہیں کہ میں مضامین کیوں لکھتا ہوں، مجھے تو صرف شعر کہنے چاہئیں۔ آہ! دنیا تصویر کے صرف ایک رخ کو دیکھتی ہے!

میرے تنقیدی اور ادبی مضامین کا مجموعہ زیر ترتیب ہے اور مجھے اپنی یہی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے۔ ان مضامین میں ایک مضمون مذہب کے متعلق ہے، جو میرے کئی سال کے مطالعہ اور غور و فکر کا ماحصل ہے، بعض تنقیدی اور ادبی مضامین اور چند تخلیقی ہیں۔

بس اتنے سے اشارات ہی سمجھنے والوں کے لئے کافی ہیں، اس سے زیادہ کچھ کہوں گا تو

خود ستائی سمجھی جائے گی اتنا بھی میں نے ڈرتے ڈرتے لکھا ہے اور کیا عجب ہے کہ بعض عیب بینوں کا ذوق تنقید اب بھی مجھے الزام سے بری نہ کر سکے۔

(۳) اردو کے نثر نگاروں میں مجھے مولٰنا عبدالماجد دریابادی سب سے زیادہ پسند ہیں۔ دنیا میں ہزاروں شعراء اور مصنفین پیدا ہوتے ہیں مگر "صاحب طرز" دو چار ہی ہوتے ہیں مولٰنا عبدالماجد ایک خاص طرز کے مالک ہیں۔ آسان اور سہل زبان میں فلسفہ و علم و کلام کے مسائل بیان کرنا بس اُن ہی کا حصہ ہے۔ انکے مضامین میں سلجھاؤ ہوتا ہے اور اثر انگیزی کا تو یہ عالم ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا کافر ادب بھی ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کے سوالات کے جواب آپ کے مافی الضمیر کے مطابق دے ہیں، شاید آپ اسی قسم کی تفصیل چاہتے تھے۔ اپنے ان تمام ہم مدرسہ ساتھیوں سے میرا سلام کہئے جنھوں نے گذشتہ عصرانہ کے موقع پر اصرار کر کے بہت سی نظمیں مجھ سے سنیں اور میری گھبراہٹ کا یہ عالم تھا کہ بہ یک وقت آئسکریم اور گرم چائے پی رہا تھا۔ ؎

صدائیں دو مرے گزرے ہوئے زمانہ کو

۲۵ آبان ۱۳۴۲ء

مخلص ماہر القادری

از پروفیسر دستگیر رشید

مہربان من، السلام علیکم۔

آپ کے سوالات مطالعہ کا امتحان ہیں۔ میں مطالعہ سے نہیں بلکہ امتحان سے گھبراتا ہوں سارے طلبہ علم بھی اس کی تصدیق کریں گے مگر کیا کیا جائے۔ ع

بچتے رہے مگر نہ بچے امتحاں سے ہم

۱۔ اردو زبان میں میری چند عزیز کتابیں یہ ہیں:۔

رحمۃ اللعالمین۔ از مولٰنا سلمان منصور پوری۔ خطبات مدراس (از مولٰنا سید سلیمان ندوی) النبی الخاتم، (مولٰنا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)۔ آب حیات۔ قصص الہند، ہماری شاعری، پردہ، مقدمہ شعر و شاعری۔ شعر العجم۔ حسن معاشرت (ڈپٹی بشیر احمد مرحوم) بانگ درا۔ ضرب کلیم دلی کا سنبھالا۔ کلیات میر تقی میر۔ صراط الحمید (از مولوی الیاس برنی صاحب ناظم دارالترجمہ۔ منتخب داغ۔ دنیا کی کہانی۔

یوں تو میں درد میر، فکر اقبال، زبان داغ، اور انشاء آزاد کا گرفتار ہوں لیکن میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ سب سے زیادہ

عزیز کتاب کون ہے؟ البتہ میری عزیز ترین کتابوں میں سے ایک کتاب صراط الحمید ہے۔

اصل میں یہ مخدومی مولٰنا الیاس برنی صاحب کا سفرنامۂ حج ہے۔ یہ کتاب انتہائی لطیف واردات قلبی کا ایک غیر معمولی مجلیٰ آئینہ ہے۔ نفسیات اور احساسات کی نزاکتوں اور لطافتوں اور بلند حکمتوں کی ایک ایسی تعبیر ہے جسے دیکھ کر حیرت اور مسرت کے جذبات ابھا تھ پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے اشارات حد درجہ بلیغ ہیں۔ کتاب دل کی یہ ایک نہایت فطیح تفسیر ہے ایک صاحب نے اس کی بابت یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جو کچھ اس میں مندرج ہے۔ اس سے زیادہ اس کے بین السطور میں ہے۔ میں اس باب میں بھی اُس کا ہم خیال وہم نوا ہوں۔ یہ مطلب نہیں کہ کتاب انسانی نقص کا شائبہ تک نہیں رکھتی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ باوجود ان کمزوریوں کے فی الجملہ مجھے یہ کتاب حد درجہ پسند ہے۔ اس کی خصوصیات۔ حق۔ حکمت۔ سوز دل اور سادگی و پرکاری بیان؛

۲۔ میری اپنی مرغوب ترین تصنیف شمس معنوی ہے۔ یہ مولانا روم کے دیوان غزلیات پر تاریخی نقد اور ادبی تبصرہ ہے۔ تیسرا باب غزلیات کی روشنی میں مولانا روم کے مسلک تصوف سے متعلق ہے۔ میں نے شبلی مرحوم کی کتابوں سے فارسی شاعری کے مطالعہ کا جو ذوق پیدا کیا ہے اور بعض کیمیا اثر اہل نظر سے سلوک و تصوف میں جو نعمت پائی ہے۔ اس کا اظہار حتی الامکان حسن و خوبی سے اس کتاب میں ہوا ہے۔ بعض اہل کمال نے میری اس خوش گمانی کی آزادانہ توثیق فرمائی ہے۔

۳۔ اردو کے نقادوں میں مولٰنا شبلی؛ حالی اور پروفیسر مسعود حسن ادیب کا خاص طور پر معترف ہوں۔ نقد سخن میں شبلی مرحوم کو معیار جانتا ہوں میرے خیال میں شعر العجم، فن شعر کی تحسین و تنقید میں دنیا کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ سخن فہمی کا ایک شاہکار ہے۔ شبلی نعمانی مرحوم نے فارسی شاعری کا کلیجہ نکال کر کاغذ پر رکھدیا ہے۔ پروفیسر براؤن آنجہانی جیسے صاحب ذوق اور عالم نقاد بھی شعر فارسی کے بعض نازک مقامات کے تبصرہ میں شبلی سے استفادہ کرتے ہیں اور انھیں کا حوالہ دیتے ہیں۔ براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کا مطالعہ کرنے والوں کو اسکی مختلف مثالیں ملتی ہیں اس سلسلہ میں کسی نہ کسی حد تک زبان دل پر یہ شعر آہی جاتا ہے ؎

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان

غلام دستگیر رشید
استاد فارسی نظام کالج

نظام ادب

دسمبر ۱۹۴۲ء
۱۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء

از پروفیسر محمد مجیب

مکرمی۔

تسلیم معاف کیجئے گا آپ کے عنایت نامہ کا جواب لکھنے میں اتنی دیر ہوگئی۔ اس کا ایک سبب تو خاص اس زمانے میں میری غیر معمولی مصروفیت تھی، اور دوسرا سبب یہ تھا کہ میں آپ کے سوالات کا جواب جس تفصیل سے اور جس مقصد کے لئے آپ چاہتے ہیں نہیں دے سکتا۔

۱۔ کتابوں کی جو تقسیم آپ نے کی ہے وہ صحیح نہیں۔ نثر کی کتابیں سب ایک قسم کی ہوتی ہیں نہ نظم کی پھر کتاب کا عزیز ہونا کیا معنی؟ انجمن ترقی اردو کی لغت ہر وقت میری میز پر رہتی ہے اور دن میں کئی کئی بار میں اس کے ورق الٹتا ہوں اور کام کے الفاظ اس میں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہوں، بال جبریل سال میں چند بار ہی پڑھنے کا موقع ملتا ہے لیکن اس سبب سے اس کی قدر کچھ کم نہیں ہوتی۔ اب میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ ان دو کتابوں میں مجھے زیادہ عزیز کون سی ہے؟ یہ دونوں بالکل مختلف قسم کی کتابیں ہیں، میں تو یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ مجھے بال جبریل زیادہ عزیز ہے یا مثنوی اسرار درموز۔

۲۔ اسی بنا پر میں یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ مجھے نثاروں نقادوں میں کون زیادہ پسند ہیں علی اقدر مراتب فہرست مرتب کرنا میرے لئے ممکن نہیں اور شائد کسی کے لئے مناسب نہ ہوگا۔

۳۔ میں نے ایک دو کتابیں لکھی ہیں اور وہ شائع بھی ہو چکی ہیں لیکن ان میں اتنی خامیاں رہ گئی ہیں کہ ان میں سے کوئی اب مجھے پسند نہیں۔ یہ امید البتہ رکھتا ہوں کہ آئندہ اور کوئی کتاب لکھی تو اس میں اتنی خامیاں نہ ہوں گی، مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ امید پوری نہ ہوگی۔

نیازمند محمد مجیب

چلے بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم ✻ کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھیرے گا

تھمے تھمتے تھمیں گے آنسو ✻ رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

مصحفی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا ✻ ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

روح کے ساتھ ہی قالب میں قضا بھی آئی ✻ شمع آئی مرے گھر میں تو ہوا بھی آئی

اسیر

مُردے کی بپتا

مجھے بستر مرض پر پڑے ہوئے آج پورے انیس روز ہو گیے تھے۔ بیماری کچھ پیچیدہ تھی اس لیے فن طب کے نقطۂ نظر سے دلچسپ بھی۔ جہاں طبی نقطۂ نظر سے بیماری دلچسپ ہوئی تو سمجھئیے کہ مریض کی خیر نہیں۔ ایک ڈاکٹر نے ٹائیفائیڈ کی تشخیص کی دوسرے نے تپ محرقہ کے ساتھ ملیریا کا بھی جوڑ لگایا۔ تیسرے کی رائے میں ٹائیفائیڈ کے ساتھ ملیریا نہیں بلکہ ملیریا کے ساتھ ٹائیفائڈ تھا۔ کسی نے کہا بیمار کے جسم میں خون کی کمی کی بھی شکایت ہے اور غذا کا بدل، تحلل نہیں ہو رہا ہے۔ ایک اور کا خیال تھا کہ دل کی کچھ خرابی ہے۔ ایک حکیم کی رائے میں جگر متورّم اور گُردے خراب ہونے سے حرارت ہو گئی تھی۔ غرض ڈاکٹر کچھ کہتے تھے، حکیموں کا کچھ کہنا تھا، ہومیوپیتھی کی کچھ رائے تھی، ہر ایک کی تشخیص الگ الگ اور ہر ایک کا علاج جُدا جُدا۔ مگر ان اختلافات کے باوجود سب اس پر متفق تھے کہ مریض مشکل سے جانبر ہو سکے گا۔ ہر چند مریض ان سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا مگر یہ سب پیسے یا فن کی دلچسپی کی خاطر ملک الموت کی طرح اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ حرارت ۱۰۵ درجے تھی۔ پسلیوں کے نیچے درد اور جسم تمام زرد ہو گیا تھا اور حالت خراب ہو رہی تھی۔ اگرچہ لوگ میرا حال مجھ سے چھپاتے تھے مگر مختلف علامتوں اور تیمار داروں کے چہرے بُشرے سے مجھے اپنی نزاکت حال کا احساس ہو رہا تھا کہ نہ ٹلنے والی گھڑی قریب آ گئی ہے۔ دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا اور طاقت برداشت جواب دینے لگی۔ آخر میری بے چینی و اضطراب کو دیکھ کر ایک لمبے تڑنگے تجربہ کار ڈاکٹر نے جس کی وجاہت ملک الموت سے مبارز طلبی کر رہی تھی، پچکاری کے ذریعے کچھ خواب آور دوا میرے جسم میں داخل کی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور بے ہوشی طاری ہو گئی۔ مجھے ایسا نظر آیا کہ ایک طرف تو میں مر رہا ہوں اور دوسری طرف اس جاں بلب مریض کے سرہانے کھڑے ہو کر اس کی بے بسی اور لاعلاجی پر آنسو بھی بہا رہا ہوں۔ اتنے میں اسی ڈاکٹر نے بائیں ہاتھ پر ایک اور پچکاری دی جس سے میرے دل و دماغ میں ایک جُھرجُھری سی معلوم ہوئی۔ اور ایک ایسی کشمکش کا احساس ہوا کہ عقل انسانی نے اپنے سارے وسائل کے ساتھ مجھے موت کے پنجے سے چھڑانے کی آخری کوشش کی۔ میرا سفینۂ زندگی موت و حیات کے تلاطم میں جھکولے کھانے لگا۔

لیکن پھر یہ وسواس ہوا کہ یہ کیفیت اس سنبھالے کے سوا کچھ نہیں جس کے بعد مریض جاں بلب کو چند نفس ہی جینے کی اجازت ملتی ہے۔ اس حالت میں میں نے دیکھا کہ میری رفیقۂ حیات میرے قریب بیٹھی ہوئی امید و بیم کی حالت میں میرا منھ تک رہی ہے۔ میرے دوست اور عزیز جن کو میرے آخری وقت کا یقین ہو چکا تھا کمرے سے باہر اداس کھڑے تھے۔ بچوں کو کمرے کے اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس وقت دو خیال میرے دماغ میں گھوم رہے تھے جن کا سلجھانا میرے امکان سے باہر تھا۔ کیا یہ دنیا، یہ شکلیں یہ شہر، یہ سامان، یہ مکان جس میں میں رہتا ہوں، یہ پلنگ جس پر میں لیٹا ہوں، میری بیوی بچے، دوست احباب، گوشت پوست جس کو میں اپنا کہتا ہوں، یہ تمام احساسات اور خیالات جن سے میری ذات مراد ہے، کیا یہ ساری کائنات میرے آخری دم کے ساتھ طلسم ہوشربا کی طرح آناً فاناً غائب ہو جائے گی؟ پھر میری پیدائش میری زندگی اور زندگی کے ان سارے بکھیڑوں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ شاید قدرت کا چلبلا پن! ستم ظریفی! یا بیکار نہ رہ سکنے کی مجبوری! اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے!

دوسرے خیال کا اظہار میں نے کچھ رکتے ہوئے اپنی رفیقۂ حیات سے اس طرح کیا۔

دلربا!! - میری آنکھوں کے پردے — اٹھ رہے ہیں — کیا بتاؤں میری زندگی — ہائے میری زندگی کس قدر بے کار گئی — میری قوتیں جو غریبوں کو لوٹنے — اپنے اور اپنے بال بچوں کے پیٹ کا — دوزخ بھرنے میں صرف ہوئیں — کاش وہ ذہن انسانی کو غلامی سے چھڑانے — اہل دنیا کو سکھ چین کی زندگی کا راستہ دکھانے — اور انسان کو فاقہ اور موت — اور غلط خیالات وعقاید کے خوف اور ڈر سے — نجات دلانے میں کام آتیں! ہائے کیا میرا جینا — میری زندگی ایک فریب تو نہیں تھا؟ — یہ علم و عمل یہ فنِ ادب — یہ عمر بھر کی عبادت و ریاضت — کیا یہ سب بے کار تو نہیں گیا!؟ — کیا موت کے بعد — کوئی اور زندگی ہے بھی کہ نہیں! — کیا وہاں میرے اعمال کا — میرے گناہوں کا احتساب ہو گا بھی کہ نہیں! — افسوس! افسوس!!

اس کے ساتھ میرے رخسار پر آنسو ڈھلکنے لگے اور میری ڈاڑھی بھیگ گئی۔ میں کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ میرے پاؤں کا دم کھنچ گیا۔ اور نچلا دھڑ تقریباً بے حس و بے جان ہو گیا۔ میری جان کھنچی جا رہی تھی۔ ایک بزرگ سرھانے بیٹھے یٰسین پڑھ رہے تھے اور کبھی کبھی حلق میں نبات کا پانی چوا رہے تھے۔ بالآخر ایک جھٹکا سا محسوس ہوا اور رشتۂ زندگی جو اتنی دیر تک موت اور زندگی کی کھینچا تانی میں تھا، چٹ سے ٹوٹ گیا۔ اس کے ساتھ میں نے ایک عجیب ناقابل بیان بے کیفی سی محسوس

کی گویا کسی نے سنترے کی پھانکوں سے رس نچوڑ لیا یا تلوں سے تیل نکال لیا ہو۔ حواس کا چراغ گل ہو گیا اور میرے اطراف میلوں دور اندھیرا تھا۔ جذبات کا تھرمامیٹر بھی ٹوٹ گیا اور میں ایک بے حس گوشت پوست کا لوتھڑا اور ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گیا۔ اُن بزرگ نے جو یٰسین پڑھ رہے تھے نبض ٹٹول لی پھر میری آنکھیں بند کر کے منھ پر چادر اڑھا دی اور میرے ہاتھ پیر سیدھے کر دئے۔ جو نہی گھر میں میرے مرنے کی خبر ہوئی۔ ایک کہرام مچ گیا۔ ایک قیامت بپا ہوئی اور گریہ و ماتم کے تلاطم سے گھر کے در و دیوار لرزنے لگے۔

کسی نے دھاڑیں مار کر پکارا! "میرے باوا!"
کسی نے چیخ ماری! "میرا بیٹا!"
کسی نے سسکی بھر کر کہا! "میرے سرتاج!"

ان ماتم کرنے والوں کی آہ وزاری پر میں دل ہی دل میں سوچتا تھا کہ ان احمقوں کو کس طرح سمجھاؤں کہ آپ لوگوں کے چیخنے چلانے اور رونے کی آواز میرے کانوں تک نہیں آتی ہے۔ آپ لوگ کیوں تکلیف کرتے ہیں میں زندہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ کو مختصر کرتا ہوں رونے دھونے، تجہیز و تکفین اور تسبیح و تحلیل کے وہ تمام مراحل طے ہوئے جو اس قسم کے موقعوں پر ہوتے ہیں۔ اس تمام کارروائی پر نظیر اکبرآبادی کے یہ اشعار پڑھنے کو جی بہت چاہتا تھا ؎

مرتے ہیں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کار و بار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بالآخر مجھے قبر میں اتار کر لوگ اپنے اپنے گھر سدھارے مگر اس موقع پر ایک بزرگ نے اس قدر طویل فاتحہ پڑھا کہ زندہ تو زندہ ہیں مُردہ بھی اس طوالت سے قبر میں گھبرا اٹھا۔ خیر صاحب، جب یہ ساری مصیبتیں ٹلیں تو قبر میں ہم ہی ہم رہ گئے اور اس انتظار میں کہ قبر کے فرشتے اب آتے ہی ہوں گے اور سوالات کا دفتر اب کھلتا ہی ہوگا۔ یہاں یہ عجیب بات کہنے کے قابل ہے کہ دنیا کی جتنی باتیں جو مجھے اس سوال و جواب کے متعلق یاد کرائی گئی تھیں ان میں سے ایک بات بھی یاد نہیں پڑتی تھی۔ اور میرا ذہن اُس تختی کی طرح صاف نظر آتا تھا جس کو بچوں نے بہت کچھ لکھ لکھا کر پانی سے پونچھ دیا ہو۔ اگرچہ اس سے مجھے ایک طرح کی بھول اور بے چینی سی محسوس ہوتی تھی مگر دوسری طرف ایک ایسا آرام بھی نصیب ہوا جو کبھی دنیا میں نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک

ایسا عالمِ نسیاں تھا جو دنیا میں کسی شراب کی مدہوشی، کلوروفارم کی بے ہوشی، خواب کی گرانی یا نشۂ دولت کی سرمستی و اطمینان میں بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اگر دنیا کے شور و شغب اور زندگی کی دوڑ دھوپ کے بعد منزل گور محض اس عالمِ نسیاں اور مسکن آرام کا نام ہے تو کم از کم مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔ غرض اس عالمِ نسیاں میں پڑے ہوے نہ معلوم کتنے مہینے یا سال گذر گئے —— کیونکہ مرنے کے بعد وقت کی رفتار کا احساس باقی نہیں رہتا —— قبر میں نہ کوئی آیا اور نہ سوال جواب ہوا۔ جس سے مجھے یک گونہ مایوسی ہوئی۔ کیا اعمال کی جزا و سزا ہوگی بھی کہ نہیں؟ خیر کیا مضایقہ ہے، دنیا میں اس بندۂ خدا نے بھی تھوڑے گناہ کئے ہیں! اگر حسنِ عمل کی جزا نہیں تو پھر گناہوں کی بھی پرستش نہ ہوگی۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اس خیال سے کچھ خوشی سی ہوئی۔

اس عالم میں رہتے کتنے ہی دن گزرے ہونگے کہ مجھے پھر ایک طرح کی بے چینی معلوم ہونے لگی۔ میرا تمام جسم آگ اور گرمی سے پھنکنے لگا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی میں نمک کی کنکری کی طرح گھل رہا ہے غرض جسم کا بند بند ٹوٹنے لگا اور پوست تو پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا اب گوشت بھی ہڈیوں سے چھوٹنے لگا۔ ایک قسم کی ناگوار بو سے میرا دماغ پھٹا جاتا تھا۔ اور میرے جسم کی گیا میں نکل کر زمین کے مسامات میں پھیلنے لگیں، جن سے نہ معلوم روئے زمین پر کتنے نباتات غذا حاصل کر رہے تھے۔ اس کے کچھ دنوں بعد میرے سارے بدن میں ایک کلبلاہٹ سی محسوس ہوئی اور ایسا معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک، منھ، کان غرض سارے تن بدن میں لاکھوں ننھی ننھی مخلوق کلبلا رہی ہے۔ مجھے اپنی اس گوشت پوست کی عجیب و غریب تبدیلی پر کچھ حیرت سی ہوئی اور کچھ رنج بھی ہوا۔ میرا جسم تحلیل ہو کر دوسرا جنم بدل رہا تھا۔ اور حشرات و جراثیم کی ایک نئی دنیا تشکیل پا رہی تھی۔ اس موقع پر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری زندگی کا کچھ حصہ اس نئی زندگی میں منتقل ہو رہا ہے۔ اور میں پہلی زندگی سے تو جدا ہو ہی چکا تھا اب دور بہت دور ہو رہا ہوں۔

کسی صاحب نظر نے خوب کہا ہے کہ فطرت کے نعمت خانے میں ہر چیز کبھی کسی کو لقمہ بنا لیتی ہے کبھی خود لقمہ بن جاتی ہے۔ چھوٹی مچھلی جو ہزاروں ہوام و حشرات پر پرورش پاتی ہے بالآخر بڑی مچھلی کا لقمہ تر بن جاتی ہے۔ بناسپتی پر پرورش پانے والے ڈھور اور چوپائے مرنے کے بعد کرگس اور زاغ و زغن کے جسم کو موٹا کرتے ہیں۔ نباتات سڑ گل کر دوسرے نباتات کو غذا بہم پہنچاتے ہیں۔ اور پھر اپنی حیات کا ایک اور روپ بدل کر حیوانی زندگی کا روپ بھر لیتے ہیں۔ اسی طرح تمام اجسام و عناصر سدا اپنی شکل و صورت بدلتے رہتے ہیں۔ اسی تبدیل صورت و ہئیت کا نام دورِ حیات ہے

اور زندگی کے سارے کاروبار، سارے مظاہر اسی چمن کے گل بوٹے ہیں۔ اور ہر نئی شکل پرانی شکل کی گود میں جنم لیتی اور روپ بدلتی رہتی ہے۔

یہ نظریہ کچھ اور سہی مگر آواگون کا مسئلہ نہیں ہے۔ آواگون یا تناسخ کا مسئلہ اس تسلسل کی تفصیل ہے اور بس کہ جو آگ کھائے گا وہ انگارے اگلے گا۔ یہاں اس اجمال کی تفصیل کی گنجایش نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ مجھے اپنی ہئیت کی تبدیلی پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل و دماغ پر (استعارتاً کیونکہ دل و دماغ اب تک سڑ گل چکے تھے) خواب کا ایک گہرا اور تاریک پردہ پڑا ہوا ہے جس کی اوٹ میں میں اپنی زندگی کے نئے کھیل کے لیے روپ بدل رہا ہوں۔ وہی روپ جو دنیا کے اسٹیج پر فطرت کی ہر چیز منظر کی تبدیلی کے موقع پر بھرتی ہے۔

اب مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میرا جسم بوٹی بوٹی ہو کر (پھر وہی استعارہ) اور میرے خیالات و محسوسات پارہ پارہ ہو کر بن کی آگ کی طرح فضائے بسیط میں پھیل رہے ہیں۔ اس طرح میرا وجود کائنات کے ذرّہ ذرّہ کے وجود سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ اس جسم کی قید سے آزاد ہو کر فضائے عالم میں گم ہو جانے کا مجرد خیال ہی آہ کتنا دلنواز اور فرحت بخش ہے!

اس کے بعد کیا ہوا میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ البتہ ایک موقع پر نہ معلوم کتنے زمانے کے بعد جب کہ ایک دوشیزۂ بہار ایک گلاب کے تختے میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی نکلی اور ہاتھ بڑھا کر ایک پھول کو چٹ سے توڑ کر بالوں میں لگایا تو مجھے دل میں کچھ کسک سی معلوم ہوئی جس کو عاشقوں کی زبان میں غالباً دردِ عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس وقت مجھے اپنے پہلے انسانی وجود کا کوئی شعور یا احساس باقی تھا۔ یا کوئی ایسی کیفیت جس کو عشق سے موسوم کرتے ہیں طاری ہوئی۔ کہاں کا شعور! کیسا عشق! شعور و احساس کا سلسلہ تو انسانی شکل میں جس قدر مکمل ہوتا ہے اس کا عشر عشیر بھی کسی اور شکل میں نہیں ہوتا اور اپنی خودی و ذات کا تصور انسانی دماغ میں جس قدر پورا اترتا ہے اس قدر کسی اور چیز میں نہیں اترنے پاتا۔

اس کے بعد نہیں معلوم میں کس کس شکل میں، کہاں کہاں، کتنے سال بھٹکتا پھرا۔ قرن ہا قرن کے بعد ایک مرتبہ آم کے موسم میں ایک پرند آم کے درخت پر بیٹھا ہوا ایک پکے آم پر ٹھونگیں مار رہا تھا کہ مجھے کچھ ہوش سا آنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی کمرہ ہے، وہی بستر اور وہی ڈاکٹر جس نے مجھے خواب آور دوا کی پچکاری دی تھی، اب ہوش میں لانے والی دوسری پچکاری میرے گوشت میں ٹھونس رہا ہے۔

میرے دوست مرزا صاحب بازو کھڑے ہوئے دبی زبان سے کہہ رہے تھے ۔

کہو بھئی کلیم ! اب طبیعت کیسی ہے !

بشیر احمد طاہر
سابق طالب علم نظام کالج

غزل

تم ہو اور مشق جفا کاری ہے　　ہم ہیں اور پاس وفاداری ہے

دل بہل جاتا ہے اس سے دم بھر　　تجھ سے تصویر تری پیاری ہے

تیرے بیمار پہ اے رشک مسیح　　آج کی رات بہت بھاری ہے

ہے جو بیمار چمن میں نرگس　　تیری آنکھوں کی فسونکاری ہے

کیسے جانبر ہو فہیمِ مجروح
زخم او چھا سا نہیں کاری ہے

ہیم چندر پرشاد فہیم
سینیر بی۔اے

نئی نسل سے خطاب

انتشار خیال کے اس دور میں جبکہ جدید رجحانات قدیم معتقدات کی جگہ لے رہے ہیں ممکن ہے کہ نوجوانوں کے لیے اِک ایسے شخص کے عمیق تجربات کا بیان مفید ہو، جو تمام عمر نفس حیات کا ایک سرگرم مطالعہ ران رہا ہے،

مہد سے لے کر لحد تک فطرتاً ذہن انسانی طلب علم میں سرگرداں رہتا ہے، اور اس جستجو میں حقایق کو جانتے اور اُن کو بہ اغراض مختلف، مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دینے میں وہ اُن سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا، اس طریقہ سے خیال اور احساس گھل کر ایک دوسرے کے شریک بن جاتے ہیں، اور انسان جوں جوں منازل زیست طے کرتا ہے اُس کی فطرت کے اخلاقی (روحانی کہنا کیا بے جا ہوگا؟) پہلو کی خود بخود تربیت ہوتی رہتی ہے۔ مذاق، ماحول، اور طبعی رجحانات ہر ذہن کی اختیاری صلاحیت کی رہبری کرتے ہیں اور یہ تمام عناصر ایسے مواد کی فراہمی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں جو اُس کے قلب کی تشنگی کو بجھانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوں، اس پیش رفت میں احساسات بروئے کار آتے ہیں اور تصورات متشکّل ہوتے ہیں، یہ محمود بھی ہوتے ہیں، اور نامحمود بھی، جیسا کہ تدریجی احوال عالم سے ثابت ہے۔

آج بدقسمتی سے اہرمنی قوتیں اتنی بے باکی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اقوام کی یہ مجنونانہ ہوس کہ دوسری قوموں پر تفوق حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی تخریبی صلاحیتوں میں اضافہ کریں۔ اپنی تمام خوفناکیوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے کار فرما ہے اور یہ تہذیب و تمدن ہی نہیں۔ خود عالم کائنات و تباہی کی دعوت دے رہی ہے۔؟!

کیا ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ، جدید یورپ نے اخلاقیات کو ٹھکراتے ہوئے مذہب کو مسترد کرتے ہوئے، اور کروڑوں کا خون بہاتے ہوئے خدا کو معزول کرنے کی اُمید باندھی ہے، اگر صدہا سال کی ترقی کے بعد اُس نے یہی سبق حاصل کیا ہے تو کیا ہمارے واسطے یہ انسب نہ ہوگا کہ ہم زندگی کے دوسرے خاکوں اور اخلاقیات کے دوسرے پیمانوں کی جانب بروقت توجہ منعطف کریں،

آئیے پہلے یورپ ہی کے شاندار ماضی پر نظر ڈالیں جو ہماری پسندیدہ خاطری کے لیے عالم انسانیت کے

چند اعلیٰ ترین کارنامے فراہم کرتا ہے۔ یونان و روما کے مہتم بالشان زمانوں کے بعد عقیدت اور شریفانہ جرأت کے مسیحی یورپ کا دور آتا ہے۔ قدیم تمدن اور مسیحیت کے خوشگوار امتزاج کے اثر کے طور پر اعلیٰ خیالی اور عالی کرداری کا یورپ۔ اور ایک نوبت ما بعد پر اصلاحی تحریکات و نشاۃ جدیدہ نے اسی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ لیکن بہ حیثیت مسلم ہمارا حقیقی واسطہ اک جداگانہ عہد پر نظرِ بازگشت ڈالتا ہے جب ساتویں صدی عیسوی میں پھر ایک مرتبہ مشرق سے ایک آفتاب انوار نے طلوع ہو کر یورپ کو جگمگا دیا، اور اسی نور کے فیضان نے تاریخ میں اجتماعی حرکت ملّی کی نادر ترین اور رفیع الشان مثالیں فراہم کیں، یہ اسلام کا ابتدائی عہد ہے، جو دل و دماغ دونوں کو موہ لیتا ہے۔

کیا آپ مجھے یہ بیان کرنے کی اجازت دیں گے کہ مجھ پر حقیقت جمال اور جمالِ حقیقت کی جستجو میں کیا بیتی ہے، اور کس طرح میں زندگی کے اقدار کی تخمین، ثانی کرتا یورپ سے عرب تک گیا مجھے موضوع سے ذرا ہٹنے کی اجازت ہو تو میں کہوں کہ اس طرح میں اپنے بعض داخلی خیالات و احساسات کو بطور پیامِ دل بہ دل پہنچانے کا خواہاں ہوں!

کیمبرج کی طالب علمی کے زمانے کے بعد سے میں ہزاروں فرسخ گزر چکا ہوں، میں نے زندگی کے متعدد رخ دیکھے ہیں اور تخیل تصور اور تیقن کے مختلف مرحلوں سے گزرا ہوں۔ اور چونکہ طفلی ہی سے میں یونان و روم اور اُن کی عظمت کا مقر رہا ہوں، اس لیے تقابل میں میرے نامنصف ہو جانے کا امکان نہیں۔

اک زمانہ تھا جب میں تصورِ حسن کی ایک ایسی دنیا میں رہنا پسند کرتا تھا جہاں شاعری مذہب کی تخلیق اور زندگی کا سامان فراہم کرتی تھی، اور اُس وقت ہومر، ورجل، پلوٹارک کے مافوق البشریت انسانوں کے درمیان رہنا بڑی چیز معلوم ہوتا تھا۔ اُس زمانہ میں ہوریس کی شاعری کا "فلسفہ نشاط" اور انڈیمین کیٹس کے "فردوسِ خیال" کی چاہت بڑی کیف آور معلوم ہوتی تھی، یہ دور رفیع الشان اور لذت بخش تھا، لیکن یہ میری زندگی کو "بار امانت" اور مذہب کو "اعتقادِ کامل" کی حیثیت سے پہچاننے سے قبل کا دور تھا۔ یہ اُس سے بھی بہت پہلے کا دور تھا جب میں نے یہ جانا کہ "یقینِ محکم" ہی دلوں کو گرمی بخش سکتا ہے اور فکر و نظر میں صداقت و حقیقت کا نوری اور بے پناہ شعور پیدا کر سکتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد میں نے یورپ کی تہذیب کا مطالعہ اس کی بہترین شاعری اور فنونِ لطیفہ، اس کے اعلیٰ فلسفے اور اخلاق، کے توسط سے شروع کیا

اور یہ جنگ و بہ امن اُسی کی کامرانیوں میں سرور محسوس کرنا سیکھا، ایک زمانہ حقیقتاً ایسا بھی تھا جب یورپ کے کارناموں کی پسندیدگی نے میرے اپنے بیش قیمت ذخائر کے متعلق میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا، لیکن آج تجربہ نے صداقت حقیقی کا معنٰی تر اور اک بخش کر مجھ کو فیصلہ قطعی کرنے کا زیادہ اہل بنا دیا ہے۔

تاریخ یورپ کا عظیم الشان منظرستان میری آنکھوں کے روبرو ایک حیران کن تصویر کی مثال عیاں ہے میں انسانی خیالات، خواہشات اور توقعات کو اداروں، مملکتوں اور سلطنتوں میں متشکل ہوتے دیکھتا ہوں، میں ان کے عروج و زوال پر نظر کرتا ہوں اور ان میں رواں خوب و ناخوب عناصر کی غیر مرئی رو کا سراغ لگانے کا خواہاں ہوں، میں اس کے لیے بھی بے چین ہوں کہ ابدی مسرت کو رفتنی خوشی سے، مفید کو غیر مفید سے اور منفعت بخش اثرات کو مضرت رساں عناصر سے علیحدہ کروں، میں نے اکثر ایسا احاطہ کیا ہے، اور میں اعتماد خاص کے ساتھ اعلان کر سکتا ہوں کہ ساتویں صدی عیسوی کے مسلمان عرب کی عظمت اپنی اعلیٰ ترین پاکیزگیوں کے ہمراہ، یونان، روما، ازمنۂ وسطیٰ یا یورپ جدید کی عظمت سے بلند تر ہے کیونکہ اس کی بے مثل خصوصیت یہ ہے کہ حق کے سوا کوئی اور مدعا اُس کی اساس نہیں۔

یونان و روم کے قومی محصلات کی اساس شاذ ہی اخلاقی ہوتی تھی اور مسیحی یورپ کے کارنامے بھی بیشتر اس بات میں پیچھے ہیں، مذہب کی آغوش سے اُبھرنے والی اسلامی تہذیب نے اخلاقی گیرائی کو اپنی کامرانی کا حقیقی آلہ بنایا مجھ کو کسی دوسری قوم کی تاریخ میں اس کا بدل نہیں ملتا نہ میں کسی زبان کے ادب میں کوئی ایسی شے پا سکا جو حق کے نفاذ کے لیے اس قدر مضبوط عقیدے ایسے ایقان ابدیت، اس طرح کی متحدہ ملی حرکت اور اس معیار کے کارنامہ ہائے جرأت و ایثار کو ابھار کر بروئے عمل لانے کا سبب ہو جیسا قرآن کریم کی دل ہلا دینے والی آواز اور رسالتمآب صلعم کی ذات کی اعلیٰ مثال ہے۔ ہم ایک ملت کی ملت کو اس شاہراہ پر گامزن دیکھتے ہیں۔

یورپ میں پہلے یا بعد ایسی آواز کبھی نہیں سنی گئی جو ایک ملت کی ملت کے دلوں کو ایسے اعلیٰ خدمات کی برقی رو سے گرمانے میں اتنی با اثر ثابت ہوئی ہو جتنی قرآن کریم کے پیام کی معجز نمائی، اس نے ریگستان کے وحشی عربوں کو یہ محسوس کرا دیا کہ وہ منتخبہ اُمت ہیں، جو خدا کی جانب سے یقین محکم و عمل صالح کی قوت کی بنیاد پر دوسری تمام قوموں پر سربلند کیے گئے ہیں وہ ہمیشہ خدا کو حاضر اور اس کے رسول کو ناظر جانتے تھے اور اسی نے ان کو صادق العمل، بہادر اور ناقابل تسخیر بنایا

رسالتمآب صلعم کی پھونکی ہوئی روح اُن کے دنوں میں فروزاں تھی، میری نظر سے اور کسی ملک یا دور کی کوئی ایسی تاریخ نہیں گزری جس میں مماثل حالات کے تحت مماثل نتائج ظہور پذیر ہوئے ہوں، بالیقین ہم ایک قابل افتخار ماضی کے وارث ہیں،

مجھے تاریخ میں کوئی اور مثال بتائیے جہاں قوم کی قوم صرف خدا کے احکام کی تعمیل کے لیے مثل فرد واحد اُٹھ کھڑی ہوئی ہو، دنیا کے عظیم الشان واقعات میں سے ایک بھی ایسا واقعہ بتائیے جو ایسی تصویر پیش کر سکے، کیا عہد جدید کا باخبر انسان اس کو ترقی سے موسوم نہ کرے گا یا وہ اپنے نیم تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ بھائیوں کو ان واقعات سے بے خبر رکھنا پسند کرے گا، اور ترقی کا نصب العین اُسی میں پانے کا کوشاں رہے گا جس سے خود یورپ آج دست بردار و کنارہ کش ہو رہا ہے،

دین میں جب میں فلسفہ سے یقین کی طرف اور تاریخ میں مغرب سے مشرق کی طرف رخ کرتا ہوں تو ریگستان عرب کی تپتی ہوئی زیر پا ریت اور چمکتا ہوا بالائے سر آسمان اپنے پیغام سے مجھے گرما دیتا ہے، وجود باری تعالیٰ سے اس میں جان پڑ جاتی ہے۔ اور خاک کے ذرات یقین کی ضیا پاشی کرتے ہیں اور مسافر اپنے قلب کی عمیق ترین گہرائیوں میں یکسر بے چارگی اور حرماں نصیبی کے بجائے اعتماد اور امید کے احساسات موجزن پاتا ہے، نیز یہ اقرار کرنا سیکھتا ہے کہ نادیدہ ربّانی برکتیں حیطۂ شمار سے باہر ہیں۔ اس وقت وہ عرب کی تاریخ اپنی آنکھوں کے سامنے مرتب ہوتے دیکھ سکتا ہے، قرآن کریم کا لایا ہوا وہ تسلی بخش پیغام جو ملائے اعلیٰ سے لمعہ نور کے مثل اتر کر بے چراغ دلوں کو خوشی کی کرن سے جگمگا گیا، عرب کے وجدان اور عرب کے اقتدار کا سرچشمہ تھا اور وہ تاریخ صحیح طور پر محیر العقل ہے جو چند برسوں کی قلیل مدت میں ایسے مہتم بالشان کارناموں سے پر ہو گئی جو روم کے کارناموں سے اگر بلند نہیں تو اُن کے ہمدوش ضرور ہیں اور یہ کارنامے سکندر اعظم کی عریض و جلیل الشان فتوحات اور روما کی وسیع و رفیع المرتبت قلمرو سے عریض تر اور وسیع تر رقبہ روئے زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اسلام کی روحانی قوت از کار رفتہ نہیں۔ آئیے اب ہم عالمگیری سے ہٹ کر عالم سازی پہ نظر ڈالیں، ہم اسلام کو اخوت کی ٹھوس بنیادوں پر ربّانی رہ نمائی کے زیر اثر ایک سچی عمومیت اقوام و ملل پر منتج ہونے والے طریقہ سے حکمراں پاتے ہیں۔ میں ہر تعلیم یافتہ مسلمان سے جواب مانگتا ہوں کہ کیا تاریخ میں اس سے قبل بھی کوئی ایسی چیز تھی، فلسفہ، فنون اور ادب ان تمام گہرائیوں میں ڈوب

جن پر مغربی تمدن کی بنیاد رکھی گئی ہے اور یورپ کے سارے علم اور ساری گیرائی سے سیراب ہو کر تشنگی بجھانے کے بعد بھی شاید ہی کوئی مسلمان ہو جو اس کے متعلق یگانگت کا احساس کر سکے۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ اپنے ہی اسلاف کے کارناموں کو عزیز رکھے۔

نوعمری میں میں نے بیگانہ ذرائع (alien sources) سے جو کچھ وجدان حاصل کیا وہ تمام و کمال ناشنود (second hands) تھا۔ اور اب میرا ایقان ہے کہ سچا وجدان صرف انھیں سرچشموں سے مل سکتا ہے جو منجانب اللہ ہمارے ہیں مستعار فیضان کا مصنوعی طور پر توانائی دادہ نقش کے مانند سربسجود ہو جانا موت کی طرح یقینی ہے۔ میرے اس پیام کا لب لباب یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے کوئی چیز اتنی صحیح طور پر عمل آفریں نہیں جتنا اپنے شاندار ماضی کا تصور زا مطالعۂ مذہب کے وجدان سے مستفیض ہو کر ہم نے ترقی کے ایسے بہت سے منازل طے کیے جن کے نشانات آج بھی دلیل راہ ہیں، پس میرا پیام یہ ہے کہ جدید چھچھلی تعلیم کے زیر اثر ہم کو جلد بازی سے کام لے کر ان کی رہنمائی کے زیر اثر جو دانستہ یا نادانستہ طور پر ہم کو بھٹکا رہے ہیں، مصنوعی رجحانات کے پیچھے سرگرداں نہ ہونا چاہیے یاد رکھیے کہ اس سمت میں ہماری تمام مساعی ہم کو تقلید خام کی حد سے آگے نہیں لے جا سکتیں اپنے رجحانات کو حقیقی زندگی سے ہمکنار کرنے کے لیے ہم کو اپنے ان ذخائر سے اکتساب قوت چاہیے جو مدتوں سے ہماری بے توجہی اور غفلت کا شکار ہیں اور اگر ہم کو ترقی کے منازل طے کرنے کی خواہش ہے تو پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھنا چاہیے۔ تاریخ و تجربہ دونوں کا سبق یہ ہے کہ سچی ترقی کے لیے داخلی گیرائی لازم ہے اور گیرائی عاریت نہیں لی جا سکتی، خود نمو پذیر ہونا چاہیے۔

ان امید کش اور مایوس کن ایام میں یہ خیال بڑا طمانیت بخش ہے کہ اسلام اب بھی دنیا کو حاجت روا پیغام دے سکتا ہے کہ حق کو اقتدار کا حامی ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ محض بہیمانہ قوت میں زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ بعض یورپین مصنفین خواہ کتنی ہی غلط بیانی سے کام لیں مگر اسلام نے سچی ترقی کی راہ دکھا دی ہے اور اسلام اب بھی یورپ کو خوشحالی کے لیے دنیا برتنا سکھا سکتا ہے۔

ارسطا طالیس پہلا شخص تھا جس نے سیاسیات کی بنا اخلاقیات پر رکھنے کی ضرورت کو نمایاں کیا۔ اسلام نے سب سے پہلے عملی کامیابی کی حیثیت سے اس کو ثابت کر دکھایا اس فلسفی کی مثالی حکومت کی اکائی ایک صالح شہری تھا (فلاطیس) اور شہری کو صالح بنانے کے لیے اس نے ہوشیاری سے مطابق اخلاقی ضوابط کے نظام کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اس طرح اس کے نظریہ کے مطابق سیاسیات متعدد

اچھے شہریوں کے متحدہ حرکت وعمل کا نام تھا جس میں "انفرادی عمل صالح" اجتماعی بہبود کی خاطر "ملی عمل صالح" کی شکل اختیار کر لیتا تھا، یہ سچی عمومیت تھی۔ اور اسلام نے اُس کو صرف اک کلمۂ ایمان سے حاصل کر لیا، اس نے انسان کے دل میں صالحیت کی خواہش قوی پیدا کی اور تمام مسلمانوں کو اچھا شہری اور عمدہ سپاہی بنا دیا، رسول کریم کے صحابۂ کرام آخرالزماں صلعم کی مثال وہدایات کے تربیت یافتہ ہوکر مختصر سے بلدمدینہ کے اچھے شہری بنے، جو اسلامی حکومت کا مرکز تھا، اور پھر انھوں نے اپنے اثر اور اپنی مثال سے صالحیت حیات کے لیے دوسروں کی تربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ گروہ وسیع ہوتا گیا تا ایں کہ اس نے اسلام کی فوجوں اور اسلام کے مفتوحہ علاقوں اور حکومتوں کو محیط کر لیا اور اس طرح اچھے شہریوں سے بالآخر وہ عمدہ حکومت مترتب ہوگئی، جو اسلام کا نصب العین تھی۔ یعنی ایک حق پرست مساویانی جمہوریت۔

کیا ترقی کا کوئی تصور اس سے زیادہ کامیابی سے حقیقت پذیر ہوسکتا تھا، آخر آج ایسی مثال کے متعلق ہمارا جوش کیوں سرد پڑ گیا ہے، جب یورپ خود اس کی پسندیدگی کا اعتراف کر رہا ہے۔ ہم اُن بیگانہ مثالوں کی تلاش میں اس قدر اضطراری طور پر کیوں افتاں وخیزاں ہیں۔ جو جلد ہی مسترد کر دی جائیں گی اور کیا ہم اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں کہ چونکہ یورپ زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ متمدن ہے اس لیے وہ جو کچھ کرتا ہے وہی خوب ہے کیا آزمایش اور انتخاب کی جگہ ہم محض نقالی کے متمنی نہیں یاد رکھئے کہ حقیقی تعلیم کا مقصد ہم کو اس مغالطہ سے بچانا ہے اس کلجگ میں ہم اور کس نوع کی ترقی کی نقل کرسکتے ہیں۔ بجز اس تقلیدی ترقی کے جس کی جڑیں مکروہ ترین خودغرضی میں غرق ہیں۔ اور جو نفرت کے زہر سے غذا حاصل کرتی ہے۔ کیا ہم کو متقدر بننے کے لیے بہائم ہونے کی ضرورت ہے۔

مسلمان اب بھی اپنے تئیں اس بدبختانہ انجام سے بچا سکتے ہیں، اور اس بچاؤ کا راستہ اب بھی مسدود نہیں، وہ اس نظریہ کو ماننے سے انکار کردیں جو جدید انتقام طلب ذہن باور کرانے میں ساعی ہے یعنی یہ کہ مذہب واخلاق شاہراہ ترقی میں روڑے ہیں، یہ مغالطہ صرف بہت ہی پست درجہ ذہن میں جاگزیں ہوسکتا ہے، یعنی وہ ذہن جو صحیح الخیالی سے معذور ہے۔

نواب سر نظامت جنگ بہادر

مترجمہ

اسرائیل احمد مینائی۔

نیا نظامِ عالم

گزشتہ جنگ عظیم کے ہولناک و تباہ کن نتائج سے کوئی ایسی ذی روح ہستی نہ تھی جو متاثر نہ ہوئی ہو۔ فلسفی ہو کہ مورخ۔ سائنس داں ہو کہ معمولی انسان۔ ہر ایک کے دل میں یہی تشویش اور یہی کھوج تھی کہ اس جنگ عظیم کا کیا باعث ہے۔

اور یہ جنگ جس نے تمام دنیا کو کرۂ جہنم بنا دیا ہے اس کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کرکے دنیا کو کسی طرح جنت ارم بنا دیا جائے۔ مصلحین قوم نے ہمیشہ اپنی کوششیں جاری رکھیں اور دنیا کو امن اور امان کی تلقین کی۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد اس سلسلہ میں دنیا کے مصلحین اور صاحبانِ اقتدار نے اس جنگ کی تباہ کاریوں سے متاثر ہو کر ایک انجمن بین الاقوامی کی بنیاد ڈالی تھی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ گزشتہ جنگ عظیم جن اسباب و علل کی بنا پر ہوئی تھی ان اسباب کو دور کرنے کے لیے یہ انجمن بھی بے انتہا ناکام رہی۔ اور اس کی ناکامی کا ثبوت یہ موجودہ جنگ ہے جو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ جب ہم جنگ کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اس کے چار اہم سبب معلوم ہوتے ہیں

(۱) اصول کے نفاذ کی بنا پر۔

(۲) نوآبادیوں کے لیے۔

(۳) مدافعانہ جنگ۔

(۴) اقتدار کی برقراری۔

یونانیوں اور رومیوں نے مذہبی اور سیاسی اتحاد قائم کرنے کے لیے از حد کوشش کی لیکن سولھویں اور سترھویں صدی کے آغاز پر قومیت کے جذبہ نے اتنا گہرا اثر کیا کہ بجائے اتحاد کے قوموں کو بر سرِ پیکار ہونا پڑا۔ القصہ قوموں میں بزدلی۔ خوف۔ تعصب۔ نفرت۔ نوآبادیوں کی حرص۔ اور خون کی پیاس نے عوام کے دلوں پر گہرا نقش کر دیا۔

آج دنیا میں ہر قوم یہی کہہ رہی ہے کہ وہ اپنے آئینِ حکومت کی خاطر لڑ رہی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اس اصول کو بہتر سمجھتی ہے۔ گزشتہ جنگ عظیم کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وہ آئینِ حکومت کے لیے

لڑی گئی تھی۔ لیکن جب جمعیت الاقوام نے دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے قوانین مرتب کیے اُس وقت تمام دنیا کو آزادی معیشت۔ قومی خودداری۔ انصاف۔ اور صداقت کی بجائے مندرجۂ بالا خصوصیات کو زیادہ جگہ دی گئی۔ اور اس وقت سے ایک دوسری جنگ کے مسموم جراثیم ان بزدلو قوموں کے دلوں میں پرورش پانے لگے۔ کاش اس جذبہ قومیت۔ اس فنا کرنے والے تباہ کن نظریۂ کی بجائے بین الاقوامی مصالحت کے جذبہ کو جگہ دی جائے اگر تمام دنیا کی قومیں عزت و افتخار آزادی معشیت۔ صدق و انصاف اور امن کی دولت سے مساوی طور پر حصہ پائیں تو دنیا کو اِس قیامت صغرا کا دوبارہ منظر نہ دیکھنا پڑتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اقوام میں یہ احساس ہونا چاہیے کہ انسان اور اقوام ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں اور اس لیے اقوام کے تمدنی۔ معاشی اور سماجی حالات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہذا انھیں چاہیے کہ بجائے خود مختار ہونے کی کوشش کرنے کے آپس میں دوستانہ روابط قائم کریں۔

انسان کی مادی ترقیاں اور سائنس کی جدید معلومات و ایجادات بجاے سودمند ثابت ہونے کے اندوہناک نتائج برپا کر رہی ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان ترقیوں سے روح انسانی مردہ ہو چکی ہے۔ اور دنیا کی حرص و آز نے قوموں کے جذبہ مروت و اخلاق کو بالکل فنا کر دیا ہے۔ ملک کی وفاداری نے رفاقت بنی نوع انساں کو چھوڑا اور انسانی تخیل نے جبلتوں کی غلامی کو تسلیم کیا۔

تنظیم نو کے سوال پر غور کرنے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جدید تنظیم گزشتہ جنگ عظیم کے بعد کیوں ناکام رہی۔ انجمن بین الاقوامی صرف اس لیے ناکام رہی کہ وہ زیادہ تر نظریات پر مبنی تھی۔ نیز اقوام کا اخلاقی معیار بھی گر چکا تھا۔ لہذا اب جبکہ دنیا پھر نئے سرے سے غور کر رہی ہے اس کو اپنی گزشتہ غلطیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے ان غلطیوں کو دہرانا نہ چاہیے۔ ورنہ یاد رکھئے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہے گی۔

تنظیم نو میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ امپیریل پالیسی کو جگہ نہ دی جائے نوآبادیوں کی تحصیل سے ہاتھ دھولیں۔ قومیت کے نصب العین کو خیرباد کہیں۔ اور متمدنانہ روابط کے نظریہ کو قبول کریں۔ کرۂ زمین کی تمام پیداوار اور ذرائع ارتقاء مساوی طور پر تقسیم کئے جائیں۔ صنعتی حکومت ہو۔ اور سرمایہ داروں کا نظریہ جو لوگوں کو تابع بناتا ہے مسترد کر دیا جائے۔ اور ہمیشہ خود موضوعی ضبط کا حاصل ہو۔ نسلی امتیاز کے ناپاک جذبہ کو صفحۂ دل سے مٹا دیا جائے۔ اور ایک اہم چیز یہ ہے کہ انجمن بین الاقوامی

ایک ایسی مرکزی حکومت ہو جو غیر جانبدارانہ طور پر اپنے فیصلوں کے ذریعے اقوام میں اتحاد اور اتفاق و باہمی رواداری کی ضامن ہو۔ اور اقوام کو چاہیے کہ وہ اس کے منصفانہ فیصلوں کا احترام کریں۔

اب ایک نازک مشکل ترین اور سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اقوام کو کس طرح غیر مسلح کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج اور اسلحہ کی اس وقت ضرورت درپیش ہوتی ہے جب کہ اقوام کے دلوں میں بغاوت کے جراثیم پیدا ہوں۔ اور وہ عہد شکنی کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور دوسروں کے حقوق پر بے جا دست درازی کرنے لگیں۔ لیکن ایسے نزاع انجمن بین الاقوامی کے سپرد کر دئے جائیں اور ہر قوم اس کے فیصلہ کا احترام کر کے اس پر کاربند ہو جائے تو اسلحہ سازی اور فوجی تنظیم کی کوئی ضرورت لاحق ہونے کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

اب سوال یہ ہے کہ دنیا کے لیے کونسا آئین حکومت ایسا ہو سکتا ہے جو انسانیت کے اس مرض کو ہمیشہ کے لیے دور کر دے اور پھر دنیا اس بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ جہاں تک ظاہری اصول سے تعلق ہے جمہوریت سے کوئی چیز بہتر نہیں۔ لیکن عملی طور پر جمہوریت نے بھی اپنے کو ناکام ثابت کیا ہے۔ ریاستوں کا نظریہ نصب العین جمہوری اور سماجی حالات پر مبنی ہو۔ لارڈ لوتھیان نے کہا تھا کہ عیسائیت یورپ میں اپنی عملی۔ مادی اور سائنس کی ترقیوں اور تمدن اور تہذیب کے باوجود قوموں کے اخلاق کو بلند کرنے میں ناکام رہی۔ کیا ہندوستان کے مذاہب دنیا کے اخلاق کو بلند کرنے میں امداد دے سکیں گے؟ لہذا تاوقتیکہ قوموں کے ضمیر میں انقلاب نہ ہو اور روحانی کایا پلٹ نہ ہو جائے اس وقت تک انسان کا اخلاقی معیار بلند نہ ہوگا۔ اور جب تک کہ وہ نوع انسان کے سوا کوئی قوم یا نسل کو تسلیم نہ کرے گا۔ جب تک کہ تعصب کینہ۔ حرص کے بجائے مروت۔ صداقت۔ انصاف دل میں جگہ نہ پائیں صلح و امن کی ہر تدبیر بے سود ثابت ہوگی اور دنیا سے جنگ و خونریزی کی لعنت دور نہ ہوگی۔ صرف روحانی انقلاب ہی دنیا کو اس جنگ و جدل کی لعنت سے بچا سکتا ہے۔ اور اس سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی کی دنیا کو اشد ضرورت ہے۔ تاکہ تمام بداخلاقیوں کا ازالہ ہو سکے۔

شہنشاہ بیگم
ام۔ اے آخری

نارماڈیوک پکتھال

آپ کی یاد ہمارے دلوں کو حساس تر اور دماغوں کو بلند تر
بنا دیتی ہے۔ وہبی نعمتوں کا یہ لطف اور حکمت ایزدی پر یہ اعتماد
ہر کسی کو کہاں حاصل ہے؟

پکتھال کی موت کی خبر ان کے ایک دہ سالہ فیض یافتہ ہم نشین کے لئے عظمت و رفعت کے اچانک خاتمہ کا ایک پیغام تھا۔ نیز یہ اس بات کی بھی اطلاع تھی کہ وہ ایک ایسے اعلیٰ تر عالم کی طرف انتقال فرما گئے ہیں جس کے وجود کی شاہد خود ان کی اپنی زندگی تھی۔ در اصل پکتھال جو کئی سال سے خدا کو ہر روز کئی مرتبہ یاد کرتے تھے اب موت وحیات کے راز کو سمجھنے کے لئے خدا کے پاس یاد کئے گئے ہیں جب ان کی دوستی کی یاد ہمارے دل میں اس خیال کو بیدار کر دیتی ہے کہ وہ فرستادگان حق سبحانہٗ تعالیٰ اور خاصان خدا سے تھے تو اس عظیم نقصان کا تلخ احساس ماند پڑ جاتا ہے اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔

اُن کا وقت، ان کی طبیعت، کمال ہمت اور تحمل کے مظاہر تھے۔ ان کی عام روش کا اثر ان کے نام ہی سے واضح تھا جس میں پکٹ (Pict) اور پوائٹوز (Poitou) کی جرأت اور صبر آزمائی کی گونج تھی ان کا نام نامی سیرت اور کردار کی اس قوت کو ظاہر کرتا ہے جو از منۂ وسطیٰ کی ایک خصوصیت خیال کی جاتی ہے! وہ سخت کوش عہد کی ایک یادگار اور محسن آدمی تھے جنہوں نے عیش دوستی کو اپنا کعبۂ مقصود نہیں ٹھہرایا تھا۔ ان کا حسب و نسب ان کی نارتھمن (Northman) بیباکی اور ان کی تابناک آئرستانی (Irish) مسرت سے ظاہر تھا۔ دنیا ان کے لئے بازیچۂ اطفال تھی اور وہ آریائی، سامی اور تورانی ہر ایک کے ساتھ گفتار و تخیل میں مساوی طور پر بے تکلف تھے۔

ان کو کمینا اور متکبر اشخاص کے علاوہ تمام لوگوں سے ملنے میں خوشی ہوتی تھی۔ ان کی صحبت میں اعلیٰ حکمرانوں کو معصوم خوشی حاصل ہوتی تھی اور وہ ان کو اپنا راز دان بناتے تھے۔ ان کے ساتھ کھیلنے میں چھوٹے بچے اپنے آپ کو شادمانی کے ایک پرستان میں پاتے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہوتا کہ چھوٹے بچے زیادہ شگفتگی کے ساتھ ہنس رہے ہیں یا پکتھال۔

جس کسی محفل میں وہ لطف اندوز ہوتے۔ ان کی طفلانہ سادگی و شگفتگی اور موثر سنجیدگی لازماً

ظاہر ہوتی۔ ایک غریب ہندو طالب علم، ایک مکرم اور بزرگ مسلم (Muslim) ایک مہربان شہزادی یا ایک تھکے ماندہ کارکن، اور ایک غیر معمولی ولدادہ ماہر۔ ہر ایک پر ان کی ہمدردی کا تسلی بخش اور صحت افزا اثر ہوتا تھا وہ اشیاء کے ذریعہ ان کے اسباب اور اعمال کے ذریعہ سیرت کو تاڑ جاتے تھے۔ کسی عجیب و غریب قوت مدرکہ کے اظہار کے بغیر وہ قول صادق، برمحل مسکراہٹ اور ذہنی کشاکش سے بآسانی نجات حاصل کرنے کے اصول سے واقف تھے۔ ان کی گہری انسانیت کی دمک میں ہر طرح کی خود نمائی معدوم ہو جاتی، بے فائدہ قہر تھم جاتا، عداوت کی لہر مسدود ہو جاتی اور قلب ماہیت کر جاتی۔ وہ ایک تاریک دل کے حق میں انوار صبح کے مماثل تھے۔ اپنی برموقع حاضری اور حیات بخش حکایات بیان کی روانی اور اپنے ناقابل فراموش مظاہرہ کی ہنرمندی سے ان کی مانند کوئی اور شخص بیمار کے کمرہ کی فضا کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر ایک غیر معمولی اور یادگار زمانہ استاد کی طرح گامزن تھے۔ جس طرح ایک کمال درجہ کا سچا اور ممد حیات مذہب ہر قسم کے پریشان دلوں کو، جو حالت اضطراب میں رہبری، ظن اور شک کی ظلمت میں نور یقین اور دون ہمتی میں سہارے کے طالب ہوں، اپنے سرچشمہ کی جانب کھینچ لیتا ہے اسی طرح کیتھال کی درخشاں شخصیت صدہا دلوں کے لئے مقناطیسی کشش رکھتی تھی۔

بلاشبہ یہ ان کے ذوق کی فراوانی اور وسعت کا نتیجہ تھا جس کی وجہ وہ ادب کی مختلف شاخوں، مثلاً میریڈتھ کی وکٹوریا (Meridith's Vistoria) پک وک پیپرز Pickwick Papers عربی گھریلو کہانیاں، اناطول فرانس (Anatole France) شاعر لیوس کیارل (Lewis Carroll) اور ترکی موسیقی وغیرہ سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ان کا حیرت انگیز حافظہ ان کی گفتگو کو دوامی انبساط بخشتا تھا ممکن ہے ان کا تعلق Ants نامی قبیلہ سے ہو یا وہ انگریزی (English) آئرستانی (Irish) اور نارمن (Norman) کے اعلیٰ خاندانوں کی آمیزش کا نتیجہ ہوں بہرحال ان کی شخصیت کے لئے سماجی شرافت اور ملنساری کا نقطہ شعاعی تھی ہمیشہ ان کی گفتگو برمحل اور برجستہ ہوتی اور وہ خوش آئند مشورہ دیتے۔ شاذ ہی کوئی مشورہ ایسا ہوتا جو دشمنی کی دوستی اور خلاف قیاس خوشگوار تعلقات سے مبدل ہونے پر مجبور نہ کرتا ہو۔ یہ چھا جانے والا انداز، جو شاعرانہ دلکشی سے منور تھا، اور یہ خوشگوار طریق استدلال ایک جم غفیر کی مختلف الجھنوں سے نجات پر دلالت کرتا جن سے وہ ملاقات کرتے تھے وہ بھی یہ بات بتانے سے قاصر ہے کہ کیتھال کی موجودگی اور دانشمندی نے ان کے نظریہ اور اقدار (Values) کے منصوبہ میں کیا تغیر کر دیا ہے۔

علاوہ ان کی ہمدردی اور تابناک ہمدردی کے ان کی رسائی فہم اور مستعدی قابل یادگار

تھی شاید ہی کوئی شخص ان کی طرح اپنی رائے کا محافظ اور خود آگاہ ہو۔ وہ تصفیۂ روح کے لئے عزلت گزینی کے خواہاں تھے لیکن وہ اپنے آپ کو دوسروں کی موجودگی میں بھی خاطر جمع اور مطمئن کر پاتے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمکو زمان و مکان کی رسائی سے پرے کسی گہرائی سے دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ اتنے نزدیک ہوتے کہ ہم انھیں چھو سکتے۔

وہ بیشک گرم جوش اور زندہ دل تھے لیکن کوئی اور شخص شاید ہی ان سے زیادہ جذباتی ریا و نمود سے آزاد تھا۔ راز کو وہ ایک مقدس امانت تصور کرتے تھے۔ ان کے خیالات کی دنیا میں بہت ہی کم لوگوں کو رسائی حاصل تھی۔ ان کا خلاقِ معانی دماغ ہی ان کی غیر معمولی قابلیت کا منبع تھا، جس کی بنا پر وہ ایک زبردست مدبر، عالم، نیک رفیق، اولوالعزم اور خوش خلق انسان اور بندہ خدا سب کچھ بن سکے۔ ان کا دل ایک معبد تھا، اور ان کا ضمیر عزم مصمم کی ایک دنیا۔ وہ ایک غیر معمولی قسم کے سچے شاعر تھے، جن کی زندگی خود شاعری تھی۔ ان کا ذوقِ شعر حروف میں نہیں بلکہ ان کے متوازن اعمال میں صورت پذیر ہوتا۔ اختصار، پابندی، اور باریک بینی ان کا خاصہ تھی، جو اکثر ان کے اصول زندگی کے انتخاب اور برتاؤ سے مل کر ان کو ہوریس (Horace)، کیا مپین (Campion) اور لیانڈر (Landor) جیسے شاعر، موسیقار اور مصنف کا ہمنشین بنا دیتی تھی۔

جس فیاضی کے ساتھ انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے حوالہ کیا۔ اس کے اظہار کے لئے صرف ایک لفظ ہے۔ **قربانی**۔ ان تمام قوتوں کی قربانی جن کو وہ اپنی قصہ گوئی کی بے نظیر استعداد کے ذریعہ مشرق کی خوبصورت خوش آیند اور شاندار زندگی کی شرح کرنے میں صرف کرسکتے خواہاں تھے۔ آزادی کے وہ دن جن کا خواب سب اہلِ ہنر دیکھتے رہے ان کے لئے بھی مساوی طور پر دلکش اور جاذب توجہ تھے، مثلاً سفر کرنے کی آزادی، کام اور دوستوں کے انتخاب میں آزادی وغیرہ تاہم ان کی یہ خواہش مذہبی معاہدہ کے احساس اور حدود کی سخت پابند تھی۔ اس معاہدہ کی ظاہری شعائر سے ان کی کمال وابستگی کو ان کے ہموطنوں میں سے بہت کم لوگ سمجھ سکتے تھے۔ ان کے حق میں اسلام ان کی موروثی، اولوالعزمی، ترکِ اَمَل، اور خیر بر ترکے اختیار کرنے میں مزید تقویت اور رفعت کا سہارا ثابت ہوا۔ اس عشقِ حقیقی کے ساتھ ساتھ ان کو اپنے اس حکمران سے بھی شخصی محبت تھی جس کی تحسین اور وفا شناسی کی خاطر انھوں نے اپنی عمر کے آخری زمانہ میں وفاداری اور بلند حوصلگی سے اپنا خون پانی ایک کیا، اور اس حاکم کی قدردانی، ہمت افزائی، خیر خواہی اور صحبت فیض رسان کی جیسی کچھ عال قدر کرتے تھے، اس کے اظہار کے لئے الفاظ ناکافی ہیں۔

آئے دن کی ناکامیوں میں جو چیز ان کے لئے استقامت اور حیات بخش تھی وہ ان کا اعلیٰ تخیل تھا جو ان کے یقین محکم اور فطرت راسخ کا جزو لاینفک تھا۔ ایسے واقعات کو، جو ایک قابل لحاظ اہلیت کے آدمی کو بھی بددل کر دیں، وہ اس فرض شناسی اور راستبازی کی بدولت نہ صرف صبر سے برداشت کر لیتے بلکہ ان پر غلبہ پا لیتے۔ انہی صفات نے ان کی استادانہ زندگی کو ایک معیاری نمونہ بنا دیا تھا۔ ان کی قابل پرستش ذاتی کشش ہر ایک پر اثر انداز ہوتی تھی خواہ وہ کنڈرکارٹن (Kindergarten) کے معصوم بچے ہوں، جو ان کے گھٹنوں سے چمٹ جاتے یا زیرک انتظامی عہدہ دار۔ یہ جوشِ عقیدت آج کل ناپید ہے۔

ان کا علم و فضل اس قدر ہمہ گیر تھا کہ اگر وہ ہیرو (Harrow) چھوڑنے کے بعد علم کے بجائے اتفاقاً فوج کی جانب بطور پیشہ کے راغب نہ ہوتے تو وہ کم از کم نصف درجن مضامین میں ماہر پروفیسر بن جاتے۔ انھوں نے حیدرآباد میں ایک عظیم الشان فوقانیہ مدرسہ کا اہتمام اپنے ذمہ لیا، اگرچہ یہ امر ان اصحاب کے استعجاب اور حیرانی کا باعث ہوا جو بچوں کی تربیت ایک "کارِ طفلاں" سمجھتے ہیں۔ اگر ان کے لئے کافی اسباب اور گنجائش فراہم ہو جاتے تو مملکت کا یہ مقبولِ عام ادارہ حیدرآباد کے مقبول اور معمور ترین درسگاہ کی شکل اختیار کر لیتا۔ اس معمولی کام کی انجام دہی میں قابل تحسین گرم جوشی اور سرگرمی کے ساتھ ساتھ کمال ہوشیاری سے اور بہترین انگریزی روایات کے مطابق بیکتھال سیول سروس کے ان طلبا کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام فرماتے جو انہی کے مکان میں رہتے تھے۔ مملکت آصفیہ کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جو ان کی نو سالہ خدمات کا اور ان کے ایک منصب جلیلہ پر فائز ہونے کی بیش بہا یادگار حریت نواز اثر محسوس نہ کر رہا ہو۔

ان کے ہم وطنوں کے لئے ان کا دوسرا مذہب اختیار کر لینا باعث تردد و اضطراب تھا ان کے اہل وطن اس بات سے کما حقہٗ نا آشنا تھے کہ دنیائے اسلام اپنی مختلف وسیع آبادیوں میں ایسے مختلف وضع و قماش کے انسان رکھتی ہے جن کی شرافت اور صداقت کا پورا اندازہ دنیا کو نہیں، ۔ جو خدا ترس سنجیدہ، پرہیزگار، دیانتدار، کمال درجہ صاحب اخلاص ہستیاں ہیں، اور جن کی شخصیت اور صحبت بیک وقت دلنشین اور موثر ہے اور جن کے دل حبِ مال و جاہ سے یکسر آزاد ہیں

انھیں مشرق میں ایسے اشخاص کی دیرینہ صحبتوں نے ان کے ان احساسات کا شریک و سہیم بنا دیا۔ توراۃ و انجیل کے گہرے مطالعۂ فلسطین و شام کی زندگی اور وہاں کی زبانوں کے علم و معرفت کے باعث جس طرح بیکتھال بیت المقدس میں آرام اور اطمینان کا سانس لیتے تھے اسی طرح قسطنطنیہ میں بھی خود کو

نہایت شاد کام محسوس کرتے تھے۔ اور ابانا[1] (Abana) اور پارپا[2] (Parpar) کا پانی پیکر انھوں نے محسوس کیا کہ جو چیز اُن کو اپنی نہایت محبوب خلائق کے ساتھ انتہائی ہمدردانہ وحدت کا موقع بخشے گی، وہ کشادہ دلی اور آزادی سے ان کے مذہب میں شرکت ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ بچپن کی حاصل کی ہوئی مسیحی تعلیمات سے بالکلیہ دستبردار ہوگئے تھے۔ وہ ساری تعلیمات ان کے دل میں زیادہ مُطہر اور معظم صورت میں موجود تھیں۔

انھوں نے اپنی مثال سے یہ ثابت کیا کہ مذہب کے باب میں غلو سے بچتے ہوئے عیسائی اور اسلامی تعلیمات کے مرکزی اوصاف اور اقدار (Values) کو وحدت اور قوت بخشنا کس طرح ممکن ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لطیف تسکینت اسی طرح ان کے کردار کا ایک حصہ تھی جس طرح اسلام کی وسیع انسانیت ؎

اندازہیں جذب اسیں سب شمع شبستان کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

پروفیسر اسپیٹ
ترجمہ محمد عبد الصمد
متعلم جونیر بی۔اے

رہروِ راہِ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر صیاد
ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے

ہزار کام مزے کے ہیں داغ الفت میں
جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں
داغ

---

[1] و [2] ابانا۔ اور۔ پارپا۔ دمشق کی دو ندیوں کے نام ہیں۔

اور کچھ سنائیے

یہاں کچھ ان لوگوں کے متعلق عرض کرنا ہے۔ جن کا تکیۂ کلام کچھ سنائیے یا اور کچھ سنائیے ہوتا ہے۔ جہاں ملے اور صورت دیکھی کہ فرمائش ہوگئی اور کچھ سنائیے۔ اجی سنانا تو آسان ہے۔ مگر یہ تو فرمائیے کہ کتنے لوگ ہوں گے کہ جنہیں جی بھر کے سننے کی تاب ہو۔ ادھر منہ سے کچھ نکلا۔ کہ مخاطب کو کچھ اپنے واقعات فوراً یاد آگئے۔ اور لگا جی گدگدانے۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر آگئی۔ اب لاکھ بکے جائیے وہ آپ کی باتوں سے بے نیاز۔ چہرے سے بے توجہی ظاہر دل ہی دل میں گئی گذری داستانیں دہرا رہے ہیں۔ اور کچھ فرمانے کے لئے بے تاب ہیں۔ بات کی بنا کی تلاش ہے کہ شروع کس طرح کریں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اپنی خوش کلامی کا مغالطہ ہے۔ ورنہ ہوئے کوئی سیدھے سبھاؤ کے کہ انھوں نے چھیڑی ہو وقت کی۔ اب اللہ ہی ہے کہ یہ تان ٹوٹے۔ سنانے والا بھی منغض اور بے مزہ ہونے لگا اور اپنی گفتگو کی تبلیغ کا وہم ہونے لگا۔ جب کچھ سلسلۂ کلام کو ہوں ہاں۔ یا آہا ہا اور واہ وا کا سہارا نہ ملا۔ تو ایک دم وہم ہو خاموش ہو رہا۔ یہ سوچ کر کہ چلو ان کو بھی بات کا موقع دو۔ اب سنو ان کی بھی جن کو آپ پسند کرتے ہیں اور جن کی باتوں سے جی تلملائے اور الجھن پیدا ہو۔ اور دل نفرت کرے۔ شائد یہ نفرت دور ہو جائے۔ یہ کوئی ایسی بات فرمائیں۔ اور ہماری سوء ظنی رفع ہو جائے۔ کیونکہ اگر کوئی بدمزاج ہے تو وہ ہر وقت تک چڑا ہی نہیں بنا رہتا اور اگر مغرور معلوم ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اس کو غرور ہی ہو۔ بلکہ کبھی شرمیلا اپنی حد سے زیادہ شرمیلی طبیعت کو مصنوعی غرور کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے حقیقت میں پیارا تو وہی ہے جو برے بھلے میں شریک ہو۔ شرکت صرف ایسی ہو کہ ہمدردی کی اور وہ بھی زبانی کہ سوگز وارین، گز بھر نہ پھاڑیں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو ہم ہوشیار عقلمند اور اپنا دردمند سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اپنا دکھڑا رونے اس کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور جی بھر کے دل کی بھڑاس نکال ڈالتے ہیں۔ حالانکہ اندر سے دل کہتا ہے کہ یہاں صرف زبانی ہمدردی کی امید ہے۔ اور اس زمانے میں تو یہ شئے بھی عنقا ہے۔ دنیا خوشی کی ساتھی ہے۔ آپ کے ساتھ ہنسنے والے بہت مل جائیں گے۔ لیکن آپ کے رونے کا شریک کوئی نہ ہوگا۔ اگر ایک آدھ دفعہ پھنس گیا تو پھر بھول کر بھی آپ کی طرف رخ نہ کریگا۔ آپ خوش ہیں کہ چلو دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ آپ ذرا اپنی مشکلوں کے حل میں خود بھی کوشش کرنے لگے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو باتیں کرنے کی

پیاری ہوتی ہے۔ اور یہ پیاری ہوتی دلچسپ اور دلکش ہے۔ وہ محفلوں میں اپنا ایک حلقہ مداحوں کا پیدا کر لیتے
ہیں۔ بس ان کی سنے جائیے چاہے وہ کچھ کہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کو ملکہ ہوتا ہے سنانے کا اور
ان میں خداداد قابلیت ہوتی ہے گفتگو کرنے کی۔ باتیں خوب چٹخارے دار اور چکنی چپڑی کر کے صحبت میں
خوش کلام مشہور ہو جاتے ہیں۔ کہیں بھی ہوں۔ اکیلے نہ رہیں گے۔ لوگ ان کو گھیر لیں گے۔ اور ان کی
باتیں خوش دلی سے سنیں گے۔ بلبل ہے کہ چہک رہا ہے۔ اور لوگ زٹیلوں پہ لگا رہے ہیں۔ اگر وہ ذکی الحس
ہوں تو ذرا غور کریں۔ کہ ان کے سامعین ایسے ہیں جو محبت سے اور بات کے دلکشے سے دور بھاگتے ہیں
اور ہاں میں ہاں ملانا اپنی زندگی کا شعار بنا لیتے ہیں۔ اور ان خوش گفتاروں کو اپنی رفع الوقتی اور
خوش وقتی کا آلہ بنا لیتے ہیں۔ کبھی اس انسان نما چہکتی چڑیا کو یہ محویت گراں گزرنے لگتی ہے اور وہ
تھک جاتا ہے۔ کہ کہاں تک نئے لطیفے سنائیے اور کب تک مغز سے آتار آتار کر نت نئی چھانٹتے جائیے۔
تھک کر اس کو خاموش ہونا ہی پڑتا ہے اور اس وقت محفل میں ایک ہو کا عالم اور ایک عجیب وحشت انگیز
سکوت طاری ہو جاتا ہے جس کو کوئی سمجھدار ٹوک کر توڑتا ہے۔ لیکن پھر عام طور پر رنگ محفل نہیں جمتا۔
یا تو فی الفور تھکا سننے والے جدا کسل مند۔ چلے سب خالی الذہن گھر کو۔ ہاں اگر باتوں میں کوئی راست یا بلارعایت
چٹکی لی گئی۔ تو جدھر نشیب میں پانی مرا تھا وہ دماغ میں جوابوں اور خیالوں کا طوفان لے کر چلا اور سوچتا
گیا کہ یوں کلیجے میں چٹکی توڑنی تھی۔ ایسا دنداں شکن جواب دینا تھا۔ اس طرح دانت کھٹے کرنے تھے۔
افسوس وقت پر نہ سوجھی۔ ورنہ پالی اچھی جمتی جو کم گو اور وقت گزاری کے لئے باتیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے
تکلف اور طبیعت کی افتاد کو ذرا ایک طرف کو کر دیں تو خاصے دلچسپ بن سکتے ہیں۔ اگر ان
بچاروں کو اس کا موقع دیا جائے کہ بزم کے رسمی فقروں کو جو طوطے کی طرح رٹے ہوتے ہیں۔ ان کے
علاوہ کچھ دل کی بات بھی کریں۔ اگر وہ خود ہچکچائیں تو ان کو ذرا سی طفلانہ شے کی ضرورت ہے جیسے
آپ بچوں سے بات کیجئے۔ وہ شرمائیں گے، بھنائیں گے۔ پہلے گردن کے ڈورے سے جواب دیں گے۔ ٹکا بھر
زبان نہ ہلائیں گے۔ دھڑی بھر کا سر ہلا دیں گے۔ آپ اس کی پرواہ نہ کریں اور ان سے باتیں کئے جائیے
وہ ہاں ہوں سے جملوں پر اتر آتے ہیں اور تھوڑی دیر میں خوب چہکنے لگتے ہیں ان بڑے ڈیلوں میں
بھی بچوں کی روحوں نے حلول کیا ہے۔ ایک دفعہ آپ ان کو باتوں کے رستے پر لگائیے اور پھر دیکھئے
تک بارہ کے کان کاٹتے ہیں یا نہیں۔ اور آپ کی دلچسپی کا موجب بنتے ہیں کہ نہیں۔ اور جو آپ نے شروع
ہی میں ان پر حملہ بول دیا کہ اور سنائیے۔ وہ بچارے ہکا بکا حیران ہو جاتے ہیں۔ اور اس گھبراہٹ میں
کچھ نہیں سدھرتی کہ کیا باتیں کریں اور کس طرح کریں۔ وہ اور کھو جاتے ہیں اور گم سم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ایسے چپ کے لڈو کھانے والوں یا چپ کا روزہ رکھنے والوں کا بڑھاپا قابل رحم ہوتا ہے۔ ان بڈھوں میں سوائے بڑھاپے کے نور اور جلال کے کوئی جاذبیت نہیں رہتی۔ اس کے ساتھ فرق مراتب اور عمر کے فرق کا لحاظ ان میں اور دوسروں میں ایک وسیع کھاڑی پیدا کر دیتا ہے۔ اور ان کے اس پیرانہ رعب سے لوگوں کو مرعوب ہونے کا کم موقعہ ملتا ہے جیسے بات کرنا فن ہے۔ ایسا ہی بات کا سننا بھی ایک بڑا ہنر ہے۔ جتنا ہنرمند ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ باتونیوں کی دنیا میں مقبول ہوگا۔ اگر سننے والا استاد نما ہؤا کہ جماعت میں لڑکے نے پڑھنے میں تلفظ کی غلطی کی اور پڑی ڈانٹ۔ بس یہیں سے باتوں کا کھیل بگڑا۔ یہ صورت صحبت کے درہم برہم ہونے کی ہوتی ہے۔ بعض کی بے توجہی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آپ اس کوشش میں ہیں کہ دل کی کتاب پوری ان کے سامنے کھول کر رکھ دی جائے اور متن مع شرح کے سنا دیا جائے لیکن سننے والے ایسے قدردان ملے ہیں۔ کہ کبھی کھدیتے ہیں۔ ہوا بھیگی بھیگی ہے۔ ذرا بھر بی لے کر۔ ادھر کی کھڑکی کا ایک کواڑ بند کر دیجئے۔ کبھی اگلدان سیدھا رکھوایا۔ کبھی سامنے کی کسی رکھی ہوئی ترتیب کی چیز کو ایک خاص زاویہ پر رکھا۔ کبھی اس بدمزگی کو دور کرنے کی کوشش میں باتیں کرنے والے نے آنچل کو درست کیا۔ یا دامن سنوارا۔ یا چوڑیاں کلائیوں میں پھرائیں اور انھوں نے جھٹ سے ٹوکا کہ کھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔ سنانے والے کا جی بجھ گیا۔ اب گرمی گفتار بچارا کہاں سے اور کس گھر سے مانگ کے لائے۔ اور سنائیے کی فرمائش کی تعمیل کرو۔ تو مال پسند نہیں آتا۔ اور واپسی کا خرچہ اپنے ہی سر پڑا اب فرمائیے کہ کوئی کیا سنائے۔ کوئی سنے بھی تو۔

عاصمہ رحمن

نبیری مولوی خلیل الرحمن صاحب مرحوم

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو

بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

مصحفی

غم اور مسرّت

زمانے کے نشیب و فراز کا نام انسانوں نے غم اور مسرّت رکھ لیا ہے۔ زمانہ کی حالت کبھی یکساں نہیں رہتی۔ زمانہ رنگ بدلتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کی زندگی میں بھی تغیرات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں رنج اور خوشی ہی انسان کی زندگی کا اختصار ہے اور انھیں دوا حساسات پر زیست انسانی کا انحصار ہے۔

قدرت کے نظام کو سمجھنا انسانی فہم و فراست سے باہر ہے۔ خدا نے انسان کے دل میں ایسے احساسات جمع کر رکھے ہیں۔ اور ان دلی احساسات لطیف کو سمجھنے کے لئے دماغ جیسا رہبر بھی مرحمت فرمایا ہے تاکہ انسان اس کی مدد سے اپنے دلی احساسات کا اعلیٰ یا ادنیٰ ہونا اچھی طرح جانچ سکے اور انسان اپنے ہی احساسات میں اچھے اور برُے کی تمیز کر سکتا ہے۔ رنج اور غم کا باعث اکثر ایسی خواہشیں ہوتی ہیں جن کی تکمیل ناممکن ہوتی ہے اور وہ ترقی کرنے کے بعد عذاب جان بنکر رہ جاتی ہیں اُن ہی آرزوؤں کی تکمیل میں پیہم ناکامیاں انسان کے حق میں غم کی گھٹائیں ثابت ہوتی ہیں اور انسان ان ناکامیوں سے جب تنگ آجاتا ہے اور دشواریوں کا اس کو ہر دم سامنا کرنا پڑتا ہے تو اکثر اس کی فطری کمزوری اس پر غالب آجاتی ہے اور یہی غم کی کالی کالی گھٹائیں آنکھوں کی راہ سے برس پڑتی ہیں جس سے اس کو دماغی الجھنوں سے کچھ دیر کے لئے نجات مل جاتی ہے لیکن پھر اُسے خواہش اپنی طرف گھسیٹتی ہے اور انسان اس کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اور پھر اس پر غم کے بادل لوٹ پڑتے ہیں اور انسان اس ناممکن التکمیل خواہش کو حاصل کرنے کی انتھک کوشش کرتا ہے اور غموں کی دنیا میں روپوش ہو جاتا ہے۔ ناممکن الحصول خواہش کا خیال عموماً فرحت افزا اور ایک گونہ مسرّت کا باعث ہوتا ہے لیکن اُس کی تکمیل کی کوشش کی عملی دشواریاں اُتنی ہی ڈراونی اور ہیبتناک ہوتی ہیں خیالی فرحت کو انسان اپنے دل میں بخوشی جگہ دے لیتا ہے کیونکہ امید اسے رنگین خواب اور پر فضا باغ دکھاتی ہے لیکن جب انسان عملی طور پر اس خیالی فرحت کو حقیقی راحت کی شکل میں اپنی زندگی سے وابستہ دیکھنا چاہتا ہے تو اُسے ظاہر ہے کہ ناکامی ہوتی ہے لیکن خدا نے انسان کے دل میں غم کی تاریک گھاٹیوں میں امید کا یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ شاید اسی لئے روشن کر رکھا ہے کہ اس سے انسان کی حوصلہ افزائی ہو اور

ان تابڑتوڑ ناکامیوں سے وہ گھبرا کر اپنی زندگی سے بھی تنگ آجائے۔ انسان کی زندگی ہی کا دارومدار امید پر قائم نہیں بلکہ پوری کائنات کا نظام امید ہی کی بدولت انبساط اور اہتمام کے ساتھ چل رہا ہے۔ انسان ناکام ہو جاتا ہے تو بہت گھبراتا ہے اور مغموم رہتا ہے لیکن امید اسے خوش آئند خواب سے اس کے خوابیدہ احساسات کو پھر سے بیدار کر دیتی ہے اور اسے پھر سے مسرت کی جھلک نظر آنے لگتی ہے اور وہ اپنی کوششوں کی نئے سرے سے ابتدا کرتا ہے۔ ان ہی ناکامیوں کو انسان غم سے تعبیر کرتا ہے۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہی لوگ دنیا میں مغموم و ناشاد رہتے ہیں جو اعلیٰ دماغ اور حساس دل کے مالک ہوں۔ حساس طبیعت یا حساس دل انسان اپنے میں برائیاں کمزوریاں اور نااہلیاں محسوس کرتا ہے اور اچھے اور برے کا اثر اس کے لوح دل پر اچھی طرح ہوتا ہے اور اس کے زیر اثر انسان فضول اور بے سود افکارات میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے اس کی زندگی گھٹتی جاتی ہے کیونکہ ان ہی تفکرات میں اس کی صحت دماغ اور دل پر خراب اثر پڑتا جاتا ہے اور ایسے انسان اکثر تنہائی پسند ہو جاتے ہیں اور رنج و غم کا اثر ایسے اشخاص پر کافی طور پر ہو جاتا ہے اور یہ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ جاتا ہے کہ انکو اپنی زندگی بھی وبال معلوم ہونے لگتی ہے ایسے لوگ اکثر جزئیات کو کلیات سمجھ کر اس کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ ان کے حق میں خوش آئند نہیں ہوتا۔ ایسے اشخاص کو اپنے بہی خواہ اور دوست احباب بھی دشمن نظر آتے ہیں اور وہ ان کے سایے سے بھی دور بھاگنا چاہتے ہیں ایسے اشخاص بعض اوقات اپنے نقائص اور کمزوریوں کو فراموش کر کے اوروں کے نقائص ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور یہی کوتاہ نظری اور کوتاہ خیالی ان کے آگے ہمت شکن واقعات پیش کرتی ہے جس سے وہ غمگین اور اداس نظر آتے ہیں ایسے اشخاص کے عموماً دوست بہت کم اور دشمن بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

غم اور مسرت دونوں انسانی احساسات لطیف کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتے ہیں اور انسان ہی کی پیدا کردہ چیزیں ہیں تربیت کی بنا پر انسان اپنی زندگی بناتا ہے اور بگاڑ بھی لیتا ہے غم اور مسرت مثل دن اور رات کے ہیں اور یہ دائمی نہیں ہوتے غم کا وجود دنیا میں شاید اس لئے ہے کہ انسان دنیا کی نیرنگیوں میں پھنس کر اپنے خالق کے وجود کو فراموش نہ کر دے غم اور مسرت جب دونوں چیزیں دائمی نہیں ہیں تو مسرت میں خوش رہنا اور غم میں آنسو بہانا اور زندگی سے نالاں رہنا کم ظرفی اور کمزوری کی دلیل ہے۔ غم کی گھٹاؤں کو چھانٹ کر مسرت کے خورشید کو آسمان جہاں پر دیکھنا مقصود ہو تو ثابت قدمی اور استقلال کی ضرورت ہے۔ اور اسی میں انسان کی شرافت اور اعلیٰ

مرنجے کے نہ ہونے کا راز مضمر ہے۔ غم کا وجود خود مسرت کے وجود کا ثبوت ہے۔ مشکلات اور مصائب راحت اور مسرت کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اور یہی کائنات کے ہر ذرہ کی حرکت اور تغیر سے ظاہر ہے۔

انسان خواہش کا پتلا بلکہ غلام ہے اور اس کی خواہش تا دم زیست اس کے دل میں باقی رہتی ہے خانۂ دل کبھی بھی خواہش سے بے بہرہ نہیں رہتا۔ خواہش دل کو آباد رکھتی ہے اور امید خواہش کے وجود کو مستحکم کرتی ہے۔ انسان کی ایک خواہش کی تکمیل اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے دل میں ایک اور خواہش جاگزین ہوئی اور جب تک خواہش دل میں ہے تب تک انسان مغموم نظر آتا ہے۔ انسان کی طبیعت کچھ ایسی حریص واقع ہوئی ہے کہ اس کو کبھی سیری نہیں ہوتی اور کم ملنے پر اسے زیادہ کی خواہش ہوتی ہے اور زیادہ ملنے پر اسے اور زیادہ کی لہذا جب تک یہ حرص باقی رہی تب تک ظاہر ہے کہ انسان اس کو حاصل کرنے میں سرگرداں رہے گا اور غم میں مبتلا رہے گا۔ شعر۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غم اور مسرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ غم کی کالی گھٹاؤں میں بھی ایک نہ ایک وقت خورشید مسرت نکل ہی آتا ہے۔

حقیقی مسرت عنقا ہے ہما ہے لیکن مسرت کی امید ہی کو لوگ مسرت سمجھ بیٹھے ہیں دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو حقیقی مسرت سے آشنا ہو دولتمند یا صحتمند عقلمند یا خوبرو ہر ایک کو خوشی کے پہلو میں غم کا خار چھپتا نظر آتا ہے تفکرات سے کوئی بھی ایسا نہیں جو آشنا نہیں اور غم کے خار وخس میں مسرت کے پھول بھی کھلتے ہیں۔ مسرت میں غم کا شائبہ نظر آتا ہے اور غم میں مسرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ لہذا دنیا میں کوئی انسان بھی ایسا نہیں جس نے پوری طرح مسرت حاصل کی ہو یا پوری طرح غم کا لذت چشیدہ ہو بلکہ خدا نے غم اور مسرت کے میزان کے دونوں پلڑوں کو ہموزن بنایا ہے تاکہ پوری پوری مسرت سے انسان دنیا کی نیرنگیوں کا شکار نہ ہو جائے یا پورے پورے غم سے تنگ آ کر خودکشی نہ کرے اور اور خدا کا انسان کو پیدا کر کے دنیا میں بھیجنے کا مقصد فوت نہ ہو جائے اور ان فرائض کی تکمیل جن کے لئے خدا نے انسان کو خلق کیا نامکمل نہ رہ جائے۔

عارضی مسرت کو اپنے ہمراہ رکھنے کے لئے انسان کو چاہئے کہ دنیاوی تکلفات کی کچھ پرواہ نہ کرے۔ تفکرات سے دامن بچا کر رہے۔ بیجا اور ناممکن اور ناپاک خواہشوں کو دل میں جگہ نہ دے ہر دم اسی کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہم خوش رہ سکیں دائرہ احباب میں اس بات کی کوشش کرنی چاہئے

کہ ان کا وجود ان کے احباب کے لئے شاق نہ گذرے۔ ہنسی مذاق کی گفتگو کرنا اور غم اور رنج کی باتوں سے احتراز کرنا چاہیئے کیونکہ ایسی باتوں سے غم کا اثر دل پر پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی عارضی مسرّت ہے یا ایک مسرّت کا خواب ہے جس کی تعبیر رنج و الم ہونا ضروری ہے۔ اور رنج و الم کی رات پھر سے ختم ہو جاتی ہے اور خورشید مسرّت طلوع ہوتا ہے اور اسی گردش میں انسان کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اعلیٰ دماغ اور حساس دل۔

مسرّت :۔ دولت صحت۔

انسان حاسد ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ مغموم نظر آتا ہے۔

احساس مسرت مسرّت بخش بھی ہوتا ہے لیکن انسان کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کا وجود مٹتا جاتا ہے۔

شہرت دولت وغیرہ مسرت کا باعث نہیں ہوتیں۔

غربت میں ان کی میٹھی نیند انکی محنت شاقہ کا صلہ ہوئی ہے اور ایمانداری کی خدمت کے صلہ میں اس کو یہ عارضی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

مسرت اطمینان قلب کا دوسرا نام ہے حقیقی اور دائمی اطمینان قلب جب تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان اپنی موجودہ حالت پر صابر و شاکر نہ رہے اپنی موجودہ حالت پر صابر و شاکر رہنے کے لئے انسان کا دل دنیاوی خواہشوں سے پاک رہنا چاہیئے اور ایسا انسان، انسان نہیں رہتا بلکہ انسانیت کے دائرہ سے کہیں بلند اور برتر ہو جاتا ہے۔ اور ایسا فرشتہ صفت انسان حقیقی مسرت کو پائیگا لیکن اس کی خواہش دنیاوی خواہشوں سے مبرا ہو کر دینوی خواہشوں سے علاقہ پیدا کرتی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اس کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑیگا کیونکہ خدا کی محبت میں بھی اگر انسان کے دل میں اپنی ذاتی خواہشوں کی تکمیل کی کوشش ہو تو ایسے انسان کا درجۂ انسانیت سے برتر نہیں اور مسرت اس کے لئے بھی عنقا ہے لیکن ایک انسان خدا کی محبت کو خدا کی ذات تک محدود کر کے اس کی ذات سے کسی قسم کی امیدیں وابستہ نہیں رکھتا ایسے انسان کی کوشش اعلیٰ اور ادنیٰ خواہشوں سے مبرا ہوتی ہے اور ایسا انسان دنیا کے مال و متاع پر لعنت بھیجتا ہے اور دنیاوی چیزوں پر نفرین کرتا ہے اور صرف خدا کی ذات کے لئے خدا سے الفت رکھتا ہے اور ایسا انسان پاک حقیقی اور دائمی

مسرت کو پالیتا ہے بچپن کا زمانہ بھی متذکرہ بالا انسان کی زندگی کے مثل ہے جہاں خواہش اور دنیاوی چیزوں سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا اور ایک بچہ دنیا کے نفع نقصان سے اثر پذیر نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر حال میں خوش اور بشاش نظر آتا ہے حقیقی مسرت یا تو بچہ جو کمسن ہو اس میں پائی جاتی ہے یا ایسے انسان میں پائی جاتی ہے جو تارک الدنیا اور جام الست کو نوش جان کر چکا ہو۔

ہیم چندر پرشاد
سینیر بی۔ اے۔

ریاض دہر میں پوچھو نہ میری بربادی
برنگ بو اِدھر آیا اُدھر روانہ ہوا

پردے سے اسکی ذات کو کیا کام تھا امیر
چھپ کر صفات نامتناہی میں رہ گئی

نہاں تھا آنا کہ ہو نہ ظاہر عیاں تھا جانا کہ سب ہوں ماہر
وہ آئے دل میں امنگ ہو کر گئے تو چہرہ کا رنگ ہو کر

امیر ایسی کہاں قسمت کہ پہنچوں اڑ کے پھولوں تک
کبھی چاکِ قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو

امیر اپنا دل پر داغ سوئے کربلا لے چل
یہ گلدستہ ہے نذر روضۂ شبیر کے قابل

امیر

مغرب زدہ باپ - (افسانہ)

سلیم بڑے فرماں بردار اور ذہین تھے لیکن جب سے آئی سی ایس میں آئے اور لندن گئے دنیا ہی بدل گئی۔ اب جو چند سے وہاں رہکر واپس آئے تو پورے "صاحب"۔ مغرب کی وضع قطع اور خیالات سے لیس اپنی اچھائیوں تک سے متنفر "صاحب" کی برائیوں پر شیدا۔ بیوہ ماں وہی نقشہ جمائے بیٹے کو فرمانبردار سمجھے بیٹھی تھی۔ ایک اعلیٰ نسب شریف عزیز کی لڑکی پسند کر رکھی تھی اور تعلیمیافتہ خوش سیرت و خوب صورت لڑکی والوں کو زبان دی تھی کہ تمھاری بیٹی میری بہو ہوگی۔ سب راضی تھے۔ ادھر صاحبزادے تشریف لائے اور ادھر کچھ دنوں بعد ماں نے کہا بیٹا میں قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہوں۔ تیرے بیاہ کا بڑا ارمان ہے۔ اب دیر نہ کر۔ صاحبزادے نے دیکھا کہ لڑکی خوبصورت اور دولت والی ہے سوچا کہ کیا مضائقہ ہے۔

سلیم و نسیمہ کی شادی ہوئے پانچ سال گذر گئے اور اب خیر سے نسیمہ کی گود میں دو سال کی معصوم بچی کھیلتی تھی۔ ننھی وسیمہ کیا تھی؟ بس ایک بنگالی مینا تھی۔ سارے دن چہکتی رہتی جس پر نانی فدا دادی نثار۔ خالہ تام کی دیوانی۔ پھوپیوں کی آنکھ کا تارہ۔ ماں کی لاڈلی چہیتی اور پیاری مگر باپ؟ باپ اسکی صورت سے نفرت کرتا تھا سلیم پر مغربیت چھائی ہوئی تھی اس لئے وہ اس کی چھپی ہوئی خصوصیات سے دور و بے خبر اور ظاہری نمائش کا دیوانہ تھا۔ اس کے لئے زندگی اور خود غرضی دونوں کا ایک ہی فلسفہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اپنا عیش اپنا آرام ہی سب پر مقدم ہے۔ اور وہ ہر چیز کو غرض اور ہوس ہی کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ اس لئے ہندوستانی مسلمان گھر کی غیر فیشن ایبل غازے پوڈر۔ لپ اسٹک سے دور رہنے والی نسیمہ سے ہر طرح سے بیزار رہنے لگا تھا۔ ادھر نسیمہ گھنٹوں سوچتی۔ کڑھتی کہ اس کے والدین نے آخر کیا سمجھ کر سلیم سے شادی کردی؟ کیا اسی لئے کہ اسے ہر وقت وہ جلاتا رہے اور گھلا گھلا کر ختم کردے؟ کیا اس لئے کہ وہ ایک شریف لڑکی کو اس کی سادہ زندگی کی حقیقی مسرتوں سے محروم کردے؟ اے میرے اللہ کیا زندگی صرف خود غرضی کا نام ہے؟ خود ہی وہ تمام سوالات کرتی اور خود ہی ان کا جواب دیتی کہ نہیں بیشک نہیں۔ اور میں اسے ثابت کر دکھاؤں گی کہ ہرگز ہرگز نہیں۔

سلیم سوٹ بوٹ پہنے انگلیوں میں سگریٹ دبائے ہر کس و ناکس کیسا تھ آیرا و تھیٹرین بیباکانہ پھرا کرتا تو نیک دل و نیک سیرت نسیمہ کو بہت برا لگتا۔ اکثر وہ خیال کرتی کہ گھر بار مال و متاع سب چھوڑ کر میکے چلی جائے

مگر وسیمہ کا خیال دامن گیر تھا۔ اس لئے وہ خاموش ہوجاتی . . . . آج بھی سلیم حسبِ معمول کلب جا چکا تھا۔ آسمان پر شفق پھولی ہوئی تھی۔ نسیمہ اپنے خیالوں کی دنیا میں کھوئی ہوئی ملاقات کے کمرے کی طرف جاتی ہے اور وہیں ایک آرام کرسی پر دراز ہوکر سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھتی اور سوچتی ہے کہ دن تمام ہوا رات اپنی تمام تاریکیوں کے ساتھ چھائی جارہی ہے۔ کل سویرے پھر سورج کا دیوتا ساری دنیا کو روشن کرے گا۔ کیا میری تقدیر کا ڈوبا ہوا سورج پھر کبھی طلوع ہوگا؟ اس کے جواب میں پیچھے سے ایک آواز آتی ہے "بیبی کو بخار تیز چڑھا ہے"۔ یہ ننھی کی آیا کی آواز ہے۔ اس کو سنتے ہی نسیمہ جلدی سے بچی کے کمرے میں پہنچی۔ ننھی وسیمہ کا چہرہ بخار کی شدت سے سرخ ہورہا تھا اور اس کے ننھے ننھے ہونٹوں سے ہلکی آہ نکل رہی تھی۔ نسیمہ نے بچی کی پیشانی پر آہستہ سے ہاتھ رکھا تو گھبرا کر ہٹالیا۔ اُف کس شدت کا بخار آیا تھا! پنڈا تھا کہ جل رہا تھا۔ آیا نے کہا بیبی گھنٹہ بھر سے یونہی کراہ رہی ہیں۔

آیا نے پہلے سلیم سے کہا تھا لیکن وہ اس وقت اپنے بال بنانے میں مصروف تھے۔ کلب میں آج پارٹی تھی اس میں مسٹر کی شرکت لازمی تھی۔ انھوں نے کچھ سنا کچھ نہ سنا بچی کو ایک نظر دیکھا اور کہتے گئے کہ بیگم صاحبہ سے کہہ کر ڈاکٹر کو بلا بھیجنا مجھے آج ذرا جلدی جانا ہے مس شیا منتظر ہوں گی۔ نسیمہ کو آیا کے ان جملوں کو آگے سننے کی تاب نہ تھی۔ بس بس کہہ کے بیچاری ماں و بدنصیب بیوی نے ہاتھ کے اشارے سے آیا کو روکا پھر آلہ اٹھا کر ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا۔ ڈاکٹر آیا اور معائنہ کے بعد کہا کہ بچی پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا ہے بیگم صاحبہ ذرا سی لاپروائی جان لئے ڈالے گی۔ بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ وہ تو نسخہ تجویز کرکے رخصت ہوا مگر نسیمہ کو یہ سنا تھا کہ اختلاج کا دورہ پڑ گیا۔ باپ تو ادھر ٹینس کھیلنے یا رُوٹ دوستوں کے ساتھ قہقہے لگانے اور پینے پلانے میں مصروف تھے۔ اور ادھر ماں نے تمام رات بچی کے پاس بیٹھکر گزار دی۔ وقت پر دوا پلاتی اور ساری رات رو رو کر خدا سے دعا مانگتی رہی . . . . . . مسٹر سلیم رات کے بارہ بجے پارٹی سے واپس آئے تو شراب کے نشے میں مست نوکر اور ڈرائیور نے موٹر سے اتار کر انھیں پلنگ پر لٹا دیا۔

صبح ہوئی شام ہوئی۔ یونہی دن گذر گئے۔ ننھی کا مرض بڑھتا گیا۔ نسیمہ نے سینکڑوں روپیے صدقہ وخیرات میں صرف کردیے۔ ہزاروں روپیے ڈاکٹروں اور حکیموں کی نذر ہوئے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ننھی وسیمہ کا بخار تو اور بڑھتا ہی گیا۔ کچھ دنوں پہلے کی دو سالہ موٹی تازی بچی آج سوکھ کر صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ ہر وقت آنکھیں بند کئے ہوئے اپنی چھوٹی سی مسہری پر پڑی ہوئی کراہتی رہتی اور غمزدہ ماں چوبیس گھنٹے ٹکٹکی باندھے بیٹی کی صورت تکتی رہتی۔ اب وہ خود برسوں کی مریض معلوم ہوتی تھی۔ جس دن سے وسیمہ بیمار ہوئی اسی دن سے اس کی دنیا بالکل اندھیر تھی۔ وہ ہونٹ جو ہر وقت

ہنستے بولتے رہتے تھے اور ہنسنے میں ایک خوشنما پھول جیسے معلوم ہوتے تھے ان پر اب بھولے سے بھی ہنسی نہیں آتی۔

ادھر مسٹر سلیم کے اوقات تفریح اور بناؤ سنگھار میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔ میاں بیوی میں ناچاقی بھی تو کیا آخر تو وسیمہ اسی کی اولاد تھی لیکن خدا جانے کیوں ایک ہندوستانی سچی بیوی کی طرح جس قدر نسیمہ اس پر اپنی جان چھڑکتی تھی سلیم اتنا ہی اس سے دور رہتا۔ . . . . ایک دن اس خاندان سے گہری راہ و رسم رکھنے والے سلیم کے پرانے دوست مسٹر اسلم ملنے اور وسیمہ کی خیریت دریافت کرنے آئے۔ یہاں آکر جو یہ رنگ دیکھا تو سلیم کو آڑے ہاتھوں لیا۔ بڑی شرم و غیرت دلائی کہ مرد خدا تیری ایک ہی بچی اور تجھے اس کا بھی خیال نہیں خدا مجھے ایسی ایک بچی دیتا تو میں اسے آنکھوں سے لگاتا اور دل میں بٹھاتا۔ بیوی تمھاری ایک دو میں نہیں ہزاروں میں انتخاب ہے لیکن تم ہو کہ اِدھر اُدھر انگلو انڈینوں اور کرسٹینوں کے ساتھ گھوما کرتے ہو مسٹر سلیم مسکرائے اور حقارت سے فرمانے لگے کہ جس سے شوہر کا دل نہ بہلے وہ بیوی کیسی؟ وہ وسیمہ کی ماں ضرور ہیں لیکن سلیم کی بیوی۔ . . . . . . جی نہیں کپڑے بدلنے تک کا انھیں ہوش نہیں کیا کوئی اتنا بھی بچوں کے پیچھے برباد ہو جاتا ہے؟ یہ کہکر سگریٹ کا دھواں نتھنوں سے اڑاتے ہوئے باہر تشریف لے گئے اور زور سے پکارا ڈرائیور۔ تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ کلب چلے گئے اور نوکر سے کہدے کہ رات کا کھانا گھر پر نہ کھاؤنگا۔

ننھی وسیمہ کو بخار آئے آج پچیسواں دن تھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے کہ بچی کو بڑی تکلیف کے بعد ذرا نیند آگئی تھی۔ کہ نسیمہ آہستہ سے اٹھی اور اپنی ماں نجمہ کو وسیمہ کے پاس چھوڑ کر آپ سیدھی غسل خانے میں گئی۔ وضو کیا نماز ادا کی پھر یہ بیکس و بے بس ماں اپنے خالق کے آگے سجدہ میں گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی مگر آہ کہ اب وقت دعا کا بھی نہ رہا۔ بیقرار دل کو سنبھالتے ہوئے دوڑی آئی اور ننھی کو دوا پلائی۔ لیکن متلی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر دوا دی وہ بھی نکل گئی اس حالت میں ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر آیا تو دیکھا کہ بچی آخری سانس لے رہی ہے۔ مایوسی کی حالت میں سر ہلانے لگا نسیمہ جو پاس کھڑی ڈاکٹر کا منہ تک رہی تھی اس اشارے کو سمجھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوں کا دریا امنڈ آیا ایک چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ ہوش آیا تو سورج ڈوب چکا تھا مصیبتوں کی کالی رات سر پر کھڑی تھی بدنصیب نسیمہ اپنی لخت جگر نور نظر امیدوں کے چمن کو اجڑتے ہوئے حسرت سے دیکھ رہی تھی جس پر نزع کا عالم طاری تھا۔ . . . . . . تمام عزیز جو ایک پل کے لئے بھی ننھی وسیمہ سے الگ نہ ہونا چاہتے تھے۔ بے قرار اور اشک بار تھے اسی عالم کرب میں وسیمہ کی زندگی کی آخری رات کا بڑا حصہ گزر گیا سارے کمرہ میں ہو کا سا عالم چھایا ہوا تھا۔ جلنے کے جاڑے تھے آتشدان کی آگ تک سرد ہو چکی تھی لیکن اس کا بھلا اسے کیا احساس ہو سکتا تھا جس کے گلشن امید میں صرف ایک ہی کلی آئی اور بن کھلے ہی مرجھا گئی۔ . . . . .

.... اتنے میں پاس کے مکان سے گراما فون پر رکارڈ لگا۔

"من مورکھ کیوں دیوانہ ہے

آج رہے کل جانا ہے"

چند لمحوں کے اندر ایک بھیانک قہقہے کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا سب کے سب چونک پڑے مست و مخمور سلیم شراب کے نشہ میں جھومتا ہوا آگے بڑھا۔ اور نسیمہ سے (جو اس کے اس انداز بےخودی سے برہم ہو کر اس کو شور مچانے سے منع کرنے کے لئے کھڑی ہوئی تھی) کہنے لگا آؤ ڈارلنگ ڈانس کریں۔ ہو ہو ہا۔ ہا ہا ہا! ! نسیمہ کو اب تاب نہ رہی۔ پوری طاقت سے اس حیوان سے بدتر انسان کو ایک دھکا دیا اور زمین پر گرا دیا۔ پھر ننھی وسیمہ کی طرف متوجہ ہوئی ننھی کے چہرے پر اب تکلیف کے کوئی آثار نمایاں نہ تھے۔ چہرے پر سکون تھا اور خفیف سی مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ وسیمہ پیاری وسیمہ مر چکی تھی نسیمہ اپنی بچی کی لاش سے چمٹی رو رہی تھی عزیز و اقارب نے بھی کہرام مچائے ہوئے تھے نتیجہ آخر وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی سلیم نے نسیمہ کو طلاق دے دی اور مس شیاما کے پھندے میں پھنس گئے۔ ساری دولت شراب و جوئے میں اڑا چکے۔ اور فرائض ملازمت میں کوتاہی اور غفلت برتنے لگے تو ملازمت سے برطرف کر دئے گئے۔ آخر ایک دن اس مغرب پرست کی موت اسی شیاما کے ہاتھ سے گولی کھا کر ہوئی جس پر وہ نثار تھا۔

مس فرحت قطب الدین

سینیر انٹرمیڈیٹ

پھنسی جو دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے — کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں — میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

قریب ہے یار روز محشر چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر — جو چپ رہیگی زبانِ خنجر، لہو پکاریگا آستیں کا

امیر مینائی

میسور کا دسہرا

آیئے آج ہم آپ کو اس مسعود تقریب کی ایک جھلک دکھائیں جس کا پرتگالی سیاح ڈامنجو ئیز ( ) نے ایک نظارہ کیا تھا جسے دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو گیا۔ اور کھو سا گیا تھا سلطنت وجیانگر کے تہوار دسہرہ کی تقریب عبدالرزاق نے بھی دیکھی تھی اس ایرانی سفیر کی رائے ہے کہ یہ تقریب نہایت پر تکلف اور شاہانہ طریقہ پر منائی جاتی ہے۔ یہ سیاح دنیا کے عرض و طول کی سیاحت کر چکے تھے اور وہاں کے مشہور اور خصوصی تہوارات کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس قدر شان و شوکت انہوں نے کسی ملک کی رسم میں نہیں پائی۔

سلطنت وجیانگر راجہ کرشن دیو رائے دوم کے دور میں انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی اور اسی زمانہ میں پرتگالی سیاح یہاں آ پہنچا تھا۔ راجہ کی خواہش اس تہوار کو اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانہ پر منانے کی ہوتی تھی۔ اس طریقہ پر دسہرہ کا تہوار جس آب و تاب سے وجیانگر میں منایا جاتا تھا ہندوستان کے کسی حصہ میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا۔ سلاطین کے سلسلہ میں تبدیلی ہوتی گئی اور دسہرہ سال بہ سال زیادہ سے زیادہ بارونق اور دلکش بنتا گیا۔

اس سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ آپس کی پھوٹ۔ خانہ جنگی اور بیرونی فتوحات سے دارالسلطنت متاثر ہوا لیکن صوبہ دار والے اس کی عظمت اور دسہرہ کی تقریب میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ کنڑی حصہ راجہ وڈیار کے زیر حکومت آیا اور میسور اس کا دارالسلطنت قرار پایا۔ اس راجہ نے بھی دسہرہ کے تہوار کی اہمیت اور اس کے منانے کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ کی چنانچہ جس آب و تاب سے دسہرہ آج کے دن ریاست میسور میں منایا جاتا ہے اس کی مثال ہندوستان بھر میں نہیں ملتی۔ اس کے دیکھنے کے لئے زائرین ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے آتے ہیں۔ اس طرح یہ پر شوکت تہوار میسور کے مہاراجوں کے ورثہ میں آیا۔ ہر شخص یہی کہہ رہا ہے "واقعی یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے"

اس تہوار کا آغاز آج سے نو دن قبل ہوتا ہے۔ اور تسلسل کے ساتھ راجہ کے محل میں جاری رہتا ہے۔ دیکھئے محل کس قدر عالی شان اور بارونق ہو گیا ہے۔ اس کے ستون ہاتھی کی شکل میں تراشے گئے ہیں اور وہاں ساتھ ساتھ دوسرے نقش و نگار بھی برابر ہیں۔ سامنے دیکھئے کیا وسیع میدان ہے۔ یہ پتھر کا فرش

مہاراجہ کے محل میں لے جاتا ہے۔ یہ رنگا رنگ کپڑے جو ٹانگے گئے ہیں وہ یہاں کی رسم ہے۔ ان پر خوب صورت پھول بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ کپڑے نہایت بیش قیمت ہیں اور رنگ عموماً سنہرا اور سرخ ہے۔ اچھا اب اندرونی حصہ کا معائنہ کریں۔

اس نہایت وسیع ایوان میں مہاراجہ کا دربار ہوتا ہے۔ دیکھئے کس سلیقہ سے اس کو سجایا گیا ہے۔ دیواروں پر دیوتاؤں کی قلمی تصاویر ہیں۔ آگے بڑھئے! ادھر ایک طرف ایک خاص تخت رکھا ہے۔ جس پر درگا دیوی کی پوجا ہوگی۔ کیونکہ انہی کی شکتی کی بدولت سری رامچندرجی مہاراج راون کو گھائل کرکے فتح پا سکے تھے۔ اور یہ تہوار ان کی فتح منانے کا ہے۔ ہاں دیکھئے دیوی کے سنگھاسن کے نیچے ایک جانب مہاراجہ کا تاج ہے کیسے قیمتی جواہرات جڑے ہیں۔ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کوئی اس کو آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ دوسری جانب مہاراجہ کے موروثی پائل ہیں، جس میں زمرد۔ موتی اور ہیرے لگے ہیں۔ اب ادھر پلٹ کر دیکھیں۔ اس ایوان کے ختم پر مہاراجہ کا تخت ہے جو دیوی کے تخت کے بالکل مقابل ہے۔ اس تخت کو ببر والا تخت کہتے ہیں کیونکہ دیکھئے ایک ببر جو پورا سونے کا بنا ہوا ہے تخت کی نگہبانی کر رہا ہے۔ اور آج اس کا بھی سنگار ہوا ہے قیمتی زیور سے وہ بھی آراستہ ہے ببر کے سامنے جو مخملی گدا ہے اور جس کے اطراف تین لڑیں موتیوں کی ہیں وہاں مہاراجہ تشریف رکھتے ہیں۔

آج کے دن سے نو روز قبل اس تہوار کا آغاز ہوا۔ چہل پہل اور رونق ابتدا ہی سے ہے لیکن اس میں اضافہ ضرور ہے۔ مہاراجہ نو دن سے برت رکھ رہے ہیں۔ اب وہ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر اس ایوان میں داخل ہوئے ہیں۔ سامنے میدان کی طرف نظر دوڑائی ہے ہیں تو ایک ہجوم نظر آ رہا ہے دیکھئے! کیا بھیڑ ہے غالباً یہ یہاں کا سب سے بڑا میلا ہے۔ ادھر غور سے دیکھئے۔ یہ جو چند سفید وردیاں پہنے نظر آ رہے ہیں وہ سلطنت کے امرا ہیں اور عہدہ دار بھی۔ یہ اپنے ہمراہ فوج لے آئے ہیں جو اس وقت آپ کو میدان میں دکھائی دے رہی ہے۔ جملہ فوج نہایت سلیقہ کے ساتھ کھڑی ہے۔ سب سے آگے پیادہ فوج ہے۔ ان کی وردی اس سلطنت کے مخصوص رنگوں کی بنی ہے یعنی سرخ و سبز۔ فوج باضابطہ ہے۔ نہایت باقاعدہ۔ یہ کسی مہم کی تیاری نہیں بلکہ جلوس کی تیاری ہے۔ پیادہ فوج کے بعد سوار ہیں وہ جو اپنی گردنیں ہلاتے کھڑے ہیں وہ بے چین گھوڑے ہیں۔ دیکھئے! انسان تو انسان جانور بھی اس سج دھج سے کھڑے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یقیناً کوئی غیر معمولی تہوار ہے۔ ان کی پیشانیوں پر چاندی کی ڈھالیں لگی ہیں۔ باگیں تو آپ نے دیکھی نہیں۔ ریشمی بٹے ہوئے تاگوں کی ہیں۔ اور چار جامے اور زینیں کیسی خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ سب سے پیچھے وہ جو سمندر کی طرح بے تاب اور بادل کی طرح گرج رہے ہیں وہ

آپ جانتے ہی ہیں یہ ریاست میسور کی خاص پیداوار ہیں۔ ان کے سفید لانبے دانت اور ان کی پیشانیوں کانوں اور سونڈوں پر مختلف نقش و نگار آج ان کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہے ہیں یہ ان کی پشت پر جو کوناڈبہ جیسا رکھا ہے وہ تو عماری ہے۔ ان کی جھول دیکھئے کیسی سرخ ہے اور اس پر زرین کام کیسا عمدہ ہے۔ انھیں بھی زیور پہنائے گئے ہیں۔ یہ زیور آج کے نہیں بلکہ صدیوں کے ہیں ان کی زینت واقعی بہت کچھ بڑھ گئی ہے۔ خیر یہ تو آپ نے دیکھ لیا۔

ذرا نیچے کی طرف دیکھئے یہ ٹولیاں کیا ہیں! چھوٹی چھوٹی لڑکیاں مختلف جماعتوں میں گا بجا رہی ہیں تاکہ عوام کو بار نہ گزرے اور دل لگی ہو جائے۔ ان گانوں سے دیکھئے لوگ کیسے محظوظ ہو رہے ہیں کوئی تو اپنی گردن ہلا رہا ہے۔ کوئی واہ واہ کر رہا ہے۔ اور کوئی اس کے بدلے جیب سے پیسہ نکال رہا ہے۔ یہ ان کا خراج تحسین ہے۔ اچھا لو۔ مہاراجہ برآمد ہو رہے ہیں۔ یہ کیا! پجاری بھی ساتھ ہیں اور پجاری کے ہاتھ میں جو بڑا کٹورہ ہے اس میں کیا ہے۔ اچھا سفید گلاب کے پھول ہیں اور دوسرے ہاتھ میں عطردان۔ اوہو کیا بڑا عطردان ہے۔ اس میں تو تولہ نہیں بلکہ سیروں عطر آتا ہوگا! ہاں صاحب یہی تو شان ہے۔ اچھا اب اس رسم کو غور سے دیکھئے! مہاراجہ گلاب کے پھول گھوڑوں پر پھینک رہے ہیں اور تین دفعہ پھینکیں گے۔ اس کے بعد عطر بھی پھینکا جائے گا۔ آج ہی سواری کی پوجا ہوتی ہے۔ بالخصوص گھوڑے اس لئے یہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ارے۔ یہ کیا۔ ہاتھی کیوں آرہے ہیں۔ اچھا اب ان کی بھی پوجا ہوگی ٹھیک ہے۔ چلئے صاحب یہ تو رسم ختم ہوئی۔ اب راجہ کے ساتھ چلیں اپنے پھر وہی ایوان میں۔ راجہ اپنے تخت پر رونق افروز ہو رہے ہیں۔ اور دونوں جانب سے امرا، ممتاز عہدہ داران آداب بجا لا رہے ہیں اور بعض تو نذر بھی پیش کر رہے ہیں۔ یہ بھی ختم ہوا۔ اب برخواست کا وقت ہے کیونکہ بارہ بج چکے ہیں۔ اور پھر تین بجے سے نظام العمل شروع ہوگا۔ سارے لوگ اسطرح واپس ہو رہے ہیں۔ جس طرح کہ آئے تھے۔

اوہو! یہ کیا ہے! یہ ہجوم کیسا۔ صاحب تین بج رہے ہیں اس لئے سب کے سب جوق جوق چلے آرہے ہیں اور پھر راجہ کے محل کی طرف ہی۔ ہاں! اس میدان میں جمع ہوں گے۔ یہ رنگا رنگ وردیاں لوگوں کی بہار واقعی دیکھنے کے لائق تو ہے۔ کیا خوب تماشہ ہے۔ یہ دیکھئے فوجی عہدہ دار اپنے اپنے سپاہیوں کو ٹوکتے پھر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کو منظم رہنا چاہئے۔ اچھا۔ مہاراجہ بھی آگئے دربار کا ایوان بھرا ہوا ہے۔ لباس نہایت سادہ پہنے ہیں جسم پر سفید سلک کی پوشاک ہے۔ اور روپہلی طلائی کام کی زرین پگڑی گلہ اور ہاتھ جواہرات سے لدے پڑے ہیں۔ امرا بھی موجود ہیں۔ اب مظاہرہ ہوگا۔

دیکھئے وہ لوگ جو ڈھال، بھالہ اور کمان وغیرہ لئے گذر رہے ہیں وہ اپنی اپنی فوج کے کپتان ہیں۔ یعنی سردار اور موری فوج کے کپتان بھی ہیں۔ اچھا یہ لوگ آگے بڑھ رہے ہیں شائد مہاراجہ کے پاس آ رہے ہیں ہاں۔ دیکھئے وہ جو مہاراجہ مختلف چیزیں دے رہے ہیں وہ ان کا انعام ہے۔ اچھا ادھر تو دیکھئے میدان کیا ہے دنگل بنا ہوا ہے واہ واہ کشتی ہو رہی ہے۔ یہ بھی خوب رہی۔ واہ جناب پہلوان بھی خدان ہیں۔ یہ جو راجہ سے انعام پا رہے ہیں وہ کامیاب پہلوان ہیں۔

سورج غروب ہونے کو آیا۔ اور چوطرف مشعل جلنے لگے۔ آن کی آن میں میدان اور سارا شہر بقعۂ نور بن گیا دیواروں پر بھی شمعیں رکھی گئی ہیں۔ اور اس وسیع میدان میں سوار وغیرہ اپنے کرتب کے مظاہرے کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ناچنے والے گانے والے اور قصہ کہنے والے۔ تماشہ دکھلانے والے رسی پھیرنے والے اپنے کمالات دکھا کر پیسہ کما رہے ہیں۔ گرگوں کی آواز سے تو ناک میں دم ہے۔ یہ تو اچھا خاصہ میلہ ہے۔ یہ اونچی گاڑی نما کیا چلی آ رہی ہیں۔ جناب یہ رتھ ہیں جو قدیم زمانہ میں استعمال ہوتے تھے کس سلیقہ سے انھیں آراستہ کیا گیا ہے۔ ان کے پیچھے شاہی گھوڑے آ رہے ہیں۔ اچھا یہ درمیان سب سے بہتر سجا ہوا گھوڑا بلا سوار کے چلا آ رہا ہے۔ وہ کس کے لئے۔ اس پر تو مہاراجہ سوار ہو رہے ہیں۔ دو پیدل آدمی زرین چھتریاں لئے ان کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ جلوس کی صورت میں میدان کے گرد دو مرتبہ چکر لگا رہے ہیں اور پھر صفوں میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ وہ دیکھے اس بھیڑ کو چیرتے ہوئے گرد مہاراجہ جن کے ہاتھ میں ایک کٹورہ ہے۔ اور پیچھے دو چیلے ہیں چلے آ رہے ہیں۔ اس کٹورے میں نظر تو ڈالیں۔ واہ اس میں تو ناریل۔ چاول اور پھول ہیں۔ منتر پڑھ کر کٹورے پر گلاب کے پھول رکھ رہے ہیں گھوڑوں پہ پانی کی چھینٹیں پڑیں اور وہ چلے۔ مہاراجہ اب اندر داخل ہو رہے ہیں۔ اچھا اب پھر اسی ایوان میں چلیں پجاری دیوی کی مورت اٹھا رہے ہیں۔ گویا اب مہاراجہ اپنا برت توڑ سکتے ہیں۔

یہ لیجئے دسواں دن "دسہرا" ہے یہ آخری دن ہے۔ ساری فوج پیادہ اور سوار سب ہی جمع ہیں۔ مہاراجہ ان کا معائنہ فرما رہے ہیں۔ مہاراجہ گھوڑے پر سوار ہیں۔ ہر سپاہی اپنے سردار کی دی ہوئی نئی وردیاں پہنے ہے۔ گھوڑوں پر بھی چین اور ایران سے منگوائی ہوئی مخملی جھول ڈالی گئی ہے۔ ہاتھی زرق برق جھول اوڑھے نہایت شاندار دکھائی دے رہے ہیں۔ کیا مجمع ہے۔ اللہ کی پناہ راستہ میں چیونٹی تک کے چلنے کی گنجائش نہیں۔ شانہ سے شانہ ٹکرا رہا ہے۔ ہر شخص مست ہے۔ زمین کا چپہ چپہ تماشہ بینوں سے بھرا ہوا ہے۔ مہاراجہ کی پوشاک بدل گئی ہے۔ اب ایک خاص لباس زیب تن کئے ہوئے

ہیں سب سے آگے ہاتھی جھومتے جھامتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے بعد بیس نہایت اعلیٰ پیمانہ پر آراستہ کئے ہوئے گھوڑے ہیں۔ بیچ میں مہاراجہ گھوڑے پر سوار ہیں۔ ان کے پیچھے یہ ڈولی کیا ہے۔ نہیں ڈولی نہیں پالکی ہے۔ اس میں دیوی کو بٹھایا گیا ہے۔ اب یہ جلوس شہر کے باہر جائے گا جہاں پر ایک مخملی ڈیرا دیوی کے لئے تانا گیا ہے۔ لیجئے وہ آگیا۔ اچھا راجہ بھی اتر پڑے۔ راجہ تیر کمان سنبھالے ہیں اور دیکھئے وہ تیر ہے۔ ایک دو۔ تین۔ مہاراجہ پھر سوار ہوگئے۔ جلوس واپس لوٹ رہا ہے۔ امراء و ممتاز عہدہ دار مہاراجہ کے جلو میں پیدل چل رہے ہیں۔ محل کے سامنے ہجوم پھر جمع ہے۔ مہاراجہ اترے۔ اور اندر چلے جا رہے ہیں۔ باہر مجمع نعرے لگا رہا ہے۔ ذرا غور سے سنئے! کیا! اچھا "مہاراجہ کی فتح ہو" "وجے بھوتیشوری کی کرپا ہو"۔ واہ صاحب واقعی بڑا دلچسپ نظارہ تھا۔ دسہرا اب ختم ہوا۔ لوگ اپنے اپنے گھر واپس ہو رہے ہیں۔ اب خوب رنگ رلیاں مچینگی۔

تیج نرائن
بی۔ اے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

آتش

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

دل کو نالوں کی دمِ نزع ہوس باقی ہے منزل آخر ہوئی فریادِ جرس باقی ہے

اسیر

کہتے ہیں جسکو عشق ــــــــ؟

ڈاکٹر ارشاد سائنس کے پروفیسر تھے۔ روئے زمین پر ان کی قوت تخلیق کے دو بے مثل شاہ کار تھے ایک تو معرکۃ الآرا تصنیف عجائبات سائنس اور دوسرے ان کی اکلوتی لڑکی نجمہ۔ کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو شہر کی طرف بھاگتا ہے لیکن جب ہم جیسے نوجوانوں کی شامت آتی ہے تو تجربہ خانے اور لکچر روم میں آ پھنستے ہیں میں سائنس کے کسی مسئلہ پر تحقیق کر رہا تھا اور اس تحقیقات کے دوران میں پروفیسر ارشاد سے ہماری خوب گاڑھی چھننے لگی۔ میری علمی کاوش تو خیر بے سود ثابت ہوئی تھی اور ہوئی لیکن اس کا سب سے خوش گوار نتیجہ میری اور نجمہ کی ملاقات تھی۔ نجمہ کچھ حسن کی پتلی نہ تھی۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا، چہرہ مہرہ درست۔ رنگ چمپئی تھا اور صورت نمکیں۔ فرائڈ کے اصول تحلیل نفسی اور اردو کے پرانے افسانے نگاروں کی ڈگر کے موافق ہم کسی نامعلوم اثر کے تحت، نجمہ کی طرف دن بدن کھنچتے چلے جا رہے تھے اور کسی کے بندہ بے دام بن چکے تھے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان منطقہ حارہ میں واقع ہے۔ اور یہاں عشق کئے کب دیر لگتی ہے خصوصاً جب کہ فرصت زیادہ ہو اور عقل کم۔

بہر حال ہم عشق کے دھارے پر بہے چلے جا رہے تھے۔ عاشق صادق تو خیر اس چودھویں صدی میں عنقا ہے لیکن ہم ایک عاشق کامل بننے کے لئے جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ غالب نے کہدیا ہے نہ "کہتے ہیں جسکو عشق خلل ہے دماغ کا" ہم نے تمام نام نہاد عاشقوں کی سوانح عمریاں پڑھ ڈالیں۔ غلط وزن کے اشعار کہنے کی بھی عادت کر لی اور ٹھنڈی آہیں بھرنا بھی سیکھ لیں۔ زبان پر حسرت و یاس کے اشعار رواں رہتے کسی فالتو کاغذ پر اپنے دستخط کی بجائے نجمہ کا نام لکھ چھوڑتے۔ کھڑکیوں اور کواڑوں کو بھی ان چاند ستاروں سے محروم نہ رکھا۔ الغرض ہم اردو شاعری کے روایتی عاشق کی زندہ تصویر بن گئے کچھ دنوں کی مشق کے بعد ہم شکسپیر کے نوجوان ہیرو رومیو کی ہمسری کرنے لگے اور کیا نل، کیا قیس اور کیا فرہاد ہم سب کا سوانگ بھر سکتے تھے۔ آخر میں مضمون نگاری کا خبط سر پر سوار ہوا اور ہم رسالۂ نوید کے قلمی معاون بن گئے لیکن ہمارے مضامین "اسیر" کے فرضی نام سے شائع ہوتے رہتے تھے۔

کئی دن یونہی بیت گئے۔ بیکاری کے تمام مشاغل۔ شاعری، مضمون نگاری اور عشق، ان تینوں سے ہم کو خاص لگاؤ تھا۔ آخر کار ہم نے سوچا کہ آخر اس درد دل کا کچھ انجام بھی تو ہو۔

کیڑے پتنگوں کی طرح مفت میں جل مرنا کونسی عقلمندی ہے، اس صدی کا معاشی انسان تو کسی نہ کسی مقصد کے تحت کام کرتا ہے ابتدائے عشق سے لے کر اب تک، یہ پہلا موقع تھا کہ ہم کو عقل کی بات سوجھی حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح جنگ و جدال شروع ہوتے ہی سچائی اور صداقت ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح عشق کے شروع ہوتے ہی عقل و فہم کو ایک طویل رخصت مل جاتی ہے۔ بڑے غور و خوض کے بعد ہم نے ٹھان لی کہ چلو آج نجمہ سے اپنا حال دل کہہ ہی ڈالیں۔ اپنی گفتگو کا ہم نے کئی بار ریہرسل بھی کر لیا کہ کہیں بھول چوک نہ ہو جائے۔ اس کے بعد ہم نجمہ کے پاس جا پہنچے۔

"اوہو نجمہ یہ کیا پڑھ رہی ہو" میں نے پہنچتے ہی کہا "میں رسالہ نوید پڑھ رہی تھی۔ کیا دلچسپ مضمون ہے" نجمہ نے ورق الٹتے ہوئے کہا "ہاں ہاں بڑے بڑے انشا پرداز اس رسالہ کے معاون ہیں۔ لیکن نجمہ تم سے ایک اہم مسئلہ پر گفتگو کرنی ہے" میں نے کہا۔

"کیوں خیر تو ہے" نجمہ نے مطالعہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

نجمہ اصل تو یہ ہے کہ جب سے میں نے تمھیں دیکھا ہے، جب سے ۔۔۔۔

"لکھنے والے نے تو قلم توڑ دیا۔ سبحان اللہ کیا ستھری زبان ہے، جذبات کی کیا رنگینی ہے واہ" نجمہ نے مضمون پڑھتے ہوئے کہا۔

"نجمہ کیا تم ایک زندہ انسان کے جذبات کی قدر نہیں کر سکتیں۔ تمھارے 'ہاں' یا 'نہیں' پر میری زندگی کا دار و مدار ہے" میں خطیبانہ انداز میں کہا۔

"اور اگر میں جواب نفی میں دوں تو آپ کیا کریں گے" نجمہ نے کہا۔

"کیا کروں گا؟ فوراً خودکشی کر لوں گا نجمہ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ کیا ہے" میں نے کہا۔

"اچھا تو عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں" نجمہ نے ہنستے ہوئے کہا

"نجمہ ذرا خیال کرو۔ میرے عشق کی آگ تو بجھائے نہیں بجھتی" میں نے شاعرانہ لہجہ میں کہا۔

"اور عشق کی آگ لگائے بھی نہیں لگتی ـــ چچا غالب کی سند یاد رہے" نجمہ نے فاتحانہ انداز میں جواب دیا۔

"تو نجمہ تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں" میں نے مایوس ہو کر پوچھا۔

"ہاں نہیں کر سکتی لیکن نفرت بھی نہیں کرتی آخر آپ بھی تو ہم جیسے انسان ہیں نہ" نجمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اِدھر میرا حال برا ہو رہا تھا۔ اس لڑکی کی کٹ حجتی نے تو دم ناک میں کر دیا۔ ان حوا کی بیٹیوں کی زبان کیا ہے تافتہ پر کی قینچی۔ میں نے خیال کیا کہ یہ انکار و تکرار تو شاہدان ناز کا ازل سے شیوہ رہا ہے۔ انہی خیالات میں غرق تھا کہ نجمہ نے پوچھا "مسٹر تحسین! رہنے دو ان سب باتوں کو۔ کیا آپ اس مضمون کے لکھنے والے کو جانتے ہیں۔ کیا مضمون لکھا ہے آسمان سے تارے توڑ لائے ہیں۔ نجمہ نے کہا۔

"آخر ان کا نام تو دیکھو" میں نے جواب دیا۔

نجمہ نے ورق الٹے اور دیکھ کر کہا "مضمون نگار کا نام ہے۔ مسٹر اسیر"

"کیا کیا مسٹر اسیر او ہو" بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ میرا دل بانسوں اُچھل رہا تھا۔ میرے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"کیوں کیا آپ انھیں جانتے ہیں"۔

"ہاں اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ ان سے اپنی ذات سے زیادہ واقف ہوں"۔

"کاش میں اُن سے مل سکتی۔ میں تو ابھی سے اُن کی ہو چکی ہوں"

"تم چاہو تو اب بھی ان سے مل سکتی ہو"۔

"یہ تو کہو کہ وہ آدمی کیسے ہیں"۔

بس مجھ جیسے انسان۔ صورت بھی ذرا مجھ سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن نجمہ مسٹر اسیر پر تو تم ریجھو ہی گی۔ اس اجنبی کے تو نصیب جاگ اٹھے۔ خیر نجمہ۔ میں تمھارا حق خود ارادیت تسلیم کرتا ہوں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ تمھیں مسٹر اسیر جیسا شوہر نہیں مل سکتا۔

نجمہ نے یہ سنکر مارے شرم کے سر نیچے جھکا لیا۔ میں واپس لوٹا۔ مارے خوشی کے پھولے نہ سماتا پاؤں زمین پر نہ پڑتا تھا۔ آج تو سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ میں خوش تھا کہ ہم ہی اصل میں نجمہ کے اسیر تھے۔

اب ہم سوچنے لگے کہ دوسرا محاذ بھی قائم کرنا چاہیئے۔ ہم پروفیسر صاحب کو ہموار کرنے کی تدابیر کرنے لگے۔ ایک دن پروفیسر صاحب تفریح کر رہے تھے۔ ہم بھی جا دھمکے۔ میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے آپ سے ایک نازک مسئلہ پر گفتگو کرنی ہے۔ "ہاں مسئلہ بیان کیجئے مگر دیکھئے سائنس کا ہر مسئلہ نازک ہوتا ہے"۔ پروفیسر صاحب نے کہا "لیکن ڈاکٹر صاحب میرا مطلب زندگی کے ایک اہم مسئلہ سے ہے"۔ میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ اتنے سال پڑھنے کے بعد تم کورے کے کورے ہی رہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سائنس زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے"۔ پروفیسر صاحب کہنے لگے۔

"کاش آپ میرے دل کی دھڑکنیں محسوس کر سکتے" میں نے کہا "میری راتیں تو تارے گنتے کٹ

کٹ جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب"۔

"تارے گنتے ہو۔ کیا علم نجوم میں تحقیق کر رہے ہو۔ تاروں کی تعداد پر سائنس دانوں کے مختلف نظریے ہیں مثلاً سر جیمس جین کا خیال ہے کہ"۔

ان نظریوں کو رہنے دیجئے" میں نے بات کاٹ کر کہا "کیا آپ نے نجمہ کی آئندہ زندگی کے متعلق سوچا ہے"؟

"سوچا ہے لیکن نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ ایک سائنسدان کا یہ خیال ہے کہ نتیجہ حاصل کرنا"۔

"دیکھئے ڈاکٹر صاحب میرے صبر وضبط کا پیمانہ چھلک رہا ہے۔ مجھے نجمہ سے محبت ہے اور امید ہے کہ آپ بھی اس کے موافق ہیں" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"اخاہ! کیا کہا۔ تم اور نجمہ۔ یہ منہ اور مسور کی دال مسٹر تحسین تم اپنی اوقات خراب کر رہے ہو تم علم نجوم ہی میں تحقیق کرتے رہو تمھارے لئے وہی اچھا ہے۔ تاروں کی دنیا بڑی دلفریب ہوتی ہے اس میدان میں بڑے بڑے مفکروں نے نام پیدا کیا ہے"۔

"اچھا ڈاکٹر صاحب تو کہئے یہ ہے آپ کی مرضی۔ خوب۔ خدا حافظ" یہ کہکر میں لوٹ آیا میں نے ریاضی دانوں اور سائنسدانوں کو پانی پی پی کر کوسا کہ ان کے بے ہنگام تذکروں سے ہماری مٹی پلید ہوئی میں نے ارادہ کر لیا کہ ایسی تدبیر کروں گا کہ پروفیسر صاحب سے انتقام بھی لے لوں اور پھر انھیں اپنا زیر منت بھی بنا لوں۔ بڑے غور و فکر کے بعد ایک تدبیر سوجھی مجھے معلوم تھا کہ پروفیسر صاحب روز کشتی میں سمندر کی سیر کیا کرتے ہیں۔ میں فوراً کشتی ران کے پاس پہنچا اور اس کی بڑی منت سماجت کی اور اس سے کہا کہ وہ کل صبح پروفیسر صاحب کی کشتی کو الٹ ڈالے اور میں ان کی جان بچا لوں گا پہلے پہل تو اس بڈھے کشتی ران نے ناراضی ظاہر کی لیکن پیٹ کی خاطر کون کیا نہیں کرتا۔ پیسے کی لالچ میں کون نہیں آتا۔ بڑی ملتیں یونہی پارہ پارہ ہوگئیں۔ یہ تو معمولی کام تھا۔ صرف کشتی کو غرق کر دینا۔ غرض دوسرے دن صبح میں موقعہ واردات پر پہنچ گیا۔ ادھر کشتی کو بڈھے نے ڈبو دیا اور ادھر میں لپکا۔ پروفیسر غوطے پر غوطہ کھا رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پانی کے دباؤ کے اصول بھول گئے ہیں۔ بڑے بڑے سائنس دان بھی ان کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ میں جلدی سے تیرتا ہوا پروفیسر صاحب کے قریب گیا اور ان کا کالر پکڑ کر ساحل کی طرف کھینچ لایا۔ دل میں آئی کہ راستے میں ہی انھیں غرق کر دوں لیکن نجمہ کا خیال دامن پکڑ لیتا تھا۔ ہانپتے کانپتے ڈاکٹر ارشاد خشکی پر تھے۔ میں فاتحانہ انداز میں آگے بڑھا اور کسی طربیہ کے ہیرو کی طرح مسکراتے ہوئے پروفیسر صاحب سے پوچھا "خدا کا شکر کہ آپ کی جان بچ گئی۔ مگر آپ نے تو خوب پانی پی لیا"۔

مسٹر تحسین "میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں تم نے میری جان بچا کر نہ صرف نجمہ کے حال پر رحم کیا ہے بلکہ دنیائے سائنس بھی تمہارے زیر احسان رہے گی"۔

"اگر میں نہ ہوتا تو آپ اب تک سمندر کی تہ میں ہوتے"۔

"اُف اور دنیا ایک بڑے سائنسدان کو کھو چکتی۔ کل اخبارات میری حسرتناک موت پر مضامین لکھتے۔ ہر جگہ تعزیتی جلسے ہوتے، مدرسوں کو چھٹی مل جاتی لیکن تم نے مجھکو موت کے منہ سے نکال لیا"۔

"پروفیسر صاحب آپ کی تو جان بچ گئی لیکن کیا آپ میری جان نہیں بچا سکتے کیا آپ مجھے نجمہ سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے"۔

"ہاں مسٹر تحسین۔ میں راضی ہوں میں پھر کہتا ہوں کہ آج کے دن تم نے سائنس کی دنیا کو میری ہستی سے محروم نہ ہونے دیا" "تم قابل مبارکباد ہو"۔

اب میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ پروفیسر صاحب بھی میرے مرہون منت ہو گئے۔ اُدھر نجمہ کے تصور میں ہم مسٹر آسیر کے روپ میں جلوہ گر تھے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں واللہ ہم نے تو میدان مار لیا۔ اب باقی ہی کیا تھا۔ پروفیسر صاحب کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ اب مجھے صرف نجمہ کو یہ یقین دلانا تھا کہ ہم ہی مسٹر آسیر ہیں۔ کئی دن یوں ہی گذر گئے ایک دن میں نے تہیہ کر لیا کہ آج نجمہ پر سارا راز منکشف کر دیا جائے پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ۔ اسی خیال سے میں پروفیسر صاحب کے گھر پہنچا۔ ڈاکٹر ارشاد کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر ان کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ میں حیران تھا کہ خیر ہی ہو یہاں تو گھر کا باوا آدم ہی بدلا ہوا ہے "وہ رذیل اور کمینے کہیں کے" پروفیسر صاحب نے غضبناک ہو کر کہا۔ "دیکھئے ڈاکٹر صاحب" میں نے کہا "آپ اپنے داماد کی شان میں کیا فرما رہے ہیں" "بس بس زیادہ نہ کہو تم نے میرے خلاف سازش کی مجھے دھوکہ دیا۔ تمہارے اشارہ پر کشتی ران نے کشتی الٹ ڈالی۔ میری خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر تم میری جان سے کھیلنا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے" پروفیسر نے ایک سانس میں کہا بازو کے کمرے سے ایک ہلکے سے قہقہے کی آواز آئی میں سٹ پٹا گیا۔ یا اللہ یہ کیا نئی آفت آ پڑی۔ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ پروفیسر صاحب کے غصہ کا پارہ اور چڑھ رہا تھا لیکن میں پلٹا اور سیدھا گھر لوٹا۔ بڈھے ملاح کو بہت برا بھلا کہا لیکن اس بیچارہ کا زیادہ قصور نہ تھا جب سے پروفیسر صاحب نے پانی میں غوطے کھائے تھے جب سے غریب ملاح کا روزگار بھی ڈوب گیا۔ لوگ اس پر انگلیاں اٹھاتے اور پھر آمدنی کا ذریعہ بھی مسدود ہو گیا تھا۔ بھوکا کیا نہ کرتا اپنی صفائی کی خاطر اور اپنی ساکھ دوبارہ قائم کرنے کے لئے بڈھے نے میرا راز طشت از بام کر دیا۔

اقبال کے یہاں خودی ایک باطنی قوت اور احساس کا نام ہے جس کو مسلسل کوشش، بلند ہمتی، اور عالی حوصلگی سے حیاتِ جاوید بخشی جاسکتی ہے۔ اس مقام پر اندرونی خلفشار اور بیرونی رکاوٹیں خود بخود قوت ارادی کی تابع ہو جاتی ہیں اور اس جدید قوت سے زندگی سنوارنے کے لئے تعمیری جد و جہد شروع کی جاسکتی ہے

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

خودی کی استواری کے لئے محبت (جو یقین علم و عمل پر مشتمل ہے) احساس غیرت اعلیٰ نصب العین نظم و ضبط اور آزادی ضروری عناصر ہیں۔ اقبال آزادی پر زیادہ زور دیتے ہیں کیونکہ غلامی میں زندگی کا سرچشمہ جو بحر ذخار سے بھی زیادہ وسیع ہے اور گہرا ہے خشک ہو جاتا ہے اور حیات بخش قوتیں اخلاقی اقتدار اور ذوق عمل مفقود ہو جاتا ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

فرد کو اپنی ہی قوم و ملت کے تمدن پر عمل پیرا رہنا بھی ضروری ہے، کیونکہ اس طرح اس کو بام ترقی پر پہنچنے کی امید ہو سکتی ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

غیر تمدن کی کورانہ تقلید احساس کمتری پیدا کرتی ہے جو اصلاح کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ

خودی کے ارتقا میں سب سے بڑی رکاوٹ سوال (دست طلب دراز کرنا۔ خیرات کے طور پر مانگنا) سے پیدا ہوتی ہے۔ سوال کے ساتھ ہی غیرت انسانی کا خون ہو جاتا ہے اور احساس غیرت جو تکمیل کے لئے لازمی ہے مفقود ہو جاتا ہے سوال درحقیقت درد کا درمان نہیں ہے بلکہ دوسروں کے سامنے اپنی کمتری کا اعتراف ہے کیونکہ سوال سے شدت غیرت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے

از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلی نخل سینائے خودی

وائے بر منت پذیر خوان غیر
گردنش خم گردۂ احسان غیر

چوں حباب از غیرت مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

اقبال کے نزدیک خودی خود ایک حقیقت ہے گو اپنے ابتدائی مدارج میں وہ تشنۂ تکمیل ہوتی ہے لیکن مناسب تعلیم سے جس کا مقصد ذوق یقین اور قوت عمل کی تشکیل ہے خودداری اور غیرت کی تعمیر کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کی ترقی کی راہ میں موت بھی مانع نہیں کیونکہ موت صرف ظاہر زندگی کے خاتمہ کا نام ہے۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی
موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

پیہم جانفشانی سے خودی میں ترقی ہوتی ہے اور آخر کار منزل مقصود تک رسائی ہو جاتی ہے یعنی اس حد پر قرب یزدانی حاصل ہو جاتا ہے۔

خودی کی خلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

غالب نے اسی مطلب کو اپنے ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

دراصل مصرع اولیٰ میں غالب نے تمام صوفی فلسفہ کی تشریح کر دی ہے صوفیائے کرام کے اس عقیدہ کی تشریح کہ کائنات ذات باری کی مظہر ہے اس سے بہتر پیرایہ میں ممکن نہیں لیکن اقبال نہ تو اس تصور کے حامی ہیں اور نہ "ہیگل" کے نظریہ "عالمگیر حیات" کے۔ وہ کہتے ہیں کہ خودی منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد بھی اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔ اور اس کی وحدت فنا نہیں ہوتی اس کا سبب یہ ہے کہ بلندی کی اس منزل پر پہنچنے سے قبل ہی اسے نظم و ضبط کے سخت امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے اور جب وہ اس اوج پر پہنچتی ہے تو لافانی ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ کیا انسانی خودی (جو ایک محدود شئے ہے) اپنی وحدت ربانی خودی

کے سامنے (جو ایک غیر محدود شئے ہے) برقرار رکھ سکتی ہے؟ یا بالفاظ دیگر محدود قوت غیر محدود قوت کے ساتھ قائم رہ سکتی ہے؟ اقبال اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں ان کی دلیل ہے کہ خودی کی "گہرائی" اصل شئے ہے نہ کہ "وسعت" جس طرح آفتاب عالمتاب کی خیرہ کن روشنی میں مومی شمع اپنا نور قائم رکھتی ہے اس طرح انسانی خودی اپنا وجود قائم رکھتی ہے

تصوف کے عقیدہ کے خلاف اقبال کی تشریح خودی ایک اہم ترین حقیقت رکھتی ہے۔ خودی کی ترقی کا مقصد انفرادیت کو کھو دینا نہیں ہے بلکہ اس کا مزید تیقن ہے نیٹشے کے نزدیک لافانیت کائنات کے میکانی عمال سے قائم ہے اور آدمی اسے برداشت کرنے پر مجبور ہے۔ اقبال کے لئے لافانیت ایک مقصود ہے جو ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ صرف وہی اسیں کامیاب ہوتے ہیں جو اپنی خودی کو بعض تدابیر سے بڑھاتے ہیں

اس قدر بحث و تمحیص کے بعد یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نیٹشے سے اقبال کس حد تک متاثر تھے۔ ان دونوں میں اختلاف ہونے کے باوجود مشرقی فلسفہ کس حد تک نیٹشے کا رہین منت ہے یعنی کیا اقبال کا فلسفہ اپنا ذاتی ہے یا دوسروں کے خیالات پر ایک اضافہ ہے۔

مغربی مصنفین کا یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ تمام ایشیائی فلسفیوں پر "ادبی سرقہ" کا الزام لگاتے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے عقلمند لوگوں نے ایک ہی بات کہی ہے۔ ایک طرح دنیا میں کوئی بات نئی نہیں ہے، بلکہ پرانی شراب کو ہی نئے شیشوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نیٹشے نے اقبال کے خیالات پر اثر ڈالا ہے تو بھی اقبال کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

اگر زندگی کی خواہش ہے تو خطرہ جو اور خطرہ پسند بن جاؤ۔ انسانی حیات کا مقصد ماحول کی تسخیر

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اس کا مزید ثبوت وہ یوں پیش کرتے ہیں کہ "از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید"۔ "میں ہر شخص کو سپاہی اور ہر عورت کو اچھی ماں دیکھنا چاہتا ہوں"۔

یہ اور دیگر بہت سے اقتباسات اقبال کی نظموں اور تقریروں سے پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نیٹشے سے ضرور متاثر ہے۔ اقبال کے ہیرو اگوسٹے نپولین اسٹینل۔ وہی ہیں جو نیٹشے کے ہیں

اقبال کا "انسان کامل" نیٹشے کے "فوق البشر" سے ملتا جلتا ہے لیکن اقبال نے خیال نیٹشے سے مستعار نہیں لیا جس طرح نیٹشے نے یہ خیال شوپنہار یا کارلائل سے مستعار نہیں لیا ہے۔ اقبال کا کامل انسان اخلاق فاضلہ کا نمونہ ہے اور اپنی زندگی میں اعلیٰ اقدار کو تخلیق کرتا ہے۔ نیٹشے کا "فوق البشر" کسی اخلاق کا قائل نہیں"

اس کے نزدیک کشمکش حیات میں نیکی کے بجائے قوت درکار ہے تاکہ کمزوروں پر فوقیت حاصل کی جاسکے اقبال کا انسان کامل خودی کی تکمیل کے لئے مسلسل کوشش اور پیہم عمل سے کام لیتا ہے اور فطرت کی تسخیر کی جدوجہد کرتا ہے لیکن اس جدوجہد میں اخلاق کا دامن اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا نیٹشے کا "فوق البشر" اخلاقی اقدار کو کمزوری پر محمول کرتا ہے اور خیر وشر کو اضافی حیثیت دیتا ہے نیٹشے خدا کا قائل نہ تھا اس لئے اس کے نزدیک قوی شخص اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش کرسکتا ہے اقبال، انسان کامل میں جلالی اور جمالی صفات کی موجودگی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

جن لوگوں کو اقبال کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے وہ اس سے واقف ہیں کہ اقبال کی فطرت میں خاکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ کبھی کسی بات کو چھپاتے نہ تھے اور صاف کہدیتے کہ یہ خیال فلاں مصنف سے مستعار لیا گیا ہے لیکن نیٹشے کے بارے میں ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط کے دوران میں لکھتے ہیں کہ ان کا فلسفہ خودی نیٹشے کا رہین منت نہیں ہے۔ یورپ جانے سے قبل بمبئی کے ایک رسالہ میں انڈین انٹیکوئی ۱۹۰۰ء میں "انسان کامل" کے عنوان سے ایک مضمون قلمبند کیا تھا اور اس وقت تک وہ نیٹشے سے آشنا نہ تھے مذکورۂ بالا رسالہ میں جو مضمون طبع ہوا تھا اس میں عبدالکریم جیلی کا اثر نمایاں ہے۔

اقبال خاص طور پر جیلی۔ محی الدین ابن عربی ابن خلدون سے متاثر تھے جن کی تحریرات میں "انسان کامل" کے خاکہ کا پتا چلتا ہے۔ ان کے تاثرات اور بھی گہرے ہوگئے جب ان کو یہ علم ہوا کہ یہ خیالات قرآن مجید کی ان آیات سے ہم آہنگ ہیں "(اے بشر) ہم نے تیرے لئے آسمانوں اور زمین کو مسخر کردیا ہے" اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو واضح علامات کے ساتھ بھیجا ہے' کتابیں اور قوانین دئے ہیں تاکہ وہ انصاف کی راہ میں لوگوں کی راہبری کرسکیں۔ اور ہم نے سیف بھیجی ہے جس میں انسان کے لئے بڑے فوائد مضمر ہیں"۔

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ "انسان کامل" کا خیال جرمنی سے اخذ نہیں کیا گیا اس کے ماخذ عربی ذرائع ہیں۔ ان کے فلسفہ میں ایسے خیالات جو طبعزاد نہیں ہوتے ہیں کم وبیش اسلامی ذرائع سے لئے گئے ہیں۔ کم وبیش کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ راقم الحروف اس سے منکر نہیں کہ اقبال مغربی خیالات سے متاثر نہیں تھے ان کی عمر کا کافی حصہ اس کے مطالعہ میں صرف ہوا ہے۔

اقبال خود بھی مغرب کے اثر کو تسلیم کرتے ہیں اور اگرچہ وہ علی ثقافت پر عمل کرنے کے حامی ہیں لیکن دوسروں کی ثقافت سے اچھی باتیں اخذ کرکے ان پر عمل کرنیکو وہ برا نہیں سمجھتے ہیں۔ ابتدائی اسلامی فلسفیوں نے یونانی فلسفہ سے استفادہ کیا۔ اسلامی فلسفیوں سے یورپ نے علم کی روشنی حاصل کی جامعہ قرطبہ سے بیکن نے استقرائی طریقہ کی تعلیم پائی۔ ہزاروں یورپی عالموں نے فیض پایا اسکے بعد مسلمانوں میں ایک طرح کا

ذہنی زوال شروع ہوگیا لیکن اقبال نے مردہ جسم میں پھر جان ڈال دی اور احیاء علوم مشرقی عمل میں آیا۔
جب اقبال نے عبدالکریم جیلی کے تصور "انسان کامل" کی تشریح اپنے مضمون میں کی تب وہ نیٹشے سے بخوبی واقف نہ تھے لیکن بعد میں چل کر اقبال نے نیٹشے کا کافی مطالعہ کیا۔ وہ اپنی نظموں اور تقاریر میں نیٹشے کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ انہوں نے نیٹشے کو سمجھنے میں غلطی نہ کی حالانکہ یورپ اور جرمنی کے اکثر لوگ اسے مجنون سمجھتے تھے جو خیالات کی دنیا میں کھویا ہوا رہتا تھا۔ اقبال نے "جاوید نامہ" میں لکھا ہے کہ نیٹشے کا جنون فی الحقیقت دیوانگی نہ تھی بلکہ روحانی ارتقار کا ایک درجہ تھا۔ خودی کے ارتقار کے کئی مدارج ہیں۔ ان میں سب سے پہلا درجہ خود شناسی کا ہے۔ خودی کے ذریعہ یہ خود شناسی الحاد کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ اس دور میں اپنی ذات ہی اہم ترحیثیت حاصل کر لیتی ہے اس دور سے گذرنے کے بعد وہ درجہ آتا ہے جب اپنی ذات سے ہٹ کر خدا کے وجود کا شعور شروع ہوتا ہے۔
لیکن یہ مدارج سخت دشواری سے حاصل ہوتے ہیں۔ راہ میں طرح طرح کی مشکلات ہیں جن کو بغیر عارف؛ رہبر کی رہبری کے طے کرنا سخت دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے بعض لوگ صرف پہلے ہی درجہ میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور اس سے آگے نہیں بڑھتے نیٹشے ان میں سے ایک تھا اس درجہ تک پہنچ جانا ہی خود ایک مشکل امر ہے اور ہر فرد اس تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا اس درجہ کے لوگ عام افراد سے کچھ بالاتر ہیں۔
بال جبریل میں اقبال نے "حکیم نیٹشے" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔

حریف نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم
نگاہ چاہئے اسرار لا الٰہ کے لئے
خدنگ سینۂ گردوں ہے اس کا فکر بلند
کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لئے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی
ترس رہی ہے مگر لذت گنہ کے لئے

اثبات خودی اور انکار خدا پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اس غلطی کا منبع دماغ ہے نہ کہ دل ذہنی غلطیاں نظر انداز کی جا سکتی ہیں۔ "پیام مشرق" میں اقبال نے نیٹشے کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا دل سچا معتقد تھا لیکن اس کا ذہن کافر تھا۔ ایسی مثالیں شاذ ہیں۔ اور اس غلطی کی وجہ روحانی رہبری کا فقدان ہے۔
"جاوید نامہ" میں اقبال نے "مجذوب" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ اس میں اس نے بتایا ہے کہ کس طرح نیٹشے کو جو فی الواقع مجذوب تھا مجنون سمجھا گیا۔ لوگ اس کے خیالات کی رفعت

تک نہ پہنچ سکے نیٹشے کو اگر روحانی رہبر ملجاتا تو وہ سرمدی درجہ حاصل کرسکتا تھا لیکن رہبر نہ ملنے کی وجہ سے وہ بھٹک گیا۔ اقبال کے نزدیک مجذوب کی حیات ہی مکمل حیات ہے۔

حیات کیا ہے خیال ونظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگون

اقبال نے اپنی تقاریر میں بھی نیٹشے کا تذکرہ کیا ہے اور اس کا اقرار کیا ہے کہ نیٹشے میں وجدانیت جاگ چکی تھی۔ اگر اس کو صحیح رہبری حاصل ہوتی تو درجہ کمال تک پہنچ سکتا تھا۔ بظاہر نیٹشے مجنون معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں باطنی روشنی اس میں نمودار ہوچکی تھی۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

ایک جگہ نیٹشے خود لکھتا ہے کہ "میں ایک عظیم مسئلہ سے دوچار ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں صحرا میں کھوگیا ہوں۔ مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے ساتھیوں کی ضرورت ہے اور مجھے رہبری کی ضرورت ہے" دوسری جگہ رقمطراز ہے کہ "مجھے ایسا آدمی کیوں نہیں ملتا جو مجھ سے بلند نظر رکھتا ہو اور جو مجھے ہدایت دے سکے مجھے اسی کی زبردست خواہش ہے" نیٹشے نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "میرا وقت یہ نہیں ہے۔ میں کل کے بعد کے دن کا مالک ہوں"۔ اقبال نے بھی لکھا ہے کہ "میں آئندہ کے شاعر کا نغمہ ہوں"۔

اقبال اور نیٹشے میں اختلافات ہیں لیکن اس حد تک ان میں ہم آہنگی ہے کہ ان دونوں نے اپنے ملک کے نوجوانوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اور ان کی موت کے بعد یہ عقیدت والہانہ حدوں تک جا پہنچی۔ نیٹشے کی تجہیز وتکفین کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے ایک جرمن طالب علم نے جن تاثرات کا اظہار کیا اس سے نوجوانوں کی گہری عقیدت کا پتہ چلتا ہے طالب علم نے جوش کے ساتھ کہا کہ کل کے بعد والا دن آپہنچا ہے اور اب ہم نیٹشے کو سمجھ سکتے ہیں۔

اقبال کی موت سے ہندی نوجوانوں کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ ان کے خلوص اور والہانہ عقیدت کا مظہر ہے۔ "یوم اقبال" کے سلسلے میں ملک میں جس جوش کا ثبوت دیا گیا وہ اقبال کی ہر دلعزیزی پر دال ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سید منظور احمد متعلم سال اول

تاثیر رنگ

مسٹر خورشید۔ ہمارے شہر کے ایک نوجوان ماہر سائنس ہیں جن کی شادی ابھی حال میں ہوئی ہے۔ بیرون شہر ایک چھوٹی لیکن رفیع الشان حویلی میں اپنی بیوی کے ساتھ سکونت پذیر تھے دن بھر اپنے علمی مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہتے اور جب فراغت پاتے تو بلقیس کے ساتھ سایہ کی طرح رہا کرتے۔ مغربی طرز کا مکان، مغربی وضع کا ساز وسامان اور مغربی معاشرت کے دلدادہ تھے۔ ایک فرنگی ٹبلر میلٹ کے علاوہ تین یورپین مامائیں ان کے آرام وآسائش کی ضرورتیں پورا کرنے کے لئے متقرر تھیں۔

دسمبر ختم ہونے کو تھا۔ ایک دن سرشام مسٹر خورشید بہت ٹھاٹھ سے گرم پوشاک زیب تن فرما کر اپنی بی بی سے رخصت ہونے لگے۔ بلقیس ڈرائنگ روم میں ایک صوفہ پر فروکش تھیں۔ مایوسانہ انداز سے اپنے شوہر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "ماہرین سائنس بحیثیت شوہر اچھے نہیں ہوا کرتے۔ اگر آپ کا جانا ضروری ہے تو تشریف لے جائیے"۔

خورشید بے قرار ہو کر کہنے لگے۔ تم بھی عجیب ہو میں لاکھ سمجھاؤں پر تم سمجھ نہ سکوگی کہ ڈاکٹر اسد نے علم تحقیقات میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔ ملک چین سے ان کی واپسی کے بعد اب تک میں ان سے مل نہ سکا۔ وہ میرے بچپن کے دوست ہیں۔ آج انھوں نے خاص طور پر مجھے بلایا ہے۔ میرا جانا ضروری ہے ورنہ میں تمھیں تنہا چھوڑ کر ہرگز نہ جاتا۔

بلقیس۔ بہت خوب، تشریف لے جائیے لیکن جلد آئیگا میں میلٹ سے کہوں گی کہ وہ میرے لئے یہیں کھانے کی میز بچھا دے آج شام کا سارا کام اسی کے سر ہے کیونکہ میں نے ماماؤں کو آج شام کی چھٹی دیدی ہے

خورشید۔ کیا تینوں ماماؤں کو بھیجدیا۔

بلقیس۔ میلٹ کے پاس سینما کے تین ٹکٹ تھے اور اس نے وہ ٹکٹ ماماؤں کو دیدیے چونکہ چونکہ آپ بھی دعوت کی وجہ سے آج شام کو گھر میں نہ ہونگے۔ میں نے انھیں چھٹی دیدی۔ جائیے تشریف لے جائیے کہیں دیر نہ ہوجائے۔ میں آپ کی واپسی تک یہاں سے ہلوں گی بھی نہیں۔ ہاں میرے اس نئے تکیے کو ایک نظر دیکھتے جائیے۔

خورشید نے ایک اعلیٰ درجہ کا زردوزی کا کام کیا ہوا انفشی رنگ کا ریشمی تکیہ دیکھا۔
بلقیس: بیلٹ نے مجھے یہ تکیہ بطور تحفہ پیش کیا ہے۔
خورشید نے تعجب سے پوچھا۔ بیلٹ ؟ کیا دنیا کے بٹلر بنفشی ریشمی تکیے بطور تحفہ اپنے آقاؤں کے نذر کیا کرتے ہیں ؟
بلقیس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ دوسرے بٹلر نہ دیتے ہوں لیکن ہمارا بٹلر تو ہمیں نذر پیش کرتا ہے۔ بیلٹ نے چند دن قبل میرے نیلگوں تکیہ پر بالائی گرا دی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت شرمندہ ہوا۔ آج اس نے یہ تکیہ لاکر اس لجاجت سے درخواست کی کہ میں اس کو اپنے نیلگوں تکیہ کے عوض قبول کروں۔ میرے انکار سے وہ کچھ ایسا رنجیدہ نظر آیا کہ میں نے آخر وہ تکیہ لے ہی لیا۔
بلقیس نے تکیہ اپنی جگہ لگا کر اس پر اپنا سر رکھ لیا۔
خورشید نے کچھ غور کے بعد کہا۔ کاش میرا جانا ضروری نہ ہوتا۔
جھک کر اپنی بی بی کو الوداعی پیار کیا۔ ایک ہلکی سی تلخ خوشبو خورشید کے دماغ میں پہنچی اس نے چونک کر کہا۔ بیلٹ کا تکیہ خوشبو سے معطر ہے کیا تم اس کو پسند کرتی ہو۔
بلقیس: خوشبو بہت بھینی بھینی ہے میرے خیال میں کوئی فرنگی عطر ہے معلوم نہیں کہاں سے دستیاب ہوا۔ میں نے عمر بھر میں کبھی ایسا فرحت بخش عطر نہیں لگایا۔ خیر وقت ہو رہا ہے آپ جائیے ڈاکٹر اسد آپ کی راہ تکتے ہوں گے۔
خورشید خیرباد کہکر کمرے سے باہر نکلے۔ بیلٹ جو اس وقت ہال سے گذر رہا تھا اپنے آقا کو دیکھکر آگے بڑھا اور کوٹ پیش کیا۔ بیلٹ کا قد چھوٹا سینہ کشادہ اور چہرہ کتابی تھا۔ اور وہ پوری طرح آداب سے واقف تھا۔
خورشید نے کوٹ پہن کر کہا "سنا ہے کہ مامائیں باہر گئی ہیں۔ دیکھو مسز خورشید کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ بیلٹ نے سر خم کیا اور کہا بہت خوب۔
خورشید روانہ ہوگئے۔ بلقیس نے دروازہ کھلتے اور بند ہوتے سنا اور تکیہ پر سر رکھ کر دراز ہوگئیں خیال کرنے لگیں کہ اب بیلٹ میرے کھانے کا انتظام کرتا ہوگا۔

ڈاکٹر اسد اگرچہ ہنوز نوجوانی کے عالم سے گذر رہے تھے لیکن عالم سائنس میں ان کی تحقیقات کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ڈنر ختم ہو چکا، لیکن اسد کی تحقیقات کی داستان کچھ ایسی دلچسپ تھی کہ کافی بھری

ہوئی۔ پیالیاں یونہی دھری رہیں سلگتے ہوئے سگار بجھ کر دھرے رہ گئے۔ دو بج گئے۔ آخر اسد چونکے اور کہا میں نے خوب آپ کی سمع خراشی کی۔ یہ تو فرمائیے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔

خورشید۔ کچھ نہیں۔ اور کچھ غور کے بعد کہا۔ میں نے شادی کر لی ہے۔

اسد۔ ہاں میں نے سنا۔ آپ کو مبارک لیکن یہ مبارکباد بہت دیر میں دی جا رہی ہے۔ ہاں بیش بہا جواہرات اور ہاتھی دانت کی بنی ہوئی چند انوکھی چیزیں میں نے ملک چین میں خریدی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مسز خورشید انھیں دیکھ کر نہایت محظوظ ہوں گی۔ کسی شام کو مجھے حاضر ہونے کی اجازت دیجئے

خورشید۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں نہایت خوشی۔۔۔۔۔

اسد یکایک کسی خیال سے متاثر ہو کر بول اٹھے ارے چین کا ذکر آیا تو مجھے یاد آیا کہ وہاں مجھ پر ایک عجیب زہر کا انکشاف ہوا۔ میرے خیال میں ملک چین کے باہر میرے اور ایک فرنگی کے سوا اس زہر کے حالات سے دوسرا کوئی واقف نہیں سچ پوچھو تو یہ راز صرف اس فرنگی کو معلوم تھا۔ ابھی تک اسے یہ خبر نہیں کہ اس کے سوا کسی اور پر بھی اس کا انکشاف ہو گیا۔ دو سال قبل بمبئی میں جو شیریں کا واقعہ گزرا اس سے آپ واقف ہوں گے۔

خورشید۔ نہیں مجھے اس کی خبر نہیں۔

اسد۔ شیریں ایک بہت مالدار خاتون اپنے ڈرائنگ روم کے صوفہ پر مردہ پائی گئیں۔ سارے زیورات غائب تھے۔ یہ خاتون بلند قامت اور بے حد قوی تھیں جو اپنی جان و مال کی حفاظت میں اپنی طاقت کے استعمال کرنے میں پس و پیش نہ کرتیں لیکن وہاں تو کسی کشمکش کے علامات نہ پائے گئے۔ اور آج تک ان کی موت کیوجہ بھی معلوم نہ ہو سکی۔ اس واقعہ کے شائد گھنٹہ یا دو گھنٹے قبل ایک ماما جو کسی کام کے لئے وہاں گئی تو شیریں نے اسی تکیہ کے متعلق جس پر سر رکھے ہوئے لیٹی ہوئی تھیں کہا کہ بالکل انوکھی خوشبو اس تکیہ میں ہے۔ اس خاتون کے بس یہی آخری الفاظ تھے۔ زیورات کے غائب ہو جانے کا مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آ گیا۔ کیونکہ زیورات کے ساتھ ساتھ ایک بٹلر بھی جو ابھی چند دن پہلے ملازم ہوا تھا غائب ہو گیا۔ یہ خاتون بہت قیمتی ہیروں کے پہننے کی عادی تھیں۔ ان کی موت ابھی تک ایک سربستہ راز ہے اور آدمی کا بھی ابتک پتہ نہ لگا۔ اس واقعہ سے بے حد دلچسپی ہو گئی تھی مجھے یقین تھا کہ ضرور کوئی بات ہے لیکن دیگر مشاغل نے مجھے اس کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنے کا موقع نہ دیا۔ دو مہینے پہلے جب میں ملک چین میں تھا اس کا اعادہ ہوا اور وہ بھی اس وقت جب مجھے وہ زہر دستیاب ہوا۔ کس طرح مجھے وہ زہر ملا ایک داستان ہے جو

کسی اور وقت سناؤں گا۔ دوسروں کے بہ نسبت ملک چین کے باشندے ایسی شیطانی اشیا سے بہت واقفیت رکھتے ہیں لیکن پھر بھی یہ چیزیں پوشیدہ رکھی جاتی ہیں میں نے اس کو چرالیا۔ میری جان جوکھوں میں تھی کس طرح چرایا پھر کسی وقت بیان کرونگا۔ چوری دریافت ہو جاتی تو جاں بہ بچتی۔ ملک چین میں رہ کر اس اسرار پر روشنی ڈالنی محال تھی۔ اب اور بات ہے۔ مجھے وہ زہر معلوم ہوگیا جس سے شیرین کی جان لے لی گئی۔ یہ زہر ابھی اس فراشدہ ٹیلر کے قبضہ میں ہے جس کی بدولت وہ آج بھی کسی کو اسی سرعت اور آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے اور کسی کو معلوم بھی نہ ہوسکیگا کہ کس وجہ سے موت واقع ہوی۔ ایک مخصوص حالت میں وہ زہر بہت مہلک ثابت ہوتا ہے۔ اس خصوصیت کے بغیر وہ زہر محض بے کار ہے ایک مکھی بھی اس سے مر نہیں سکتی۔ وہ خصوصیت رنگ سے پیدا ہوتی ہے۔

خورشید۔ رنگ!

اسد۔ ہاں رنگ۔ مجھے اس مسئلہ پر زیادہ غور کرنے کا موقع نہ ملا۔ برسوں سے میرا عقیدہ تھا کہ کئی کیمیائی اشیا پر رنگ کا اثر ضرور ہوتا ہے ہر پوڈر میں ملا کر ایک خاص رنگ کے کپڑے میں ملفوف کردیں تو ایک عجیب خوشبو دینے لگتا ہے۔ جو ایک انسان کے مار ڈالنے کے لئے بہت کافی ہے۔ دو تین گرین کسی گلوبند، رومال، تکیہ یا کسی اور چیز میں لگاکر اس کو کسی آدمی کے منہ کے قریب رکھدیں تو کافی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس ٹیلر کو یہ راز معلوم تھا اور شیریں کے آرام کرنے سے پیشتر اس نے دو تین گرین اس تکیہ میں رکھدیا جس پر وہ اپنا سر رکھنے والی تھی اس تکیہ کا رنگ بھی مخصوص ہوگا۔

خورشید۔ عجیب بات ہے! کونسا رنگ تھا وہ؟

اسد۔ بنفشی، بہت خوشنما بنفشی۔ آپ کسی اور رنگ کے کپڑے میں اس رنگ کو ملفوف کریں تو بالکل بے ضرر ثابت ہوگا۔ میں ابھی اس کے متعلق تشفی بخش بیان نہیں دے سکتا۔ اس مسئلہ پر مجھے دو تین ماہ غور کرنا پڑیگا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اعتقاد کے مطابق یہ مسئلہ ضرور رنگ سے متعلق ہے۔ میں تھوڑا زہر اپنے ساتھ لے آیا اور یہاں دو خرگوشوں پر آزمائش کی۔ ایک خرگوش کے روبرو سفید ریشمی کپڑے میں دو گرین اور دوسرے کے روبرو بنفشی ریشمی کپڑے میں دو گرین رکھ چھوڑا جس خرگوش کے روبرو سفید ریشمی کپڑا رکھا تھا اس پر تو کسی قسم کا اثر نہ ہوا لیکن وہ خرگوش جس کے سامنے بنفشی ریشمی کپڑا دھرا تھا...... ہیں خورشید! کیا ہوا۔ اسد نے دیکھا کہ خورشید کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔

خورشید سراسیمہ ہوکر بولے۔ مجھے معلوم نہیں۔ وہ جھومتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور دیوار سے

پنڈت برج نارائن چکبست آنجہانی

اُردو علم ادب نے ابتدا سے آج تک کئی چولے بدلے اور تغیرات کی مختلف منزلیں طے کیں۔ اردو کی ادبی دنیا میں خیالات کے اعتبار سے جو خوشگوار انقلاب نمودار ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ بلحاظ اپنے مستقل فوائد کے قابل قدر چیز ہے۔ اس عظیم انقلاب کی وجہ برطانوی راج ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ فاتح قوم کا اثر مفتوح قوم پر پڑتا ہے۔ طرز معاشرت اور عادات وخصائل کی طرح فاتح قوم کے علم و ادب سے مفتوح قوم کا علم ادب بھی متاثر ہوتا ہے۔ یہ ادبی انقلاب حقیقت میں اس وقت شروع ہوا جب ہم انگریزی تعلیم کے ذریعہ مغربی خیالات سے واقف ہوئے حقیقی معنی میں اردو ادب کا پرچار اس وقت سے شروع ہوا جب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور ان کی جماعت نے جن کے دل اردو ادب کی بے لوث خدمت گذاری سے معمور تھے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کی جماعت کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے کئی کتابیں اردو میں شائع ہوئی لیکن ان تمام کا رنگ مشرقی تھا۔ اور یہ مغربی خصوصیات سے بالکل بے بہرہ تھیں۔ پنجاب کے ڈائرکٹر تعلیمات کرنل ہالرائڈ صاحب نے اس کمی کو پورا کیا یعنی مغربی لٹریچر سے مشرقی طبائع کو مانوس کرانے کی کوشش کی کرنل ہالرائڈ صاحب کی انتھک کوششوں کی بدولت مغربی ادب کے جواہرات اردو ادب کے خزانہ میں داخل ہوئے جس سے اردو ادب کی خوب صورتی میں چار چاند لگ گئے۔

کرنل ہالرائڈ کی ترغیب کی بدولت چند ہی دنوں میں کئی لوگ کرنل صاحب کے ہم خیال ہو گئے اور یہ نیک کام جو نیک نیتی اور خلوص دل کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔ احسن طور پر انجام پانے لگا کرنل صاحب اس خدمت جلیلہ کی وجہ سے اردو لٹریچر کے اول محسنوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کرنل ہالرائڈ صاحب اس میں شک نہیں کہ اس تحریک کے بانی ہیں لیکن ایک ہی شخص کسی تحریک کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ جب تک کہ اس کے ہم چند خیال پیدا نہ ہو جائیں۔ اور اس کام میں محرک کا ہاتھ نہ بٹائیں۔ کرنل صاحب پروفیسر آزاد دہلوی اور مولانا حالی کی کوششوں کے باعث اپنے مقصد میں کامیاب ہے ان دونوں باکمالوں کی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ واقعی مادر ہند کے ان سپوتوں نے اردو ادب کی کس حد تک خدمت کی۔ موجودہ اردو علم و ادب میں جو نئی چیزیں نظر آتی ہیں یہ سب ایسے ہی لوگوں کی حسن تدبیر کا

نتیجہ ہیں جنھوں نے اپنی عمر اردو کی خدمت میں صرف کردی۔ اور اپنا تن من دھن اس پر نچھاور کر دیا۔
اس سلسلہ میں مولانا آزاد۔ حالی۔ ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا شبلی۔ نواب محسن الملک۔ سرسید۔
پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ پنڈت برج نارائن چکبست۔ اور پنڈت دیا شنکر نسیم کے نام قابل ذکر ہیں یہی
وہ لوگ ہیں جن کے زور قلم نے اردو ادب کی کایا پلٹ دی اور یہی وہ مبارک ہستیاں ہیں جن کی
زبردست دماغی کاوشوں نے اردو لٹریچر میں ایک نئے اور روشن باب کا اضافہ کیا۔ کرنل ہالرائیڈ
صاحب کا لگایا ہوا پودا انہیں برگزیدہ ہستیوں کی بدولت پھلا پھولا اور آج ہمارے سامنے ایک گھنے
سایہ دار درخت کی شکل میں موجود ہے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ مغربی علم و ادب کے اثر نے اردو میں انقلاب پیدا کیا سچ تو یہ ہے کہ
مغرب نے ہمارے لئے آئینہ کا کام دیا۔ اس آئینہ کے ذریعہ ہم نے اردو ادب کے خط و خال کو دیکھا۔

مغربی خیالات سے واقف ہونے سے پہلے ہمارے شعراء لکیر کے فقیر تھے ان کی شاعری گل
وبلبل کی داستان تک محدود تھی اور مبالغہ سے بھری ہوئی تھی۔ اور جو تشبیہات اور تلمیحات ان کے کلام میں
پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق ہمارے ملک سے نہیں ہے۔

جب سے مغربی علم و ادب کا اثر اردو علم و ادب پر پڑا اردو شاعری کا میدان وسیع ہو گیا
اس میں نیچرل شاعری اور قومی شاعری کا اضافہ ہوا۔ نیچرل شاعری کی داغ بیل مولانا آزاد دہلوی نے
ڈالی حالی نے قومی شاعری کا بیج بویا۔

مولانا حالی کے بعد سرزمین فیض آباد سے ایک ستارہ اردو ادب کے آسمان پر چمکا۔ اور
یہ ستارہ قومی شاعری کے لئے رحمت ثابت ہوا۔ سچ ہے پوت کے گن پلنے میں نظر آتے ہیں۔

پنڈت برج نارائن چکبست کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ آپ نے پہلی غزل نو سال کی
عمر میں کہی اور اس وقت سے آپ کا مذاق شعر و سخن بڑھتا گیا۔ آپ آتش۔ غالب۔ انیس۔ اور حالی
کے کلام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ آپ کی غزلوں میں آتش کی جھلک اور آپ کے مسدس میں انیس کی
پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ صرف خیالات میں اختلاف ہے لیکن بلحاظ سلاست زبان اور بندش الفاظ
روشن خیالی اور حسن ترکیب ان ہی اساتذہ کی تقلید کی ہے۔ سوز گداز چکبست کے کلام کی نمایاں خصوصیت
ہے۔ حالی کی طرح چکبست کا رجحان قومی شاعری کی طرف رہا اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ اس پر مبنی ہے

وہ لوگ جو دھن کے پکے اور ارادوں میں اٹل ہیں۔ آنے والی مصیبتوں کا خندہ پیشانی
سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود پر پہنچ کر ہی رہتے ہیں۔ پنڈت برج نارائن چکبست وکالت کی

گوناگوں مصروفیات کے باوجود شاعری کے لیے وقت ضرور نکال لیتے تھے شاعری کا جذبہ فطری چیز ہے اور اس کا شمار خدا کے بیش بہا عطیات میں ہوتا ہے۔ انسان شاعر پیدا ہوتا ہے۔ بنتا نہیں وہ لوگ جو شاعر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا حساب مارے کوٹے کے فقیر کا سا ہے جو دنیا کے دکھانے کے لئے اپنے کپڑے رنگ لیتا ہے۔ لیکن اس کا من رنگا ہوا نہیں ہوتا۔ اس طرح بنا ہوا شاعر شاعری ضرور کرتا ہے۔ لیکن اس میں سوز و گداز ہوتا ہے نہ لوچ۔

اب ہم پنڈت برج نارائن چکبست کے قومی کلام کا کچھ انتخاب پیش کرتے ہیں۔

شاعر اپنے وطن کی عظمت و شان کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے　　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پرضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

جب دنیا پر جہالت طاری تھی اس وقت مادرِ ہند تمام ملکوں کی رہنما بنی ہوئی تھی اس واقعہ کو شاعر ہمیں یاد دلاتا ہے۔

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　　چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

عیش و عشرت کی رنگ رلیاں کرنے والوں اور ملک کی حالت سے بے خبر رہنے والوں کو شاعر اس طرح مخاطب کرتا ہے۔

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا　　　دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا　　　ایک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
علم و کمال و ایمان برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

شاعر ہندوؤں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

بھنور میں قوم کا بیڑا ہے ہندوؤ ہوشیار　　　اندھیری رات ہے کالی گھٹا ہے اور منجدھار

اگر پڑے رہے غفلت کی نیند میں سرشار   تو زیر موج فنا ہوگا آبرو کا مزار

مٹے گی قوم یہ بیڑا تمام ڈوبے گا
جہاں میں بھیشم و ارجن کا نام ڈوبیگا

مسلمانوں کو ان کے اسلاف کی بہادری کے کارنامے یاد دلاتا ہے۔

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو   وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو
ستون ملک کے ہو قدر قومیت جانو   جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو
نبی کے خلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم   عرب کی شان حمیت کی یادگار ہو تم
کرو خیال کچھ اسلاف کی حمیت کا   دیا تھا دشمن قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا   یہ فرض عین ہے سودا نہیں مروت کا

اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی
ہزار خندہ کفر است بر مسلمانی

غفلت کی نیند سونے والوں کے لئے شاعر کی تمنا ملاحظہ ہو۔

اے شور حب قومی اس خواب سے جگا دے   بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے   اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شاعر کو اپنے وطن سے کسقدر انس و محبت ہے کہتا ہے۔

شیدائے بوستاں کو سرو سمن مبارک   رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک   ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلینگے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملینگے

ہے جوئے شیر ہم کو نور سحر وطن کا   آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا   تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو   مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو

شاعر مادر ہند کے دونوں سپوتوں کو اپنے وطن کی حالت کو سدھارنے کی توجہ یوں دلاتا ہے۔

اگر نہ قوم کے اسوقت بھی تم آئے کام نصیب ہوگا نہ مرنے پہ بھی تمھیں آرام
یہی کہیگا زمانہ کہ تھا برائے نام وہ دہرم ہندوؤں کا وہ حمیت اسلام

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے نہ جوش کھائے جو غیرت تو وہ لہو کیا ہے
فدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

کچھ عجب رنگ چمن بدلا ہوا ہے آج کل غنچہ وگل صورت شبنم ہوا ہونے کو ہیں
اپنے اپنے راگ سے کان آشنا ہونے کو ہیں پردہ ہائے ساز قومی بے صدا ہونے کو ہیں
مادر ناشاد روتی ہے کوئی سنتا نہیں دل جگر سے بھائی سے بھائی جدا ہونے کو ہے

ان اشعار میں حکبست نے اس کیفیت کو بیان کیا ہے جو ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں پیدا ہوگئی ہے

نالۂ یاس

کیا کہیں کس سے کہیں ہم آج کیا کہنے کو ہیں آخری افسانہ شوق وفا کہنے کو ہیں
جن امیدوں کی لڑکپن میں ہوئی تھی ابتدا آج ان کی انتہا کا ماجرا کہنے کو ہیں
ہے خبر اب بھی نہیں کچھ قوم کے دکھ درد کی پہلے ہمت تھی دوا کی اب دعا کرنے کو ہیں
کیا کہیں کیا دور آخر میں ستم دیکھا کئے
برہمی بڑھتی گئی محفل کی ہم دیکھا کئے

وہ بھی کیا عالم تھا جب دنیا سے دل آزاد تھا اور سب بھولے تھے ایک قصہ وفا کا یاد تھا
قوم کا سودا وفا کا شوق خدمت کی امنگ بس انھیں دو تین کے صدقے میں دل آباد تھا
کوفت تھی ہم کو اگر گمراہ تھا جب کوئی ہم بھی خوش تھے گر کسی معصوم کا دلشاد تھا
تھی اسی رنگ محبت سے امیدوں کی بہار کیسے کیسے پھول تھے کیا چمن آباد تھا
ہم یہ برسوں کی محبت بھولنے والے نہیں
اتنے بھائی ایک ماں کی گود میں پالے نہیں

ہندوستان کی تباہی کے اسباب کو شاعر نے صرف ایک شعر میں کس خوبی سے ادا کیا ہے

غرور و جہل نے ہندوستان کو لوٹ لیا — بجز نفاق کے اب خاک بھی وطن میں نہیں

شاعر قوم والوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ بلند حوصلے اور نیک عمل کرنے کے عادی ہوں۔

زبان سے جوش قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا — ابلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

پرانی کاوشیں دیر و حرم کی مٹتی جاتی ہیں — نئی تہذیب کے جھگڑے ہیں اب شیخ و برہمن میں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے — مزا داماں مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

پرشوتم راج سکسینہ

ہم اپنی خاک سے بعد فنا یہ کام لیتے ہیں — غبار راہ بن کر ان کا دامن تھام لیتے ہیں

رہو تم شوق سے عہد شباب و دور مستی میں — ہم اپنے سر بلائے گردش ایام لیتے ہیں

امیر

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح — میں نے تمام عمر گذاری ہے اس طرح

ناطق لکھنوی

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت — جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

ناطق لکھنوی

لایا گل مراد نہ جھونکا نسیم کا — دامن میں ہر بہار میں پھیلا کے رہ گیا

جلیل

مدینہ جاؤں پھر آؤں مدینہ پھر جاؤں — تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے۔

امیر

وہ مست ہوں کہ ساغر مے جب میں پا گیا — اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

امیر

نبوت اک بے بہا تھا گہنا کہ سلسلے وار سب نے پہنا — تمہیں کیا خاتم النبیین کھلا کچھ ایسا یہ ہار تم

امیر

غلط فہمی

ایک دلچسپ نتیجہ خیز مختصر ڈرامہ

اشخاص ڈرامہ۔ افضل۔ ایک بلند خیال دولت مند نوجوان جس کی شادی حال میں خالدہ سے ہوئی ہے۔

خالدہ۔ افضل کی بیوی۔　　یوسف۔ خالدہ کا بھائی۔

گلشن۔ قدیم ملازمہ　　رفعت۔ افضل کا خدمت گار

زاہدہ۔ افضل کی بہن۔

پہلا سین

(شام کا وقت، پائیں باغ۔ افضل و خالدہ ٹہلتے ہیں)

افضل۔ (منہ سے سگریٹ کا دھواں اڑا کر) پیاری خالدہ۔ میری زندگی کا جو وقت تمھارے ساتھ گزرتا ہے میرے دل میں ایک لازوال مسرت پیدا کرتا ہے۔

خالدہ۔ (ایک سرد آہ بھر کر) مجھے آپ کی ان باتوں سے تشفی نہیں ہوئی۔ آپ ہر وقت یونہی کہا کرتے ہیں۔ کہیں وہی مثل نہ صادق ہو کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔

افضل۔ (حسرت سے) کاش تم میرے دل کی گہرائیوں کو ٹٹولتیں۔ میرے خیالات کی تہاہ لیتیں۔ میرے جذبات کا اندازہ کرتیں تو تم پر میری صحیح حالت عیاں ہوتی۔ تم عورتیں تو خانہ داری کی شین بن جاتی ہو۔ تم لوگوں کی محبت شبنم کے قطرے کے مانند ہوتی ہے۔ جو سورج نکلنے پر غائب ہو جاتا ہے۔ اس سے بدتر تم لوگوں کا حال ہے۔ اولاد۔ خانہ داری اور شوہر پرستی کے تم لوگ دشمن ہو۔ لیکن مجھ کو اپنے انتخاب پر ناز ہے۔ حسن اور بے انتہا حسن محبت اور بے پایاں محبت۔ تعلیم کیا تھ روشن خیالی انتظام خانہ داری کے ساتھ حسن کی نزاکتیں۔ میری زبان تعریف سے قاصر ہے۔ غرض میری زیست کا منشا پورا ہو گیا۔

خالدہ (حیا سے سر جھکائے ہوئے)۔ میں اس قدر تعریف کی ہرگز مستحق نہیں ہوں۔
(دبی زبان سے) کتابوں میں پڑھا ہے کہ مردوں کی محبت دریا کا دھارا ہوتی ہے۔ جدھر ڈھال پاتی ہے بہ نکلتی ہے۔ اور عورت کی محبت ابدی ہوتی ہے جسے کبھی زوال نہیں۔ خدا کرے آپ اس سے مستثنیٰ ہوں۔

افضل۔ (مسرت سے) خالدہ ایسی باتیں للہ نہ کرو۔ وہ مرد کوئی اور ہونگے۔ تم نے میری طبیعت کا اندازہ نہیں لگایا۔ میں محبت کا بندہ ہوں۔ اور تم حسن کی دیوی۔ میرا جینا، میرا مرنا، میری زندگی میری موت سب تم سے وابستہ ہے۔ تم مجھ پر شبہ کرکے میرے دل کو ٹھیس لگاتی ہو۔

شیشہ دل اک ہی تو نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا
اس پہ کسی کے تیر ستم کی مشق سیاست کیا کہئے

خالدہ۔ (متاثر ہوکر) آپ کو میری جان کی قسم۔ ایسا نہ کہئے۔ آئیے باغ کی سیر کریں۔
(افضل اور خالدہ جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)۔

دوسرا سین

(افضل کا ڈرائنگ روم۔ افضل گھنٹی بجاتا ہے۔ رفعت حاضر ہوتا ہے۔)

رفعت۔ حضور۔ **افضل**۔ بیگم صاحبہ گئیں۔ **رفعت**۔ حضور
افضل۔ کس کے ساتھ۔ **رفعت**۔ یوسف میاں کے ساتھ۔
افضل۔ گلشن کو بھیج دو۔ (رفعت اندر جاتا ہے)

افضل۔ (اپنے آپ سے) آج کل کی عورتوں پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ آہ۔ خالدہ تجھے میں جان سے زیادہ چاہتا ہوں لیکن تو نے میری قدر نہ کی۔ تو یہ کس کے خطوط پڑھتی ہے۔ زرین فیتے سے بندھے ہوئے تو ان کو کس قدر احتیاط سے رکھتی ہے۔ میرے دریافت کرنے پر بھی تو نے ظاہر نہ کیا۔ میں نے اکثر تجھے تنہائی میں ان کو پڑھتے دیکھا ہے۔ تو ایک تصویر کو دیکھ کر روتی بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو کسی سے محبت کرتی ہے۔ تیری ادائیں پہلے ہی سے کسی کو گھائل کر چکی ہیں۔ خیر گلشن کے ذریعہ ان خطوط کے دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ اگر ناممکن ہوا تو زبردستی ان خطوط کو دیکھوں گا۔
(رفعت اور گلشن داخل ہوتے ہیں)

افضل۔ رفعت تم جاؤ۔ (رفعت چلا جاتا ہے)

افضل۔ (پریشانی سے) گلشن ذرا دروازہ تو بند کرو۔
گلشن۔ (کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ بند کرتی ہے) میاں خیر تو ہے۔
افضل۔ تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے لیکن یہ ایک اہم راز ہے گلشن "(گھبرا کر) کیا"
افضل۔ تم پہلے قسم کھا کر وعدہ کرو کہ کسی سے نہ کہوں گی۔
گلشن۔ ہائے۔ ہائے سرکار۔ ایسی کیا بات ہے۔
افضل۔ تم وعدہ کرو۔ (گلشن وعدہ کرتی ہے)
افضل۔ (بھرائی ہوئی آواز سے) تم نے میری پرورش کی ہے اور دودھ پلایا ہے۔ پیاری امی کے انتقال کے بعد میں تم کو ان کی جگہ سمجھتا رہا۔ تم میری مدد کرو۔ (کچھ دیر کے بعد) مجھے خالدہ پر شبہ ہے
گلشن۔ (سینہ کوٹ کر) خدایا۔ غضب!
افضل۔ تمھاری رد و رکار ہے۔ گلشن کس طرح۔
افضل۔ خالدہ کے پاس چند خطوط ہیں۔ ریشمی رومال میں بندھے ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک تصویر بھی ہے۔ خالدہ ان کو پڑھ کر روتی ہے۔ اور تصویر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتی ہے۔ میرے پوچھنے پر وہ خطوں کو چھپا دیتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ زبردستی کروں اس لئے تم میری مدد کرو تاکہ میں خط بھی دیکھ لوں اور اسے پتہ بھی نہ چلے۔ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔
گلشن۔ (خوف سے لرزتے ہوئے) اے پروردگار تو ہی سب کا حافظ ہے (پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

(خالدہ اپنے کمرہ میں اداس بیٹھی ہے۔ زاہدہ پاس ہی ہے)۔

خالدہ۔ (دلگیر آواز سے) آجکل میری قسمت گردش میں ہے۔ میکے میں سب چل بسے۔ رخسانہ تھی اسنے بھی داعی اجل کو لبیک کیا۔ یہاں پر خوش و خرم تھی۔ تم لوگوں کی محبت سے دل کو ڈھارس تھی لیکن میری تقدیر ہی کھوٹی ہے۔ آج کل ان کو کیا ہو گیا معلوم نہیں مجھ سے انجان رہتے ہیں۔ ہر وقت ناک پر غصہ رہتا ہے۔ بے حد ضدی ہو گئے ہیں۔ دن گزر جاتے ہیں مگر مجھ سے نہیں بولتے۔
زاہدہ۔ آخر بات کیا ہے۔ کچھ تو معلوم ہو۔ بھائی صاحب تو کبھی ایسے نہ تھے۔
خالدہ۔ کیا کہوں میں خود پریشان ہوں۔

زاہدہ ۔ آخر آپ نے غور کیا کہ ناراضگی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

خالدہ ۔ میری سمجھ میں تو کوئی بات نہیں آتی (کچھ توقف کے بعد) ہاں ایک بات ہو سکتی ہے۔

زاہدہ ۔ وہ کیا! (افضل پردہ کی آڑ سے دونوں کی باتیں سنتا ہے)

خالدہ ۔ بات بے تکی ہے مگر تم سے کہتی ہوں میرا گمان ہے پھر بھی مجھے یقین نہیں کہ آیا صحیح ہے یا غلط میری عزیز بہن جو لاہور کے زنانہ مدرسہ میں پڑھتی تھی وہاں سے اکثر مجھے خطوط لکھا کرتی تھی اس کے خط پیارے اور محبت سے لبریز ہوتے تھے وہ جوانی میں مر گئی اب میں اُن خطوط سے اسے اکثر یاد کر لیا کرتی ہوں۔ اس کی بچپن کی تصویر دیکھتی ہوں اور آنکھوں سے لگاتی ہوں (بے اختیار رونے لگتی ہے) کیسی ذہین کیسی خوبصورت۔ لکھنے پڑھنے کا کتنا شوق۔ سینے پرونے میں کیسی ماہر۔ آہ۔ وہ محبت کا پتلا تھی۔

افضل ۔ شرمندہ ہوتا ہے اور اشک جاری ہو جاتے ہیں۔

زاہدہ ۔ سچ ہے۔ کون ایسا ہے جس کو مرحومہ کی بے وقت موت کا افسوس نہ ہو گا اور حقیقت تو یہ ہے کہ بھائی صاحب بھی بہت افسوس کرتے ہیں۔

خالدہ ۔ تمہارے بھائی صاحب نے کتنی بار چھپ چھپ کر ان خطوں کو پڑھتے اور مجھے روتے دیکھا ہے ان کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خطوں کی کچھ اور اصلیت سمجھتے ہیں۔ اس بات پر مجھے بے حد غصہ آیا میں نے خیال کیا کہ انہیں چھپ کر دیکھنے اور غلط نتیجہ اخذ کرنے کا کیا حق تھا! انہوں نے ایک آدھ بار مجھ سے دریافت بھی کیا لیکن میں نے غصے میں دیکھے بن ٹال دیا (خالدہ ایک الماری سے خطوں کو مع تصویر کے نکال لاتی ہے اور زاہدہ کو دیتی ہے)

خالدہ ۔ دیکھو کیسے محبت بھرے خط ہیں۔ (آنکھ سے آنسو گرنے لگتے ہیں)

(یکایک پردہ ہٹتا ہے اور افضل دوڑ کر خالدہ کے قدموں پر گر جاتا ہے۔ خالدہ چیخ کر الگ ہو جاتی ہے)

زاہدہ ۔ (گھبرا کر) بھائی جان۔

افضل ۔ (ندامت سے خالدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر) پیاری مجھے معاف کرو۔

خالدہ ۔ (حیرت سے) اس آپ ہیں۔ آپ لونڈی کو معاف کریں۔

افضل ۔ میں گنہگار ہوں مجرم ہوں۔ تمہاری قدر نہ کی چھپ کر تمہاری باتوں کو سنا میری غلطی تھی۔

خالدہ ۔ تو آپ کو مجھ سے شکایت تھی۔

افضل ۔ (خجل ہو کر) خود کردہ را علاجے نیست۔

(خالدہ فوراً بے ہوش ہو جاتی ہے۔ افضل اسے سنبھال لیتا ہے۔ زاہدہ جاتی ہے)

افضل ۔ (بے اختیار ہو کر) مرد کی شکست۔ عورت کی فتح۔ مرد کی محبت خود غرض ہوتی ہے اور عورت کی محبت بے غرض!

(پردہ گرتا ہے)

حمید الرحمٰن جونیئر (بی۔ اے)

ایک دلچسپ سفر

عرصہ سے یہ خیال ہمارے دلوں میں گدگدا رہا تھا کہ شمالی ہندوستان کی سیر کریں اور مشہور عمارت تاج محل کو دیکھیں جو اپنی ساخت اور خوب صورتی کے لحاظ سے عجائبات عالم میں شمار کی جاتی ہے دسمبر کی تعطیلوں میں ہمارے چند زندہ دل احباب نے سفر کا مصمم ارادہ کر لیا اور تمام انتظامات درست ہو جانے پر پیش نامہ کے مطابق، ۱۱ر دسمبر ۱۹۴۲ء کی شام کو ۶ بجے نام پلی اسٹیشن پر جمع ہونے لگے سب کے آجانے پر چشم زدن میں سامان ریل پر رکھ دیا گیا اور ہم لوگ گاڑی میں سوار ہو گئے مسافر گاڑی میں سوار ہوئے اور انجن نے سیٹی دی اور گاڑی نے حرکت کی ہم لوگوں نے ان دوستوں کو جو ہمیں چھوڑنے آئے تھے خیرباد کہا اور جہاں تک وہ نظر آتے رہے رومالوں کی حرکت سے برابر ان کا جواب دیتے رہے۔ گو ہمارے چہروں سے مسرت اور انبساط کے آثار نمایاں تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وطن کی محبت اور عزیز و اقارب کی جدائی کا خیال دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ بہت دیر تک تو ہم لوگ کھڑکیوں سے گردنیں نکال کر ہرے ہرے کھیتوں، قدرت کی گلکاریوں اور شفق شام کی رنگینیوں کی بہار دیکھتے رہے مگر جب اندھیرا زیادہ چھا گیا اور یہ تمام چیزیں ہماری مشتاق نظروں سے اوجھل ہونے لگیں تو چاروناچار کھڑکیوں کی طرف سے منہ پھیرا اور بیت بازی کا بازار گرم کیا شام کے آٹھ بجے ہم سب کھانے کے لئے اٹھے ناشتے دان کھولے گئے۔ لوازمات کی کثرت سے معلوم ہوتا تھا کہ خوان نعمت بچھا ہوا ہے۔ ایک صاحب نے تو کمال ہی کر دیا کہ چار ٹکیاں چھ پراٹھے اور تین شامی کباب (شکمپور) کے علاوہ جو کھایا اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ ایک رکابی جس میں دو مرغ تلے ہوئے رکھے تھے حسن اتفاق کھٹے یا جناب کے ہاتھ کی صفائی کہ تھوڑی ہی دیر میں سوائے ہڈیوں کے گوشت کا نام نہ تھا جب آپ کا مذاق اڑایا گیا تو روکھے منہ سے کہنے لگے "آمین کیا اب گوشت ختم ہو گیا یار بڑا لذیذ تھا میں نے تو صرف تھوڑا ہی لیا تھا" اس پر ایک زندہ دل دوست کہہ اٹھے مضائقہ نہیں تھا ہی کتنا۔ غالباً تین پاؤ ہوگا جو آپ کے ایک نوالے کے قابل نہ تھا۔ بظاہر وہ بگڑے اور ہاتھ جھٹک کر اٹھے مگر اٹھتے اٹھتے میٹھے کی رکابی جو سامنے رکھی ہوئی تھی لیکر اٹھے رکابی اٹھاتے وقت ہم نے خود دیکھا کہ لبالب بھری ہوئی تھی مگر جب نیچے رکھی گئی تو بہت کچھ ختم ہو چکا تھا کھانے کے بعد بہت دیر تک تاش ہوتا رہا اور اس دوران میں ایک صاحب جو تاش میں شریک نہ تھے کسی قدر بلند آواز سے گنگنانے لگے کیا کہنا جناب نے ایسی شیریں آواز

پائی تھی کہ اس کے آگے لحن داؤدی بھی شرماتا تھا۔ بہر حال تھوڑی ہی دیر میں سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور درخواست کی کہ اگر جناب بجائے نغمہ سرائی کے تاش میں حصہ لے لیں تو سب ممنون احسان ہوں گے۔ دس بجے سب بستروں پر جا لیٹے گاڑی کے جھکولوں کے سبب بہت دیر تک نیند نہ آئی مگر کب تک؟ سچ ہے کہ سولی پر بھی نیند آ ہی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ ہمارے دوست سونے لگے مگر ایک صاحب نے جو پہلے ہی سے سو رہے تھے اپنے پر زور خراٹوں سے سونے والوں کو بھی جگا دیا ان کے خراٹوں سے ایک دوست جو کسی قدر تیز طبیعت تھے جاگ اٹھے اور انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً تولیے کا ایک کونا ان کے کھلے ہوئے منہ میں ٹھونس دیا جس کی وجہ سے وہ اس پریشانی سے اٹھ بیٹھے کہ باقی سونے والے بھی جاگ اٹھے جب اس پریشانی کی وجہ دریافت کی گئی تو کہنے لگے کہ انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے بلی ان کا منہ چاٹ رہی ہے اس پر سب میں ہنسی ہوئی اور ایک دوست نے کہا کہ شکر ہے۔ آپ نے خواب میں بلی ہی دیکھی اگر کہیں شیر دیکھ لیا ہوتا تو شائد دوسرے ڈبے پر بھی اس خوف و ہراس کا اثر پڑتا تھوڑی دیر بعد سب اپنی اپنی رضائیاں اوڑھ کر میٹھی نیند کے مزے لینے لگے صبح سویرے ہی میری آنکھ کھل گئی دوسروں کو سوتا دیکھکر کوشش کی کہ پھر نیند آجائے مگر نہ آنی تھی نہ آئی۔ آخر بستر کو چھوڑ کھڑکی کے پاس جا بیٹھا نسیم صبح کے سرد جھونکے مجبور کر رہے تھے کہ آئینہ چڑھا لوں مگر خدا کی شان ہے کہ اس نفیس اور فرحت بخش ہوا میں وہ لطف تھا کہ طبیعت کسی طرح اس کے نرم اور سرد جھونکوں سے سیر نہ ہوتی تھی میں اپنی جگہ سے اٹھا اور لبادہ پہنکر پھر وہیں آ بیٹھا صبح صادق کا جلوہ عجب شان سے نظر آنے لگا تارے جو رات کی تاریکی میں چمک دمک دکھا رہے تھے اپنی روشنی پھیکی محسوس کر کے شرمانے لگے اور آہستہ آہستہ غائب ہونے لگے سیاہی چھٹنے لگی اور افق مشرق پر سفیدی نمودار ہوئی رفتہ رفتہ اُجالا پھیلنے لگا۔ گویا محبوب صبح نے رات کے بکھرے ہوئے سیاہ زلفوں کو اپنے حسین چہرے سے سمیٹ لیا اور اس کی نورانی پیشانی نظر آنے لگی آسمان پر قدرت کے وہ دلفریب رنگ دکھائی دینے لگے کہ جن کا نظارہ انسان کو محو حیرت کر دیتا ہے اس وقت سگریٹ کے نئے شوقین کی طرح انجن ہوا میں دھواں اڑاتا تقریباً ۵۰ میل کی رفتار سے سفر طے کر رہا تھا نسیم سحری معشوقانہ انداز کے ساتھ خوش خرامی کرنے لگی درختوں کی نازک ڈالیاں خوش الحان پرندوں کے شیریں نغموں کو سن کر جھومنے لگیں۔ پرندے جا بجا حمد الہٰی میں نغمہ سرا تھے میں نے ایک دوست کو جو قریب ہی سو رہے تھے جگایا اور قدرت کا یہ دلفریب منظر دکھایا ہمارے جن سونے والے احباب کو باد نسیم کے خوش گوار جھونکے تھپک تھپک کر سلا رہے تھے اور پرندوں کے نغمے لوریاں دے رہے تھے وہ بھی اب کروٹیں بدلنے لگے میں نے انھیں آواز دی اور یہ شعر پڑھا ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں ۔۔۔ اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تھوڑی دیر میں سب بیدار ہو گئے مگر بستروں پر ہی تھے کوئی کسی کی رضائی کھینچ لیتا تھا تو کوئی کسی کو نشست پر سے گرا کر اس کے بستر میں گھس جاتا تھا غرض اسی طرح ہنسی مذاق میں سات بج گئے اب سب اٹھے اور ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کے لئے تیار ہو گئے ناشتہ پر وہی رات کا بلی والا قصہ دہرایا گیا جس کو سنکر دوبارہ لطف حاصل کیا گیا تمام دن دلچسپ گفتگو اور پرمذاق لطیفوں کے کہنے سننے میں گزرا اور شام کے سات بجے ہم بھوپال اسٹیشن پر اترے نواب صاحب بھوپال کے اکثر عہدہ دار اور ہمارے کالج کے ایک قدیم طالب علم عود بن عمر جو نواب صاحب سے رشتہ رکھتے تھے ہمارے استقبال کے لئے آئے۔ کیوں کہ انھیں پہلے ہی سے اطلاع دے دی گئی تھی کہ جاگیردار کالج کے طلبا آرہے ہیں مصافحہ کے بعد سرکاری موٹروں کے ذریعہ ہم سب نواب صاحب کے ایوان خاص کی طرف روانہ ہوئے محل کے سامنے ایک بہت ہی پرفضا مقام پر خیمے نصب کئے گئے تھے جو بہت ہی سلیقہ کے ساتھ آراستہ تھے ۸ بجے تک ہم نے نہا کر رات کے کھانے کا لباس پہن لیا اور اپنے میزبان کے ساتھ میز پر پہنچ گئے نواب صاحب کے بھتیجے سے ہمارا تعارف کرایا گیا اور کھانا ختم ہوتے پر انھوں نے فرمایا کہ نواب صاحب گھوڑ دوڑ دیکھنے کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے ہیں اور آپ سے ملاقات نہ کرنے کا اظہار افسوس کرنے کے لئے مجھے ہدایت دی ہے اور مجھے آپ کی میزبانی کا حکم دے گئے ہیں ہم نے بھی نواب صاحب کی اس مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا شکریہ ادا کیا اور محفل برخواست ہوی۔ یہاں پر سردی اس شدت کی تھی کہ دانت بج رہے تھے ہم اپنے ڈیروں میں پہنچنے کے تھوڑے ہی دیر بعد گرم بستروں پر سو گئے دوسری صبح آٹھ بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر میزبان کے ساتھ شہر دیکھنے گئے سردی کی شدت سے جو شخص اوورکوٹ اور اونی کپڑوں میں اس طرح لدا ہوا تھا کہ گویا ایورسٹ کی چڑھائی پر جا رہا ہے بھوپال ایک چھوٹا سا شہر ہے جو ایک پہاڑی پر واقع ہے نواب صاحب کی چھوٹی لڑکی کا مکان ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے جس کے نیچے ایک تالاب ہے یہاں کا منظر بہت دلفریب ہے غرض مشہور مقامات کے دیکھنے کے بعد ہم قیام گاہ پر واپس آئے چار بجے نواب صاحب کی لڑکیوں نے جو ہاکی کھیلنے میں اچھی مشق رکھتی ہیں ہم سے گیند ڈنڈے کے مقابلے کی خواہش کی تھی لیکن پورے کھلاڑی فراہم نہ ہو سکنے سے مقابلہ ملتوی ہو گیا اسی روز شام کے چھ بجے ہم اپنے میزبان کا شکریہ ادا کر کے بھوپال سے یہ شعر پڑھتے ہوئے روانہ ہوئے ؎

سیر کی پھول چنے خوب پھرے شاد رہے ۔۔۔ باغباں جاتے ہیں گلشن ترا آباد رہے

رات کے تقریباً بارہ بجے بذریعہ ٹرین گوالیار پہنچے اور چونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی اس لئے اسٹیشن کے

قریب ہی ایک مسافر خانہ میں پڑے رہے صبح نو بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر گوالیار کا مشہور قلعہ دیکھنے گئے یہ قلعہ ایک بہت اونچے پہاڑ پر واقع ہے جہاں سے تمام شہر گوالیار نظر آتا ہے اس کی مضبوط بندش سے کاریگروں کے کمال کا پتہ چلتا ہے قلعہ کے اکثر دروازوں پر رنگ برنگ کا کاشانی کام بڑی صنعت سے کیا گیا ہے۔ یہاں وہ مقام بھی دیکھا گیا جہاں اورنگ زیب نے اپنے بھائی مراد کو قید کر رکھا تھا اس قلعہ میں تین سرنگیں بھی ہیں جو اب بند کر دی گئی ہیں ان کے متعلق یہ روایت ہے کہ ایک دہلی دوسری آگرہ اور تیسری بھوپال جاتی ہے۔ یہاں ٹانگے جو بہت خوب صورت اور تیز ہوتے ہیں کثرت سے ہیں قلعہ کے بعد شہر دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے یہ شہر بھوپال کی نسبت بہت پاک و صاف اور دلچسپیوں سے بھرا ہوا ہے راستوں پر چہل پہل زیادہ ہے اور اکثر مقامات پر چھوٹے چھوٹے چمن بنے ہوئے ہیں شہر میں رونق بھی ہے اور تانگوں کی کثرت کے علاوہ شہر میں ایک چھوٹی ریل گاڑی بھی چلتی ہے۔ اور لوگ اس میں بڑے شوق سے بیٹھ کر مسافت طے کرتے ہیں۔ انہیں دنوں میں وہاں کا مشہور میلہ ہو رہا تھا جس میں ہم نے شرکت کی میلہ بہت دلچسپ تھا اکثر احباب نے دستی چھڑیاں جو بہت مشہور ہوتی ہیں خریدیں رات کے گیارہ بجے کی ٹرین سے گوالیار کو چھوڑ کر آگرہ روانہ ہوئے اور رات کے دو بجے آگرہ پہنچے سردی اس شدت کی تھی کہ اس کا ہم کو عمر میں پہلی بار سابقہ پڑا تھا۔ اسٹیشن سے امپائر ہوٹل پہنچکر دو کمرے لئے اور تھوڑی ہی دیر میں گرم بستروں کو کھول کر دراز ہو گئے۔

صبح آٹھ بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر آگرہ کے مشہور تاریخی مقامات دیکھنے کے لئے روانہ ہوئے ہم سب طالب علم دو موٹروں میں تقسیم کر دے گئے تھے اور یہ موٹریں تمام دن کے لئے کر لی گئی تھیں سب سے پہلے فتح پور سیکری گئے جو شہر سے تقریباً ۲۰ میل پر واقع ہیں یہاں حضرت سلیم چشتیؒ کا مزار اور شہنشاہ اکبر کا مقبرہ دیکھا جو سکندرہ کہلاتا ہے یہ مقبرہ سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے بہت نفیس اور خوب صورت عمارت ہے اس میں ہندوستان کا وہ عزت و بلند وقار شہنشاہ آرام کر رہا ہے۔ یہ مقبرہ اس فخر پر کہ وہ شہنشاہ اکبر کی آرام گاہ ہے سر بفلک کھڑا ہے مقبرہ کو دیکھتے ہی اکبر کے عہد زرین کے وہ تمام واقعات یاد آ گئے جو تاریخ ہند کی روح رواں ہیں۔ سچ پوچھو تو اہل نظر کے لئے عجیب عبرت کا مقام ہے اس مقبرہ پر جو حسرت برس رہی تھی اس سے ہم لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے اور رہ رہ کر یہ شعر یاد آ رہا تھا۔

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ
تختِ زمیں پہ سینکڑوں آئے چلے گئے

اکبر کی اصلی قبر مقبرہ کی پہلی ہی منزل میں ہے جس کی زیارت کے لئے تقریباً ۲ سیڑھیاں

اتر کے ایک تہہ خانہ میں جانا پڑتا ہے مقبرہ کی آخری چھت جہاں سیاہ اور سفید سنگ مرمر کا فرش ہے اس چبوترہ کے بیچ میں قبر کے نشان کے لئے ایک سفید سنگ مرمر رکھا ہوا ہے جس کا طول ڈھائی گز عرض تقریباً ایک گز اونچائی ایک گز سے زیادہ ہے اس کے سرہانہ ایک سنگ مرمر کا شمع دان ہے جس کے بیچ میں ایک کندیدگی کا نشان ہے کہتے ہیں کہ اس میں دنیا کا سب سے بڑا ہیرا کوہ نور جڑھا ہوا تھا جو اب حکومت برطانیہ کے قبضہ میں ہے مقبرہ کے اطراف خوب صورت باغیچے ہیں جن میں ہرن بے فکری سے چرتے پھرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب بھی اس بادشاہ کے زیر سایہ کوئی ان کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

یہاں سے سلیم چشتیؒ کے مقبرہ کو گئے یہ سفید سنگ مرمر کی خوب صورت عمارت ہے جس کے اندر سیپ کا بہت ہی نفیس کام کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بلند دروازہ دیکھا جو حقیقت میں بہت بلند ہے اس کی بلندی کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے اگر اس کے نیچے کھڑے ہو کر آخری حصہ کو دیکھنا چاہو تو سر پر ٹوپی قائم نہیں رہتی۔ چنانچہ ہمارے ایک دوست کی ٹوپی جو گری تو دیکھتے ہی دیکھتے چبوترہ سے تقریباً پچاس سیڑھیاں نیچے پہنچ گئی۔ اکبر کا پنج محل اور خاص محل بھی قابل تعریف ہیں۔ جہاں سے واپس ہوتے ہوئے شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل کے والد اعتماد الدولہ کا مقبرہ دیکھا جو جمنا کے کنارے واقع ہے مقبرہ کی دیواروں پر بہت ہی نفیس کام کیا ہوا ہے اور اطراف کے دروازوں میں مرمری نازک جالیاں لگی ہوئی ہیں جو عہد مغلیہ کے کاریگروں کی صنعت اور ان کے ہنر کا ثبوت دیتی ہیں ایک بجے ہم ہوٹل واپس آئے اور کھانے سے فارغ ہو کر آپس میں سلاطین مغلیہ کی عزت و وقار اور اس عہد کی ترقی پر تبادل خیالات کرتے رہے ڈھائی بجے آگرہ کا قلعہ دیکھنے گئے جہاں ہمارے کالج کے ایک پرانے طالب علم خسرو یار خاں ملے جن سے ہم نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر سب مل کر قلعہ دیکھنے گئے جہاں بہت سی سنگ مرمر کی عمارتیں مثلاً دیوان عام قصر جہانگیر محل خاص موتی مسجد اور سمن برج وغیرہ دیکھا موتی مسجد خالص سنگ مرمر کی ایک بہت عالیشان مسجد ہے جس کو شاہ جہاں نے بہت شوق سے تعمیر کرایا تھا ایک اور خوب صورت عمارت دیکھی یہ سمن برج کہلاتی ہے یہ جمنا کے کنارے واقع ہے۔ جہاں سے دریا کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ شاہ جہاں اپنی علالت کے زمانہ میں اسی محل میں رہتا تھا۔ جس کے برآمدہ کی دیوار میں ایک ناخن کے برابر ہیرے رنگ کا پتھر لگا ہوا ہے جس میں سے دیکھنے سے تاج محل جو بہت فاصلہ پر واقع ہے صاف دکھائی دیتا ہے اور کہتے ہیں کہ شاہ جہاں نے اپنی وفات سے کچھ دیر پہلے یہاں سے تاج محل کی آخری زیارت کی تھی۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

قلعہ سے سیدھے تاج محل کے باہر کا عالیشان دروازہ دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ بے مثل عمارت جو اس دروازے سے گزرنے پر دکھائی دے گی وہ کس قدر خوبصورت ہو گی غرض جوں ہی سیڑھیاں ختم کر کے اس دروازہ میں داخل ہوئے سامنے ہی ہندوستان کی وہ مایۂ ناز عمارت نظر آئی جو اپنی خوب صورتی میں نظیر نہیں رکھتی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جمنا کے پانی میں اپنا دل فریب عکس دیکھکر سہمی اور بے حس کھڑی ہے دروازہ سے مقبرہ تک جانے کے لئے دو راستے ہیں جس کے بیچ میں پانی کے حوض بنے ہوئے ہیں جنمیں فوارے اچھلتے رہتے ہیں اور جس کے دیکھنے سے عجب لطف آتا ہے راستہ کے دونوں جانب سرو کے خوبصورت درخت قرینہ سے لگائے گئے ہیں جو دور سے بہت خوشنما نظر آتے ہیں چمن میں ہر طرف گل کاری کی گئی ہے بیچ میں ایک حوض مرمریں مربع شکل کا ہے جس میں کنول کے پھول حوض کی خوب صورتی کو دو بالا کرے ہیں ان تمام چیزوں کو دیکھتے ہوئے ہم مقبرہ تک پہنچ گئے یہاں پر چند مغربی مرد اور خواتین بھی تاج کے نظارے میں محو تھے ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس عمارت کا شوق دیداران کو انگلستان سے کھینچ لایا سچ ہے کہ زندہ دلی اور سیاحت کا شوق اہل مغرب کی امتیازی خصوصیت ہے افسوس ہے کہ بہت سے لوگ ہندوستان میں رہکر اس بے مثل عمارت کو دیکھنے کا موقع حاصل نہیں کرتے جس کی وجہ سے ہندوستان کا وقار غیر ملک کے باشندوں کی نظروں میں بہت ہے ۔تاج محل ہندوستان کی سب سے مشہور عمارت ہے اور ہندوستان پر ہی کیا موقوف ہے بلکہ اپنی طرز میں دنیا بھر میں لاجواب ہے ۔ یہ مقبرہ شاہجہاں شہنشاہ ہندوستان کی بیوی ممتاز محل کا ہے جب یہ فوت ہو گئی اور داغ مفارقت دیگئی تو اس کے شوہر شاہ جہاں نے اپنی محبت کا ثبوت اس آرام گاہ کے بنانے اور سجانے میں دیا کیونکہ اس میں اس کے دل کی ملکہ ہمیشہ کے لئے سو رہی تھی ۔شاہ جہاں نے دریائے جمنا کے کنارے سنگ مرمر کا ایک عالیشان مقبرہ تیار کروایا جس کے وسط میں ممتاز محل کی قبر تھی اور کچھ عرصہ بعد اسی قبر کے قریب شاہ جہاں بھی جا لیٹا جس وقت میں اس عجیب و غریب عمارت کو دیکھ رہا تھا میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا کہ آیا روضۂ تاج محل کی خوب صورتی اور دل ربائی جس کی ایک دنیا شیدائی ہے صرف سنگ مرمر کی نفیس جالیوں سے پیدا ہوئی جو مزار کی گرد میں بنی ہوئی ہیں یا ان گل کاریوں کا نتیجہ جن کو باکمال استادوں نے سنگ مرمر کے سفید و بیش قیمتی پتھر پر منقش کر کر اپنی ہنر مندی کے جوہر دکھائے ہیں گو یہ تمام چیزیں اس کی دلکشی کو بڑھاتی ہیں مگر ممکن تھا کہ روضۂ ممتاز اس قدر ممتاز نہ ہوتا فی الحقیقت یہ شاہ جہاں کی اس بے لوث محبت کی برکت ہے ۔ جو وہ اپنی بیوی سے رکھتا تھا تاج محل کو دیکھنے سے سلاطین مغلیہ کی شان و شوکت اور اس عہد کے ترقی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اسے دیکھنے کے لئے ہر سال دور دور سے سیاح آتے ہیں کہتے ہیں کہ

یک بار ولایت کی ایک امیر خاتون اپنے شوہر کے ساتھ اس روضہ کو دیکھنے آئی ہوئی تھیں انہوں نے اپنے شوہر سے کہا اگر کوئی مجھے یہ یقین دلادے کہ مرنے کے بعد مجھے یہاں دفن کیا جائیگا تو میں ابھی ابھی مرجانے پر آمادہ ہوں تاج محل میں یہ تاثیر کیوں نہو شاہ جہاں اور ممتاز محل کا مقبرہ نہیں بلکہ میاں بیوی کی محبت کا مدفن اور اُن کی وفا کا مزار ہے۔ ان ؟ محبت کے مزاروں سے عجیب حسرت برس رہی تھی۔

میر مصطفیٰ علیخاں
سینیر بی۔ اے۔

مرغانِ چمن سے پھولوں نے اسے شاد یہ کہلا بھیجا ہے۔
آنا ہے تو اب بھی آجاؤ ایسے میں ابھی شاد اب ہیں ہم
شاد

خشک گل، افسردہ سبزہ، شمع چپ، بالیں اُس | جی بھر آیا منظرِ گورِ غریباں دیکھکر
تسلیم

یاد جب مجھکو مدینہ کی فضا آتی ہے | سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے
امیر

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے | میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا
آتش

کیفیت اُسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں | مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں
آتش

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا | ہم محو نالۂ جرس کاروان رہے
میر

غم صیاد و خوف باغباں ہے | دو عملی میں ہمارا آشیاں ہے
صبا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے | بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانے کیا یاد آیا

نہ کچھ تیزی چلی بادِ صبا کی | بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی
صبا لکھنوی

لب چپ ہیں تو کیا دل گلہ پرداز نہیں ہے | سب کچھ ہے خموشی میں اک آواز نہیں ہے
شوق قدوائی

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر باہیں غریب | عید کے دن جسکو غربت میں وطن یاد آگیا
امیر

قیدی

"عبدو...... عبدو اب کتنے بجے ہیں"؟ میں نے اپنے بستر پر لیٹے ہوئے ہی پوچھا۔

"جی ابھی شہر کے گھنٹے نے دو بجائے ہیں۔ کیوں سرکار آپ اتنی رات گئے جاگ رہے ہیں؟"

"ہاں عبدو نیند کچھ اچاٹ سی ہوگئی" میں نے کہا۔ پھر میں تھوڑا سا پانی پی کر اپنے بستر پر لیٹے ہوئے اپنی غزل کا ایک شعر بار بار دہرا رہا تھا کہ یکایک عبدو کی آواز آئی "ذرا ٹھہریئے سرکار"۔ میں اکدم اٹھا اور ذرا ٹھیر کر عبدو سے پوچھا۔ "کیوں خیر تو ہے؟"

"پہلے تو مجھے اپنی جھونپڑی کے پیچھے کی پہاڑی کی طرف سے سیٹی کی ایک دھیمی آواز آئی اور پھر ایسا معلوم ہوا کہ اس طرف بہت سے آدمی دوڑ رہے ہیں"۔ عبدو نے یہ کہتے ہوئے مجھ سے پہاڑ کی طرف چلنے کی خواہش کی اور میں نے بھی اس کے کہنے پر بغیر سوچے سمجھے جانے کا ارادہ کرلیا میں نے اپنی ٹارچ لے لی اور عبدو نے ایک موٹا لمبا ڈنڈا لے لیا۔ ہم دونوں جھونپڑی کے چبوترے پر سے اتر کر پہاڑ کی طرف چلے۔ دھیمی دھیمی چاندنی تھی۔ ہوا کا نام نہ تھا۔ پودے خاموش تھے۔ بڑے درخت خاموش تھے۔ زمین پر سوکھے پتے بچھے ہوئے تھے۔ ہمارے قدموں کی آواز خاموش جنگل میں پھیل کر گونج رہی تھی۔ میرے دامن سے ببول کی ایک سوکھی شاخ الجھ گئی۔ عبدو نے اسے نکال دیا۔ میں نے پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ جھونپڑی سے ہم بہت دور نکل گئے تھے مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ مجھے کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا۔ میں نے عبدو سے کہا۔ "ہم بہت دور نکل گئے ہیں"

عبدو "آپ کچھ خوف نہ کیجئے۔ اس مقام پر اکثر بدمعاش راتوں کو لوٹ مار کیا کرتے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو آج کسی نہ کسی کو پکڑ کر خوب اس کی درگت بنائیں گے" عبدو نے کہا۔

ہم دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ عبدو آگے تھا۔ دفعتاً میرے کانوں میں سیٹی کی سی آواز آئی۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔ عبدو نے بھی سیٹی سنی وہ فوراً رک گیا۔ اور ہاتھ سے مجھے ٹھیر جانے کو کہا۔ میرے پاس سے کوئی جانور تیزی سے جھاڑی کی طرف بھاگا۔ اس کے بعد ہم کو قریب بیس۲۰ منٹ کے کوئی سیٹی وغیرہ نہیں سنائی دی۔

ہم پھر چلنے لگے اب ہم پہاڑ کا دوسرا رخ اتر رہے تھے اور بہت خاموشی کے ساتھ

اتر رہے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں ایک پگ ڈنڈی نکل کر بڑی سڑک میں جا ملتی تھی۔ ہم اس پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ عبدو نے جھاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ تین سیاہ پوش ایک نہتے شخص پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ تھوڑے وقفہ کے بعد ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ ہاتھ میں خنجر تھا۔ ایک لمحہ کے اندر ہی خنجر اس شخص کے سینے میں پیوست کر دیا گیا۔ جب وہ زمین پر گر پڑا تو تینوں سیاہ پوش فرار ہو گئے۔ اور ہمارے سامنے ایک پگڈنڈی پر ایک خنجر آ گرا۔ اس سے ہماری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ خنجر نہایت زنگ آلود تھا۔ عبدو فوراً زخمی کی طرف دوڑا میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ دو ہی منٹ میں ہم زخمی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ عبدو نے زخمی کو بغور دیکھا وہ مر چکا تھا۔ شہر کے گھنٹے نے اپنی گرجدار آواز میں آہستہ آہستہ تین بجائے مجھے معترف ہونا چاہئیے میں سر سے پیر تک سرد ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نہایت خوف میں مبتلا تھا اس لئے کہ آج تک ایسا منظر نہ دیکھا تھا۔ عبدو اپنے پہلو میں شیر کا دل رکھتا تھا۔ اس کے چہرے پر حقارت آمیز تبسم لہریں مار رہا تھا۔ بزدل ایک نہتے پر تین تین۔ میں ان ناپاکوں سے ضرور اس کا بدلہ لونگا۔ سرکار آپ کچھ بھی کہیں میں تو ان کا تعاقب کروں گا۔" یہ کہکر عبدو اس جھاڑی کی طرف لپکا جہاں سیاہ پوش غائب ہو گئے تھے۔ مجھے اس کو اس ارادہ سے باز رکھنے کا موقع نہ ملا۔ چار ناچار میں بھی اس کے ساتھ چلا آیا میں نے کہا۔ "عبدو اب اس جنگل سے ہمکو بہت جلد باہر ہو جانا چاہئیے ورنہ پولیس ہمکو ہی . . . ."

"ذرا سرکار" عبدو نے بات کاٹ کر کہتے ہوئے مجھکو چپ رہنے کے لئے اشارہ کیا۔ پانچ چھ سکنڈ کے بعد اس نے میری طرف دیکھا کہ اب کہئیے۔ "ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ پولس ہمکو ہی ملزم ٹھیرادے اور مفت میں ہم گرفتار ہو جائیں۔

"تو ٹھیک ہے آپ کا ارشاد۔ ہم جلد واپس ہو جائیں گے"۔

جنگل میں اجالا ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ جنگل کی ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی مگر ابھی جھاڑوں کا سایہ نہیں پڑ رہا تھا۔ اور پہاڑوں کا بھی سایہ نہیں پڑ رہا تھا۔ جب ہم پگ ڈنڈی کے قریب تھے۔ اس پر مجھے ایک دیہاتی نظر آیا۔ جس کی عمر تقریباً ساٹھ یا ساٹھ سے اونچی ہوگی اور جس کا جسم نحیف تھا مگر پٹھے صاف نمایاں تھے۔ وہ جھک کر زمین سے کچھ اٹھا رہا تھا میں نے عبدو کو انگلی کے اشارہ سے تبلایا۔

مجھے وہ زراعت پیشہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے کندھے پر لاؤ کی رسی دکھائی دے رہی ہے" عبدو نے آہستہ سے کہا۔

"وہ کم بخت زمین سے وہی خنجر اٹھا رہا ہے عبدو۔ مفت میں یہ بے قصور پکڑا جائے گا۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ ہم دونوں شش و پنج میں تھے کہ کیا کیا جائے۔ عقل نے یاری نہ کی۔ ہم اس کی طرف خاموشی سے تک رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ پیچدار راستوں کو طے کرتا ہوا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ! ہم دونوں نے قریب کا راستہ اختیار کیا۔ اب ہم کو اپنی جھونپڑی نظر آ رہی تھی۔

"عبدو اس نے ہمکو دیکھ تو نہیں لیا ہو گا"

"نہیں مجھے یقین ہے اس نے ہم کو ہرگز نہیں دیکھا اس لئے کہ ہم کافی طور پر چھپے ہوئے تھے"۔ عبدو نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"عبدو کیا تم کو اس کی صورت یاد ہے"؟

"مجھے اچھی طرح یاد ہے"

دوسرے روز گاؤں کا بازار تھا۔ جو آٹھ روز میں ایک مرتبہ بھرتا تھا۔ میں اور عبدو کچھ ضروری اسباب خورد و نوش لانے بازار کے وسیع میدان کی طرف چلے گئے۔ عبدو بہت تیز چلنے کا عادی تھا۔ مجھے بھی تیز چلنے کی رفتہ رفتہ عادت ہو چکی تھی۔ ہم کو بازار میں آدمیوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ نظر آ رہے تھے۔ عبدو نے کہا "آج بازار کا پھیلاؤ غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔ لوگ سڑک کے قریب قریب تک آ گئے ہیں" ہم اور آگے چلتے گئے۔ سڑک کے کنارے پولیس کی چوکی تھی اور لوگ بھی زیادہ اسی طرف تھے۔ جب ہم مجمع کے قریب پہنچے تو لوگوں میں ایک عجیب ہیجان پایا گیا۔ سب کے سب عالم پریشانی میں "خون، خون" کہہ رہے تھے۔ سارے بازار میں ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم کچھ سمجھ نہ سکے۔ مجمع دائرہ کی شکل میں تھا۔ عبدو میرا ہاتھ پکڑے ہوئے مجمع کو چیرتا ہوئے دائرہ کی پہلی صف میں گھس گیا۔ وہاں ہم نے دیکھا ایک آدمی پابہ زنجیر کھڑا ہے۔ اور گڑگڑاتے ہوئے یہ کہہ رہا ہے "میں خونی نہیں ہوں۔ میں نے خون نہیں کیا۔ مجھے قید نہ کرو مجھے سزا نہ دو میں بے گناہ ہوں"

پولیس کے حاکم نے اس سے پوچھا۔ پھر یہ خون آلود خنجر تمھارے پاس سے کیوں برآمد ہوا؟ عبدو نے آہستہ میرا ہاتھ دبایا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے میرے کان میں آہستہ سے

کہا "یہ آدمی وہی ہے جس نے خنجر اٹھایا تھا"

قیدی کی زبان پر یہ الفاظ تھے "میں خونی نہیں ہوں۔ مجھے چھوڑ دو" حاکم نے پوچھا۔
"تمھارے پاس اپنے بے گناہ ہونے کا کیا ثبوت ہے؟

میرے پاس کیا ثبوت ہے؟ میں خونی نہیں ہوں۔ مجھے چھوڑ دو" قیدی نے کہا۔
سارے مجمع پر خاموشی طاری وساری تھی۔ سب لوگ قیدی کو دیکھ رہے تھے۔ قیدی نے کچھ سوچ کر یہ کہنا شروع کیا "حاکم صاحب آپ تھوڑی آگ منگوائیے۔ اگر میں خونی نہیں ہوں تو میرا ہاتھ نہیں جلے گا۔ اگر میں خونی ہوں تو جل جائے گا"

آگ منگوائی گئی۔ قیدی نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اطمینان واستقلال کیساتھ آگ کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ مگر ہائے کمبخت ہاتھ جل کر کباب ہوگیا تھا۔

محمد سلام اللہ خان

سال اول

پھر نہ کچھ آیا نظر جب تو نظر آیا مجھے　　　جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا مجھے

آتش

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　　ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

آتش

عالم ہو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے　　　چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

ریاض

کیا حسرت سے رخصت صبح کے تارے کو یہ کہکر　　　کہ جس کا شام سے تھا آسرا ابتک نہیں آیا

ریاض

دیا ہو تو دیا ہو کچھ پیام شوق آنکھوں نے　　　مرے لب پر تو حرف مدعا ابتک نہیں آیا

ریاض

جتنا جی چاہے ستائے ستم ایجاد مجھے　　　مرغ تصویر ہوں آتی نہیں فریاد مجھے

امیر

رپورٹ و رُوداد بزم اتحاد اردو نظام کالج بابتہ ۴۱ء تا ۴۲ء

بزم اتحاد اُردو نظام کالج کی کابینہ حسب ذیل عہدہ داروں پر مشتمل تھی۔

صدر۔ پروفیسر احمد عبد اللہ صاحب صدیقی۔

نائب صدر۔ جناب شیخ سعادت علی صاحب۔

معتمد۔ ہیم چندر پرشاد۔

خازن۔ جناب سید ناظم الدین صاحب۔

اراکین۔

محمد ممتاز علی صاحب۔ محمد فصیح الدین صاحب۔ میر اسد علیصاحب۔ سید نور الحسن صاحب قاضی احمد بشیر الدین صاحب۔ علی محمد خسرو صاحب۔ مس یس۔یس انجنیرو مس میمونہ زاہد علیصاحب۔

بزم اتحاد اردو کے منتخبہ عہدہ داروں نے اگسٹ ۴۱ء کے تیسرے ہفتہ میں جائزہ حاصل کیا۔ بزم کا افتتاحی جلسہ یکم ستمبر ۱۹۴۱ء بصدارت نواب ذوالقدر جنگ بہادر منعقد ہوا۔ جناب شیخ سعادت علیصاحب نائب صدر بزم کے خطبۂ صدارت سے جلسہ کا آغاز ہوا جس میں بزم کی اہمیت اغراض و مقاصد پر کافی روشنی ڈالتے ہوئے بزم کے لائحۂ عمل کا ایک مفید اور مختصر خاکہ پیش کیا گیا تھا۔

قابل نائب صدر نے اپنے مبسوط خطبۂ صدارت کا آغاز کرتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی تھی کہ بزم اتحاد اردو کالج کے طلبہ کا وہ مقدس ادارہ ہے جو ان کی اجتماعی۔ اخلاقی۔ علمی اور عملی زندگی کو استوار کرتا اور ان کی مناسب نمائندگی سے طلباء میں ارتباط اور اختلاط پیدا کرتا ہے۔ آپ نے مزید واضح کیا کہ بزم اتحاد کا بنیادی مقصد طلباء میں تقریری تحریری اور تنظیمی صلاحیتوں کی تربیت ہے اس کے بعد بزم کی سرگرمیوں کے مختلف شعبوں سے متعلق بزم کا لائحۂ عمل پیش کیا جس کی تفصیل اور اس کی تکمیل کی رپورٹ آگے بیان کیجائیگی

۲۔ نائب صدر کے خطبۂ صدارت کے بعد ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ نے بعنوان "تعمیر سیرت" ایک دلچسپ اور پر از معلومات تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب نے جو فلسفیانہ دماغ حکیمانہ نظر اور شاعرانہ احساس کے حامل ہیں اپنی تقریر کے دوران میں مختلف مثالوں سے یہ واضح کیا کہ ہر شخص کا ایک خاص کردار ہوتا ہے اور وہ اس کردار کے (مرکز ثقل) کے گرد گھومتا ہے۔ کسی شخص کا کردار مختلف

حیثیتوں کا حامل ہوتا ہے اور اس شخص کے کردار کی جانچ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جبتک اس کے کردار کو مختلف حیثیات سے جانچا نہ جائے قابل مقرر نے فرمایا کہ کردار پر ماحول کا گہرا اثر پڑتا ہے اس لئے نوجوانوں کی سیرت کی تعمیر میں اس امر کا خیال نہایت ضروری ہے۔

صدر جلسہ کی صدارتی تقریر کے بعد جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

جلسۂ افتتاحیہ کے بعد بزم نے سال کے شروع ہی میں تقاریر کا ایک مکمل نظام العمل طبع کرا کے طلبہ میں تقسیم کر دیا اس سال پروگرام جملہ سترہ جلسوں پر مشتمل تھا جن کی تفصیل یہ ہے۔

نشان سلسلہ	موضوع	محرک	مخالف
۱	تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا	احمد عبداللہ سال چہارم	محمد عبدالہادی سال سوم
۲	طلبا کو سیاسی تحریکات میں عملی حصہ نہ لینا چاہئے۔	سید نورالحسن " دوم	سیف الدین عبدالمجیب " دوم
۳	جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو	حامد حسین " سوم	عالم علیخاں " دوم
۴	مذہب کی حقیقی تعلیم کا فقدان موجودہ عالمگیر تباہی کا باعث ہے	محمد ابراہیم احمد " چہارم	شوکت علیخاں " چہارم
۵	سائنس نے نوع انسانی کو مذہب سے زیادہ فائدہ پہنچایا ہے۔	سید ریاض الحسن " "	محمد فریدالدین احمد ایم اے ابتدائی
۶	ہندوستان میں لسانی اختلاف اجتماعی ترقی میں مزاحم ہے	محمد عبدالہادی " سوم	احمد عبداللہ سال چہارم
۷	ہندوستان میں متحدہ قومیت ممکن ہے۔	شوکت علیخان " چہارم	احمد عبداللہ سال "
۸	اچھی حکومت کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ جمہوری ہو۔	محمد عبدالہادی " سوم	سید ریاض الحسن " "
۹	کسی ملک کے لئے شاعر سیاست دان سے بہتر ہے۔	افسر سلطان " چہارم	غلام حسن علی " "
۱۰	کالجوں میں فوجی تربیت لازمی ہے۔	ابو جعفر شرف الدین علی " "	محمد عبدالحلیم " "
۱۱	موجودہ نظام تعلیم ناقص ہے	سید یوسف حسینی " سوم	بدری نارائن راٹھی " سوم
۱۲	موجودہ عالمگیر جنگ غلط اور خودغرضانہ سیاست کا نتیجہ ہے	ہیم چندر پرشاد " "	سید ناظم الدین " چہارم
۱۳	انسانیت کیلئے روحانیت مادیت سے زیادہ مفید ہے	قاضی محمد بشیرالدین " اول	ناگشی " دوم
۱۴	ع جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی	سید نورالحسن " دوم	سید ریاض الحسن " چہارم
۱۵	جامعاتی امتحانات طلبہ کی قابلیت کا حقیقی معیار نہیں ہو سکتے	محمد نیاز الدین احمد " چہارم	محمد عبدالحلیم " "

۱۶	ہندوستان کیلئے زرعی ترقی صنعتی ترقی سے زیادہ ضروری و اولی ہے۔	اشفاق احمد	سال سوم	عزیز سعید	سال سوم
۱۷	ہندوستان میں موجودہ اعلیٰ تعلیم کی تجدید بے روزگاری کا صحیح حل ہے۔	ضیاء الحسن جعفری	سال اول	محمد نصیر الدین احمد	سال سوم آنرز

۳ بزم کے زیر اہتمام اردو ادب کے مایہ ناز شاعر شوکت علیخاں فانی کی وفات پر ایک جلسہ تعزیت بصدارت جناب شیخ سعادت علی صاحب منایا گیا مختلف تقریروں کے بعد قرار داد تعزیت صدارت سے پاس ہوئی

۴۔ حسب پروگرام بزم کے میقاتی فی البدیہہ تقریری مقابلے منعقد کئے گئے جس میں علبہ (۲۵) سے زائد مقررین نے حصہ لیا مقابلے نہایت دلچسپ اور کامیاب رہے جن کے نتائج یہ ہیں۔

بی اے بی۔ ایس سی۔ آنرز سکشن
۱۔ اوّل شوکت علی خاں صاحب
۲۔ عبد الہادی صاحب۔

انٹرمیڈیٹ سکشن
۱۔ اول نورالحسن صاحب
۲۔ دوم۔ قاضی احمد بشیر الدین صاحب۔

۵۔ حسب دستور اس سال بھی بزم اتحاد کی جانب سے بین الکلیاتی سالار جنگ فی البدیہہ تقریری مقابلہ بتاریخ ۲۴ر فروری ۴۲ء منعقد ہوا۔ جس میں یونیورسٹی عثمانیہ کالج اور سٹی کالج کے مقررین کو مدعو کیا گیا تھا۔ حکم صاحبان میں نواب ناظر یار جنگ بہادر۔ راجہ بہادر بشیشر ناتھ صاحب اور مولوی سید محی الدین صاحب شریک معتمد تعلیمات تھے مقابلہ کے لئے جو موضوعات دئے گئے تھے وہ یہ ہیں۔

۱۔ پارلیمنٹری طرز حکومت ممالک شرقیہ کے لئے کس حد تک موزوں ہے۔

۲۔ معاشی مسائل ہی موجودہ جنگ کے باعث ہوئے ہیں۔

۳۔ بے روزگاری کے اسباب اور ان کے ارتفاع کی سبیل کل مقررین کی تعداد بارہ تھی جن میں سے چار عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے۔ چار کلیہ بلدیہ۔ اور چار نظام کالج کے نمائندے تھے۔ تقریری مقابلہ نہایت دلچسپ رہا۔ سالار جنگ کا رگردان کو سٹی کالج کی ٹیم نے جو مجید احمد صاحب فاروقی اور فاروق علی خانصاحب پر مشتمل تھی حاصل کیا۔

انفرادی طور پر مجید احمد صاحب فاروقی نمائندہ سٹی کالج۔ اور احمد محی الدین صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کالج اول و دوم رہے۔

۶۔ بزم اتحاد کا سالانہ مشاعرہ بصدارت سر محمد یعقوب مرحوم مشیر اصلاحات بتاریخ ۱۳ ار جنوری ۱۹۴۲ء منعقد ہوا۔ ملک کے مشہور شعرا نواب تراب یار جنگ بہادر سعید۔ نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج جناب ابو الحسن صاحب قیصر۔ جناب غلام مصطفےٰ صاحب رسا۔ جناب مخدوم محی الدین صاحب مخدوم کے علاوہ دیگر شعرا نے بھی شرکت کی تھی۔ مشاعرہ میں جناب فضلی صاحب بھی مدعو تھے جن کا کلام بھی مقبول ہوا۔ ان شعرا کے علاوہ کالج اور مدرسہ عالیہ کے نوجوان شعرا نے بھی کافی تعداد میں طبع آزمائی کی اس طرح سے جملہ (۵۰) شعرا نے مشاعرہ میں شرکت کر کے مشاعرہ کو بیحد کامیاب کیا۔

۷۔ بزم ادب کی جانب سے ایک ششماہی رسالہ "نظام ادب" بھی چند سال سے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سال نظام ادب کی ادارت انتظاماً مستقل طور پر جناب آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اردو کے تفویض کی گئی ہے جن کے تحت ایک سب کمیٹی نظام ادب کا انتظامی کام انجام دیتی ہے یہ کمیٹی جو بحیثیت ذیلی کمیٹی بزم کی کابینہ میں شامل ہے۔ حسب ذیل حضرات پر مشتمل ہے۔

معتمد نظام ادب . . . . سید ریاض الحسن

اراکین

غلام حسن علیصاحب۔ عالم علی خان صاحب۔ ضیاء الحسن صاحب جعفری۔ بی۔ ایس۔ فرحت قطب الدین صاحب

نظام ادب کا پہلا شمارہ طبع ہو چکا ہے۔ دوسرا شمارہ زیر ترتیب ہے بعنقریب شائع ہو جائیگا۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا ضروری ہوگا کہ اگرچہ نظام ادب کا استحکام بیشتر طلبا رقدیم کی اعانت پر منحصر ہے لیکن کالج سے ایک مستقل مالیہ کا انتظام نظام ادب کی دوامی زندگی کا باعث ہوگا۔

اس کی صورت اس طرح ہو سکتی ہے کہ انگریزی میگزین کی طرح نظام ادب کا چندہ لازمی قرار دیا جائے اور طلبار سے سالانہ فیس کے ساتھ آفس میں وصول کیا جائے۔ بزم اتحاد جناب پرنسپل صاحب سے ادباً مستدعی ہے کہ اس خصوص میں کافی غور فرمایا جائے۔ مالی مشکلات کے قطع نظر نظام ادب ہمیشہ سے صاحب قلم طلبار کا محتاج توجہ رہا ہے اگر طلبار کی دلچسپی کا یہی حال رہا تو رسالہ کا مستقبل معلوم۔

۸۔ بزم کا یوم سالانہ بتاریخ یکم مارچ ۱۹۴۲ء بصدارت عالی جناب آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر آصفجاہی صدر المہام تعمیرات منایا گیا۔ جناب نائب صدر صاحب کی تعارفی تقریر اور معتمد کی رپورٹ کے بعد جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے بعنوان دکن میں اردو ایک دلچسپ تقریر فرمائی اور واضح فرمایا کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ اور ہندوؤں نے بھی اس کی

کافی خدمت کی ہے۔ حیدرآباد کے ممتاز اردو دان حضرات میں انھوں نے سرمہاراجہ کشن پرشاد بہادر آنجہانی راجہ محبوب راج بہادر باقی۔ راجہ مرلی منوہر صاحب بہادر آنجہانی اور دور حاضرہ میں راجہ نرسنگ راج عالی کے اسمائے گرامی بطور مثال پیش کئے اور فرمایا کہ اردو کی موجودہ ترقی شدہ حالت ہندوں اور مسلمانوں کی مشترکہ سعی کا نتیجہ ہے صدارتی تقریر کے بعد جلسہ نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ متعین میں کالج کے پروفیسر صاحبان طلباء وطالبات کے لئے ایک پرتکلف عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا۔
بزم ہذا۔ آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر کی ممنون ہے کہ انھوں نے بزم کو دو سو روپیہ کا گرانقدر عطیہ مرحمت فرمایا ہے۔

۹۔ یہ ہیں بزم اتحاد اردو کی سرگرمیاں جن کا تذکرہ اجمالاً آپ کے گوش گزار کیا گیا۔ اس سال بزم کے مشاغل سالہائے گذشتہ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنانے کی انتہائی کوشش وسعی کسی حد تک مشکور ہوئی۔

۱۰۔ یہاں یہ امر واضح کردینا ضروری ہوگا کہ بزم ہذا کی ہمہ جہتی کامیابی کا انحصار بیشتر طلباء قدیم کی اعانت پر ہے ہم معزز طلباء قدیم اساتذہ صاحبان کے مشکور ہیں کہ اُنھوں نے اپنی قیمتی اعانت سے بزم کو مستفد فرمایا۔

۱۱۔ آخر میں میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ عالیجناب پرنسپل صاحب وجناب صدر صاحب بزم وجناب نائب صدر صاحب کا دلی شکریہ ادا کروں جنھوں نے فرائض کی تکمیل میں میری گرانقدر رہنمائی اور امداد فرمائی۔

۱۲۔ اراکین کابینہ اور اراکین بزم بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے میرا بہت کچھ ہاتھ بٹایا۔

ہیم چندر پرشاد
معتمد

اک آن میں گھائل دل وجاں سارے کے سارے
خنجر سے بھی بڑھ کر ہیں ستم گر کے اشارے

حاصل نہ رہیں مجھ کو اگر تیرے نظارے
زندہ رہوں اے جانِ کرم کس کے سہارے

ہیں جس کے مہ و مہر یہ داغِ جگر و دل
آنسو ہیں اُسی چرخ کے ٹوٹے ہوئے تارے

عالم ہے کہ ہے محوِ تماشائے تجلّی
میں دیکھ رہا ہوں ترے ابرو کے اشارے

میں نے اُنھیں پایا چمنِ دہر کی زینت
جو پھول کہ اے رشکِ چمن تو نے اُتارے

دُنیا نے پکارا جسے محبوبۂ فطرت
اُس دوش کے گیسو بھی تو ہم ہی نے سنوارے

اے دوست۔ رہے زیست کے حاصل وہ شب و روز
فاروق نے جو تیری محبت میں گذارے

محمد فصیح الدین فاروق سینیر بی۔اے

۷۰۹۱۶۷

جلد ۱ بابتہ ستمبر و مارچ ۱۹۳۹ء و ۱۹۴۰ء عیسوی شمارہ ۱ و ۲

طلبائے نظام کالج کا ششماہی رسالہ

زیرِ نگرانی

(۱) جناب آغا حیدر حسن صاحب دہلوی پروفیسر اردو

(۲) جناب احمد عبد اللہ صاحب صدیقی پروفیسر اردو

(۳) جناب غلام دستگیر صاحب رشید پروفیسر فارسی

(۴) جناب سید بادشاہ حسین صاحب (سابق طالب علم)

مجلس ادارت

مدیر
محمد عبد القوی صاحب (سال چہارم)

معتمد
سید منظور احسن ہاشمی (سال سوم)

اراکین

غلام جیلانی صاحب (سال سوم) احمد الدین صاحب صدیقی (سال سوم)

پرشوتم راج سکسینہ صاحب (سال اول)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس

سالانہ چندہ

طلباء حال سے ———— دو روپیہ سالانہ

طلباء سابق سے ———— دو روپیہ سالانہ

عوام سے ———— دو روپیہ سالانہ

شرح اشتہارات

پورا صفحہ ———— دس روپیہ

نصف صفحہ ———— چھ روپیہ

مضامین اور چندہ ارسال کرنے کا پتہ

معتمد "نظام ادب" نظام کالج حیدرآباد دکن

فہرستِ مضامین

A-:۹۰

شذرات

نظام کالج اردو میگزین کی موقوفی کے کم و بیش دس سال بعد نظام کالج سے ایک اردو رسالہ موسوم بہ "نظام ادب" جاری ہو رہا ہے۔

میگزین کی موقوفی کا سبب، جیسا کہ دیگر رسائل کا ہوا کرتا ہے، طلباء کی بے توجہی اور سرپرستوں کی دامن کشی تھی نظام ادب کا جاری ہونا ان تمام دشواریوں پر قابو پانے کے مترادف ہے۔ عموماً طلباء کا اپنے درسی مشاغل میں مدرجہ انہماک ان کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ دیگر ادبی کاموں میں بھی کما حقہٗ حصہ لیں۔ اسی خیال سے رسالہ کی اشاعت سال میں صرف دو بار رکھی گئی ہے۔ یہ امر قابل مسرت ہے کہ یہ رسالہ طلبائے نظام کالج حال و قدیم کے باہمی اشتراک عمل اور اجتماعی جد و جہد کا ایک خوشگوار اور قابل رشک نتیجہ ہے۔ میں اپنی اس توقع کا جو بمنزلہ یقین کے ہے اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "نظام ادب" جس کا مقصد اردو ادب کی پرخلوص خدمت اور طلباء میں ادبی ذوق کا پیدا کرنا ہے اپنے روشن اصول پر ماضی سے زیادہ مستقبل میں پابند رہے گا۔

رسالہ میں تنوع اور معیاری خصوصیات پیدا کرنے کی بابت ہمیں ایسے بلند بانگ دعوے کرنے نہیں ہیں جو شرمندہ ثبوت نہ ہو سکیں۔ ایک سرسری سی نظر صاحبانِ ذوق پر ظاہر کر دے گی کہ ہم نے افادیت کو پیش نظر رکھا ہے اور مفید اور کار آمد مضامین ہی جمع کئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ پروفیسر صاحبان اور

سابق طلباء کی قلم کاریوں نے رسالہ کے عام معیار کو خود بخود خاصا بلند کر دیا ہے۔ پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب کا مضمون اس اشاعت کی جان ہے۔ آغا صاحب دلّی کی بیگماتی زبان جس انوکھے طرز میں لکھتے ہیں وہ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ صرف انہی کا حصہ ہے اور جس کو ملک کے طول و عرض میں خاص عزت و وقعت حاصل ہے۔ پروفیسر صدیقی صاحب کو ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا بے حد شوق ہے اور اکثر صاحبان ذوق جانتے ہیں کہ ان کا ذخیرہ کتنا گراں قدر ہے اس لئے اس موضوع پر اُنھوں نے فنی اعتبار سے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔

طلبائے سابق میں سید باد شاہ حسن صاحب اور ناکارہ حیدر آبادی ملک کے مشہور ادیب ہیں۔ اول الذکر کو ڈرامہ سے جو خاص دلچسپی ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یقین ہے کہ ان کا ہلکا طنزیہ ڈرامہ "پبلشر" بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ ناکارہ صاحب نے "بے روز گار" کو موضوع بنایا ہے اور ہنسی ہنسی میں بہت سی کام کی باتیں کہی ہیں۔ در اصل اعلیٰ درجہ کے مزاح کی یہی ایک خصوصیت ہے۔ ہادی جعفری صاحب نے ہندوستان کی حرفتی صلاحیتوں کو بہت اچھے اور موزوں وقت پر یاد دلایا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ عوام موضوع کی اہمیت سے باخبر ہوں اور اس کے ذرائع اور امکانات پر عملی نقطہ نظر سے غور و فکر کریں۔ طاہر علی صاحب مسلم اردو ادب کا پاکیزہ مذاق اور خصوصاً شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ان کا کلام دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

طلبائے حال نے بھی اپنی بساط سے بڑھ چڑھ کر داد محنت دی ہے۔ عنوانات کے انتخاب اور مضامین کی تیاری میں کافی تلاش و جستجو کی ہے۔ اس سلسلہ میں بعض اہم موضوع پر اظہار خیال ضروری ہے مثلاً جامعات اور مسئلہ بے روز گاری اور نرسری وغیرہ جو بلاشبہ

ہندوستاں کے اہم ترین مسائل میں سے ہیں ان کے سوا دیدار ستارے، موسیقی وغیرہ بھی بہت دلچسپ موضوع ہیں۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ رسالہ کے اجرا میں نہ صرف پرنسپل صاحبان اور طلبائے حال نے حتی الوسع دلچسپی لی بلکہ طلبائے سابق نے بھی خاطر خواہ ہاتھ بٹایا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر احمد عبداللہ صاحب صدیقی اور سابق طالب علم سید بادشاہ حسین صاحب کے نام پیش پیش ہیں۔ ایک نے رسالہ جاری کرنے کی تحریک کو ابتدائی مرحلوں سے نکالا تو دوسرے نے رسالہ کو ناظرین کے ہاتھوں تک پہونچانے کے قابل بنایا۔ اسی سلسلہ میں صاحبزادہ میر آفتاب علی خاں صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ صاحب موصوف کی خدمات بھی بزم ادب کو حاصل رہیں۔ طلبائے حال میں میرے رفقائے کار، منظور الحسن صاحب۔ جیلانی صاحب اور بابر بیگ صاحب کی کوششوں کو کافی دخل ہے۔ کتابت اور طباعت کے جملہ امور میں جو دلچسپی انھوں نے لی اور جس محنت و مستعدی سے انھوں نے کام کیا ہے وہ حد درجہ لائق تحسین و داد ہے۔

میں جملہ معطیاں و معاونین خصوصاً نواب معین الدولہ بہادر نواب سالار جنگ بہادر۔ نواب تراب یار جنگ بہادر اور نواب مہدی جنگ بہادر جنہوں نے اپنی قدیم درسگاہ کو فراموش نہیں کیا۔ مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ ان کے فیاضانہ عطیوں کا کماحقہٗ شکریہ ادا کروں۔ نواب معین الدولہ بہادر اور نواب تراب یار جنگ بہادر نے اپنا کلام عنایت فرما کر مزید شکریہ کا موقع عطا فرمایا۔ حیدرآباد کے مشہور و مقبول شاعر حضرت صفیؔ کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جنہوں نے اپنی غزل عنایت فرمائی۔ آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو خوشگوار اور نیک جذبہ نظام ادب کے احیاء کا باعث ہوا وہی اگر اس کی بقاء و توسیع میں بھی کار فرما رہے تو اس کی کامیابی کسی عنوان ناممکن نہیں مجھے امید ہے کہ میرا دور ادارت ختم ہو جانے کے بعد طلبائے حال و سابق پرچہ کو کامیاب بنانے کی حتی الوسع کوشش کریں گے۔

مدیر

غزل

نتیجہ فکر عالیجناب نواب اعانت جنگ معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ معینؔ

یہ نہ فرماؤ کہ " آئینِ وفا یاد نہیں " — فیضِ الفت کے تصدق مجھے کیا یاد نہیں

اِک زمانہ تھا کہ ہر بات کا رہتا تھا خیال — اَب تو کچھ تیری محبت کے سوا یاد نہیں

کیا کہوں اپنے عقیدے کو مسیحا تم ہو — میں نے مانا کہ تمہیں کوئی دوا یاد نہیں

آج تک لاکھوں ہی اقرار ہوئے تھے ہم سے — اور جب یاد دلایا تو کہا یاد نہیں

کتبِ عشق کی تعلیم کا ہے خاص اَثر — جو لکھا بھول گیا اور جو پڑھا یاد نہیں

آپ کی چشمِ عنایت کے تصدق جاؤں — ہے یہ جینے کی تمنا، کہ قضا یاد نہیں

ہوں ملاقات کی لذت سے ابھی تک بیخود — مجھ سے کل آپ نے جو کچھ بھی کہا یاد نہیں

آج کب دیکھی ہیں ساقی کی نشیلی آنکھیں — آج کب پی ہے مئے ہوش رُبا یاد نہیں

آپ سے شکوۂ اندازِ ستم ہے بے کار — آپ کو شیوۂ اربابِ وفا یاد نہیں

ایک جلوے نے ترے کر دیا بیہوش مجھے — کس ادا نے مجھے مارا وہ ادا یاد نہیں

شبِ خلوت بھی ہو وہ زینتِ آغوش بھی ہے — عیش اتنا ہی میسر کہ خدا یاد نہیں

اے معینؔ پھر اُسی سفاک و ستم گر کا خیال

اُس کے برتاؤ تجھے مردِ خدا یاد نہیں

دِلّی کی بیگمات

سبحان اللہ! کیا مزے کی بات ہے کہ مردوں سے فرمائش ہوتی ہے کہ وہ بیگماتی زبان میں لکھیں تقریریں کریں اور مردوے اپنے چاروں طرف بیویوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہیر دنگیاں شہدے کے لٹھ ہو گئیں وضع دیکھو تو وہ ادھ مردی۔ لباس دیکھو تو وہ مردانہ۔ کسی کو تحریر تقریر کا شوق ہوا تو جانے مردوا باتیں کر رہا ہے خیر ہزاروں برس سے مرد ہی عورت کے اُستاد ہیں۔ داؤں پیچ سکھا کر خود چت ہوتے ہیں۔ میں بھولا بھی چلو اِن بیویوں کو اُن کی بھولی ہوئی باتیں یاد دلادوں۔ میں نے اٹھارویں سدی کی بیگمیں دیکھی ہیں اور اکثر بڑھیائیں ایسی دیکھیں جو محمد شاہی عہد دیکھنے والیوں کو دیکھ چکی تھیں۔ اِس لئے میری تقریر شاہِ عالمی زمانے سے شروع ہوگی۔ میرے چھٹپنے میں جو صورتیں دلی والوں کو پسند تھیں اور جوان کا مذاقِ حسن تھا وہ یہ تھا کہ گورا یا سبزہ رنگ ہو۔ گورا رنگ موتی کی آب کا پسند کیا جاتا تھا۔ فرنگی لون سفید نہ سمجھا جاتا اور نہ اُس کو گورا کہا جاتا۔ بھورا یا لال کہلاتا۔ اور اس رنگ کے مالک لال دیو یا لال دیونیاں کہلاتے بال سیاہ اور گھندار پسند کئے جاتے۔ بھویں پتلی اور کھنچی ہوئی۔ جٹی ہوئیں تو کیا کہنا۔ قد مدرا۔ ڈیل گدرا مائل بلاغری۔ پیشانی محرابدار یا بنی ہوئی۔ ناک پتلی نتھنے تنگ اور نازک۔ دہن پستہ۔ ہونٹ پتلے اور پستہ جیسی چھوٹی اور چمکدار۔ شانے گول۔ کمر پتلی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں۔ پتلی پتلی انگلیاں لمبوتری پوریں قدرے لمبی اور ناخن آبدار اگر بن مہندی کے ہوں تو گلابی۔ اور گوشت انگشت کے برابر۔ نہ نکلے ہوئے نہ ہٹے ہوئے یہ شاہ عالمی آئینِ حسن تھا جو شہر آبادی میں اکبر شاہ بہادر شاہ تک رہا اور شہر بربادی میں صورتوں کے دلدادہ دلی والے اسی معیار پر کستے اور پرکھتے رہے۔ یہی مذاقِ حسن اُنیسویں سدی کے آخر تک رہا۔ دلی میں بیگموں کے تین بڑے طبقے تھے۔ اوّل شہزادیاں۔ اُن میں دو درجے تھے ایک بادشاہِ وقت کی

بیگمات اور بیٹیاں بھتیجیاں۔ دوسرے سلاطین زادیاں۔ کہ جن کے اسلاف صاحب تخت و تاج رہے تھے یہ بادشاہ کے بھائی بند بھی کہلاتے تھے۔ ان میں دو درجے تھے۔ ایک تو وہ جن کا سلسلہ حضرت عالمگیر رح تک جا پہنچتا اور یہ نو محلے میں رہتے ان کی بیگمات نو محلے والیاں کہلاتیں۔ اور جن کا سلسلہ حضرت بابر بادشاہ تک منتہی ہوتا وہ بڑی بنیاد والے کہلاتے اور اُن کی بیگمات بڑی بنیاد والیاں۔ اور جن کا سلسلہ حضرت تیمور صاحبقران سے جا ملتا وہ چھوٹی بنیاد والے کہلاتے۔ اور ان کی بیگمات چھوٹی بنیاد والیاں ان میں اتا خیل بھی شریک تھے۔ دوسرا طبقہ نواب زادیوں کا تھا۔ ان میں بھی دو درجے تھے ایک تو وہ جو پوتروں کی امیر زادیاں تھیں۔ وہ اپنے کو شہزادیوں سے کم نہ سمجھتیں۔ اور دوسرے وہ جن کے مرد ولایت سے آتے یہاں خدمات بجالاتے۔ بادشاہ تک رسائی ہوتی۔ مناصب پاتے۔ جنگ و دلائی ملکی کے خطابات سے سرفراز ہوتے۔ یہ نو دو لتئے کہلاتے اور تین چار پشت تک حسد اور رشک کی نظروں سے قدیم امیروں میں دیکھے جاتے۔ تیسرا طبقہ شریفوں کا تھا۔ ان میں خوش باش جن کے پاس گاؤں۔ باغ۔ مکان کی دکانیں ہوتیں اور اُس کی آمدنی سے بسر کرتے۔ دوسرے نوکر پیشہ کہ یہ شاہی نوکریاں کرتے لیکن خطاب جاگیر اور منصب سے محروم رہتے۔ تیسرے مولوی چوتھے حکیم۔ شریفوں میں ان چاروں ذیلی طبقوں کی بیویاں بیگمیں کہلاتیں۔ اسی طبقہ میں ایک اور ذیلی طبقہ تھا۔ جو پیروں کا طبقہ کہلاتا شاہانِ مغلیہ میں اکبر بادشاہ سے پیری مریدی کی بنیاد پڑی اور اکثر مقربِ بارگاہ۔ ارادت مند عقیدت کیش اور مرید خاص کہلاتے اور یہ رنگ آخر بہادر شاہ بادشاہِ غازی تک رہا۔ جو مرید کرتے۔ اور عمل بخشتے اور اسم بتاتے۔ یہ بادشاہ کسی صاحب دل کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔ اس کی توجہ لیتے اور کسبِ باطن کرتے۔ رعیت کے عقیدہ میں ظل اللہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہی وہ صاحبِ تصرف سمجھے جاتے اور لوگ ان کو صاحب کشف و کرامات سمجھتے۔ اور ان کی رُوحانی قوت اور خرق عادات کے قائل تھے یہ بادشاہ ایسے خوش عقیدہ تھے کہ اکثر نے اپنی بیٹیاں ان پیروں کو یا ان کی اُولاد کو دیں جن کے وہ معتقد ہوتے۔ اِس لئے اکثر دلی میں پیروں کے گھرانے ایسے تھے جن کا ننھیالی رشتہ شاہی خانداں سے تھا۔ اور دلی والے اُنیسویں سدی تک بہت پیر پرست رہے۔ اور ان پیروں کا بہت اثر آبادی پر تھا اور ان کی بادشاہ کے بعد عزت کی جاتی بلکہ ایسے زمانے گزرے ہیں جبکہ بعض کو تو بادشاہوں پر بھی فوقیت دیجاتی۔ اور بادشاہ ان کے حلقوں میں حاضر ہونا اپنی سعادت سمجھتے۔ اور اُن کے وجود کو

اپنی اور اپنی سلطنت کے بقا کا موجب جانتے۔ ان پیروں کے ہاں کی مستورات بھی بیگموں میں شمار ہوتیں۔ پردہ شاہی خاندان میں کم تھا۔ کیونکہ رعایا، اولاد سمجھی جاتی اور اولاد سے پردہ کہاں۔ امیروں اور شریفوں میں پردہ سخت تھا اور عورتیں گھروں میں رہتیں۔ برسات اور گرمی میں جن کے باغ ہوتے وہ پردے کا انتظام کرا کے دنوں اور مہینوں ان باغوں میں جا کر رہتیں۔ امریوں میں جھولے پڑتے۔ کڑاہیاں چڑھتیں۔ جھرنوں۔ مدرسوں مقبروں اور جنگلوں میں سیر کو جاتیں۔ فالینر پر شام کو جاتیں پردے کا انتظام ہو جاتا۔ دریا میں نہایا جاتا اور خربوزے تربوز کھائے جاتے۔ ریتی پر ڈیرے خیمے لگ جاتے۔ بجرے نواڑوں ناووں میں بیٹھتیں۔ مچھلی کا شکار ہوتا۔ اور وہیں تل کر کھاتیں۔ زندگی کی ساری دلچسپیاں گھروں میں موجود رہتیں۔ اور آئے دن خوشی کی ایسی تقریبیں نکلتی رہتیں کہ جس کے بہانے سو پچاس بیویاں بلالی جاتیں اور کھانا گانا ہنسنا بولنا ہو جاتا۔ کچھ نہوا بہار میں جلاب لے لئے۔ منجین پی جا رہی ہیں۔ رنگ اور خون کی صفائی کے لئے ما، الجبن (مال جوبن) لئے جا رہے ہیں۔ گلابی محل کی دیواروں پر گلابی رنگ ہوا۔ فرش گلابی ہوا۔ پردے گلابی چھٹے۔ جھاڑ کنول۔ دیوارگیریاں ہانڈیاں۔ مردنگ سب گلابی۔ ماماؤں۔ اصیلوں۔ لونڈیوں باندیوں نے گلابی جوڑے پھڑ کائے۔ ملنے جلنے والیاں کنٹھے۔ رنگ کے قرابے۔ پانوں کے بیڑے۔ بُن سو بیاری (سپیاری) دھنیا الائیچیاں بھجوا رہی ہیں۔ گنگا جمنی الائیچیاں ہیں۔ چکنی سپیاری پر چاندی سونے کے ورق چڑھے ہیں۔ باجرے کے دانے برابر گول گول چھالیا کتری ہے۔ اور اُس پر سونے چاندی کے ورق چڑھے ہیں۔ الائچی کے دانوں پر بھی سونے چاندی کے ورق چڑھے ہیں۔ پستے بادام کھوپرے کی پھول پتیاں کاٹ کر زعفران۔ شہاب میں رنگ کر۔ پھول گل بنا کر گلدستے بنا گلدانوں میں سجا کشتیاں آراستہ کر بھجوائی ہیں۔ سواریوں پہ سواریاں اُتر رہی ہیں۔ ڈومنیوں کا ناچ گانا ہو رہا ہے۔ نقلیں ہو رہی ہیں۔ خُوب چہل پہل اور آہا ہو ہو ہے۔ کوئی بات رنج کی جلابن بیگم کے کانوں میں نہیں پڑنے پاتی کہ کہیں جلاب بگڑ جائیں اور خون جگر کھا جائے رنگ جل کے چتے اور چھائیاں نہ پڑ جائیں گھروں میں بیگمیں اپنا کام کرنا عیب نہ سمجھتیں اور جب کام سے فارغ ہوتیں بنا سنور کرتیں۔ صبح پو پھٹے اُٹھنا۔ ضروریات اور نماز سے فارغ ہوئیں۔ اور حمام کی سوجھی۔ ہر حویلی میں حمام کا ہونا ضروری تھا۔ محلسراؤں میں سنگ مرمر کے پانچ پانچ درجے کے حمام ہوتے جن میں فرش۔ اجارہ۔ حوض۔ ستون اور محرابیں سنگ مرمر کی ہوتیں۔ چھتیں لداؤ کے گنبد کی ہوتیں۔ جس کے بیچوں بیچ روشندان ہوتا۔ اور اس میں روشنی آنے کے لئے

چھوٹے چھوٹے مربع شیشے لگے ہوتے کھڑکیاں ہوتیں جن میں چونے کی زہ بنا کر شیشے بٹھاتے تاکہ حمام خوب روشن رہیں۔ حمام گرم اور سرد دونوں ہوتے۔ ایک درجہ جامہ کن کہلاتا۔ جہاں کپڑے اُتارے جاتے۔ اور ایک درجہ معتدل ہوتا۔ جس میں گرم حمام کے بعد آ بیٹھتیں۔ ساتھ مامائیں۔ مغلانیاں۔ لونڈیاں باندیاں رہتیں۔ اکثر اپنا کام یہیں کرتیں۔ کوئی سیتی پروتی۔ کوئی مہندی لگاتی۔ نگینوں میں مہندی گندھی رکھی ہے۔ مہندی میں رنگ آنے کے لئے۔ کتھا اور پڑیا کی بیٹ ملاتے۔ اور اگر سیاہی مائل سرخ رنگ پسند ہے تو اس میں ذرا سا نیلا تھوتھا ملا دیتیں۔ دلہنوں کے حمامی مہندی لگائی جاتی۔ کوئی چھلا چور مہندی لگاتی۔ کوئی ہتھیلیوں پر مچھلیاں بناتی۔ کوئی چاند کوئی سورج کوئی ٹکیا بناتی۔ بعض قندقی مہندی لگاتیں۔ کوئی جالی کی مہندی لگاتی۔ مہندی لگانے کے بعد ارنڈ کے پتے ہاتھوں میں لپیٹ کر حنا بند جو سرخ قند یا سُرخ غلتے کے ہوتے اور جن میں سبز مغزی لگی اور گوٹا لگا ہوتا۔ باندھ دیئے جاتے۔ پاؤں میں بھی مہندی ہاتھوں ہی کی وضع کی لگائی جاتی۔ اکثر رات کو لگا کر سوتیں۔ اور صبح حنا بند کھول۔ ارنڈ کے پتے الگ کر۔ مہندی چھڑا چنبیلی کا تیل مل تھوڑی دیر میں ہاتھ پاؤں دُھو لیتیں اور مہندی ایسی رچتی جیسے سرخ سُرخ باقر خانیاں یا بیر بہٹیاں۔ ناشتہ بھی یہیں کر لیا جاتا۔ پانچ چھ گھنٹے حماموں میں گزرتے۔ دن جب گرم ہو جاتا تو ان حماموں میں سے نکلا جاتا۔ حمامی عورتیں نہلاتی دھلاتیں اور مشت مال کرتیں۔ اِن حماموں میں اگر کی بتیاں خوشبو کے لئے روشن کیجاتیں اور رکوڑیا لوبان کی دُھونی دی جاتی۔ گرمیوں میں سرد حماموں میں نہاتیں۔ گھر کی نہروں اور حوضوں میں تیرتیں چھینٹے کھیلتیں۔ گھنٹوں پھواروں کے نیچے بیٹھی رہتیں۔ گرمی کی چاندنی راتوں میں کھانے سے پہلے نہایا جاتا۔ ان نہانوں میں نری عورتیں ہی ہوتیں۔ مرد کے نام چوہے کا بچہ نہ ہوتا۔ جو پانی سے ڈرتی اُس کو زبردستی گھسیٹ کر پانی میں ڈالتیں۔ اور ڈوبنے نہ دیتیں اُس کی کفن پھاڑ چیخیں اور دوسریوں کی ہنسیاں اُن قہقہہ دیوار کی محلسراؤں میں ایک اُودھم مچا دیتیں۔ سر آنولوں۔ بیری کے پتوں اور ماش کی دال سے دھویا جاتا۔ تاکہ بال ہمیشہ کالے رہیں اور بڑھیں۔ نرم ہوں اور ان میں حلقے پیدا ہوں۔ جاڑوں میں جلد کو نرم رکھنے کے لئے فتنہ ملتے اور پھٹے ہوئے حصوں پر موم روغن لگایا جاتا۔ جلد کا روکھا پن عیب میں داخل تھا۔ چکنے چپڑے چہرے پسند کئے جاتے۔ اِس لئے باہر والیاں چہروں پر ہلکا ہلکا تیل مل لیا کرتیں۔ سیر تفریح نہ ہو تو بیگمیں رات دن حویلیوں میں رہتیں۔ اِس چار دیواری کی دنیا میں اُن کے لئے تمام دلچسپی کے اسباب جمع رہتے۔ صبح کی نماز و وظیفے کے بعد۔ پیش خدمت نے فوراً زیر انداز مسند کے سامنے لا بچھایا۔ زیر انداز

کھاروے۔ بانات اور مخمل کے ہوتے اور عام طور پر عنابی رنگ کے ہوتے۔ سادے اور حاشیہ دار حاشیہ بانکڑی کا بیمک کا ہوتا۔ یا کلابتونی یا کارچوبی ہوتا آفتابچین نے سلچی استادہ اور مقابے والی نے مقابہ سامنے رکھا جھک کر مجرا عرض کیا اور اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گئی۔ مقابے میں بیسن دانی۔ کھلی دانی۔ سنجن کی ڈبیہ۔ جیبی۔ پیلو کی مسواک۔ صندل کی ٹکیاں اور بٹنے کی ڈبیا ہوتی۔ آفتابچیں۔ آفتابے ٹھنڈے گرم پانی کے لئے کھڑی ہیں۔ رومال خانے والیوں نے زانو پوش زانوؤں پر ڈال دیا۔ زانو پوش۔ بانات۔ اطلس۔ مخمل اور گلبدن کے ہوتے۔ روپاک سے چہرہ پوچھا۔ دستمال سے ہاتھ۔ پاپاک سے پاؤں پوچھے اور یہ سامان بڑھا دیا گیا۔ سنگاردان سامنے آیا۔ سنگاردان میں آئینہ۔ گیسو دانی۔ شانہ پیچ میں کنگھی۔ حنا بند۔ ایک چھوٹی سی تلے دانی میں سوئی تاگا۔ اور مباف جن کے کناروں پر دھنک کی بنی کلیاں اور کرن یا تقل کے پھول ٹکے رہتے۔ سرمہ دانی۔ سلائی۔ کجلوٹی۔ تیل گیری۔ تیل کی کپی۔ تیل کی کٹوری۔ مسی کی ڈبیہ۔ انشان کی ڈبیہ۔ قینچی۔ ایک ڈبیہ میں کاشنکاری (کاشغری) سفیدے کی پوٹلی بندھی رکھی۔ ایک ڈبیا سچے سیپ کے سفوف کی ایک کٹوری میں شہاب۔ ایک ڈبیہ میں کارچوبی نزلے بند۔ ایک ڈبیا میں کالی کاشانی مخمل کے خال۔ ایک کٹوری میں گوند کا پانی۔ لکھوٹی میں لاکھا۔ ایک گنگا جمنی ٹلکی میں سرمے۔ کاجل۔ شہاب۔ مسی۔ زعفران لگانے کی سلائیاں۔ ایک سلائی ذرا موٹی سی بھی ہوتی۔ جس پر لٹیں لپیٹ کر۔ بال گھونگروالے بنائے جاتے۔ مشاطہ نے عمر اقبال اور سہاگ کی دعائیں دیں۔ ست پوتی۔ کوکھ اچھوتی۔ دودھوں نہائیں۔ پوتوں پھلیں۔ کوکھ مانگ بھری پُری رہے۔ اللہ اللہ کر کے اب بناؤ شروع ہوا۔

مشاطہ نے پہلے صندل کا چھاپہ گلے اور مانگ پر ہلکا سا دیا۔ پیچھے گھٹنوں پر بیٹھ کر بیگم صاحب کے تیل گیری پیٹھ پہ ڈال کپی میں سے تیل کی کٹوری میں تیل نکال بالوں میں تیل لگایا۔ شانہ پیچ سے کنگھی نکالی موٹے دندانوں سے بال سلجھائے۔ باریک دندانوں سے سونتے۔ مانگ نکالی۔ چاند بیریوں کا یا محمد شاہی پٹیوں کا سر گوندھا۔ کنواری لڑکیوں کے سیپ کے سر گوندھے جاتے تاکہ مانگ پھٹ کر چوڑی نہ ہو جائے اور کوڑے کے مباف ڈالے جاتے کہ بالوں کی نوکیں پھٹیں نہیں محفوظ رہیں اور بال بڑھیں۔ بچاری لڑکیاں بیچ میں یاد آگئیں ہاں بیگم صاحب کا بناؤ سنئے۔ کھجوری چوٹی گوندھ مباف دانی میں سے جوڑے کے رنگ پر کھلنے والے رنگ کا مباف نکال۔ ڈالا۔ مانگ بھری۔ افشان چنی۔ بیگم صاحب نے سیپ کے سفوف کی پوٹلی سے منہ پر سفوف مل کر باریک ململ سے برابر کیا۔

پھر روئی سے شہاب لیکر رخساروں پر غازہ لگایا۔ پپوٹوں پر اور حدقہ چشم پر ہلکا ہلکا ایم زعفران اور رسوت کا لیپ کر کے آنکھوں میں حلقے بنائے۔ دنبالے دار سرمہ لگایا۔ شہاب سے دو خط دنبالے سے زاویہ بناتے ہوئے اُوپر نیچے کھینچے کہ آنکھ مچھلی بن گئی۔ کاجل سے بھویں بنائیں کن پٹیوں پر گوند لگا جڑاؤ یا کارچوبی نرے بند چپکائے۔ بانچھ پر بالائی لب سے ہٹا ہوا مخملی تل لگایا۔ کتھا چونا ملا لاکھا بنایا اور سلائی سے ہونٹوں پر باریک خط لاکھے کا کھینچا۔ اس پر مسی کی تحریر سلائی سے دی۔ جامدار خانے والی نے جوڑیا کے دست بغچے حاضر کئے۔ موسم اور رُت کے اِعتبار سے کھلتا ہوا رنگ پسند کیا۔ پیش خدمتوں نے اوُٹ کھڑی کی۔ پوشاک بدلی۔ مشاطہ نے مدد دی۔ مشاطہ کا کام مغلانیاں ہی میرے زمانے میں کرنے لگی تھیں۔ چاندی کی ہشت پہل انگیٹھی میں سونے کی سلائی گرم کی اور اس پر لٹوں کو لپیٹ حلقے بنا چھوڑ دیئے۔ زلفیں بنائیں۔ کالا دانہ اُتار آگ میں ڈالا کہ دیکھنے والیوں کی نظر نہ لگے۔ اور بناؤ میں کھنڈت ہو۔ چٹ چٹ سر سے پیر تک کی بلائیں لے خدمت کی سرفرازی کا آداب بجالا۔ اُلٹے قدموں دُعائیں دیتی رخصت ہوئی۔ اَب جواہر خانے والیوں نے زیور کے خوانچے اور کشتیاں پیش کیں۔ سُگھڑ گھڑتیوں کے گھڑے اور چتر جڑتیوں کے جڑے گہنے جن پر ہوشیار میناگروں نے باغ و بہار۔ ہزار گلے اور گلُ اندر گل کے مینے کئے اور کندن گروں نے کندن کئے۔ یا سادہ کاروں نے متناسب کوٹھیاں بنا اور حساب سے باٹنی ڈال۔ زیہہ بٹھا۔ آواز دار زیور بنائے۔ اور نگ ایسی خوبصورتی سے برابر بٹھائے کہ ایک ڈال جوہر ہونے کا دھوکا ہوا۔ جڑائی میں وہ صفائی کہ چینی غلتہ پھیرو تو کیا مجال جو ذرا ریشم سے اُلجھ جائے زیہہ ایسی کہ کندن گردن کے کندن کو پرے بٹھائے۔ جس رنگ کا جوڑا پہنا ہے تو زیور اسی رنگ کا پہنا جاتا۔ اگر لباس دو رنگ کا ہے تو زیور کے نگینے بھی دو رنگ کے ہوتے میں نے اپنے بچپنے میں شہر آبادی کے زمانے کا ایک جوڑا دیکھا یہ ریشمی تھا اور بارہ مختلف چہچہاتے شوخ رنگوں کی انگل انگل چوڑی پٹریاں پڑی تھیں۔ اور ہر پٹڑی میں چھوٹی چھوٹی بوٹیاں تھیں تہ پوشی کا ریشم بہت دبیز روئی کا روئی اور نرم۔ اور محرم کرتی کا ریشم باریک بافت کا نرم معلوم نہیں کس شہر کا تھا چادرا رامپور کا بنا ہوا کھیس تھا بیحد نرم اور دبیز۔ اس کے ساتھ کے تمام زیور میں بارہ بارہ رنگ کے مختلف نگ جڑے تھے۔ جو جوڑے کے رنگ سے ملتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ کی ایک شال تھی جامہ وار کی جس کی میں نے کٹوا کر شیروانی سلوائی۔ نگوں کے رنگوں میں بھی موسم کا خیال کیا جاتا۔ مختلف خاندانوں میں مختلف

جواہر بھاگوان اور منحوس سمجھے جاتے۔ سعد اور نحس کا بڑا وہم کیا جاتا۔ بعض نگ بعض کو سازگار ہوتے اور دوسروں کو ناساز۔ نیلم منحوس سمجھا جاتا۔ لہسنیہ بعض کو سازگار اور بعض کو ناساز ہوتا۔ نیا نگ پہلے سوتے وقت تکیئے کے نیچے رکھ کر سوتے اور دو چار دن تک اُس کے اثرات کا خیال رکھتے اور ان دنوں میں جو کچھ ہونی ہوتی وہ نگ کے اثر سے تعبیر کی جاتی۔ اور اہلِ خاندان اور متوسلین کو اس کے سَعد و نحس خواص کا عقیدہ ہو جاتا۔ عقیق یں جگری بھاگوان سمجھا جاتا۔ ہیرے سے دھڑکن دور ہوتی۔ شُودَر وَرن یعنی کالا ہیرا منحوس سمجھا جاتا۔ فیروزہ اگر موافق ہے تو دافع بلیات سمجھا جاتا۔ زُمرد سے سانپ اندھے ہوتے۔ دل قوی ہوتا اور دافع نظر بد سمجھا جاتا۔ یاقوت سے جرأت بڑھتی۔ لال سے لالن کی قوت گویائی بڑھتی اور مدعیوں کی زبان لال ہوتی۔ موتی سے دل کی گرمی دور ہوتی اور کالا موتی پیام مرگ سمجھا جاتا۔ پکھراج بسنت رُت میں پہنا جاتا۔ یاقوت جاڑے میں۔ موتی گرمی میں اور زمرد برسات میں۔ ہیرے کا کوئی موسم نہ تھا۔ برہما برن ہیرا بے عیب سفید ہوتا۔ اور بے حد پسند کیا جاتا۔ چھتری برن ہیرا نیلگوں آبی زیادہ پسند نہ کیا جاتا۔ بیش برن ہیرا زردی لئے ہوتا اور یرقان کی بیماری پیدا کرتا اور رنجل پر دال تھا ہیرے کی ترصیع چاندی میں ہوتی اور بجلیاں یا جھپکے کے بالے بہت پسند کئے جاتے۔ چندن ہانس اور گل چیپ بھی اکثر چاندی کے گھاٹ کے ہوتے اور یہ چاندی میں جڑے ہیرے کے زیور چاندنی راتوں یا جشن مہتابی میں پہنے جاتے۔ عوام میں یہ سفید سونے کے زیور سمجھے جاتے۔ سبز سونا بہت نادر سمجھا جاتا اور اس کے نخلنے ترنج ملکہ زمانی کے ہاتھ میں رہتے۔ یہ سنے ہیں دیکھے نہیں۔ البتہ کتابوں میں توتین اور جدولیں سبز سونے کی دیکھیں۔ قدیم پشواز اور سیدھے تنگ پاجامے کا رواج کم ہوگیا تھا۔ شاہ عالم کے زمانے میں ایک نئی قسم کا پاجامہ ایجاد ہوا جو قلغی دار کہلاتا۔ پائینچے میں اوپر کندے ہوتے۔ اور گھٹنے سے نیچے کندے کی نوک سے ایک ایک کلی کی نوک ملا کر پائینچہ سی لیا جاتا۔ جو کولھے سے گھٹنے تک تو پھنسا رہتا اور گھٹنے کے نیچے سے ٹخنوں تک بتدریج ڈھیلا ہو جاتا۔ موریوں پر پٹھا چڑھا ہوتا۔ یا مغزی لگی رہتی۔ اکثر سنجاف بھی لگاتیں۔ یہ پنجامہ پہن کر بیگمیں یا موز مرغیاں یا کبوتریاں معلوم ہوتیں۔ اندر محرم۔ محرم کے اوپر پشواز۔ سر پہ تین گز کا روپٹہ۔ اُنیسویں صدی سے کچھ پہلے پہلے پشواز بالکل چھٹ گئی۔ اور وہ صرف تیلنوں اور گھوسنوں میں رہ گئی۔ البتہ باہر والی دلہنوں کو چوتھی کے جوڑے میں پشواز چڑھتی اور وہ باہر والوں میں تلک کہلاتی۔ شہر میں پشواز کی جگہ اڈی کی کرتی نے لے لی۔ جو بابر لیٹ۔

روڈ جالی اور لاہی یا کسی اور باریک کپڑے کی سلی ہوتی۔ جس کپڑے کی کرتی ہوتی اسی کپڑے کی محرم ہوتی۔ اڈی کی
کرتی پیچھے گدّی کے نیچے سے پانچ انگل چوڑی ہوتی ہوئی پسلیوں سے لپٹی ہوئی سینے سے دو انگل اوپر تک
رہتی اور سامنے کوڑی سے ناف تک آتی۔ اور پینڈے پر چپت رہتی۔ دو بند کھووں پر سے ہوتے سامنے
کی پاکھیوں میں سلے ہوتے اور سامنے کی دونوں پاکھیوں میں سیدھے ہاتھ کی طرف بوتام اور بائیں ہاتھ کی طرف
کلج ہوتے۔ جو پہن کر لگا لئے جاتے۔ محرم۔ کنٹھی پٹھے کی ہوتی جس کی وجہ سے دگدگی کے نیچے تک کا حصّہ کھلا رہتا۔
چڑیا میں دونوں طرف چار چار ٹکیوں کی کٹوریاں جو مونڈھوں سے سامنے کی طرف سلی ہوتیں۔ اور پیچھے مونڈھوں
میں پچھوے جڑے ہوتے۔ ملکٹ کی دو ٹکیاں چڑیا سے جڑی ہوتیں اور دو ٹکیاں اگاڑیوں سے سلی ہوتیں۔
اور یہ اگاڑیاں بغلوں سے مونڈھوں اور پچھووں سے ملی ہوتیں۔ سی دی جاتیں۔ پچھووں میں اوپر نیچے
بیچ کلیوں میں دو دو بند ٹکے ہوتے جو پیٹھ پر کس کر باندھ دیئے جاتے اور پشت پر ان کی بندش سے ایک
لوزات سی بن جاتی۔ مونڈھوں میں چست آستینیں لگی ہوتیں جو کبھی کلائی تک آتیں اور کبھی آدھے بازوؤں
تک رہتیں۔ محرم اور کرتی بالکل اوپر کے جسم کے حصے کی ساخت کی ہوتیں اور جسم سے چپکی رہتیں۔ روپٹے
محرم کرتی اور پاجاموں کی سلائی پر بڑی بڑی ہنرمند مغلانیاں دیدہ ریزی کر کے وہ وہ نئے نئے کام دہنک
بہنک۔ گوکھرو۔ مقیشی گوکھرو۔ کلابتوں۔ سلمے۔ ستارے۔ ٹکورے۔ گجائی۔ کٹوریوں۔ حباب۔ کرن۔ تھل۔
پٹھے۔ بانکڑی۔ چمپا۔ ننھی جان اور ریشم کے کرتیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے اور ان ٹکنوں ہی کی وجہ
سے اور ان ٹکنوں کے کام کی بدولت ہزار بیگمیں کسی ایک محفل میں ہیں تو ان سب کے لباس الگ الگ
معلوم ہونگے اور ایک کا دوسری سے نہ ملیگا۔ حالانکہ وہی چار پارچے۔ روپٹہ۔ محرم کرتی اور پاجامہ ہوتے لیکن
کیا مجال کہ ایک بیگم کی وضع کسی دوسری سے تول جائے۔ اِس لئے مغلانیاں سیتے وقت بڑی احتیاط کرتیں
کہ کہیں ایسا نہو کہ اپنی بیگم صاحب سے پہلے یہ ٹکن عام ہو جائے۔ جاڑوں میں چھیل چھبیلی بیگمیں تو باریک حباب
سے روپٹے اوڑھتیں۔ لیکن شال۔ دوشالے۔ کھیس چادرے۔ دولائیاں اور چھنکلی۔ ادھ پٹی۔ پوسیری
روئی کی رضائیاں اوڑھی جاتیں۔ صدریاں۔ کریاں اور نیمہ آستین بھی پہنی جاتیں۔ انگرکھے یا چپکنیں پہننا
شہدیانی وضع سمجھی جاتی لیکن اکثر بائیکیاں پہنتیں دولائیاں رضائیاں چادرے پاجامے عنف کپڑوں کے
ہوتے۔ روپٹے۔ پشوازیں۔ محرم کرتیاں باریک کپڑوں کی ہوتیں۔ کبھی کبھی رنگین میان تہ دیگر دولائیوں اور
رضائیوں میں باریک ابرے لگاتے۔ پاجامے۔ کمخواب۔ مشجر۔ زربفت۔ نیم زری۔ پوتھ۔ دریائی۔ نسر

کنا و سبز۔ اطلس۔ غلتہ۔ چوڑیا۔ رادھانگری۔ بانک کٹار۔ مشروع۔ گلبدن۔ مخمل۔ نین سکھ۔ تن سکھ۔ کمرک۔ گورنٹ
پرشا۔ ساٹن۔ ساٹن کلاٹ۔ شہدی۔ ریشمی سوسی۔ اٹیلین۔ نرما۔ الچہ۔ (الاَچۂ)۔ خاصہ۔ چھینٹ۔ قلم کاری۔
مومی چھینٹ۔ سمنی۔ گمٹی۔ چھال ٹین۔ بانات۔ کشمیرا۔ موٹرا۔ دھوپ چھاؤں۔ پھلالین۔ ان میں کمپنی بہادر
کی بدولت کمرک۔ گورنٹ آئے اور انگریزی حکومت میں پرشا۔ ساٹن۔ ساٹن کلاٹ۔ اٹیلیں۔ لٹھا۔ نرما۔
پھلالین۔ آئے۔ بیگمیں ان میں سے بعض کپڑے اپنی باندیوں کے لئے خریدتیں۔ باریک کپڑے ململ۔
تن زیب۔ آب رواں۔ ہواؤ دریا۔ چینی گھانس۔ لاہی۔ محمودی۔ تار ترنگا۔ جھونا۔ چوتاری۔ سربفاف۔ گنگاجل
اساوری۔ پنجتولیہ۔ پھوار۔ رین بسی۔ پشتولیہ۔ سیلہ۔ بنارسی۔ جامدانی۔ ڈھاکہ پاٹن۔ گلشن۔ ڈورجالی۔
بابرلیٹ۔ کتان۔ رفل چکن۔ رینگ۔ کریپ۔ جامدانی ٹانڈے اور سیکاکول کی۔ ململ چندیری اور ڈھاکے
کی پسند کی جاتی۔ قلعے میں جوڑے ایک رنگ کے ہوتے۔ اور دو رنگ کم پہنے جاتے۔ روپٹہ۔ محرم کرتی ایک
ہی رنگ کے ہوتے اور تہ پوشی دوسرے رنگ کی۔ کبھی تین رنگ کے جوڑے ہوتے۔ روپٹے کا الگ رنگ
محرم کرتی ایک رنگ کی۔ تہ پوشی اور رنگ کی۔ لیکن تین رنگ کے جوڑے پہننا بہت مشکل تھا۔ اِس میں بہت سلیقہ
اور خوش مذاقی درکار تھی۔ تین رنگ اِس طرح ملائے جائیں کہ وہ آنکھوں کو بھائیں۔ مثلاً اودی تہ پوشی سبز محرم کرتی
اور نارنجی روپٹہ ہوتا۔ اگر ان تین رنگوں میں سے ایک رنگ نکال کر کوئی اور رنگ شامل کر دیا جاتا۔ تو اُس پر
پھبتیاں ہوتیں۔ تین ترنگا دیوالی کا ہیجڑا۔ ترنگی تلی یا دیوالی کی کلھیا۔ یہی حال دو رنگوں کا تھا کہ اُن کا ملانا بھی سہل
نہ تھا۔ کاسنی اور شربتی۔ فیروزی اور بادامی۔ انگوری اور پیازی۔ کافوری اور سونی۔ شنگرفی اور پستئی۔ تربوزیہ
اور کاہی۔ شفقی اور تاؤسی۔ سردئی اور زنگاری۔ گل ناری اور سبز۔ بسنتی اور آسمانی۔ زعفرانی اور بیگنی۔
ماشی اور جوزی۔ دہانی اور فالسائی۔ آتشی اور زبرجدی۔ ارغوانی اور زمردی۔ سرخ اور سبز لیکن اس پر کبھی کبھی
مرچوں کے کھیت اور کچے پکے بیروں کی پھبتی ہو جاتی۔ البتہ نیلا اور سرخ ملا کر کوئی نہ پہنتا اگر کوئی باہر والی پہنے
دکھائی دیتی تو کلیجی پھیپھڑے کی پھبتی کسی جاتی زرد اور سیاہ کا بھی میل نہ ملاتے۔ کیونکہ کڑاہی پہ کوئیلا کون سنتا۔
عباسی۔ ناسپاتی۔ اگرئی۔ صندلی۔ ملاگیری۔ شتری کشمشی۔ دودھیا کاسنی۔ چنپئی۔ سیپی۔ کوکناری۔ سرمئی۔ طوطیائی
گندکی۔ کپاسی۔ سنہری۔ روپہلی۔ جوگیا۔ کشنیزی۔ مٹیالا۔ سیندوری۔ گیروا۔ خاکستری۔ بھورا۔ لاکھی۔ تیلیا۔
لاجوردی۔ کرنجوی۔ گڑملی۔ شہابی۔ گیندئی۔ نافرمانی۔ نیلوفری۔ کستوری۔ گلابی۔ مستی۔ زہریلا۔ آبی سفید
سوتیائی غرض کہاں تک رنگوں کے نام لوں۔ رنگوں کی ایک دنیا تھی پھر ان میں ہلکے گہرے۔ شوخ چہچہاتے

سُسن۔سوتے۔ مدھم رنگوں نے مل کروہ رنگ برنگی پیدا کردی تھی کہ رہے نام رنگیلی کا صوفی اور شاعروں کی دنیا دو رنگی تھی اور بیگموں کی دنیا لکھ رنگی۔ لیکن اَب تو بے رنگی کا دور دورہ ہے اس کو کوئی کیا کرے۔ تلنگی دار پیجاموں کے بعد فرشی تہ پوشیوں کا رواج ہوا۔ جن میں بیس بیس کلیاں ہوتیں۔ یہ کلیاں پائینچوں میں چور کلی کے بعد ایک دوسرے میں سی دی جاتیں۔ جن کی نوکیں اُوپر چور کلی کے پاس رہتیں اور سرے نیچے کی طرف۔ اِس طرح دونوں پائینچے نیچے کی طرف بہت چوڑے ہو جاتے اور کولھوں پر سمٹے رہتے۔ اِن پائینچوں کو پیچھے چھوڑ دیا جاتا تو بڑے ہونے بڑے بھلے معلوم ہوتے جیسے مور کی دُم۔ اِن پائینچوں پر پانچ پانچ منزل کی اور سات سات منزل کی گوٹیں چڑھائی جاتیں لیکن یہ گوٹیں سات اُنگل سے بڑھنے نہ پاتیں۔ کیونکہ دِلّی میں ایک بالشت سے زیادہ گوٹ گنوارو سمجھی جاتی۔ اور گوٹوں کے چوڑے اور پتلے ہونے سے بیگمات میں تمیز ہو جاتی کہ کِس طبقے کی ہیں پانچ اُنگل سے کم گوٹ ہندنیوں کی سمجھی جاتی اور بالشتی گوٹ ثقہ اور وضعدار۔ تہ پوشیوں کے پائینچوں کو پیچھے چار چار چھوکریاں سنبھالتی ہوئی چلتیں۔ اِن فرشی تہ پوشیوں کا اَبتک رواج ہے۔ اور کم سے کم چوتھی کے جوڑے میں دوپٹہ تین گز کا۔ محرم۔ اڈّی کی کرتی اور ڈھیلے پائینچوں کے پاجامے ابتک دیئے جاتے ہیں۔ اور شادی کی دلہنیں اسی وضع کا لباس پہن کر بیاہنے چڑھتی ہیں۔ تہ پوشی کا پہننا کمال تھا اور پائینچوں کا سنبھالنا اور نیفے میں اُڑسنا یا کلائی پر ڈال یا پیچھے چھوڑ کر چلنا وہ اَدائیں دکھاتا تھا کہ اُس کو تلوار باندھنے والے ہندوستان کے مردوں سے پوچھیئے۔ نیفے لال قند۔ کالے پرمٹے اور کالی یا لال گورنٹ کے لگائے جاتے۔ جوانیں۔ اور سہاگنیں لال قند کے نیفے لگاتیں اور بیگماتی لغت میں لال نیفہ یا لال نیفے والی سے مراد عورت ہوتی اور کہتیں "اے اِس موئے زرغل مَردوے کو صورت کا کیا شعور نفانفتے کو لال نیفہ چاہیئے۔"

شہر بربادی میں ردپٹہ محرم کرتی اور تنگ (موری کے) پاجامے بھی پہنے جانے لگے تھے۔ یہ تنگ پاجامے سیدھے اور چست ہوتے اوپر پائینچوں میں کندے لگائے جاتے اور چور کلی سے دونوں پائینچے جوڑ دئے جاتے اور مُوریاں یا تو اُڑھیادی جاتیں یا پتلی مغزی لگاتے۔ اور اُس اُڑھیادن یا مغزی سے اُوپر بانکڑی یا پمیک ٹانکی جاتی۔ نیفے کے منہ کے نیچے چور کلی کی نوک رہتی اور عام طور پر چور کلی کی لمبان سوا بالشت رہتی جو ٹکنے کے بعد ایک بالشت کی رَہجاتی۔ موریاں گاؤ دم ہوتیں اور پنڈلیوں پر پھنسی رہتیں اور اکثر بیگمیں مُوریاں کھول کر پہنتیں اور پہننے کے بعد اُن کو اُلٹ کر سی لیتیں تاکہ پنڈلیوں پر ایسی پیوست ہو جائیں کہ چٹکی لی جائے تو گوشت نہ آئے۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں آڑے پاجاموں کا رواج ہوا۔

جو یا تو ڈھیلے کی تراش کے ہوتے یا سموسے کی تراش کے۔ یہ قدرے گھٹنوں سے اُوپر کولھوں تک ذرا ڈھیلے
رہتے اور پنڈلیوں پر خوب چُست۔ ٹخنوں پر تھوڑی سی چوڑیاں رہتیں۔ اِن پر گھٹنوں سے نیچے کرتے
پہنے جاتے۔ اور گریبان کاج پٹی کے ہوتے اور گلے ناخونی۔ گلے۔ گریبان۔ مونڈھوں۔ آستینوں اور
گھیر میں کٹاؤ کا کام کرکے اُن میں تارے کی جگری دیتے۔ جو مہین کرتوں میں سے بیٹھنوں کی طرح جھم جھم
کرتے۔ کرتوں کے نیچے محرم رہتی۔ اور اس میں بھی کٹاؤ کا کام ہوتا اور نین سکھ کی پھول پتیاں کاٹ کر
اور اُس پر تارے جما کر باریک کپڑوں کے نیچے تیپچی کرکے ٹانک دیتے۔ کرتے اور روپٹے ایک ہی قسم
کے باریک کپڑے کے ہوتے اور رنگ بھی ایک ہی ہوتا۔ قلعہ میں کرتے کا نام نہ لیتے اور منحوس سمجھتے۔ اِس کے
لئے تھنکارے کا کنایہ تھا۔ اگر منہ سے کرتے کا لفظ نکل جاتا تو تھو تھو کر دیتے۔ کیونکہ کرتا رنڈسالے میں دیا جاتا۔
لیکن شہر برباد ی میں اُنیسویں سدی کے آخر سے شہر میں کرتوں کا رواج عام ہوگیا۔ سہاگنیں اور رانڈیں سب ہی
پہننے لگیں کہتے ہیں آڑے پاجامے پنجاب سے آئے۔ پہلے پہلے دِلّی کے پنجابی تاجروں کی عورتوں نے
یہ وضع اِختیار کی۔ اِس کے بعد کوٹھے والیوں نے پھر نوجوان نواب زادیوں نے۔ اور لوگوں نے خوب خوب
نام دھرے۔ لیکن پھر یہ وضع عام ہوگئی۔ صرف بڑی بوڑھیاں یا حکیمنیاں سیدھے پاجامے اور اُونچے کرتے
پہنتی رہیں۔ اکثر گھرانوں میں گرمیوں میں بیگمیں نین سکھ کے غرارے دار پائیجامے پہنتیں جن کا پائینچہ عرض
کا ایک ہوتا ہے اور اس کی موریوں پر چکن کی کنگوریدار بیل یا چین ٹکا ہوتا۔ لیکن یہ وضع اچھی نہ سمجھی جاتی۔
کیونکہ مرد غرارے دار پائیجامے جن کو تُمّان (تنبان) کہتے تھے پہنتے۔ مولویوں کے گھرانے کی بیویاں سیدھے
پاجامے جو چست نہ ہوتے پہنتیں اور جہاں وہابیت کا اثر ہوگیا تھا وہ شرعی پیجامے پہنتیں جن کی موریاں
ذرا ڈھیلی رہتیں اور پنڈلیوں پر اِس قدر ڈھیلے ہوتے کہ جسم کی ساخت نظر نہ آئے۔ اُن کے کرتے
اور روپٹے ذرا عفت کپڑے کے ہوتے تاکہ جسم ذرا سا بھی ان میں سے نہ جھلکے۔ بیسویں سدی میں تین کلی
کے پاجاموں کا رواج ہوا۔ مدرسوں میں پڑھنے والی لڑکیوں نے اِس کو زیادہ پسند کیا۔ جس کی وضع ایسی
ہوتی جیسے انگریزنوں کے دو سایوں کو جوڑ دیا گیا ہو۔ اُس پر اُٹنگے کرتے پہنتے اور تین گز کے روپٹے
اوڑھے جاتے بمبئی کی زبیدہ خاتون دلّی میں حکیم اجمل خاں سے علاج کرانے آئیں اور دلّی کی بیگمات سے
ملیں تو اکثر دلی والیوں نے اُن کی وضع اَنوکھی سمجھ کر اس کو اختیار کرلیا۔ ترا ہے کے سفتی والوں میں کی بعض
لڑکیاں بمبئی والوں میں بیاہی گئیں اُنھوں نے بمبئی کے بوروں کی وضع اِختیار کی اور اُن کی ریس اکثر نے

دلی میں کی سہنگے بھی پہنے جاتے لیکن بہت کم۔ یہ لہنگے کی طرح ہوتے۔ ایک ہی پائینچہ ہوتا اور اس میں پانچ پانچ کلیاں پیچھے کی طرف ڈالی جاتیں۔ کلیوں کی نوکیں اُوپر رہتیں اور سرے نیچے۔ سہنگے میں چونکہ دونوں ٹانگیں ایک ہی پائینچے میں رہتیں اِس لئے اندر گھٹنے پہنے جاتے۔ اِس پر کرتا ذرا اٹنگا گھٹنوں سے ایک بالشت اونچا رہتا یا محرم کرتی کے ساتھ پہنتے اور اس کے ساتھ دوپٹہ گاتی مار کر اوڑھا جاتا۔ ساڑیاں دلّی میں ہمیشہ حقیر سمجھی گئیں کیونکہ یا تو گھسیاریاں پہنتی تھیں یا ٹانڈے کی نٹنیاں۔ کبھی کبھی پورب سے جو سونڈھے والیاں آتیں تو وہ گرمیوں میں باریک ساڑیاں باندھتیں۔ ہندنیاں لہنگے پہنا کرتیں۔ ساڑی وہ بھی نہ باندھتیں۔ زیور اَناپ شناپ لادنا عیب تھا۔ زیور کا پہننا آسان نہ تھا اور گہنوں کا سلیقہ سے پہننا بڑی تعریف کی بات سمجھا جاتا۔ سر کے زیور پھول سگے۔ سیس پھول۔ چاند۔ سورج۔ مانگ۔ تعویذ۔ سیس جال اور جڑاؤ چوٹی تھے۔ ماتھے کے زیور جھومر۔ چپکے۔ ٹیکہ۔ سیس پٹی۔ ڈامنی۔ مرزا بے پروا تھے۔ کن پٹیوں کے زیور نزلے بند۔ نظر بند۔ اور سراسریاں تھیں۔ کان اُوپر کے چار چھیدے جاتے اور نیچے کے تین یا چار چھیدے جاتے۔ اِس لئے ہر کان میں سات یا آٹھ چھید ہوتے۔ کن بندھے۔ دھار باندھ کر چھیدا کرتے۔ اور کَن بنّدھائی کی تقریب میں کھوپرا مصری تقسیم ہوتی۔ گانا ہوتا۔ بیویاں بلائی جاتیں اور کھانا کھلایا جاتا۔ اُوپر کے چار چھیدوں میں پتے بالیاں پہنی جاتیں جو طرح طرح کی ہوتیں۔ جڑاؤ۔ سادی۔ مولسری کے پھول کی۔ سوتی چور کی ہوتیں۔ نیچے لو کے چھید میں جھلنیاں۔ جھمکے کرن پھول۔ لڑے۔ چھرٹے۔ چاند چودانیاں۔ مگر چودانیاں۔ مچھلیاں بالے۔ بالے جھالے۔ لٹکن۔ جھپکے کے بالے۔ بندے۔ آویزے۔ انٹیاں۔ مرکیاں۔ مور بھنور جھمکے گمر۔ دُربچے۔ لولک۔ کرن پھول۔ کنشلے۔ کان اور رواج پہنے جاتے۔ نیچے لو کے چھید میں لمبے زیور عام طور پر پہنے جاتے۔ جیسے جھلنیاں۔ لڑے۔ چھرٹے۔ جھپکے کے بالے۔ یا چاند چودانیاں۔ وغیرہ۔ اس سے اوپر کے سوراخ میں پھولوں بھری بالیاں پہنی جاتیں۔ بیچ کتنے باہر والیاں چھداتیں۔ اور اس میں خوشہ یا بالی پہنتیں۔ ناک کے سیدھے نتھنے میں ایک سوراخ کیا جاتا۔ ناک کے زیور کیل۔ اور نتھ تھے پھُلّی۔ لونگ۔ مورنی۔ توتا۔ بیسر۔ بلاق باہر والیوں کے زیور تھے۔ بلاق شہر میں اور قلعہ میں منّت کیلئے کبھی کبھی چھیدا جاتا۔ اور جن کو بلاق پہناتے ان کے نام مرزا بلاقی اور بلاقی بیگم رکھے جاتے۔ لیکن مور۔ توتا۔ اور بیسر ہندوانی گہنے سمجھے جاتے جو گنواریاں اور باہر والیاں پہنتیں۔ گلے میں اُوپر گلوبند یا ٹیپ پہنی جاتی۔ اس کے نیچے جگنی اور چمپا کلی۔ چمپا کلی جوے کی یا بادامی ہوتی۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں

کان کا ایک زیور پتوں سے ملتا چمپا کلی بھی تھا۔ ہنسلی باہر والیوں کا زیور تھا۔ یا میرانجی میں بچوں کے گلے میں منت کی ہنسلیاں پہنائی جاتیں۔ مالا۔ موہن مالا۔ دگدگی۔ ڈھولنا۔ تعویذ۔ ہار۔ چندن ہار۔ چندن ہانس کنٹھی ست لڑا۔ گجرے کا توڑا۔ چھلے۔ توڑے۔ پچ لڑا۔ سہ لڑا۔ دولڑا۔ بدھی۔ ادھی۔ اڈھی بدھی۔ طوق کیری۔ عطردان۔ زنجیر۔ ہنیکل۔ حمائل گلے کے زیور تھے۔ بازوبند۔ نورتن۔ جوشن۔ بجو بند۔ گل جیب۔ تعویذ۔ بل۔ بل ڈونڈ۔ اکے۔ سہ نگے۔ نونگے۔ تعویذ۔ بازو کے زیور تھے۔ کڑے طرح طرح کے ہوتے۔ شیر دہاں۔ مگر دہاں۔ توتے کے سرکے۔ مور کے سرکے۔ مینڈھے کے سرکے۔ ہوتے اور سب کے آگے پہنے جاتے۔ کڑے پیچھے پہننا گنوار پن اور باہر والا پن سمجھا جاتا۔ اور اکثر کمہاریاں پہنا کرتیں۔ چوڑیاں جہانگیریاں۔ جوئی۔ سمرن۔ دست بند۔ تعویذ۔ پلمے۔ پری چھم۔ چھن۔ چوہے دنتیاں۔ کوکردنتیاں۔ کنگن تیتر پنکھیاں۔ گجرے۔ پہنچیاں۔ چوڑا۔ بنگڑیاں پچھلیاں۔ کلائی کے زیور تھے۔ چھن۔ پری چھم۔ بنگڑیاں۔ باہر والیاں پہنتیں۔ پچھیلیاں جو سب زیور کے پیچھے پہنی جاتیں ان کا رواج کم تھا۔ انگلیوں میں انگوٹھی چھلے۔ اور پوریں پہنی جاتیں۔ انگوٹھے میں آرسی ہوتی۔ ہتھ پھول انگلیوں اور پہنچے میں پہن کر پشت دست پر رہتا۔ کمر میں کمربند ہوتا جس کو ازاربند کے دونوں سروں پر دلیا جاتا۔ تاگڑی۔ کمرپٹی۔ زنجیر۔ چھدر کھنکا۔ کٹ میکھلا۔ ہندنیاں پہنتیں۔ خلخال۔ جھانجھن۔ چوڑیاں۔ بل۔ کڑے۔ رم جھول۔ پازیب۔ بانک۔ پایل۔ توڑے۔ گھنگرو۔ لنگر۔ پینجنیاں پاؤں میں پہنتے جاتے۔ لنگر اور پینجنیاں باہر والیوں کے زیور تھے۔ اور گنوار و سمجھے جاتے۔ پاؤں کی انگلیوں میں چٹکی چھلے پہنے جاتے۔ بچھوے۔ انوٹ۔ انوٹ بچھوے۔ باہر والیاں پہنتیں۔ پگ پھول کا رواج بہت کم تھا۔ زیوروں کے نام بہت ہیں۔ اگر اُن کی ساخت۔ اور وضع قطع بیان کی جائے تو ایک چھوٹی سی کتاب ہو جائے۔ بیگموں میں لکھنا پڑھنا۔ خوشنویسی سینا پرونا۔ کاڑھنا۔ کھانا پکانا۔ ہنروں میں داخل تھے۔ قلعہ میں ان ہنروں کے علاوہ۔ گانا۔ ناچنا۔ اور ساز بجانا بھی کمال میں داخل تھے۔ لیکن شہر والیوں میں ناچنے کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ البتہ ڈھول بجانے اور گانے میں مضائقہ نہ تھا۔ قلعہ میں شادی کرتے وقت جب لڑکی کے جہاں اور کمالوں کی کھوج کی جاتی وہاں دریافت کرتے کہ ناچ میں توڑا کیسے لیتی ہے۔ نشانہ لگانا۔ تلوار چلانا۔ تیرنا۔ درختوں پر چڑھنا۔ گھوڑے کی سواری۔ بڑے گھرانوں کی بیگمیں جانتی تھیں۔ اور شہزادیوں کو چوگان کا بھی شوق تھا۔ چوگان میں صرف عورتیں ہی شریک ہوتیں۔ اور قلعہ کے نیچے بیلے میں چوگان کا میدان تھا۔

کھانا دن میں چار دفعہ کھایا جاتا۔ صبح نو بجے تک ناشتہ۔ ایک بجے دوپہر کا کھانا۔ تیسرے پہر چار پانچ بجے ناشتہ اور رات کو دس گیارہ بجے کھانا۔ سارے دن خشک و تر میوہ۔ ترکاریاں یعنی مقامی میوے۔ مٹھائیاں۔ حلوے۔ اور طرح طرح کے چٹخے مٹھے سارے دن کھائے جاتے۔ اور کہا جاتا جبڑا چلے ستر بلا ٹلے۔ صبح میٹھے والی آئی گرما گرم حلوا پوری۔ پھر پھڑ پھڑاتی کچوریاں۔ بیوڑیاں۔ مٹھڑیاں خستہ کچوریاں۔ جلیبیاں۔ قلاقند۔ گلاب جامنیں۔ مال پورے۔ رس گلے۔ سوہن بھوگ۔ لائی۔ پھر ملائی والی آئی۔ صاف ستھری جگمگاتی تھالی میں یہ دل دار روئی کی روٹی ملائی جمی ہے۔ دھلے دھلائے ہرے ہرے پتوں کے دونے بنے ہیں۔ سیر آدھ سیر ملائی تول دی۔ دوپہر ہوئی برف والی آئی۔ کھیرے کی برف۔ خربوزے کی برف۔ رنگترے کی برف۔ شربت کی برف۔ انگور کی برف۔ آم کی برف۔ فالسے کی برف۔ بادام کی برف۔ پستے کی برف۔ کھرچن کی برف۔ ملائی کی برف۔ ربڑی کی برف۔ لسی کی برف کے سوندھے سوندھے مٹی کے آبخورے جمے ہیں۔ یا جست کی قلفیاں ہیں۔ ہنڈالے بیٹھ گئی۔ قلفیاں اور آبخورے کھول کھول کھلانے شروع کئے۔ یہ گئی کا چھن آئی۔ رت کی ساری ترکاریاں ہیں۔ فصل کے میوے ہیں لئے اور کھائے۔ پھر دہی بڑے والی آئی۔ جل جیرے سونٹھ کا پانی۔ بتاشے۔ بوندیاں۔ بڑے۔ سونٹھ کے چھوہارے۔ پھلکیاں۔ پتے۔ سموسے۔ سنگوچیاں۔ لونگ چڑے۔ قلمی بڑے۔ دال سیو۔ پپڑیاں۔ سیویاں۔ تلے ہوئے کابلی چنے آئی دے گئی۔ کہ اتنے میں کچالو والی آئی۔ امرود کے کچالو۔ آلو کے کچالو۔ پنڈالو کے کچالو۔ کچالو کے کچالو۔ کھیرے کے کچالو۔ کیلے کے کچالو۔ املی مٹر کے کچالو۔ انناس کے کچالو۔ آم کے کچالو۔ پھوٹ کے کچالو۔ لوکاٹ کے کچالو۔ سنگاڑے کے کچالو۔ آڑو کے کچالو ککڑی کے کچالو۔ جس ترکاری کی رت ہوئی اس کے کچالو بنائے۔ بارہ مصالحہ ڈالے۔ (کالی مرچ۔ لال مرچ۔ تِتّا مرچ۔ سانبھر نمک لاہوری نمک۔ منہاری نمک۔ کالا نمک۔ سفید زیرہ۔ کالا زیرا) اور کھلائے۔ سی سی کر رہی ہیں۔ چٹوری زبان رکتی نہیں۔ آنکھ۔ ناک منھ سے رطوبت ٹپکے پڑ رہی ہے۔ آلو چھولے والی آئی۔ آلو چھولے طرح طرح کی گھنگنیاں دے گئی۔ حلوائین آئی۔ پستے کی لوز۔ بادام کی لوز۔ کھوپرے کی لوز فالسے کی لوز۔ زعفرانی لوز۔ برفیاں۔ دال موٹ۔ دال بی جی۔ نکتیاں۔ دربہشت۔ امرتیاں۔ انگوردانے موتی چور کے لڈو۔ بیسن کے لڈو۔ مونگ کے لڈو۔ میوے کا قلاقند۔ اندرسے۔ سہال۔ اندرسے کی گولیاں۔ کھجلے۔ جو موسم کی مٹھائی ہوئی دے گئی۔ کوابن آئی تیغ کے کواب۔ مچھلی کے کواب۔ گولی کے کواب

کلیجی کے کواب ۔ بھیجے کے کواب ۔ چڑیا کے کواب ۔ پسندے کے کواب ۔ گولر کے کواب ۔ مُولی کے کواب ۔ خوب چٹنی مصالحہ ڈال دے گئی ۔ گھر میں بیٹھے ہمہ نعمت چلی آتی ہے ۔ مالن پھول ۔ کنٹھے ۔ گجرے دے گئی ۔ اپنا اِنعام لے گئی ۔ منہاری طرح طرح کی چوڑیاں لائی پہنائیں اور اپنا نیگ لیا ۔ دعائیں دیتی رخصت ہوئی ۔ عطر والی طرح طرح کے عطر ۔ مسی ۔ کاجل ۔ سرمہ ۔ اگر ۔ لوبان ۔ صندل ۔ خوشبو ۔ چھیل چھبیلا ۔ ناگرموتھا ۔ بال چھڑ کپور کچری ۔ خوشبودار تیل ۔ خوشبودار کھلیاں ۔ دے گئی اپنی تقدیر کا اِنعام لے گئی ۔ پکّے رنگ کے کپڑے جن میں کچھ اور نیل کا میل ہوتا رنگریزنیں رنگنے لے جاتیں ۔ اجلی کے گھر کپڑے دھلنے جاتے ۔ بیویوں کے کپڑے میل خورے کو دینے بے شرمی سمجھی جاتی ۔ بلکہ شہر آبادی میں رومالیاں کھول کر رکھلی جاتیں ۔ کندے اور پائینچے الگ کرکے کھپ میں دئے جاتے ۔ چھوٹے کپڑے گھر ہی میں چھوچھوئیں دھولیتیں ۔ اِستری کا رواج نہ تھا ۔ کلف کندی کی جاتی کپڑے والی ۔ گوٹے والی ۔ بساطن غرض کسی چیز کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں ۔ دُنیا کی ہر شئے موجود ہوجاتی اور گھر میں مینا بازار لگ جاتا ۔ سودے سلف خرید فروخت سے فرصت ہوئی تو گھر گھر پھرنے والیوں نے سارے شہر کی خبریں سُنادیں ۔ گھر گھر کا حال بتادیا ۔ بھلا اَب اَخبار کے پیچھے کون دیدے پھوڑے ۔ اُن سے فرصت ہوئی رات کو کھانے کے بعد قصہ خواں عورتیں قصہ پڑھ رہی ہیں ۔ داستان گو عورتیں داستان سُنا رہی ہیں ۔ کوئی پہیلیاں بجھوا رہی ہے ۔ کوئی کہ مکرنی ۔ ان مل ۔ ڈھکوسلا سنا رہی ہے ۔ یہ نہ سہی ڈھولکی بجنے لگی ۔ اور لگیں چھوکریاں گانے ناچنے ۔ تھک کر سو رہے ۔ پھر صبح ہوئی اور وہی زندگی ۔ بیویاں گلہریاں پالتیں کبوتر پالتیں ۔ لال ۔ مینا ۔ طوطے پالے جاتے ۔ بلیاں بندر پالے جاتے ۔ اور اکثر بیویاں اپنے شوق کے ناموں سے مشہور ہوجاتیں ۔ جیسے بندر والی بیگم صاحب ۔ گھر کے چمنوں میں جو درخت ہوتے اُس سے بھی مشہور ہوجاتیں جیسے بیری والی بیگم صاحب ۔ کھجور والی بیگم صاحب ۔ املی والی بیگم صاحب ۔ نواب بھولا بیگم ۔ کھٹولے پر بیٹھی رہتی تھیں ۔ اِس لئے کھٹولے والی بیگم صاحب کہلاتی تھیں ۔ نواب دلیدادخاں رئیس مالاگڑھ کی بیگم کی آنکھیں شہر بربادی کے ہنگامے میں جاتی رہی تھیں ۔ اِس کے بعد سے وہ اندھی بیوی کہلاتی تھیں ۔ تو وقت تو ہوا ہو گیا اللہ سب کی زندگیوں کی خیر رکھے اور لڑائی کا منہ جلدی کالا ہو جو دلوں کو چین اور اطمینان نصیب ہو ۔ پھر آپ میری باتیں سُنیں ۔ اللہ بیلی ۔ اللہ نگہبان ۔

(بہ اجازت حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن) ———————— آغا حیدر حسن دہلوی

غزل

نتیجہ فکر عالیجناب نواب تراب یار جنگ بہادر سعید

نہ اضطراب میں لذت نہ کچھ قرار میں ہے
ہمارا دل ہے مگر اُن کے اختیار میں ہے

خود اپنی موت کی اللہ سے دُعا کرتے
جو یہہ نہ جانتے کیا لطف انتظار میں ہے

وہ جسکو کہتے ہیں اک اضطراب کا عالم
ہمارے قلب میں ہے یا نگاہ یار میں ہے

تمہارے وعدۂ فردا کا اعتبار نہیں
خدا کا شکر ہے دل آج اختیار میں ہے

کبھی لحد سے جو اُٹھے غبار یہہ سمجھو
ہماری خاک ہے یہہ جو تلاش یار میں ہے

کئے ہیں تو نے بہت بیقرار دل پامال
کہ اضطراب تری خاک رہگزار میں ہے

خبر نہ ہوگی مجھے آپ دیکھ لیں آکر
وہ کیفیت جو مری چشم انتظار میں ہے

جو زندگی میں مرے سوز دل کا عالم تھا
جھلک اُسی کی چراغ سر مزار میں ہے

ہم ایسے دل پہ بھروسہ کریں تو کیسے کریں
نہ اختیار سے باہر نہ اختیار میں ہے

خزاں کے دور میں کیا کام آہِ دل سے سعید
کہ اس ہوا کا مزا موسم بہار میں ہے

ڈاک کے ٹکٹوں کا ذخیرہ

(۱)

دفتری گھس گھس، کاروباری مصروفیت یا دوسری افکارِ معیشت کے اِنہاک کا ردِ عمل جو قوائے انسانی پر ہوتا ہے اِس کی وجہ سے اعضائے جسمی اور قوائے عقلی پر ایک قسم کی کمزوری مُسلط ہو جاتی ہے۔ اِس کے ازالہ کے لئے اِنسان ایسی تفریح اور ایسی دلچسپی کا خواہاں ہوتا ہے جو دل و دماغ پر کم سے کم بار ڈالے اور زیادہ سے زیادہ تسکین بخش سکے۔ اِن تفریحوں میں بعض وقت طلب عسیر الحصول اور کثیر المصارف ہوتی ہیں جو متوسط الحال طبقہ کے لئے ایک بارِ گراں ثابت ہوتی ہیں۔ بعض آسان سہل الحصول اور کم خرچ ہوتی ہیں جن سے معمولی آمدنی والا شخص بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

تفریحی مشاغل جن سے اِنسان اَوقاتِ فرصت میں دل بہلا سکتا ہے مختلف ہیں۔ اِنسان اِبتداء سے کسی نہ کسی چیز کے جمع کرنے میں دلچسپی لیتا رہا ہے۔ بعض تو قیمتی تصاویر۔ عجائبات۔ قدیم فرنیچر اور قدیم سکّوں کے ذخیرے کرنے میں اپنی دلچسپیوں کو مرکوز کر دیتے ہیں لیکن اُن کی تکمیل ہر شخص کے دسترس سے باہر ہے۔

بعض لوگ ایسی چیزوں کا شوق کرتے ہیں جو نسبتاً کم خرچ اور آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ منجملہ ان سہل الحصول چیزوں کے ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہے۔ قبل اِس کے کہ ہم اس کی متعدد دلچسپیوں اور منافع کے متعلق بحث کریں یہ ضروری ہے کہ ٹکٹ کی اِیجاد اور اُس کی تاریخ پر کچھ روشنی ڈالیں۔

متمدن ممالک جہاں تجارت کی گرم بازاری ہے وہاں سلسلہ مخابرات و رسل و رسائل کی باقاعدگی کی بہت ضرورت ہے۔ تقریباً ایک صدی پہلے نہ کوئی باضابطہ ڈاک خانہ تھا نہ کوئی بااصول نظام قائم تھا

جس کے ذریعہ نامہ و پیام میں سہولت ہو۔ جو طریقہ اِس زمانہ میں انگلستان میں رائج تھا اس میں بہت سی خامیاں تھیں مثلاً ایک شخص کسی کو ایک خط بھیجتا تو کوئی محصول ابتداءً میں نہیں ادا کرتا تھا بلکہ کارکنان ڈاک اِس خط کو منزل مقصود پر پہونچا کر محصول طلب کرتے تھے ایسی صورت میں بہت سے لوگ اِس قسم کے خطوط وصول کرنے سے اِنکار کر دیتے تھے جس کی وجہ سے اخراجات اور بے مصرف کام میں زیادتی اور ڈاک خانہ کی آمدنی میں معتدبہ خسارہ ہوتا تھا۔ اِن تلخ تجربات کی بنا پر انگلستان میں ایک نئی تجویز پیش کی گئی جس میں ایک شخص مسمی رولنڈ ہل پیش پیش تھا۔ اُس نے کہا کہ خطوط پر بجائے مرسل الیہ سے محصول وصول کرنے کے مرسل ہی سے یہ محصول پیشگی وصول کر لیا جائے۔ اور یہ خطوط بغیر کسی مزید محصول کے مرسل الیہ کو پہونچا دیئے جائیں اس صورت میں ڈاک خانہ بے ضرورت مصارف اور کام سے بچ جائیگا اور مرسل الیہ بھی اِنکار کی زحمت سے نجات پا جائیگا۔ چنانچہ اسی کو روبہ عمل لانا قرار پایا۔ اور ایسے خطوط کی شناخت کے لئے جن کا زر محصول ادا کر دیا جاتا تھا ایک لیبل لگانے کی تجویز ہوئی اور ۱۸۴۰ء میں انگلستان میں سب سے پہلے ایسا لیبل بنایا گیا اور یہی سب سے پہلا ٹکٹ ہے۔ یہ طریقہ ایسا مقبول ہوا کہ چند ہی سال کے عرصہ میں کم و بیش دنیا کے ہر متمدن ملک نے اُس کو اختیار کر لیا۔ اور ہر ملک نے اپنے اپنے ٹکٹ علٰحدہ علٰحدہ تیار کئے۔

چونکہ ذرائع رسل و رسائل ابھی ناکافی تھے اس لئے مختلف ممالک کے ٹکٹ مشکل سے فراہم کئے جا سکتے تھے لیکن لوگوں کو اُس کے جمع کرنے کا شوق ہو چلا تھا۔ اور اس زمانہ میں جس کے پاس سو پچاس ٹکٹ جمع ہو جاتے تھے اُس کا شمار بڑے شوقینوں میں ہوا کرتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ڈاک خانہ کا اِنتظام بہتر ہوتا گیا اور اقسام کی سہولتیں پیدا کی گئیں جن کی وجہ سے فراہمی ٹکٹ کی دشواری کم ہوتی گئی اور اسی مناسبت سے شوقینوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ شوق ایسا عالمگیر ہو گیا کہ ایک صدی سے کم عرصہ میں تمام دنیا میں ٹکٹ جمع کرنے والے ہر چیز کے شوقینوں کی مجموعی تعداد سے بدرجہا بڑھ گئے۔ انگلستان میں تو ہر مدرسہ میں کم از کم نود فیصد طالبعلم ٹکٹ جمع کرتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے دوسرے ممالک مثلاً فرانس جرمنی وغیرہ میں بھی ان کی بڑی کثرت ہے۔ ہندوستان میں یہ شوق اتنا عام نہیں ہے۔ ہندوستانیوں کی بدذوقی کا ذمہ دار زیادہ تر اُن کا اِفلاس ہے جو ہر میدان میں اُنہیں نیچا دکھاتا ہے۔

جب بڑے بڑے شہروں میں اُن کی مانگ بڑھ گئی تو اس کی باقاعدہ خرید و فروخت ہونے لگی متعدد دوکانیں ہر بڑے شہر میں کھل گئیں۔ فہرستیں اور اخبارات و رسائل شائع ہونے لگے۔ بیسیوں انجمنیں

قائم ہوئیں جہاں شوقین اَوقاتِ فرصت میں جمع ہوکر تبادلۂ خیالات، اپنے اپنے نایاب ٹکٹوں کی نمائش اور مکررات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ بڑے بڑے ذخیرے فروخت کرنے کے لئے ہراج خانہ کُھل گئے ہر سال کسی نہ کسی بڑے شہر میں نمائش مقرر کی جاتی ہے۔ جہاں دُنیا بھر کے شوقین اور تاجر جمع ہوتے ہیں۔ اور لاکھوں کا بیوپار ہوتا ہے۔ اس نمائش کی یادگار میں خاص خاص ٹکٹ شائع ہوتے ہیں اور اِس طرح ذخیروں میں اُن کی یاد تازہ رہتی ہے۔

لندن میں بعض ایسے کوچے ہیں جہاں ہر دوسری دوکان ٹکٹ فروش کی ہے۔ یہ شہر مختلف ممالک کے ٹکٹوں کا معدن ہے اور اُس کو اتنی مرکزیت حاصل ہے کہ جو ٹکٹ تلاش سے دنیا کے کسی گوشہ میں نہیں مل سکتے وہ آسانی سے یہاں مِل جاتے ہیں اُن کی تجارت اَب اس اعلیٰ پیمانہ پر ہونے لگی ہے کہ معاشی کساد بازاری عالمگیر جنگ یا اور رکاوٹ اُس کی ترقی یا مقبولیت کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی۔ برخلاف اِس کے اعداد و شمار یہ ثابت کرتے ہیں کہ زمانہ جنگ میں اس کی تجارت کو فروغ ہوتا رہا ہے۔

تاجروں کا اِس پر کروڑوں روپیہ لگا ہوا ہے اور بعض بعض قدیم و نایاب ٹکٹوں کی قیمتیں اسقدر بڑھی چڑھی ہوتی ہیں کہ غیر شوقین بمشکل اُن پر یقین کرسکتا ہے۔ تاجروں کے علاوہ بعض شوقینوں کے ذخیرے ایسے قیمتی اور نایاب ہیں کہ اُن کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستان میں صرف ایک قابل ذکر کلب قائم ہے جس کی شرکت ہندوستانیوں کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اِس میں ۷۵ فیصدی بلکہ اُس سے زائد غیر ہندوستانی اراکین ہیں۔ یہ انجمن بھی اُن یُوروپین حضرات نے قائم کی ہے جو اپنے ذخیرہ میں نئے نئے ٹکٹ اِضافہ کرنا چاہتے ہیں ہندوستانی حضرات کو اِتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اِس قسم کی انجمن قائم کریں۔ اُن میں اِس قسم کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اِحساس فرومائگی اُنہیں یہاں بھی سر اُٹھانے نہیں دیتا۔

لندن میں ماہ مئی ۱۹۴۰ء میں ایک بڑے وسیع اور شاندار پیمانہ پر سب سے پہلے ٹکٹ کی یکصد سالہ جوبلی منائی جانے والی تھی جس کی تیاری بھی شروع کردی گئی تھی مگر جنگ کی وجہ سے اِس خیال کو سر دست ملتوی کردینا پڑا۔

---

(۲)

اَب ہم مبتدیوں کے لئے چند مُفید ہدایات درج کرتے ہیں۔

ٹکٹ جمع کرنے کی ابتداء عام طور پر مختلف قسم کے ٹکٹوں کو اکٹھا کرلینے سے ہونی چاہیئے یعنی جو بھی ٹکٹ حاصل ہوجائیں اُن کو محفوظ کرلیں کیونکہ اس طرح سے ٹکٹوں کے متعلق معلومات بڑھتے جاتے ہیں اور اس تفریحی شغلہ سے ایک قسم کی دلبستگی سی ہوجاتی ہے جس کے بعد رفتہ رفتہ اِس فن میں مہارت حاصل ہوجاتی ہے۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ کون کون سے ٹکٹوں کو جمع کرنا چاہیئے اور کن کن ٹکٹوں کے حصول کی کوشش کی جانی چاہیئے۔

بڑے سے بڑا شوقین بھی ایک نہ ایک وقت یہ محسوس کریگا کہ ایک مکمل ذخیرہ کا مالک ہونا نہایت دُشوار بلکہ ناممکن امر ہے اور اس دشواری کے تحت بہت ممکن ہے کہ وہ اپنے ذخیرہ کو بعض خود عائد کردہ حدود سے محدود کردے مثلاً ایک شوقین چاہے تو صرف برطانوی مقبوضات کے ٹکٹ جمع کرسکتا ہے اگر یہ بھی زیادہ معلوم ہوں تو صرف برطانیہ کے ٹکٹ فراہم کرسکتا ہے۔ بعض لوگ ایک ہی کمپنی کے مطبوعہ ٹکٹ جمع کرتے ہیں۔ بعض خاص خاص مواقع کے یادگاری ٹکٹ اکٹھا کرتے ہیں اور بعض صرف ہوائی ڈاک کے ٹکٹ۔ علیٰ ہذالقیاس مختلف قسم کے عنوانات کے تحت اِس شوق کو محدود کیا جاسکتا ہے۔

ایک مبتدی کے لئے اَب بہت ساری سہولتیں ہم پہونچادی گئی ہیں وہ باسانی ہزار دل ٹکٹ وقتِ واحد میں خرید کر اس شوق کی ابتداء کرسکتا ہے۔ اُن کو ترتیب دے لینے کے بعد مختلف سٹوں کی تکمیل کی کوشش کرسکتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے ذخیرہ میں اِضافہ کرسکتا ہے۔ ٹکٹ فروشوں کے سواء اکثر اَوقات ٹکٹ مہاجنوں سے بھی حاصل کرلئے جاتے ہیں اور قدیم کاغذات۔ دستاویزات اور خطوط سے بھی بہت سارے اچھے اور نایاب ٹکٹ حاصل ہوسکتے ہیں۔ ہندوستان تو قریب قریب ایک براعظم کی حیثیت رکھتا ہے جہاں بہت سے نایاب ٹکٹ متلاشیوں کو مل جا سکینگے۔ حیدرآباد میں بھی اِس قسم کے اِمکانات موجود ہیں یہاں سرکاری دفاتر کے محافظ خانوں۔ جاگیرات۔ سمستانوں اور پائیگاہوں کے قدیم اور قابل اِتلاف کاغذات میں ہندوستان اور حیدرآباد کے قدیم اور نایاب ٹکٹ مل سکینگے بشرطیکہ

ان کرم خوردہ خزانوں تک رسائی ہو جائے۔

دنیا کے مشہور ذخیروں کے مالکوں کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ شاہ جارج پنجم آنجہانی کا ذخیرۂ برطانوی مقبوضات سب سے اہم ہے۔ بیرن فراری ہنگری کا وہ فراخدل شوقین تھا جس نے اپنی دولت کا معتدبہ حصہ قدیم ٹکٹوں کی خریدی میں خرچ کر دیا تھا اس کا انتقال لوسیین میں ۱۹۱۷ء میں ہو گیا۔ اور جب اس کا ذخیرہ ۱۹۲۲ء میں شہر پیرس میں ہراج کیا گیا تو ایک شخص مسمی آرتھر ہینڈ نے بہت سے نایاب ٹکٹ بڑی بڑی قیمتیں دیکر حاصل کر لئے اس کے علاوہ اس نے بہت سے دوسرے قابل قدر ذخیرے بھی منہ مانگی قیمت دیکر حاصل کر لئے تھے۔ آرتھر ہینڈ کو اس بات کا بھی فخر حاصل تھا کہ وہ ایک ایسے ٹکٹ کا بھی مالک تھا جو دنیا میں صرف ایک ہی ہے وہ ٹکٹ برٹش نیوگنی کا ہے جس کے لئے اس نے ۳۴۴۳، پونڈ ادا کئے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ موریشس کے ایک لفافہ کے لئے جس پر دو ٹکٹ چسپاں تھے گیارہ ہزار پونڈ ادا کئے تھے۔ انگلستان اور برلن کے عجائب خانوں کے ذخیرہ بھی نایاب اور عسیر الحصول ٹکٹوں سے پُر ہیں۔

عسیر الحصول ٹکٹوں کے متعلق تفصیل وار بحث کرنا بیحد دشوار اور اس مضمون کی غیر ضروری طوالت کا باعث ہوگا اس لئے ہم صرف ایک ٹکٹ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کرینگے یعنی وہی ٹکٹ جو دنیا میں ایک ہی ہے اس نیوگنی کے ایک سنٹ کے ٹکٹ کا سب سے پہلا مالک واگھان نامی ایک طالبعلم تھا یہ وہی ٹکٹ ہے جس کی موجودہ قیمت ساڑھے سات ہزار پونڈ ہے یہ ٹکٹ ۱۸۵۶ء میں جاری ہوا تھا یہ کچھ ایسا خوبصورت ٹکٹ بھی نہیں اور مستعملہ ہونیکی وجہ سے اپنی رہی سہی خوبی سے بھی محروم ہے۔ یہ مستطیل وضع کا ٹکٹ ہے اور ایک مربع انچ سے کچھ بڑا ہے یہ فالسئی رنگ کے کاغذ پر سیاہ روشنائی سے چھپا ہوا ہے۔ یہ معمولی کاغذ کا ٹکڑا دس ہزار پونڈ کے لئے بیمہ ہو چکا ہے۔ اس ٹکٹ کی تاریخ بیحد دلچسپ ہے اس کی ابتدا برٹش گنی کے دار السلطنت جارج ٹاؤن سے ہوتی ہے۔ چونکہ لندن سے (جہاں نیوگنی کے ٹکٹ طبع ہوا کرتے تھے۔) ٹکٹ وقت پہ نہ آسکے اور ڈاک خانہ میں کار اجرائی کے لئے ٹکٹ باقی نہ رہے تھے اس لئے عامل ٹپہ مسٹر ای۔ ڈی۔ وائٹ نے موقتی ضرورتوں کے تحت مقامی مطبع میں چند ٹکٹوں کی طباعت کا انتظام کروایا تھا۔ اس کے نقشے میں ایک جہاز اور ملک کا نام ہے۔ جب یہ ٹکٹ طبع ہو چکے تو عامل نے یہ خیال کیا کہ اس کی نقل آسانی سے کی جا سکتی ہے اس لئے اس نے مناسب سمجھا کہ اُس پر اپنی دستخط بھی ثبت کر دے۔ اس کے سترہ سال بعد ایک طالبعلم مسمی ورنن واگھان نے اپنے والد کے کاغذات میں اس ٹکٹ کو پایا اور اپنے

مختصر ذخیرۂ ٹکٹ میں اُس کو شامل کر لیا۔ چند دن بعد اُس نے اپنے چند غیر دلچسپ ٹکٹ علٰحدہ کر کے اُن کے معاوضہ میں دوسرے پسندیدہ ٹکٹ حاصل کرنے کا تہیہ کیا اور ایک مقامی ٹکٹ فروش کے پاس پہونچا۔ اس ٹکٹ فروش کا نام ہیک کنان تھا اُس نے اول تو اس ٹکٹ کو جعلی تصور کیا لیکن معاً اسے یہ خیال آیا کہ اُس نے اس قسم کے ٹکٹوں کے متعلق کسی رسالہ میں کچھ پڑھا تھا۔ اور محض قیاس پر اس نے اِس ٹکٹ کے لئے چھ شلنگ کی قیمت لگا دی واگھان نے اُس کو اپنی خوش نصیبی سے تعبیر کیا اور فوراً ٹکٹ فروخت کر دیا۔

اِس کے بعد ہیک کنان اِسکاٹ لینڈ کو منتقل ہوگیا اور بعض مالی دشواریوں کے تحت اُس نے اپنے ذخیرہ کو بیچ ڈالنا چاہا اور مختلف ماہرینِ فن اور شوقینوں سے اِس خصوص میں گفتگو کی۔ اِس ذخیرہ کی خریداری کے لئے دو خریدار آمادہ تھے لیکن قیمت کا تصفیہ نہ ہو سکا۔ اُن میں سے ایک نے بالآخر شرائط خریداری منظور کر کے گلاسگو کو مالک کے پاس چک روانہ کر دیا لیکن دوسرا شخص چک کے پہونچنے سے قبل خود ہی وہاں پہونچ گیا اور اِس ذخیرہ کو حاصل کر لیا۔ اِس کے بعد ایک اور تاجر مسٹر وایٹ نے اِس خاص ٹکٹ کو ۲۵ پونڈ کے معاوضہ میں حاصل کر لیا۔ بعد ازاں بیرن فان فراری نے اس ٹکٹ کو ڈیڑھ سو پونڈ میں خرید لیا اِس بڑی رقم نے ملک میں ہیجان برپا کر دیا۔ ۱۸۹۰ئہ سے ۱۹۱۴ئہ تک یہ ٹکٹ بیرن فراری کے ذخیرہ میں رہا اِس کے بعد جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اور پھر مالک بھی مرگیا۔ ۱۹۲۲ئہ میں فراری کے ذخیرہ کا ہراج ہوا اُس خاص ٹکٹ کو برطانوی لکپتی آرتھر ہینڈ نے ۷۳۴۳ پونڈ میں حاصل کیا۔ ۱۹۳۵ئہ میں اِس ٹکٹ کو پھر ہراج کیا گیا اور ساڑھے سات ہزار پونڈ میں مسٹر پی۔ ایل۔ پمبرٹن نے خریدنا چاہا لیکن اس کے مالک کو اِس قیمت پر بھی فروخت کرنا گوارا نہ تھا۔ مسٹر پی۔ ایل۔ پمبرٹن وہی صاحب ہیں جنھوں نے گلاسگو کو ہیک کنان کے پاس چک روانہ کیا تھا۔ ایک مدت کے بعد ایک خطیر رقم پیش کرنے پر بھی یہ بیچارہ اس ٹکٹ کو حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

اِس مضمون کے ختم کرنے سے پیشتر چند ضروری باتوں کا ذکر کر دینا مناسب ہے یہ باتیں نایاب ٹکٹوں کی خریدی میں احتیاط برتنے کے متعلق ہیں۔ اِس شوق کی ہردلعزیزی اور بعض جواھر ریزوں کی غیر معمولی قیمت دیکھکر اکثر قیمتی ٹکٹوں کی نقل کی گئی ہے۔ بعضوں نے تو نہایت کامیاب جعل سازی کی ہے ماہرینِ فن تو آسانی سے اصل و نقل میں امتیاز کر لیتے ہیں لیکن اکثر ناتجربہ کار شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ قیمتی لیکن ناقص اور از کار رفتہ ٹکٹوں کی اِس خوبی سے مرمت کرتے ہیں کہ

بادی النظر میں ان کی خامیاں نمایاں نہیں ہو سکتیں لیکن یہاں بھی ایک مبصر اس درستی اور مرمت کے مقامات دیکھ لیتا ہے اور اس کا شکار ایک ناتجربہ کار شوقین ہی ہوتا ہے۔ اِس لئے ٹکٹ ایسے ٹکٹ فروش سے خریدے جائیں جس کی شہرت اور دیانت مسلمہ ہو ورنہ (۹۰) فیصدی ٹکٹ پر جعلی ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

یہ ہیں مختصر حالات اِس تفریحی شغلہ کے جو ایک صدی کے قلیل عرصہ میں ایک معمولی شوق سے ایک زبردست تجارت اور مدون فن بن گیا ہے۔ ہندوستانی حضرات اگر چاہیں تو ٹکٹ کی تجارت سے کثیر نفع حاصل کر سکتے ہیں مگر وہ ایسا کیوں کریں۔ ہر قسم کی تجارت اُن کی وضعداری کے خلاف ہے اور ترقی اور ہندوستان میں بعد المشرقین ہے۔

احمد عبداللہ صدیقی

پروفیسر اُردو نظام کالج

یقین محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں
(اقبال)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
(غالب)

نتیجہ فکر حضرت صفیؔ

اورنگ آبادی

غلام شوق کے بندے بنے تمنّا کے
وہی مثل کہ "رہے دین کے نہ دنیا کے"

جگر کا خون ہیں یہہ ۔ دل کی جان ہیں ظالم
ہمارے اشک ہیں موتی نہیں ہیں دریا کے

نہ قبر سے کوئی ڈر ہے نہ حشر کا کھٹکا
اٹھانیوالے ہیں ہم ان کے نازِ بے جا کے

جو واقعات ہیں دنیا کے انکو کیا دیکھوں
معاملات ہیں یہہ قیس کے نہ لیلا کے

نہ دیکھ حضرت یوسف کی چاک دامانی
جو عشق دے تو خدا ہاتھ دے زلیخا کے

جگر کے داغ کبھی تو ملاحظہ کیجے
چراغ جلتے ہیں صدقے میں روئے زیبا کے

صفیؔ ہے اور پھر اس کی گلی ہے اے توبہ
سنبھل سکا نہ یہہ سو بار ٹھوکریں کھا کے

پبلشر

ایک ایکٹ کا مزاحیہ ڈراما

افراد ڈراما

نعیم ——— "نعیم پبلشنگ ہاؤز" کا مالک
نوکر ——— دفتر کا ملازم
خلیل ——— ناول نگار
یوسف ——— خطبے نگار
یعقوب ——— سوانح نگار
فخرِ قوم ——— مشہور لیڈر

نعیم۔ ادھر آؤ، ادھر آؤ! کوئی ہے؟

(گھنٹی بجتی ہے)

نوکر۔ حاضر، حاضر!

نعیم۔ جلد بلا لا، سنتا نہیں؟ ہیں!

نوکر۔ جی، جی کس کو بلاؤں؟

نعیم۔ کس کو؟ ہیں! یعقوب کو، ارے مسٹر یعقوب کو اور کس کو؟

ہیں؟ چل دیا؟ ارے سن تو سہی یعقوب کو نہیں، مسٹر یوسف کو۔ ہیں ہیں مسٹر خلیل کو

نوکر۔ جی، جی کس کو بلاؤں؟ ——— یعقوب صاحب کو، یوسف صاحب کو یا خلیل صاحب کو؟

نعیم۔ ہیں! اتنا نہیں سمجھتا بے وقوف کہیں کا، بلا لا کسی کو، جا، چل، بھاگ

سمجھ میں نہیں آتا ہمارے پاس کے نوکر بھی —— ہیں! کیا کہتے ہیں ؟ ——

(خلیل داخل ہوتا ہے۔)

خلیل۔ جی صاحب! ارشاد ؟

نعیم۔ ہیں! تم، مسٹر خلیل ؟

خلیل۔ جی ہاں خاکسار خلیل۔

نعیم۔ کیوں کیا ہے، کیسے آئے ؟

خلیل۔ جی صاحب نے یاد فرمایا تھا۔

نعیم۔ میں نے تمہیں —— ہاں ہاں بے شک یاد فرمایا، میں کہنا چاہتا ہوں یاد کیا بلکہ بلایا تھا

خلیل۔ جی ارشاد

نعیم۔ ہیں، ارشاد ؟ یہہ بھلا ارشاد کا کیا موقع ہے۔ ہیں! کام کی بات سنو میں کہنا چاہتا ہوں دیکھو یہہ کتاب —— ہیں! دیکھ کیا رہے ہو کہتے کیوں نہیں کہ بہترین ہے کتاب

خلیل۔ جی، جی ہاں، بے شک بے شک

نعیم۔ ارے جی ہاں، بے شک بے شک کیا کر رہے ہو دیکھتے نہیں کہ کتنا عمدہ ناول ہے یہہ گو کہ میں نے ابھی پڑھا نہیں اس کو مگر اس سے کیا ہوتا ہے، بک جو رہا ہے ہاتھوں ہاتھ۔ پاک صاف ہوٹل میں کہنا چاہتا ہوں پاک صاف پبلشنگ ہاوز نے اسے شائع کیا ہے۔ ابھی میں نے دیکھا کہ اُن کے بک اسٹال پر ایک ہجوم تھا لوگوں کا گو کہ میں کہہ نہیں سکتا کہ لوگ سب کے سب یہی کتاب خریدنے جمع ہوئے تھے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی دنگا فساد ہو گیا ہو یا بہر حال کچھ بھی ہو سکتا ہے —— ہیں! کیوں ہے نا ٹھیک ؟ بولتے کیوں نہیں ؟

خلیل۔ جی، جی درست ہے۔

نعیم۔ ہیں ہیں ! !

خلیل۔ کتاب بظاہر اچھی تو معلوم ہوتی ہے۔

نعیم۔ (منہ چڑھا کر) ہو ہنہ، کتاب بظاہر اچھی تو معلوم ہوتی ہے۔

خلیل۔ جی کتاب چھپی تو اچھی ہے اور ٹائٹل بھی جاذب نظر ہے گو کہ ایک حد تک شوخ ہو گیا ہے۔

غالباً یہہ کسی طوائف کی سرگذشت ہوگی۔

نعیم۔ ہو نہہ! طوائف کی سرگذشت ہوگی تو ہوا کرے ہیں تو روپیہ کمانا ہے چاہے وہ طوائف کی سرگذشت ہو چاہے کسی پبلشر کی، میں کہنا چاہتا ہوں ـــــ ہیں ہیں، بہر حال کسی اور کی۔ دیکھنا یہہ ہے کہ لوگ اس کو زیادہ سے زیادہ خریدتے ہیں یا نہیں، اتنا نہیں جانتے، ہیں! ناول نگار ہو، بڑے ناول نگار کہیں کے! جب دیکھو کسی میں فلسفہ لے بیٹھے کسی میں تعلیمی مسائل کسی میں اصلاح سماج غرض یہہ کہ ان ہی فضولیات میں سر کھپائے جاتے ہو ـــــ میں پوچھتا ہوں کہ کوئی بھی کام کی بات لکھی تم نے، کوئی سَو بھر بکی۔ کوئی دو سو، حد ہوگئی اشاعت کی۔ اس کو دیکھو ہزاروں تک بک چکی ہوگی۔

خلیل۔ عوام کا مذاق ـــــ

نعیم۔ (بات کاٹ کر) کیا کہتے ہو عوام کا مذاق عوام کا مذاق۔ بے کار کی حجت کرتے ہو۔ جاؤ! لکھو جلدی سے، فلم اسٹار کی کہانی کچھ اس کی اور کچھ ڈائرکٹر کی زبانی، یا ریڈیو اسٹار ہونا کیا معنی رکھتا ہے، یا پھر، جوانی کی راتیں مرادوں کے دن، بہرحال ان ہی جیسے عنوانات پر کتاب، میں کہنا چاہتا ہوں قلم اٹھاؤ ـــــ سوچ کیا رہے ہو، چل رے نامے، میں کہنا چاہتا ہوں چل رے خامے بسم اللہ۔ اتنی سی دیر میں کتنے عنوانات بتا دئے اور تمہیں دیکھو ہر آں یہی فکر کہ موضوع نہیں ملتا ـــــ

(یوسف داخل ہوتا ہے)

کون؟ مسٹر یوسف! کچھ خبر بھی ہے آپ کو کہ نواب صاحب آف فردوس نگر کاس ماپالیٹن لیگ کے صدر نامزد کئے گئے ہیں؟

یوسف۔ جی ہاں، اسی کی اطلاع دینے تو حاضر ہوا تھا۔

نعیم۔ او ہو؟ آپ اور اطلاع، کیسے؟ مجھے! ہُو نہہ! گویا کہ میں بھی تمہاری طرح بے خبر ہوں

یوسف۔ جی نہیں میرا مطلب ـــــ

نعیم۔ (بات کاٹ کر) میرا مطلب، آپ کا مطلب، کیا مطلب ہُو نہہ! خطبہ صدارت لکھو جلدی سے۔ ابھی ابھی نواب صاحب کا تار آیا ہے ـــــ کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہو۔

جاؤ، بھاگو۔ ابھی ابھی لکھو۔ نواب صاحب کو ذرا جلدی ہے اور ہاں کسی اور اخبار کو سوائے ہمارے جمہور کے معلوم نہ ہونے پائے کہ ہم خطبہ تیار کر رہے ہیں ——— جا کہاں رہے ہو؟ ابھی سُن تو لو بات پوری طرح۔ نواب صاحب نے اب کی دفعہ پسند ناپسند کی شرط بُری لگائی ہے اس لئے ذرا خطبہ اچھا لکھنا سمجھے؟ یاد رکھو اگر نواب صاحب نے خطبہ واپس کر دیا تو میں بھی تمہیں گھر بٹھا دوں گا۔ اتنے عرصہ سے یہ کام کرتے ہو پھر بھی تمہیں خاک نہ آیا، ہُونہہ!

یوسف۔ مگر مشکل یہ ہے کہ مجھے "کاس ما پالی ٹن لیگ" کے متعلق کچھ بھی معلومات حاصل نہیں ہیں۔ نہ اس کے اغراض و مقاصد معلوم ہیں اور نہ اس کے طریقۂ کار کا علم ہے۔

نعیم۔ ارے اتنی سی بات، ہیں! یہ بھی کوئی معلوم کرنے کی بات ہے۔ مجھے دیکھو کچھ معلوم تھوڑا ہی ہے پھر بھی ابھی خطبہ لکھواتا ہوں ——— اچھا تو لکھو ——— " میں 'کاس ما پالی ٹن، لیگ' کے ارکان کا بے حد ممنون ہوں بہت ہی شکر گذار ہوں اور تہ دل سے ——— ابھی ابھی ——— کیا کہتے ہیں، سپاس گذار کہہ سکتے ہیں، کیا مضائقہ لفظ تو بہر حال اچھا ہے موزون ہو یا غیر موزون چلنے دو کوئی تمیز نہیں کرے گا ——— کہ کہ انہوں نے اس اعلیٰ، ارفع اور بلند ترین منصب کے لئے مجھ ناچیز کو منتخب کیا " ——— ابھی ابھی ——— اب اس کے بعد یہ لکھنا چاہیئے کہ مجھے یعنی نواب صاحب کو اس لیگ سے بے حد دلچسپی ہے اور اس کے ارکان سے خاص خلوص۔ میں وعدہ کرتا ہوں یعنی نواب صاحب وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے ہر فعل کو وہ بُری میں کہنا چاہتا ہوں اچھی نظر سے دیکھیں گے ——— غرض یہ کہ اس قسم کی باتوں کو ذرا پھیلا کر لکھ دو ——— کیا تم اتنا بھی نہیں کر سکتے؟ ہیں!

یوسف۔ وہ جو ہمارے ہاں ایک نمونہ کا خطبہ رکھا ہے ———

نعیم۔ (بات کاٹ کر) بس بس اسی طرز پر بلکہ لیگ کا نام اس میں داخل کر کے دو ایک باتیں بڑھا دو اور کچھ جملے برائے نام اِدھر اُدھر بدل دو ——— بس ہو گیا تیار خطبہ۔

یوسف۔ اچھا صاحب! وہ کل شام میں آپ نے جو "انجمن برائے انسداد بے رحمی بر شوہراں" کے خطبہ کے لئے کہا تھا وہ میں نے رات بھر جاگ کر مکمل کر لیا۔

نعیم۔لکھ تو لیا؟ خوب! کہاں ہے وہ؟ دیدو پریس میں اور کہدو کہ اس کو سب سے پہلے چھاپ دیں۔
یوسف۔ ابھی ابھی میں نے یہہ بھی سُنا کہ ایک انجمن عورتوں نے بھی اس کے جواب میں بنائی ہے اور اس کا نام "انجمن برائے انسداد بے رحمی بر بیویاں" رکھا ہے۔
نعیم۔ ہی ہی ہی!!! خوب خوب۔
یوسف۔ اور میں نے ایک خطبہ اس کے لئے بھی تیار کر لیا ہے، شاید وہ بھی ہم سے رجوع ہوں۔ حکم ہو تو اس کو بھی چھپوا لوں۔
نعیم۔ کیوں نہیں، کیوں نہیں؟ ضرور چھپوا لو۔ بھئی کیا کہنے میں کہنا چاہتا ہوں تم تو آدمی نکلے کام کے۔ بس ٹھیک رہے گا۔ ہیں! دو ایک آدمی ایسے اور مل جائیں تو پانچوں گھی میں ہوں۔
(یعقوب داخل ہوتا ہے)
یعقوب۔جی صاحب ارشاد۔
نعیم۔ارشاد، ہیں! دیکھئے مسٹر یعقوب آپ کی یہہ سستی اور کاہلی سے کام نہیں چلے گا۔میں کہنا چاہتا ہوں ـــــ ہاں ہاں، ایک آنکھ نہیں بھاتی
یعقوب۔ سستی؟ کاہلی؟
نعیم۔ جی ہاں سستی، ہیں! اور جی ہاں کاہلی، ہیں! آپ کو جاننا چاہیئے کہ آپ پبلشنگ ہاؤز میں نوکر ہیں اور وہ بھی وقتیہ کتابیں چھاپنے والے پبلشنگ ہاؤز میں
یعقوب۔ درست ہے۔
نعیم۔(منہ چڑھا کر) درست ہے۔ ہیں! میں کچھ نہیں جانتا۔صرف یہہ پوچھتا ہوں کہ آپ کبھی اخبار بھی کان کھول کر، میں کہتا ہوں، آنکھ کھول کر بھی پڑھتے ہیں در ان حالیکہ خود میرے پبلشنگ ہاؤز سے ایک بہترین اخبار چھپتا ہے۔
یعقوب۔جمہور تو میں روز ہی پڑھتا ہوں
نعیم۔ ہیں! کیا خاک پڑھتے ہو ـــ دیکھو یہہ خبر ـــــ پڑھو تو سہی
یعقوب۔"فخر قوم کے خون کا دباؤ بڑھ گیا ہے ـــــ

نعیم۔ (مخل ہوکر) اور تم ابھی تک سو رہے ہو، ہیں! ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا تمہارے عجب کوڑھ مغز ہو۔ ارے میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے فخر قوم کے سوانح حیات مرتب کر لئے۔

یعقوب۔ سوانح حیات! کس لئے؟

نعیم۔ (مُنہ چڑھاکر) کس لئے! دیکھ رہے ہو کہ ان کے خون کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ حالات تسکین، میں کہنا چاہتا ہوں تشویش ناک ہو رہے ہیں اور تم کو کوئی فکر ہی نہیں۔

یعقوب۔ تو آپ کا مطلب ہے کہ میں ان کے حالات زندگی جمع کروں۔

نعیم۔ مطلب؟ عجب کم سمجھ آدمی سے سابقہ پڑا ہے۔ مطلب، ہیں مطلب! ارے میں کہتا ہوں حالات زندگی جمع کرنا کیا معنی لکھ ڈالو ان کے سوانح حیات لکھ ڈالو۔

یعقوب۔ بہت اچھا۔

نعیم۔ بہت اچھا، پھر وہی بہت اچھا۔ میں کہتا ہوں کہ لکھ ڈالو، سوانح حیات لکھ ڈالو اور تم کہتے ہو کہ بہت اچھا۔

یعقوب۔ ابھی لکھتا ہوں۔

نعیم۔ ابھی لکھتا ہوں، لاحول و لا ، عجیب آدمی ہو، ارے بھئی فوراً لکھو —— ذرا دیکھو تو یہہ خبر کب کی ہے؟

یعقوب۔ (اخبار سرسرانے کی آواز) —— کل کی

نعیم۔ کل کی —— او ہو کل کی —— کیا عجب جو وہ ابھی تک ختم بھی ہو گئے ہوں۔

یعقوب۔ حالت تو اتنی نازک نہیں بتائی گئی ہے۔ ابھی کل ہی کا تو معاملہ ہے۔

نعیم۔ کہوں! کل ہی کا معاملہ ہے۔ لاکھ دفعہ کہا کہ کل کا معاملہ ہوا تو کیا، کیا آدمی اتنی دیر میں مر نہیں سکتا؟ اور پھر خون کا دباؤ گھٹنا کوئی معمولی بات ہے۔

یعقوب۔ خون کا دباؤ گھٹا نہیں بلکہ بڑھا ہے۔

نعیم۔ بڑھ گیا ہے یا گھٹ گیا ہے بہرحال حجت کی ضرورت نہیں۔ پھر وہی الٹی بحث۔ میں کہتا ہوں کہ سوانح حیات لکھ ڈالو، فوراً پریس میں دیدو اور کہدو کہ میں نے حکم دیا ہے کہ سب کام چھوڑ کر اسی کو چھاپ دیں سمجھے؟ کل صبح تک چھپ جانا چاہیئے۔

یعقوب۔ مگر اتنی عجلت میں تو حالات جمع بھی نہ ہو سکیں گے۔
نعیم۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ تمہیں سمجھ نہیں۔ ایک مشہور لیڈر کے حالات قلمبند کرنے کا سلیقہ تم کو بالکل نہیں۔ اتنا نہیں جانتے کہ ہر لیڈر کے حالات کم و بیش ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ کسی نہ کسی کے حالات اٹھا لو۔ یہاں وہاں بس دو چار جگہ خفیف سے ترمیم کر کے پریس کے حوالہ کر دو۔ یہ بھی کوئی کہ بڑا کام ہے؟ ہیں!
یعقوب۔ بہت اچھا۔ کتاب کتنی ضخیم ہو۔
نعیم۔ لاحول ولا۔ عجب کٹ حجتی آدمی ہو۔ اس کی دباغت، میں کہنا چاہتا ہوں اس کی ضخامت بس کافی ہو کافی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ جاؤ جاؤ کام شروع کر دو۔ اتنا بھی نہیں معلوم۔
یعقوب۔ فخر قوم کی تصویر ہونی چاہئے مگر ہمارے ہاں غالباً نہیں ہے۔
نعیم۔ جمہور کے دفتر سے منگوا لو۔ وہاں ضرور ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ خود انہوں نے بلاک بنوا کر دیا تھا کہ ہم موقع بے موقع چھاپتے رہیں ـــــ ہاں یہ سنو! شروع کی تمہید اور آخری حصہ ذرا سنبھال کے لکھنا کیونکہ لوگ اسی کو پڑھتے ہیں بیچ میں چاہئے جو لکھ لو کوئی ہرج نہیں مگر یہ ضرور لکھنا کہ مولانا اپنے خطاب ننگِ قوم میں کہنا چاہتا ہوں کہ فخر قوم کے ہر طرح مستحق تھے۔ انہوں نے یہ کیا اور وہ کیا۔ اب ان کے اٹھ جانے سے تم یعنی ہم یعنی سب لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ـــــ کہ کیا محسوس کرنے لگے ہیں؟ بولتے کیوں نہیں؟ نہ تمہاری زبان چلتی ہے اور نہ قلم چلتا ہے ـــــ جا کہاں رہے ہو؟ سنو تو سہی کہ بہر حال اسی قسم کی واہی تباہی میں کہنا چاہتا ہوں مناسب اور موزون باتیں لکھو۔ چاہے مطلب کچھ نہ ہو مگر الفاظ اچھے اچھے ہوں۔ اب جاؤ گے بھی یا یہیں کھڑے رہو گے۔ اتنی سستی سے تو کام نہیں چلے گا۔
یعقوب۔ مگر صاحب ـــــ
نعیم۔ (بات کاٹ کر) ہیں! مگر صاحب کیا؟ کہتے کیوں نہیں۔
یعقوب۔ میرا خیال تھا ـــــ

نعیم ۔ (منہ چڑھاکر) میرا خیال تھا ـــــ ارے بندہ خدا کچھ کہہ تو بھی زبان سے میرا خیال
تھا تیرا خیال تھا ہمارا خیال تھا ـــــ کیا واہیات بکواس ہے ۔ جاؤ جاؤ اپنا کام کرو ـــ
مگر خیر کہہ دینے میں کوئی ہرج بھی تو نہیں ہے ۔ لاکھ دفعہ کہا ہے کہ جو کچھ سمجھ میں آئے
فوراً بلا جھجھک کہہ دیا کرو ـــ

یعقوب ۔ فخر قوم کی حالت کچھ ایسی زیادہ نازک نہیں ہے کہ ان کے سوانح حیات اتنی رواروی
میں مرتب کر لئے جائیں اور ـــــ

نعیم ۔ ہُو نہہ ! حالت اتنی نازک نہیں ہے ۔ بس یہی کہنا تھا ۔ ناتجربہ کار کہیں کے ۔ جاؤ جاؤ
کام کرو اپنا ۔ جو کچھ کہہ دیا ہے ایسا ہی ہو ۔ ہاں کتاب کا نام "فخر قوم مرحوم و مغفور
اعلیٰ اللہ مقامہ" ہوگا ۔ ٹائیٹل کی پیشانی پر ایک آدھ شعر لکھ دینا مثلاً حسرت اُن غنچوں پہ ہے
جو بن کھلے مُرجھا گئے یا بہت سی خوبیاں تھے مرنے والے میں ـــــ یا یا ، تم بھی تو دو
ایک شعر تجویز کرو

یعقوب ۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے + بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں
دیدہ ور پیدا ۔

نعیم ۔ ہو نہہ ! کوئی اور شعر یاد نہیں ـــ

یعقوب ۔ زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوشنوا + شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اُڑ گیا ۔
دونوں شعر علامہ اقبال کے ہیں ـــ

نعیم ۔ علامہ اقبال کے ؟ خوب خوب ! جب ہی تو بہت اچھے ہیں ۔ ایسا کرو ایک ٹائٹل
پر اور دوسرا انڑ ٹائٹل پر لکھوا دو ـــ اور ہاں خوب یاد آیا ، وہ شاعر ہے نام کیا
نام اس کا ؟ تلمیذ الرحمٰن ہاں تلمیذ الرحمٰن ! اس سے بھی ایک نظم لکھوا لو ۔ کیا کہتے ہیں اسے
"شہر آشوب" ؟

یعقوب ۔ جی شہر آشوب تو شہروں کی تباہی پر کہا جاتا ہے ۔

نعیم ۔ تو قوم کی تباہی پر "قوم آشوب" کہا جا سکتا ہے ـــــ تو خیر سمجھے ؟ ایک نظم اس عنوان
کے تحت لکھوا کر شائع کردو ۔ ابھی آدمی بھیجو اُن کے ہاں ۔ یا تم خود چلے جاؤ ۔ بہر حال

جلدی کرو ــــ کل کے اخبار میں اشتہار بھی دیدینا کہ فخر قوم مرحوم ومغفور اعلی اللہ مقامہ کے سوانح حیات شائع ہو گئے۔ جاؤاب وقت ضائع نہ کرو۔

یعقوب۔ پچھلی دفعہ بھی ہم نے لسان الملک کی سوانح عمری شائع کی تھی مگر کتاب شائع ہونے تک وہ بھلے چنگے ہو گئے اور ساری کتابیں دھری کی دھری رہ گئیں

نعیم۔ عجیب حجت ہے لسان الملک نہ مرے تو فخر قوم بھی نہ مریں گے ؟ یاد ہے تم کو انہیں ابھی کتنا برا بھلا کہا تھا اور کتنا ڈانٹا ڈپٹا تھا بلکہ دھمکی بھی دی تھی کہ ہرجانہ وصول کرونگا ــــ اور سچ کہتا ہوں کہ اب کی دفعہ اگر فخر قوم خود نہ مریں تو میں ہی مار ڈالوں گا ــــ بھلا یہہ بھی کوئی بات ہے۔ ہُونہہ! جاؤ جاؤ اپنا کام شروع کردو اور فضول اندیشہ کے ضرورت نہیں۔ بس سمجھ لو کہ فخر قوم مرچکے۔

دوسرا سین

دوسری صبح۔ مسٹر نعیم کے آفس رُوم میں یعقوب داخل ہوتا ہے

یعقوب۔ صاحب! میں حاضر ہوسکتا ہوں ؟

نعیم۔ ہاں ہاں آؤ! منع کون کرتا ہے تمہیں۔ خیر، مگر بہرحال اجازت لے لینا بہتر ہے۔ کیوں کیا کہتے ہو ؟ ہیں! بولتے کیوں نہیں ؟

نعیم۔ اچھا تو یہہ ہے سوانح عمری ــــ لانا تو ادہر ــــ (ایک لمحہ خاموشی۔ کاغذ الٹنے کی آواز) ــــ اتنی مختصر ؟

یعقوب۔ ایک دن میں اس سے زیادہ کیا لکھی جاسکتی تھی اور اس سے زیادہ کیا چھاپی جاسکتی تھی۔

نعیم۔ ہیں! میں کہتا ہوں اگر لکھی نہ جاسکتی تھی چھاپی کس طرح نہ جاسکتی تھی ؟

یعقوب۔ مواد اس سے زیادہ دستیاب نہ ہوا اور وقت بھی کم تھا۔

نعیم۔ میں کہتا ہوں اسی مواد کو زیادہ پھیلا کر چھاپہ جاسکتا تھا ــــ ہُونہہ سمجھے ؟ منہ کیا تک رہے ہو۔ دیکھو! سترہ سطر کی بجائے دس سطر لکھواتے اور پھر ذرا جلی قلم میں کھلا کھلا تو کیا صفحات زیادہ نہ ہوتے ؟

یعقوب۔ مگر اس سے ـــــ

نعیم۔ (بات کاٹ کر) ہیں! مگر اس سے! بے وقوف کہیں کے! مگر اس سے کیا؟ میں کہنا چاہتا ہوں کہ کتاب اگر ـــــ ہیں، ہیں! کیا کہتے ہیں اسے ـــــ بولتے کیوں نہیں؟

یعقوب۔ ضخیم

نعیم۔ ہاں ہاں وہی۔ بس اتنی سی تو بات تھی اور تم سوچتے رہ گئے ـــــ خیر ہاں تو وہ ہاں ضخیم ہوتی تو لوگوں کی نظروں میں خوب جچتی۔ لوگ تو بس فربہی، کیوں فربہی کہہ سکتے ہیں کتاب کے لئے؟

یعقوب۔ جی نہیں ـــــ

نعیم۔ (بات کاٹ کر) جی نہیں۔ کیوں نہیں؟ کوئی سبب بھی ہے، کوئی قاعدہ بھی ہے، کوئی اصول بھی ہے؟ یا بس جی نہیں ـــــ سوچتے کیا ہو، دوسرا لفظ کیوں نہیں کہتے۔

یعقوب۔ ضخامت

نعیم۔ ضخامت! ہُونہہ! تو میں کیا کہہ رہا تھا ـــــ ہُونہہ کیا کہہ رہا تھا؟

یعقوب۔ لوگ کتاب کی ضخامت ـــ

نعیم۔ ارے رے رے! یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ لوگ کتاب کی ضخامت سے مرعوب ہوتے ہیں، تم کو کس نے کہا تھا کہنے کے لئے؟ ہیں! ـــــ اچھا! یہ فخر قوم کی تصویر ہے۔ اس کے نیچے کیوں نہیں لکھدیا کہ یہ ان کی آخری تصویر ہے جو موت سے چند گھنٹے پیشتر خاص طور پر جمہور کے لئے حاصل کی گئی۔

یعقوب۔ صاحب! یہ تو پرانی تصویر ہے، کئی سال پہلے کی۔

نعیم۔ پھر وہی بے وقوفی کی باتیں! یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ یہ بہت پرانی تصویر ہے لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ پڑھنے والے اتنا سوچا سمجھا نہیں کرتے وہ تو سوانح نگار کی رائے پر اعتماد کر لیتے ہیں اور پھر غور تو کرو اس بیان سے تصویر کی ـــــ کیا کہتے ہیں، کیا کہتے ہیں؟

یعقوب۔ اہمیت

نعیم۔ ہاں ہاں یقیناً اہمیت بڑھ جاتی
یعقوب۔ مگر غلط بیانی ——
نعیم۔ (بات کاٹ کر) غلط بیانی! ہُو ہنہ! جیسا کہ تم نے اس میں جو کچھ لکھا ہے سب حرف بہ حرف صحیح ہے۔ ایک دفعہ لکھ کر تو دیکھا ہوتا؟ میرا ذمہ جو چند سال بعد بڑے بڑے محقق اس تحریر سے استدلال کر کے یہہ ثابت نہ کر دکھاتے کہ فخر قوم جوان رہے۔
(فخر قوم کواڑ ٹھوکتے ہیں)
کون؟ آئیے، آئیے!
(دروازہ کھلتا ہے)
فخر قوم۔ جی خاکسار — جس کو آپ فخر قوم کے خطاب سے یاد فرماتے ہیں
نعیم۔ فخر قوم؟ ہیں ہیں!! فخر قوم؟ واقعی یہہ تو آپ ہی معلوم ہوتے ہیں، میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ تو بالکل فخر قوم معلوم ہوتے ہیں ——
فخر قوم۔ (بات کاٹ کر) معلوم ہوتے ہیں —— ہاہاہا — خوب خوب!
نعیم۔ لیکن آپ، لیکن آپ تو ——
فخر قوم۔ (بات کاٹ کر) لیکن میں تو مرچکا — ہاہاہا — یہہ کہہ رہے تھے نا آپ؟ واقعی آپ اخبار کے اشتہار کے لحاظ سے تو میں مرحوم و مغفور اعلیٰ اللہ مقامہٗ ہوں —— ہاہاہا
نعیم۔ آپ تو واقعی — ہیں ہیں! میں کہنا چاہتا ہوں فخر قوم کے بھوت معلوم ہوتے ہیں ——
دیکھو مسٹر یعقوب ایسا کرو، اس کتاب میں ایک اور باب کا، سنسنی خیز باب کا اضافہ کردو۔ عنوان رہے "فخر قوم کا بھوت نعیم پبلشنگ ہاوز کے دفتر میں" سمجھے؟
فخر قوم۔ ہاہاہا! خوب مذاق کرتے ہیں آپ۔
نعیم۔ مذاق و ذاق کچھ نہیں، دیکھئے نا —— آپ کو کیا کہا جا سکتا ہے، مرحوم کے بھوت! ہاں ہاں ٹھیک ہے، مرحوم کے بھوت یہہ سوانح عمری ہے فخر قوم مرحوم و مغفور اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی، دیکھئے نا؟ ہے پسند آپ کو؟ اور ہاں ہاں یہہ ہیں مرحوم کے سوانح نگار مسٹر یعقوب —— (آہ سرد بھر کے) آہ! سچ کہتے تھے مرحوم کے مرنیکے

بعد ہی اُن کی قدر ہو گی۔

فخر قوم۔ تو کیا آپ مجھے واقعی مار ڈالتے ہیں؟

نعیم۔ میں نہیں تو یہہ کتاب ضرور ہی اس کو ثابت کر دے گی۔

فخر قوم۔ اچھی بات ہے عدالت میں دیکھا جائے گا، میں ہرجانہ کا دعویٰ کر رہا ہوں۔ میری خبر مرگ سنکر ملک میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا کچھ معلوم ہے آپ کو؟ اور میرا سارا انتظام تعلیم درہم برہم ہو گیا۔

نعیم۔ دیکھئے دیکھئے، آپ ناحق خفا ہو رہے ہیں، کیا واقعی آپ زندہ ہیں؟ اور اگر بالفرض زندہ ہیں تو کیا واقعی مجھ پر دعویٰ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

فخر قوم۔ اس میں کیا شک، اگر آپ کا دیوالیہ نہ نکال دیا تو کوئی کام نہ کیا، مذاق سمجھ رکھا ہے آپ نے فخر قوم کو مار ڈالنا۔

نعیم۔ سنئے سنئے! کیا کہتے ہیں اسے، یعقوب دیکھتے کیا ہو مُنہ، کوئی تدبیر کیوں نہیں بتاتے۔

یعقوب۔ کتابیں تلف کر دی جائیں اور اخبار میں معذرت کر لی جائے ——

نعیم۔ (بات کاٹ کر) ہُوں ہنہ! بے وقوف کہیں کے —— کیا کہتے ہیں، ہیں! اچھا اچھا فخر قوم دیکھئے ایسا کیوں نہ کریں کہ آپ چند روز کے لئے واقعی مرجائیں، میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کہیں غائب ہو جائیں اور میں ساری جلدیں بیچ لوں، نفع برابری کا تقسیم ہو جائے گا، ہیں ہیں! کیوں ہے نا بہترین ترکیب؟

فخر قوم۔ مگر بعد کو کیا ہو گا؟

نعیم۔ بعد کو؟ ہیں! بعد کو کیا ہو گا؟ کچھ بھی ہوتا رہے گا، ہو ہنہ اس سے کیا؟ کچھ بھی ہوتا رہے ہیں! اس وقت دیکھا جائے گا۔

فخر قوم۔ نہیں نہیں ابھی سے سوچ لینا چاہیئے۔

نعیم۔ ہُو ہنہ! تو ایسا ہو سکتا ہے —— کیا کہتے ہیں اسے! ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ بعد کو اعلان کر دیں کہ آپ نے کوّا کوّی کی شادی دیکھی تھی اور اس شگون بد کو مٹانے کے لئے یہہ سب کچھ کیا گیا —— کیوں کیوں ہے نا ٹھیک۔

فخر قوم۔ ہا ہا ہا! خوب بہت خوب، ایسا ہی ہو گا۔

سید بادشاہ حسین حیدرآبادی (اولڈ بوائے)

ہندوستانی تہذیب
پر
اِسلامی حکومت کا اَثر

تاریخ ہند کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ہندوستان روز ازل سے مختلف اَقسام کی تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے ہندو تہذیب اور اِسلامی تہذیب جو اپنی جگہ خود ترقی یافتہ۔ وسیع اور ایک دوسرے سے مختلف تھی اُن کا آپس میں مل جانا واقعی حیرت ناک ہے۔ جس کی نظیر دنیا کی کوئی تاریخ نہیں پیش کرسکتی۔ ان دونوں کا میل جول اس حد تک پہونچ چکا ہے کہ اَب خالص ہندو یا خالص اِسلامی تمدن کا وجود باقی نہیں رہا۔

برالنس کہتا ہے کہ "زمانہ جہالت میں جب کہ سلطنتِ رومہ تباہ ہوچکی تھی اور سارا یوَرپ بربریت میں گھرا ہوا تھا تو اُس وقت شمع علم کو روشن رکھنے کا فخر صرف عربوں کو حاصل ہے" تو ضروری طور پر جدید ہندو مسلم تہذیب میں محمّد بن قاسم کی فتح سندھ کا حصہ بھی ہوگا۔ اور سلطنت مُغلیہ کے وجود سے قبل ہندوستان پر مختلف خاندانوں کے اِسلامی بادشاہ حکومت کرچکے ہیں۔ تو لازمی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم تہذیب پر اسلامی تہذیب کے اثر پذیر ہونے میں اُس دور کا بھی کافی حصہ ہوگا لیکن اُس حصہ کا تخمینہ کرنا آسان کام نہیں اِس لئے توجہ زیادہ تر مغلیہ دورِ حکومت ہی پر کیجائیگی۔ کیونکہ اِس جدید تہذیب کے وجود کا بانی زیادہ تر یہی دورِ حکومت ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی پیچیدگیاں قدیم اور سب پر ظاہر ہیں۔ لیکن اِسلامی حکومت کا حصہ معلوم کرنا ناممکن نہیں۔

ہمیں اِسلامی حکومت کی تاریخی گہرائیوں سے تعلق نہیں۔ صرف اِتنا کہدینا کافی ہے کہ اِسلامی حکومت کا قیام ہندوستان میں مستقلاً محمد غوری کے دوسرے حملے سے شروع ہوتا ہے۔ اِس مہم کے سر کرنے کے بعد محمد غوری نے اپنے با اثر و با اِعتماد غلام قطب الدین ائبک کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اپنے

آقا کی وفات کے بعد اس وفادار غلام نے سلطان کا لقب اختیار کر لیا۔ اور اِس طرح سلاطین مملوک کی سلطنت قائم ہوئی۔ ۱۱۹۳ء سے مغلیہ خاندان کے زوال تک ہندوستان مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہا۔ ہندوستانیوں کی باہمی نزاع اور نا اتفاقیوں کی وجہ سے مسلمان بھی جولیس سیزر کی طرح کہہ سکتے ہیں کہ "ہم آئے۔ ہم نے دیکھا۔ اور ہم قابض ہو گئے"۔

اَب ہم تہذیب جدید کے حسب ذیل پہلوؤں پر غور کرینگے کہ اُن میں اِسلامی حکومت کے کیا اثرات ہیں۔

(۱) مذہب و فلسفہ (۲) زبان و خطاطی (۳) فنون لطیفہ {معماری۔ سنگتراشی۔ نقاشی موسیقی} (۴) دیگر پہلو {زر و جواہر کا اِستعمال۔ رَسم پَردہ۔ اور فنون تاریخ نویسی}

(۱) مذہب و فلسفہ:۔

قدیم ہندوستانی فلسفہ و قدیم ہند و مذہب میں آزادی رُوح کے تین ذرائع مقرر تھے۔ عمل۔ علم و عبادت۔ عمل (کرما) کو دائمی مسرت کا باعث سمجھتے تھے۔ گیتا کی یہ تعلیم ہے کہ نجات عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ اور عمل کی تعریف ہے کہ۔ فرض کا بلغیر فکر اجرا ادا کرنا۔

عمل کے بعد راہ علم کا رتبہ ہے جو گوتم بدھ اور مہاویر جیسے صوفیوں کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ راہ علم تمام مذاہب میں مشترک ہے جس کا حصول منزل حقیقی کو پہونچاتا ہے اور جس سے اِنفرادی رُوح کا رشتہ خدائے تعالیٰ سے قائم ہوتا ہے۔

تیسرا ذریعہ عبادت قرار دیگئی ہے۔ اس راہ کی بانی بھگوت گیتا ہے جس کی تعلیم ہے کہ عبادت صرف ایک ہستی کے لئے مخصوص کیجائے تاکہ اُس کی وحدت اچھی طرح سے واضح ہو۔

اِسلامی حکومت کے وجود سے پہلے ہی ہند و مذہب میں بہت ساری تبدیلیاں آچکی تھیں۔ دیوتاؤں کی تعداد اور اُن کی اَہمیت کافی بدل چکی تھی۔ مذہب کا رُجحان جذبہ پرستی کی طرف تھا۔ اِسلامی خیالات اور ہند و مذہب کے میل جول کی وجہ سے مختلف نظریئے قائم ہونے لگے۔ باہمی میل جول باہمی

---

(۱) مذہب فلسفہ۔ تاراچند کی کتاب Influence of Islam on Indian culture اور گیاریٹ کی کتاب Mughal rule in India اور برنیر کی ترجمہ Delaete's Empire of the great Moughal سے مدد لیگئی ہے۔

اِبہام وتفہیم کا باعث ہوا۔ جس کی وجہ سے بہت سے ایسے اشخاص بھی پائے گئے جو باوجودیکہ اپنا مذہب بدل چکے تھے۔ لیکن ظاہراطور پر اُن کی زندگی ایسی تھی کہ اُن میں اور اُن کے قدیم ساتھیوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ اِسی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب رُونما ہوئی کہ نہ اُس کو بالکلیہ ہندو اور نہ بالکلیہ اِسلامی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ اہلِ ہنود اِسلامی مقبروں پر نیاز چڑھاتے تھے۔ قرآنِ پاک کے نسخے نحس روحوں کے اثرات کو زائل کرنے کیلئے مکانوں میں رکھتے تھے۔

(۲) سکھ مذہب جس کی بناء گرونانک نے ڈالی اِسلامی اثر کی ایک شاندار مثال ہے۔ نانک کی تعلیم پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم سے اخذ کی گئی ہے۔

شہنشاہِ اکبر کا دینِ الٰہی گو چند روزہ تھا لیکن صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ وہ ہندو اور مسلم میل جول کا نتیجہ تھا۔

برہمو سماج جس کی بناء راجہ رام موہن رائے آنجہانی نے ڈالی تھی اور جسے رائے کیشاب چندر اسن نے ترقی دی۔ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی ابتداء کی خاص وجہ اِسلامی اثر تھا۔ کیونکہ برہمو سماج خدا کی وحدت کا قائل ہے۔ جو کہ اِسلام کا سب سے زیادہ اہم عقیدہ ہے۔

آریہ سماج جس کی بناء سوامی دیانند اسرسوتی نے پنجاب میں اُنیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصہ میں ڈالی۔ جس کے وجود کی وجہ بُت پرستی سے اِنحراف تھا۔ تو ظاہر ہے کہ یہ اسلامی عقائد کا اثر تھا۔ گو یہ مذہب اِسلامی اثر کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو رُوکنے کی خاطر اِسلام کی جانب جنگجو رَویّہ اختیار کرتا ہے۔ تاہم اُس کی بہت ساری اِصلاحات اِسلامی نظریوں سے مختلف نہیں۔

ایک اور مذہبی مصلح کا نام اِس سلسلہ میں لینا ضروری ہے۔ وہ مصلح کبیر ہے جو بھگتی تحریک کا فروغ دینے والا تھا۔ اِس تحریک کے ایک اور لیڈر کے الفاظ ہیں کہ " رام اور رحیم میں۔ کعبہ اور کیلاش میں۔ قرآن اور پرآن میں۔ کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔ ہر دو عمل کو ہی راہِ نجات قرار دیتے ہیں" اِس تحریک کے مشہور کارکنان۔ رام نند۔ کبیر۔ دادو۔ رام داس وغیرہ ہیں جو ہندوستان کے مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں خدا کی وحدت کی تعلیم دیتے رہے۔ ہر ایک پر کافی سے زیادہ اِسلامی اثر پڑ چکا تھا۔

---

(۲) کتاب (Legacy of India) سے مدد لی گئی ہے۔

(۳) تپسیا اور قنوطیت سارے ہندوستانی مذاہب کے مزوری ستون تھے۔ تپسیا سے مُراد تھی جسمانی تکالیف کا برداشت کرنا اور اُن کا عادی ہوجانا تاکہ اسی حالت میں رُوح قبض کیجائے۔ برہماچاریہ تحریک بھی تپسیا کا ایک جزو ہے۔ اِسلام میں بھی عیش پسندی کی حدتک نفس کشی کا وجود ہے۔ لیکن اِسلام خودکشی کو کبھی بھی جائز نہیں قرار دیتا۔ اور نہ اسلام میں برہماچاریہ خیال کا وجود ہے۔ اس کے برخلاف اِسلام ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔

دُنیا کی برائیوں کو اِس طرح واضح کیا جاتا ہے کہ اِنسان دنیوی زندگی میں پھنس کر اپنے حقیقی مرکز سے دُور نہ ہوجائے۔ اور دنیوی خطرات میں گرفتار نہ ہوجائے۔ سرجان وڈراف لکھتا ہے کہ " ایک چھوٹی سے اقلیت کے لئے زندگی کتنی ہی پُرلطف کیوں نہو ایک بڑی اکثریت کے لئے زندگی مصائب وآلام سے پُر ہے۔ اِس لئے دُنیا میں سکون حاصل ہونا ناممکن ہے۔"

اِسلام میں قنوطیت کا گزر نہیں ہے اِس کے برخلاف مسلمان ضرورت سے زیادہ رجائت پسند ہوتے ہیں۔ اِس طرح اِن دونوں مذہبوں کے باہمی میل جول کی وجہ سے ایک درمیانی نقطۂ نظر وجود میں آتا ہے۔

(۴) زبان اور خطاطی۔

اِس باہمی میل جول کا سب سے نُمایاں۔ قابل قدر۔ اور عجیب ترین نتیجہ ایک مقامی زبان یعنے اُردو۔ جو فارسی اور سنسکرت وغیرہ سے مرکب ہے۔ اور اس زبان کا خصوصی اَدب ہے۔ اُردو بالکلیۃ ہندوستانی زبان ہے۔ مسلمان اپنی مادری زبان ترکی وفارسی وغیرہ کو چھوڑ کر ہندوستان کی زبان اختیار کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے قدیم زبان ترقی پاتی ہے اور نیا اَدب وجود میں آتا ہے۔ مسلمانوں نے اِس نونہال کی اپنی مادری زبانوں کے گوشت وخون سے پرورش کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آگے چل کر یہی زبان

---

(۳) سر وڈراف کی کتاب Is India civilized سے مدد لی گئی ہے۔

(۴) یہ حصہ حسب ذیل کتب سے ماخوذ ہے:۔ Influence of Islam on Indian culture

Legacy of India Ishwari Pershad's History of Medieaval India

اور (عرب وہند کے تعلقات سلیمان ندوی) (اور محمد حسین آزاد نیرنگِ خیال) Indo Persian Literature

سارے ہندوستان کی مشترک زبان بنجاتی ہے۔

گلاب کو خواہ کسی نام سے یاد کریں وہ اُتنی ہی خوشبو دیگا۔ اسیطرح اردو کہئیے یا ہندوستانی۔ دارالخلافہ سلطنت مغلیہ کے اطراف واکناف یہ ہندوستان کی مشترک زبان کی حیثیت سے ترقی کرتی رہی۔

سر تیج بہادر سپرو فرماتے ہیں کہ "اُردو زبان ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آبا واجداد سے ایک مشترکہ ومقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے۔ جو قطعاً نا قابلِ تقسیم ہے۔"

مسٹر انیل چندر بنیرجی "ہندوستانی فارسی اَدب" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "تقریباً سارے ہندوستانی و فارسی اَدب میں لاتعداد ہندوستانی الفاظ اِستعمال کئے گئے ہیں۔ اور ہزاروں فارسی الفاظ مختلف ہندوستانی زبانون میں اپنا لئے گئے فارسی۔ عربی وترکی الفاظ وخیالات اور سنسکرتی زبانوں کے الفاظ وخیالات کا میل جول لسانیات کے طالب علم کے لئے بیحد دلچسپ باب ہے۔ اور اُن اجنبیون کے میل جول سے مقبولِ عام اُردو وجود میں آئی۔ ہندومت اور اِسلام کے درمیانی فاصلے کو دور کرنے اور دونوں میں ادراک عمل: ہم آہنگی پیدا کرنے کا سہرا زبان اُردو ہی کے سر ہے۔" نہ صرف اُردو بلکہ بہت سی ہندوستانی زبانیں اِسلامی دورِ حکومت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہیں۔

مسٹر تاراچند لکھتے ہیں کہ "ٹیگور کی میٹھی زبان (بنگالی) صرف مسلمانوں کی فتح ہندوستان کیوجہ سے اَدبی معیار کو پہونچ سکی۔ ہندو راج کبھی بھی اس کو مقبول نہ ہونے دیتا۔ مسلمان بادشاہوں نے اسکی سرپرستی کی اور راہِ ترقی پر گامزن ہونیکا موقعہ عطا کیا۔

ہندوستان میں مشاعرے مسلمانوں کیوجہ سے مقبول عام ہوئے گو موجودہ مشاعرے اَگلے زمانے کے سے پُرجوش وپُر تکلف نہیں پھر بھی وہ ایک جگہ مختلف مذاہب اور مختلف ملکوں کے باشندوں کو جمع کرتے ہیں اور وہ سب شاعری وتخیل کی داد ایک زبان ہو کر دیتے ہیں۔

ہندوستان میں خطاطی کو مسلمان بادشاہوں نے ترقی دی۔ قدیم ہندوستانی تحریرات وکتابیات کا دورِ اِسلام کے تحریرات وکتابیات سے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطاطی کو بے اِنتہا فروغ حاصل ہوا۔ عمارتوں کی تعمیر میں موزونیت کے ساتھ خوشخط کتبے اور نقش کاری کا استعمال۔ خوبصورتی۔ آرائش وزیبائش کی خاطر ہونے لگا۔

(۵) فن تعمیر و فن نقاشی:۔

غالباً فنون مذہب سے کہیں زیادہ تبدیلیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ فن تعمیر اور نقاشی میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اُن کو معلوم کرنے سے قبل مسلم اقتدار سے پہلے کے فن تعمیر کے نمونوں پر غور کرنا چاہیئے۔ ہندو عمارتیں ہندو مذہب کی ترجمان ہوا کرتی ہیں۔ ایک ہندو کی مذہبیت اس کی عمارتوں اور بتوں سے زیادہ کہیں اور ظاہر نہیں ہوتی۔ ایک قابل ہندو کا کہنا ہے کہ ہندو لوگ اُن ہی کے ذریعہ اپنے مذہب کی ہمہ گیری ظاہر کر سکتے ہیں۔ ابوریحان البیرونی لکھتا ہے کہ "اس فن میں ہندوستانی ترقی کے بہت سارے زینے طے کر چکے ہیں۔ جس کی وجہ مسلمان جب اِن عمارتوں کو دیکھتے ہیں تو حیران رہجاتے ہیں۔ اور اُن کو بیان نہیں کر سکتے۔ چہ جائیکہ اُن جیسی عمارات کو تعمیر کر دا سکیں"۔

اِس عظیم الشان ملک کی وسعت کی وجہ سے اگلے زمانے میں ایک طرز تعمیر کا سارے ہندوستان میں رائج ہونا ناممکن تھا اِس لئے ہم نے اُس دَور کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ طرز شمالی۔ طرز جنوبی۔ اور چالوکیہ طرز تعمیر۔

شمالی ہند کی طرز تعمیر میں کرخی و گول کرخی دار بلند مینار ہوا کرتے تھے۔ جو کٹورہ نما ابھرے ہوئے سروں میں ختم ہوتے تھے۔ یہ نمونہ بہت ہی عام تھا۔ اور سارا مینار سنگتراشی سے مرصع ہوا کرتا تھا۔ اِس طرز کے بہترین نمونے اَب بھی اُڑیسہ راجپوتانہ اور گوالیار و گجرات کے مندروں میں پائے جاتے ہیں۔

طرز جنوبی ہند یا ڈراویدی طرز۔ اِس طرز کی خصوصیت مخروطی چھت ہے۔ جو مختلف منزلوں میں بلند ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک گول یا کثیر الاضلاع گنبد میں ختم ہوتی ہے۔ کیلاش ایلورا تانجور اور مدہورا کے مندر اِس طرز کے نمونے ہیں۔

چالوکیہ طرز تعمیر جنوبی اور شمالی دونوں کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اور اِس طرز تعمیر کے لاتعداد نمونے میسور۔ کنٹر مقامات ناگپور اور ریاست حیدرآباد میں پائے جاتے ہیں۔ میسور کا ہیلوئیڈ مندر اِس کا سب سے بہترین نمونہ ہے۔

---

(۵) یہاں بھی تاراچند کی کتاب Influence of Islam on Indian culture سے اور کتاب Legacy of India سے مدد لی گئی ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ سرزمین ہند پر دو مختلف ذہنیت کے لوگوں اور اُن کی تہذیب کا میل ملاپ ہوا۔ جس کے سبب ایک نئی تہذیب ظہور میں آئی۔ ابتداءً ہندوستان میں بھی اسلامی طرز تعمیر دوسرے ملکوں کی طرح مخدومیہ کے قدیم طرز کی نقل تھی اس کے بعد ساسانی اثر کے تحت اس فن میں ترقی دیگئی اور خلفاء عباسیہ کے زمانے میں جو طرز بغداد شریف میں رائج تھی ہر جگہ اختیار کی گئی گنبد اسلامی عمارات کی خصوصیات میں سے ہے، اور قدیم ہندوستانی عمارات میں ناپید ہے۔ اِس کے تعلق بعض مصنفین کا خیال ہے کہ ترکستانی گول ڈیروں کی نقل ہے۔

مسلمانوں کو اپنی آمد کے بعد ابتدائی زمانے میں جن ہندو معماروں کو مجبوراً ملازم رکھنا پڑا تاکہ مساجد اور دوسری ضروری عمارات کی تعمیر ہوسکے وہ گول محرابین اور گنبدوں کی تعمیر کرنے کے قابل نہ تھے لیکن چودھویں صدی عیسوی کے شروع تک ساری شکلات دور ہوگئی تھیں۔ اور معمار اپنے آقاؤں کے حسب منشاء عمارات کی تعمیر کرنے لگے۔

اسلامی عمارات کی سادگی اور صوفیانہ طرز پر ہندوستانی پیچیدہ اور عجیب وغریب طرز کا اثر رفتہ رفتہ پڑنے لگا جس کی بدولت طرز تعمیر اور مرصع کاری ایک حد تک ہندوستانی ہوکر رہی۔ گول اور سادہ گنبدیں صاف وسفید دیواریں اور کشادہ سکانیت مسلمانوں کے خاص عیلے ہیں۔ اواخر بارہویں صدی عیسوی سے ہر وہ ملک جس کو مسلمانوں نے فتح کیا۔ مساجد۔ عالیشان محلات شاندار مقبرون اور دوسری عمارتوں سے پُر ہیں۔ اور یہ ساری عمارتیں اس نئی ہندو مسلم طرز تعمیر کی مثالیں ہیں۔

خاندان تغلق کے زمانے کی سادہ اور بڑی بڑی عمارتوں کی ان عمارتوں سے جو بنگال وغیرہ کے خود مختار اسلامی صوبوں میں تعمیر ہوئی تھیں کوئی مناسبت نہیں ہے۔

سلاطین گولکنڈہ و بیجاپور کے عہد کی معماری ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے اور ہر دو صوبہ گجرات کے ہندو وجین طرز تعمیر سے بہت مشابہ ہیں۔ رانا مان سنگھ کے زمانے کی عمارات مثلاً بارہ دری اور محل صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوؤں کو حکمران قوم کی طرز اختیار کرنے کا شوق تھا۔ جس کا نتیجہ ایک بیحد دلچسپ طرز تعمیر کا وجود ہوا۔

عہد اکبری میں ہندو ومسلمان کے درمیان فرق کو گھٹانے کی کامیاب کوشش کی گئی فتح پور سیکری کی عمارات کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین آلہی کی بناء ڈالنے والا جذبہ یہاں بھی

کارفرما رہا اور اُس نے وہاں سے زیادہ

جدید ہند و مسلم معماری نہ صرف سیاسی نقطۂ نظر سے کی گئی۔ بلکہ یہی طرز سارے ہندوستان میں عام ہوئی۔ اور نہ صرف شاہی عمارات اس طرز کے نمونے ہیں بلکہ ضروریات عوام کے پورا کرنے والی عمارات بھی اسی طرز کی بنائی گئیں۔ تاج محل کے متعلق لاتعداد قدردان بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اور یقینی طور پر وہ دنیا کی عجیب ترین اور نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ عام طور پر فرانسیسی معمار کو اس کا تعمیر کرنے والا بتایا جاتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ سے بعید بات تھی۔ مولوی معین الدین احمد صاحب "تاج اور اُس کے اطراف واکناف" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اُس کی تعمیر کا فخر ایک ہندوستانی ترک موسوم بہ عیسیٰ آفندی کو حاصل ہے۔

تہذیبی نقطۂ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے ہندوستانی فن کو ایک نئی قوت بخشی۔ اور معمار جن کو کہ مغلیہ ملازمت کا فخر حاصل ہوا۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر اُنہوں نے پتھر اور چونے کے ذریعہ اس عہد کی ذہنیت کا اِنکشاف کیا۔ ہندوستان کے پُرتکلف شاندار۔ رومانی اور شاعرانہ خیالات اِسلامی سادگی اور صوفیانہ ذہنیت کے میل جول کیوجہ سے ایک نئی تہذیب رُونما ہوئی۔

اِسلام میں سنگتراشی کے لئے زیادہ گنجائش نہ تھی۔ اِس لئے اِس فن کو دوسرے فنون کی ہمسری حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن خوبصورت سنگتراشی نے جس میں بُت تراشی داخل نہ تھی ترقی کی۔ اور اسلامی عمارات میں اُس کا اِستعمال عام ہوتا گیا۔ احمد آباد میں سدی سید کی مسجد کے منقش محراب اور دریچے اِس فن کے بہترین نمونے ہیں۔ چمکدار اور رنگین فرشی تریا و کھپریل خُراسان و سمرقند سے ہندوستان میں لائے گئے۔

نقاشی کی تاریخ۔ معماری کی تاریخ کے پہلو بہ پہلو رہی ہے۔ مغلیہ عہد میں اِس فن کی اصل اِیرانی ضرور تھی لیکن وہ ایرانی وہ ہندوستانی خیالات کی مشترکہ ترجمان رہی۔ قدیم نقاشی کے پس ماندہ نمونے اَجنٹا اور اِیلورا کے غاروں میں محفوظ ہیں۔ یہ نمونے اَشخاص کے مجموعے ہیں۔ جس میں عورت و مرد اور بچے۔ ہر انداز و ادا میں پائے جاتے ہیں۔ جس کے سبب یہ مجموعے حیران کن ثابت ہوتے ہیں۔ اِس حیرانی کے سبب ایک نہیں بلکہ کئی ہیں جاندار و بیجان۔ پرند و چرند۔ پھول و شجر۔ اِنسان و دیوتا سب کے سب پُرلطف اور پُوری اہمیت کے ساتھ ظاہر کئے گئے ہیں۔

اِسلامی نقاشی میں بہزاد کو اُستادی کا فخر حاصل رہا۔ اور بہزادی طرز کے نقاش اِنفرادیت

کی طرف ہمیشہ مائل رہے۔ اِنفرادی خصوصیات کے ظاہر کرنے کا شوق اس حد تک بڑھا کہ نقاشی مصوری ہو کر رہی لیکن مصوری اس پایۂ کی تھی کہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اِن دو فنونی ذہنیتوں کے ملاپ کی وجہ اور مغل بادشاہوں کی سرپرستی کے سبب ایک نئی طرز وجود میں آئی اور اگلی شان کے ساتھ جدید حُرمت داخل کی گئی جس کی وجہ نقاشی میں شاہی آداب کا خیال رکھا جانے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب میں باغبانی ایک اِسلامی بلکہ مغلیہ عطیۃ ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دلی کے اطراف واکناف میں فیروز شاہ تغلق نے بارہ سو باغ لگوائے تھے۔ غالباً یہ باغ قدیم ہندوستانی طرز پر لگوائے گئے اور تیموری (باغبانی) سے اُن کو کوئی نسبت نہیں ہے۔ بابر اپنی تزک میں ہندوستان میں اچھے باغوں کی کمی پر افسوس کرتا ہے۔ فن باغبانی جس کو بابر اپنے ساتھ لایا تھا اُس کے جانشینوں نے ترقی دی اور ہندوستان کی خوبصورتی کو بڑھا دیا۔ مغل ہندوستان میں مستقلاً مقیم ہوتے ہی باغبانی کیطرف متوجہ ہوئے اُنہیں ہندوستانی آب وہوا اور سطح کے لحاظ سے اپنے فن میں تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ ڈھلوان زمین ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتی۔ اور ہندوستان کی گرم آب وہوا بڑے پیمانے پر آب پاشی کو ضروری کر دیتی ہے جس کی وجہ خوبصورت نہروں اور حوضوں کی تعمیر عمل میں آئی۔ جیسی کہ لاہور کے شالامار باغ میں کی گئی۔ مسلمانوں کے زیر نگیں جو بھی شہر رہا اُس میں لاتعداد باغ لگوائے گئے۔ بادشاہوں کے کارناموں کی نقل عوام نے کی جس کی بدولت سارا ہندوستان باغوں سے پُر اور رشکِ فردوس بنگیا۔

مغلیہ خاندان کے آخری شہنشاہ۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی مذہبی ذہنیت کی وجہ سے اِس غلط عقیدہ نے جڑ پکڑلی تھی کہ مسلمانوں کو موسیقی سے کوئی واسطہ نہیں۔ اورنگ زیبؒ کے سوائے سارے مغل بادشاہ موسیقی کے شائق تھے اور اُنہوں نے اِس فن کو کافی ترقی دی۔ یہ فن اپنے عروج کو امیر خسروؒ کی بدولت پہونچا تھا۔ اور سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں جناب امیر خسروؒ نے اس فن کو قدیم ہندوستانی موسیقی کے معیار سے بلند تر کیا۔ بابر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اِس فن میں ماہر تھا اور اس پر ایک مقالہ بھی تحریر کیا تھا۔ یہ بھی اَغلب ہے کہ تان سین جو مغنیوں کا سرتاج مانا جاتا ہے گوالیار کا باشندہ تھا۔ اور اکبر کے دربار میں حاضر ہونے کے چند دن بعد ہی اُس نے اِسلام قبول کیا کیونکہ اُس کو مرزا کا خطاب عطا ہوا تھا۔

ہندوستان کے ہندو و مسلمان شہزادے جواہرات کے اِستعمال اور دکھاوے کے ہمیشہ

شوقین رہے ہیں۔ ان دونوں کے مشترکہ شوق کی بہترین مثال شاہجہاں کا تخت طاؤس تھا۔

پردہ کا رواج گو اب گھٹتا جا رہا ہے۔ ایک عرصے تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں رائج تھا۔ یہ خالص اسلامی رواج ہے جو ہندوستانی تہذیب میں داخل ہوا۔ اور حد سے گذر گیا۔ گو یہ طریقہ شاہی خاندان میں رائج نہ تھا کیونکہ وہ رعایا کو اپنی اولاد سمجھا کرتے تھے۔ اور اولاد کے سامنے پردہ کیسا لیکن وہ رئیسوں اور متوسط طبقوں کی ضروریات میں البتہ داخل ہو گیا۔

<u>تاریخ نویسی</u>۔ تاریخ ہند کا ہر مورخ اور ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ ہندوستان قدیم کی تاریخ ایک پیچیدہ اور مشکوک نتائج کی کہانی ہے۔ اس کو اتفاقی اور غیر مصدقہ ذریعہ معلومات پر اکتفاء کرنا پڑتا ہے۔ اس طویل عرصے میں نہ کوئی سرکاری اور نہ خانگی طور پر تاریخ لکھی گئی۔ کم از کم کسی قدیم تاریخ کے وجود کے متعلق ابتک معلوم نہیں ہوا۔ ایک قریبی کوشش جس کو کبھی بھی تاریخ نہیں کہہ سکتے: کوتلیا کی ارتھا شاسترا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی یہ فن بھی ہندوستان میں داخل ہوا۔ کیونکہ ہمیں اُن کے آنے کے بعد کے کئی سرکاری و خانگی تاریخوں کا حوالہ ملتا ہے۔ بدقسمتی سے یوروپی مورخ خصوصاً انگریز مورخ عام طور پر ان تواریخ پر بھروسہ نہیں کرتے۔ یوروپی مورخ تاریخ کو بھی ذہن اور قیاف سے لکھتے ہیں اور تاریخی سچائی پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ تاکہ اُن کے سیاسی مقاصد پورے ہوں۔ لیکن اب زمانہ آگیا ہے کہ محقق (ریسرچ اسکالرس) کی محنتوں کی بدولت ان خیالی تاریخوں کی اہمیت بہت کم ہو گئی ہے اور اب بالکل غائب ہو جائیگی۔ اور ہر محقق اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ مسلمان مورخ نے یوروپی مورخوں کے برخلاف قیافے اور تخیل سے کبھی کام نہیں لیا۔ اور تقریباً سارے محقق مسلمان مورخوں کی تعریف میں ہم نوا ہیں۔ اور ہر ایک مسلمانوں کی فتح کو (اس فن کی آمد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے) ایک رحمت تصور کرتا ہے جس کا تہذیب ہند پر بڑا احسان ہے۔

ہندوستانی تہذیب کا دائرہ کافی وسیع ہے اس لئے مسلمانوں کی حکومت کے اثرات بھی بہت سے ہیں۔ لیکن اُن کا معلوم کرنا بیحد مشکل امر ہے۔ اور اس مختصر مضمون کے دائرہ سے باہر ہے۔ اس مضمون کا بہترین اختتام غالباً پروفیسر ایشوری پرشاد کی تاریخ کے ایک اقتباس کا ترجمہ ہوگا۔

"سلطنتِ غزنی کے زوال کے بعد فاتح ہونے کا شرف ایک ایسے شخص کو حاصل ہوا

جو خاص سیاسی خیال کا حامی تھا۔ قسمت نے اُس کا ساتھ دیا اور وہ سرزمین ہند پر ایک سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ اور اسلام کا ہندوستان پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا۔ بلکہ اسلام نے ہندوستان کے راجاؤں میں جو ایک دوسرے کے ساتھ دست وگریبان تھے۔ سامراجی اِتحاد کا اور اقتدارِ اعلیٰ کے احکام کی تابعداری کا جذبہ پیدا کیا۔ ہندوستان کی جدید تہذیب کا وجود اسلام کا ایک قابلِ ستائش کارنامہ ہے۔ مسلمانوں کے عادات وآداب کا اثر ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے پر پڑا۔ اور در حقیقت میں ہماری تہذیب کی ساری خوبیاں اُن ہی فاتحین کی رہینِ منت ہیں۔ مسلمانوں نے اپنی زبان کو ہندوستان میں داخل کیا جس کا عجیب وغریب اَدب ہندوستان کی فنونی بیداری کا سبب ہوا۔ گویا اُس نے مُردہ جسم میں ایک نئی روح پھونکدی ''

غُلامُ جیلانیؔ

سَال سُوم

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دِل مرتضیٰ سوزِ صِدیق دے

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

خودی کو نہ دے سیم وزر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

اِقبال رح

تیری یاد

ب نظر ہوتی ہے مایوس کرم دل کی طرح
ہوش گم ہوتے ہیں وارفتۂ منزل کی طرح
نس جب ٹوٹتی ہے وعدۂ باطل کی طرح
تیرگی عالم احساس پہ چھا جاتی ہے

مجھ کو اس وقت بھی ظالم تری یاد آتی ہے

ھی بستی سے بہت دور نکل جاتا ہوں
آہ کرتا ہوں تڑپتا ہوں مچل جاتا ہوں
م زیست ہوں میں سوئے اجل جاتا ہوں
زندگی سے جو طبیعت کبھی گھبراتی ہے

مجھکو اُس وقت بھی ظالم تری یاد آتی ہے

بح جب باغ میں چلتی ہے ہوا اِٹھلا کر
پھول جب ہنستے ہیں ہیروں کا خزانہ پاکر
اخِ گل پر جو چہکتے ہیں عنادل آکر
آہ دل سے لب خاموش تک آجاتی ہے

مجھ کو اُس وقت بھی ظالم تری یاد آتی ہے

چپکے چپکے جو تری یاد میں روتا ہوں کبھی
بات کرتے ہوئے خاموش جو ہوتا ہوں کبھی
ہو کے دیدار سے مایوس جو سوتا ہوں کبھی
دھندلی سی تری صورت نظر آجاتی ہے

مجھ کو اُس وقت بھی ظالم تری یاد آتی ہے

کیا کہوں چشم گہربار کا منشاء کیا ہے
تجھکو کس طرح دکھاؤں کہ تمنا کیا ہے
دل کو بہلاتا ہوں بہلانے سے ہوتا کیا ہے
ضبط کرتا ہوں مگر آہ نکل جاتی ہے

مجھ کو اس وقت بھی ظالم تری یاد آتی ہے

خشک ہوتا ہے مرا دیدۂ پرنم جس دم
ٹوٹ جاتا ہے طلسم غم عالم جس دم
کرتا ہوں اپنی تمناؤں کا ماتم جس دم
زندگی موت کی آغوش میں سو جاتی ہے

مجھ کو اس وقت بھی ظالم تری یاد آتی ہے

شکوہ کرتا نہیں دنیا کے ستم سہتا ہوں
بات کرتا نہیں خاموش سدا رہتا ہوں
لب خاموش سے افسانۂ دل کہتا ہوں
آنکھ جب دل کا تماشا مجھے دکھلاتی ہے
مجھ کو اس وقت بھی ظالم تری یاد آتی ہے

دامنِ شب میں چمکتے ہوئے تاروں کی قسم
عہد عشرت کی دل افروز بہاروں کی قسم
چشم بدمست کے رنگین اشاروں کی قسم
دل پہ جب تازہ مصیبت کوئی آجاتی ہے
مجھ کو اس وقت بھی ظالم تری یاد آتی ہے

زندگی جب سمٹ آتی ہے دل بسمل میں
دفن ہوتی ہے تمناؤں کی دنیا دل میں
فرق رہتا نہیں جب ماضی و مستقبل میں
نزع میں سانس جو چلتی ہوئی رُک جاتی ہے
مجھ کو اُس وقت بھی ظالم تری یاد آتی ہے

محمدؐ عبدالقوی۔ قوؔی

شادی کی اور غم کی ہے دنیا میں ایک شکل
گل کو شگفتہ دل کہو تم یا شکستہ دل

دردؔ

مئے خانہ کی اک روح مجھے کھینچ کے دیدی
کیا کردیا ساقی نگہ ہوش رُبا سے

اصغؔر

سوویٹ

روس ۱۹۱۷ء میں ایک انقلابی دور سے گذر رہا تھا۔ ۱۹۲۰ء تک سلطنت روس (جو اس وقت یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کہلاتی ہے) کے حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے تھے کہ دنیا اشتراکیت کو ناممکن العمل سمجھنے لگی تھی۔ لیکن اب بیس برس بعد سرمایہ داری کے مقابلہ میں اشتراکیت نے سیاسی۔ معاشی اور تمدنی نقطہ نظر سے ایک نمایاں حیثیت پیدا کرلی ہے۔ یہہ کامیابیاں اگرچہ اس سرزمین کے محبان وطن کے حسن انتظامات پر پوری طرح محمول نہیں کی جاسکتیں کیونکہ انھوں نے اپنی ناتجربہ کاریوں کی وجہ سے وہی غلطیاں کیں جن کے ہونے کا عام طور پر امکان ہوتا ہے اور جن کے ارتکاب کے لئے ان کا غیر تربیت یافتہ نصب العین انھیں آمادہ کرتا تھا لیکن ان کی نا اہلیت درحقیقت اتنی تباہ کن نہ تھی جتنی کہ بظاہر معلوم ہوتی تھی کیونکہ وہ اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے اور عوام کی نظروں سے چھپانے کی بجائے جیساکہ سرمایہ دار کیا کرتے ہیں آپس ہی میں ایک دوسرے پر نکتہ چینی کرتے تھے اور اس قدر شور وغل مچاتے تھے کہ ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹ جاتا تھا۔ لیکن ان غلطیوں کو محسوس کرتے ہی فوراً مکبر الصوت کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ میں اعلان کر دیتے تھے۔ اور ان کے رویہ میں فوراً ہی تبدیلی پیدا ہو جاتی تھی۔ بعض وقت وہ اس تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹتے تھے کہ ہمارا دارالعوام اسے تصور میں نہ لاسکتا تھا۔

ہمیں یہہ ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ حکومت شخصی جائداد یا شخصی نفع بخش کاروبار کو خواہ وہ اسے کتنا ہی مخدوش کیوں نہ سمجھتی ہو اس وقت تک نہ ضبط کرے اور نہ روکے جب تک کہ حکومت خود اپنے پیروں پر نہ کھڑی ہو جائے۔ ورنہ اس کا انجام بے روزگاری اور قومی افلاس ہی ہوا کرتا ہے۔ کارخانے کے کام کرنے والوں کو کبھی نظر انداز نہ کیا جائے کیونکہ صنعت وحرفت اس نئے دور میں مزدوروں ہی کے ہاتھوں انجام پاتی ہے جو اس وقت تک کام کرتے ہیں جتنے عرصہ کے لئے ان سے کچھ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے صرف مزدوروں کا طبقہ ہی نہیں بلکہ وہ عملہ بھی زیر نگرانی رہنا چاہئے،

جس میں معمولی محرروں سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ ریاضی داں اور سائنس داں داخل ہیں۔ مزدوروں کی مثال جہاز کے ان مسافروں کی سی ہے جو خشکی سے میلوں دور ہوں اور جو نہیں بتا سکتے کہ جہاز کو کس طرف جانا چاہئے۔ یہہ کام تو کپتانوں اور افسروں کا ہے جو علم ہئیت کی مدد سے کر سکتے ہیں۔ زمیندار اور کارخانہ داران مزدوروں کو جن کے بل بوتے پر ان کا نظام حیات قائم ہے بہت ہی نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں جس کا نتیجہ ایک مکمل انقلاب ہوا کرتا ہے۔ اور وہی جذبۂ حقارت ان میں پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنے سرمایہ دار دشمنوں کو ٹھوکر مار کر نکال دیں لیکن اگر جہاز کے مسافر بیچ سمندر میں بغاوت کر بیٹھیں اور افسروں کو قتل کر دیں تو اس کا انجام خود ان کے لئے بُرا ہوگا۔ جہاز اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرے گا۔ یہاں تک کہ وہ یا تو فاقے سے مر جائیں گے اور یا جہاز کہیں ٹکرا کر مع مُسافروں کے پاش پاش ہو جائے گا۔ اسی لئے ایک انقلابی حکومت کو چاہئے کہ اس جذبہ انتقام کو اس وقت تک دبائے رکھے جب تک کہ اس کے نظام حکومت کو چلانے کے لئے قابل کارکن مہیا نہ ہو جائیں۔ ایک تجربہ کار اور ہوشیار کاشت کار نہایت عمدگی سے کھیتی باڑی کر رہا ہے۔ اگر مزدور بغاوت کر کے اس کو بھگا دیں تو یہہ اس کی لالچ کی سزا اچھی ہوگی لیکن کچھ ہی دنوں میں زمین بنجر ہو جائے گی اور مزدوروں کو اپنی مزدوری سے ہاتھ دھونا پڑے گا

ایک چیز اور ہے جس کا خیال حکومت کو ضرور ہونا چاہئے۔ حکومت کی طرف سے ایک شخص کو رعایا کی خدمت کے لئے مامور کیا جاتا ہے لیکن وہ اپنے کام میں تساہل سے کام لیتا ہے اور لاپرواہی برتتا ہے تاکہ لوگ مجبور ہو کر اپنا کام نکالنے کے لئے اس کی جیب گرم کریں۔ یہہ مرض اس قدر عام ہوگیا ہے کہ ایک چپراسی سے لے کر بڑے سے بڑے عہدے دار اپنی مٹھی گرم کرنے کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی رشوت ستانی اس قدر مضبوط جڑیں پکڑ چکی ہے کہ مختلف ریاستوں کی سول سروس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہر عہدہ دار اپنے ماتحتیں کی تنخواہ سے کچھ نہ کچھ زبردستی وصول کرتا ہے جو خود بھی اپنے ماتحتیں کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ یہہ سلسلہ وہاں تک پہونچتا ہے جو بے چارے کسی کے حاکم نہیں ہوتے اور انھیں کسی سے کچھ نہیں مل سکتا۔ یہہ رواج سا ہوگیا ہے کہ سرکاری خدمتیں کچھ لیکر دی جاتی ہیں چاہے وہ درخواست گذار حکومت اور قوم کا کتنا ہی بدخواہ کیوں نہ ہو۔

حکومت زار کا خاتمہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں ہوا اور اس کی جگہ پارلیمانی حکومت نے لے لی۔ روس ایک مزدوروں کا ملک ہے۔ ان مزدوروں کو جنگ عظیم میں برطانیہ اور فرانس کی امداد کے لئے

جبراً فوج میں بھرتی کیا گیا۔ برطانوی فوجوں کے آرام کا خیال تو ہر طرح سے رکھا جاتا تھا۔ انھیں اتنا کھلایا گیا کہ ان میں سے اکثروں نے شائد اتنا آسودہ ہوکر پہلے کبھی نہ کھایا ہوگا اور پھر ان کی بیویاں الاؤنس پاتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی زمانہ امن سے کہیں زیادہ خوشگوار تھی۔ لیکن روسی فوجوں کی ایسی قسمت کہاں تھی۔ وہ تقریباً سب کے سب فاقہ زدہ تھے۔ وہ پہلے سمجھے کہ جنگ زیادہ طول نہ پکڑے گی لیکن ۱۹۱۷ء میں انھیں جرمنی کی تنظیم فوج کے مقابلہ میں ہر جگہ شکست ہوئی اور بہت سے مارے گئے۔ اس پریشانی کی حالت میں انہوں نے میدان چھوڑنا شروع کیا اور آخر کار اتنی ہمت پیدا ہوگئی کہ خود اپنی تنظیم آپ کرنے لگے۔ لیکن یہ تنظیم فاقوں کو دور کرنے کے لئے کچھ نہ کرسکتی تھی۔ اِدھر جرمن حکومت نے لینن نامی ایک اشتمالی کو اُکسایا تاکہ رُوس میں پھوٹ پیدا ہو جائے لیکن وہ بجائے اشتعال انگیز ثابت ہونے کے اپنے وقت کا بڑا مدبر نکلا۔ اس نے سپاہیوں اور مزدوروں کو اس کا یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ انھیں کاشت کے لئے زمین دی جائے گی۔ اس طرح اسے مزدوروں کی ایک بڑی قوت حاصل ہوگئی اور اس نے "کرنسکی" حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ برسٹ لٹوسک میں جرمنی سے صلح کرکے اپنا پہلا وعدہ پورا کیا لیکن روسی پولستان اور بلقانی صوبے ہاتھ سے جاتے رہے جس کی وجہ سے انتہائی انقلاب پسند اشتراکی ناراض ہوگئے۔

اب آپ ان صبر آزما حالات کا مطالعہ کیجئے جن میں لینن اور مارکس کی اشتمالی جماعتیں گرفتار تھیں۔ انھیں سوائے اشتمالیت کے اور کچھ خیال نہ تھا کیونکہ ان کے ہاتھ میں مزدوروں کی ایک بڑی قوت تھی جو شائد اشتمالیت سے اتنا ہی واقف تھے جتنا کہ ریاضی سے مزدوروں کے بچوں کی حالت بہت ہی افسوس ناک ہوگئی تھی وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں اِدھر اُدھر بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ اور ان پرندوں کی طرح جو موسموں کی تبدیلیوں کی وجہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑ جایا کرتے ہیں، خانہ بدوش پھرا کرتے تھے۔ اگرچہ وزرائے تعلیمات نے ان کی اصلاح کرنے کے لئے ہر ممکن صورت پر عمل کیا لیکن ان کی وحشت کسی طرح دور نہ ہوتی تھی۔ موقع ملتے ہی وہ فوراً بھاگ جاتے تھے۔

موجودہ روس میں ایک بھی لڑکا بھوکا یا ننگا نظر نہیں آئے گا لنن جانتا تھا کہ اشتمالیت کی کامیابی کا دارومدار ایک ایسی نسل پر ہے جسے دنیا نے آج تک نہیں دیکھا۔ اسی روس کے

پسنے والوں کو ایک پیالہ سالن اور ایک ٹکڑا روٹی کے لئے جان توڑ محنت کرنی پڑتی تھی۔ لیکن لینن کے زیر حکومت طلبا رنوابوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے کیونکہ ان پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا تھا۔ زار کے وقت کی مردم شماری کا اس وقت کی مردم شماری سے اگر مقابلہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سولہ برس کے لڑکے اور لڑکیاں اشتالیت کے زیر پرورش دو انچ لانبان میں اور چار پونڈ وزن میں اس وقت کے لڑکوں اور لڑکیوں سے زیادہ ہیں۔ انگلستان کی پارلیمان میں اکثر ان تباہ حال دیہاتی لڑکوں کا نقشہ کھینچا جاتا ہے جنھیں پوری طرح غذا نہیں ملتی اور جن کے ٹھٹھرے ہوئے جسموں پر قحط زدگی کی ساری علامتیں پائی جاتی ہیں لیکن وہاں کے روزنامے اپنے صفحوں پر ان کا ذکر تک نہیں لاتے۔ البتہ اس بات کا یقین دلانے کے لئے بہت گرم پروپگنڈا کرتے ہیں کہ روسیوں کو غلامی کا طوق پہنا کر تباہ کر دیا گیا ہے اور اہل برطانیہ آزاد اور خوش حال ہیں کیونکہ گذشتہ ہفتہ برآمد میں دو فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔

بہتر ہوگا کہ بالشوکیوں نے جہاں کہیں ٹھوکریں کھائی ہوں اُنھیں واضح کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر ہم نظام روس اختیار کریں جسے ہم اختیار کرنے پر مجبور ہوں گے تو ہم سے وہی غلطیاں سرزد ہوں گی جنھیں روس کے قابل ترین محبان وطن نے کی تھیں۔ جب تک ہم سوئٹ کے تجربوں کی روشنی میں اپنے حالات کا مطالعہ نہ کریں اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

بالشویکیوں نے سب سے پہلے مارکس کے اُصول پر چلتے ہوئے خانگی متاجرین کو دوکان سے نکال باہر کیا جس طرح حضرت عیسیٰؑ نے سود خواروں کو کلیساؤں سے نکال دیا تھا۔ ان کے سامان کو ضبط کر لیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک نقاشہ کلیر شریڈن نامی لنن اور اس کے ساتھیوں کے مجسمے بنانے کے لئے ماسکو گئی ہوئی تھی لنن نے جو لبادہ اس کو تحفۃً دیا وہ انھیں دو کانوں کا لوٹا ہوا مال تھا۔ اس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ ماسکو میں ایک بھی دوکان کھلی ہوئی نظر نہ آئی۔ چونکہ مکانوں کا اب کوئی حق دار نہ تھا اس لئے کسی نے ان کی مرمت بھی نہ کی اور وہ خستہ حال ہو کے رہ گئے۔ برقی جھولے رُک گئے۔ بجلی کی روشنی بند ہوگئی۔ محکمہ صفائی کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مسٹر ایچ۔ جی۔ ولس نے روس کے بڑے بڑے شہروں کی اس وقت سیر کی تھی۔ مسٹر ولیم رینڈالف ہارسٹ نے خود مجھے بہت بڑا کمیشن دیا تھا کہ میں روس جا کر وہاں کے حالات قلمبند کروں لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ سوائے اس کے اور

کیا دیکھوں گا کہ سرمایہ داری تباہ حالت میں ہے اور اشتمالیت اس سے کسی صورت میں بہتر نہیں۔
سا۱۹۳۱ئ میں جب کہ ہوا کا رُخ بدل چکا تھا میں روس گیا۔ دس روز تک نہایت آرام سے گھومتا رہا
(روسیوں نے میرے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیا گویا کہ میں خود کارل مارکس تھا)۔ وہاں میں نے کوئی ایسی
ردی حالت نہیں دیکھی جو سرمایہ داروں کی مغربی دنیا کے مصیبت زدہ دیہاتوں میں نہ ملتی ہو۔
خوش قسمتی سے روس میں غلطیوں کی پردہ پوشی نہیں کی گئی۔ ان پر بار بار اعتراضات کئے
جاتے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کی جاتی۔ کیونکہ یہاں سرمایہ داروں کا مفاد تو تھا نہیں جس کی مدح خوانی
کی جاتی۔ چند سال کی ناگفتہ بہ تباہی اور پریشانی ضرور تھی لیکن اس دوران میں مزدور کبھی مایوس نہیں
ہوئے اور اپنی خود داری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ لینن نے علی الاعلان اپنے ہمرکابوں سے کہدیا
تھا کہ - - - - - - - - - - - - - - - اگرچہ ہمارے انقلابی اُصول تعریف سے باہر
ہیں لیکن عملی روح ہم میں موجود نہیں بہت ہی تلخ تجربہ کے بعد اسے معلوم ہوا کہ خانگی نفع خوروں کو
اسوقت تک تباہ نہ کرو جب تک کہ مشترکہ تجارت میں قوم خود اپنے پیروں پر نہ کھڑی ہو جائے۔ اس
سبق کو وہ اشتراکین انگلستان (Fabians) سے حاصل کرسکتا تھا۔ بہرحال اسے۔
"این۔ ای۔ پی"، یعنی نئے معاشی روے کا اعلان کرنا پڑا جس کی رو سے خانگی متاجرین کو اجازت
دی گئی کہ وہ اپنے کاروبار کو اس وقت تک جاری رکھیں جب تک کہ کوئی دوسرا اعلان نہ کیا جائے۔
اس طرف قدم اٹھایا ہی گیا تھا کہ دنیائے سرمایہ داری میں بڑی خوشیاں منائی گئیں کہ اشتمالیت
کا آخر کار خاتمہ ہوگیا اور سرمایہ داری پھر سے زندہ ہو رہی ہے۔
روس میں جب کہ ہر چیز اپنی بدترین شکل میں تھی۔ دنیائے سرمایہ داری کی طرف سے آواز
بلند ہوتی تھی کہ "لبرل پارلیمان جو اُکھاڑ پھینکی جا چکی ہے وہی دراصل روس کے لئے مناسب حکومت
ہوسکتی ہے۔ سوئٹ تو بدمعاشوں کا ایک نرغہ ہے۔" سرمایہ داروں نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے
ایک کثیر رقم اکٹھا کی جس میں انگلستان سب سے ممتاز رہا۔ مسٹر ونسٹن چرچل نے جو اس وقت اسٹیٹ
آف وار کے سکرٹری تھے یہ رقم اس یقین کے ساتھ اٹھا کر دے دی کہ جزائر برطانیہ کے ہر ایماندار او
مہذب شخص کی دلی حمایت ان کے ساتھ ہے لیکن اُنھیں اس وقت بے حد تعجب ہوا ہوگا جب کہ
روس سے "ہاتھ اٹھالو" والی تحریک نے دھمکی دی کہ سرخ پوشوں کے خلاف عوام کی رائیں آپ کے

ساتھ نہیں ہیں۔

روس میں کچھ عرصہ کے لئے بغاوت پھوٹ پڑی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوئٹ ختم ہو جائیگا
غازان پر باغیوں کے حملے کے بعد جو سفید پوش کہلاتے تھے بالشوکیوں کی حالت مایوس کن ہو گئی تھی
پیٹرس گراڈ کو چند ہی گھنٹوں میں باغیوں نے فتح کر لیا تھا لیکن دو ہی سال کے عرصہ میں انھیں کمل شکست
ہوئی اور سرخ پوشوں نے برطانوی وردیاں اور جوتے پہنے اور وہ ہتیار سجائے جنھیں مسٹر چرچل نے
ان کی تباہی اور بربادی کے لئے بھیجا تھا۔ یہہ سب کچھ کیونکر ہوا؟۔ اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو آئیے
سوال آراضی کو دیکھیں۔ سپاہیوں اور مزدوروں سے امن اور اراضی کا وعدہ کرنے کے بعد لنن کو مزدوروں
کی قوت حاصل ہوئی اور اس نے جرمنی سے صلح کر کے جنگ سے پیچھا چھڑایا۔ لیکن سوال اراضی کا حل
کرنا گویا لوہے کے چنے چبانے تھے۔ یہہ کہنا آسان تھا کہ "زمین قومی ملک ہے۔ تم اسے لے لو۔
اور اگر ضرورت ہو تو زمین داروں کو سولی پر لٹکا دو۔ جو کچھ ہو گا سوئٹ اس سے نبٹ لے گا"۔ غریب دیہاتیوں
نے زمینداروں کو مار بھگایا۔ بہتوں کو جان سے مار ڈالا۔ گھروں کو لوٹ لیا اور جلا کر خاک سیاہ کر دیا زمینیں
آپس میں تقسیم کر لیں اور کاشت کرنے لگے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے کھانے کے بعد جو کچھ بچ رہتا
ہے اسے حکومت لے لینا چاہتی ہے تاکہ شہری مزدوروں کی خوراک کا انتظام کیا جائے تو انھوں نے
زیادہ کاشت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بدلے میں جانوروں کے ضبط ہو جانے کا جو ڈر پیدا ہوا
تو انھیں بھی ذبح کر ڈالا۔ یہہ حالت ایسی تھی کہ اگر ان پر کسی قسم کی سختیاں کی جاتیں تو اس سے زیادہ مایوس
کن نتائج پیدا ہوتے۔

اگرچہ کاشت کار ایک طرف تو مارکسی اصول کے ساتھ ہٹ دھرمی کر رہے تھے اور دوسری
طرف انھیں یہہ ڈر لگا ہوا تھا کہ پرانے زمیندار کہیں پھر واپس آ کر ان پر ظلم نہ ڈھانے لگیں۔ سب سے زیادہ
تعجب خیز بات یہہ تھی کہ کسی دیہات کے جلاوطن کئے ہوئے زمیندار کا انتقال ہو جاتا تو اس کی موت
کی خبر حکومت کو ہونے سے پہلے گاؤں والوں کو ہو جایا کرتی تھی۔ جس وقت انقلاب کے خلاف
ملک میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو دیہاتی بھی سمجھے کہ زمیندار واپس آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ٹراٹسکی
نے جو ایک ہوشیار فوجی اور جوشیلا مقرر تھا انقلاب کی محافظت کے لئے مزدوروں کو طلب کیا جو گاؤں
سے ابلتے ہوئے کوہ آتش فشاں کی طرح نکل پڑے۔ فوج کی تھوڑی بہت کمی پوری کرنے کے لئے

قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ ٹراٹسکی اس مہم کا سرغنہ تھا۔ اٹھارہ مہینے تک اس کا دفتر ریل کے ایک ڈبہ میں رہا۔ دوسرے کمانڈر ٹراٹسکی کی بساط پر مہروں کی طرح کام کرنے کے لئے تیار نہ تھے خصوصاً اسٹلین اپنے آگے کسی کی نہ سنتا تھا۔ اسے ٹراٹسکی کے منصوبوں کی ذرا بھی پروا نہ تھی کیونکہ وہ خود جو کچھ کرتا تھا اُس میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوتی تھی۔ اس نے آخر کار لینن سے کہہ دیا کہ روس میں یا تو میں رہ سکتا ہوں یا اسٹلین۔ لینن نے کسی نہ کسی طرح حالات کو سازگار بنا لیا لیکن اسٹلین اور ٹراٹسکی کے درمیان اختلافات کی ایک بڑی خلیج حائل ہوگئی جس کا انجام یہہ ہوا کہ ٹراٹسکی کو جلاوطن ہونا پڑا اور بہت سے بالشوک موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ کیونکہ انقلابی فطرتیں کبھی نہیں بدلتیں اور یہہ ایک مسلمہ امر ہے کہ انقلاب کو برقرار رکھنے کے لئے انقلابیوں کو نیست و نابود کر دینا چاہیئے۔

روسی تعلیم بہت گراں تھی کیونکہ ہمارے ہاں کی تو تھی نہیں کہ بچّوں کو اٹھا کر مدرسوں کو بھیج دیا جنھیں دوسرے معنوں میں جیل خانہ سمجھنا چاہیئے وہ نو برس کے سن تک نہ تو اپنی زبان صاف طور پر بول سکتے ہیں اور نہ خط لکھ سکتے ہیں۔ انھیں وظیفہ دے کر کسی ایسی جامعہ کو بھیج دیا جاتا ہے جہاں معیار قابلیت بڑھنے کی بجائے اور گھٹ جاتا ہے اور وہ نظام سرمایہ داری میں گرفتار ہو جاتے ہیں روسی جامعات اگر ذرا بھی اشتراکی قوم کے راستہ میں حائل ہوتیں تو لکھوکھا روسی بچّوں میں سے ایک فی صد بھی ان جامعات میں نہ شریک ہوتے۔ روس کو ایسی جامعات کی ضرورت تھی جو کاشت اور مختلف شعبہ ہائے فنون کی تعلیم دے سکتی ہوں لیکن مزرعہ میں مختلف فنون سکھانے کے لئے ایک ایسے دار التجربہ کی ضرورت تھی جس میں قیمتی سے قیمتی آلات موجود ہوں۔ ان کے خریدنے کے لئے ایک کثیر رقم درکار تھی لیکن کوئی حکومت قرض دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ بہت سی حکومتوں نے تو کسی شرط پر بھی تجارت کرنے سے انکار کر دیا۔ بہرحال سوئٹ کو کسی نہ کسی طرح خود اپنے ہاتھوں اپنا انتظام کرنا تھا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے شروع کیوں کر کیا جائے۔ کارخانے تو بند ہو ہی چکے تھے۔ اب انھیں از سر نو چلانے کے لئے یا تو پُرانے کام کرنے والوں کو بلانا پڑا اور یا خود اشتمالی جماعت میں ڈھونڈنا پڑا جو اس کام کو اپنے سر لے کر جیسا بھی بنے چلائے۔

اِدھر پبلک ملازمین نے لاپروائی برتنی شروع کر دی تھی جس کی وجہ سے ایک عام بدنظمی پیدا ہوگئی۔ لہٰذا یہہ ضروری تھا کہ پولیس کا انتظام کیا جائے جو ان کاہلوں اور مفت خوروں کی خبر لے۔

اس مہم کے لئے ایک جماعت تیار کی گئی جسے شیکا (Tcheka) کہتے ہیں۔ پبلک ملازمین میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے میں شیکا بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اس کی سختیوں کی وجہ سے عوام یہہ محسوس کرنے پر مجبور ہوئے کہ فوجی کام کی طرف سے اگر ذرا بھی غفلت برتی گئی تو وہ گولی سے مار دئے جائینگے حکومت نے امریکہ کے ماہرین فن کو طلب کیا کہ وہ یہاں کے مزدوروں کو کارخانے بنانا اوران کو چلانا سکھائیں۔ ان کی رہنمائی میں فولاد اورشیشہ کے جدید ترین کارخانے کثرت سے قائم ہوگئے۔

کارخانے قائم تو ہوگئے لیکن کام کرنے والے وہی کاشتکار یا وحشی لوگ تھے جنھوں نے ہر چیز برباد کردی۔ انھیں یہہ بھی نہ معلوم تھا کہ ایک تیز رفتار مشین کو بنڈی کے پہیوں سے زیادہ تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے چارے انجینیروں نے اپنا سر پیٹ لیا اوران سے جب یہہ دریافت کیا گیا کہ کارخانے مال کیوں نہیں تیار کررہے ہیں تو سوائے اس کے اور کیا جواب دیتے کہ مزدوروں کی موجودہ حالت میں کسی قسم کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ بہرحال حکومت کو کسی نہ کسی طرح کام چلانا تھا۔ مجبور ہوکر بلجیم۔ جرمنی انگلستان اور خصوصاً امریکہ سے ماہرین فن کو بڑی تعداد میں بلوایا تاکہ وہ پوری طرح رہنمائی کرسکیں۔ کارخانے پھر چلنے لگے اور مال تیار ہونے لگا۔

ادہر "نپمن" ((Nep men)) نے کسی نہ کسی طرح حالات پر قابو پالیا اوراسی طرح کلک ((Kulak)) نے بھی مدد دی۔ کلک وہ زمیندار تھے جن کے پاس بڑی بڑی زمینیں تھیں اورجو ۱۰-۱۵ کے طور پر مویشی، گھوڑے، اور مزدور وغیرہ رکھتے تھے شروع میں تو بالشوکوں نے مارکسی اُصول کے تحت ان لوگوں کو دھکے دے کر نکال دیا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہہ ہوا کہ زمینیں ویران ہوگئیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے ٹالسٹائے کی لڑکی سے ملاقات کی تھی۔ اس نے اپنے گاؤں کو جو ایک زمانہ میں سبزہ زار تھا ریگستان کی سی افسوس ناک حالت میں دیکھ کر اشتراکیوں کو بہت کچھ برا بھلا کہا۔ اس کا بگڑنا حق بجانب تھا کیونکہ کلک کو بے دخل کردینا جس طرح دو کانوں کو ضبط کرلیا گیا تھا اشتراکین انگلستان" کی مخالفت میں ایک بڑی احمقانہ غلطی کا ارتکاب تھا۔ جب "این۔ای۔پی" (نئے معاشی رویہ) کا اعلان ہوا تو حکومت کو نکالے ہوئے کلک کو واپس بلانے پڑے اور انھیں اجازت دی گئی کہ اپنی کاشت جاری رکھیں جب تک کہ انقلاب پایہ تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔

شاہی خاندان بے چارہ بڑا بدقسمت تھا۔ لبرل انقلاب نے جب اسے تخت سے

اتار دیا تو "کنسکائٹ" کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے ساتھ کس طرح برتاؤ کیا جائے۔ انگریزی اور فرانسیسی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر انقلابی عدالت قائم کی جاتی اور زار کا سر اڑا دیا جاتا تو یہ شاہی خاندان پر بہت بڑا ظلم ہوتا۔ جب بالشویکوں نے برس کو ہٹا دیا اور اشتمالی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہونی شروع ہوئیں تو اس وقت بھی انہوں نے کوئی نئی حرکت نہیں کی۔ زار اور اس کے خاندان کو اور ایک مقام کو منتقل کر دیا گیا۔ لیکن ایک رات میں اچانک بندوقوں سے مسلح ایک جماعت زار کے مکان میں داخل ہو گئی۔ زار کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اور نصف منٹ میں اس کا لڑکا اور اس کی لڑکیاں خاک اور خون میں لوٹ رہی تھیں۔ صرف اسی پر بس نہیں کی گئی بلکہ ان کے مردہ جسموں کو جنگل لے جایا گیا اور ان پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ یہ مسلح جماعت زیکس کی تھی جو مازرک کی قیادت میں قومی آزادی حاصل کر چکے تھے۔

یہاں میں انہیں غلطیوں پر بحث کر رہا ہوں جن سے اگر سوئٹ اشتراکیت چاہتی تو اپنا دامن بچا سکتی تھی۔ بہر حال ہیں ان ذہنیتوں کو جو سرمایہ داری کے خلاف ہیں نفسیاتی اصول پر جانچنا چاہیے سرمایہ داری کے خلاف بالشویک آگ بگولا ہو ہی رہے تھے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سارے کل پرزوں کو جتنا ہو سکا توڑ پھوڑ ڈالا۔ حساب کتاب غلط کر دئے۔ یہاں تک کہ کاشت کے بیجوں کو ضائع کر دیا۔ جن پر آئندہ کاشت کا دارومدار تھا۔ البتہ یہ بہت اچھا کیا کہ وہ لوگ جو عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور جن میں مزدوروں کی غربت اور تکالیف کا ذرا بھی احساس نہ تھا ان کے گھروں پر حملہ کر دیا کمروں کی تلاشی لی۔ آمدنیاں ضبط کرلیں۔ ان سے متنفر ہو گئے۔ ان کے بچوں کا داخلہ مدرسہ میں بند کر دیا تاکہ غریب بچوں کو پہلے موقع ملے ـــــ یا وہ کلک جن کے پاس لہلاتی کھیتیاں تھیں اور کئی جانور۔ انھیں نکال دیا گیا کیونکہ ان کے بدقسمت پڑوسی فاقوں سے مر رہے تھے۔ ان انقلابیوں کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے سوائے اس کے کہ انتقام کی آگ ان کے سینہ میں بھڑک رہی تھی۔ انھیں خواہ کچھ بھی نہ ملے لیکن وہ انتقام کی پیاس بجھا کر اپنے دل کو تسکین دینا چاہتے تھے۔ سرمایہ داریہ چاہتا ہے کہ مزدور اور ملازم ان کا احترام کریں۔ لیکن یہ تمنا شائد آئندہ پوری ہوگی کیونکہ سرمایہ داری کے خلاف منافرت پھیلتی جا رہی ہے۔ خوش قسمتی سے ان کی اولاد جو ایسے رسوا کن ماحول میں تربیت پانے سے محفوظ رہی اس نئے نظام کو بالکل فطری اور جائز سمجھ رہی ہے۔

عورتوں نے بھی اس انقلاب کا خیر مقدم کیا لیکن چند خواتین کسی فریب خیال میں مبتلا تھیں ۔
انھوں نے خیال کیا تھا کہ مزدوروں کی آمریت جنسی تعلقات کے لئے عام اجازت دے دیگی اور
سماج کے ضروری بندھنوں سے آزاد کر دے گی۔ سویٹ اگرچہ اپنی زندگی میں اتنے ہی سخت تھے
جتنے کہ مذہبی احکام ہوا کرتے ہیں لیکن انھوں نے شروع میں ناسمجھ عورتوں کی بے راہ روی کو نظر انداز
کر دیا اور اخلاقی اصولوں کی اصلاح کرنے کے لئے مسئلہ طلاق میں انتہائی آسانیاں پیدا کر دیں۔ اسکول
کی تنظیم کو تو بالکل ہی فراموش کر دیا تھا لیکن ان غلطیوں کے اتنے برے نتائج نکلے کہ انھوں نے اپنی
اصلاح آپ ہی کر لی اور اب موجودہ ذہنیت ربیلشن کلیسائے تھیلما (Rabelaisian
Abbey of Thelema) کی طرف جانے کے بجائے جہاں کی تعلیم تھی کہ "تم جو چاہو کرو"
مذہبیت کی طرف زیادہ رجوع ہو رہی ہے۔ میں دوبارہ پھر ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے ان بُرے
نتائج سے کوئی بحث نہیں جن کا کسی ردعمل کی وجہ سے پیش آنا لازمی ہے اور جو بعد میں اپنی اصلاح آپ
کر لیتے ہیں جیسا کہ ہر سوسائٹی میں ہوا کرتا ہے بلکہ ان غلطیوں سے غرض ہے جن کا ازالہ اگر نہ کیا گیا تو سرمایہ
داری کے مضر اثرات پیدا ہو جاتے ہیں ۔

آمدنی کی مساوی تقسیم جو اشتمالیت کا آخری اور اہم جزو ہے مارکس کی تعلیم میں داخل نہیں
جس نے شخصی جائداد کی تباہ کاریوں کو ختم کر دینا چاہا تھا۔ جب "نیا معاشی رویہ" عام خوش حالی پیدا
کرنے میں ناکام رہا اور سویٹ حکومت کی حالت آجر (Employer) کی سی ہوتی چلی
گئی تو اس نے محسوس کیا کہ منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے اسٹیشن ماسٹروں کو اور کارخانہ میں
کام کرنے والوں کو جو پڑے ہوئے مست پڑے رہتے ہیں گولی سے اڑا دینے میں صورت حال
کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔ اور نہ وہ جوشیلے رضاکاروں کے جتھے ہی کچھ کر سکے جو عملی طور پر کام سکھانے
کے لئے دورہ کرتے رہتے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ نظام سرمایہ داری کا وہ قاعدہ اختیار
کر لیتے جس کے ذریعہ سے کاموں کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ہر ٹکڑے کی نوعیت
کے لحاظ سے کم زیادہ مزدوری مقرر کی جاتی ہے تاکہ ہر مزدور اپنی مزدوری میں اضافہ کرنے
کے لئے اپنے فنی معیار کو بڑھائے اور اپنی حالت کو جلد سے جلد بہتر بنالے۔ ان غیر مساویانہ
صورتوں کو دیکھ کر بالشوی رہنما اب بھی اس بات کی تردید کرتے ہوئے غلطی کرتے ہیں کہ آمدنی کی

مساوی تقسیم اشتراکیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اور بھی غلطی کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ تقسیم کار اور ان کی کم زیادہ مزدوری کا مقصد کام کرنے والوں کی فطری اہلیتوں میں امتیاز پیدا کرنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ صنعت کی طرف بہت کم مائل ہوتے ہیں۔

اس کو صحیح طور پر یوں سمجھایا جا سکتا ہے کہ فطری اہلیتوں میں جسامت میں۔ وزن میں۔ حسن میں۔ عقل میں یا شہرت میں عمرو۔ بکر۔ اور زید کے درمیان اختلافات ہی کیوں نہ ہوں لیکن کھانے پینے اور رہنے سہنے کے اخراجات بالکل یکساں ہیں۔ ان کی حالت مساوی بنانے کے لئے اگر پہلا قدم اُٹھانا ہے تو یہ تصفیہ کرنا چاہیئے کہ ملک ہر ایک کی ضروریات کہاں تک پوری کر سکتا ہے۔ اس وقت تقریباً ہر ملک میں آمدنی کی مساوی تقسیم ہے لیکن اس کا معیار ایک غیر ماہر فن مزدور رکھا گیا ہے اگر اشتراکی حکومت ہر ایک کی آمدنی کو اس معیار تک کم کر دے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اعلیٰ درجہ کی دماغی قوتیں اور قابل اعتماد رہنمائی باقی نہ رہے گی۔ مثلاً ریاضی داں۔ انجینیر۔ ماہر طبیعات مفکر۔ وکلا۔ مدبرین۔ سپہ سالار صرف یہی نہیں بلکہ شعرا۔ نقاش۔ اداکار۔ حسن کار جو دنیائے حیات کے لئے بے حد ضروری ہیں ان میں اور عام لوگوں میں ضرور امتیاز ہونا چاہیئے اس وقت تک جب تک کہ عام لوگ ان کے معیار کو نہ پہونچ جائیں۔ ایک لوہار جو صرف ایک لوہے کی چادر تیار کرتا ہے اگر اپنی آمدنی کو دونی کرنے کیلئے دو بنانے لگے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ نظام سرمایہ داری میں ایسے چند اور اُصول ہیں جو قابل قبول ہیں نہ کہ قابل رد۔ لیکن جب عوام کا معیار بلند ہو جائے تو آمدنی پر ٹیکس لگانے یا شخصی جائداد پر پابندیاں عائد کرنے کی ہر تجویز بروئے کار لانی ہوگی تاکہ وہ سب ایک رشتہ میں منسلک ہو جائیں۔ کسی قوم کے اتحاد کو اگر زندہ رکھنا ہے تو یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی آمدنی کی تقسیم مساویانہ ہو۔

یہ میرے لئے ناممکن ہے کہ سوئٹ حکومت کے حیرت ناک کارناموں کی ایک مفصل فہرست آپ کے سامنے پیش کروں۔ اس کے لئے ہزار صفحے چاہئیں سڈنی اور بیاٹرس دب (اشتراکین انگلستان) اس پر کافی لکھ چکے ہیں اب صرف اتنا نوٹ کرنے کے لئے رہ جاتا ہے کہ ۱۹۲۸ء میں ٹراٹسکی اور اسٹیلن میں صرف اس سوال کی بنا پر اختلافات پیدا ہو گئے تھے کہ روس کو آیا سارے یورپ کے مزدوروں کی قیادت کرنی چاہیئے تاکہ ہمیشہ کے لئے سرمایہ دار حکومتوں سے ایک

مستقل انقلابی جنگ کی صورت پیدا ہو جائے (نظریہ ٹراٹسکی) یا وہ خود اپنے ہی معاملات سے وابستہ ہو جائے اور اپنے ملک میں ایک قابل تقلید نظام اشتراکیت قائم کرے (نظریہ اسٹلین) "اشتراکیت ایک ہی ملک میں" یہ الفاظ اسٹیلن کے تھے جن کی وہ پوری طرح وکالت کر رہا تھا۔ ٹراٹسکی کا جلا وطن ہونا اسٹیلن کی فتح نہ تھی بلکہ عقل سلیم کی فتح تھی۔ نئے "ٹراٹسکیسٹ" کا آج کل مطلب ہی یہ ہے کہ "اسٹیلیت" کے خلاف جنگ کرے جو یہ کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اشتراکیت بیرونی اتحاد کے بغیر اور مشرقی مغربی سرمایہ دار اتحادیوں کا خیال نہ کر کے سرسبز و شاداب رہ سکتی ہے۔

(ماخوذ از برنارڈ شا)

سید منظور الحسن ہاشمی

سال سوم

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گُل سے کلام پیدا کر

ترا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

(اقبالؒ)

دُمدار ستارے

عقل انسانی کے لئے آسمانی دنیا ہمیشہ ایک معمہ بنی رہی رفتہ رفتہ قابل ہستیوں کی انتھک کوششوں کا یہہ نتیجہ ہوا کہ ہم کو بعض قیاسات اور ممکنات کو حقیقت کی روشنی میں مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ زمانہ گذرتا گیا قیاسات ممکنات اور ممکنات واقعات میں تبدیل ہوتے گئے ان بزرگ ہستیوں کی کوششوں سے اب اسرار آسمانی کا پہلا پردہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے سے اُٹھ چکا ہے لیکن جو کچھ ہم جانتے ہیں اور جو ہم نہیں جانتے اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسحاق نیوٹن جیسے ماہر فلکیات نے کہا ہے کہ اس کی حیثیت بھی محض ایک بچّہ کی سی ہے جو ایک ناپیداکنار سمندر کے کنارے کنکریاں چُن رہا ہو۔ بایں ہمہ ان تمام انکشافات کے یہہ دنیا اب بھی ایک سربستہ راز ہے دُمدار ستارے بھی ایک عرصہ تک دنیا کو دعوت غور و فکر دیتے رہے اور اب ایک صدی کی اس غور و فکر کے بعد ہمارے ہاں قیاسات اور ممکنات کا ایک ذخیرہ جمع ہو چکا ہے دُمدار ستارے ہمارے لئے کوئی نئے نہیں کیونکہ دنیا انھیں پہلے بھی جانتی تھی۔ پلینی (Pliny) جیسا شہرۂ آفاق مورخ ۸ءہ قبل مسیح کے دُمدار ستارے کی نسبت لکھتا ہے کہ سیزر (Caesar) اور پمپی (Pompey) کی لڑائی میں ان بڑے اثرات کی ایک مثال ملتی ہے جو کہ دمدار ستارے کے نمودار ہونے کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں . . وہ خوفناک ستارہ جو حکومتوں کا تختہ الٹ دیتا ہے پورے اہتمام کے ساتھ شعلہ انگیز تاروں کو اپنے جھرمٹ میں لئے ہوئے آسمان پر نمودار ہوا۔ ہالی (Halley) کے مشہور دُمدار ستارے کے متعلق سارے واقعات بہت ہی وثوق سے پیش کئے جا سکتے ہیں یہی وہ پہلا دُمدار ستارہ ہے جس کے متعلق ہمیں کافی معلومات حاصل ہیں کیونکہ اب تک اس کے کئی دورے ہو چکے ہیں یہہ ستارہ ۱۲ اپریل ۸۳۷ء کو چین اور روم میں دیکھا گیا اور اس وقت کی تصویر " خوفناک خونی ستارہ " کے الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔ کچھ عرصہ بعد ہی شہنشاہ مارکینس (Marcinus) کا انتقال ہو گیا پھر آٹلا (Attila) کی موت سے پہلے وہ ۳ جولائی ۴۵۱ء کو نظر آیا۔ مالمبری (Malmesbury) کے ایک راہب نے اپنے ملک کی خطرناک حالت کو محسوس کرتے ہوئے اس دمدار ستارے کو اس طرح

مخاطب کیا تھا "میں تم کو دیکھ رہا ہوں جو ماؤں کے آنسوؤں کا باعث ہے میں تمہیں بہت زمانے سے دیکھ رہا ہوں لیکن تم اب بہت خوفناک نظر آرہے ہو کیونکہ تم میرے ملک کو تباہی و بربادی کی دھمکیاں دے رہے ہو" اس کے بعد ہم اس دُمدار ستارے کی مثال دے سکتے ہیں جس کے برے اثر کی وجہ سے دنیا نواب عغزان مکان اور ایڈورڈ ہفتم جیسے جلیل القدر حکمرانوں سے محروم ہو گئی۔ اُس زمانے کا حال کسی بڑھیا ہی سے سُنیں تو ہمیں اس کا کچھ اندازہ ہوگا۔ آسمان پر تاروں کی لانبی قطار جس کی وضع قطع جھاڑو سے ملتی جلتی ہے (اسی لئے اُسے جھاڑو تارہ بھی کہا جاتا ہے) نظر آئی۔ لوگ مارے دہشت کے مکانوں میں پڑے رہتے تھے اور کوئی نامعلوم خوف انہیں بے چین کرتا تھا۔ عوام کی دہشت بے وجہ نہ تھی۔ خود دُمدار ستارے کی شکل کچھ ایسی ہیبت خوفناک اور خونی ہوتی تھی کہ لوگ خوف و ہراس سے پریشان رہتے تھے اس کے علاوہ یہہ خیال انھیں اور بھی پریشان کرتا تھا کہ دمدار ستارہ زمین کے اتنا نزدیک آجاتا ہے کہ یہہ بہت ممکن ہوتا ہے کہ وہ ہماری فضا میں بھی آجائے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا آسمان پر نمودار ہونا کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ اس کو جنگ قحط اور ساری دنیا کی بدامنی کا پیش خیمہ قرار دیا جاتا تھا۔

سب سے پہلے ہم ان دُمدار ستاروں کے ناموں کے متعلق کچھ کہیں گے ان کے نام دینے کا طریقہ بہت آسان ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ نے ۱۹۴۰ء میں ایک دُمدار ستارہ دریافت کیا اور اپنی اس دریافت کی اطلاع آپ نے کسی مستند رصدگاہ کو دے دی اور پھر اس کے جائے وقوع کے متعلق بھی اپنے تمام اندراجات بھی بھجوا دیئے تو یہہ سب معلومات بذریعہ ٹیلیگراف یا کسی اور ذریعہ سے دنیا کی ساری رصدگاہوں تک پہنچا دی جائیں گی اور ہر جگہ (جہاں کہیں وہ نظر آسکے کیونکہ جب کوئی ستارہ جنوبی کرۂ ارض والوں کو نظر آتا ہے تو شمالی کرہ والے اس کے وجود سے بے خبر ہوتے ہیں) اسے دوربین سے دیکھا جائے گا اور کئی اندراجات کئے جائیں گے اور بعد میں ان تمام اندراجات کی مدد سے اس کا مدار (orbit) اور کئی متعلقہ معلومات حاصل کر لی جائیں گی فرض کیجئے کہ یہہ ستارہ ۱۹۴۰ء کے سال کا پہلا دُمدار ستارہ ہے تو پھر اس کا نام یہہ ہوگا ۱۹۴۰-۱-I یعنی سب سے پہلے سال پھر اس سال کی دریافتوں میں اس کا سلسلہ واری نمبر اور پھر دریافت کنندہ کا نام۔ مشہور ماہر فلکیات پانس (Pons) اس میدان کا مرد تھا اور اس کے نام سے کئی ستارے موسوم کئے گئے ہیں مثلاً ۱۸۰۸-۱-پانس وغیرہ۔

دُمدار ستارے کے عموماً دو جزو ہوتے ہیں ایک تو اس کا سر اور دوسرا اس کی دُم، گو ہم ان

کھینچتی ہے اور یہ قوت کشش فاصلہ اور چیزوں کے حجم پر موقوف ہوتی ہے۔

اب ہم موضوع کے سب سے اہم مبحث کی طرف رجوع ہوتے ہیں یعنی دُمدار ستاروں کی اصل اور اس کی حقیقت۔ اور پھر وہ آتے کہاں سے ہیں؟۔ اس موضوع پر مختلف اصحاب نے مختلف اوقات پر قیاس آرائیاں کیں۔ بلحاظ قیاسات ہم ان اصحاب کو تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے گروہ کا خیال ہے کہ دمدار ستارے نظام شمسی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ وہ کسی اور نظام کے تابع ہیں۔ دوسرے گروہ کو اس کا یقین ہے کہ سورج ہی ان کی اصل ہے تیسرا گروہ مختلف بڑے بڑے سیاروں کو ان کی اصل اور ان کا جداعلیٰ گردانتا ہے پہلے گروہ کے ایک مفکر کی بحث کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، ہم اپنی بحث کو اس نظریہ سے شروع کرتے ہیں کہ دمدار ستارے کسی بیرونی دنیا سے ہمارے نظام شمسی میں داخل ہوئے بعض لوگ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے انہیں اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا کہ کس طرح دمدار ستاروں کا مادہ اُس نامعلوم دنیا میں پیدا ہوا۔ مگر یہ ان کی غلطی ہے کیونکہ ہمیں ہر نظریہ میں مادے کی حقیقت پر ٹھہر جانا پڑتا ہے نظام شمسی کی اصل اور ابتدائی حالت کو اگر دھویں اور ہوائی مادہ کی صورت سے ظاہر کریں یا ایک قسم کی گرد سے یا ان دونوں کے مجموعہ سے تو بھی اگر ہم سے یہ پوچھا گیا کہ یہ ہوائی مادہ اور یہ گرد کہاں سے آئی تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے اس کے بعد بھی اگر ہم کہہ سکیں کہ یہ مادہ ا، ب، ج کی مختلف تبدیلیوں سے عالم وجود میں آیا تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس طرح ا، ب، ج عالم وجود میں آئے۔ ایسی حالت میں ہمیں اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اس لحاظ سے دُمدار ستارے جیسی نامعلوم چیز کی اصل تاروں کی وہ دنیا ہی ہو سکتی ہے جس کے متعلق بھی ہمارے معلومات اتنے ہی محدود ہیں کہ جتنے دُمدار ستاروں کے مادے کے" لیکن یہ قیاس بہت دور از کار معلوم ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دمدار ستارے ایک نامعلوم دنیا سے ہوتے ہوئے ہمارے اس نظام میں داخل ہوتے ہیں اور یہاں سے پھر وہی دنیا میں واپس ہو جاتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دمدار ستارے دراصل اس نامعلوم دنیا کی پیداوار ہیں حقیقت سے دور اور واقعات کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے گروہ کے نظریہ کی موافقت میں ہم دو اہم چیزیں پیش کر سکتے ہیں پہلی بات یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شمسی فضا میں ایسی بلندیاں اور گیسوں کے ایسے آتش فشانی مادے کافی رفتار سے

حرکت کرتے رہتے ہیں اور وہ مادے کی ایک معتدبہ مقدار کو وہاں سے دور پھینک سکتی ہے ان بلندیوں اور ان آتش فشانی چیزوں کو ڈاکٹر جارج ای ہال کے مشہور (Spectro Heloscope) اسپکٹرو ہیلو سکوپ سے ہم خود دیکھ سکتے ہیں اس کی مدد سے ہم سورج کے ان شعلوں کو دیکھ سکتے ہیں جو کہ نہ صرف اس کے ایک حصہ پر بلکہ اس کی سطح سے اُٹھتے رہتے ہیں یہہ شمسی بادل فلکیات کے طالب علم کو دعوت نظارہ دیتے ہیں اور یہہ چیزیں اپنی رنگین وضع قطع اور تیزی سے تبدیل ہونیکی وجہ سے بہت ہی دلچسپ اور جاذب نظر بن جاتی ہیں بعض حصے تو ۲۰۰ میل فی ثانیہ کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں۔ اس نظریہ کی موافقت میں ایک اور چیز بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ دُمدار ستاروں اور شہاب ثاقبی طیف (Spectrum) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ہائیڈروجن اور اس کے مرکب کی ایک کافی مقدار موجود ہے اس کا یہہ مطلب ہے کہ اس کی اصل ایسے مادے کی ہی ہو سکتی ہے جو سورج جیسا ہی ہو کیونکہ سورج میں ہائیڈروجن وغیرہ کی ایک خاصی مقدار موجود ہے۔ ان تمام چیزوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہم یہہ کہ سکتے ہیں کہ یہہ نظریہ ایک حد تک ٹھیک ہے لیکن اس پر جو ایک صحیح اعتراض ہو سکتا ہے اور جو ہوا ہے وہ یہہ ہے کہ اس مادہ کی رفتار اتنی نہیں ہو سکتی کہ وہ سورج کے اثر سے باہر جا سکے اسی لئے وہ پھر اس کی سطح پر گر جاتا ہے (سورج سے باہر جانے کے لئے کم از کم ۳۸۳ میل فی ثانیہ کی رفتار چاہیئے) یہہ اعتراض اگر دور ہو جائے تو کوئی امر ہمیں اس نظریہ کے نہ جاننے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے اگر سورج سے پھینکے ہوئے مادے کی رفتار ۳۸۳ میل فی ثانیہ سے بھی کم ہو تو مادہ سورج پر واپس گرے گا اگر ایسے وقت سیاروں کے اثر سے مادے واپس نہ جائے تو وہ ایک دمدار ستارے کی حیثیت سے گردش کرنے لگے گا اور اس کا راستہ بھی سورج کے نزدیک اور بین بین ہوگا۔ ۱۶۸۰، ۱۸۴۲، ۱۸۸۰ اور ۱۸۸۷ کے دُمدار ستاروں کے گروہ ایسے ہی راستوں پر گردش کرتے ہیں اور ان ستاروں کے لئے ایک شمسی اصل ناممکن نہیں معلوم ہوتی لیکن ایسے بہت سے دُمدار ستارے بھی ہیں جن کا سورج سے قریبی فاصلہ بھی زمین کے سورج سے قریبی فاصلہ سے بھی زیادہ ہے اور ان کے لئے یہہ نظریہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد ہم تیسرے نظریہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں اس نظریہ کے لحاظ سے ان تمام دُمدار ستاروں کے جد اعلیٰ یہی چند بڑے سیارے ہیں اس کے سمجھنے کے لئے ہم کو فرض کرنا پڑے گا

کہ ایک سیال مادہ بڑی تیزی سے اپنے محور پر گھوم رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک مخصوص راستہ پر بھی حرکت کر رہا ہے۔ یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ سیال مادہ جب تیزی سے گھومتا ہے تو اس کے بعض اجزا ار مادہ سے الگ ہو جاتے ہیں اور ایک دوسری جگہ خود گھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس مثال میں ہم نے سیال مادے کا ذکر کیا تھا یعنی ان تمام سیاروں کی مادی حالت جب ایک سیال شئے کی سی تھی تب ان دمدارستاروں کا ورود ہوا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لاکھوں برس پہلے عالم وجود میں آئے لیکن یہ حقیقت کے خلاف ہے کیونکہ عموماً دمدارستاروں کی عمر لاکھوں برس کی نہیں بلکہ کچھ ہزار سال کی ہوتی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ پرانے ستارے اب ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں اور وہ ہمیں نظر نہیں آرہے ہیں وجہ شاید یہی ہو کہ وہ کسی دوسری چیز سے ٹکرا گئے ہوں یا ان کا راستہ ہی بدل گیا ہو۔ ان پرانوں کی جگہ نئے دمدارستاروں نے لے لی ہے۔ ان چیزوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دمدارستارے اب بھی پیدا ہو رہے ہیں اور یہ کہ وہ اپنی عمر کے اختتام پر ایک نامعلوم طریقہ پر فنا ہو جاتے ہیں یا ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ان بڑے سیاروں میں "آتش فشانیاں" اب بھی ہو رہی ہیں۔ اگر یہ نظریہ صداقت پر مبنی ہو تو حقیقت میں ایسا ہی ہونا چاہیئے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ مشتری کی سطح پر سفید دھبے اس امر کے شاہد ہیں کہ وہاں بھی آتش فشانیاں ہمیشہ ہوا کرتی ہیں زحل پر بھی ایسے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ خود زمین پر بھی بعض اوقات خوفناک قسم کے دھماکے ہوا کرتے ہیں جیسا کہ ۱۷۸۳ء کے اسکپٹرجوکل Skaptar jokull کے ۱۸۸۳ء کے کراکٹور Krakatoa کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ بہر حال ان سب چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل سیارے ہی دمدارستاروں کے جداعلیٰ ہیں۔ لیکن یہ نظریہ بھی ان دمدارستاروں کے سلسلہ میں بیکار اور ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، جن کا سورج سے قریبی فاصلہ بھی زمین کے قریبی فاصلہ کے کئی گنا ہو۔ ایسے اوقات میں ہم کو کسی اور حل کی تلاش کرنی پڑتی ہے اس نہ سلجھنے والی گتھی کا جو دوسرا حل پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب دمدارستارے اس کے بکھرے ہوئے اجزا ار میں جو ہمارے نظام شمسی کا جداعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔

محمد شوکت علی (سال چہارم)

کیفِ حیات

اے کہ تو ہے آسمانِ حسن کا ماہ تمام
اے کہ تو ہے بادۂ اُلفت کا اک لبریز جام

اے کہ تو ہے تاجدارِ کشورِ نازوادا
ناخدا ہے حسرتوں کا آرزوؤں کا خدا

اے کہ تو ہے ماہ خوبی نیّر برج کمال
تیرے جلوؤں سے منوّر میری دنیائے خیال

قلزم خوبی کا تو اک گوہر نایاب ہے
یا ریاض حسن کا کوئی گلِ شاداب ہے

یا سراپا غیرتِ حسنِ بتان آذری
صانع قدرت کی جس پر ختم ہے کاریگری

مست آنکھوں میں شراب ارغوانی ہے نہاں
اور تبسم میں ترے پوشیدہ لاکھوں بجلیاں

روئے زیبا سے عیاں ہے جلوۂ قدرت کا نور
نازنیں پیکر سے تیرے صنعت حق کا ظہور

مرہم زخم جگر ہے تیری ہر دلکش ادا
دردِ دل کے واسطے تیرا تبسم ہے دوا

تیرے ہر انداز میں ہے سحر بھی اعجاز بھی
تو مجسم حسن بھی ہے اور سراپا ناز بھی

سرخیٔ عارض نہیں یہ لالہ زار حسن ہے
تیری رگ رگ سے عیاں جوش بہار حسن ہے

تیرے نظارہ سے برپا انقلاب آرزو
ذرہ ذرہ قلب کا مست شراب آرزو

روئے زیبا کی ترے جس کو میسر دید ہے
زندگی اس کے لئے اک راحت جاوید ہے

اک ترے دم سے ہے باقی لذت و لطف حیات
ورنہ اس دل کے لئے بے کیف ساری کائنات

عباس جعفری بی۔اے

ہندوستان کی صنعتی ترقی کے ذرائع

موجودہ متمدن ممالک کا رجحان یہہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے آپ کو معاشی نقطۂ نظر سے کسی اور کا دست نگر نہ رکھا جائے زراعت یقیناً بہت سی ضروریات پوری کرتی ہے مثلاً وہ آبادی کے لئے غذا، صنعت و حرفت کے لئے خام پیداوار اور برآمدات کے لئے بچت فراہم کرتی ہے لیکن دنیا کا کوئی ملک صرف زراعت ہی کے بل بوتہ پر متمول نہیں ہو سکتا۔ تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات بڑھتی ہی جاتی ہیں اور ان کی پابجائی کے سلسلہ میں زراعت کی بہ نسبت صنعت و حرفت زیادہ اہمیت اختیار کرتی جاتی ہے۔ جدید اصولوں کے لحاظ سے یہہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ زراعت میں معینہ مزدوروں کی تعداد سے تجاوز صنعت و حرفت پر خطرناک حد تک اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن ہندوستان اس اصول کو عملی جامہ پہنانے میں ہنوز دوسروں کی بہ نسبت بہت پیچھے ہے۔

ہندوستانی صنعتوں کی تعداد ۱۹۳۰ء کی اعداد شماری کی بموجب ۸۱۴۸ تھی۔ سرمایہ جو بڑے پیمانہ کی صنعتوں پر لگایا جا چکا تھا اس کا اندازہ سات سو کروڑ روپئے تھا لیکن اس سرمایہ میں ہندوستانیوں کا حصہ تین سو کروڑ سے زیادہ نہیں تھا صنعتی اداروں میں جو مزدور تھے ان کی تعداد ۱۹۳۰ء میں ۱۵,۵ لاکھ تھی یعنی جملہ کام کرنے والوں کی ایک فی صد تعداد۔ اس کے برخلاف زراعت سے متعلق جو مزدور تھے اُن کا اوسط ۶۶,۴ فی صد تھا ان اعداد شمار کو پیش نظر رکھ کر ایک غیر جانب دار نقاد یہہ کہہ سکتا ہے کہ یورپ اور جاپان میں خصوصاً جبکہ صنعتوں کی حیرت انگیز ترقی ہو رہی ہے ہندوستان روز بروز زرعی ہوتا جاتا ہے۔

صنعتی اداروں سے جن لوگوں کی کفالت ہو رہی ہے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے اُن کی تعداد ۱۸,۰۱۲,۱۶۷,۴۳ یعنی ۹,۴۹ ۱۰,۱ فی صد تھی۔ ۱۹۳۱ء کے اعداد شمار بتاتے ہیں کہ یہہ گھٹ کر ۹,۹۵ فی صد رہ گئی۔ مزدور جو ان اداروں میں کام کر رہے تھے ان کی تعداد

۹۲۳ ر۳۶۱ ر۱۵ یعنی ۴ ر۷ فی صد ۱۹۳۱ء میں تھی۔

ہندوستان میں مزدوروں کی ایسی تنظیم نہیں ہے جیسی مغربی ممالک یا جاپان میں موجود ہے۔ دوسرے یہہ کہ ابھی اس کی پوری تحقیقات اور مکمل معلومات حاصل نہیں کی گئی ہیں کہ کس صوبے میں کس چیز کی پیداوار ہے اور کس چیز کی کمی تاکہ درآمد و برآمد پر قابو پانے کی منظم کوشش کی جاسکے۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک جن اشیاء کی درآمد برطانوی ہند میں ہوئی ان کا رقمی اندازہ ۷ر۱۲۲ کروڑ روپے تھا۔ اتفاق کی بات یہہ ہے کہ درآمد کی ہوئی ان اشیا میں اسی فی صد اشیاء ایسی تھیں جو ہندوستان میں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ درآمد کے مقابلہ میں ہندوستان کی برآمد حیرت انگیز کم یعنی ۸۹ ر۱۵۵ کروڑ روپے تھی۔

موجودہ حالات کے تحت اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اپنی سہولت کے مدنظر صنعتوں کو تین شعبوں میں بڑے اوسط اور چھوٹے پیمانے پر ان کے سرمایہ کا لحاظ کرکے تقسیم کیا جائے اور باضابطہ طور پر صوبہ واری تخمے مرتب کئے جائیں تاکہ اعداد و شمار سے ان کے ضبط و نظم میں حسب ضرورت ترقی کے امکانات پیدا کئے جائیں۔ بڑے پیانہ کی صنعتیں عام طور پر ملک کی بنیادی اور اہم ترین صنعتیں ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے یہہ ضروری ہوجاتا ہے کہ انکی طرف خاصی توجہ کی جائے۔ ذیل کی چند صنعتوں کو مثال کے طور پر اس گروہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

معدنیات ــــــ اس میں مختلف قسم کی دھاتیں شامل ہیں۔

انجینیری صنعتیں ــــــ اس میں گیس اور تیل سے چلنے والی مشین، کل پرزے وغیرہ شامل ہیں۔

برقی صنعتیں ــــــ اس میں برقی رو سے چلنے والی مشین شامل ہیں۔

کیمیائی صنعتیں ــــــ اس میں ادویات وغیرہ شامل ہیں۔

روئی اور سن کی صنعتیں وغیرہ۔

متذکرۂ بالا صنعتوں کی جانب ملک کے سرمایہ داروں اور ماہرانہ فن کاروں کی توجہ بیحد ضروری ہے۔ اس خصوص میں ایک طرف تو کثیر سرمایہ، ماہرانہ فنی قابلیت اور منظم کوششوں کی ضرورت ہے اور دوسری طرف دوسرے ممالک سے مقابلہ اور مسابقت درکار ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ حکومت پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کی ہر طرح مدد کرے، حفاظتی قوانین نافذ کرے اور وہ

سب مواقع فراہم کرے جو سیاسی اقتدار مہیا کر سکتا ہے۔

سرمایہ داروں اور بڑے اداروں کو چاہئے کہ وہ صوبائی حکومتوں کو منظم کوششوں کی امداد پر آمادہ کریں۔ جہاں ضرورت کے مطابق سرمایہ فراہم نہ ہو سکے وہاں صوبہ کی حکومت کو چاہئے کہ اس کی تکمیل خود کرے یا قرض کی سبیل نکالے جیسا کہ سابق میں مرکزی حکومت نے ریلوے اور آب رسانی کے کاموں کے لئے کیا تھا۔ ہر سال یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ حکومت ریلوے یا آلات حرب کی ضروریات دوسرے ممالک کے صنعتی اداروں سے پوری کرتی ہے۔ بعض دفعہ تو یہ رقم تیس چالیس کروڑ روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر حکومت ایک آدھ سال اتنی رقم ملک کے کسی صنعتی ادارہ پر خرچ کرے اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے مکمل نگرانی اور انتظام کرے تو ملک میں رفتہ رفتہ بڑے پیمانہ پر صنعتی اداروں کا قیام آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

اوسط پیمانہ کی صنعتیں بالعموم کمپنیوں کی نگرانی میں فروغ پاتی ہیں حالانکہ بعض بڑے سرمایہ داران کو ذاتی طور پر بھی چلا سکتے ہیں۔ ذیل میں چند صنعتوں کے نام مثال کے طور پر درج کئے جاتے ہیں:

سوتی، اونی اور مصنوعی ریشم کی گرنیاں۔

رنگوں اور دوسرے کسی دیسی اجزا، کے کارخانے۔

شکر کے کارخانے،

کاغذ کی گرنیاں،

دیا سلائی کے کارخانے،

صابون اور موم بتیوں کے کارخانے۔

سیمنٹ کے کارخانے۔

کانچ کے ظروف کے کارخانے۔

فلم کمپنیاں وغیرہ وغیرہ۔

متذکرۂ بالا صنعتوں میں سے تقریباً سب کی سب مختلف صوبوں میں موجود ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے اور ان کی پیداوار اتنی محدود ہے کہ ہماری مانگ ان سے پوری نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان صنعتوں کو ترقی کے بہت اچھے مواقع حاصل ہیں۔ اگر حکومت

تھوڑی سی سرپرستی کرے اور سرمایہ دار اور ماہرین فن پر خلوص کوشش کریں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ان کا مستقبل سنور نہ جائے۔

یہ حقیقت صاحبان نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ زراعت سے صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرنے کے لئے گھریلو صنعتوں کو بطور درمیانی کڑی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ انگریزی حکومت سے قبل ہندوستان میں گھریلو صنعتوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا اور ایک حد تک کہا جا سکتا ہے کہ ملک اپنی ضرورتیں آپ پوری کر سکتا تھا لیکن ذرائع حمل و نقل کی فراوانی اور سہولتوں کی وجہ سے ملک کے تمدن نے جو پلٹا کھایا اس کا اثر فوراً ہی یہ ہوا کہ گھریلو صنعتیں خصوصاً جو دیہات میں تھیں نیم جان ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی بیرونی اشیاء کی درآمد اور ملکی خام پیداوار کی برآمد کا جب تانتا بندھا اور سیاسی انتشار کی وجہ سے حکومت کی مقامی سرپرستی میں فرق آگیا تو ان گھریلو صنعتوں کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ بڑے اور اوسط پیمانے کی صنعتوں کے ذکر بعد چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا ذکر ضروری ہے اور یہاں یہ بھی واضح کر دینا مناسب ہے کہ چھوٹے ہونے پر ان کو حقیر یا بے وقعت سمجھنا بڑی غلطی ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ اسی غلط فہمی کی وجہ سے عام طور پر ہندوستانیوں نے اس کی ترقی کی طرف توجہ نہیں کی۔ ذیل میں چند صنعتوں کے نام پیش کئے جاتے ہیں جن کی ترقی میں دلچسپی لی گئی تو عام صنعتی حالت میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے:۔

شال اور کمبل بُننے کے کارخانے

آٹے کی گرنیاں۔

مختلف قسم کے بیجوں کے تیل نکالنے کی گرنیاں

بسکٹ، روٹی، شربت، میٹھے وغیرہ تیار کرنے کے کارخانے۔

لیمنڈ وغیرہ بنانے کے کارخانے،

سگریٹ اور بیڑی کے کارخانے،

مٹی کے برتن بنانے کے کارخانے،

چمڑے کی دباغت اور اس سے مختلف قسم کی چیزیں مثلاً جوتے سوٹ کیس وغیرہ بنانے کے کارخانے

جستجو میں تیری اَے انجمن آرائے حیَات
کھینچ لائی ہے کہاں مجھکو تمنّائے حیات

پی گیا سَاقیٔ دوراں نے پلائی جِتنی
تلخیٔ دَہر تھی گویا طَرَب اَفزائے حیات

میں بھی اِک قطرہ ہوں شاید اِسی موجِ یم کا
جس سَمنُدر میں بہَا جاتا ہی دریائے حیَات

آج جتنی بھی پلانی ہو پلا دِے سَاقی
شاید اِمروز سے بہتر نہو فَردائے حیَات

نَوحہ خوانی سے کہیں کام چلا ہی مُسلم
کیجئے گا نہ بَس اَب ہائے جہاں وائے حیات

میر طاہر علیخاں مُسلم

جاپان کی صنعتی و معاشی ترقی

جاپانیوں کا عقیدہ ہے کہ سورج ماتا نے اُن کو سلطنت جاپان عطا کرتے وقت یہہ کہا تھا کہ "میری نسل پرمیشوروں کی حیثیت سے اس سرزمین پر حکومت کرے گی"۔ خاندان شاہی کی اصل ابتدا یہی ہے۔ یہ قوی عقیدہ جاپانیوں میں بالتخصیص پایا جاتا ہے۔ دیوتاؤں کی بنائی ہوئی راہیں اختیار کرنا اور ترقی روحانیت کو نہایت اہم خیال کرنا، جاپانیوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اسی لئے ابتدائی زمانہ سے لے کر اب تک جاپانیوں میں بادشاہت کا دور دورہ رہا ہے۔ اور شائد مستقبل میں بھی یہی نظام حکومت قائم رہے گا۔ جاپان کی تاریخ میں ایسے بھی ادوار ہیں جبکہ استبدادیوں نے تحصیل حکومت اور اقتدار کی ہوس میں اس ملک کی بنیادیں ہلادی تھیں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے شاہی اقتدار حاصل کرنے کے لئے دست و گریبان رہتا تھا۔ اور ۱۸۶۸ء تک تاریخ جاپان انھیں جھگڑوں اور فسادوں کی ایک طویل داستان ہے۔ حتیٰ کہ ٹوکوگاوا کا پُرامن دَور حکومت صرف فوجی طاقت پر منحصر تھا۔ ان صُوبوں میں جہاں حکومت کا ہاتھ نہیں پہونچ سکتا تھا ہر قبیلہ کا سردار اپنے پڑوسیوں کو تاخت و تاراج کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مختلف صوبوں کے مابین ہمیشہ ناخوشگوار تعلقات رہے۔ طرز تمدن۔ رسم و رواج اور حتیٰ کہ زبان میں بھی زبردست تفاوت واقع ہوگیا تھا۔ سرداران قبیلہ نے شادی بیاہ اور کسی اور قسم کے تعلقات دوسرے صوبوں سے پیدا کرنے کو ممنوع قرار دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہہ ہوا کہ لوگوں پر جمود کی کیفیت طاری ہوگئی۔ تجارت اور دوسرے کاروبار میں سرد بازاری پھیل گئی۔ عوام پر ہر قسم کی جبر و تعدی روا رکھی گئی۔ اور عام لوگ اپنے آپ کو صرف بقید حیات رکھنے کے لئے کسب معاش کے لئے ہاتھ پیر ہلاتے تھے۔ صدیوں کی کنارہ کشی اور خود غرضی نے جاپانیوں کے قومی تخیل اور جذبۂ ہمدردی پر شدید ضربیں لگائیں۔

جاپان کے اِس دور بربریت کی معاشی اور تمدنی زندگی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے معاشی نقطۂ نظر سے جاپان ایک بدنصیب ملک تھا۔ آبادی کا ایک نہایت چھوٹا حصہ جو ذی اثر اور با اقتدار تھا

عیش و عشرت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ لیکن لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ تھے جو فاقوں سے مر رہے تھے۔ قحط اور طاعون کے مہلک اثرات سے نجات پانے کی ان کو کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی لوگوں سے جبراً کام لیا جاتا تھا جاگیرداری نظام حکومت کو ضرورت سے زیادہ تقویت حاصل ہو گئی تھی تجارت کے لئے منڈیوں کا وجود تک نہ تھا۔ تقریباً تمام قوم زراعت پیشہ تھی آج کسان جاپان کا ممتاز رکن ہے۔ اس کا یہ فریضہ ہے کہ وہ قوم، اہل و عیال اور مذہبی پیشواؤں کو غذا بہم پہونچائے۔ وہ ہمیشہ قوم کی پشت پناہ رہے گا۔ جاپان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اپنا روزگار زراعت ہی کے ذریعہ پیدا کرتا ہے۔ اس ملک کی آبادی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اور ہر فرد کو روزگار سے لگانے کے لئے حکومت جاپان نئے قطعات زمین حاصل کرنے اور نئے ذرائع معاش پیدا کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے چنانچہ موجودہ جنگ چین و جاپان انھیں مسائل کے حل کرنے کے لئے جاری ہے۔ جاپان کی تقریباً ساٹھ فی صدی آبادی جانوروں اور ریشم کے کیڑوں کی پرورش اور چائے اور چاول کی کاشت میں مصروف ہے۔ زراعت صنعتوں کے فروغ کی سنگ بنیاد ہے کیونکہ صنعتی کاروبار کی کامیابی کا دارومدار خام اشیار کی فراہمی پر ہے۔

نہاتی ہیں بہاریں جب لہو میں حُبِ قومی کی
تو ہوتا ہے شگفتہ لالہ زارِ حُبِّ انسانی

صدیوں کے خواب گران کے بعد جاپان بیدار ہوا۔ جاپانیوں کو اپنے ملک کو محفوظ رکھنے کے لئے دستور حکومت میں تبدیلی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ان کی طبیعتوں سے باغیانہ جذبات رفو چکر ہو گئے شاہی خاندان کو تخت پر بحال کر دیا گیا۔ حب وطن کا جذبہ اس حد تک بڑھا کہ تمام غیر ملکیوں کو سرزمین جاپان سے نکال باہر کر دیا گیا۔ والٹیر کا یہ قول کہ "تاریخ جاپان میں کوئی باب ایسا نہیں ہے جس میں وہ غیروں کے زیر حکومت رہا ہو" اب بھی پورا پورا صادق آتا ہے۔ آبادی میں کافی اضافہ ہوتا گیا۔ زمانہ حال تک جاپان کا کوئی خاص فلسفہ نہ تھا۔ اس ملک کی تاریخ۔ زبردستوں کا زیردستوں کو پیسنا اور دلنا۔ خونریزی، قحط اور مختلف امراض کی مکمل داستان ہے۔

۱۸۶۸ء سے جو ترقی اس سلطنت کو حاصل ہوئی وہ قابل تحسین ہے۔ عوام الناس ایک زبردست قوم میں متحد ہو گئے۔ مغرب کے آئین و ضوابط۔ وہاں کی ایجادات و اختراعات سے

انھوں نے پورے طور پر استفادہ کیا۔ پچاس سال کے قلیل عرصہ میں اس قوم نے دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صف میں اپنی جگہ پیدا کر لی اور مشینوں اور کلوں سے کام لینے میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر ایک ہی جست میں امریکہ کی ہمسری کا دعویٰ کرنا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں مغرب کے بڑے بڑے صنعتی ممالک سے مسابقت کرنا فی الحقیقت جاپان کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔ ہر چیز نہایت امن سے چل رہی ہے۔ لیکن خطرہ ہے تو صرف جاپانیوں کی ذہنیت سے۔ ان میں ذہنی اور روحانی انحطاط آگیا ہے۔ جاپان جدید میں قتل کے واردات کثرت سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ایک تجربہ کار انگریزی سیاح کا بیان ہے کہ یہاں رات کو باہر نکلنا خطرہ سے خالی نہیں۔

۱۸۶۸ء میں میکاڈو دوبارہ مسند نشین ہوا۔ لوگوں کو نام نہاد سیاسی اور سماجی مساوات کی خوشخبری سنائی گئی۔ جاگیرداری نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا ہے یہ نظام جاپان کی ترقی میں روڑے اٹکا رہا تھا۔ اور ایک زمانہ تک ملک کی اہم صنعتوں کا ٹھیکہ جاگیرداروں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ صنعتی اداروں اور کارخانوں نے جاگیرداری نظام کی جگہ لے لی اور تھوڑی ہی مدت میں جاپان صنعتی ممالک کی صف اول میں جگہ پانے کا مستحق ہوگیا۔ کیونکہ جاپان کو بیرونی مسابقت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس لئے جاپان کو حسن کارانہ اشیاء بنانے کے علاوہ لوہے اور تانبے کی ٹھوس چیزیں بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جدید اسلحہ کی تیاری نے جاپان کی بحری اور بری قوت کو کافی تقویت بخشی۔

حکومت نے بھی صنعتوں کی سرپرستی کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا اور بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جاپان کی صنعتی ترقی حکومت کا کارنامہ ہے۔ مختلف صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے کئی طریقے عمل میں لائے گئے۔ لوگوں کو یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں صنعتوں کا غور و خوض کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ جاپان کے صناعوں اور کاریگروں کو صنعت کے جدید طریقوں سے واقف کرایا گیا۔ کئی ماہرین فن کو غیر ملکوں سے نہایت ہی فیاضانہ شرائط پر بلایا گیا اور ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ جدید طرز کے کارخانے اور فنی ادارے قائم کریں۔ قوم کو جدید صنعتوں کے متعلق معلومات بہم پہونچانے کے لئے فنی نظام تعلیم مرتب کیا گیا۔ حکومت نے اپنے ہی صرفہ سے کئی

کارخانے قائم کئے اور آخر میں ان کو غیر سرکاری کمپنیوں کے سپرد کر دیا گیا۔ اگر کوئی شخص ذاتی طور پر کسی مفید صنعت کو بروئے کار لانا چاہتا تھا تو حکومت اسے ہر قسم کی امداد دیتی تھی۔ تجارتی معاملات میں آسانی پیدا کرنے کے لئے اور عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی غرض سے بینک اور کرنسی کو رواج دیا گیا۔"

دور تجدید سے پہلے (Post Restoration) جاپان کی خارجی حکمت عملی مقبوضات حاصل کرنے کی طرف منعطف ہوگئی تھی اور "سمورائی" کا منتہائے مقصد بھی یہی تھا چنانچہ اس زمانہ میں جاپان کو اپنی گھریلو منڈی کو ترقی دینے کا نہ خیال ہوا اور نہ اس کو اتنی فرصت ملی۔ لیکن پروفیسر ٹویاما اور اس کے ساتھیوں نے اندرون و بیرون حکومت میں پروپگنڈے کے جال پھیلا دئے اور ان کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی انھوں نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کی بیرونی منڈیوں میں داخلہ حاصل کر لیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں ان کا عمل دخل شروع ہوگیا۔ اس کے علاوہ جدید جاپان نے اپنی اشیاء کو عام پسند بنانے کے لئے ہر ممکنہ کوشش کی۔ ۱۸۷۳ء میں جاپان نے اپنی صنعتوں کو ویئنا کی نمائش گاہ میں رکھا۔ امریکہ اور یورپ کی کوئی بین الاقوامی نمائش ایسی نہیں ہے جس میں جاپان نے نمائندگی نہ کی ہو۔ غرض کہ ملک کی معاشی اصلاح کے لئے نہایت منظم کوشش کی گئی۔ درماندہ اور پست ہمت اقوام پر جاپان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ذرا سی ہمت سے نئے آلات اور نئے طریقوں سے صنعتوں کو اتنا فروغ دیا جاسکتا ہے کہ ملک میں دولت کی فراوانی ہوجائے اور نکبت وادبار کے سیاہ بادل پھٹ جائیں ع

"ہے جو راہ عمل پر گامزن محبوب فطرت ہے"

سمنٹ، کاغذ، فولاد، دیاسلائی، پارچہ بافی، اور ریشم کے کارخانے قائم کئے گئے پہلے پہل حکومت ہی نے ان کو قائم کیا تھا اور حکومت ہی ان کے نظم ونسق کا خیال رکھتی تھی ان کاروبار کی غیر معمولی صنعتوں نے عوام پر مقناطیسی اثر کیا اور کئی متحد جماعتوں نے ان کو ذاتی طور پر چلانے کا حکومت سے ذمہ لے لیا ریشم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے گویا (ریشم کے کیڑے کا خول) ملکی ضروریات پورا کرنے کے علاوہ ایک بڑی مقدار ریاست ہائے متحدہ کو روانہ کی جاتی ہے لاتعداد ادارے اور کئی گھرانے کلوں کے ذریعہ کاغذ بناتے ہیں۔ اور یہ صنعت

دن بدن ترقی کرتی جاتی ہے۔ گھریلو صنعتیں مثلاً شطرنجی۔ بوریا۔ ٹوکری۔ وغیرہ خصوصاً عورتیں اپنے لمحات فرصت میں انجام دیتی ہیں۔ جاپان کا ہر فرد یہاں تک کہ بچہ بچہ ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا ہے۔ کم سن بچے اپنی چھوٹی چھوٹی اور نازک انگلیوں سے دیا سلائی کی ڈبیہ پر لیبل چپاں کرتے ہیں۔ چائے کی پتی چننے میں مدد دیتے ہیں اور ریشم کے کیڑوں کے خول بھی خوشی خوشی اکٹھا کرتے ہیں۔ ایک زمانہ میں لنکا شائر روئی کا ٹھیکہ دار بن بیٹھا تھا لیکن جب جاپان میں پارچہ بافی کے کارخانے کھل گئے تو اتنا کپڑا بیرونی ممالک میں ارزاں قیمت پر بھیجا گیا کہ لنکا شائر کا کاروبار پھیکا پڑ گیا۔

جاپان میں معدنی پیداوار کو بھی بہت اہمیت دی جا رہی ہے اس طرف ترقی کی رفتار پہلے پہل دھیمی تھی۔ کوئلہ۔ تانبا۔ لوہا۔ پٹرولیم۔ سونا۔ اور چاندی یہاں کی معدنی پیداواریں ہیں۔ جنگ عظیم کے دوران میں جاپان کو سونا اور چاندی نکالنے کی شدید ضرورت پیش آئی تھی۔ تین ہزار سے کچھ زیادہ یہاں پٹرولیم کی باولیاں ہیں اور ان سے تیل وغیرہ حاصل کرنے کے لئے جاپانی امریکہ کے بتائے ہوئے قاعدوں کی پابندی کرتے ہیں۔ جاپان میں لوہے کی چند ہی معدنیں ہیں اور جو کچھ لوہا ان کانوں سے نکلتا ہے وہ ملک کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بھی ناکافی ہے۔ معدنی ترقی میں مزدوروں کی طرف سے کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ کانوں میں کام کرنے والوں میں بھائی چارہ قائم ہے اور ہر مزدور مستعدی سے کام کرتا ہے اور جو کچھ ملتا ہے اس پر قناعت کرتا ہے۔ اگر جاپان کے مزدوروں میں ایسا پاک جذبہ موجزن نہ ہوتا تو آج جاپان معراج ترقی پر نہ پہونچتا۔

مقاصد جنگ اور تجارت کی ترقی کے لئے جاپان نے کئی جہاز تعمیر کئے ہیں۔ اس بارے میں جاپان غیر اقوام کا دست نگر نہیں ہے۔ اس صنعت میں جاپان اطالیہ اور فرانس کے دوش بدوش چل رہا ہے۔ جے۔ آر چرڈ رقمطراز ہے کہ جاپانی صنعتیں ابھی تک سرمایہ دارانہ نظام پر چل رہی ہیں۔ بڑے بڑے کاروبار چند دولت مند لوگوں ہی کے ہاتھ میں ہیں یا ان ذی اثر لوگوں کے قبضہ میں ہیں جن کو "سمورائی" کہا جاتا ہے اور جو گذشتہ صدی کے آخر میں حکومت یا سرکاری ملازمت حاصل کرنے سے مایوس ہو گئے تھے۔ بالفاظ دیگر جو حیرت انگیز کامیابی جاپانیوں نے

بیرونی تجارت میں حاصل کی ہے۔ اس کی تنظیم صرف عقلی اصول پر نہیں تھی۔ بلکہ اس میں مزدوروں کی غیر معمولی صفت جفاکشی اور ان تھک محنت کو کافی دخل تھا۔ لیکن مزدور اپنی قسمت سے کبھی شاکی نہ ہوئے۔ جاپانیوں کا ایک بڑا طبقہ سمورائی کی عزت و توقیر اور خدمت بجالانا فرائض زندگی میں سے خیال کرتا ہے

جاپان نے اپنی بیرونی تجارت کو پھیلانے میں نہایت سرگرمی کے ساتھ کام کیا جاپان کو دنیا کی بہترین اور زبردست قوت بنانے کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ اس مقصد برآری کے لئے کپڑا بننے کے مشین تیار کئے گئے۔ کارخانوں کا وجود عمل میں آیا چرخے بنائے گئے۔ رنگوائی اور دھلوائی کے جدید ترین طریقے استعمال میں لائے گئے۔ فولاد اور لوہے کے نکالنے کے لئے کئی کارخانے قائم کئے گئے اور فوجی و تجارتی بیڑے کی تعمیر کے لئے ہر قسم کی ضروریات و انتظامات بہم پہونچائے گئے۔ اب جاپانیوں کی تمام تر توجہ اسی قسم کی سائنٹیفک صنعتوں کی طرف مبذول ہوگئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہہ ہوا کہ جاپان کی ان چھوٹی چھوٹی دستکاریوں کو تنزل آگیا جو اپنی خوبصورتی نفاست اور نزاکت میں بے نظیر تھیں جاپانیوں کی ان کارروائیوں پر یورپ کی مشتبہ نظریں پڑنے لگیں۔ اور جیسا کہ یورپ کا خاصہ ہے اس نے جاپانیوں کی قومی دستکاریوں کا سرپرست بن کر پروپگنڈے کے ذریعہ جاپانیوں کو سائنس کی ایجادات سے بے التفاتی برتنے کی ترغیب دی مگر جاپانی مکمل طور پر بیدار ہو چکے تھے۔ جو واقعات اور حالات بیرونی دنیا میں معرض وجود میں آرہے تھے ان کا وہ تحقیق و تدقیق کے ساتھ مطالعہ کر رہے تھے۔ اپنے ملک کو تقویت و ترقی دینے کے لئے وہ موقع و محل کے متلاشی ہیں۔ وہ ہمیشہ زمانہ کے سیلاب کے موافق چلتے ہیں۔ آج جاپان کی صنعتوں کا ہر منڈی میں بول بالا ہے۔ فرانس اور برطانیہ نے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جاپان ہی کے جنگی اسلحہ استعمال کئے اور اسی زمانہ میں یہہ چھوٹا سا جزیرہ قارونی خزانے کا مالک بن بیٹھا۔

پہلے پہل جاپان کی صنعتوں کو ناپائدار خیال کیا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ خریداروں کی یہہ شکایت بھی دور ہوگئی فنی معلومات میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کو زیادہ معاوضہ دیا جانے لگا۔ مزدوروں کی آمدنی میں اضافہ کرنے سے یہاں کا معیار زندگی بڑھ گیا اور کاریگری میں بھی نمایاں ترقی ہوئی اور یہاں کے بڑے بڑے تجارتی کاروبار۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں اور تجربہ کار سوداگروں کی زیر نگرانی ہیں۔ جاپان کی اس دن دونی

رات چوگنی ترقی کے متعلق جوشؔ کہتا ہے ؎

رہِ علم وعمل میں دیر سے ہنگامہ آرا ہوں　　طلسم کار و بار شوق و طوفانِ تمنا ہوں
قسم کھائی ہے میری سعی نے بیدار بختی کی　　میں ہر بازار کا یوسف ہوں ہر صنعت کا مولا ہوں
غرور ایشیا ہوں محرم امروز فردا ہوں

صنعتوں کا فروغ جاپان کی معاشی ترقی کی جڑ ہے۔ جنگ چین و جاپان جنگ روس و جاپان اور گذشتہ جنگ عظیم جاپان کے حق میں ابر رحمت کا کام کرگئیں جاپانی قوم نے ہر دس سال کے وقفہ سے ان واقعات کا سامنا کیا۔ جاپان کے معاشی اور سرمایہ داری اعداد و شمار یہ پتہ دیتے ہیں کہ ان تینوں واقعات نے ان مشکلات و مصائب کا خاتمہ کر دیا جو گھریلو منڈیوں کے غیر اہم اور بے ربط ترقی کی وجہ سے رونما ہوئے تھے اور فیضان تھا انھی جنگوں کا کہ جاپان نے سرمایہ داری کی طرف قدم بڑھائے۔

۱۸۹۵ء میں جاپان کی چین میں کامیاب جارحانہ کارروائیوں نے یورپ کی آنکھیں کھول دیں۔ جاپان کی برّی فوج اور بحری قوت کی دھاک یورپ کی بڑی بڑی قوتوں پر بیٹھ گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان اور یورپ کی سلطنتوں کے مابین معاہدات پر مساویانہ اُصول پر دستخط ہوئے۔ شکست روس کے بعد جاپان کے اقتدار و رعب میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جنوبی منچوریا میں ریلوے لائن۔ کوئلے کی کان اور زمین کے دستاویزات جاپانیوں کے قبضہ میں آگئے۔ اس طرح سے جو اثرات روس کی مداخلت سے ملک پر مترتب ہو رہے تھے ان کا کامل طور پر خاتمہ کر دیا گیا۔ اگر صدر جمہور روزولٹ مفاہمت کی تدبیریں نہ کرتا تو بہت ممکن تھا روس کی وسیع اور طاقتور حکومت جاپان کی چھوٹی سی ریاست کو کچھ عرصہ بعد صفحۂ ہستی سے محو کر دیتی اس فتح نے جاپانیوں کو کامیابی کے نشہ میں مخمور و سرشار کر دیا اس اثنا میں صنعتوں کو نہایت تیزی سے ترقی ہو رہی تھی۔ اس کے چند سال بعد جاپان، کوریا اور فارموسا پر قابض ہو گیا۔ اگر برطانیہ سے معاہدہ نہ ہوتا تو شاہ راہ ترقی پر جاپان کی رفتار دھیمی پڑجاتی۔ یہ معاہدہ جاپانیوں میں مذہبی و قومی جذبات موجزن کرنے میں اکسیر کا کام کر گیا۔ بادشاہ کی روحانی عظمت جو تقریباً بھلا دی گئی تھی اس کو از سرنو تازہ کیا گیا۔ بدھ مت کو سیاسیات سے مکمل طور پر بیدخل کر دیا گیا۔

اور ایک قلیل مدت کے لئے جاپان مغربی کاریگروں ۔مغربی صناعوں اور مغربی عالموں کا گہوارہ بن گیا اور جاپان جدید کا لہلہاتا ہوا پودا انہی اثرات کی پیداوار ہے ۔ حب وطن ہی وہ تریاق تھا جسکو حاکموں نے مذہبی تعصبات اور مغربی تمدن کے زہریلے اثرات کو توڑنے کے لئے استعمال کیا۔ انفرادیت کے پردوں کو مرتفع کر کے جاپانیوں میں اشتراک عمل کی روح پھونکی گئی اور رفتہ رفتہ جاپان نے فوجی مقاصد کی شاہراہیں قائم کرلیں ۔

صرف جاپان ہی وہ ملک تھا جس نے جنگ عظیم سے پورا پورا استفادہ کیا اس ملک نے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یورپ کی نازک حالت سے فائدہ اُٹھاکر جاپان نے جنوبی منچوریا میں اپنے معاشی و تجارتی حقوق مستحکم کرلئے۔ ملکی ادارے اپنے کام میں مصروف تھے ۔ ملکی صنعتوں کی رفتار غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی۔ اشیاء کی برآمد اور کام کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا دونے سرمایہ کی کھپت ہونے لگی اور صنعتی کاروبار میں اتنا سرمایہ لگایا گیا کہ جاپان جدید سرمایہ دار ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ اور اس کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوگئی۔ دوران جنگ میں جاپان کو مشرقی منڈیوں میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئی۔ اور کثیر دولت نفع کی صورت میں جاپان کے ہاتھ لگی۔ ۱۹۱۹ء میں جب جنگ اختتام کو پہونچی تو جاپان کی بیرونی تجارت کو سخت نقصان پہونچا۔ اس کا سب سے گہرا اثر جاپانی کسانوں پر پڑا۔ کسان مقروض ہو گئے۔ آبادی کی قوت خرید میں بری طرح سے کمی واقع ہوگئی۔ ہزارہا مرد اور عورتیں بے روزگاری کا شکار ہوگئیں اور اشیاء کی قیمتوں میں ۱۲۵ فی صد اضافہ ہوگیا جاپان میں انقلابی جراثیم پرورش پارہے تھے ۔ مزدور پیشہ حکومت سے بغاوت کرنے کے لئے کمر بستہ کھڑے ہو گئے تھے لیکن ۱۹۲۰ء میں حالات نے پلٹا کھایا اور کئی تجارتی انجمنیں نہایت منظم طور پر قائم کی گئیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کردینا ضروری ہے کہ جنگ سے پہلے جو منڈیاں جاپان میں قائم تھیں وہ بہت چھوٹی تھیں۔ کوئی بڑے کارخانوں کا وجود نہ تھا۔ حکومت نے اس خرابی کو دور کرنے کے لئے کئی منڈیوں کو مدغم کرکے بڑی بڑی منڈیاں بھی کھولیں۔ لیکن اس پر بھی یہاں چھوٹی چھوٹی صنعت گاہوں کی کثرت ہے ۔ جہاں تک جاپان کی بیرونی منڈیوں اور اس کی بیرونی تجارت کا تعلق ہے یہ بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ جاپان کی صنعتوں کو اہمیت

ضرور حاصل ہے لیکن اشیاء کے تیار کرنے اور اُن کے بنانے کی صورت حال مختلف النوع ہے۔ جاپان میں ایسے کارخانوں کی کثرت ہے جو ادنیٰ پیمانے پر چلائے جاتے ہیں یعنی ان کارخانوں میں مزدوروں کی تعداد بہت کم ہے۔

جنگ عظیم کے بعد جاپان میں ایک اشتمالی گروہ بھی پیدا ہو گیا لیکن یہاں کے محکمہ خفیہ اور منظم فوجیں ان کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکے ہوئے ہیں کہا جاتا ہے کہ جب تک حکومت میں زور باقی رہے گا اس وقت تک جاپان میں اشتالیوں کے لئے کوئی راہ کھلی نہ نظر آئے گی۔ اگر جاپان کی مالی حالت گر جائے یا وہ کسی غیر قوم کا محکوم ہو جائے تو ممکن ہے کہ موجودہ نظام حکومت میں تبدیلی پیدا ہو جائے اور مزدور اور اشتمالی جماعت برسر اقتدار ہو جائیں ورنہ اس ملک میں اشتمالیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

جاپان کے معاشی و مالی اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ ان تینوں جنگوں نے جاپان کو پستی اور فلاکت کے بھنور میں پھنسنے سے بچا لیا۔ منچوریا کے الحاق سے بھی اسی قسم کا اثر ہوا۔ جاپانی دور تجدید سے لے کر اب تک اپنی حکومت کے حدود بڑھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ منچوریا کا قبضہ مشرق پر جاپانی تسلط جمانے کا پہلا اقدام تھا۔

صنعتوں کے فروغ اور معاشی ترقی نے جاپان کو دنیا کی ایک بڑی قوت میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہ ملک جو ہندوستان سے بھی ہر اعتبار سے پست تھا آج اس نے امریکہ اور برطانیہ کو چین میں ہراساں کر دیا ہے۔ لیکن جاپان چین پر جو دست درازیاں کر رہا ہے وہ اس کی تاریخ کا ایک تاریک باب رہے گا۔ دن بدن اس ملک میں ہوس زر کشی بڑھتی جا رہی ہے جمعیت اقوام کو ٹھکرا کر ہر قسم کی جابرانہ کارروائیوں کو چین میں روا رکھا گیا ہے۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ پورا شمالی چین تقریباً اس کے قبضہ میں آگیا ہے۔ اینٹی کنٹرن پکیٹ ( ) کے ایک رکن کی حیثیت سے وہ انسانیت کے حقوق کو نہایت بے دردی کے ساتھ کچل رہا ہے اور جہاں بانی و کشور کشائی کی ہوس میں ہٹلر و مسولینی کی ہمنوائی کرنے کے لئے تیار ہے جاپان جبر و استبداد کے ذریعہ پورے چین کی ٹھیکہ داری لینے پر تلا ہوا ہے اور جہاں تک بن سکے یہاں سے برطانیہ اور امریکہ کے اثرات کو کمل طور پر مٹا دینا

چاہتا ہے۔ فسطائی اطالیہ، نازی جرمنی، اور جاپان ایسے ملک ہیں جن کی وجہ سے تہذیب حاضر معرض خطر میں پڑی ہوئی ہے۔ جاپان میں سرمایہ داری نے زور پکڑا ہے اور اس کا صنعتی اور معاشی فروغ دنیا کے لئے سراسر دھوکا ہے؂

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

محمدؐ عبد الحق

(سال چہارم)

لوہا آگ میں

ایک خاتون کو اپنی ادبی قابلیت کے بارے میں غلط فہمی تھی۔ اس نے اپنے بعض مضامین ڈاکٹر جانسن کے پاس بھیجے اور یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ اس نے اور مضامین لکھے ہیں بتایا کہ "اور لوہا آگ میں رکھا ہے"۔

جانسن نے مسودہ کے دو تین صفحات پڑھے۔ پھر مسودہ واپس کر دیا اور لکھا کہ میری "ایماندارانہ" رائے یہ ہے کہ آپ اسے بھی "اور لوہے" کے ساتھ ہی رکھ دیں تو بہتر ہے۔

فنون لطیفہ میں جو فوقیت اور برتری فن موسیقی کو حاصل ہے وہ شاید کسی اور فن کو نصیب نہیں۔ موسیقی میں جو دلفریبی اور لوچ ہے اُس سے کسی فرد کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر افسوس ہے کہ اکثر لوگ اس فن سے قطعاً ناواقف ہیں۔ موسیقی میں جادو کا سا اثر ہوتا ہے۔ اس کی ادنیٰ سی چھیڑ روح کو مضطرب کر دیتی ہے۔ اور انسانی قلوب میں کیف زا ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ جب کوئی اس سے لطف اندوز ہوتا ہے تو اس پر ایک ناقابلِ بیان کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ تمام لطیف احساسات کو بیدار کرتی ہوئی کسی نا معلوم دنیا کی سیر کراتی ہے۔ متفکر اور مغموم انسان دنیاوی غم و آلام سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو راحت میں پاتا ہے۔ شیکسپیر کا قول ہے کہ "موسیقی محبت کی غذا ہے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو موسیقی سے ناواقف ہیں وہ محبت کرنا نہیں جانتے۔

سچ تو یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں اس فن کا چرچا نہ رہا ہو لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فن کی ابتدا کہاں سے ہوئی ہے۔ اور اس کا ظہور کس زمانہ میں ہوا۔ اس امر میں محققین ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا حضرت آدم ؑ کے وقت سے ہوئی۔ فرشتوں کو حکم ہوا تھا کہ وہ پوربی راگنی الاپیں تاکہ روح جو جسم آدم میں داخل ہوتی ہوئی ڈرتی اور گھبراتی ہے وجد میں آ کر لوٹتی ہوئی جسم میں داخل ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مگر بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ انسان نے اس فن کو "ققنس" سے سیکھا ہے۔ یہ ایک قسم کا پرند ہے جس کی خصوصیات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ دیکھا تو نہیں سُنا ہے کہ اس پرند کی منقار میں تقریباً ایک ہزار سوراخ ہوتے ہیں اور جب یہ فرطِ مسرت سے چہچہانے لگتا ہے تو ان سوراخوں سے ہوا گذرتی ہے اور انواع و اقسام کے سُریلے اور درد بھرے راگوں سے فضائے عالم میں ایک خاص کیفیت پیدا

ہوجاتی ہے۔ اس کی عمر کے متعلق یہ اندازہ ہے کہ یہ ایک ہزار سال تک بقیدِ حیات رہتا ہے۔ اس کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ تنہا اور راہبانہ زندگی گذارنا گوارا کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا جوڑا نہیں ہوتا۔ بقائے نسل کے متعلق یہ مشہور ہے کہ جب یہ پرند عمرِ طبعی کو پہونچتا ہے تو چند تنکے اور سوکھی ہوئی لکڑیاں جمع کرکے اپنی چتا تیار کرتا ہے اور اس میں بیٹھ کر چہچہانے لگتا ہے۔ سوراخوں سے قسم قسم کے ترانے نکلنے لگتے ہیں۔ جب دیپک راگ شروع ہوتا ہے تو یہ جمع کئے ہوئے تنکے سُلگ اُٹھتے ہیں اور ققنس، خوش الحانی کرتا ہوا اس آگ میں جل کر راکھ ہوجاتا ہے۔ موسم بہار کی بارش اُس خاک کو انڈے کی شکل میں تبدیل کردیتی ہے۔ چند دنوں بعد اس میں سے اس نوع کا پرند برآمد ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے اہلِ فارس اس پرند کو "آتش زن" کے نام سے پکارتے ہیں۔

مورخین اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں (ایک ہزار چودہ سال قبل مسیح) غنا کا بڑا چرچا تھا اُس زمانہ میں بڑے بڑے خوش الحان لوگ موجود تھے۔ اور وہ اپنے اس کمال پر فخر کرتے تھے۔ سُنا گیا ہے کہ خوش الحانی کی صفت حضرت داؤد علیہ السلام کو بارگاہِ الٰہی سے بطور معجزہ عطا ہوئی تھی کہا جاتا ہے کہ جب آپ آیاتِ زبور کی تلاوت فرماتے تھے تو انسان تو کیا چرند اور پرند تک مسحور ہوجاتے تھے اور حضرت کے اطراف خودبخود کھینچ کر جمع ہوجاتے تھے۔ یہاں تک کہ لوہا پگھل جاتا تھا اور آپ اس کی کڑیاں بناکر زرہ بناتے تھے۔ آپ کے زمانہ میں موسیقی کو اس قدر عروج ہوا کہ یہ حمد و مناجات کا ذریعہ قرار پائی۔

دوسرے نظریہ کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ققنس کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ صرف محققین کی جدتِ طبع کا مخلوق معلوم ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو علم حیوانات کے ماہر ہیں اُس کا سُراغ لگانے سے قاصر رہے بہرحال اس فن کا موجد حضرت انسان کو قرار دیا جائے یا ققنس کو، اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ اس فن کو ہندوستان میں کس حد تک مقبولیت حاصل ہوئی۔ قرون اولیٰ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان ایک طویل خواب کے بعد بیدار ہورہا ہے ملک میں جابجا اس امر کی کوشش کی جارہی ہے کہ ہندوستانی فنون لطیفہ کو ترویج دی جائے۔ زمانۂ موجودہ میں فن موسیقی کی طرف خاص رجحان ہے جس کا بیّن ثبوت مختلف جلسوں اور کانفرنسوں کے انعقاد سے مل سکتا ہے۔ موسیقی کی تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی میں ماہرین نے اس فن میں غیر معمولی مہارت بہم پہونچائی تھی اور بڑی جد و جہد کے بعد آسمان موسیقی پر درخشاں ستاروں کی طرح چمکے۔ جن لوگوں نے واقعی موسیقی کی غیر معمولی خدمت کی دنیا انھیں کسی عنوان فراموش نہیں کرسکتی۔ اُن مایۂ ناز ہستیوں کی ایک طویل فہرست پیش کرنا اس وقت غیر ممکن ہے۔

ان میں سے چند مشہور ہستیوں کا ذکر میں مختصراً آگے دیتا ہوں۔

سب سے پہلے بجو باورے کا کچھ حال اور اس کی خدمات کا ذکر ضروری ہے۔ تغلق کے زمانہ میں یہ بڑا مشہور گویا گذرا ہے۔ فن موسیقی میں اُس نے کافی مہارت بہم پہونچائی تھی۔ تان سین جسے دنیائے موسیقی کا اُستاد مانا جاتا ہے گوالیر کا باشندہ تھا۔ مغلوں کے زمانہ میں اُس نے موسیقی کو وہ رنگ دیا جس کا اندازہ مشکل سے ہوتا ہے۔ اس زمانہ کے سارے لوگ حتیٰ کہ مغل دربار کی اعلیٰ شخصیتوں نے اُس کا لوہا مانا ہے۔ بلا مبالغہ یہ وہ ہستی تھی جس کی عظمت کا سکہ ہر شخص کے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ جو حضرات موسیقی سے تعلق رکھتے ہیں باز بہادر کو نہیں بھول سکتے۔ یہ شخص مالوے کا رہنے والا تھا۔ اُس نے اس لطیف فن میں انتہائی جانفشانی کے بعد ملکہ حاصل کیا اور ساری دنیا پر واضح کر دیا کہ اس فن کو کیا اہمیت حاصل ہے اسی سلسلہ میں سلطان حسین مرزا کا ذکر آنا بھی ضروری ہے یہ جونپور کا رہنے والا تھا اور اپنے زمانہ کا اُستاد تھا۔ اِس کے بعد ابراہیم عادل شاہ کا ذکر بڑی حد تک اہمیت رکھتا ہے۔ یہ جگت گرو تھے۔ اِن کی مشہور تصنیف " نورس " ہے جس میں مختلف راگ راگنیوں کا جو اُنھیں کی ایجاد ہیں ذکر کیا ہے۔ آخر میں محمد شاہ کے زمانہ کی رتن بائی کا ذکر آنا لازمی ہے اُس نے موسیقی کو گھر کی لونڈی سمجھ رکھا تھا۔ آواز میں اس بلا کا لوچ تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ رتن سنجیت خاں صاحب عبدالکریم خان جو خود اس فن کا اُستاد مانا جاتا ہے اُس پر بے حد فریفتہ تھا۔ یہ ہیں ہندوستان کے وہ مایۂ ناز افراد جو دنیائے موسیقی کے خدا مانے جاتے ہیں۔

موسیقی کی تاریخ سے ہٹ کر اَب یہ دیکھنا ہے کہ ہندوستان کے ماہرین فن نے اس کی کیا تقسیم رکھی ہے ہند کے لوگ آواز کو سُر کے نام سے تعبیر کرتے ہیں اور سُر کو آواز کے اُتار چڑھاؤ کی مناسبت سے سات قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) سر یا کھوب (۲) رکھب (۳) گندھاری (۴) مدھم (۵) پنچم (۶) دھیوت (۷) نکھاد ان الفاظ میں چار لفظوں کے سرحرف لے کر " سرگم " بناتے ہیں اور ان کو بنظر سہولت سرگم ہی کہتے ہیں۔ سروں کی تقسیم راگوں پر کی گئی ہے اور راگ کو راگنی پر تقسیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر سُر میں چھ راگ ہوتے ہیں۔ (۱) مالکونس راگ (۲) ہنڈول راگ (۳) دیپک راگ (۴) میگھ راگ (۵) بھیرویں راگ (۶) سری راگ۔ ہر راگ میں مختلف راگنیاں ہوتی ہیں جن کو ذیل میں تفصیلاً درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ مالکونس راگ = ۱۔ باگیسری ۲۔ گوری ۳۔ دبی ۴۔ سوہا ۵۔ ککری ۶۔ ملتانی۔

۲۔ ہنڈل راگ = ۱۔ پوریا۔ ۲۔ بسنت۔ ۳۔ لات۔ ۴۔ پنچم۔ ۵۔ دھناسری۔ ۶۔ ماردا۔
۳۔ دیپک راگ = ۱۔ چھایانات۔ ۲۔ ہمیر۔ ۳۔ کلیان۔ ۴۔ کدارا۔ ۵۔ بہاگ۔ ۶۔ ریمن۔
۴۔ میگھ راگ = ۱۔ مدمات۔ ۲۔ گونڈ۔ ۳۔ سدہ سارنگ۔ ۴۔ بڈہنس۔ ۵۔ ساونت۔ ۶۔ سورٹھہ۔
۵۔ بھیروں راگ = ۱۔ بھیرویں۔ ۲۔ رام کلی۔ ۳۔ گوجری۔ ۴۔ کھٹ منجری۔ ۵۔ گندھاری۔ ۶۔ اساوری۔
۶۔ سری راگ = ۱۔ گدری۔ ۲۔ پوربی۔ ۳۔ گدر۔ ۴۔ ترون۔ ۵۔ مالسری۔ ۶۔ سری جہت۔

بعض حضرات متذکرۂ بالا تقسیم میں کچھ اختلاف رکھتے ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ راگنیاں (۳۶) نہیں بلکہ صرف (۳۰) ہیں اور ہر راگ میں بجائے چھ راگنیوں کے صرف پانچ راگنیاں ہوتی ہیں اور ہر راگ میں آٹھ آٹھ پتر کے بھی قائل ہیں۔ پتر کی کل تعداد (۴۸) ہے اور پتر بھارجا پر منقسم ہیں جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے۔
بلحاظِ وقت راگنیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ (۱) سنکیرن ۔ (۲) سالنگ۔
سنکیرن وہ راگنیاں ہیں جو اپنے راگ کے مخصوص وقت پر گائی جاتی ہیں اگر اُن کو وقت سے ہٹ کر گایا جائے تو وہ لطف اور سرور حاصل نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے سالنگ وہ راگنیاں ہیں جن کے لئے وقت کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔ یہ ہر وقت اور ہر موسم میں دل لبھاتی ہیں۔ ماہرینِ فن نے مختلف راگ راگنیوں کے اوقات مقرر کئے ہیں جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) مالکونس راگ

اِس راگ کو پھاگن کے مہینہ میں الاپتے ہیں جو انگریزی مہینے جنوری اور فروری کے مطابق ہوتا ہے ہر چیز اپنے وقت پر بھلی معلوم ہوتی ہے۔ وقت پر کوے کی کائیں کائیں بھی دلسوز ہوتی ہے مگر غیر وقت میں کوئل کی کوک اور بلبل ہزار داستان کا نغمہ طبیعت پر گراں گزرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اِس راگ کے لئے طلوعِ آفتاب سے ایک پہر دن تک مخصوص وقت ہوتا ہے۔ اِس راگ کی سنکیرن اور سالنگ حسبِ ذیل ہیں۔

سنکیرن = ۱۔ گوجری۔ ۲۔ پلاولی۔ ۳۔ توری۔ ۴۔ مالسری۔ ۵۔ اساوری۔
سالنگ = ۱۔ الہیا۔ ۲۔ منگال۔ ۳۔ گندھاری۔ ۴۔ کلیان۔ ۵۔ ریمن۔ ۶۔ بنگالی۔
۷۔ پٹ منجری۔ ۸۔ بیرٹھہ۔

(۲) ہنڈل راگ

موسم بہار چیت بیساکھ اِس کا مخصوص زمانہ ہے۔ اس کے مطابق انگریزی مہینے مارچ اور اپریل ہیں۔ اس کے گانے کا وقت ایک پہر دن چڑھے سے دو پہر تک ہے۔

سنگیرن۔ ۱۔ لات۔ ۲۔ بسنت۔ ۳۔ بھیم پلاسی۔ ۴۔ دیبکار۔ ۵۔ کنتھادتی۔

سالنگ۔ ۱۔ پنچم۔ ۲۔ دہول۔ ۳۔ ہڈہنس۔ ۴۔ بھوپالی۔ ۵۔ سیام۔ ۶۔ جنت سری۔ ۷۔ پرج۔

(۳) دیپک راگ

اگر یہ راگ اپنے خاص وقت پر گایا جائے تو بے انتہا دلکش ہوتا ہے۔ بہتا دریا تھم جائے۔ چلتے بادل رُک جائیں۔ درختوں کے پتے ساکت ہوجائیں۔ اِنسانوں کا تو کیا ذکر حیوان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں۔ اِس راگ کے متعلق یہ مشہور رہے کہ جب اس کو سلیقہ سے گاتے ہیں تو بجھی ہوئی شمع جل اُٹھتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ متواتر الاپنے کے بعد شہر میں آگ لگ جاتی ہے۔ اِس کے توڑ کا راگ ملہار ہے۔ جب آگ لگ جاتی ہے تو یہ راگ فائر انجن کا کام دیتا ہے اور اُس کے گاتے ہی موسلا دھار بارش ہونے لگتی ہے اور لگی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ جیٹھ اور اساڑھ کے زمانہ میں جو مئی اور جون کے مطابق ہوتا ہے یہ راگ گایا جاتا ہے۔ اس کے گانے کا مقررہ وقت دوپہر سے دن باقی رہے تک ہے۔

سنگیرن ۱۔ سارنگ۔ ۲۔ دیوگری۔ ۳۔ کاتی۔ ۴۔ نٹ۔ ۵۔ گورسارنگ۔

سالنگ۔ ۱۔ کدارا۔ ۲۔ منگل۔ ۳۔ کوکب۔ ۴۔ مدہمادہ۔ ۵۔ پوریا۔ ۶۔ بردی۔ ۷۔ کھماج۔

(۴) میگھ راگ

ساون بھادون (جولائی اور اگست) کے مہینوں میں عموماً اِس راگ کو گاتے۔ اِس راگ کا مخصوص وقت تو نصف شب سے صبح کاذب تک ہے لیکن اگر ہوا رپڑتی ہو تو دن گذرنے کے بعد سے تمام رات گایا جا سکتا ہے۔

سنکرن - ۱- ملہار - ۲- جھنجوٹی - ۳- کانڑا - ۴- سورٹھ - ۵- سنکرا بھون
سالنگ - ۱- کمودھ - ۲- آڈ آنا - ۳- گونڈ - ۴- بھاگ - ۵ جھنجوٹی - ۶- کلاپرجن
۷- سانونت -

اِن کے علاوہ اور بہت سی راگ راگنیان ہیں لیکن طوالت اور گرانباری خاطر کا خوف دامنگیر ہے۔ مضمون چونکہ فنی ہے اس لئے انہیں چند صفحات پر اکتفا کرتا ہون۔

اِحسان احمد

سال سوم

قیامت کا دِن

ایک مشہور اَدیب نے ایک یہودی سے کچھ روپیہ قرض لیا۔ یہودی نے اِصرار کیا کہ قرض کی ادائی کی کوئی قطعی تاریخ مقرر کر دی جائے۔

اُس اَدیب نے کہا "اچھی بات۔ قیامت کا دن ٹھیک رہے گا"۔ یہودی نے جواب دیا۔ "لیکن جناب۔ اس روز ہم سب بہت مصروف رہیں گے"۔

قرضدار کہنے لگا۔ "صحیح ہے۔ اچھا تو اس کے بعد کا دن کیسا رہیگا؟"

جامعات اور مسئلہ بے روزگاری

پروفیسر پرفل چندر گھوش نے ایک بہت ہی اہم مسئلہ کی طرف رہنمائی کی ہے۔ انکی تجویز پر ذیلی اختلافات کا امکان ہے لیکن ان پر سنجیدگی سے غور کیا جانا بہرحال ضروری ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ جامعات کی ذمہ دار ہستیاں اس کو دلچسپی کی نظر سے دیکھیں گی۔

(مدیر)

حال ہی میں صنعت و حرفت اور تجارت کے ماہرین نے کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت قبول کرکے تعلیم یافتہ بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے متواتر تقریریں کیں تقریریں کس حد تک اس مسئلہ کو حل کرسکیں ؟ ۔ اس کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ لیکن اتنا تو سچ ہے کہ اُن تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو جنھوں نے ان تقاریر کو سنا ہے یا اخباروں میں اُن کے ضمیمے پڑھے ہیں ضرور تسلی ہوئی ہوگی۔ اُن کے متفکر والدین اور عوام کو یہہ اطمینان ہوگیا ہوگا کہ جامعہ ہر سال لڑکوں کا امتحان لے کر بہتوں کو کامیاب کرنے کی صرف مشین ہی نہیں رہی بلکہ مسئلہ بے روزگاری کو حل کرنے کی پُرخلوص کوشش بھی کر رہی ہے۔

مدارس ثانوی میں تعلیم متعلق بہ کلیہ کے ساتھ ساتھ پیشہ وری تعلیم (Vocational Education) بھی دی جاتی تو شائد زیادہ اچھا ہوتا۔ جنگ عظیم کے بعد یورپ کے ممالک میں تعلیم ثانوی کے متعلق خیالات میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ اُن کے نصاب میں ایک تہائی حصہ پیشہ وری تعلیم اور دو تہائی حصہ تعلیم متعلق بہ کلیہ ہے یہہ خیال مشہور ماہر تعلیم سمراسو توش مکرجی کو پسند آیا۔ اور انھوں نے پیشہ وری تعلیم کی اہمیت کو واضح کرنے کی غرض سے صدر مدرسین کی کانفرنس منعقد کی۔ لیکن ان جلسوں سے کچھ نہ ہوسکا کیونکہ اُن مدرسین میں قوت امتیاز۔ پیش بینی و پیش قدمی کی کمی تھی۔ ان دنوں اور خاصکر ہمارے مفلس ملک کے لئے پیشہ وری تعلیم ضروری ہے۔

ان ماہرین فن کو تقریرین کرنے کے لئے دعوت دینے سے قبل کلکتہ یونیورسٹی نے

یہہ سوچا ہوگا کہ کس طرح مسئلہ بے روز گاری کو حل کیا جائے۔ اور ممکن ہے اپنے حدود میں اس مسئلہ کو حل کرنے کی تدبیریں بھی سوچ لی ہوں۔ میں ذیل میں چند تجاویز پیش کرتا ہوں جن کی طرف عہدہ داران جامعہ کی توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر ان تجاویز کو عملی جامہ پہنا دیا جائے تو شاید غیر کی مدد کے بغیر ایک حد تک یہہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

۱۔ جامعاتی بنک

زری فنڈ، کتابوں کی فروخت وغیرہ سے یونیورسٹی کو کئی لاکھ کی آمدنی ہوتی ہے۔
(Nominal Capital) سے وہ اپنے ہی ایک بنک کا افتتاح کر سکتی ہے۔
چند ہنگامی عہدہ داروں کو جو بنکنگ میں مہارت رکھتے ہوں مقرر کر کے اپنے اُمیدواروں کو تربیت دے سکتی ہے۔ یہہ جماعت معمولی وظیفہ پر تین سال تک عملی مشق پاتی رہے گی۔ مشق ختم ہونے پر اس جماعت میں سے چند مختلف صیغوں میں مقرر کئے جا سکتے ہیں اور کئی گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ بنک کے مختلف شعبوں میں جگہ پا سکتے ہیں۔ یہہ تحریک کردہ بنک نہ صرف یونیورسٹی کے لئے رہے گا بلکہ مدرسین، ممتحن، مددگار، و ماتحتین کے لئے بھی۔ اور خارجی یا بیرونی معاملات کی حد تک کلیرنگ بنک (Clearing Bank) کا کام کرے گا کلکتہ کے مختلف کلیسے اقامت خانے وغیرہ بھی اسی بنک کے شرکار بنیں گے اس طرح تحریک کردہ بنک نہ صرف یونیورسٹی کا خزانہ ہوگا بلکہ یونیورسٹی کے طلبار کی عملی مشق کے لئے ایک ادارہ رہیگا۔ ہر سال بنک کا کام بڑھتا جائے گا اور اُس سے فائدہ بھی زیادہ ہوتا جائے گا موجودہ بنکنگ۔ محاسبی۔ و تنقیح حسابات وغیرہ کی تعلیم اچھی طرح سے ہوگی جس کا نتیجہ یہہ ہوگا کہ قابل طلبار نکلیں گے جس لحاظ سے اس میدان میں اہل کلکتہ اس وقت بہت پیچھے ہیں۔ چند سال کے بعد تحریک کردہ تین اور ادارے اس بنک کے سرمایہ سے قائم کئے جا سکیں گے۔ یونیورسٹی کو چاہئے کہ وہ پورے نظام العمل کو عملی جامہ پہنائیں تاکہ یہہ بنک طلبار کے لئے ایک تجربہ خانہ ہو۔

۲- کواپریٹیو اسٹورز

اسی طرح یونیورسٹی اپنے مددگار، مدرسین اور طلبا وغیرہ کو بھرتی کر کے ایک کواپریٹیو اسٹور قائم کرسکتی ہے۔ یہ اسٹور ضروریات اور آسائش کے سامان مہیا کر کے اپنے اراکین کو اچھی خاصی رعایت سے معقول آمدنی کے ساتھ بیچ سکتا ہے۔ ایسے کواپریٹیو اسٹورز کامیاب و فائدہ مند ثابت ہوتے ہیں۔ یہ انسٹوٹیوشن بلڈنگ میں قائم شدہ دوکانوں کی ترقی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان اسٹورز کے سامان بھی بہت جلد فروخت ہوں گے۔ مادر علمی کے لئے وفاداری کا جذبہ تعلیم یافتہ بے روزگار کی بھلائی کی خواہش، امداد باہمی کا سچا جوش، اور کام کرنے کی صلاحیت کواپریٹیو اسٹورز قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ جس سے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کئی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار ملجاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایسے اداروں کو قائم رکھنے کی مشق ہوجاتی ہے۔ طلبا کی عملی زندگی میں یہ تجربہ کام آتا ہے۔ یونیورسٹی بنک کواپریٹیو اسٹور کی آمدنی کے لئے خزانے کا کام دے گا۔

۳- شعبۂ بیمہ

ان دنوں بیمہ کا کاروبار ترقی پارہا ہے۔ یونیورسٹی کامیابی کی توقع کے ساتھ ایک ایسا شعبہ بیمہ کے لئے قائم کرسکتی ہے جس میں جان کا ڈر۔ چوری۔ آگ اور امتحانات میں کامیابی وغیرہ کو اہمیت دی جاتی ہو۔ اس شعبہ میں بھی کئی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمت مل سکتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بیمہ کے کاروبار میں معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کے تمام عہدہ داراں۔ مددگاراں۔ مدرسین۔ وممتحنین وغیرہ معقول شرائط پر اراکین بنائے جاسکتے ہیں۔ پریمیم کی رقم شعبہ کو قائم رکھے گی اور ساتھ ہی ساتھ معقول آمدنی بھی ہوگی۔ جس کی وجہ سے شعبہ ترقی پائیگا۔ مجرائی رقوم Moneys on Credit یونیورسٹی بنک میں جمع کئے جائیں گے۔

۴- شعبہ جلد سازی۔ اسٹیشنری وصنعت

نئی کتابوں کی طباعت کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی ایک شعبہ جلد سازی کے لئے بھی قائم کرسکتی ہے

جس میں کئی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمت مل سکتی ہے۔ اور جلد سازی میں طلبا کو مشق بھی ہو جاتی ہے اور اسی شعبہ کے تحت اسٹیشنری سامان کی تیاری۔ طباعت۔ رنگوائی۔ کندہ کاری۔ وغیرہ بھی سکھائی جاسکتی ہیں۔ اس شعبہ کی تمام آمدنی یونیورسٹی بنک میں جمع کر دی جائے گی۔ اس طرح اس کا کام و سرمایہ بڑھے گا۔

قانون کے تحت یونیورسٹی بنک کا کاروبار کر سکتی ہے یا نہیں اس کے متعلق پورے معلومات نہیں ہیں لیکن اگر قانون کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہے تو جامعہ کو چاہئے کہ وہ حکومت پر واضح کر دے کہ اس طرح کے عمل سے بے روزگاری کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اس کے فائدوں کے مد نظر حکومت کو کوئی عذر نہ ہوگا۔ شعبہ بیمہ کے قائم ہونے سے نہ صرف جامعہ کے ملازمین کو فائدہ پہونچے گا بلکہ بآسانی طلبائے موجودہ بیمہ کے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ کوآپریٹیو اسٹورز قائم کرنے میں بھی حکومت کو کوئی عذر نہ ہوگا کیونکہ حکومت نے خود کئی جگہ ایسے اسٹورز قائم کئے ہیں اور قائم کرنے میں مدد دی ہے۔ جن جامعات میں اشاعت کے شعبے قائم ہیں انھیں چوتھی تجویز کو عمل میں لانے کے لئے کوئی دقت نہ ہوگی کیونکہ اس سے صرف شعبے کی توسیع ہوتی ہے۔ اصل غرض تو یہہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمت ملے اور طلبا کو مشق حاصل ہو۔

تجارتی معاملات میں جانے سے جامعہ کو جھجکنا نہیں چاہئے کیونکہ وہ اشاعت وغیرہ کے ذریعہ تجارت میں کافی حصہ لے چکی ہے۔ بلکہ ایسے معاملات میں مسئلہ بے روزگاری کے مد نظر جامعہ کو پیش قدمی کرنی چاہئے۔ اور خصوصاً ہندوستان جیسے مفلس ملک میں کسی جامعہ کے زیر سرپرستی تقاریر ہونے سے یہہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ جامعہ خود اس مسئلہ کو حل کرنے کی پرخلوص کوشش نہ کرے مسئلہ کے حل ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ان تجاویز کو منظور کرنے میں حکومت کو کوئی پس و پیش نہ ہونا چاہئے کیونکہ ان تجاویز کو عمل میں لانے کے معنی ایک اہم مسئلہ کو حل کرنا ہے لیکن ان نئے اداروں کو قابو میں رکھنے کے لئے اپنے عہدے داروں کو نگرانی کے لئے بھیجنا چاہئے۔ ان نئے اداروں میں ملازمت کو ڈھونڈھنے والوں کو چاہئے کہ وہ وفاداری اور راست بازی سے کام کرنے کی کوشش کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی لاپروائی کی وجہ سے ان نئے اداروں کو نقصان اٹھانا پڑے۔

(ترجمہ۔ پرفل چندر گھوش)

س۔ ہیمنت راؤ (سال سوم)

شیام نہ ابتک آئے

ساون کی وہ بھیگی راتیں
ہلکی ہلکی سی برساتیں
چپکے چپکے من کی باتیں
جیا مورا گھبرائے....... شیام نہ ابتک آئے..... سکھی ری

اُس بن ساری باتیں سونی
دن سونے اور راتیں سونی
پریم کی ساری گھاتیں سونی
کون نگریا بسائے...... شیام نہ ابتک آئے..... سکھی ری

بانسری میٹھی اُس کا بجانا
سوئے ہوئے ہردے کا جگانا
پریم کا دیپک من میں جلانا
یاد سنجوا آئے..... شیام نہ ابتک آئے...... سکھی ری

میں دکھیاری پریت کی ماری
سوگ کی گٹھری سر پر بھاری
بھٹکے پھرے ہوں ڈگریا نیاری
راہ یہ کون لگائے...... شیام نہ ابتک آئے...... سکھی ری

نیر بھرن جب جاتی اکیلی
شیام کرت تھے مو سے اٹھکیلی
باجت ایسی بانس سریلی

من مورا تڑپائے .... شیام نہ ابتک آئے .... سکھی ری

چھوڑ کے جانا تھا جو ہم کو
موہ لیو پھر کیوں مورے من کو
جیون سے ہے ناتا کس کو

یاد میں کیوں تڑپائے ،.... شیام نہ ابتک آئے .... سکھی ری

یا وہ ہمرے دیس آجائیں
یا اپنے ہی پاس بلائیں
بچھڑے تھے سو یوں مل جائیں

پریت کی جیت ہو جائے .... شیام نہ ابتک آئے..... سکھی ری

میر حسین علی

(سال سوم)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبالؒ

وہ راجکماری اَجنیتا تھی جس کے جمالِ دلفروز کو راجہ نارائن کے درباری شاعر شنکھر کی آنکھیں ابتک نہ دیکھ سکیں جب کبھی وہ مہاراج کو ایک نئی نظم سُنانے بیٹھتا تو اپنی دلکش اور ترنم ریز آواز کو اتنی بلند کرتا کہ اُس کے سحر خیز نغمے محل سرا کے اس پار جاتے —— اس بلند و فلک سیر بالکنی تک جہاں پردے کے پیچھے چند نظر نہ آنے والے سامعین گوش برآواز بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ اپنی بلند آواز کو ستاروں کی اس انجمن تک پہنچاتا تھا جس کو اس نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا —— اس نورانی انجمن تک جہاں اس کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا مگر غائبانہ طور پر اور حدِ نظر سے بھی بعید! ! اس بزم میں جہاں نگاہ تو کیا عقلِ رسا کی بھی رسائی نہیں ہوسکتی اور جذبِ دل کی تاثیر کو مشکل سے بار ملتا ہے شاعر کی آواز باآسانی داخل ہوجاتی ہے آہ! وہ بزم کتنی قریب ہے اور پھر بھی کتنی دُور! ! !

شنکھر کو ہر روز پسِ پردہ ایک سایہ سا گذرتا ہوا نظر آتا تھا اور اس کے ساتھ ہی گھنگروں کی ایک ہلکی سی جھنکار سنائی دیتی تھی۔ یہ آواز اس کو تصورات کی ایک غیر فانی دنیا میں پہنچادیتی تھی جہاں وہ بیٹھا ہوا اس خلخال کو دیکھا کرتا جس کے طلائی گھنگروں سے ہر قدم پر یہ قیامت خیز نغمے نکل رہے تھے۔ وہ اُن نازک گلابی پیروں کو بصد حسرت و یاس تکتا رہتا جو زمین کو زیرِ بارِ احسان کر رہے تھے۔ وہ بلوریں قدم زمین پر اس طرح پڑ رہے تھے جس طرح خدا کی رحمت گنہ گاروں پر! ! شاعر نے اُن قدموں کو اپنے دل میں جگہ دی تھی اور اس کی دلکش راگنیاں اور نغمے اُن طلائی گھنگروں کی آواز کے ساتھ ہم آہنگی کر رہے تھے۔ یہ آواز اس کے دل کی ہر ضرب کے ساتھ سُر ملا رہی تھی۔ وہ اِس پردہ کے پیچھے بار بار گذرنے والی شئے سے بخوبی واقف تھا۔ وہ راجکماری اَجنیتا تھی جس کے جمالِ دلفروز کو وہ ابتک نہ دیکھ سکا! ! !

کیشر کی ہر نظم پُر اثر تھی خصوصاً جس نظم نے فقیر سے لیکر بادشاہ تک کے دل پر اثر کیا وہ کرشن

اور رادھا کی داستانِ عشق تھی۔ ایک غیر فانی مرد اور ایک غیر فانی عورت کا تذکرۂ محبت، فرقت کی مصیبتیں جو ابتدائے عالم سے ان پر پڑ رہی تھیں اور آخر کو مسرت وصال جس کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ یہ تھا نفس مضمون اُس نظم کا جس کو سُنکر ہر شخص سر دھن رہا تھا۔ جب چاند اپنی ہلکی ہلکی شعاعیں رُوئے زمین پر ڈالتا ہے۔ اور ہوا کے سرد جھونکے چلنے لگتے ہیں۔ شنکر اپنا گانا شروع کرتا ہے خشکی میں در و دیوار سے اور سمندر میں پانی کی بیقرار موجوں اور جہاز کے لہراتے ہوئے پردوں سے بھی اسی کے پرافسوں نغمے سنائی دیتے تھے یہاں تک کہ درختوں کی سرسراہٹ سے بھی اُسی کی آواز آنے لگتی ہے۔

اِس طرح ہنسی خوشی سے کئی دن گذر گئے۔ درباری شاعر شنکر ہر روز گاتا رہا اور مہاراج نارائن سنتے رہے۔ سامعین جوش مسرت سے اُس کی تعریف کرتے رہے۔

محل سرا میں بالکنی کے پردہ پر ایک سایہ سا ہر روز گذرتا رہا اور دور سے طلائی گھنگروؤں کی آواز پہلے کی طرح ہر روز برابر آتی رہی۔

ایک روز جبکہ راجہ نارائن مہاراجہ اَمن پور سر دربار بیٹھا ہوا تھا ایک شاعر پنڈارک نامی داخل ہوا۔ اس نے پہلے آتے ہی راجہ کی مدح میں چند بند پڑھے اور پھر راجہ کے درباری شاعروں کو مقابلہ کی دعوت دی اگر کوئی ہمت والا صاحب کمال ہو تو سامنے آئے۔ اور اس سے فن موسیقی میں مقابلہ کرے۔ پنڈارک ایک مشہور شاعر تھا اور فن موسیقی میں بلا کی مہارت رکھتا تھا۔ ابتک وہ جس دربار میں گیا اس کا خوشی سے استقبال کیا گیا اور اس نے جس سے مقابلہ کیا کامیاب رہا۔

راجہ اس کو لینے کے لئے آگے بڑھا اور بہت عزت و احتشام سے اُس کا اِستقبال کیا۔ پنڈراک نے مغرورانہ انداز میں جواب دیا "مہاراج! میں مقابلہ کے لئے آیا ہوں"!

شنکر کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ موسیقی میں کس طرح مقابلہ کیا جاتا ہے۔ رات بھر اس کو اسی فکر میں نیند نہ آئی۔ پنڈراک کی رعب دار صورت، ستوان ناک اور اس کا سر پرغرور صبح تک شنکر کی آنکھوں میں پھرتا رہا۔

صبح ہوئی اور وقتِ مقررہ پر شنکر دربار میں داخل ہوا مگر خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ دل بیٹھا جاتا تھا۔ مجمع ایسا تھا کہ دربار میں تل دھرنے بھی جگہ نہ تھی۔ شنکر نے اپنے حریف کو مُسکراتے ہوئے پرنام کیا۔ پنڈراک نے فقط سر کے اِشارہ سے اُس کے سلام کا جواب دیا اور فوراً اپنے مداحوں کی

طرف منہ پھیر کر مسکرانے لگا۔

شکھر نے بھی محل سرا کے پردہ پر ایک نظر ڈالی اور دل ہی دل میں اپنی مالکہ کو یہ کہتے ہوئے سلام کیا کہ "اے راجکماری! اگر میں آج کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاؤں تو تیرا ہی نام دنیا میں روشن ہوگا۔"

ترھی بجنے لگی۔ سارا مجمع اُٹھ کھڑا ہوا اور بیک آواز پکار اُٹھا۔ "مہاراج کی جئے!" راجہ سفید براق سی پوشاک زیب تن کئے بہت ہی آہستگی کے ساتھ دربار میں اس طرح داخل ہوا جس طرح موسم خزاں کے ابر کا ایک ٹکڑا! چاروں طرف ایک مستجسانہ نگاہ ڈالی اور تخت پر بیٹھ گیا۔

پنڈارک اُٹھ کھڑا ہوا۔ سارے دربار پر ایک ہیبت ناک خاموشی طاری ہو گئی۔ اس نے اپنا سر اونچا کیا اور سینہ تان کر اپنی مخصوص گرجتی ہوئی آواز میں راجہ نارائن کی مدح میں ایک نظم پڑھنے لگا اس کی خوفناک آواز سارے دربار میں گونجنے لگی۔ اس کی صدائے بازگشت سمندر کی تلاطم خیز موجوں کی طرح ہر در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی۔

راجہ نے شکھر پر ایک نظر ڈالی اور اُس نے بھی تھوڑی دیر تک مایوس نگاہوں سے راجہ کو دیکھا۔ جس طرح ایک پیاسا زخمی ہرن دریا کے کنارے پر پڑا ہوا پانی کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہے یہی حالت شکھر کی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل زرد تھا وہ عورت کی طرح شرما رہا تھا۔ اُس کا دُبلا پتلا نازک سا جسم ایک سِتار کی متشکل مثال پیش کر رہا تھا جس میں رنگینیوں اور مختلف مضمون کے خزینے دبے پڑے ہیں اور جو مضراب کی ایک چھیڑ کے محتاج ہیں۔

شکھر سر بزانو بیٹھا ہوا تھا اور جب اُس نے گانا شروع کیا تو اس کی آواز بالکل پست ہو گئی۔ شروع کے دو تین شعر تو تقریباً سنائی بھی نہ دیئے۔ تب اُس نے آہستہ سے اپنا سر اُٹھایا جو آواز لوگوں کے کانوں تک نہ پہنچ سکتی تھی وہ اَب ہر ایک کے دل میں اُتر گئی اور سارے دربار میں بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح پھیل گئی۔

اُس نے اگلے زمانے کے واقعات سے اِبتدا کی اور ان تمام راجاؤں کے حالات و واقعات ان کی مشہور لڑائیوں اور ان کی فیاضیوں اور سخاوتوں کی داستانیں بیان کرتے ہوئے موجودہ دور کے راجہ نارائن کے حالات بہت ہی عقیدت مندی کے ساتھ بیان کئے اس کی نگاہیں راجہ کے

چہرہ پر بھی ہوئی تھیں اُس کے ہر لفظ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آقا اور اس کے خاندان سے دلی محبت، وفاداری اور عقیدتمندانہ جاں نثاری رکھتا تھا۔ اور جب اس نے اپنا گانا ختم کیا اور ہانپتے کانپتے اپنی جگہ جا بیٹھا تو اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا "میرے آقا! مجھے الفاظ کی ہیر پھیر اور آواز کی اتار چڑھاوے سے شکست دیجا سکتی ہے مگر یہ چیزیں محبت و وفاداری کے اُس جذبہ کو شکست نہیں دے سکتیں جو میں تیرے لئے اپنے دل میں رکھتا ہوں"۔ سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دربار کے سنگین در و دیوار فتح کے فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگے۔ لوگوں کے اظہار جذبات کی تحقیر اور اُن پر حقارت آمیز طعن و تشنیع کرتے ہوئے پنڈارک یکبارگی اُٹھ کھڑا ہوا اور مجمع سے اِس طرح مخاطب ہوا۔

"الفاظ سے اعلیٰ تر اور کونسی چیز ہوسکتی ہے"؟ ایک لمحہ میں سارے دربار پر سناٹا چھا گیا:۔

پنڈارک نے اپنے علم کے زور سے ثابت کیا کہ ابتدائے آفرینش میں بھی الفاظ موجود تھے اور یہ کہ انہی الفاظ کے مجموعہ کا نام خدا یعنی جامع صفاتِ کمال ہے۔ اُس نے اپنے بیان کی موافقت میں کئی مثالیں دین اور کئی مقدس کتابوں کا حوالہ دیا اور دوبارہ اپنی مخصوص آواز میں وہی سوال کیا "الفاظ سے بڑھکر اور کونسی چیز ہوسکتی ہے"؟

وہ مغرورانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کسی کو اس کا دعویٰ قبول کرنے کی جرات نہ ہوئی اور اس خونخوار شیر کی طرح جس نے ابھی کسی جانور کا شکار کیا ہو۔ وہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ جتنے پنڈت تھے سب کے سب اُس کی تعریف میں تر زبان ہوئے۔ راجہ حیرت و استعجاب میں خاموش بیٹھا رہا اور بیچارہ شیکھر تو اِتنا خفیف ہوا کہ اپنے آپ کو پنڈارک کے مقابلہ میں بالکل حقیر سمجھنے لگا۔ اِس طرح اُس روز تو جلسہ برخاست ہوگیا۔

دوسرے دن شیکھر نے گانے کی ابتدا کی۔ ایک ایسا ہی دن تھا جبکہ کرشن بھگوان نے رادھا کی یاد میں محبت کے گیت گائے تھے اور اپنی بانسری کی سُریلی آواز سے سارے عالم کو مسحور کر دیا تھا۔ جنگل میں نسیم صبح دم گرفتہ حیرت و استعجاب میں کھڑی سُن رہی تھی۔ دیہاتی عورتوں کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ یہ گانے والا کون ہے اور یہ آواز کہاں سے آرہی ہے مشرق کی طرف سے یا پہاڑ کی چوٹیوں پر اُڑنے والے بادلوں سے؟ وہ خوشی کے نغمے نہیں تھے بلکہ درد و غم سے بھری ہوئی آہیں تھیں جو کسی کے مایوس دل سے نکل رہی تھیں۔ آسمان پر تارے اُس باجے کے دھقنے معلوم ہورہے تھے

جس کے نغمے رات کی خاموش فضاؤں میں ہر طرف گونج رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف سے موسیقی کی لہریں رہ رہ کر اٹھتی تھیں۔ الحاصل کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں نغمے نہ نکل رہے ہوں۔ آج کا گانا بھی بالکل اُسی قسم کا تھا۔

شنکر بیخود ہو گیا۔ اَب وہ کسی خیال میں مستغرق کھڑا تھا۔ اُس کا کمزور جسم سوکھے ہوئے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اُس کے دل میں کسی کا تصور چٹکیاں لے رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک سایہ سا اُس کے دل و دماغ پر چھا گیا اور اُسے بالکل سحر کر لیا۔ اُس کے کانوں میں کسی کے طلائی گھنگروں کی ہلکی ہلکی سی جھنکار محسوس ہو رہی تھی اور کسی کے نازک قدموں کی آواز آ رہی تھی۔

اُس نے گانا ختم کیا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا سامعین اُس کی خوش نوائی سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے۔ اور وہ اسی محویت کے عالم میں اس کی ہمت افزائی کرنا بھول گئے۔ جب لوگوں کا یہ جوش کم ہوا تو پنڈارک پھر راجہ کے تخت کے قریب اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے حریف سے اپنی مخصوص آواز میں سوال کرنا شروع کیا "یہ عاشق کون تھا اور یہ معشوقہ کون تھی"؟ پھر اس نے متکبرانہ انداز میں شنکر کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اپنے مداحوں کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

شنکر کی طرف سے جواب نہ پا کر اس نے ان الفاظ کے مادوں اور اُن کے مختلف معنوں کی تصریح و توضیح کرنی شروع کی اور ہر مذہب کے حقائق و معارف بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے بیان کئے اس نے کرشن اور رادھا کے حرفوں کو اپنی منطق کے زور سے علیحدہ علیحدہ کئے اور پھر ان کو اس پھرتی کے ساتھ جوڑا کہ اس کے کچھ عجیب معنے نکل آئے اور اُس کے یہ توڑ جوڑ اچھے سے اچھے زود رس پنڈت اور قابل سے قابل ودیارتھی کی بھی سمجھ میں نہ آ سکے۔ اس کے اِس حسن کلام پر سارے پنڈت سر دُھن رہے تھے۔ پبلک نے بھی پنڈارک کی قوت متخیلہ کا دل سے اِقرار کرتے ہوئے پنڈتوں کا ساتھ دیا۔ اسکے علمی کمالات سے وہ ایسے محظوظ ہوئے کہ انہوں نے اتنا سوچنے کی بھی تکلیف نہ کی کہ آیا اُن کمالات کی کوئی اصلیت بھی ہے یا نہیں۔

راجہ متحیر بیٹھا ہوا تھا۔ فضا موسیقی کے نغموں سے بالکل خالی ہو چکی تھی۔ دربار میں ہر طرف ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے ان کو اپنا درباری شاعر اس دیو کے مقابل میں جو الفاظ و تخیل کا مرد میدان تھا، ایک چھوٹا سا بچہ نظر آنے لگا۔ شنکر نے جو نظمیں پڑھیں وہ اُنہیں ایسی آسان اور

سلیس معلوم ہونے لگیں کہ انہوں نے خیال کیا کہ اگر وہ ذرا بھی اپنے دماغ پر زور ڈالیں تو اس سے بہتر نظمیں لکھ سکیں۔ ان کی نظروں میں شنکھر کے اشعار میں نہ تو نیاپن تھا اور نہ کچھ دقائق، ان میں کچھ عبرت ونصیحت تک بھی نہ تھی۔ اور سچ پوچھو تو وہ بالکل غیر ضروری اور بیکار تھے۔

راجہ نے شنکھر کو ترچھی نظروں سے بہت کچھ اشارے کئے اور ہر ممکنہ کوشش کی کہ وہ پھر ایک آخری مقابلہ کرے۔ مگر شنکھر اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا رہا۔ راجہ غصے میں بھرا ہوا تخت سے اترا اور ایک موتیوں کا مالا اپنے گلے سے نکال کر پنڈارک کو پہنا دیا۔ حاضرینِ محفل فرطِ مسرت سے پھولے نہ سمائے محلسرا کے اندر خفیف سی سرسراہٹ اور طلائی گھنگروؤں کی ہلکی ہلکی سی آواز آنے لگی۔ شنکھر اپنی جگہ سے اٹھا اور دربار کے باہر چلا گیا۔

اندھیری رات تھی۔ شنکھر کسی خیال میں غلطاں اٹھا اور اپنے گھر کی محرابوں سے کتابیں نکالکر صحن میں ایک ڈھیر لگا دیا۔ اس میں اس کے کئی مضامین اور نئے اور پرانے کلام کا مجموعہ بھی تھا۔ اس نے دو ایک کتابیں کھولیں اور سرسری طور پر مطالعہ شروع کیا۔ یہ تمام نظمیں اس کو بالکل ہی معمولی بلکہ بے معنی معلوم ہونے لگیں۔ صرف الفاظ کا مجموعہ تھا جو اشعار کی شکل میں نظر آتا تھا۔ ایک کے بعد ایک اس نے ساری کتابیں پھاڑ دیں اور سب کو آگ لگا دی۔ رات بڑھتی گئی۔ گھر کے باہر طلائی گھنگروؤں کی ہلکی ہلکی سی جھنکار سنائی دینے لگی اور ہوا کے عطر بیز جھونکے کمرہ میں آنے لگے۔ شنکھر بیہوش تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ایسی حالت میں وہ کہنے لگا "پیاری اجیتا! کیا تمہیں اپنے نوکر پر آخر رحم آ ہی گیا؟ راجکماری! کیا تم مجھے دیکھنے آئی ہو! میرے دھن بھاگ"!!

بہت ہی ہلکی اور پیاری آواز میں جواب ملا "پیارے کوی! میں آ گئی ہوں"۔ شنکھر نے آنکھیں کھولدیں اور سرہانے راجکماری اجیتا کو کھڑی ہوئی پایا۔ اس کی آنکھیں پتھرانے لگیں وہ صورت جو عمر بھر شنکھر کے دل میں جلوہ فگن رہی، وہ شکل جس کی یاد اور جس کا تصور اس کو ہر وقت تسکین واطمینان بخشتا رہا۔ وہ لڑکی جو دل کے مندر میں ایک پاک دیوی کی طرح بیٹھی ہوئی تھی آج شنکھر کے روبرو اس کے افسردہ و پژمردہ چہرے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

راجکماری نے کہا "کبشیر میں اجیتا ہوں"! شنکھر بہت ہی تکلیف سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔

راجکماری نے آہستہ سے اُس کے کان میں کہا

"کوی! راجہ نے تمہارے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔ دراصل وہ تمہیں تھے جو اس موسیقی کے مقابلہ میں کامیاب رہے۔ پیارے کشیر میں تمہارے سر پر فتح کا سہرا باندھنے آئی ہوں"

اُس نے اپنے گلے سے پھولوں کا ہار نکالا او شکھر کے گلے میں ڈالدیا۔ جونہی اجیتیا نے ہار پہنایا شکھر اپنے بستر پر گر گیا۔

شاعر مر چکا تھا۔!!!

(ترجمہ از ٹیگور)

محمد عبدالقوی

(سال چہارم)

پھول اور کانٹے

نابینا ملٹن نے ایک عورت سے شادی کی جو بڑی "ظالم" تھی۔ ایک دوست نے شاعر ملٹن کو اُس کے انتخاب پر مبارکباد دینے کی غرض سے کہا کہ آپ کی بیوی تو ایک گلاب ہے۔

ملٹن نے کہا "میں اندھا ہوں۔ رنگ کا حال میں کیا جانوں ؟ لیکن ممکن ہے کہ تمہارا خیال درست ہو۔ کیونکہ میں روزانہ کانٹوں کی چبھن محسوس کرتا ہوں"

فسطائیت

انسان کی زندگی ایک پہیہ سے مشابہ ہے جو ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ اس کی ہر گردش ایک نیا دَور اور ایک نیا منظر پیش کرتی ہے۔ زندگی کے یہہ تغیرات ازلی ہیں اور ابد تک ان کا سلسلہ قائم رہے گا۔ انسان کی زندگی کے کسی پہلو پر بھی ہم نظر ڈالیں تو وہی تغیر ہر جگہ دکھائی دے گا۔ ہم کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہتے اور نہ فطرت اس چیز کو گوارا کرتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہماری یہہ تمام سرگرمیاں اور ترقیاں خواب پریشاں ہوتیں۔ جب ہم انسانی زندگی کے سیاسی پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہاں بھی وہی چیز نظر آتی ہے۔ ارسطو نے انسان کو "سیاسی جانور" کہا ہے۔ اور اسی زبردست یونانی فلسفی نے حکومت کے ان تغیرات کی بھی تشریح کی ہے جو وقتاً فوقتاً صفحۂ ہستی پر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ارسطو کے مُطابق سب سے پہلا طریق حکومت بادشاہت تھا جو بعد میں حکومت اشرافیہ میں تبدیل ہو گیا۔ تیسرا دَور عدیدیہ (Oligarchy) ہے جہاں حکومت اور قوت کا معیار دولت ہے۔ اس دور کے بعد استبدادیت (Tyranny) اور آخر میں جمہوریت کا دَور آتا ہے، یہہ چکر جو نہی اختتام کو پہونچتا ہے پھر اس میں از سرِ نو حرکت شروع ہو جاتی ہے اور تاریخ خود کو دھرانا شروع کرتی ہے۔

اس مضمون میں جس طریق حکومت پر ہم بحث کرنے والے ہیں وہ چوتھا یعنی آمریت کا دور ہے۔ گذشتہ جنگ عظیم نے یورپ کی سیاسی دنیا میں عجیب و غریب تبدیلیاں پیدا کیں۔ حکومتوں کی تقدیر نے کئی پلٹے کھائے اور نت نئے گل کھلے۔ ان تغیرات میں جو اس جنگ کے صریح نتائج کہلائے جا سکتے ہیں فسطائیت کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہہ وہ چیز ہے جس نے انسان کے سماجی، معاشی، اور سیاسی نقطہ نظر کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ جنگ عظیم کا زمانہ یورپ کی سیاسی زندگی میں انتہائی کشمکش کا دور تھا۔ اس یادگار دور میں عوام کو عظیم الشان قربانیاں کرنی پڑیں چنانچہ اختتام جنگ کے بعد یہہ خیال کیا گیا کہ عوام کی زندگی خوشگوار بنانے کے لئے دستور حکومت میں بہت کچھ

اصلاح و ترمیم ہو گی۔ مگر ان تمام امیدوں کو مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ قدرتاً ایسی حالت میں اکثر یاس نے یہہ نتیجہ اخذ کیا کہ جمہوری پارلیمانی ادارے بذات خود ان سماجی معاشی کمزوریوں اور خامیوں کو رفع کرنے سے قاصر رہے جمہوریت ہی کو ان تمام خرابیوں کی جڑ تصور کیا جانے لگا۔ اس سے پہلے بھی والٹیر، ہیگل۔ نطشے وغیرہ نے اس طریق حکومت کو نشانہ ملامت بنایا تھا۔ جنگ نے اس کا رہا سہا اعتبار بھی غارت کر دیا۔ افلاس و مصیبت کے مارے عوام نے یہہ خیال کیا کہ نمائندہ مقننہ سے کچھ کام چلتا نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ جنگ نے کچھ ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس میں شخصی حکومت اور آمریت نہایت آسانی سے نشو نما پا سکتی تھی اور عوام کسی ایسے رہنما کے متلاشی تھے جو انھیں نجات کا راستہ دکھلائے۔ اطالیہ نے ایسا رہنما مسولینی کی شکل میں پیدا کیا۔ جنگ کے بعد اطالیہ کی حالت فسطائیت کے لئے موزون ترین تھی۔ قومی اتحاد مفقود تھا۔ جمہوری اداروں میں جمہوریت کی اصلی روح ناپید تھی۔ فرقہ واری کشمکش اور جنگ ملک کی سیاسی زندگی کا جزو لاینفک بن گئی تھی اشتراکی فرقہ دن بدن قوی ہوتا جا رہا تھا۔ اور اشتراکی بغاوت کا دن زیادہ دور نہ تھا۔ یہہ شدید بغاوتیں جو نہ صرف قومی استحکام بلکہ اس کے وجود کے لئے خطرناک تھیں مسولینی کے ہاتھوں تباہ کر دی گئیں۔

مسولینی اپنی جوانی میں اشتراکی تھا اور اس نے مارکس ہیگل۔ میکسولی نطشے سورل وغیرہ کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اس زمانہ میں اشتراکیت کو اپنا نصب العین بنایا اور اسی بنا پر مسولینی کو سوئزرستان اور آسٹریا سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ اور خود اپنے وطن میں وہ کئی دفعہ قید ہوا۔ جنگ کے چھڑ جانے کے بعد مسولینی نے شرکت جنگ کی حمایت کی اس وجہ سے اسے اشتراکی جماعت سے خارج کر دیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں فوج میں بھرتی ہو کر اس نے جنگ میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں وہ سخت زخمی ہوا اور وطن لوٹنے پر مجبور ہو گیا۔ اس زمانے میں مسولینی نے خود کو صحافت اور سیاسی مظاہروں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۱۹ء میں اس نے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی جس کا نام (Fasci di combatliments) تھا اور جس کے افراد کا مقصد فلاح ملک کے لئے زندہ رہنا یا جان قربان کرنا تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء تک فسطائی کافی منظم اور مستحکم ہو گئے دو سال اشتمالیت کی مخالفت میں صرف ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں اشتمالیوں نے عام ہڑتال کا اعلان کیا۔ ملک کی حالت بہت ابتر تھی۔ ریلوے۔ تار۔ اور ٹیپہ کے مزدور اکثر ہڑتال کرتے جس سے نہ صرف عوام کو تکلیف

ہوتی بلکہ حکومت کے ذرائع حمل ونقل بھی درہم برہم ہو جاتے۔ اشتراکی جماعت نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اور ان تمام بے چینیوں کی وجہ وہ معاشی بتاتے تھے مگر اصل میں ان کا مقصد ان ذرائع سے حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ یہہ ان کی سیاسی چال تھی اشتراکیوں کا مقصد قائم شدہ حکومت کو تباہ کر کے اطالیہ میں اشتمالیت کا قائم کرنا تھا۔ جیسا کہ مسولینی خود اپنی سوانح میں لکھتا ہے کہ ان تمام نقابلوں کے پیچھے اس فرقہ کی خواہش صرف یہی تھی کہ اطالیہ میں بھی روسی اشتمالیت قائم ہو جائے۔ اس خطرہ کا علاج اگر کچھ ہو سکتا تھا تو وہ صرف فسطائیت ہی تھی۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں جب اشتراکیوں نے عام ہڑتال کا اعلان کیا تو قدرتاً حکومت کی نظریں فسطائی جماعت کی جانب اٹھیں۔ مسولینی کی جماعت نے حکومت کی مدد کرنے کا تصفیہ کیا اور یہہ ہڑتال چوبیس گھنٹوں میں ختم ہو گئی۔ ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء میں مسولینی نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اس طرح کئی ہزار اشخاص فسطائی جماعت میں شرکت کے لئے دوڑے۔ اکتوبر میں قریب چالیس ہزار اشخاص نے نیپلس میں جمع ہو کر یہہ اعلان کیا کہ اگر انھیں حکومت نہیں دی گئی تو وہ دار الحکومت پر حملہ کر دیں گے۔ سائینر فیکٹا نے جو اس وقت وزیر اعظم تھا، مارشل لا کا اعلان کرنا چاہا مگر شاہ اطالیہ نے نہایت تدبر سے کام لیتے ہوئے اس اعلان پر اپنے دستخط کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح کئی ہزار جانیں تلف ہوتے ہوتے رہ گئیں اور مسولینی کا روم پر تاریخی اور اہم اقدام بغیر کسی جنگ وجدل کے عمل میں آیا۔ اس کے بعد سے مسولینی ہی اطالیہ کا حقیقی حکمران تصور کیا جا سکتا ہے۔

اس مختصر مضمون میں یہہ غیر ممکن ہے کہ فسطائیت کے اُصول اور اس کے طریق حکومت پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔ کوشش اس امر کی کی جائے گی کہ فسطائیت کے اہم اور نمایاں عقائد کو ہم مختصر پیرایہ میں بیان کریں۔ فسطائیت میں انسان کو انفرادی حیثیت سے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اس کے اصول کے مطابق ریاست ہی اہم ترین سماجی ادارہ ہے۔ ہر فرد کا وجود ریاست کے لئے ہے۔ اس کا مقدس فریضہ حکومت کی اطاعت اور خدمت کرنا ہے۔ "جو کچھ ہو ریاست کے اندر ہو نہ اس کے باہر اور نہ اس کی مخالفت میں" یہہ فسطائیت کا مقولہ ہے۔ فسطائیت ریاست کی اخلاقی اور قانونی مطلق العنانی پر زور دیتی ہے اور انسانی مساوات کی مخالفت کرتی ہے۔ جمہوری نعرے "آزادی مساوات اور اخوت" کے بجائے فسطائی "ذمہ داری۔ فرمانبرداری اور

کلیسائی حکومت" کے نعرے لگاتے اور اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ وہ انسانی مساوات کی مخالفت کرتے ہوئے یہہ ضروری تصور کرتے ہیں کہ حکومت کو ایک مختصر جماعت کے تفویض کیا جائے جو حکومت کرنے کے قابل ہو۔ قوت فسطائیت کی روح ہے۔ اور قوت کے ذریعہ سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے میں وہ پس و پیش نہیں کرتے انھیں اصولوں کے تحت جبشہ اور البانیہ کو فتح کیا گیا۔ فسطائی جنگ کے مخالف نہیں ان کا خیال ہے کہ جنگ کرنا انسانی فطرت ہے۔ وہی قوم ترقی کرسکتی اور زندہ رہ سکتی ہے جو ہمیشہ جنگ کے خطرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے لئے تیار رہے۔ فسطائی اسی اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔

اطالیہ صرف ایک جماعتی ریاست ہے اور وہ فسطائی جماعت ہے۔ اس جماعت کی مخالفت قانونی جرم ہے جس کے لئے سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے۔ حکومت کی نکتہ چینی بھی جرم تصور کیا جاتا ہے۔ ملک کے تمام ذرائع پر حکومت قابض ہے۔ اخبار کی آزادی۔ اور آزادی رائے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ فسطائیت بغاوت کا نتیجہ ہے۔ اور بہت ممکن ہے اسی کے ذریعہ سے اس کا خاتمہ ہو اس لئے وہ تمام تدابیر اختیار کئے گئے ہیں جن سے حکومت کو ان خطروں سے محفوظ رکھا گیا ہے۔

تعلیم پر حکومت پوری طرح نگرانی رکھتی ہے اور نصاب اس قسم کا تیار کیا گیا ہے کہ بچپن ہی سے بچوں کو فسطائی اصول اور حکومت کا دلدادہ بنادے ان میں ایسی ذہنیت پیدا کی جاتی ہے جس کے باعث وہ اپنی ذاتی رائے رکھنا نہیں جانتے اور جانوروں کی طرح مطیع بنائے جاتے ہیں۔ عورتوں کے باب میں فسطائی نقطہ نظر قدامت پسند ہے کیونکہ وہ یہہ خیال کرتے ہیں کہ عورت کا صحیح دائرہ عمل اس کا گھر ہے اور اس کا کام صرف آبادی کو قائم رکھنا اور بڑھانا ہے۔

فسطائیت کا معاشی اصول قومی بہبودی ہے وہ "لیسز فیر" (Laissez faire) اور جمہوری ملکیت کے خلاف ہے۔ تمام معاشی اور صنعتی معاملات فنی اور پیشہ ور مجالس کے تحت اور تابع ہیں۔ سیاست میں فسطائیت خود مختاری اور حکومت چاہتی ہے۔ جو اہم جماعتوں یا فرقوں کی نمائندگی کرے اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور جس کے احکام میں کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جاسکے۔ فسطائی جمہوریت کے اس خیال کی مخالفت کرتے ہیں کہ اقتدار عوام میں داخل ہے۔ اس طرح سیاسی اشرافیت کی وہ تائید کرتے ہیں۔ اطالوی پارلیمان کے چارسو (۴۰۰) اراکین اُن اہم فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا وجود حکومت نے تسلیم کرلیا ہے۔ موسلینی کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔

وہ وزرا کا انتخاب خود کرتا ہے۔ اور انھیں خدمت سے علحدہ کرنا بھی اسی کے اختیار میں ہے مسولینی پارلیمان کا ذمہ دار نہیں اگر وہ کسی کا ذمہ دار ہے تو وہ اسی کی جماعت ہے۔ اس کے احکام قانون کی حیثیت رکھتے ہیں اس کے وزرا مسولینی کے رفقا نہیں بلکہ اس کے محکوم ہیں۔ مختصر یہ کہ اطالیہ ایسی ریاست ہے جس کی اعلیٰ کمان مسولینی کے ہاتھ میں ہے۔ پورے اقتدار کا وہی حامل ہے اور وہی تقسیم کنندہ ہے۔

یہاں تک تو اصول فسطائیت سے بحث کی گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا فسطائیت نے اطالیہ کو واقعی کوئی فائدہ بخشا؟۔ اس سوال کے جواب میں ہمیں زیادہ چھان بین کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم اطالیہ کے ان حالات کا مطالعہ کریں جو زمانہ جنگ اور اس کے بعد ہی یہاں رونما ہوئے تھے تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہوں گے کہ فسطائیت ہی کی بدولت آج اطالیہ کو موجودہ قوت وعزت حاصل ہے زمانہ جنگ میں حکومت اطالیہ اتحادیوں کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی تھی۔ ملک میں قومی اتحاد ویگانگت مفقود تھی اور نہ اس ملک کو کوئی سیاسی یا فوجی اقتدار یا امتیاز حاصل تھا۔ کئی صدیوں تک یہ ملک آسٹریا کے مظالم کا تختہ مشق بنا رہا۔ کوئی مرکزی حکومت یہاں قائم نہ ہوسکی اور ملک کو چھوٹے چھوٹے سیاسی حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ مختصر یہ کہ اطالیہ صرف ایک جغرافیائی اصطلاح سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ یہ سب فسطائیت ہی کے سبب یہاں قومی اتحاد اور سیاسی بیداری پیدا ہوئی اسی دور حکومت میں اطالویوں نے خاص شان وشوکت حاصل کی۔ فسطائیت نے ملک کی عظیم الشان خدمت کی اور جہاں جمہوری پارلیمانی طریقے ناکامیاب اور بیکار ثابت ہوئے فسطائی طریقہ حکومت کامیاب رہا۔ فسطائیت نے اطالویوں کو اتحاد، سکون، صلح، خوشحالی، اقبال مندی، اور مستحکم وقوی حکومت عطا کی۔ اطالیہ کا شمار دنیا کی بڑی بڑی طاقتور قوموں میں کرتے ہیں۔ فسطائیت نے اطالیہ کی معاشی حالت سدھارنے میں بہت کچھ حصہ لیا۔ بے روزگاری کا مسئلہ حل کیا گیا۔ تجارت اور صنعت کی تنظیم کی گئی اور اسے حکومت کی طرف سے ہر قسم کی مدد اور تقویت دی گئی۔

اگر فسطائیت پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو ہم یہ دیکھیں گے کہ دوسری اچھی تحریکات اور خیالات کی طرح اس میں بھی کچھ کمزوریاں اور خامیاں موجود ہیں۔ انسان خود خامیوں سے معرا نہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ادارے اور طریقے جو اس کے خیالات کا نتیجہ ہیں نکتہ چینی سے محفوظ رہ سکیں۔

سب سے پہلے اس باب میں ہمیں جو چیز نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ فسطائیت کا یہ اصول ہے جس کے سبب انسان کی انفرادیت۔ آزادی رائے وغیرہ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ فسطائیت اندھی تقلید کا درس دیتی ہے۔ اس کے تحت ایک شہری کا مقدس فریضہ یہ ہے کہ اپنے لیڈر کے احکامات کی بغیر سوچے سمجھے تعمیل کریں۔ اس سے انسان میں ایک قسم کی حیوانی جبلت پیدا ہو جاتی ہے۔ حکومت نے چند اُصول اور راستے بتا دئے ہیں جن کا ماننا اور ان پر چلنا شہری کا اہم فریضہ ہے۔ اور اسی میں اس کی سلامتی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا فسطائیت کی روح قوت و طاقت ہے اور اس طرح وہ امن و صلح کی دشمن تصور کی جاسکتی ہے۔

بہر حال یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فسطائیت کا مستقبل کیا ہے؟۔ یہ ایسا سوال ہے کہ جس کا صحیح جواب ممکن نہیں۔ اگر ہم تاریخ سے مدد لیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی قوم کی زندگی میں آمریت کا دور بھی آتا ہے مگر ضرورت ختم ہونے پر خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔ تاریخ روما اور تاریخ یونان میں ہمیں اکثر ایسی مثالیں ملیں گی جہاں قوم کو آمر کی ضرورت تھی تاکہ مصیبت کے وقت اس کی رہنمائی کر سکے۔ وقت نے ایسے آمر پیدا کئے جو اپنا کام مکمل کرنے کے بعد زمانہ کے ہاتھوں صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ کیا اطالوی آمریت کا بھی یہی نتیجہ ہوگا؟ جو بھی نتیجہ ہو یہ انسانی زندگی کا چکر وہی قدیم رفتار سے پھرتا رہے گا۔ جب کوئی خاص حکومت قائم ہوتی ہے تو اس کے مداح اور مخالف دونوں پیدا ہوتے اور فنا ہوتے ہیں۔ تاریخ اسی طرح بنی ہے اور اسی طرح بنتی رہے گی۔ کسی طریقہ پر "بہترین اور بدترین" کا اطلاق ممکن نہیں یہ تمام ہمارے خیالات کا مجموعہ ہے۔ کسی چیز سے ہم ابھی محبت کرتے ہیں اور پھر فوراً اس سے نفرت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

"ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال"

محمد احمد الدین صدیقی

سال سوم

بے روزگار

نوکری کی ضرورت

ایک نوجوان کو جو کاہل، کام چور، نااہل، بدسلیقہ، بدرویہ وغیرہ ہے اور احساس فرض نہیں رکھتا، نوکری کی ضرورت ہے۔ اگر کسی دفتر یا کمپنی میں کسی صاحب کو ایسے نوجوان کی خدمات کی ضرورت ہو تو فلاں پتہ پر خط و کتابت کریں۔

آسٹریلیا کا ایک نوجوان طویل مدت سے بے روزگار تھا اس نے بہت دوڑ دھوپ کی۔ جگہ جگہ درخواستیں دیں، اخباروں میں اشتہار شائع کرایا کہ بندہ نہایت لائق فائق، شریف، محنتی، فرض شناس وغیرہ ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ اگر بندہ کو نوکر رکھ لیا گیا تو بندہ اپنے حکام بالادست کو اپنے کام سے خوش کر دے گا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ آخر نوبت پاگل پن یا خودکشی تک پہنچتی نظر آئی، تو اس کے دماغ میں ایک لہر اٹھی۔ اس نے ایک آخری تیر چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس نے اخباروں میں مندرج بالا اشتہار چھپوا دیا۔ ظاہر ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی تھی۔ روزی کی رہی سہی اُمید کا خاتمہ اس اشتہار نے کر دیا تھا۔ کون بے وقوف ہوگا جو نااہلی و بداخلاقی کے اس اعلان کے بعد اُس نوجوان کو ملازم رکھنے پر غور کرتا؟

لیکن انسانی نفسیات کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے، کہ نااہلی و بداخلاقی کے اس اعلان کے باوجود بلکہ اس کی وجہ سے کئی جگہ سے اُس نوجوان کو بلاوے آئے، کہ ہمارے ہاں جگہ خالی ہے۔ فلاں پتہ پر فلاں تاریخ کو ملاقات کرنے آؤ ـــــ نتیجہ یہ کہ چند ہی دن کے بعد اس نوجوان کو ایک اچھی جگہ مل گئی!

اس واقعہ کا ذکر کرنے سے میرا مقصد یہہ نہیں کہ بے روزگاروں کو اس نسخہ کے آزما دیکھنے کی ترغیب دوں۔ اس لئے کہ یہہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک جدت طراز ذہن کا خیر مقدم ہر مقام پر ایک سا ہوگا۔ آسٹریلیا میں اس کا نفسیاتی ردعمل اس بے روزگار کے مفید مطلب ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں اس قسم کی کوشش پر درخواست گذار کے تعاقب کے لئے چپراسی یا کتے دونوں کو چھوڑ دیا جائے۔ یا پھر اس کی درخواست کو پاگل خانے کے عہدہ داروں کی توجہ کے قابل سمجھا جائے۔

خیر مطلب واقعہ کے اس پہلو سے نہیں۔ بلکہ یہہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں پہلے اس نوجوان کو دروازوں پر "نو ویکنسی" کے بورڈ لٹکتے نظر آئے تھے وہاں اس اشتہار کے بعد اس کے لئے وہی دروازے حیرت انگیز طور پر کھل گئے۔ گداگر آپ کے قریب آتا ہے۔ آپ کی زبان سے فوراً نکلتا ہے۔ "معاف کرو"۔ حالانکہ آپ کی جیب بفضلہ خالی نہیں۔ تو جناب! یہی اصول نوکری کے معاملہ میں کیوں کار آمد نہیں ہو سکتا؟ لیکن وہاں جوان بھکارن مستثنیات میں نمایاں درجہ رکھ سکتی ہے۔ اسی طرح یہاں استثناء خود بخود "اثرات" کی بدولت پیدا ہو جاتا ہے۔ جن کے آگے "عمل ہمزاد" یا دیگر عملیات گرد ہیں۔ جہاں یہہ اثرات ہوں، جگہ نہ بھی ہو تو نئی جگہ خاص طور پر نکالی جا سکتی ہے۔ اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے نکالی نہ جا سکتی ہو تو کوئی دوسرا ملازم تو آسانی سے نکالا جا سکتا ہے۔ مختصر یہہ کہ یہی ہے وہ گر جس کی مدد سے بیڑا تارپیڈو یا مقناطیسی سرنگ کے خطرہ کے بغیر پار ہو جاتا ہے اور گھی کی ریل پیل ہوتی ہے (گو مصنوعی سہی) اس طور پر کہ پانچوں اسی میں ہوں گی اور چراغ بھی اسی کے جلیں گے۔

لیکن یہاں بحث ایسے اشخاص سے نہیں جو ڈگری یا قابلیت یا کردار نہ سہی، اثر و رسوخ والے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اثرات، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، "کھل جا سم سم" کا مفہوم یا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اس لئے جو شخص اثرات رکھتا ہو وہ زیادہ عرصہ تک بے روزگار نہیں رہ سکتا، جس طرح آدمی جو ٹامن پیٹ میں داخل کرتا رہتا ہے بیمار یا کمزور نہیں رہ سکتا! بحث ان لوگوں سے نہیں سابقہ تو یہاں ہیں ان بدنصیبوں سے ہے جو اس کلید کامیابی سے محروم ہیں اور نتیجتاً بے روزگار۔

پس سب سے پہلے لازم آیا کہ بے روزگار کی تعریف کر دی جائے۔ جامع و مانع تعریف ذرا دشوار ہے۔ لیکن مطلب برآری کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ بے روزگار وہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ شخص ہے جو دوسروں کی کمائی کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہو اور خود کما کھانے کی دُھن میں درخواست کی کئی نقلیں ہر چھوٹے اور بڑے سرکاری اور غیر سرکاری دفتر میں صاف دے آیا ہو ڈاک[1] کے ذریعہ بھیج چکا ہو، جو اخبارات میں ضرورت ہے، عنوان والے اشتہارات تلاش کرتا اور غور سے پڑھتا ہو، جو خاموش یا بولتی چالتی کسی قسم کی سفارش نہیں رکھتا یا جس کی سفارش دعا کی طرح بے اثر ہو، جو سازشں کے فن سے بے بہرہ ہو یا جس کی سازش میدان مقابلہ میں کم تر درجہ کی ثابت ہوئی ہو جو اس بازار میں خرید و فروخت کی انتہائی کوشش کرتا رہتا ہو یعنی روٹی کی خریداری کے لئے بیوی کا زیور اور اپنی عزت جزواً یا کلیتاً بیچ چکا ہو یا بیچ رہا ہو، جس کے لئے پُرانے ملاقاتیوں کا یہہ سوال "کیوں بھئی! آج کل کیا کر رہے ہو؟" روح فرسا بن گیا ہو، جس سے دوستوں کو زبانی یا دلی ہمدردی ہو اور بیوی اور سُسرال والوں کو ـــــ بتائیے میں کیا کہنا چاہتا تھا! جس کے جوتے کا تلا یا سائیکل کا ٹائر اور دماغ خراب ہو گئے ہوں یا ہونے کو ہوں، جس کے لئے اُمیدوار بن جانا جوئے شیر لانا ہے اور امیدواری کا تجربہ سر پھوڑ لینے کا محرک جو اس کا پتہ چلانے میں سرگرداں رہتا ہو کہ کس عہدہ دار کی کس کس سے "اچھی" ہے اور ان کی بیویوں کی کن کن گھرانوں سے راہ و رسم ہے، جس کو دیکھ کر چپراسی غُراتے ہوں اور وہ ان کو دیکھ کر اس طرح ڈرتا ہو جس طرح روایتی عاشق معشوق کے دربان سے، جو ـــــ اوہو! تعریف بہت طویل ہو گئی حالانکہ ارادہ اختصار سے کام لینے کا اور صرف یہہ بتانے کا تھا، کہ بے روزگار ایک قومی بلکہ بین الاقوامی شخصیت بلکہ ادارہ ہے جس سے ماہرین تعلیم، لیڈر اور اخبار والے ـــــ تحریر اور تقریر میں ـــــ نہایت گہری ہمدردی ظاہر کیا کرتے ہیں!

جب زمانہ اتنا تہذیب و ترقی یافتہ نہ تھا۔ عاشق کی نشانیاں کچھ اس قسم کی ہوتی تھیں

---

[1] ۔ ایک بے روزگار ملاقاتی کا بیان ہے کہ درخواستوں کے ٹائپ کرانے اور رجسٹری کے ذریعہ بھیجنے میں اب تک ان کے جملہ ۲۰ روپے ۴ آنے، جو وہ وقتاً فوقتاً "قرض حسنہ" لیتے رہے ہیں، خرچ ہو چکے ہیں۔

چہرہ فق، آنکھیں بے رونق، ان کے گرد حلقے، سینہ اور گریباں کی حالت ناگفتہ بہ، غرض کہ حلیہ ایسا کہ بقول شخصے بارہ بج رہے ہوں۔ لیکن اب کہ زمانہ روشن ہو گیا ہے یہہ نشانیاں خفیف ترمیم کے بعد بے روزگاری قرار دی جا سکتی ہیں۔ عاشقی اب شرافت کی نفی یا نقصان کے ساتھ گوارا نہیں کی جاتی اور شرافت آپ جانتے ہیں، عموماً درزی خانہ اور اصلاح خانہ سے بن ٹھن کر نکلتی ہے اور کلب میں جلا پاتی ہے۔ لیکن بے روزگاری شرافت کو کڑی آزمائش میں ڈالنے والی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس کا ایک معمولی ثبوت یہہ ہے کہ اس اُمید پر کہ لڑکے کو اچھی نوکری ملجائیگی جو نسبتیں ہوتی ہیں وہ اکثر بے روزگاری کے قیام و استقرار بلکہ استقلال کے آثار نظر آتے ہی ٹوٹ جاتی ہیں اور لڑکے کی "نجیب الطرفینی" مشتبہ ہو جاتی ہے۔

لیکن ایسے معاملہ فہم بے روزگاروں کی بھی کمی نہیں جو نسبت اور اپنے شیشۂ دل کی شکست کی نوبت آنے نہیں دیتے۔ بلکہ قبل اس کے کہ لڑکی والے مایوس ہو جائیں شادی کر ڈالتے ہیں۔ مگر شرط یہہ ہے کہ لڑکی والے کھاتے پیتے ہوں لڑکی انھیں اتنی عزیز ہو کہ وہ نہ صرف گھر داماد کے اُصول کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیں بلکہ داماد کی ملازمت کے لئے خود دوڑ دھوپ بھی کرنے لگیں! ہر ملک میں عاشق، غریب پرور (معاشی نقطہ نظر سے) معشوق کے گن گاتے آئے ہیں، اسی طرح بے روزگار جس میں روحانی یا اخلاقی طاقت بدقسمتی سے بہت زیادہ نہ ہو ایسی بیوی پر جان چھڑکتا ہے جس کے والدین انسانیت کے اصول جانتے ہوں اور اُسے باپ بننے سے پہلے نوکر رکھا دیں۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ بے روزگاری میں اکثر انسان کو شادی سوجھتی ہے یا پھر شاعری۔ یوں کہئے کہ بے روزگاری کا منطقی نتیجہ بچے ہیں یا پھر شعر۔ لیکن جہاں ضبط تولید کا اصول اول الذکر نظریہ کو ایک حد تک مجروح کر سکتا ہے وہاں شعر شاعری ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ یہہ نہ ہوتا تو موجودہ ادب اشتراکی رجحانات رکھنے والی شاعری سے محروم رہ جاتا۔ یعنی اس سرمایۂ شعر و سخن کا راز یہہ ہے کہ ملک میں شاعر بہت ہیں اور اکثر بے روزگار۔ قحط عشق کے لئے سم قاتل ہے۔ کم از کم دمشق میں تو یہی ہوا۔ لیکن شاعری کی نسبت یہہ نہیں کہا جا سکتا۔ گھر میں قحط کی سی کیفیت ہو گی پھر بھی شاعر کی طبع رواں ایک سیلاب برپا کر دے گی۔ بھوک میں عاشق

چوکڑی بھول جاتا ہے، لیکن شاعر کو دور کی سوجھتی ہے۔ مگر جس طرح بے روزگار عامی کو (اگروہ ہوشیار ہو) خوش حال سُسرال مل سکتی ہے، اسی طرح بے روزگار شاعر کو اکثر دولت مند سرپرست نصیب ہو جاتا ہے۔ وہ بے تکلف شعر سناتا ہے اور پُر تکلف دسترخوان پر بیٹھ جاتا ہے۔ امارت کے اس ذوق سلیم نے شاعروں کو غم روزگار سے نجات دلانے میں قابل لحاظ حصہ لیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چھوٹے وقار کا احساس رکھنے والے شاعر اس چیز کو گوارا نہیں کرتے!

پونہ کے ایک لکچرار نے حال ہی میں ایک مشورہ دیا، کہ مدارس اور کالجوں میں دیگر مضامین کی مانند شاعری کی بھی تعلیم دی جائے۔ آپ بدگمانی سے کہیں گے، کہ موصوف کا مقصد شاید یہ معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ جتنے بے روزگار ہوں سب شاعر ہوں۔ کیوں کہ بے روزگاری تو بہر حال قائم رہے گی۔ اور شاعری کا اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موصوف جو غالباً خود بھی شاعر ہیں شاعروں کی بے روزگاری کا علاج کرنا چاہتے ہیں اس لئے کہ مدارس اور کالجوں میں شاعری کی تعلیم کے لئے یقیناً شاعروں کی ضرورت ہوگی۔ اور چونکہ ملک بھر میں مدارس اور کالجوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور خدا کے فضل سے شاعروں کی بھی کمی نہیں، اس لئے چھوٹی بڑی جماعتوں میں تعلیم کے لئے کثیر تعداد میں شاعروں کی کھپت ہو جائے گی جن میں بڑے بڑے مرحوم اساتذہ کے جانشین[1]، اساتذہ، نیم اساتذہ اور دیگر شاعر شامل ہیں۔

بہر حال عاشقی ہو یا شاعری، اگر وہ بے روزگاری کے دور کرنے میں مدد دے تو یقیناً قابل قدر ہے۔ ورنہ عاشقی آج بھی عزت سادات کے لئے خطرہ ہے نیز شاعری ذریعہ عزت کبھی نہیں بن سکتی اب رہی شادی تو اس کو بھی بے روزگاری کا نتیجہ ـــ اور علاج ـــ ہونا چاہیئے نہ کہ سبب۔ اس موضوع پر میں ایک پُرلطف واقعہ سُنا کر آگے بڑھوں گا۔

انگلستان کی ایک بڑی کاروباری فرم میں ایک بے روزگار داخل ہوا۔ اُس نے منیجر سے ملاقات کی۔ کہنے لگا "آپ کے ہاں ایک جگہ خالی ہے۔ میں اس کے لئے آیا ہوں"۔ منیجر نے

---

[1] یاد رکھئے ایک مرحوم اُستاد کے ایک سے زیادہ جانشین بھی ہوا کرتے ہیں!

پوچھا۔ "تم شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ؟" اس بے روزگار نے جواب دیا۔ "شادی شدہ"۔ منیجر بولا۔ "اوہ ! ہمیں ایک غیر شادی شدہ آدمی چاہئے"۔ بے روزگار نے حیرت سے کہا۔ "مگر میں یہاں کل آیا تھا۔ اُس وقت مجھ سے کہا گیا تھا کہ ایک شادی شدہ آدمی کی ضرورت ہے"۔ منیجر نے مُسکرا کر کہا۔ "ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ ہمیں اختیار تمیزی کو کام میں لانا پڑتا ہے"۔ اس بے روزگار نے تقریباً رو کر کہا۔ "خوب ! آپ کے لئے باتیں بنانا آسان ہے۔ مگر میری حالت پر تو خدارا غور کیجئے۔ کل جب مجھے معلوم ہوا کہ شادی شدہ آدمی کی ضرورت ہے، تو میں نے یہاں سے جا کر شادی کر لی !"

شاعر پیدا ہوتا ہے، عاشق یا شوہر بنتا ہے۔ لیکن بے روزگار بنایا جاتا ہے۔ کارخانے کثیر تعداد میں ہیں۔ اور پیداوار بھی ماشاء اللہ سے بہت ہے۔ یعنی رسد کافی ہے لیکن طلب صفر۔ وجوہ کیا ہیں ؟ وہی جو بار بار دُہرائی جاتی ہیں۔ نظام تعلیم کی بنیادی خرابی، صنعت و حرفت زراعت اور تجارت سے بے توجہی، ملازمت کی خواہش وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں مساوات مرد و زن کا نظریہ کارفرما ہے۔ عورتیں روزگار کی تلاش میں گھروں سے نکل آئی ہیں۔ اس کی وجہ سے صورت حال بہتر نہیں ہوئی۔ اس نسوانی ترقی سے قبل مرد دو طرح سے روزگار کو ترقی دیتا تھا۔ پہلے تو اس طرح سے کہ وہ معاش کے میدان سے عورت کو ہٹا کر ایک جگہ خالی کرتا تھا۔ دوسرے وہ اپنے خاندان کی ضروریات پر روپیہ خرچ کرتا تھا۔ اس طرح سے مال کی مانگ بڑھ جاتی تھی۔ لیکن عہد حاضر کی عورت جو اپنی روزی آپ کماتی ہے نہ صرف مرد کو بے کار و بے روزگار بنا دیتی ہے بلکہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اپنے آرام و آسائش اور اپنی ہی ضروریات پر خرچ کرتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کا خرچ انجام کار قومی معاشیات کے لئے کچھ سود مند نہیں ہوتا ——— مُبادا کہ مجھ کو قدامت پسندی، رجعت پسندی اور اس قسم کی دیگر "پسندیوں" کا مجرم قرار دیا جائے، میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ خیالات حاشا و کلا میرے نہیں بلکہ ایک مشہور پروفیسر کے ہیں جس کا نام میری طرح شاید آپ کو بھی یاد نہیں۔

اکبر الہ آبادی نے احباب کے کارنمایاں یہ بیان کئے تھے۔

بی، اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

لیکن یہہ ذکر اُس زمانہ کا ہے جب بی، اے اور موٹر کار دونوں کم یاب تھے، اور بی، اے ہوتے ہی نوکری مل جاتی تھی۔ لیکن آج کل بی، اے ہونے اور مر جانے کے درمیان کا وقفہ اتنا خوشگوار نہیں بلکہ بعض وقت تو بہت قلیل بھی ہوتا ہے۔ سرپرست کے روپیہ سے بی، اے ہوتے ہیں اور اپنے ہاتھوں مر جاتے ہیں اور بس۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں!

عہد حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے　　قبض کی روح تری دیکے تجھے فکر معاش

نتیجہ یہہ ہوا ہے کہ بقول ایک ستم ظریف کے انسان تو انسان، حضرت ابلیس بھی آج کل بے کار ہیں۔ کیونکہ انھیں اب پیروی کر کے انسان کو ترغیب و تحریص دلانے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ خود انسان پیٹ کی خاطر اپنے طور پر ہی ان کے حسب مرضی کام کرنے لگا ہے! ممکن ہے مجھے یا آپ کو اس سے اختلاف ہو، مگر اتنا تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ اس زمانہ میں خدا اور صنم دونوں ملجاتے ہیں (بشرطیکہ پہلی صورت کے لئے آپ محض مرشد یا مجذوب بن جائیں اور دوسری صورت کے لئے فقط موٹر نشین اور بنک کے کھاتہ دار) لیکن نہیں ملتا تو روزگار۔

تو بتایئے اب کیا کریں، خصوصاً تعلیم یافتہ بے روزگار کیا کریں؟ بوٹ پالش کا کام کریں؟ گو یہہ کوئی نئی بات نہیں رہی۔ اور اس میں ایک نکتہ یہہ ہے کہ اعلیٰ کا جوتہ صاف کرنے سے ادنیٰ کا مفاد اور ترقی وابستہ ہے! ٹیوشن کریں؟ گو مسابقت کی وجہ سے یہہ بازار بھی سرد پڑ گیا ہے اشتراکی یا پھر وہشت انگیز بن جائیں؟ غیر شریفانہ حرکات شروع کر دیں؟ کہ بے معاشی اور بدمعاشی میں ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ "سیتاگرہ" پر غور کریں؟ گو یہہ بھی کوئی مستقل علاج نہیں ہوسکتا! قومی کارکن اور پھر لیڈر بن جائیں؟ اس میں فائدہ یہہ ہے کہ بھوکا نہیں رہنا پڑتا۔ روٹی آزادی کی حالت میں قوم دیتی ہے اور اسیری میں سرکار ــــــ توبہ! یہہ نازک پہلو کہاں سے نکل آیا؟ لیڈر کے تذکرے کے لئے رسالہ کے صفحات نہیں بلکہ خفیہ پولیس کے روزنامچہ کے اوراق موزون ہوتے ہیں۔

بے روزگار کی قسمیں بہت سی ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ بے روزگار، تعلیم یافتہ بے روزگار شادی شدہ بے روزگار، غیر شادی شدہ بے روزگار، وہ جو دنیا بہ امید قائم کے قائل ہوں،

وہ جو دق کے پہلے درجہ پر ہوں، وہ جن کے احساسات لطیف مردہ یا جو بالکل بے حس ہوگئے ہوں، وہ جو پاگل ہو گئے ہوں، وہ جو انتہائی صدموں کے باوجود پاگل نہ ہوئے ہوں، وہ جو ایک دفعہ روزگار سے لگے رہنے کے بعد برطرف یا مستعفی ہو گئے ہوں جیسے شادی کے بعد طلاق مل گئی ہو، وہ جن کی رائے کوششوں کی ناکامی کے بعد یہہ ہوگئی ہو کہ ملازمت غلامی ہے، وہ جو محض اس لئے بے روزگار ہیں کہ قسمت ان سے کہتی ہے کہ خودداری کو ہاتھ سے دیدو، پھر میں تم پر مہربان ہو جاؤں گی، مگر وہ نہیں مانتے!

اور پھر وہ جو اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت جانا چاہتے تھے یا پھر لیلائے سیول سروس کے مجنون تھے یا پھر تحصیلدار بننے کی ہوس رکھتے تھے یا پھر کوئی اچھی جگہ چاہتے تھے حتیٰ کہ تیس تا ساٹھ پر بھی راضی مگر فی الحال بے روزگار ع

مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی!

بے روزگار کے مشاغل مختصراً یہہ ہیں:۔ دفتروں اور "بنگلوں" کے چکر کاٹنا چاہے موسم ایسا ہو کہ سڑک پر ڈامر اور سر میں بھیجا پکنے لگے، چاہے ایسا کہ پانی پڑ رہا ہو اور گذرنے والی موٹروں کے شوفروں کو لوگوں کے کپڑوں پر "گل کاری" کرنے میں لطف آرہا ہو (شرابور ہونا تو بہر حال بے روزگار کی قسمت میں لکھا ہے چاہے پسینہ میں چاہے پانی میں) چائے خانوں میں اخبار پڑھنا اور بفضل خدا شاعر ہو تو چائے پی پی کر شعر کہنا اور شعر سنانا، دوستوں میں بیٹھ کر وقت گذارنا کہ افکار سے پیچھا کچھ دیر کے لئے تو چھوٹے، اور آخر میں گھر اس وقت پہنچنا کہ گھر والے اس کی قسمت کی طرح سو گئے ہوں اور بزرگوں یا بیوی کے "خطبۂ استقبالیہ" کی نوبت نہ آئے۔

اب رہا بے روزگاری کا کوئی موثر علاج، تو جہاں بڑے بڑے مفکروں اور لمبی چوڑی رپورٹوں سے یہہ مسئلہ حل نہ ہو سکا وہاں یہہ ناقص مضمون لکھنے والا بھلا کیا علاج تجویز کر سکتا ہے؟ ہاں اتنا مشورہ میں ضرور دوں گا کہ ہندوستان کے بے روزگار اپنی ایک مرکزی انجمن قائم کریں جس کی شاخیں ہر مقام پر ہوں۔ اتحاد و اتفاق میں طاقت ہے۔ مطالبات یا احتجاج اجتماعی طور پر پیش کرنے یا اپنے حقوق (؟) کے تحفظ کے لئے یہہ تدبیر کارگر

ہوسکتی ہے۔ انجمن انسداد بے رحمی بر جانوران جیسی چیز جب دنیا میں ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ مرکزی انجمن تحفظ حقوق بے روزگاران کی قسم کا کوئی ادارہ قائم نہ کیا جائے، خصوصًا ایسی صورت میں جبکہ گائے بیل کی طرح بے روزگار بھی ایک بے زبان جانور ہی ہے۔ دوسرے ملکوں کو دیکھیئے، وہاں بے روزگار مل کر کام کیا کرتے ہیں یعنی وہ سڑکوں پر تختیاں اور جھنڈیاں لے کر نعرے لگاتے ہوئے جلوس کی شکل میں نکلتے ہیں اور مظاہرے کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ مطلب یہہ کہ یہاں تنظیم کی ضرورت ہے۔

مضمون خلاف توقع طویل ہو گیا۔ آپ شاید سمجھیں کہ ہو نہ ہو یہہ شخص بھی بے روزگار ہے اور فرصت سے مضمون میں جانے کیا کیا لکھتا جا رہا ہے۔ یہہ صحیح ہے کہ آدمی کو اکثر بے روزگاری میں شاعری کی مانند مضمون نگاری بھی سوجھتی ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوا ہے کہ بے روزگاری کے زرین عہد سے قبل آدمی پر مضمون نگاری کے دورے پڑنے لگے، اور یہہ خاکسار اس زمرہ میں شامل ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ بے روزگاری میں خاکسار کی مضمون نگاری کو دن دونی رات چوگنی ترقی نصیب ہوئی اور اس زمانہ کے ختم کے بعد تو خاکسار عادی مجرم کی مانند عادی مضمون نگار بن گیا۔ غرض کہ آپ سمجھ گئے کہ بندہ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے بے روزگار نہیں اور یہہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ناچیز بہت مصروف آدمی ہے اس مضمون کو بے روزگار اور بے روزگاری کے چند اور پہلو بیان کئے بغیر ختم کئے دیتا ہے، اس توقع کے ساتھ کہ اس کمی کو خود کوئی بے روزگار پورا کر دے گا۔

"ناکارہ"
حیدرآبادی

غزل

کیوں کر کہوں کہ صدمۂ فرقت گراں نہیں
اے ضعفِ ہجر اب تو یہ تاب و تواں نہیں

پاسِ وفائے یار تری حد بھی ہے کوئی
ایسا خموش میں ہوں کہ گویا زباں نہیں

تنہائی ہجر یار کی اب کیا بیاں کروں
مونس نہیں، رفیق نہیں، ہم زباں نہیں

کیوں کر چھپاؤں دردِ محبت نہیں ہے تاب
کس سے کہوں کہ کوئی مرا راز داں نہیں

رونے کو میرے حال پہ ہے شمع ایک تو
تیرے سوائے کوئی مرا اب یہاں نہیں

روزِ ازل سے خوگرِ مشقِ ستم ہوں میں
یہ امتحان میرے لئے امتحاں نہیں

اب تو ہے اور حسن کی حیرت فزائیاں
ہاں اے نگاہِ شوق کوئی درمیاں نہیں

کب اس کے پھونکنے کا نہیں برق کو خیال
کب شاخِ گل کو بار مرا آشیاں نہیں

آنکھوں میں اشک، دل میں کسک، لب پہ آہ سرد
کیوں کر کہوں کہ رازِ محبت عیاں نہیں

پرشوتم راج سکینہ
متعلم سال اول

کردار نگاری

دنیائے افسانہ میں دلچسپ اور حیاتِ اصلی کے مماثل کردار کا وجود آثارِ حیات پیدا کر دیتا ہے اِس لئے فسانہ نگاری کا ایک اہم جزو کردار نگاری ہے۔ لیکن افسانوی کردار رنگین تخیل کے رہین منت ہوا کرتے ہیں۔ ایک مُصنف کے پیش کردہ کردار خواہ وہ نیک ہوں یا بدخود مصنف کی ذاتی شخصیت اور خیالی رجحان کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اکثر دو متضاد کردار کی بنیاد ایک ہی شخصیت ہوا کرتی ہے۔ کولرج (coleridge) کہتا ہے کہ ("Paradise Lost") کے شیطان۔ آدم۔ رفائیل اور ایک حد تک حوا سب کے سب کی بنیاد خود ملٹن (Milton) ہی ہے۔ کردار نگاری سے مراد" اشخاص قصہ" میں کچھ مخصوص عادات واطوار۔ خصائل اور طبیعت پیدا کر دینا ہے اور اُن ہی عادات واطوار میں چند ممتاز خصوصیات کا پیدا کر دینا جس سے" اشخاص قصہ جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے اِنسان معلوم ہوں کامیاب کردار نگاری ہے۔ یعنے کردار نگار کی تحریری تصویریں متحرک نظر آنی چاہئیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ کردار نگاری نہایت مشکل کام ہے جس کے لئے وسعت علم۔ گہرا مشاہدہ۔ اور کافی تجربہ درکار ہے۔ ہر قصہ میں کم از کم ایک مرکزی مستقل اور اہم کردار ہوگا۔ اور کئی غیر اہم۔ مرکزی کردار پلاٹ کے تمام منتشر واقعات میں تسلسل پیدا کرتے ہیں۔ اہم" اشخاص قصہ" وہ ہونگے جن کے متعلق مصنف براہ راست کچھ کہہ رہا ہو۔ یا قصہ کے آغاز ہی سے اُن کی اہمیت واضح ہوئے کردار نگاری کبھی ادبی نزاکتوں پر مبنی ہوتی ہے اور کبھی فلسفیانہ خوبیوں پر۔"

عام طور پر دو قسم کے کردار ہوا کرتے ہیں۔ ایک اِرتقائی اور دوسرے ساکن۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اِرتقائی کردار حیات اصلی اور افسانوی زندگی دونوں میں بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ موجودہ رجحان کے تحت کردار نگاری کی سب سے اہم خوبی کردار کا حیات اصلی کے مماثل ہونا ہے۔

عمدہ کردار وہی ہیں جو فطرتِ انسانی کے مطابق ہوں " لیکن ایک خود ساختہ ہیرو کا گمنامی سے شہرت حاصل کرنا ناقابل فہم طریقہ پر نہ ہونا چاہیئے۔

کردار نگاری کے دو طریقے ہیں۔ایک بلا واسطہ یا راست اور دوسرا بالواسطہ یا ڈرامائی۔ بلاواسطہ یا راست کردار نگاری میں مصنف کردار کے جذبات۔ ذہنیت اور خیالات کو واضح کرتے ہوئے اُن پر تنقید بھی کرتا ہے۔بالواسطہ یا ڈرامائی کردار نگاری میں مصنف خود کچھ نہیں کہتا بلکہ کردار کو اُن کے ہی الفاظ و اَفعال کے ذریعہ اور دوسرے " اَشخاص قصہ " کی تنقید کے ذریعہ واضح کرتا ہے۔

جس وقت کسی شخص کی زندگی کے حالات پڑھے جاتے ہیں تو پڑھنے والا ضروری سمجھتا ہے کہ کردار کی ظاہری بناوٹ۔حلیہ اور اُس کی شکل وصورت بھی واضح طور پر بیان کیجائے نہ صرف حلیہ بلکہ لباس وغیرہ کو بھی مختصراً بیان کر دینا چاہیئے۔کیونکہ عملی زندگی میں بھی آدمی کے لباس کا اثر اُس کے ملنے جُلنے والوں پر پڑتا ہے۔مصنف کو چاہیئے کہ " صرف ضروری چیزوں کو چھیڑتا ہوا گذر جائے اور ثانوی وغیر ضروری اُمور کو پڑھنے والے کی پروازِ تخیل کے لئے چھوڑ دے "۔ اِس کے برخلاف مکمل تصویریں غیر دلچسپ ہوتی ہیں۔کردار کا تفصیل دار اور زیادہ طویل طریقہ پر تعارف اِس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ مصنف اپنے بیان کو نمایاں کرنا چاہتا ہے۔غیر ضروری اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کا وجود کردار کو بے لطف بنا دیتا ہے۔ ہیرو یا دوسرے اشخاص کی اُنہی خصوصیات وعادات کو نمایاں کرنا چاہیئے جو پلاٹ پر اَثر پذیر ہوتی ہیں۔صحیح کردار نگاری میں کردار کے الفاظ۔حرکات اور لباس اُسکے پیشے کے مطابق ہونا چاہیئے۔

ایک کامیاب کردار نگار کسی کردار کا تعارف چند الفاظ میں کرواکر خاموش ہو جاتا ہے۔ اور پڑھنے والا خود بخود اس کی نشوونما سے مانوس ہو جاتا ہے کیونکہ خود " شخص قصہ کو اپنے کردار کی وضاحت کرلینے دینا۔مصنف سے بہتر اُصول ہے کردار کے طرزِ عمل کی توضیح خود اُسی کے قول و فعل سے ہونی چاہیئے۔ اور کردار کے خیالات کا آئینہ خود اس کا طرزِ عمل ہونا چاہیئے۔

وہ کردار جس پر اصلیت کا دُھوکا ہو جائے کامیاب کردار ہے لیکن کردار کو حیاتِ اصلی کے مماثل بنانے کے لئے ترتیب وار بناوٹی بیان کو قلم بند کرنا کامیاب کردار نگاری نہیں۔درحقیقت

کامیاب کردار نگاری قوتِ بیان اور زورِ قلم پر مبنی ہے۔ ناول یا ڈرامے کے پلاٹ کی خوبی بھی "اشخاص قصہ پر ہی منحصر ہوتی ہے۔ کیونکہ اشخاص قصہ خاص خاص جذبات و ذہنیت کے ساتھ یکجا کئے جاتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے اثر سے یا ذہنیتوں کے تصادم سے پلاٹ کی خوبی ظاہر ہو۔

حیاتِ اصلی کو پیش کرنا بیحد مشکل کام ہے اور اس کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ کردار کی اصل یا بنیاد آسانی سے نہ پہچانی جاسکے اس کے لئے بعض معمولی تبدیلیاں کر دینا کافی ہوتا ہے۔ حیاتِ اصلی میں ایسے لوگ کم دکھائی دینگے جو پہلی ملاقات میں اپنی ساری سرگذشت سُنادیں اِس لئے مصنف کو چاہیئے کہ کردار کو رفتہ رفتہ روشنی میں لائے۔

ایثار ہمدردی اور جان نثاری ایک کردار کے اعلیٰ صفات ہیں ایک کردار میں کسی ممتاز وصف کا پیدا کر دینا تو آسان کام ہے لیکن اُس وصف کو آخر تک قائم رکھنا کردار نگاری کا کمال ہے۔

کسی اُفسانوی کردار کے متعلق سب سے پہلے جو سوال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا مصنف کردار کو حیاتِ اصلی کے مطابق پیش کر رہا ہے یا حقائق مسلمہ کے خلاف محض تخیلی کردار کی طرح ؟

کردار میں دلچسپی اُس کے حرکات و افعال سے پیدا ہوتی ہے لیکن حرکات و اَفعال سے زیادہ کردار کی دلچسپی نیت پر مبنی ہوتی ہے۔ کیونکہ افسانوی کردار ایک شخصی تصویر ہوا کرتا ہے جو اکثر و بیشتر ذہنیتوں کے تصادم کا نتیجہ ہوتا ہے۔

کردار کی وضاحت ایک حد تک مکالموں سے ہوتی ہے اِس لئے مکالموں میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ وہ موزوں حقیقی اور ڈرامائی ہوں۔ وہ کہنے والوں کی شخصیت۔ عمر اور قابلیت کے مطابق ہوں۔ نہ صرف یہ بلکہ موقعہ و محل کے مطابق آسان اور دلچسپ بھی ہونے چاہئیں۔

بعض اُوقات کردار نگاری میں ظرافت کا جزو بھی شریک ہوتا ہے۔ کردار میں ظرافت پیدا کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ مثلاً بول چال میں ظرافت کا پہلو پیدا کر دینا۔ یا یہ ہوسکتا ہے کہ خود مصنف کے بیانات کردار کی ظرافت کو ظاہر کریں۔ لیکن سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ کردار کے اقوال میں ظرافت پوشیدہ ہو۔

شیکسپیر (Shakespeare) ڈکنس (Dickens) اور جین آسٹن (Jane Austen) کو ماہرین کردار نگاری تصور کیا جاتا ہے۔ اُن کا ایک ایک کردار انفرادی

شان رکھتا ہے - ہر کردار اپنی نوعیت کا ایک ہی ہوتا ہے۔ کردار کی ارتقا اس قسم کی ہوتی ہے کہ حیات اصلی کا دھوکا ہونے لگتا ہے - جذبات اس طرح پیش کئے جاتے ہیں کہ کردار "جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان معلوم ہوتے ہیں - ایثار، ہمدردی اور جان نثاری جو ایک کردار کے اعلیٰ صفات ہیں اس طرح یکجا کئے جاتے ہیں کہ کردار مکمل نمونہ بنجاتے ہیں۔ ڈکنس کا مشہور کردار سڈنی کارٹن اپنے طرز عمل کی توضیح خود اپنے ہی قول و فعل سے کرتا ہے ان سطور کا آزاد ترجمہ ملاحظہ کیجئے:-

"میں برسد۔ کلائی - اور ڈفارج کو دیکھ رہا ہوں . . . . . رُوح روان انتقام اشخاص جوری - اور جج سب میری نگاہوں میں پھر رہے ہیں . . . . . تشدد پسندوں کی وہ جماعت جس نے قدیم حکام کا خاتمہ کرکے عنانِ حکومت ہاتھ میں لے لی ہے میرے سامنے ہے . . . . . قدیم طرز حکومت آخری سانس لے چکی ایک خوبصورت شہران ہی کھنڈر پر بنیگا - جس میں باعزت اشخاص بسیں گے . . . . . اس حقیقی آزادی کی جد وجہد کے کامیاب و ناکام مرحلوں کے بعد . . . . . بہت بعد . . . . . سالہا سال بعد . . . . . اس منحوس ساعت کی برائیاں اور اس سے قبل کی برائیاں جو اس منحوس ساعت کے وجود کا باعث ہوئیں یکے بعد دیگرے میری نگاہوں کے سامنے آرہی ہیں - میں اُن لوگوں کو بھی دیکھ رہا ہوں جن کے لئے اپنی جان دیرہا ہوں . . . . وہ اس لندن میں پُر امن - خوشحال اور کارآمد زندگی گذارینگے - جس کو میں کبھی نہ دیکھ سکونگا . . . . . میں "اسکو" دیکھ رہا ہوں . . . . . اُس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ ہے . . . . . وہی شیر خوار جو میرے نام سے موسوم کیا جائیگا . . . . . میں اُس کے باپ کو دیکھ رہا ہوں جو عمر کے بوجھ سے جُھک چکا ہے لیکن اپنے فرائض عمدگی سے ادا کر رہا ہے . . . . . وہ ضعیف جو ایک عرصے تک اُن کا دوست رہ چکا ہے . . . . . بہت بعد . . . . . شائد دس سال بعد اپنے صبر کا پھل پائیگا . . . . . میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اُن کے دلوں میں اور اُن کی اولاد کے دلوں میں میری عظمت

اورعزت کے بیچ بوئے جائینگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں "اُس کو" دیکھ رہا ہوں جو ایک بوڑھی عورت ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جو اسی دن کی یاد میں آنسو بہا رہی ہوگی ۔ ۔ ۔ ۔ میں "اس کو" اور اُس کے شوہر کو دیکھ رہا ہوں جو اپنی زندگی کے اختتام پر ایک دوسرے کے قریب سپردِ خاک کئے جائینگے۔ اور یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اُنہیں ایک دوسرے کی نظروں میں مرتبہ اور وقار اتنا حاصل نہیں جتنا کہ میں نے خود اُن کے دلوں میں پیدا کر لیا ہے۔

میں اُس کی گود کے شیرخوار بچہ کو جو میرے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ نوجوان پاتا ہوں۔ وہ نوجوان زندگی میں راہِ عمل پر گامزن ہے۔ اور میرے نام کو اپنے کارناموں سے رُوشن کر رہا ہے۔ میرے اپنے کرتوت کے باعث میرے دامن پر جو دھبے پڑ گئے تھے دُھندلے ہوتے جا رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں اُس نوجوان کو باعزت اور عادل منصفوں کی پہلی صف میں پاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ پھر اُسکا لڑکا دکھائی دیتا ہے جس کا نام میرا ہی نام ہوگا۔ اُس کی فراخ پیشانی اور سنہرے بالوں کو خوب جانتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ یہی مقام ہوگا لیکن اِس سانحہ کا اثر موجود نہ ہوگا۔ اور پھر وہ نوجوان کا اپنے لڑکے کو مخاطب کرنا اور درد بھری آواز میں میری کہانی سُنانا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہاں یہ کام میرا سب سے بہتر کارنامہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اِس سے قبل جتنے بھی کام میں نے کئے ہیں اُن سب سے بہتر ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ آرام جس کو اَب حاصل کر رہا ہوں اِس سے قبل کبھی نصیب نہ ہو سکا تھا۔"

اگر مصنف اس کی وضاحت اپنے بیان سے کرنا چاہتا تو صفحے کے صفحے درکار ہوتے۔ اور پھر بھی یہ خوبی میسر نہ ہوتی۔ عظیم الشان ایثار کا مقصد اِتنا اعلیٰ ہے کہ کردار دُنیائے اَفسانہ میں ثانی نہیں رکھتا.... ڈکنس کی مشہور کتاب پکوک پیپرز کی قدر و قیمت کردار نگاری کے مایۂ ناز نمونوں پر مبنی ہے۔ کردار نگاری کے سوا اور کوئی بھی فنی جوہر اِس کتاب میں موجود نہیں۔ پھر بھی دُنیا جانتی ہے کہ ڈکنس کی شہرت کی بنیاد اسی کتاب نے ڈالی تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کردار نگاری کو کیا اہمیت حاصل ہے۔

شیکسپیر کا مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق ڈرامہ ہملیٹ پلاٹ کی خوبی سے مبرا ہے لیکن یہی ڈرامہ ہے جہاں شیکسپیر انتہائی کمال کا مظاہرہ کر سکا۔ یعنے اپنے رنگین تخیل کی مدد سے اس نے مکمل کردار پیش کئے جو حیاتِ اصلی کے مطابق نظر آتے ہیں۔ شہزادہ ہملیٹ اپنے طرزِ عمل کی توضیح خود اپنے الفاظ سے اِس طرح کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"سوال یہ ہے کہ عمل کی ضرورت ہے یا نہیں ۔ ۔ ۔ کیا مصیبتوں کے طوفان کو خاموشی کے ساتھ برداشت کر لینا عظیم المرتبت ہوگا ۔ ۔ ۔ یا اس طوفان کے مقابلہ کے لئے تیار رہنا اور مخالفت سے اُس کا خاتمہ کرنا۔ موت کو لبیک کہنا ۔ ۔ ۔ ایسی نیند سو جانا کہ جس کو ہماری زندگی کا اختتام کہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یا ایسے سکون کی تلاش کریں کہ جس میں دل پر کوئی صدمہ نہ گذرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی ٹھیس نہ لگے ۔ ۔ ۔ ۔ کیا مر جائیں؟ اس لئے کہ چین سے سو سکیں ۔ ۔ ۔ ۔ اور سوئیں اِس لئے کہ عالم خواب کی سیر کریں ۔ ۔ ۔ نہیں۔ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ نہ معلوم موت کی گہری نیند میں کس قسم کے وحشت ناک خواب دکھائی دیں ۔ ۔ ۔ جب کہ ہم اس فانی ڈھانچے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بہرحال ہمیں سکون درکار ہے اس طویل زندگی کے اختتام میں عزت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ زمانے کے طعن و تشنیع۔ ظالم کا ظلم۔ اور مغرور کا غرور کون سہہ سکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ناقدری محبت کی تکلیف۔ انصاف کی تاخیر اور حکام کی گستاخی کمینوں کے ہاتھ شریفوں کی بیقدری کون برداشت کر سکیگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شریف خاموشی کے ساتھ کنارہ کش ہو سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو اِس اَنتھک زندگی کا بوجھ اُٹھا کر کون شرابور ہو ۔ ۔ ۔ ۔ موت کے بعد کیا ہوگا اس کا خوف دامنگیر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ نا معلوم مقام کا تصور جہاں سے کوئی مسافر واپس نہیں لوٹتا ۔ ۔ ۔ ۔ ارادوں کو مذبذب کر دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ خیال کہ اُن مصیبتوں کا جن کو کہ ہم جانتے ہیں سہہ لینا نامعلوم مصیبتوں میں جا پھنسنے سے بہتر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح ضمیر ہمیں بزدل بنا دیتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اِس طرح قوتِ ارادی کو فکر و خوف زائل کر دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ اور اِس طرح مہماتِ عظیم کم اعتمادی کے سبب عمل سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

جین آسٹن اِس میدان میں شیکسپیر کی رقیب تھی۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اُس کو کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے شیکسپیر پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ پرائڈ اینڈ پریجیڈس Pride and prejudice کے ایک کردار کی اِرتقاء کا حال خود کردار کی زبانی سنئیے :-

"میرا حال بالکل مختلف ہے۔ تکلیف دہ واقعات کو یاد کرنا پڑیگا۔ جو نہ بھلائے جا سکتے ہیں اور نہ اُنہیں بھلانا چاہیئے . . . . فطرتاً نہ سہی لیکن عملی طور پر تو میں ہمیشہ خودغرض انسان رہا۔ لڑکپن میں مجھے اچھی تعلیم دیگئی تھی۔ لیکن اپنے مزاج کو درست کرنا نہیں سکھایا گیا۔ مجھے اچھے اُصول بتائے گئے تھے۔ لیکن اُن پر غرور و تکبر کے ساتھ عمل کرتا رہا . . . . . اِس پر بدقسمتی یہ کہ میں والدین کا اِکلوتا تھا۔ والدین نے جو خود بہت نیک تھے۔ لاڈ اور پیار میں میرا خودغرض اور نفس پرست ہونا روا رکھا۔ یا یوں کہو کہ خودغرضی اور نفس پرستی کی تعلیم دی . . . . اِسلئے میں نے اپنے خاندان کے سوا کسی اور کی پروا نہ کی۔ اور ساری دنیا کو اپنے مقابل ذلیل سمجھا کیا . . . آٹھ سال سے اٹھائیس سال کی عمر تک میرا یہی حال رہا . . . . . پیاری الزبتھ اگر تم نہ ملتیں تو ممکن تھا کہ یہی حال باقی رہتا . . . . میں تمہارا کتنا ممنون ہوں کہ تم نے ہی مجھکو ایک کار آمد سبق دیا۔ گو کہ اس کی ابتدا، نہایت تلخ تھی تم ہی نے میرے غرور کو توڑا . . . . . اور اَب ایک خوشگوار استقبال کے متعلق ذرا بھی گنجائش باقی نہ رہی . . . . ایک قابل قدر خاتون کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میں نے جو طریقے اِختیار کئے تھے وہ کس قدر ناموزوں تھے۔ یہ سبق تم ہی سے ملا"

"ج"

سال۔ سوم

مَت سہل ہمیں جانو۔ پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے اِنسان نکلتے ہیں

میرؔ

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنَا ہو جانا
دَرد کا حد سے گذرنا ہے دَوا ہو جانا

غالبؔ

تحتانی مدارس اور ابتدائی تعلیم

جو لوگ اپنی اولاد کو ابتدائی تعلیم باقاعدہ طور پر دلوانا چاہتے ہیں انھیں ابتدائی تربیت کا انتظام بھی کرنا چاہیئے تاکہ ان کی اولاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہو سکے۔ نفسیاتی اور جسمانی پہلوؤں کے مد نظر بھی بچپن کا زمانہ بہت اہم ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ اچھی عادتیں ڈالی جا سکتی ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی تربیت کا انتظام کس طرح کیا جائے اور اس تربیت کا ذمہ کون لے۔ کیونکہ بچوں کی تربیت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے عقل مند اور فنی معلومات رکھنے والے اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کا ایک بڑا طبقہ غیر تعلیم یافتہ اور مفلس ہے۔ اکثر والدین مفلوک الحال اور جز و معاشش ہوا کرتے ہیں اور وہ اس اہم ذمہ داری کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کے علاوہ قابل اور تعلیم یافتہ والدین بھی بچوں کی تربیت کے طریقوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ انھیں یہ نہیں معلوم کہ بچوں کی غذا اور اُن کے لباس کا خیال کیوں کر رکھا جائے۔ ان والدین کو تربیت اولاد کے طریقوں سے واقف کرانے کی ساری کوششیں رائیگاں جاتی ہیں کیونکہ وہ اس طرف دھیان ہی نہیں کرتے۔ خصوصاً مزدور طبقے کے بچے اچھی غذا، پاک صاف لباس اور موزون دیکھ بھال سے محروم ہوا کرتے ہیں۔ ان کی نگرانی بے حد ضروری ہے کیونکہ ان کے والدین ہمیشہ جسم و جان کو یکجا رکھنے میں مصروف ہوتے ہیں اکثر والدین جب اپنے کام پر جاتے ہیں تو بچوں کو ان کے ہی حال پر چھوڑ جاتے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ ان بچوں کی اچھی طرح نگرانی ہو اور ان کو کسی دلچسپ مشغلے میں لگایا جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے اکثر بچوں کو اتنی دیر سے مدارس میں داخل کیا جاتا ہے کہ ان کی سیرت پختہ ہو چکی ہے۔ اس وقت اساتذہ کو بری خصلتوں کے دور کرنے میں بڑی دردسری کرنی پڑتی ہے۔ یہی چیز ہے جس سے ابتدائی تربیت کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

ہندوستان میں عام طور پر والدین اس اہم اور مشکل فرض کے ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔

معدودے چند ایسے ملیں گے جنھیں اچھی تربیت دینے کے ذرائع حاصل ہیں۔ اور جو اپنے بچوں کے لئے اچھا ماحول پیدا کر سکتے ہیں۔ غذا۔ لباس۔ اور اچھی فضا بہم پہونچا سکتے ہیں پھر بھی تعلیم یافتہ اور متمول والدین ویسی تربیت اور تعلیم نہیں دے سکتے جیسی کہ نرسری مدارس میں ہو سکتی ہے کیونکہ یہہ غیر ممکن ہے کہ ہر مکان میں ہم عمر بچوں کی کافی تعداد موجود ہو۔ چھوٹے خاندانوں میں جہاں بزرگ ضرورت سے زیادہ نگہداشت یا محبت کرنے کے عادی ہیں۔ بچے عموماً وقت سے پہلے خود کو اہمیت دینے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ والدین سے یہہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ بچوں کو تربیت دینے کی ایسی صلاحیت رکھیں جیسی کہ نرسری مدارس کے اساتذہ رکھتے ہوں۔ کیوں کہ وہ اساتذہ بچوں کی صحیح فطرت سے واقف ہوتے ہیں۔ ایک مختصر خاندان میں نرسری مدرسہ کی سی سہولتیں بہم پہونچانے میں نہ صرف کثیر مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں بلکہ برٹرانڈ رسل کے خیال کے مطابق ایسے ماحول کا خانگی طور پر پیدا کرنا بچوں کو اپنی برتری اور غرور کی تعلیم دینے کے مترادف ہے جس کا ان خوش قسمت بچوں کے اخلاق پر بہت ہی برا اثر پڑے گا۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ والدین خواہ وہ مال دار ہوں یا غریب اپنے بچوں کو کم از کم دو برس کی عمر سے نرسری مدارس میں داخل کر دیں یا ہر روز صرف چند گھنٹوں کے لئے روانہ کیا کریں۔

بدقسمتی سے ہندوستان کے اکثر والدین اس قسم کے مدارس کے اخراجات نہیں برداشت کر سکتے اور نہ ہندوستان کے دیہاتوں میں اس قسم کا کوئی مدرسہ موجود ہے۔ موجودہ زمانہ میں وہ سہولتیں اور وہ ماحول جو خوشحال طبقہ کے بچوں کو حاصل ہے غریب بچوں کے خواب وخیال میں بھی نہیں آ سکتا اس لئے دیہاتی ہونہار بچوں کی زندگی پر ان کے والدین کی غربت، نا اہلی، اور جہل کا اثر جسمانی اور دماغی طور پر پڑتا ہے۔ ان کے مکانوں کی کثیف فضا، غلاظت، پاک صاف ہوا کی کمی اور لباس کے ناکافی ہونے کی وجہ سے ان کی جسمانی ترقی اور بالیدگی پر اثر پڑتا ہے۔ نرسری مدارس کے رواج سے ان برائیوں کو ایک حد تک دور کیا جا سکتا ہے اور ان سے غریب طبقہ کو کافی فائدہ پہونچے گا۔ مزدور طبقہ کے بچوں کو دو سال کی عمر سے نرسری مدارس میں داخل کیا جا سکتا ہے اور ان کو پانچ سال کی عمر تک وہیں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن داخلہ سے قبل ہر بچہ کا باقاعدہ طبی معائنہ ہونا ضروری ہے اگر کسی مرض یا اور کسی جسمانی کمزوری کا

اس معائنہ میں علم ہو جائے تو نرسری مدارس کے ذمہ دار ارکان کو چاہیئے کہ ان کا کسی شفاخانہ میں باقاعدہ علاج کرائیں۔ اگر سارے ملک میں اس قسم کے مدارس کا جال پھیلا دیا جائے تو بچوں کی اموات میں نمایاں طور پر کمی ہو سکتی ہے۔

نرسری مدارس کو حقیقی معنوں میں تربیت گاہ ہونا چاہیئے نہ کہ بچوں کی صرف قیام گاہ نرسری مدرسہ کے اساتذہ اچھی تربیت دینے کے اہل ہوں تاکہ بچوں کی جسمانی اور دماغی نشوونما میں مدد دے سکیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اساتذہ ایک حد تک نفسیات سے بھی واقف ہوں۔ ایک نرسری مدرسہ کا نصب العین یہہ ہو کہ وہ بچوں کے اخلاق درست کرے اور آئندہ تعلیم کے لئے اچھی بنیاد ڈالے۔ جوں جوں بچہ بڑا ہوتا جائے ویسے ویسے اس کو زیادہ ہدایت دیتے جائیں۔ ہر مدرسہ کے بچوں کا طبی معائنہ کم از کم مہینہ میں ایک وقت ہوتا رہے۔ اور جہاں بھی ضرورت ہو فوری توجہ کی جائے۔ ہر پندرہ روز کے بعد بچوں کا وزن بھی معلوم کیا جائے۔ اساتذہ کو چاہیئے کہ بچوں کے وزن اور قد کی تبدیلیوں کا ایک تختہ رکھیں جس میں وقتاً فوقتاً اندراجات کئے جائیں۔ نرسری مدرسہ میں بچوں کو صبح کے آٹھ بجے سے شام کے چھ بجے تک رہنا چاہیئے۔ جہاں تک ہو سکے کھانے کھیلنے، کام کرنے اور سونے کا اوقات مقرر کر دئے جائیں۔ اس طرح ان میں اچھی عادتیں پڑ جائیں گی اور وہ وقت کی ہمیشہ قدر کریں گے۔ ان کے لباس اور جسم کو پاک صاف رکھنے کے لئے خاص نگرانی کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کو چاہیئے کہ ہر وقت انھیں صفائی اور نفاست کی تعلیم دیتے رہیں۔ بچوں کو کھانے، بات چیت کرنے اور بیٹھنے اٹھنے کے صحیح طریقے بتائیں۔ چند اہم اخلاقی خوبیوں کے پیدا کئے جانے کی کوشش کی جانی چاہیئے۔ انھیں کام اور کھیل کود میں باہمی اتفاق اور ہم آہنگی کی تعلیم دی جائے۔ تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا سچا جذبہ پیدا ہو جائے۔ حق پسندی، ہمت اور راست بازی کی تعلیم بھی دی جانی چاہیئے۔

مانٹی سوری اُصول پر (Montessori line) اچھی تربیت نرسری مدارس کا نصب العین ہونا چاہیئے۔ مقابلتہً بڑی عمر کے بچوں کی تربیت مختلف کھیلوں کے ذریعہ ہونی چاہیئے۔ یہہ سب ضروریات مدرسہ کی جانب سے پوری کی جائیں۔ اور نسبتاً چھوٹے بچوں کو بہت سے

کھلونے دے دئے جائیں۔ بڑی عمر کے بچوں کو آسان نظمیں اور قومی ترانے اچھی طرز میں گانا یا پڑھنا سکھایا جائے اور کسی آلۂ موسیقی کی آواز کے مطابق کھیلنا یا گانا سکھایا جائے۔ اس طرح بچپن ہی سے انھیں موسیقی سے لگاؤ پیدا ہو جائے گا۔ ان بچوں کے وقت کا کثیر حصہ کھلی فضا میں گذرنا چاہیئے اور جس وقت وہ مکان میں ہوں تو صاف ہوا کی آمد و رفت کا خیال ضروری ہے۔ اس لئے نرسری مدرسہ کے لئے ایک چھوٹا سا خوبصورت باغیچہ بھی بے حد ضروری ہے تاکہ موسم کے لحاظ سے بچے اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ باغ میں کھیلتے ہوئے یا درختوں کی خبرگیری سے واقف ہوتے ہوئے گذار سکیں۔ اس طرح ابتداء سے ان میں قدرتی مناظر سے انس پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مدرسہ کے باغیچہ میں چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا کر ان میں بچوں کو مختلف بیجوں کا بونا سکھایا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ مختلف ترکاریوں یا درختوں کے ناموں اور ان کے بیج بونے کے موسم سے واقف ہو سکتے ہیں۔ ترکاریوں، میووں اور دوسرے درختوں کے ناموں سے واقف کرانے کے لئے خاص خاص جشن منائے جا سکتے ہیں جس میں بڑی عمر کے بچے بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ بچوں کو پھولوں کا انتخاب کرکے گلدستہ بنانا سکھایا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی انھیں اپنے کمروں کو پھولوں سے سجانے کی تعلیم بھی دی جا سکتی ہے۔ تاکہ ان میں نفاست اور خوبصورتی کی تمیز بچپن ہی سے پیدا ہو جائے۔ انھیں خاص پرندوں اور گھریلو جانوروں کے پالنے کا بھی شوق دلائیں تاکہ وہ ان کی نگرانی کے اُصول سے واقف ہو سکیں اور ان میں حیوانات سے انس اور ان کی زندگی اور عادات سے واقف ہونے کی صلاحیت پیدا ہو۔

شائد برٹرانڈرسل نے صحیح کہا ہے کہ:-

"اگر نرسری مدارس عام ہو جائیں تو ایک ہی نسل کے بعد وہ تعلیمی امتیازات جو مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں دور ہو جائیں گے"

ہندوستان میں ایسے مدارس کی کمی بے حد محسوس کی جا رہی ہے اب وقت آگیا ہے کہ اشتراک عمل سے ان ضروریات کو پورا کریں جو اس کمی کو پورا کر سکتے ہیں" سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اساتذہ کو نرسری اُصول تربیت سے واقف کرایا جائے۔ ہندوستانی خواتین کی ٹریننگ میں ایسی سہولتیں پیدا کرنی چاہئیں کہ وہ اس ٹریننگ کے بعد نرسری مدارس میں تعلیم دے سکیں۔

اگر نرسری مدارس کا شعبہ جداگانہ طور پر قائم کیا جائے تو بہت سے تعلیمی مصارف کا اضافہ ہو جائیگا جنھیں ملک کی آمدنی برداشت نہ کر سکے گی ان مصارف کو کم کرنے کے لئے جہاں کہیں ممکن ہو نرسری شعبہ کا موجودہ تحتانوی مدارس سے الحاق کرایا جائے چونکہ ان مدارس سے فائدہ زیادہ تر غریب بچوں کو ہوگا اس لئے ان بچوں سے بالکل معمولی اُجرت تعلیم لی جانی چاہئے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک کی کثیر آبادی غیر تعلیم یافتہ اور توہم پرست واقع ہوئی ہے اس لئے وہ طبقہ موجودہ شعبہ تعلیم میں اگر اصلاحات کا خیال کیا جاتا ہے تو بہت سی رکاوٹیں پیدا کر دیتا ہے ان کے روایات کے خلاف اگر کوئی بھی کام کیا جاتا ہے تو وہ اس کی ضرور مخالفت کرتے ہیں۔ اس لئے اگر نرسری مدارس کو عام کرنا ہے تو پہلے عوام کو ہم خیال بنا لینا ضروری ہے۔ جب تک کہ ان والدین کو نرسری مدارس کے فائدوں سے تشفی نہ ہو اس وقت تک ساری کوششیں بے سود ہونگی۔ اگر مدارس کے ذمہ دار ارکان والدین کی مرضی حاصل نہ کریں تو مدارس کو رائج کرنا اور انھیں جاری رکھنا ناممکن ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ کوئی جدید تجویز اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ خانگی اور سرکاری طور سے اس کے لئے کافی سرمایہ جمع نہ ہو جائے۔

(ماخوذ)

مرزا بابر بیگ

(سال سوم)

مسئلہ ناخواندگی اور ہندوستان

ڈاکٹر ہنگ شی ٹا ویہیں ایک پُر لطف قصہ سناتے ہیں کہ ایک چھوٹے سے چینی لڑکے نے اپنی دادی کو تعلیم کا حامی بنانے کے لئے۔ کہا کہ جنت کے داخلہ کے لئے فرشتوں کی کتاب پر دستخط کرنا ضروری ہے اور دستخط کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ چین میں ناخواندگی کے خلاف جو علم تشدد انہ جنگ جاری تھی اس میں جاپان کی جارحانہ کارروائیوں کی مدافعت کے سلسلہ میں خلل واقع ہوگیا۔ آج ہندوستان میں ہزاروں نوجوان مرد اور عورتیں ایسے سن رسیدہ اشخاص کو جن کے مدرسے جانے کا زمانہ گذر چکا ہے تعلیم دینے کی کوشش کر رہے ہیں آج ہندوستان میں نوے فیصد لوگ ان پڑھ ہیں۔ سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے ہندوستان کی جملہ پڑھی لکھی آبادی بچوں سمیت ۲،۳۹،۶۳،۲۷۹ مرد اور ۴۱،۶۹،۰۳۶ عورتیں ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں ۱/۴ ۲۳ کروڑ ان پڑھ ہیں۔ اس لحاظ سے ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگ ۸ فیصد ہیں اس کے برخلاف ۹۴ فیصد انگلستان میں ۹۴،۴ فیصد امریکہ میں ۹۰ فیصد سوئیٹ روس میں ۹۹ فیصد جرمنی میں ۹۹،۷ جاپان میں ہیں۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں جبکہ ہندوستان میں پہلی بار مردم شماری ہوئی پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد صرف ۳،۵ فیصد تھی۔

پچاس سال کے دوران میں یعنے سنہ ۱۸۸۱ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تک اس میں صرف ۸ فیصد تک کا اضافہ ہوا ہے اس رفتار سے پڑھے لکھے ہندوستانیوں کی تعداد صد فیصد ہونے کے لئے ۹۲۰ سال کی مدت درکار ہوگی بشرطیکہ اس کی آبادی بڑھتی نہ جائے۔ عام طور پر ہندوستان میں ۸ فیصد خواندگی کے اعداد ہونے کے باوجود ملک میں بعض ایسے حصے بھی ہیں جہاں پڑھے لکھے لوگوں کا اوسط بہت کم ہے۔

ہندوستان میں برطانوی اقتدار سے پہلے ہر گاؤں میں ایک مدرسہ تھا اور صرف بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے یعنے ہر چار سو کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ تھا۔ حکومت ہند کے کمشنر تعلیم کی رپورٹ سنہ ۱۹۲۹ء و سنہ ۱۹۳۰ء کے بموجب برطانوی ہند میں ۲،۶۰،۹۴۶ سرکاری و غیر سرکاری درسگاہیں

تھیں۔ جن میں ۱۰،۴۷،۲۸۹ مرد اور ۱۴،۶۷،۰۴۳ عورتوں کی تعلیم کا انتظام تھا۔ گویا کہ ہر ۵۰۰،۴ اشخاص کے لئے ایک مدرسہ تھا۔

ہندوستان جیسے ملک میں جہاں پڑھے لکھوں کا اوسط اتنا گرا ہوا ہے تحتانوی اور بالغوں کی تعلیم کی اہمیت اتنی واضح ہے کہ کسی خاص وکالت کی محتاج نہیں۔ پھر فوج پر جو روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اس کا ایک چوتھائی بھی ہندوستانیوں کی تعلیم پر صرف نہیں کیا جاتا۔

مرکزی اور صوبجاتی مالیات کی آمدنی سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں (۲،۲۷،۲۶،۴۸،۰۰۰) روپیے تھی جس کے منجملہ ۲۶ فیصد رقم فوج پر جس میں (۵۸،۰۰۰) برطانوی عہدے دار اور (۱۶۸،۰۰۰) ہندوستانی سپاہی تھے صرف کی گئی دس فیصد رقم پولیس اور عدالت پر خرچ ہوئی۔ اور صرف ۶ فیصد تعلیمات پر اُٹھائی گئی۔

لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد جنہوں نے سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء میں تعلیم حاصل کی۔ (۱،۰۲،۰۱۶،۱۲۶) تھی اس طرح ہندوستان کے سالانہ تعلیمی اخراجات فی کس آٹھ آنے ہوتے ہیں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ انگلستان میں ابتدائی تعلیم کے لئے ۱۰۹ روپیے سالانہ فی کس۔ اسکاٹستان میں ۱۵۰ آئرستان میں ۱۱۲ ڈنمارک میں ۱۵۸ ناروے میں ۱۵۰ اور جنوبی افریقہ میں ۱۶۶ روپیے خرچ کئے جاتے ہیں لیکن ہندوستان میں صرف آٹھ روپیے سالانہ فی کس خرچ ہوتے ہیں۔ ان حالات کے تحت کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دنیا کی غیر تعلیمیافتہ آبادی کا ½ حصہ ہندوستان میں موجود ہے۔

وہ کیا اسباب ہیں جنہوں نے موجودہ حالت پیدا کی؟ یہ ایک بدنام حقیقت ہے کہ لارڈ مکالے برطانوی ہند کی پالسی کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ صرف اس جماعت کو تعلیم دلائی جائے جو حکومت کی ملازمت کرنی چاہے۔ یہ بات اس خط سے واضح ہوتی ہے جو رائٹ آنریبل دی ارل آف النبرو نے ۲۸ اپریل سنہ ۱۸۵۸ء کو صدر اور نائب صدر ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام لکھا ہے

آنجہانی گوکھلے ہندوستان میں تعلیم کو عام کرنے کے اولین محرک تھے۔ فطری طور پر محکوم ملک میں ہر مسئلہ قومی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے اسی لئے یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ انیسویں صدی کے تیسرے دہے سے آج تک ہمارے تمام لیڈر قومی تعلیم ہی کی آواز بلند کرتے آئے ہیں اور اس کا نتیجہ ہے کہ علیگڈھ یونیورسٹی ڈی اے وی کالج لاہور بنارس ہندو یونیورسٹی اور متعدد آشرم وجود میں آئے۔ گو کہ ان اداروں کی کوششیں بارآور ضرور ہوئیں لیکن وہ عوام تک تعلیم پھیلا نہ سکے۔ بہار کے سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر سید محمود نے

۲۶/اپریل ۱۹۳۷ء کو عوام کی تعلیم کی تائید میں ایک مہم شروع کی۔ تعلیمی جماعتیں چند گھروں میں کھولی گئیں ڈاکٹر محمود کے خیال کے مطابق قیدیوں کی دماغی و روحانی قوتوں پر بڑا اثر کیا ہے "ٹاٹا آئرن اور اسٹیل کمپنی نے بھی جمشید پور میں تعلیمی جماعتیں کھولی ہیں۔ شکر کے کارخانوں کے مالکان نے بھی خواندگی کے کئی مرکز کھولے ہیں۔ ڈاکٹر محمود کا دعویٰ ہے کہ تقریباً چار ہزار دیہات میں ناخواندگی دور ہوجائے گی۔ بہار میں عوام میں تعلیم پھیلانے کی جو کمیٹی قائم کی گئی ہے وہ اس بات پر فخر کرتی ہے کہ اس نے نومبر ۱۹۳۸ء اور مارچ ۱۹۳۹ء کے درمیان صوبہ میں ۹۷۴ و ۱۸ تعلیمی مرکز قائم کئے ان تمام مرکزوں میں ۹۸۳ و ۱۹ و ۳ مرد ہیں جن میں ۹۹۴ و ۹۳ و ۱ اونچی ذات کے ہندو، ۵۰۰ و ۲ ہریجن و ۳۴۲ و ۷۴ مسلمان اور ۵۵۰ و ۱ دوسرے فرقوں کے افراد شامل ہیں انہوں نے ۹۲۶ و ۱۵ اُستادوں سے جس میں ۵۹۳ و ۱۰ اُستاد اور ۳۱۳ و ۵ رضاکار طالب علم شامل ہیں تعلیم پائی ۷۰۰ و ۵ قیدیوں نے تعلیم پائی ان میں سے ۱۵۰ قیدی جن میں ۳ عورتیں بھی شامل ہیں اپر اور لوئر پرائمری کے امتحانات میں کامیاب ہوئے۔

اس خیال سے کہ کہیں یہ پڑھی لکھی جماعت کچھ عرصہ بعد پھر اپنی اصلی حالت پر عود نہ کر جائے صوبائی کمیٹی ایک پندرہ روزہ رسالہ "روشنی" شائع کر رہی ہے جو نئے پڑھے لکھے افراد کو ملے گا۔

بہار کے بعد صوبہ متحدہ نے ۱۵/اپریل ۱۹۳۹ء سے عوام کو تعلیم دلانے کی مہم شروع کی۔ سر ہنری ہیگ گورنر صوبہ نے خود بھی عہد کیا ہے کہ کم از کم ایک سال میں ایک مرد یا ایک عورت کو وہ خواندہ بنالیں گے یا پھر دو روپیہ ناخواندہ کو خواندہ بنانے کے اخراجات ادا کریں گے۔ کہا جاتا ہے کہ نصف کروڑ سے زیادہ لوگوں نے اس قسم کا عہد کیا ہے۔ صوبہ کے ۴۸ اضلاع میں تعلیم بالغاں کی کمیٹیاں بنائی گئیں۔

بمبئی میں ۳۱۴ مرد اور ۷۳ عورتیں فی ہزار خواندہ ہیں۔ مسٹر بی جی کھیر نے ۴/اپریل ۱۹۳۹ء کو جلسہ عام میں جو گورنر بمبئی کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا کہا کہ جہالت ان تمام برائیوں کی جڑ ہے جن میں ہمارا ملک مبتلا ہے۔ ہمارا نصب العین دو سال میں سو فیصد تعلیم یافتہ پیدا کرنا ہے تاکہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں ریکارڈ قائم ہوسکے۔

بمبئی سوشل سروس لیگ نے تعلیم بالغاں کی کمیٹی کے تعاون سے مئی میں ۷۰۳ تعلیمی جماعتیں کھولیں ان کے افتتاح کے قبل جلسے منعقد کئے گئے جلوس نکالے گئے اور اشتہارات چسپاں کئے گئے خوش قسمتی سے عوام کی طرف سے بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور ۱۰۰۰۰ طلبا شریک ہوئے چند جماعتیں

عورتوں کے لئے بھی کھولی گیئں اوران میں ماں اوربیٹیاں دونوں ساتھ ساتھ دیکھی گیئں۔

پونہ سنٹرل کواپریٹیو بنک نے ۵۷ جماعتیں کھولیں۔ اساتذہ کی جماعتوں کی اسکیم بھی ستارا ضلع میں رائج کی گئی جس کی رُو سے ۲۰۰ بالغ اورکافی تحتانوی جماعتوں کو پڑھا یاجائے گا۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا یہ بھی تجویز کی گئی ہے کہ پونہ کے وسطانوی مدرسوں سے تقریباً ۴۰۰ طلباء حصہ لیں۔ چین میں زیرمشق اساتذہ نے عوام میں تعلیم پھیلانے کی تحریک میں بڑا حصہ لیا ہے چنانچہ "کاٹانگ" دوسو دیہات میں ۱۹۳۳ء میں دوسو طالب علم تھے۔ جنہوں نے دو ہزار دیہاتیوں کو تعلیم دی ان میں پندرہ سو عورتیں تھیں جن میں زیرمشق اساتذہ نے عورتوں کو خصوصاً تعلیم یافتہ بنانے میں بڑا حصہ لیا اگر ہم چاہیں توان کے تجربہ سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

ہرصوبہ اپنے طورپر اس امر کی کوشش کررہا ہے کہ ناخواندگی کو کسی طرح دور کیا جائے۔ پنجاب نے ایک نئی اسکیم مرتب کی ہے۔ حکومت پنجاب نے انجمن حمایت الاسلام۔ سناتن دھرم سبھا۔ ڈی اے وی کالج کی مجلس انتظامی، خالصہ دیوانی۔ ہیوگا مشن اوراحرار مشن کے تعاون سے اس تحریک کو سرسبز کرنے میں کوشاں ہے۔ ایسے طلباء جن کی عمر ۱۲ اور ۱۸ کے درمیان ہے اور جن کے والدین مدرسہ بھیجنا نہیں چاہتے رضاکاروں کی حیثیت سے طلب کئے جائیں گے تھوڑی سی ٹریننگ کے بعد یہ طلباء اپنے اضلاع میں جماعتیں قائم کریں گے۔

پرشوتم راج سکسینہ

(سال اول)

رُوئداد
بزمِ اتحادِ اُردو نظام کالج ۴۰-۱۹۳۹ء

اس سال بزمِ اتحادِ اُردو نظام کالج کی سرگرمیوں کی روئداد پیش کرتے ہوئے ہمیں مسرت ہوتی ہے کہ اس سال بزمِ اُردو کی کامیابی اختتامِ سال پر صرف ایک پُر تکلف عصرانہ ترتیب دے لینے اور ایک ڈرامہ اسٹیج کر لینے ہی پر موقوف نہ تھی بلکہ اس کی انتھک کوششوں کا مقصد کچھ اور بھی تھا جسے اُردو ادب کی سچی اور بے لوث خدمت کہنا چاہیئے۔ اسے اپنے مقاصد میں جس حد تک بھی کامیابی حاصل ہوئی وہ بے انتہا حوصلہ افزا ہے۔ قبل اس کے کہ بزمِ اُردو کی مختلف سرگرمیوں کا تھوڑا بہت تذکرہ کیا جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ اراکین کابینہ سے متعارف ہو جائیں۔

عہدے داران واراکین کابینہ۔

جناب احمد عبد اللہ صاحب صدیقی جو صدر شعبہ اُردو ہیں بزمِ اتحادِ اُردو کے ایک مستقل صدر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نائب صدر کا انتخاب صدر کلیہ اور صدر بزمِ اُردو کے باہمی مشورہ سے ہوا کرتا ہے۔ اس سال جناب عبد القوی صاحب متعلم سال چہارم جو اس عہدے کے لئے موزوں ترین شخص تھے منتخب ہوئے۔ دوسرے عہدوں کے انتخابات عام رائے شماری کے ذریعہ کئے گئے جن کے نتائج حسب ذیل ہیں:۔

جناب احسان احمد صاحب متعلم سال سوم معتمد۔ جناب بابر بیگ صاحب متعلم سال سوم خازن۔

مختلف جماعتوں سے حسب ذیل نمائندے منتخب ہوئے:۔

جناب ثناء اللہ صاحب سال چہارم۔ جناب امین مرزا صاحب سال سوم۔ عاصمۃ الرحمٰن صاحب۔ جناب افسر سلطان صاحب۔ جناب ریاض الحسن صاحب سال دوم

جناب عبدالہادی صاحب، مس کرلے والا اور جناب پرشوتم راج صاحب سکینہ سال اول۔

جلسہ افتتاحیہ۔

بزم اُردو کا افتتاحی جلسہ نہایت شاندار پیمانہ پر ہوا۔ جناب اظہر حسن صاحب کی صدارت میں جناب وہاج الدین صاحب شمیم نے ایک پُراز معلومات تقریر فرمائی جس میں آپ نے اُردو زبان کی تاریخ اور اس کی اہمیت پر کافی روشنی ڈالی حقیقت حال سے واقف کراتے ہوئے آپ نے نوجوانوں سے درخواست کی کہ وہ عملی طور پر اُردو کی خدمت کرنے کے لئے میدان میں اتر آئیں آپ کی تقریر کے بعد جناب ماہر القادری صاحب نے ایک ولولہ انگیز نظم سُنائی جس میں نوجوانوں سے خطاب تھا۔ حاضرین جلسہ کافی متاثر ہوئے جلسہ کے بعد طلبا اور معزز حاضرین نے عصرانہ میں شرکت کی جو بزم کی طرف سے ترتیب دیا گیا تھا۔ عصرانہ کے اختتام پر شعر و شاعری کا دور چلا مختلف شعرا نے جو اس وقت موجود تھے اپنے اپنے کلام سے حاضرین کو محفوظ فرمایا اور اس طرح افتتاحیہ جلسہ خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوا۔

تقاریر و مباحثے۔

کابینہ نے تقریری جلسوں اور مباحثوں کے لئے ایک خاص نظام العمل مرتب کر لیا تھا جس پر سال بھر عمل کیا گیا۔ مہینہ میں کم از کم دو جلسے ضرور ہوا کرتے تھے۔ مضامین نہ صرف علمی اور ادبی ہوتے تھے بلکہ ان کا تعلق ملک کے مسائل حاضرہ سے بھی ہوا کرتا تھا۔ طلباء نے ان جلسوں میں عملی طور پر شرکت کرکے جذبہ اشتراک عمل کا امید افزا ثبوت دیا۔ ایوان میں سامعین کی تعداد ہمیشہ حوصلہ افزا رہی معززین کی تعداد پچھلے سالوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔ ہر جماعت کے لڑکے تقریروں اور مباحثوں میں حصہ لیتے رہے۔ ان کے علاوہ مختلف مقالے جو معیاری ہوتے تھے جلسوں میں پڑھ کر سُنائے گئے۔

تحریری اور تقریری فی البدیہہ مقابلے۔

طلباء میں تحریر اور تقریر کا سچا ذوق پیدا کرنے کے لئے انٹر اور بی اے کے لئے علحدہ علحدہ تحریری اور تقریری فی البدیہہ مقابلے رکھے گئے جو ہر میقات کے آغاز میں ہوا کرتے تھے۔

طلبا نے ان مقابلوں میں کافی دلچسپی لی۔ حسب ذیل حضرات تیسری میقات کے اختتام پر انعام کے مستحق ٹھیرے۔

بی۔اے تقریری مقابلہ۔

انعام اول سید منظور الحسن متعلم سال سوم
" دوم۔ عبدالحق صاحب متعلم سال چہارم

تحریری مقابلہ

انعام اول احمد اللہ صاحب متعلم سال چہارم
" دوم عبدالحق " " "

انٹر تقریری

انعام اول ریاض الحسن صاحب " " دوم
" دوم عبدالہادی " " اول

تحریری

انعام اول۔ عبدالہادی صاحب " اول
" دوم۔ عبدالحلیم صاحب " دوم

توسیعی جلسے۔

بزم کی جانب سے مختلف ارباب علم وفضل کو جو یہاں موجود تھے یا باہر سے "اتفاقاً" تشریف لائے تھے دعوت دی گئی تاکہ اپنے مشاہدات اور تجربات طلبا کے سامنے بیان فرمائیں ان میں قابل ذکر جناب ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ہیں جنھوں نے ازراہ عنایت ہماری دعوت قبول فرمائی آپ نے اپنے تجربات کی روشنی میں وار دھا اسکیم پر عالمانہ تقریر کی اور اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں پر ناقدانہ نظر ڈالی۔

مشاعرہ۔

کئی سال پہلے مدرسہ عالیہ کی طرف سے ہر سال ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا لیکن بعض وجوہات کی بنا پر مشرقی تہذیب کی اس یادگار کو بھلا دینا پڑا تھا۔ بزم ادب کی جد و جہد سے

اس سال ایک کامیاب مشاعرہ زیر صدارت عالیجناب نواب تراب یار جنگ بہادر منعقد ہوا مشاعرہ میں تقریباً ساٹھ شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ حیدرآباد کے چیدہ چیدہ اساتذہ جو دوسرے مشاعروں میں بہت کم شریک ہوا کرتے ہیں اس مشاعرے میں تشریف لائے تھے۔ یہہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ نواب تراب یار جنگ بہادر نے اس کی صدارت منظور فرمائی کیونکہ حیدرآباد کے کسی اور مشاعرے کو یہہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ یہہ صرف مادر کلیہ کی دیرینہ محبت تھی جس نے نواب صاحب موصوف کو ہماری درخواست منظور کرنے پر مجبور کر دیا حضرت ضامن کنتوری۔ حضرت صفیؔ اورنگ آبادی۔ جناب سالکؔ صاحب جناب ہادی علی رسواؔ صاحب جناب تابشؔ صاحب۔ جناب آفتاب علی صاحب مہرؔ وغیرہ مشاعرہ میں شریک تھے یہہ اُن ممتاز شعرا میں سے ہیں جن کی شہرت صرف حیدرآباد کی حد تک محدود نہیں ہے مشاعرہ نو بجے رات سے شروع ہوا اور صبح کے ۴ بجے تک گرم رہا کالج کے اور مدرسہ عالیہ کے شعرا نے بھی کافی تعداد میں حصہ لیا۔ مشاعرہ کے سلسلہ میں جناب صاحب صاحب زادہ آفتاب علی خاں صاحب کا ذکر آنا ضروری ہے کیونکہ مشاعرہ کی کامیابی کا دارو مدار زیادہ تر آپ ہی پر تھا۔ مختلف انتظامات آپ ہی کی رہنمائی میں ہوئے۔ اگر آپ کی امداد ہمیں حاصل نہ ہوتی تو مشاعرہ کا اس قدر کامیاب ہونا ناممکن تھا۔

سالار جنگ بین الکلیاتی فی البدیہہ تقریری مقابلہ

حسب معمول سالار جنگ فی البدیہہ تقریری مقابلہ ہوا جس میں جامعہ عثمانیہ۔ سٹی کالج اور نظام کالج کی جماعتیں شریک تھیں۔ جناب قاضی عبدالغفار خاں صاحب مدیر پیام نے ازراہ عنایت جلسہ کی صدارت منظور فرمائی۔ آپ کے ساتھ جناب ہادی جعفری صاحب سابق طالب علم نظام کالج اور جناب عباس حسین صاحب سابق طالب علم جامعہ عثمانیہ جج تھے مقابلہ میں سٹی کالج کی جماعت اول رہی اور نظام کالج کی جماعت جس میں سید منظور الحسن متعلم سال سوم اور ریاض الحسن صاحب متعلم سال دوم شریک تھے دوم رہی۔ انفرادی طور پر ریاض الحسن صاحب متعلم سال دوم نے انعام دوم حاصل کیا۔

عصرانہ۔ ڈرامہ اور تقسیم انعامات

بزم اُردو نے ایک پر تکلف عصرانہ ترتیب دیا جس میں معزز مہمان پروفیسرین نظام کالج و مدرسہ عالیہ اور طلبائے حال و قدیم شریک تھے۔ عصرانہ کے بعد ڈرامہ "ہمزاد" عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر کے زیر صدارت اسٹیج ہوا۔ اداکاران ڈرامہ نے اپنی پرخلوص کوششوں سے ڈرامہ کو کامیاب بنا کر حاضرین جلسہ سے تحسین حاصل کی۔ عبدالعزیز صاحب اور عابد خاں صاحب اداکاری میں انعام اول و دوم کے مستحق ٹھیرے عثمان ابوطالب صاحب کو بھی ایک انعام حوصلہ افزائی ملا۔ ڈرامہ کے اختتام پر نواب صاحب نے اپنے دست مبارک سے مختلف انعامات تقسیم کئے نواب صاحب کو یوں تو نظام کالج سے بے انتہا محبت رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوتی ہے کہ نواب صاحب موصوف کی نظر عنایت بزم اُردو پر خاص طور پر رہی ہے۔ آپ نے صدارت منظور فرما کر نہ صرف ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشا بلکہ ہماری رقمی اعانت فرما کر مالی دشواریوں کو بڑی حد تک حل کر دیا ہے۔ ہماری امیدیں نواب صاحب موصوف سے ہمیشہ وابستہ رہیں گی۔

نظام ادب

اس سال کے نظام العمل کا سب سے زیادہ اہم جزو نظام ادب کی اشاعت ہے جو ایک عرصہ کے بعد نئے روپ میں آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ اسی کی اشاعت کے لئے کچھ تکلیفیں ضرور اٹھانی پڑی لیکن الحمد اللہ کہ ہمارے حوصلے خلوص نیت کی وجہ سے پست نہیں ہوئے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ آنیوالی کابینہ بھی دشواریوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے گی۔

ہماری بزم کی مصروفیتوں کا سال تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ہمارا ترتیب دیا ہوا نظام العمل باحسن خوبی انجام پا چکا ہے۔ اور ہمیں یہ کہتے ہوئے بے حد مسرت ہوتی ہے کہ طلبائے حال و قدیم نے ہمارے ساتھ اشتراک عمل کیا۔ پروفیسر صاحبان نے حوصلہ افزائی فرمائی۔ اور صدر کلیہ کی شفقت پدرانہ حاصل رہی پرنسپل قادر حسین خانصاحب کا زمانہ بزم اُردو کے لئے واقعی رحمت ہے جن کی عنایتوں کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا۔ آپ نے ہمارے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہونچائیں اور ہماری مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی۔ صدر کلیہ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہوئے اس سال کی مصروفیتوں کو ختم کرتے ہیں۔

معتمد "نظام ادب"

رازِ حیات .... طلبا کیلئے تین زرّین اُصول

۱۔ معاشی نقطۂ نظر سے ــــــــــ

ارزاں اور پائدار

۲۔ فیشن کے نقطۂ نظر سے ــــــــــ

خوبصورت اور وضعدار

۳۔ عمرِ رواں کے نقطۂ نظر سے ــــــــــ

جلد اور قریب

ہمارے ہاں سے ٹنس۔ بیڈ منٹن۔ کرکٹ۔ ہاکی فٹ بال وغیرہ کے سامان خرید فرمایئے اور پرانے سامان کو درست کروا کر نئے رُوپ میں دیکھئے۔ ہماری آنکھیں آپ کیلئے فرش راہ بنی ہوئی ہیں

کو کر اینڈ کو۔ ترپ بازار۔ حیدرآباد دکن

ہندوستان کا عظیم الشان کتبخانہ

مکتبہ ابراہیمیہ

حیدرآباد دکن

جنوبی ہند کا اولین علمی و ادبی ادارہ مکتبہ ابراہیمیہ ایک عرصہ سے ابنائے وطن کی علمی ادبی خدمات انجام دیرہا ہے اور بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ جنوبی ہند میں خاصکر یہ فخر اسی مکتبہ کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے اُردو زبان کی اشاعت اور ترقی کی خاطر ملک میں اُردو زبان کے علوم و فنون کی قدیم و جدید کتابوں کا بڑا کتبخانہ قائم کرکے عامۃ الناس میں کتب بینی کا مذاق پیدا کیا۔ تمام نامور مصنفین کے کتابیں یہاں دستیاب ہوسکتی ہیں۔ مکتبہ کی مستعد اور باقاعدہ خدمات کا آج یہ اثر ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض سے یونیورسٹیز، کالجس، مدارس، کتبخانہ جات سرکاری، غیر سرکاری اہلِ ذوق علمی ادارے ہمارے یہاں سے کتابیں طلب فرماتے ہیں۔ آپ ہمارے یہاں سے جملہ قسم کی فہرستیں طلب فرمائیں اگر آپ اپنے کتبخانہ کیلئے کوئی آرڈر دینا یا کسی کتاب کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ہم سے خط و کتابت کیجئے۔

محمد عبد الحق مہتمم مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

کیا آپ کی تمنا یہ نہیں ہے کہ ———

اپنی ٹینس کا معیار اعلیٰ قائم کریں اور اپنے ملک کو دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لا کھڑا کریں ——— یہ کس طرح ممکن ہے؟

۱۔ آپ کے کھیلنے کیلئے ہموار۔ خوبصورت۔ اور پائدار کورٹ ہو

۲۔ وضعدار۔ نفیس اور پائدار ریکٹ و دیگر ضروریاتِ ٹنس موجود ہوں

ہم آپ کی خدمت کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہیں خواہ شرط نمبر ۱ ہو یا نمبر ۲۔

——— تعمیر کورٹ کے سلسلہ میں مہدی جنگ اسٹیڈیم باغ عامہ نظام کالج اور شاہ منزل کے کورٹ ہماری خدمات کا نتیجہ ہیں۔

سیلز نجرس لمیٹڈ کے آفیشل اسٹاکسٹ ڈی فائنس اسپورٹس

عابد روڈ

کیفِ حیات! نغمہ زیست!! راحتِ زندگی!!!

وہ کونسی چیز ہے! ——— جس کی آپ تمنا کریں اور ہمارے ہاں نہ ملے۔

ضروریات زندگی ——— ہائی کلاس اسٹیشنری۔ مختلف اقسام کے سگار سگریٹ اور پائپ

ضروریاتِ خانہ داری پیٹینٹ دوائیں۔ ہاسپٹل سنڈریز۔ المونیم اسٹورز

کٹلری وغیرہ وغیرہ۔

موسم گرما کا تحفہ ——— شاعرانہ لطافتوں کا مجموعہ۔ روح پرور۔ نشاط آگیں ہمہ اقسام کے شربت

کسی پر کیف شام میں ——— عابد روڈ پر سے گذرتے ہوئے۔ ایک لمحہ کیلئے کیوں نہ ہمارے پاس

آپ تشریف لے آئیں ——— (اسم با مسمیٰ)

چیپ اسٹورز ٹوبیکونسٹ اینڈ جنرل مرچنٹ حیدرآباد

U·9147

جلد (۵) — بابتہ مارچ ۱۹۴۳ء — شمارہ (۲)

طلبائے نظام کالج کا ششماہی رسالہ

پروفیسر آغا حیدر حسن (مدیر)

اسرائیل احمد مینائی (معتمد)

قاضی عبد الرشید (شریک معتمد)

اراکین

بادشاہ حسن صاحب (نمائندہ سابق طلبأ)

سید نظم الدین صاحب (نمائندہ سابق طلبأ)

محمد عبد الولی صاحب (سال چہارم)

حامد علی صاحب (سال چہارم)

سیف الدین عبد الحسیب صاحب (سال سوم)

قاضی محمد بشیر الدین صاحب (سال دوم)

مس فرحت قطب الدین (سال دوم)

غلام محمود صاحب (سال اوّل)

سالانہ چندہ تین روپیہ

مضامین

اور

چندہ ارسال کرنے کا پتہ

معتمد نظامِ ادب نظام کالج حیدرآباد دکن

مطبوعۂ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

ج

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"پڑھنے والوں سے"

"نظام ادب" کا یہ شمارہ آغاز جولائی ۱۹۶۲ء میں آپ کے سامنے ایسے اشعار و مضامین کا مجموعہ پیش کر رہا ہے جس کے لکھنے والوں میں کالج والے بھی ہیں باہر والے بھی، پروفیسر صاحبان بھی، طلبا و طالبات بھی، حیران ہوں کہ ان سب کا شکریہ کس طرح ادا کیجئے، سوائے اس کے کہ پرنسپل صاحب اور اساتذہ کی شفقت و محبت، ساتھ والوں کے خلوص و اعانت، اور باہر والوں کی ہمدردی کا اعتراف کیجئے، اور بالخصوص ان مشاہیر گرامی کا احسان مانئے جنہوں نے اپنی قیمتی آرا، خطوط اور کلام سے سرفراز فرما کر ہمارا رتبہ بڑھایا۔ ایک کالج میگزین سے مشاہیر کرام کی یہ دلچسپی ایک طرف ان کی ادب نوازی کا ثبوت ہے اور دوسری طرف اس صحیح جذبہ ہمت افزائی کا پتہ دیتی ہے جو یقیناً ہی نوخیز و نوجوان لکھنے والوں کے لئے آئندہ اپنا "کیریر" انتخاب کرنے اور بنانے میں بیحد ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

امیر مینائی رحمتہ اللہ علیہ کی نظم و نثر کے نمونے پیش ہیں، اور قطع نظر اپنے ذاتی جوہر و کمال کے، وہ اہمیت بھی رکھتے ہیں جو "مینا گان کہن" کے غیر مطبوعہ مذاق نگارش کو ہمیشہ حاصل رہی ہے۔

"گلدستہ" میں شعرائے کرام کے خطوط اس زنجیر کی دوسری کڑی ہیں جس کی پہلی کڑی نثر تھا۔ ان کے خطوط کی شکل میں "مینا بازار" کے عنوان سے ہم نے پچھلے شمارہ میں پیش کی تھی۔ اب گویا یہ سلسلہ مکمل ہو گیا۔

زمانہ جو اپنے دامن میں اگلے پچھلے واقعات کے گلبرگ بھرے گذرا چلا جا رہا ہے، ان روزوں صبا رفتار ہے، حالات و واقعات اس تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں کہ کل تک اگر کل کا فیشن آج کے متروک کا حکم رکھتا تھا تو آج صبح و شام وہی حکم رکھتے ہیں ۔۔۔ جنگ اور اس سے مترتب ہونے والے لازمی نتائج نے ہمیں پہلے پہل حیران و ہیبت زدہ کیا، پھر مغموم و نادم اور اب انسدیسے آرام و پریشان و دل تنگ !!!

حوادث و آلام اور قتل و غارت کے اس دور میں بھی جب کسی کی جواں مرگی کی خبر سنیئے تو دل چوٹ کھائے اور آنکھیں بھر آئے بغیر نہیں رہتیں۔ ادارہ اسی لئے عبد القوی صاحب مرحوم کی بے وقت موت پر ماتم کرتا ہے۔ مرحوم ہمارے کالج کے ہونہار طالب علم رہ چکے تھے اور ان دنوں "نکاؤن" مدھار لے مدیر مہتمم تھے۔ بیشک ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو اسی کی طرف جانا ہے۔

پرانے ارکین ادارہ اب رخصت ہو رہے ہیں، جدید اراکین تشریف لا رہے ہیں، ہمیں اپنے کالج چھوڑنے کا افسوس ہے تو اسکی خوشی بھی ہے کہ نئے لوگ اس ذمہ داری کو خوشی خوشی اٹھانے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ خدا ان کے حوصلوں میں رفعت اور کوششوں کو کامیابی عطا فرمائے۔ جب تک نئے خیالات کی یہ ورآمد جاری ہے "نظام ادب" قائم اور اس کی دلچسپیوں میں ترقی جاری رہیگی ع

"یہی آئین قدرت ہے، یہی دستور فطرت ہے"

والسلام
خاکسار
اسرائیل احمد مینائی۔ معتمد

نوٹ: ہم قارئین کو خاص طور سے قاضی بشیر الدین صاحب کے مضمون "نظم معرا" کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ صنف نئی نسل شعرا کی دلچسپی کا مرکز ہے۔ قاضی صاحب کا طرز استدلال قابل داد ہے۔ معتمد

اُنس و مستی

مولوی وجیہہ الزماں خانصاحب مرحوم و مغفور، سفیر ریاست رامپور کے چھوٹے فرزند اور حضرت امیر مینائی کے برادر نسبتی، یعنی شیخ فصیح الزماں صاحب مرحوم، اُردو اور فارسی میں استعداد کامل رکھتے تھے۔ خود حضرت امیر مینائی کو ان پر بھروسہ تھا اور کمال شفقت فرماتے تھے، چنانچہ امیر کے دیوان فارسی پر (جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے) ان کی لکھی ہوئی تقریظ موجود ہے۔ ذیل کا مکتوب اُنھیں کے نام ہے۔ آپس کے تعلق اور محبت کا جو عالم ہوگا وہ خود اس خط سے ظاہر ہے۔ فلسفۂ اُنس پر جس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے، اُمید کہ صاحبانِ حال کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہوگی۔

امیر مرحوم کے کتنے ہی ایسے غیر مطبوعہ خطوط موجود ہیں، جن میں علمی اور ادبی نکات سے بحث کی گئی ہے۔ حالات کے سازگار رہنے پر انشاءاللہ تعالیٰ زیور طباعت سے آراستہ کئے جائیں گے۔ اُن ہی میں سے ایک خط ہدیہ قارئین ہے۔

اسمٰعیل احمد مینائی
نبیرۂ حضرت امیر مینائی رح

دار السرور رامپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میاں فصیح پیارے فصیح، خدا تم کو زندہ اور صحیح رکھے، القاب ہو چکا آداب ندارد، مطلب سنو، تمہید دیکھو، پر تاثیر چیزیں بہت نہیں بہت مگر دیکھیں کہ حسن کو جذاب قلوب سنا اور بے شبہ ہے، اگر عموم نہیں، دیکھو لیلے کا حسن مجنوں کے دل کو کھینچتا تھا، اور کسی

دل کو نہ کھینچ سکا! وقس علیٰ ہذا۔ آواز خوش کی دلکشی مگر اس میں بھی سامع کی صلاحیت کو دخل ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام پتھر تک کو موم کر دیتے تھے مگر وہ دل جو ہدایت پذیر نہ ہوتے تھے اُن پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ چیز جس کی تاثیر اعم الاعم ہے اور کوئی دل اس کے اثر سے بچ نہیں سکتا وہ اگر ہے تو اُنس ہے کہ نہ کوئی انسان اس سے محروم ہے نہ کوئی حیوان، دیکھو انسان کیسا ہی سنگ دل ہو، مگر جب ٹٹولو گے تو کسی نہ کسی کے ساتھ اُنس ضرور ہوگا۔ یہی اُنس وہ چیز ہے جس پر نظام عالم کا مدار ہے۔ اس سے انسان فرشتہ ہو جاتا ہے۔ یہی اُنس لے اُڑتا ہے تو بندے کو خدا تک پہنچاتا ہے، خیال کرو کہ ایک مسافر وطن چھوڑ کر غربت میں بادشاہ ہو جائے تب بھی اس کو وہی ولولہ رہتا ہے کہ چل کر ٹوٹی پھوٹی وطن کی عمارت دیکھئے، اس جھونپڑے کی سیر کیجئے اور جن سے اُنس ہے اُن سے ملئے۔ وہ پنچھی جو صبح کو اپنا پیٹ بھرنے کو بہ شوق نکل جاتا ہے، شام کو صیاد کے دام سے جان بچاتا ہوا، اپنے گھونسلے کو دوڑتا ہے، پھر کون چیز اس کو لے جاتی ہے وہی اُنس جو اپنے بچوں کے ساتھ اس کو ہوتا ہے، الغرض جس قدر غور کی نظر سے دیکھا جائے سارا طلسم دُنیا اور آخرت کا اسی اُنس اور اسی محبت پر مبسوط ہے، اور یہی سلسلہ مضبوط اور مربوط ہے

در خرمن کارگاہ عالم دیدم
یک دام محبت است دیگر ہمہ ہیچ

اس تمہید سے یہ مقصود ہے کہ میں نے جو وفور محبت سے تم کو ایک کارڈ لکھا، اُدھر وہ ڈاک میں گیا، اِدھر میرے دل پر یہ وسواس ڈاکہ لایا کہ مبادا اس کو دیکھ کر میرے کم دل کے دل پر چوٹ لگے اور وہ چوٹ الٹ کر میرے دل کو چوٹیلا کر دے۔ تیر ابھی نشانہ تک پہنچا بھی نہیں ٹکر کھا کر پلٹنے کا کیا ذکر، مگر یہاں دل وہی چوٹ کھا گیا جو اُدھر سے اُچٹ کے وہ تیر لگتا، اسی تصور سے اسی توہم میں دل سے باتیں بنایا کیا۔ کبھی یوں تسلی کی کہ شاید وہ کارڈ تلف ہی ہو جائے، تیر ہدف تک پہنچنے ہی نہ پائے کبھی ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ ؎

چہا نوشتہ ام از بے خودی بہ نالۂ شوق
خدا کند کہ بہ دست نگار من نرسد

ذرا خیال کرنے کی جگہ ہے کہ یہ کس چیز کی تاثیر ہے۔ اسی اُنس و محبت کی جو ازل سے دل میں ودیعت کی گئی ہے۔ ؎

محبت است کہ دل را نمی دہد آرام
وگرنہ کیست کہ آسودگی نمی خواہد

خاتمہ سخن اس پر ہے کہ کل آپ کے ہاتھ کی چند سطریں ایک لختِ جگر کے خط میں پائیں جی چاہا کہ کلیجہ میں چیر کر رکھ لوں، اوّل تو خط کی شان سے ابہار دست و قلم کاتب و مکتوب الیہ کا پتہ ملا، حتیٰ کہ لطیف[1] احمد نے دیکھتے ہی کہا کہ یہ تو آپ ہی کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پھر مضمون میں ایسی تاثیر بھری ہوئی تھی کہ پڑھتے ہی مجھ سے سنگ دل سخت جان کے آنسو بھر آئے ہائے محبت، ہائے محبت کی صدا غیب سے کانوں میں آنے لگی۔ جانِ من دل شکستہ ہو کر آزردہ نہ ہونا یہ بھی محبت کا اثر ہے۔ غیر اگر کبھی سخت بات کہتا تو میرا دل ذرا بھی متاثر نہ ہوتا۔ مشہور ہے کہ دوست کے ہاتھ کی پنکھڑی، غیر کے ہاتھ کے پتھر کا کام کرتی ہے۔ تمہارا اتنا عذر کرنا کہ میں اجازت منگوالوں تو رسائل مطلوبہ دوں، مجھ کو اس قدر شاق ہوا کہ میں شکایت کا دفتر لے بیٹھا، اب اس کا عذر خواہ ہوں وَالْعُذْرُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ مَقْبُوْلٌ اے میرے رسول مقبول صلعم کے عاشق تو بھی میرا عذر قبول کر اور اس شرمندگی سے نجات دے کہ ایک تو یونہی شکستہ دلی اپنا کام کر رہی ہے بلکہ کام تمام کر رہی ہے، اس پر تم سے سچی محبت کرنے والے سے حجاب، اور ایسی حالت میں، قیامت کر گیا۔

پرچہ جو تم نے بھیجا اس میں موت کا ڈر اور ہر وقت اس کا دھڑکا لکھا ہے، میاں تم تو مستان ہو، تم کو موت کا کیا ڈر، ایک غوطہ میں بیڑا پار ہے، مشکل تو ان کی ہے جو مستی کو ترستے ہیں، ایڑیاں رگڑنا تو انھیں کو ہے، خیر ان کو بھی یہ آس لگی ہے کہ یا ساقی یا مستان کہہ کر اس مشکل کو آسان کر پائیں اور یہ کڑوے گھونٹ مرگ اور سختی مرگ کے پی جائیں۔ میاں مستان تم اپنی ہو حق میں کچھ خبر نہ ہو، مرنے والے مر گئے جو مرتے ہیں ان کو مرنے دو۔ اِلَّآ اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا يَمُوْتُوْنَ کو گنگنایا کرو، اور مزے اڑایا کرو مگر بار ذرا اس کے معنیٰ پر غور کر لو کہ اولیاء اللہ کون لوگ ہیں اور ان کی کیا صفت ہے، خود بھی سمجھو اور مجھ کو بھی سمجھا دو۔ اے میرے اللہ یہ دوری اور مہجوری کا درمیان سے اٹھا دے، لکھتے لکھتے ہاتھ تھک گئے اور جی نہیں بھرتا، پاس ہوتا تو گلے لگا کر سینے سے چمٹا کر مناتا

میرے لختِ جگر اپنی بھابجی سے بعد دعا کے کہو کہ آج خیر سے بھیا تم سے رخصت ہوئے ہوں گے، مجھے اور تمہاری ماں کو اب اس کا تصوّر کہ وہ تم سے جدا ہو کر آتے ہیں، ان سے ملنے کے مزے کو گھٹاتا ہے۔ گو سب وہاں تمہارے عزیز ہیں مگر پھر وہ وہی ہیں ان کا سا انس دوسرے سے ممکن نہیں ہے خیر یہ سمجھ لو جدائی ملنے کی قدر بڑھانے کو ہوئی ہے۔ انشاء اللہ پھر ان سے اور ہم سب سے ملوگے دل قوی رکھو۔

امیر فقیر

---

[1] حضرت امیر کے منجھلے فرزند "المخاطب بہ نواب اختر یار جنگ مینائی (مرحوم)

کلامِ امیرؔ

حضرت امیر مینائی مرحوم کی ابتدائی عمر کا وہ کلام جو "غیرتِ بہارستان"[1] تھا، افسوس کہ تلف ہو گیا لیکن اخیر عمر کے کہے ہوئے مسدّس، قصیدے، رباعیات، قطعات، سلام، مراثی اور غزلوں کا ایک معتد بہ حصہ اب بھی ایسا موجود ہے جو زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوا۔ اسی میں سے یہ غزل نذرِ ناظرین "نظامِ ادب" ہے:-

اسرائیل احمد مینائی
معتمد

سُنی جو داورِ محشر نے گفتگو تیری
کہا قدیم سے بگڑی ہوئی ہے خو تیری

گلی میں کی رگِ ہر گُل کی جستجو تیری
ملا نہ رنگ ہی تیرا کہیں نہ بُو تیری

اُڑے ہیں بال و پرِ بیخودی سے ہم وحشی
تلاش کرتے ہوئے تا مقامِ ہُو تیری

منانے والوں ہی نے روٹھنا سکھایا ہے
بگڑ گئی ہے منانے سے یار خو تیری

قدح قدح تجھے کرتا ہے یاد اَو ساقی
اُدھر پکار پڑی ہے سبو سبو تیری

قضا، یہ تیغِ ادا سے کسی کی کہہ آئی
کہ راہ تکتی ہے کب سے رگِ گلو تیری

برنگِ سایہ ترے پیچھے پیچھے پھرتا ہوں
ترے ہی پاؤں سے کرتا ہوں جستجو تیری

رقیب بھی ہو جو افسانہ گو تو مُنہ چوموں
کہے کہانی اگر، میرے رُو برو تیری

امیرؔ سنتے جو آتشؔ بھی یہ غزل کہتے
جواب ہی نہیں رکھتی ہے گفتگو تیری

امیرؔ مینائی رحمۃ اللہ علیہ

[1] حضرت امیرؔ کی ابتدائی عمر کے مجموعہ کلام کا نام جو ۱۸۵۷ء کے فتنۂ غدر میں تلف ہو گیا۔

ہز اکسلنسی کرنل سر احمد سعید خاں
کے۔سی۔ایس۔آئی۔کے۔سی۔آئی۔ای۔ایم بی۔ای۔ایل۔ایل۔ڈی
نواب آف چھتاری
صدر اعظم باب حکومت دولت آصفیہ
آپ نے بزم اتحاد اردو کے افتتاحی جلسہ کی صدارت فرمائی

دکن کی اور دہلی کی اُردو کا نمونہ

پچاس برس آنکھ بند کرتے گزر گئے۔ والد مرحوم نے ترک ملازمت کی بندہ اون کے ساتھ رخصت ہوا۔ حیدر آباد بار بار آنا ہوا۔ یہی ہفتہ عشرہ کے لئے۔ مقصود دیدار یار اور کوئی مقصد نہیں۔ بار وفادار صاحبزادہ تلاوت جنگ بہادر ادام اللہ حیاتہٗ یہ عادت مستمر ہو گئی ایک سال وہ تشریف لائیں۔ دوسرے سال میں حاضر ہوں۔ یہ اون کی باری کا سال تھا۔ ناسازگاری مزاج مانع ہوئی۔ باری بندہ کو بھگتنی پڑی دو سال مدرسہ عالیہ اور دو سال نظام کالج کا طوق شاگردی گلے میں تھا دونوں اداروں کو ہر قسم کے حق مجھ پر حاصل۔ نظام کالج سے یادآوری ہوئی۔ باعث یادآوری فصیح الدین پسر نصیر الدین معلوم نہیں انہوں نے وہاں جا کر کیا جڑ دیا۔ مجھ میں جنگی ڈال جا لو دور کھڑی رہ۔ وہاں سے دعوت نامہ آیا۔ اجابت کے سوا چارہ نہ تھا۔ ستر سالہ عمر میں ناحق شناسی کے جرم کا کیسے مرتکب ہوتا۔ اپنے نام پر کلنگ کا ٹیکہ لگوانا۔ مضمون گفتار دکن کی اور دہلی کی اُردو کا موازنہ قرار پایا۔ گفتار کے بعد تحریر کی فرمائش ہوئی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات وہ بھی بسر و چشم پذیرا ہوئی۔ بوقت گفتار پہلے کچھ ظرافت سے کام لیا گیا پھر نصائح پر اتر آیا۔ مضمون میں یہ دونوں نظر انداز ہیں نفس مطلب سے مطلب ہے۔

زبان نانی جی کے گھر کا ڈیرا نہیں۔ کسی شہر یا ملک کی مطلق العنان حکومت اس پر ناجائز۔ مرکزیت کا سوال دیگر ہے۔ وہ بھی زمانہ کے ساتھ انتقال پذیر ہے بمثال لکھنو اور دہلی کا معاملہ دیکھنا یہ ہے کہ کہاں کیا اچھا ہے۔ خذ ما صفا اور دع ما کدر کے اصول پر عمل ہونا چاہیئے یہی اس گفتار کی بنیاد ہے۔ گفتار دو حصوں پر تقسیم کی گئی پہلے وہ الفاظ جو دکن کی زبان میں ہیں اور ہمارے ہم معنی الفاظ پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ہمیں اختیار کرنے چاہئیں۔ مردود قرار نہیں دینے چاہئیں۔ دوسرے وہ الفاظ جو اب مستعمل نہیں پہلے مستعمل تھے اور فصیح خیال کئے جاتے تھے۔ دکن میں جاری رہے۔ دہلی میں متروک ہو گئے۔ اب مفصل بیان حاضر ہے۔

(۱) روپیہ بھنانا یہ زبان دکن روپیہ تڑانا۔ کیوں جناب کیا روپیہ بھاڑ میں ڈال کر بھونتے ہیں جو بھنانا کہا جاتا ہے۔ تڑانا بہتر ہے۔ اگرچہ دراصل نہیں تو مجازاً تڑا دیا جاتا ہے۔

(۲) میری پہ پھپیری خالیری۔ پھوپیری بہن۔ ہمارے ہاں خالہ کی بیٹی بہن۔ پھوپی کی بیٹی بہن وغیرہ کیوں صاحب اگر دو لفظوں سے کام چلے تو پورا فقرہ کیوں بولا جائے۔ ارشاد ہوگا چچازاد بہن کہو۔ جناب یہ ترکیب کیسی۔ ایک لفظ فارسی کا دوسرا اردو کا۔ بے تکا۔ بے جوڑ۔ میری اور پھوپیری نے کیا قصور کیا ہے اسی کو بولئے

(۳) پڑجیب۔ کوّا۔ جناب وہ نہیں جو آسمان پر اڑتا ہے۔ بلکہ وہ جو آدمی کے حلق میں ہوتا ہے دیکھئے اشتباہ کا پہلو بھی نہیں رہا۔ لفظ پڑ آپ کی زبان میں موجود اور اسی معنی پر دلالت کرتا ہے جیسے پڑبال۔ پڑپوتا۔

(۴) طاق۔ عربی زبان کا لفظ طاقچہ اسم تصغیر۔ طاق کا اطلاق بہت بڑی محراب پر ہوتا ہے۔ ہمارا طاق محراب تو بیشک رکھتا ہے۔ مگر چھوٹی سی چیز ہے۔ پھر حضور طاقچہ کیوں نہ فرمائیں۔ اس میں کیا مضائقہ۔ بلکہ معنی کے لحاظ سے افضل۔

(۵) بنگلہ۔ بہ معنی انگریزی مکان یا کوٹھی۔ حیدرآباد میں بالاخانہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کوٹھی ہمارا نام بہ لحاظ معاملات کے ہے۔ یہ بہ لحاظ شکل و شباہت کے ہے۔ فارسی کے لفظ کلاہ فرنگی میں بھی شباہت کا دخل ہے۔ بنگلہ دہلی کی اردو میں موجود ہے۔ یہ گیت ملاحظہ ہو۔
ریتی میں بنگلہ چھوا دے کشوری لال۔ بنگلہ بمعنی بالاخانہ بھی ہمارے ہاں آیا ہے۔ بندہ ہی کا مکان قدیم زمانے میں بنگلہ والی حویلی کہلاتا تھا۔ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

(٦) مدرا بہ زبان دہلی قند۔ یہ کپڑا ہے۔ سرخ رنگ۔ کیوں جناب قند سے اسے کیا تعلق ہے کیا اس میں کوئی شیرینی ہے۔ شائد آپ یہ فرمائیں آنکھوں کو خوشنما اور شیریں معلوم ہوتا ہے۔ درست ہے مدرے نے کیا قصور کیا یہ لفظ تو اس کپڑے کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ کہ شہر مدرا کی پیداوار ہے۔ وہیں کا مشہور تھا اور وہیں سے ساری دنیا میں جاتا تھا۔ یہاں تک کہ رومی بھی لے جاتے تھے۔ ایک زمانے میں یہ مقام رومیوں کی تجارت گاہ تھا۔

(۷) سیتا پھل یعنی شریفہ۔ کیا اس پھل میں کوئی خاص شرافت اور بلند پائیگی پائی جاتی ہے جو شریفہ نام ہوا۔ سیتا پھل میں تو ایک تاریخی واقعہ کی طرف بھی اشارہ ہے۔ سیتا جی اس نواح میں آئی تھیں۔ اون کو یہ پھل پسند آیا ہوگا۔

(۸) کمان۔ ڈاٹ۔ محراب۔ محراب کے لفظ پر تو کوئی اعتراض نہیں۔ بہت صحیح ہے۔ عربی

۔کے لفظ ہماری زبان میں لا انتہا موجود ہیں۔ انکا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہاں یہ ڈاٹ چہ معنی دارد۔ محراب کے بیچ میں (KeyStone) ہوتا ہے۔ یہ ڈاٹ کے مشابہ اسلئے ساری محراب کو ڈاٹ بولنے لگے۔ کسی مستری جی کی خوشامد کیجئے۔ جب لفظ کی حقیقت کا پتا چلے۔ کمان سیدھا سادھا لفظ مشابہت کے معیار پر صحیح۔ پھر اُسے چھوڑ کر ایک لغو لفظ کیوں مستعمل ہو۔

(۹) ہرّاج۔ نیلام۔ جناب نیلام۔ پرتگالی زبان کا لفظ ہم بولتے ہیں۔ میری نظر میں تو صرف یہ ایک اِس زبان کا لفظ اُردو میں ہے۔ یہ پسند خاطر ہے اور ہرّاج بُرا اگرچہ اس کا مولد و منشا زبان عرب اور یہ زبان ہماری زبان میں شیر و شکر۔

(۱۰) چہل واری یعنی لٹھا۔ کیوں صاحب کیا یہ کپڑا کوئی لٹھ مارتا ہے جو جناب اس کو لٹھا فرماتے ہیں۔ ہاں نام کی رعایت سے اب لٹھ مار کہ لٹھا تو بکنے لگا ہے۔ چہل واری بڑا جامع لفظ۔ اس کپڑے کا تھان ہمیشہ سے چالیس گز ہوتا چلا آیا ہے۔ رہا وار یہ بھی ہماری زبان کا قدیم لفظ ہے۔ مثل میں موجود ہے۔ سو گز وارا اور ایک گز بھی نہیں آتارا۔

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ آپ کوشش فرمائیں اور ایسے لفظ جمع کریں۔ یہ دوسرا حصّہ اُن الفاظ کا ہے جو بُرے سمجھے جاتے ہیں مگر درحقیقت یہ ہماری غلطی ہے۔ جو لفظ کسی ضرب المثل میں آگیا وہ ہرگز اس زبان کے واسطے برا نہیں ہو نا نہ متروک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ضرب المثل موجود ہے اور مستعمل ہے۔ ضرب المثل زبان کے فقروں کے انمول جواہرات ہوتے ہیں اگر ایسے نہوں تو ان میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اور ایک بار بولنے کے بعد دوسری مرتبہ نہیں بولے جاتے۔ ذیل میں جو الفاظ لکھے جائیں گے۔ ان کے لئے محاورات یا ضرب الامثال ہی کی دلیل پیش کی جائے گی۔

(۱) چاوڑی یا چاوُڑی چبوترہ۔ تھانہ۔ چاوڑی حیدرآباد میں رائج دہلی میں رائج نہیں۔ اگرچہ دہلی کا ایک بڑا بازار چاوڑی بازار کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں مرہٹوں کے زمانے میں شاہجہان مرہٹوں کے گورنر کا مکان اور کوتوالی تھی۔

(۲) ناکہ بمعنی تھانہ۔ اب تک ناکہ بندی نے اس کی ناکہ بندی کر دی ہے۔

(۳) ہانڈی۔ ہنڈیا۔ ہانڈی لغو ہنڈیا خوب۔ کیا خوب اس مثل کا کیا علاج۔ گھی سنوارے ہانڈی اور بڑی بہو کا نام۔ یہاں بھی ہنڈیا فرمائیے۔ دیکھئے ضرب المثل کا لطف جاتا رہتا ہے یا نہیں۔

(۴) مچھی مچھلی۔ اگر مچھی غلط ہے تو مگرمچھ کیسا۔ یا جیسے آغا حیدر حسن صاحب نے فرمایا۔ مچھی بھون کہاں سے آیا۔

جیب، زبان۔ بیٹی جیب چلائیو اور روٹی کھائیو۔ اب فرمائیے جیب دہلی کی زبان میں موجود ہے یا نہیں۔

چندی، دہجی۔ ہندی کی چندی ملاحظہ ہو۔ اب چندی پر اعتراض بیکار۔ مونڈی منڈیا۔ گردن۔ مونڈی کاٹا دہلی کی عورتوں کے رُوزمرہ کا لفظ جھگڑا بے سُود۔

یہ تو چند لفظ ہیں جو سرسری نظر میں پیش نظر آئے۔ دوسرے غور اور فکر کے بعد مل سکتے۔ اب مجھے تو معاف فرمائیے، اور آپ اس کام کو جاری کیجئے۔

بندہ آداب عرض کرتا ہے۔ اور مراجعت فرمائے دہلی ہوتا ہے فقط

خواجہ محمد عبدالمجید
دہلوی

جب یہ دنیا بے نیاز خیر و شر ہو جائیگی
زندگی دشوار سے دشوار تر ہو جائیگی

حسرت ترمذی

پھر سادگیٔ حسن کا یہ لطف کہاں تھا
اچھا ہے کہ تجھ سے ترے انداز پیچھے ہیں

تسنیم

ایسوں سے کوئی کیونکر ہوش و خرد بچائے
جو ابروؤں سے روٹھیں آنکھوں سے مسکرائیں

تسنیم

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

افکارِ جلیل

مر مر کے مجھ کو جینے کا انداز آگیا
اے زندگی سمجھ میں ترا راز آگیا

بے بال و پر تھے ہم مگر اے موسمِ بہار
کلیاں جہاں کھلیں پرِ پرواز آگیا

کچھ ہو چلی تھی دل کی تڑپ میں کمی مگر
اک اور ناوکِ نگہِ ناز آگیا

توبہ کے بعد جان پڑی ہے شراب میں
کیونکر کہوں کہ پینے سے میں باز آگیا

پھر کس سہارے ہوگی غریبوں کی زندگی
جور و ستم سے یار اگر باز آگیا

دیکھا نگاہِ گرم سے تم نے جو اس طرف
دل کی تڑپ میں برق کا انداز آگیا

آنکھیں ملا کے مفت میں رسوا ہوئے جلیل
ہر جنبشِ نگاہ میں اک راز آگیا

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

دربار اکبری کے نورتن

(نشر شدہ - لاسلکی - حیدر آباد دکن)

... فتح پور دار النور میں دیوان خاص ہے - سنگ سرخ کی عمارت ہے - سنگ مرمر کی پچی کاری ہے - سنگ تراشوں نے پھول پتے بنانے میں کمال دکھایا ہے - پتھر کو موم کر دیا ہے - عبد الصمد - فرخ گوبردھن کیسو وغیرہ نے دیواروں پر وہ نقاشی اور رنگ آمیزی کے کمال دکھلائے ہیں کہ دیکھنے والا نقش بدیوار ہو جائے - قرینے سے سونے کا سنگاسن بچھا ہے - جڑاؤ چوڈنڈے پر کاشانی مخمل کا کارچوبی شامیانہ ہے - آگے اسی شان کا ڈنڈا پیش گیر بطور سائبان لگا ہے - چاروں طرف موتیوں کی جھالریں پیتوں اور پتوں کے گچھے لٹک رہے ہیں - جواہرات کی چمک سے آنکھیں چندھیائی جاتی ہیں - شاہی کارخانے کے بنے قالین - جن پر گل و بلبل - ہما اور شکارگاہ بنے ہیں - سلیقے سے بچھے ہیں - زرین طاؤسوں میں سنہری پنج شاخوں میں کافوری بتیاں روشن ہیں - مرصع عود دانوں، اگر دانوں اور سونے کی انگیٹھیوں میں بخورات روشن ہیں مردنگ - حباب - کنول - جھاڑ - فانوسوں نے رات کو دن بنا دیا ہے - تخت پر حضرت جلال الدین اکبر بادشاہ غازی رونق افروز ہیں - سبزہ رنگ - غلافی آنکھیں - چوڑا سینہ - پتلی کمر - لمبے ہاتھ - شیر کی سی ہیبت - چست ازار - باریک جامہ - سر پر لٹ پٹی دستار - مردانہ زیور پہنے - دنیا میں لاثانی معلوم ہو رہے ہیں - فرش پر ادب قاعدے سے راجہ بھگوان داس - راجہ مان سنگھ - راجہ ٹوڈرمل - راجہ بیربل - ابو الفضل - فیضی - حکیم ابو الفتح گیلانی - حکیم ہمام خانخاناں مرزا عزیز کوکلتاش - بیٹھے ہیں -

(بین درباری)

اکبر - راجہ بھگوان داس جیو! یہ میرا بائی کا کیا قصہ ہے - چتوڑ گڑھ سے کیوں دوار کا جی چلی گئیں -

راجہ بھگوان داس - انداتا! میرا بائی - ٹھاکر رتن سنگھ کی اکلوتی کنیا تھیں - ان کی ماتا کو سری کرشن جی بھگوان سے کمال کی عقیدت تھی - ہر وقت ان کی مورتی کی پوجا کرتی رہتی تھیں - میرا بائی

چھوٹی سی تھیں۔ ایک برات جا رہی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے جو اوپر جانے لگیں تو دیکھا ماں کرشن جی کی مورتی سامنے لیے بیٹھی ہیں۔ میرا بائی نے پوچھا یہ کون ہیں۔ ماں نے مسکرا کر جواب دیا کہ تمھارے دولھا۔ اس دن سے بس میرا بائی کو کرشن جی سے عشق ہو گیا۔

اکبر ان کی شادی پھر کنور بھوج راج سے چتوڑ میں کیسے ہو گئی۔

راجہ بھگوان داس۔ جہاں پناہ۔ شادی تو والدین نے کر دی۔ اور جیسے ہی ان کا ڈولا رنواس میں اترا اور ان کی ساس نے درگا پوجا کے لیے ان سے کہا انھوں نے انکار کیا اور کہا جو سر رنچھوڑ جی کے سامنے نوایا جا چکا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھک سکتا۔ رانا چتوڑ کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ اور ان کو سمجھایا۔

اکبر۔ پھر کیا ہوا۔

بھگوان داس۔ وہ باز نہ آئیں۔ آخر ان کے پلنگ پر ناگ ڈ لوایا گیا۔ اور اس نے ان کو نہ ڈسا۔ اور سادھو سنتوں کا سنگ رکھا۔

اکبر۔

اکبر نے راجہ ٹوڈرمل کی طرف آنکھ اٹھائی اور کہا یہ عجیب بات ہے۔ ان جوگیوں کی صحبت میں انسان روحانی ترقی کر لیتا ہے اور اس سے خوارق عادات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

ٹوڈرمل۔ ہاتھ باندھ کر۔ مہابلی سلامت۔ ان ہی میرا بائی کو رانا چتوڑ نے زہر کا پیالہ یہ کہ کر بھجوایا۔ کہ یہ سادھوؤں کا چرن امرت ہے۔ میرا بائی۔ بس جانتے ہوئے۔ پان کر گئیں۔ اور ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اکبر۔ حیرت۔ حیرت

راجہ بیربل۔ جہاں پناہ۔ ایک روز رانا جی کو پرچہ لگا کہ میرا بائی کا حجرہ بند ہے اور اندر سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ رانا فوراً ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر غصے سے کانپتا ان کے دروازے پر آیا اور دروازہ کھلوا کر اندر داخل ہوا۔ اور للکار کر پوچھا کہ کس سے ہنس بول رہی تھیں۔ انھوں نے ادب سے ہاتھ کا اشارہ کیا اور کرشن جی کی مورتی کو بتا دیا۔ اچھ رانا دیکھتا ہے تو کرشن جی کی مورتی کا ہاتھ بڑھا ہوا ہے۔ اور اس میں پاسا ہے۔ سامنے چوسر بچھی ہے۔ وہ یہ لیلا دیکھ کر۔ شرمندہ ہو تلوار کو میان کر واپس چلا گیا۔

اکبر۔ کنور بھوج راج کی خدمت بھی تو شوہر ہونے کی حیثیت سے ان پر کرنی فرض تھی۔

راجہ بیربل - جہاں پناہ - خانہ داری کا سب انتظام کرتی تھیں - لیکن دل کسی وقت کنہیا جی کی یاد سے غافل نہ ہوتا تھا -

اکبر - ہاں ٹھیک ہے - پنہاریوں کو دیکھ لو - کنوئیں سے پانی لاتی ہیں - کلس پکلس گاگر پہ گاگر پر بٹ لوئی ہوتی ہے - آپس میں ہنستی بولتی اونچی نیچی زمین کو طے کرتی گھروں کو پہنچ جاتی ہیں کیا مجال جو ظروف آب کا توازن بگڑے - اور وہ گر پڑیں - اگر انسان اپنے خدا کی طرف دھیان رکھے اور دنیا کے کام کرے تو کیا وہ ان پنہاریوں سے بھی گیا گزرا ہے -

تمام حاضرین - کرامات - اللہ اکبر - جل جلالہٗ -

اکبر - پھر کیا ہوا -

بیربل - رانا نے کہا کہ اس بدنامی سے تمہارا مرجانا بہتر ہے - اور ان کو مرنے کے لیے متھرا جی بھیج دیا - یہ بندرابن میں آئیں - اور بھگوان کی بھگتی میں محو ہو گئیں - مہاتما جیو کی بھگتی کی شہرت سن کر ان کے درشن کی اگیا چاہی - انھوں نے کہلا بھیجا ہم استری کو نہیں آنے دیتے میرابائی نے جواب بھجوایا - کہ ہم نے سنا تھا برج میں صرف کنہیا جی ہی پرش ہیں - باقی سب گوپیاں ہیں آج جان پڑا کہ اور پُرش بھی ان کے ساجھی ہیں - جیوجی یہ جواب سن کر شرمندہ ہوئے اور ملاقات کی - متھرا سے وہ دوارکا جی چلی گئیں - رانا کی ریاست میں جتنے ٹھاکر تھے انھوں نے بغاوت کی - آئے دن چتوڑ میں جھگڑے رہنے لگے - رانا کو خیال ہوا کہ یہ سب میرابائی کے ساتھ جو بدسلوکی کی گئی ہے - اس کا نتیجہ ہے - اس لیے راج گرو کے ساتھ اور برہمنوں کو بھی بھیجا کہ جاکر - سمجھا بجھا کر واپس چتوڑ لے آئیں - وہ لوگ پہنچے - چلنے کو کہا - وہ راضی نہ ہوئیں - آخر دھرنا دے کر بیٹھ گئے - وہ برہمن ہتیا کرنی نہیں چاہتی تھیں - کہا گردھر جی سے رخصت ہو لوں ان کی مورتی کے پاس گئیں - اور اسی میں سما گئیں - کچھ دیر انتظار کر کے جو لوگ اندر گئے - تو ان کو نہ پاکر پریشان ہوئے - مورتی کی طرف دیکھا تو پتھر میں سے ساڑی کا پلو دکھائی دے رہا تھا - اور وہ گپت ہو گئیں -

اکبر - عجیب واقعہ ہے - عقل باور نہیں کرتی -

راجہ مان سنگھ - ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہے - پیرو مرشد - اب چتوڑ کے دن پورے ہو گئے یہ تباہ ہو کر رہے گا - جن حاکموں نے خاصان خدا کو ستایا ہے - وہ کبھی پھلے پھولے نہیں - اور نہ چین سے رہے -

اکبر۔ کیا تعجب کہ یہ ملک ما بدولت ہی کے ہاتھ سے فتح ہو۔

سب حاضرین دربار۔ آمین۔ آمین۔

اکبر۔ میرا بائی کے بھجن تانسین کو یاد ہیں۔ انوپ تلاؤ پر ما بدولت سنینگے منجھو میاں کو بھی حاضر کیا جائے۔

چوبدار۔ دوڑے ہوئے۔ تانسین اور منجھو میاں پاس ان کی نشستوں پر جاتے ہیں۔

چوبدار۔ بادشاہ سلامت انوپ تلاؤ پر یاد فرماتے ہیں"

تانسین اور منجھو میاں جلدی جلدی کمریں پٹکوں سے کس سروں پر چیروں کو درست کرتے۔ تنبورا مردنگ اور منجیرے کی جوڑی لے کر روانہ ہوتے ہیں

منظر دوسرا

انوپ تلاؤ۔ لال پتھر کا چوپڑ کے فرش سے کوئی آدھ گز اونچی سطح پر بنا ہے۔ گہرائی ہاتھی ڈباؤ ہے۔ اس کے پتھروں کی سرخی کے سامنے حسینان جہاں کے دست حنا مالیدہ خجل ہیں۔ تلاؤ کے بیچ میں چبوترہ ہے۔ چاروں طرف چوپڑ کے پل بنے ہیں۔ تلاؤ میں روپے اشرفیوں کی کھچڑی بھری ہے۔ کروڑوں کی نقدی اس میں لاکر ڈال دی گئی ہے۔ جل چبوترے پر بیچوں بیچ بادشاہ کا تخت رکھا ہے۔ جس پر سبز مخمل کے کارچوبی مسند تکیے ہیں۔ حاشیے میں پھول موتیوں اور یاقوتوں کے اور پتے زمرد کے زردوزوں نے ایسی کاریگری سے ٹانکے ہیں کہ عقل حیران رہجاتی ہے۔ اسی شان کا نمگیرا۔ جڑاؤ اِستادوں پر استادہ ریشمی اور کلابتونی ڈوریوں سے کھنچا ہے چبوترے پر قلم کاری کی جاجم پر ریشمی قالین ایسی ترتیب اور سلیقہ سے بچھائے ہیں کہ فردوسی کے شاہ نامے کے اشعار اس ترتیب و تنظیم کے مقابلے میں شرماتے ہیں۔ حوض کے چاروں طرف سرو چراغاں کھڑے ہیں جن میں زمردی کنول روغن چنبیلی سے بھرے روشن ہیں۔ بیچ میں اکاس دیا بُل رہا ہے۔ جس پر سونے کا جڑاؤ جالیدار فانوس برجی کا کام دے رہا ہے فانوس کے لال اور ہیرے جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ گویا چاند کو ستاروں نے اپنے جھرمٹ میں لے لیا ہے اکبر کسی سوچ میں آنکھیں بند کئے۔ تخت پر براجماں ہیں۔ حاضرین دوزانو۔ ہاتھ باندھے آنکھیں نیچے کئے۔ بے حس و حرکت پتلیوں کی طرح بیٹھے ہیں۔ سونے روپے کے عصا لیے عصا بردار کھڑے ہیں۔ تانسین اور منجھو میاں اور سنگت کے سازندے حاضر ہوتے ہیں۔

چوبدار۔ کڑک کر آداب بجا لاؤ۔ مہابلی سلامت۔ جہاں پناہ سلامت تانسین اور منجھو میاں

اور سازندے سجدہ تعظیمی بجا لاتے ہیں۔ اور ایک طرف ادب سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اکبر ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔

یہ پھر آداب بجالاتے ہیں۔ تانسین تنبورا سنبھالتا ہے اور منجھو میاں مردنگ ایک سازند منجیرہ کی جوڑی۔

اکبر۔ میرا بائی کا دھرپد۔ یا بھجن سناؤ۔

تانسین اور منجھو میاں۔ بہت خوب۔ پیرو مرشد۔

رانا جی میں گردھر کے گھر جاؤں

گردھر میرو ساںچو پریتم ۔۔۔ دیکھت روپ لبھاؤں
رین پڑے تب ہی اٹھ جاؤں ۔۔۔ بھور بھئے آٹھ آؤں
رہن دنا واکے سنگ کھیلوں ۔۔۔ جیوں ریجھے تیوں رجھاؤں
جو بستر پہرائے پہروں ۔۔۔ جو دے سوئی کھاؤں
میری ان کی پریت پرانی ۔۔۔ ان بن پل نہ رہاؤں
جہاں بٹھائے تہاں ہی بیٹھوں ۔۔۔ بیچے تو بک جاؤں
جن میرا گردھر کے اوپر ۔۔۔ بار بار بل جاؤں

رانا جی میں گردھر کے گھر جاؤں

اکبر۔ خوب۔ خوب۔ جو بات ان دونوں کے گلے میں۔ وہ کسی کے نہیں آتی۔

گوئیے اٹھ کر آداب بجالاتے ہیں۔

حاضرین۔ برحق۔ برحق۔ بجا۔ درست۔ اللہ اکبر۔

اکبر۔ ہوں۔ اور گانے کا اشارہ کرتا ہے۔

تانسین اور منجھو میاں۔ رانا جی میں تو سانورے رنگ راچی

ساج سنگار باندھ گھونگھروا ۔۔۔ لوک لاج تج ناچی ۔۔۔ رانا جی میں تو
گئی کومت لئی سادھ کی سنگت ۔۔۔ بھگت روپ بھئی ساںچی
گائے گائے ہری کے گن نس دن ۔۔۔ کال بیال سوں باںچی
ان بن سب جگ کھاری لاگت ۔۔۔ اور بات سب کاںچی

رانا جی میں تو سانورے رنگ راچی

اکبر۔ جھوم رہا ہے۔ گانا ختم ہوتا ہے۔
اکبر۔ تانسین جی اور منجھو میاں تم دونوں جس قدر اس تلاؤ میں سے زر نقد اٹھا سکتے ہو اٹھا لے جاؤ اور تمھارے سنگت والے اپنے اپنے دامن بھر لیں۔ اکبر اٹھ کر خلوت خانے کا رخ کرتا ہے۔ راجہ مان سنگھ کو رخصت کر دیتا ہے بقیہ مقربین کو ساتھ لیتا ہے۔ گوتے آداب بجالاتے ہیں۔ اور الٹے قدموں واپس ہو کر انوپ تلاؤ کے کنارے کھڑے ہو کر روپے اشرفیوں کی مٹھیاں بھر بھر کر دامنوں میں لیتے ہیں۔ اور روباوں کی پوٹلیاں بنا کر زور لگا کر اٹھائے جاتے ہیں۔

منظر سوم

دیوان خاص

اکبر۔ مابدولت نے جب سے میرا بائی کا واقعہ سنا ہے ایک عجیب خیال دماغ میں چکر لگا رہا ہے رانا چتوڑ نے بڑی زیادتی کی۔
بھگوان داس۔ چتوڑ والے بڑے متکبر ہیں اور مغلوں سے متنفر ہیں خانہ زاد کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک دعوت میں جب مان سنگھ کی بجوڑی اس کے پاس رکھی گئی۔ اور بھوجن کا تھال آیا۔ رانا نے ساتھ بیٹھنے سے انکار کیا۔ اور بھری سبھا میں یہ کہہ کر میرا اپمان کیا کہ جو راجپوت اپنی کنیا مغلوں کو دیدے وہ اس قابل نہیں کہ اس کے ساتھ بیٹھ کر جیما جائے۔ وہیں تلوار چل جاتی۔ لیکن جھالا وار والے بیچ میں آ گئے۔
اکبر۔ اف وہ۔ یہ لوگ مغلوں کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں۔ وہاں راجہ جیو آپ کی اہانت نہیں ہوئی مابدولت کی سبکی ہوئی ہے۔
راجہ بھگوان داس۔ ان کو سزا ملنی چاہیے اور سزا دہی کا یہی موقع ہے۔ جو مسلمان وہاں آباد ہیں۔ ان کے پاس اپنے خفیہ وکیل بھیج کر ان کو چتوڑ گڈھ کے ہندوؤں کے خلاف ابھارا جائے۔ اور ان میں آپس میں پھوٹ ڈلوا دی جائے اس طرح ان کی قوت ٹوٹ جائے گی۔ خانہ زاد پچاس ہزار سوار لے کر میدان میں حاضر ہو سکتا ہے۔
اکبر۔ مابدولت اس ملک میں پھوٹ ڈلوانے کے قایل نہیں۔ بھگوان داس ہماری آرزو ہے کہ ہندوستان شمال سے لے کر جنوب تک ایک ملک ہو جائے۔ اور مختلف مذاہب و عقاید کے لوگ اس طرح مل جل کر رہیں کہ جیسے کسی بڑے خاندان کے افراد۔ دل بگاڑ کر بگڑے دونوں پر

حکومت کرنا ایسا ہی ہے کہ شہر جلا کر اور رعایا کا قتل عام کر کے۔ راکھ کے ڈھیر اور لاشوں پر کوئی بادشاہی کرے۔

سب حاضرین۔ کرامات! کرامات!

اکبر۔ کیا خیال ہے تمھارا ابو الفضل

ابو الفضل۔ جہاں پناہ۔ جب ہندو مسلمانوں کے دلوں میں نفاق پیدا ہو جائے۔ تو وہ منافقت ہمارے ساتھ بھی کرنے لگیں گے۔ اور وقت پر دغا دیں گے۔

فیضی خانہ زاد کا خیال ہے کہ اس ملک میں یہ ہندو مسلمان کی تفریق ہی باقی نہ رہنی چاہیے جہاں پناہ۔ ظل اللہ ہیں۔ بادشاہ اپنی رعایا کے اعمال کا ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ رعایا کے ہر دینی اور دنیوی معاملے میں جو وہ مصلحت سمجھے کرے۔ وہ اولوالامر اور مجدد ہے۔

اکبر۔ تم نے ٹھیک سمجھا فیضی ما بدولت نے ہر قسم کی اصلاح۔ رسم و رواج مذہب عقاید میں کی اور جو اپنی رعایا کے حق میں بہتر سمجھا۔ وہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے مذہب کو اپنے بندوں کے آرام و آسایش اور محبت سے مل جل کر رہنے کو بنایا ہے۔ نعوذ باللہ اس سے یہ مقصود نہیں کہ آپس میں بیر رکھیں اور ایک دوسرے کو گمراہ اور برا سمجھیں۔ کیوں حکیم ابو الفتح گیلانی۔

حکیم ابو الفتح گیلانی۔ جہاں پناہ سلامت۔ غرضمندوں نے مذہب کو اپنی خواہشیں پورا کرنے کی آڑ بنا لیا ہے۔ لوگوں کو ورغلا کر اور آپس میں لڑا کر اپنا منوا تازہ کرتے ہیں۔

مرزا عزیز کوکلتاش۔ ہمارے لیے دین الٰہی برحق ہے۔ اس کے اصول ایسے ہیں کہ آپس میں آویزش اور بدمزگی کا اندیشہ نہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے ہر ملک اور ہر قوم میں اپنے رسول اور کتابیں لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجیں۔ تو کیا ہندوستان جیسے وسیع ملک کو اس نے محروم رکھا ہوگا۔

اکبر۔ مسکرا کر۔ کوکلتاش یہاں رسول نہ بھیجے بلکہ خود آیا۔

سب حاضرین کرامات۔ کرامات!

حکیم ہمام۔ ہم سب کا ایک کنبہ بن کر رہنا۔ آپس میں شادی بیاہ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ جب ہم ویدوں کو کتاب آسمانی مان لیں۔ تو اہل کتاب سے ازدواج کے جواز کے تمام اہل مذہب قائل ہیں۔ اور اس پر عامل ہیں ہمارا اس سے اجتناب کس اصول کی بنا پر ہو۔

اکبر۔ ما بدولت نے تو اپنی مثال سب کے سامنے رکھدی ہے حکیم ہمام اب اگر لوگ

اس کی تقلید نہ کریں۔ تو یہ ان کی تنگ نظری ہے۔ اور مابدولت کو وہ خاندان جن سے مناکحت کے رشتے ہوئے ہیں۔ اتنے ہی عزیز اور پیارے ہیں۔ جیسے ولایت کے رشتے وال۔
عبدالرحیم خانخاناں۔ اس میں کیا شک ہے۔ آج تک کوئی فاتح قوم مفتوحین سے ایسی جلدی شیر وشکر نہیں ہوئی۔ جیسے ہم لوگ۔ ہم نے مفتوحین کو نہ ذلیل کیا اور نہ ذلیل سمجھا۔ ان کے رسم و رواج۔ طور اطوار۔ لباس خوراک۔ یہاں تک کہ زبان بھی اختیار کرلی۔ ہمارے جذبات احساسات تک میں فرق نہ رہا۔
اکبر۔ خانخاناں۔ مابدولت نے اپنی رعایا کو اپنی اولاد کے برابر سمجھا۔ اور ہر وقت ان کی بہبود اور آسایش کا خیال رکھا ہے۔ اور جو کچھ کیا اخلاص سے۔ مکروفریب کو اس میں دخل نہیں۔ نہ نفس پروری مقصود ہے۔ خیر۔ ہاں! حکیم جیو! برگ تنباکو۔ جو فرنگیاں گوا لائے تھے۔ اس کا کیا ہوا۔
حکیم ابوالفتح۔ ایک کشتی منگاتا ہے۔ اس پر کشتی پوش پڑا ہے۔ اندر ایک سونے کا جڑاؤ گولا طرحی نما کوتاہ گردن۔ اور ایک سونے کی جڑاؤ انڈوی سی۔ نیچا اور شتک جس پر موتی اور فیروزے نیچہ بند نے بڑی صنعت گری سے لگائے ہیں۔ ایک قرابہ گلاب کا۔ یہ سب سامان نکال کر رکھا گیا۔ سیلابچی آفتابہ۔ زیرانداز پر چن دیا گیا۔ حکیم صاحب نے گلاب سے خود حقہ تازہ کیا۔ اور گولے میں گلاب ڈال کر نیچہ اور شتک لگادی اور شتک کے سرے پر انگوری رنگ کے یشب کا جڑاؤ منال لگایا۔ سونے کی کٹوری اور اس پر چنبر بھی زرین جالیدار۔ کٹوری میں شکر آمیز تنباکو رکھ کر۔ ڈھاک کے کوئلے کی آگ دھری۔ اور ادب سے جہاں پناہ کے سامنے ایک سونے کے جڑاؤ کنول نما طاس میں انڈوی پر حقہ جما کر پیش کیا۔
حکیم ابوالفتح۔ خداوند نعمت اس کا ایک کش فرمائیں اور دھواں حلق مبارک سے نیچے اتار کر پھر باہر نکال دیں۔
اکبر۔ حقہ پیتا ہے۔ ٹھسکے کو ضبط کرکے۔ دھواں باہر چھوڑتا ہے۔
تمام حاضرین۔ کرامات! کرامات!
اکبر۔ دھواں سوندھا ہے۔ اور ایک ہلکا سا سرور ہوتا ہے۔ اس کے فوائد کیا ہیں حکیم جیو!
حکیم ابوالفتح گیلانی۔ پیرو مرشد اگر خاصہ کے بعد نوش فرمایا جائے تو ریاح پیدا نہیں ہونے دیتا اور تمام ریاحی امراض کے لیے نافع ہے۔ لیکن اس کی زیادتی مضر ہے معدہ کمزور ہوتا ہے جگر کا فعل خراب ہوجاتا ہے۔ شش اور قلب کو بھی کمزور کرتا ہے۔ اس میں ایک قسم کی سمیت ہے۔ کثرت

استعمال سے کند ذہنی کا بھی خطرہ ہے۔
اکبر۔ خوب! فائدے کم نقصان زیادہ۔ ما بدولت نہ پئیں گے۔ ہاں! حکیم جیو! آپ کی توپ کا کیا ہوا۔
حکیم ابوالفتح۔ جہاں پناہ کے اقبال کی بدولت تیار ہوگئی ہے۔ آزمایش بھی ہو چکی ہے بغیر وقفہ کے بارہ گولے چھوڑے جا سکتے ہیں۔ ہر گولے میں اتنی قوت ہے کہ ہاتھی مع عماری کے اڑ جائے۔
اکبر۔ اور قلعہ شکن توپ کی تیاری کیسی ہو رہی ہے۔
حکیم ابوالفتح۔ وہ بھی گیہان خدیو کے اقبال سے بن چکی ہے گولہ اتنا وزنی اور اس قوت کا پھینکتی ہے کہ مضبوط سے مضبوط قلعہ کی دیوار میں اتنا رخنہ پڑ جائے کہ ہاتھی گزر جائے۔ جشن سالگرہ مبارک پر مظاہرہ کیا جائے گا۔
اکبر۔ حکیم ہمام جیو! آپ کی چکی کا کام بڑی سست رفتاری سے ہو رہا ہے۔
حکیم ہمام۔ جہاں پناہ۔ پن چکی تیار ہوگئی ہے۔ اس کے چلنے میں اتنی سہولت پیدا کر دی گئی ہے کہ پانی کے معمولی بہاؤ سے چلنے لگتی ہے۔ اناج کے علاوہ چونا بھی پس سکتا ہے۔
اکبر۔ بہت خوب۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ اس کی داشت میں زیادہ مصارف نہ ہوں غریب رعایا بھی اس سے کام لے سکے۔
حکیم ہمام۔ جہاں پناہ اس کا خیال رکھا گیا ہے۔ خداوند آگہی کے اقبال سے ایک حمام بھی تیار ہو رہا ہے۔ جس میں مایوس العلاج مریضوں کا بھاپ سے علاج کیا جائے گا۔
اکبر۔ جب تیار ہو جائے گا تو ما بدولت بھی چل کر ملاحظہ کریں گے۔ شیخ فیضی! تم کو ہمارا وہ فرمودہ یاد ہے۔ ہر شخص اس ایزد بے چوں کو اپنی لیاقت اور بساط کے مطابق کسی نہ کسی نام سے یاد کر لیتا ہے۔ ورنہ اس بے نشان کا نام کہاں ہے؟
شیخ فیضی۔ پیرو مرشد! دُعَن کی بسم اللہ ہی اس گفتار شاہنشاہی سے کی ہے۔

بنام آن کہ او نامے ندارد ۔۔۔ بہر نامے کہ خواہی سر بر آرد

اکبر۔ واہ شیخ جیو! خوب اس خیال پر تصرف کیا ہے۔
شیخ فیضی۔ پیرو مرشد! اس مرید خاص کی کیا مجال ہے۔ یہ تصرف خدیو خدا شناس ہی کا ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔
اکبر۔ زانو بدلتا ہے۔ دربار برخواست ہو جاتا ہے۔

منظر چہارم۔ مثمن برج۔ آگرہ

اکبر۔ آگرے کے مثمن برج میں مشرق رو درشن جھروکوں میں بیٹھا ہے۔ ریتی پر درشنی درشن کرکے اشنان کرنے جمنا پہ جا رہے ہیں۔

اکبر۔ در کے پیچھے کھڑے چیلے کو حکم دیتا ہے۔ راجہ بیربل کو بلاؤ اور خانخاناں کو بھی حاضر کرو چوبدار جاتا ہے۔ دونوں کو اطلاع کرتا ہے اسی عرصے میں خانخاناں اپنی سواری سے اتر کر جاتا ہے کہ بیربل کا تام جھام آتا ہے۔ بیربل بھی اتر پڑتا ہے۔

عبدالرحیم خانخاناں۔ اللہ اکبر

راجہ بیربل۔ جل جلالہٗ

چوبدار۔ جہاں پناہ مثمن برج میں یاد فرماتے ہیں۔

ایلوہ راجہ بیربل سجدہ میں گر پڑے۔ ادب سے ہاتھ باندھے آنکھیں نیچی کیے کھڑے ہیں۔
اکبر دریا میں گلے کی مالائے مروارید ڈال کر بیربل کی طرف دیکھتا ہے۔ اور کہتا ہے۔

اکبر۔ بیربل مالا۔

بیربل۔ ان واتا ہن دیں

اکبر۔ ہنسکر۔ بادشاہوں کو اپنے مقربوں سے دل لگی اور مزاح نہ کرنا چاہیے۔

چوبدار۔ جہاں پناہ۔ نواب خانخاناں شرف قدمبوسی کو حاضر ہیں۔

اکبر۔ ہوں۔

عبدالرحیم۔ سجدہ تعظیمی بجا لاتا ہے

اکبر۔ خانخاناں۔ ما بدولت نے مدت ہوئی آپ کے دوہے نہیں سنے۔

خانخاناں۔ آداب بجا لاتا ہے۔ اور عرض کرتا ہے۔

عبدالرحیم۔ پھرجی ساہ نہ ہوے سکے گتِ ٹیڑھی تاثیر
رحمن سیدھی چال سوں پیادہ ہوئے وجیر
جو رحیم اوچھے بڑھے تواتِ ہی اترائے
پیادے سوں پھرجی بھیو ٹیڑھو ٹیڑھو جائے

اکبر۔ خوب کہا۔ اسی لیے مابدولت نے حکم دیا تھا کہ علم نا اہلوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اور سناؤ۔

خانخاناں۔ جو رحیم گت دیپ کی کُل کپوت گت سوئے
بارے اجیا رو لگے بڑھے اندھیرو ہوئے

اکبر۔ (ٹھنڈا سانس لے کر ہندی زبان سے کہنا) ہا شیخو بابا

عبدالرحیم۔ خانخاناں۔ گھبرا کر۔ دوسرا دوہیرا پڑھتا ہے۔

جو رحیم گت دیپ کی سُت سپوت کی سوئے
بڑھو اُجیرو نے ہی بہے گئے اندھیرے ہوئے
ایکے سادھے سب سدھے سب سادھے سب جائے
رحمن مول ہیں سینچبو پھولے پھلے اگھائے

اکبر۔ بالکل سچ ہے۔ ہندوئی زبان میں کس قدر رس ہے۔ اخلاقی مضامین خوب ادا کر سکتی ہے۔

بیربل۔ فارسی میں جو شیرینی ہے۔ وہ بات کہاں آتی ہے۔ حافظ کا کلام پڑھیے ہزار دفعہ پڑھیے دل سیر نہ ہو۔

اکبر۔ راجہ بیربل۔ حافظ کی ہر غزل کے بعد عمر خیام کی رباعی ہونی چاہیے۔ ورنہ۔ حافظ ایسی شراب شیراز ہوگی۔ جو بغیر گزک کے پی جاسے۔

پروفیسر آغا حیدر حسن

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اٹھا ہر بیگنہ میں بھی گناہ گار کیوں نہیں ہوں
امیر

میری محرومی کے اندر سے یہ دی اس نے صدا
قرب کی راہوں میں میری ایک رہ دوری بھی ہے
اصغر

تجدید ملاقات

مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم
خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم

نغموں میں سمویا ہوا وہ رات کا عالم
وہ عطر میں ڈوبے ہوئے لمحات کا عالم

اللہ رے وہ شدتِ جذبات کا عالم
بہکی ہوئی بھولی ہوئی ہر بات کا عالم

چھایا ہوا وہ نشۂ صہبائے محبت
جس طرح کسی رند خرابات کا عالم

وہ سادگیٔ حسن وہ محجوب نگاہی
وہ محشرِ صد شکر و شکایات کا عالم

نظروں سے وہ معصوم محبت کی تراوش
چہرے پہ وہ مشکوک خیالات کا عالم

عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے وہ قطرے
آنکھوں سے چھلکتا ہوا برسات کا عالم

وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی دنیا
وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم

بے شرطِ تکلف وہ پذیرائیٔ اُلفت
بے قیدِ تصنع و مدارات کا عالم

ایک ایک نظر شعر و شباب و مے و نغمہ
ایک ایک ادا حسن و محاکات کا عالم

نازک سے ترنم میں اشارات کے دفتر
ہلکے سے تبسم میں کنایات کا عالم

پاکیزگیٔ عصمتِ جذبات کی دنیا
دوشیزگیٔ حسنِ خیالات کا عالم

ایک چھیڑ کا منظر وہ ہر اک صلح کا منظر
اک عالمِ معنی وہ ہر اک بات کا عالم

برہم وہ نظامِ دل و دنیا، تمنا
پیہم وہ شکستوں میں فتوحات کا عالم

وہ عشق کی بربادیٔ زندہ کا مرقع
وہ حسن کی پایندہ کرامات کا عالم

وہ عارضِ پُر نور وہ کیفِ نگہِ شوق
جیسے کہ دمِ صبح مناجات کا عالم

وہ ناز وہ انداز وہ شوخی و شرارت
وہ حسن و محبت کی مساوات کا عالم

تھک جانے کے انداز میں وہ دعوتِ جرأت
کھو جانے کی صورت میں وہ جذبات کا عالم

شرمائی لجائی ہوئی وہ حسن کی دنیا — وہ مہکی ہوئی بہکی ہوئی رات کا عالم
وہ بچھڑے دلوں کی وہ بہم صلح و صفائی — مضبوط وہ تجدید ملاقات کا عالم
وہ عرش سے تا فرش برستے ہوئے انوار — وہ تہنیتِ ارض و سمٰوات کا عالم
تا صبح وہ تصدیقِ محبت کے نظارے — تا شام وہ پھر فخر و مباہات کا عالم

عالم مری نظروں میں جگر اور ہی کچھ ہے
عالم ہے اگرچہ وہی دن رات کا عالم

رئیس المتغزلین

حضرت جگر مرادآبادی

خاکی نژاد خاک کے اندر چلے گئے — جس گھر سے آئے تھے پھر اسی گھر چلے گئے

امیر

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر — سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

امیر

عارف سے یہ کہہ دو جو ترے فہم میں آئے — وہ سب ہے ترا وہم خدا اور ہی کچھ ہے
عادت تو امیر اچھی ہے فریاد و فغاں کی — پر شیوۂ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے

امیر

کچھ آج نہیں رنگ یہ افسردہ دلی کا — مدت سے یہی حال ہے یارو مرے جی کا

امیر

اے طول زمانۂ اسیری — بلبل کہیں گل کو بھولتی ہے

امیر

خواجہ بندہ نواز کی فارسی شاعری

قصۂ عشق احسن القصص است

(حضرت خواجہؒ)

گلبرگہ شریف کا عرس، غالباً دولت آصفیہ میں سب سے بڑی یاترا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ یہ عرس اولیاء دکن کے سُلطان حضرت سید محمدؒ رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں منعقد ہوتا ہے۔ یہ بزرگ خواجہ خواجگان کہلاتے تھے، اپنی مصروف تر خصوصیت کے باعث گیسو درازؒ پکارے جاتے تھے۔ اس سے بھی زیادہ شہرت انھوں نے خلق خدا کے ساتھ شفقت اور اعانت میں پائی، عام طور پر لوگ انھیں بندہ نواز ہی کے نام سے جانتے ہیں ان کا یہی نام نوکِ زبان ہے۔

[1] ۴ رجب سنہ ۷۲۱ھ تاریخ ولادت باسعادت ہے۔ بچپن ہی میں اپنے مجاہد راہِ حق والد ماجد حضرت یوسف شاہ راجو قتال کے ساتھ دولت آباد تشریف لائے۔ سولہ برس کی عمر میں دلی میں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے بیعت فرمائی اور مقامات سلوک بڑی سرعت و عزیمت سے طے فرمائے۔ علم باطن کے ساتھ ساتھ علوم ظاہر میں بھی درجہ کمال حاصل فرمایا۔ سنہ ۸۰۱ھ میں تیموری حملے سے پہلے دکن کی راہ لی۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں سرزمین گلبرگہ کو قدم بوسی کا شرف بخشا۔

یہاں آپ نے اپنی پُراثر صوفیانہ تعلیم کے ذریعے جو حتی الامکان نہایت سُندر سادہ اور غیر اصطلاحی زبان میں دی جاتی تھی۔

حضرت نے ہزاروں دلوں کو موہ لیا لاکھوں دلوں میں طلبِ حق کا سودا پیدا

---

[1] تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو میرا مطبوعہ رسالہ حیات طیبہ (خواجہ بندہ نواز)

کر دیا۔ —— تبلیغی مقاصد کی تکمیل کے لئے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جن کی تعداد کم و بیش ایک سو کے قریب ہے۔

ان کی کتابوں کے مطالعہ سے سعادت اندوز ہونے والے ان کی گہرے مذہبی قلب اور تصنع سے پاک تصورات کی نزاکت و لطافت پر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔

حضرت نے جابجا، مختلف مستند ماخذوں کے اقتباسات سے اپنے خیالات کو مدلل فرمایا ہے۔

ایک طرف اس سے آپ کے وسیع مطالعہ کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف سالک کی لگن اور طلب۔ دو آتشہ ہو جاتی ہے

تصنیفات

جوامع الکلم اور خاتمہ اگرچہ نثر میں ہیں لیکن جگہ جگہ موزوں اور اثر انگیز اشعار ان میں منقول ہیں۔ یہ کتابیں دلکش اسالیب اور بلیغ اشارات کا مجموعہ ہیں۔ ان میں جذب و سلوک کی تجلیات نمایاں ہیں۔

حضرت کے کلام سے سونے والے جاگ اٹھتے ہیں۔ جاگے ہوئے پر اسرار غیب مکشوف ہوتے ہیں۔ محبت کی آگ روشن تر ہوتی ہے۔ طالب کو حرکت میں لاتی ہے۔

مشاغل علم و فضل کے ساتھ ساتھ حضرت سخن فہم بھی تھے اور سخن گو بھی۔ شاعری حضرت کے لئے تلقین اشارت کا ایک نہایت دلکش اور موثر ذریعہ تھی۔ اس لئے اردو اور فارسی دونوں میں فکر سخن فرماتے۔ فارسی کا دیوان بنام 'انیس العشاق' مولوی حافظ سید عطا حسین صاحب ام۔ اے نے اپنی تصحیح و اہتمام سے مطبوعات حضرت خواجہ صاحبؒ کے سلسلہ میں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ ارادتمندان خواجہ صاحبؒ کو حافظ صاحب موصوف نے منت پذیر فرمایا ہے۔

محترم حافظ صاحب نے اس دیوان کی تلاش اور تصحیح میں عقیدت مندانہ ثبوت دیا ہے۔ کتاب خانہ آصفیہ اور استاذ محترم ڈاکٹر نظام الدین صاحب کے خریدے ہوئے قلمی نسخہ سے مقابلہ کیا ہوا ہے۔ کہیں کہیں پھر بھی تصحیح ممکن نہ ہو سکی۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔

ترتیب دیوان

اس دیوان کے مرتب اور جامع حضرت مخدوم کے ایک ممتاز ارادتمند معلوم ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے اصلی قلمی نسخہ دیوان میں ایک پیش لفظ

بھی لکھا ہے۔ شاید کمال بے نفسی و ادب سے اپنا نام ظاہر نہیں فرمایا۔ ان کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت سید اصغر حسینی صاحب (فرزند خرد حضرت گیسو دراز ؒ) نے انھیں حضوری خدمت کا حکم فرمایا۔ تعمیل ارشاد پر ایک مجموعہ اوراق ان کے سپرد فرمایا جس میں حضرت مخدوم جہانیاں ؒ کی غزلیات درج تھیں۔ ان اشعار کی ترتیب کا حکم ہوا۔ اس حکم کی تعمیل میں یہ دیوان ترتیب پایا۔ افسوس کہ ترتیب یا تکمیل کی کوئی تاریخ اس نسخہ پر درج نہیں ہے۔ ان کی تحریر سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ حضرت خواجہ بزرگ ؒ کی زندگی ہی میں یہ کام حسن انجام کو پہونچا۔

شعر گوئی آپ کا مشغلہ خاص نہ تھا۔ صرف کاروبار شوق میں اس کی جگہ تھی۔ اس لئے تصحیح کلام وغیرہ کے لئے آپ کے کسی استاد کے ہونے کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اس کا قرینہ پایا جاتا ہے کہ اس باب میں شاید حضرت حسن دہلوی ؒ سے کچھ فیض تربیت حاصل کیا ہو۔ کیوں کہ آپ کے والد کے وہ بڑے دوست تھے۔ حضرت حسن بھی محمد تغلق کے حکم قاہرانہ کی بدولت دولت آباد آ گئے تھے۔ جوامع الکلم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عراقی ؒ سے آپ کو نہایت دلچسپی تھی۔ تلقین ارشاد کے سلسلہ میں ملفوظات میں بکثرت شعر حضرت عراقی ؒ کے آپ پڑھتے۔ دیوان میں بکثرت اشعار کلام عراقی کے ہمرنگ ہیں۔ حضرت حسن ؒ اور سعدی ؒ کا اثر بھی محسوس ہوتا ہے کتاب خاتمہ یا آداب مریدین میں حضرت کا مریدوں کے نام یہ ارشاد درج ہے کہ دیوان سعدی کا کبھی کبھی مطالعہ ذوق طلب مزید کا باعث ہوگا۔

اسلامی شاعری اور ادب کی معنوی برتری کا بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر بڑے عالی مرتبت اولیاء اللہ اور اکابر صوفیا بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں۔ جن کے شیشۂ دل نے عشقیہ شاعری کے بادۂ خام کو پختہ کر دیا۔ ع

بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

قبول خاطر اور لطف سخن

کیبلے (Keble.) کے الفاظ میں اعلیٰ اور ثانوی درجہ کے شاعر میں ایک خاص فرق یہ ہوتا ہے کہ بلند پایہ شاعر کا احساس دوسرے کے مقابلہ میں شدید تر ہوتا ہے۔ اپنے معنوی احساسات کی ترجمانی کے لئے زبان پر بھی اسے پوری قدرت حاصل ہوتی ہے۔

زبان شعر میں حضرت بندہ نواز بھی اپنے نہایت گہرے احساسات کی ترجمانی

فرماتے ہیں۔ ان کا قلب سلیم ایک خاص پیام رکھتا ہے۔ اس پیام کے موضوع نہایت بلند اور بلیغ ہیں۔ اس لئے بلند پایۂ شعراء ایسے ہی موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ جیسے محبت، پرہیزگاری تقویٰ خدا اور بندہ کا ربط وغیرہ ؎

عشق بر خط و خال مذہب دیں ماست ہر کہ را عشق نیست ایماں نیست

حضرت بندہ نواز کی شاعری میں اپنے موضوع خاص سے ان کی گہری اور بے ساختہ عقیدت اور اس کی عام دلکشی نمایاں عناصر ہیں۔

ہم ان کے دیوان سے ایسے اشعار بکثرت منتخب کر سکتے ہیں جن پر ہر پڑھنے والا دیر تک سر دھنتا رہ جائے۔ اس تاثیر کا سبب موضوع کی دلنشینی اور طرز ادا کی سادگی ہے۔

آپ کی نظر میں محبت ایک ترقی پذیر تخلیقی طاقت ہے۔ تخلیقی محبت سے جذب وانجذاب، تجلیات کی نیرنگی اور جامع ترار تقا کی نہایت یقین آفریں توجیہ ممکن ہے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کے نزدیک عشق و محبت وجود با جود کا بنیادی میلان ہے زندگی کے ہر درجہ کا مقصد اعلیٰ ترجبات اور محبت وکشش کا جامع تر مظاہرہ ہے محبت، حسن کی طرف حرکت کا نام ہے۔ محبت خواجہ بندہ نواز کے نزدیک عین صداقت اور تقویٰ ہے اور علم و عمل کے کمال عروج کے مترادف ہے۔

آئیے حضرت کے جواہر کلام سے محبت، محب اور محبوب کا کچھ حال سنیں،

خواجہ بزرگؒ طبعاً عشقباز ہیں ان کی طبیعت سے مہر و وفا کے سوا کس امر کی توقع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

محمد در جبلت عشقباز م نمی آید ز من دیگر خصالے
محمد جز در ش دیگر درے نیست ندانم من جز ایں رہ ہیچ راہے

عشقبازی کے خلاف پند و نصیحت کا کوئی دفتر بھی ان کے لئے سود مند نہیں ؎

دوستاں می دہند پند مرا دشمناں طعنہا زنند مرا
منکہ مخلوق عشقباز ہستم کے بود، پند سود مند مرا

ایسے آزاد عشاق کی پائے بندی زلف یار ہی سے ممکن ہے۔ ؎

منکہ آزاد و سرفراز ہستم زلف او گشت پائے بند مرا

ایسے عاشق کا کوئی محسود نہیں سوائے اس کے جو بقول سعدیؒ "یا وش در بر ہو" ؎

ہرگز حسد نہ بردم بر منصبے و مالے الّا کسیکہ دارد با دلبرے وصالے

ایسے عالی ظرف محب کا محبوب کس پایہ کا ہوگا! اس کے جمال و کمال کا کیا مرتبہ ہوگا محبوب ہی سے محب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؎

ترکیب وجود آں جواں مرد بر نقطۂ اعتدال دیدم

پھر محب کا کیا رنگ ہوگا؟ ؎

تو از سر تا قدم حسنی و نازی فریفتہ گشت مارا عشقبازی

ابروے ترا سجود آدم چہ قبلۂ اہل حال دیدم

اشتیاق کی کیا صورت ہوگی ؎

ہمہ چشمیم تا بروں آئی ہمہ گوشیم تا چہ فرمائی

اگر بخت رسا ہوگیا۔ ؎

شبے با ماہ روئے خوش غنودم دو چشم بخت خود بیدار بودم

خواجۂ بزرگ شعر کو پر اثر اور پُر سوز لہجہ میں پڑھنے پر بہت زور دیتے، سماع کے بہت مشتاق تھے۔

مولانا رومؒ کی طرح ان کی غزلیات بھی زیادہ قوالی ہی میں پڑھے جانے کے لئے لکھی جاتیں۔ ان غزلیات کو قوالی میں سنکر حضرت اپنے واردات و احساسات سے قند مکرر کی طرح محظوظ ہوتے۔

حقیقت و مجاز محمدؐ را نظر جز بر خدا نیست پندار عشقبازی او مجازی

دیوان پڑھتے جائیے۔ سبک اور سادہ کلام، جا بجا مجازی تعبیرات اور تشبیہات سے بھرا ہوا۔ لیکن جگہ جگہ ایسے مقامات ملتے ہیں۔ جن سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ خواجہ بزرگ کی شاعری میں جہاں کہیں بھی بادہ و ساغر کا پیرایہ مجاز اختیار کیا گیا ہے۔ مقصود اس کا مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے۔ مجازی تشبیہات دراصل اشارات ہیں لطیف حقائق کی طرف

تحمیل مجاز بر حقیقت محفل سماع میں بھی مجازی رنگ کا کلام سنایا جاتا ہے۔ اہل دل مجازی تشبیہات سے حقائق قدسی کی طرف انتقال ذہن فرماتے ہیں۔ اس انتقال ذہنی کا کیا طریقہ ہے کیوں کہ مجاز کو حقیقت پر محمل کہتے ہیں؟ حضرت خواجۂ بزرگ ان کی اپنی تالیف "خاتمہ" میں اس پر ایک مفصل ارشاد موجود ہے۔

یکے از آداب سماع ۔ شنیدنِ بیت بہ تحمیل معنیٰ

وآنکہ در حمل بیت مشغول می شود .... پیش ازیں میانِ صوفیان سماع ہم بدیں نمط بودہ است۔ ابیات ظاہری میگفتند کہ بہ زہدے و عبادتے و ترکے نسبتے دارد۔ رباعی ازیں جنس میخوانند و حلقے و ستکے برآں میزدند و صوفیان ہمراں اضطرابے میکردند و رقص میکردند۔

اما بیتے کہ بظاہر ہر معاملے و حالے آشکارا معنی نباشد، آنرا بہ تحمیل شنوند۔ و خدمت شیخ نظام الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز ابیات را بدیں وضع شنیدے چہ پارسی، وچہ عربی وچہ ہندی معاملتے کہ میانِ عاشق و معشوق رود، شیخ قدس اللہ سرہ العزیز بہ تحمیل آں شنیدے و ذوقے کہ لائق آں بودے گرفتے۔ ص۲۶ خاتمہ

چنانچہ پدرے باشد، پسرے گم کردہ است، قصۂ یوسف علیہ السلام پیش او گویند، حال خود را باآں حال برابر یابد، ہرآئینہ گریہ و اضطرابے پیش آید۔

"بیتے از ناز و کرشمہ کہ درمیانِ دو نفر در مجازی رود۔ ایں را بشنود و واماندگی کہ اوراست....... ولذتے کہ او ازاں میگیرد ایں ہمہ را برابر دارد۔ گفتیم بحسب ایں۔ او را ذوقے دست دہد یا گریہ، یا گرد و یا اضطرابے کند.... اگر ہر یکے خواہم گفت کہ گفتہ ام ایں مختصر را بہ تطویل می کشد۔ اگر تو فہمے داری۔ او را کے کن۔ (خاتمہ)

محمدؐ را نظر جز بر خدا نیست　　مپندار عشقبازی او مجازی

بالعموم کن مجازی تشبیہات سے کون حقیقی اعتبارات مراد ہوتے ہیں، اس کی تشریح کسی حد تک جناب مرتب مولوی حافظ سید عطا حسین صاحب نے اپنے دیباچے کے صفحہ ۱۲، ۱۳ پر درج کی ہیں جو حضرت مخدوم کے فرزند اکبرؒ کی کتاب تبصرۃ الاصطلاحات الصوفیہ

اور علامہ افضل الہ آبادی کی شرح دیوان حافظ سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً جان لے کہ میخانہ و میکدہ سے مراد عارف کامل کا باطن ہے۔ ترسا اس مراد روحانی کو کہتے ہیں جس کے نفس امارہ کے برے صفات بدل چکے ہیں۔ کافر اس شخص کو کہتے ہیں جو منکر باطل ماسوا ہو وغیرہ الخ زیادہ تفصیل تطویل کا باعث ہوگی۔

ادب برائے زندگی

حضرت خواجہ صاحب نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ ادیب بننے کی پوری صلاحیت خدا نے بخشی تھی۔ شعر اور موسیقی کے نہایت دلدادہ تھے لیکن ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک ادب نفس انسانی کے اعلیٰ احساسات کی تربیت اور ترجمانی کا ایک ذریعہ تھا نہ مقصود بالذات۔ شاعر مریدوں کے لئے بھی یہی اصول تربیت پیش نظر تھا کہ وہ صرف شاعر نہ رہجائیں۔ ان کے نزدیک شعر پایہ روزگار نہ تھا۔ انسانیت کا ایک جوہر اور جزو تھا۔ "خاتمہ" میں اپنے ارادتمندوں کو بھی ہدایت فرماتے ہیں :-

> اگر طالب مردے شاعر و ناظم باشد، نشاید کہ بہ شعر و نظم مشغول شود، قوانین ایں کار را، چنانچہ حق شعر است نگاہدارد۔ اما بحسب حال بہ بدیہہ بغیر تامل و تفکر بسیار، سخنے کہ از وطلب و در دِ عشق باشد نویسد و گوید۔ وآں را مایۂ روزگار خویش نسازد و نداند کہ ایں نیز کارے است۔ و نثر کذالک :
>
> حوالہ ص۱۶۷
> (خاتمہ اداب مریدیں)

خصوصیات کلام

ان چند اشارات کو پیش نظر رکھئے اور حضرت مخدوم کا دیوان ملاحظہ فرمائیے۔ ان کے کلام کی خصوصیات پر اس سے بہتر تبصرہ شاید ممکن نہ ہو۔

(۱) طبعی ذوق شعر کے باوجود اپنی مصروف زندگی میں فکر سخن کو آپ نے اپنا مشغلہ خاص نہیں بنایا۔ اس لئے جو کچھ لکھا ہے وہ بغیر تامل و تفکر بسیار ہے و شاعری ان کے لئے فخر و حاصل حیات نہیں۔

(۲) حسب حال اور بدیہہ ہے۔

(۳) صنائع شعر کی طرف توجہ نہیں پائی جاتی۔

(۴) جوش عشق اور ذوق شعر کا ایک ہی موضوع ہے۔ یعنی "درد و طلب و عشق الٰہی۔

(۵) موضوع، واردات قلبی۔ ان پر طاری و ساری۔
طرز ادا اور زبان نہایت سیدھی سادی۔ چند شعر پڑھ کر لطف اٹھائیے۔

حدیثِ عشقِ من افسانۂ شد مثالِ سوزِ من پروانۂ شد

گر یک نفسے شود میسر با یارِ عزیز، عمر آنست

شرابِ عشق را خفیہ بنوشند متاعِ زہد را پنہاں فروشند

دلبرے نیست چوں تو یک پرے بیدلے نیست ہمچو من دگرے
قصۂ عشق احسن القصص است فہم ایں سر کے کند بشرے

ترا ساقی اگر جامے بہ بخشد شرابِ عشق را پیمانہ می باش

اے یار اگرچہ بے نیازی بزرگ شرفے است دلنوازی

غلام دستگیر رشید
لکچرار شعبۂ فارسی نظام کالج

پھر تو مضرابِ جنوں سازِ انا لیلیٰ چھیڑ ہائے وہ شورِ انا القیس کہ محمل سے اٹھا
فانی

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
رنگ چاہیے اگر اس باغ میں آزادی کا نکہتِ گل کی طرح شوقِ سفر پیدا کر
امیر

نظمِ مُعرّا

ہر فن کی ایک نہ ایک رسم ہوتی ہے اور وہی رسم مرورِ ایام کے ساتھ قاعدہ، اصول، اور قانون کہلاتی ہے۔ مثلاً علم ہندسہ کی رسم کی رو سے چار دونی آٹھ اور آٹھ دونی سولہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم اس بنیادی اصول کو محض یہ کہہ کر کہ ایک ترقی پسند آزاد ہندسہ داں رسوم پارینہ کا پابند نہیں ہو سکتا جڑ سے کھود کر پھینک دیں اور بزعم خود ایجاد بندہ اگرچہ گندہ نئے علم ہندسہ کی بنیاد ڈالنے کی سعی لاحاصل کریں جس میں چار دونی سولہ اور آٹھ دونی چار ہی ہوتے ہوں۔ اور اپنے آپ کو ترقی پسند ہندسہ داں سمجھنے لگیں تو وہ یقیناً ایک غیر عاقلانہ کوشش ہوگی اور علم ہندسہ کے یہ بزعم خود غلط نئے اصول قیامت تک علم ہندسہ نہ کہلا سکیں گے۔

اسی طرح نظم معرّا جسے دور حاضر کے بعض شعراء کوتاہ بینی سے اپنی زندگی کا کارنامہ سمجھتے ہیں نظم کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہو سکتی نظم کے معنے مرتب اور پروئی ہوئی شئے کے ہیں جو نظم ان تمام قواعد و قوانین سے معرّا ہو جو نظم کو نثر سے ممتاز کرتے ہیں وہ داناؤں کے نزدیک نظم کہلانے کی کیونکر مستحق ہوگی۔ نظم معرا کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شاعر قیود بحر سے بالکل آزاد ہوتا ہے یعنی یہ لازم نہیں کہ ایک مصرع جس بحر میں ہو نظم کے اور مصرعے بھی اسی بحر میں ہوں بلکہ شاعر کے خیالات کی کوتاہی اور درازی کے ساتھ ساتھ مصرعے بھی چھوٹے بڑے ہوتے ہیں اور بحر بھی گھٹتی بڑھتی جاتی ہے۔ اگر پہلا مصرع پانچ ارکان پر مشتمل ہو تو ہو سکتا ہے کہ دوسرا مصرع دو ہی رکن کا ہو اور پانچواں یا چوتھا اس سے زائد ارکان کا مثلاً

صفِ اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر

استالیں

مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا

یا

اور فاشسٹ خنازیر کو فی النار کرو

مرے بلخاش کہاں ہے وہ مس سرخ ترا

دوسری خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں ردیف و قافیہ کا کہیں پتہ نہیں گویا شاعرانہ رسوم و قیود و سے یہ صنف قطعاً پاک ہے۔ نہ مثنوی کی طرح اس کے ہر شعر کا علیحدہ قافیہ ہوتا ہے اور نہ غزل کی طرح ہر آخری مصرع میں قافیہ آتا ہے۔ مثلاً

پیٹ سے رینگنے والے یہ نجس اور ناپاک

سوسمار

اور وحشت کے درندے

موذی

ان دو ممتاز صفتوں کے علاوہ نظم معرّا میں یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ الفاظ کے خونِ ناحق سے اشعار میں خوب رنگ آمیزی کی جاتی ہے۔ لفظوں کے بے موقع اور بے محل استعمال سے نہ صرف ان کا گلا گھونٹا جاتا ہے بلکہ نئے نئے ثقیل الفاظ جدید عربی اور فارسی ترکیبوں سے ایجاد کئے جاتے ہیں قسم قسم کے عجیب وغریب نا آشنا الفاظ کا ذخیرہ نظم معرّا کے علاوہ کہیں ڈھونڈے نہ ملے گا۔ یہ بوقلمونی قابلِ رشک ہے اس قسم کے الفاظ کے علاوہ قسم دوم کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان سب کو اگر ناشائستہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا یہ الفاظ ایسے ہیں کہ شاعری یا نظم ان کی ثقالت برداشت نہیں کر سکتی۔ شاعر بعض جگہ کھلم کھلا گالی گلوج پر اتر آیا ہے۔ جس صاحبِ ذوق نے بدرجہ مجبوری کبھی نظم معرا سُنی ہے اس سے پوچھئے کہ بعض بعض بندوں میں تو (اگر ان کو بند کہہ بھی سکتے ہیں۔) ایسے سوقیانہ شرمناک الفاظ کی بھرمار ہے جس سے خباثت اور غلاظت کا تعفن آتا ہے۔ ہر زبان کی شاعری زبان کے نازک شیریں اور لطیف الفاظ سے معمور ہوتی ہے لیکن یہاں الٹی گنگا بہائی جاتی ہے۔ ان باتوں کے سوا سب سے زیادہ قابلِ توجہ آج کل نوجوان شعراء کے حسد اور نفرت کا وہ ناپاک جذبہ ہے جسے شاعری تو کیا دُنیائے شاعری کے باہر بھی نہ پایا جانا چاہیئے۔

یاروں کا یہ دعویٰ بالکل بجا نہیں ہو سکتا کہ آزاد طبیعت کسی قید کی پابند نہیں ہو سکتی۔ نہ طبع آزاد کے دہانے پر قیود کا توبڑا چڑھایا جا سکتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اپنے آپ کو پابندِ ترتیب و آئین ہی کرنا عین آزادی ہے کیونکہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لینے والا حریت کا علم بردار سب سے زیادہ اصول و قواعد میں گرفتار ہوتا ہے اور یہی اس کی آزادی کی دلیل ہے۔ غلام کسی قانون کا حامی نہیں ہوتا اس لئے غلام ہے کوئی قانون اس کی اور اس کے حقوق کی حفاظت نہیں کرتا ہے نہ اس کی زندگی

کو مرتب کرتا ہے۔ ملک کی بدقسمتی سے اگر اس روشن زمانے میں آزادی کے یہی معنی لئے گئے تو سارا نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ قواعد و ترتیب اور آئین و اصول ہی کی بندشیں ہیں جن سے تمام امور باحسن وجوہ انجام پاتے ہیں۔ تمام حسن و خوبی موزونی و تناسب ہی سے حسن و خوبی ہے جب وہ تناسب ہی غائب غلہ ہو گیا تو موجودات میں باقی کیا رہ گیا؟ یہ عجب بات ہے کہ بات چیت میں تو ہمارا ترقی پسند شاعر قواعدِ زبان کا پورا پورا پابند ہے کیونکہ اسٹیج پر آنے کے بعد سامعین سے بایں الفاظ مخاطب ہوتا ہے۔ "میں نے ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے "الم غلم" آخر وہ اس طرح کیوں نہیں کہتا "میں نے الم غلم ہے ہے نظم عنوان ایک لکھی" اس قواعد کی دیوار کو بھی اس کے عزمِ آہن شکن کے آگے ٹوٹ جانا چاہیئے۔ آپ فرمائیں گے اس قسم کا کلام ناقابلِ فہم اور مضحکہ خیز ہوگا تو بندہ پرور آپ کی نظم اس سے کچھ کم مضحکہ خیز اور ناقابلِ فہم نہیں۔

اس قسم کی تحریک کوئی دنیا کی انوکھی تحریک نہیں چنانچہ بیسویں صدی کے ابتدائی انگریزی نثر نویسوں نے اس پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ اگسٹن برل ایک واقعہ لکھتا ہے جس میں ایک بڑھیا نے راستہ پر چلنے کے قواعد کے پابند ہونے سے محض اسی بنا پر انکار کر دیا کہ میں اب ایک آزاد ملک کی باشندہ ہوں جو آزادی کی جنگ جیت چکا ہے معرا شاعری کا دور ایران میں بھی آ چکا ہے۔ شاہی کی تباہی کے بعد سے رضا شاہ کے برسرِ اقتدار آنے تک کا دور ایسے ہی شعرا کا دور تھا۔ اس دور میں معرا شاعری کے مالکوں کا ٹڈی دل تمام ملک ایران میں وبا کی طرح ٹوٹ پڑا تھا اس زمانے میں اصول و قواعدِ شاعری سے لوگوں نے اس درجہ بے التفاتی اور بے اعتنائی برتی کہ اصل شاعری کے حامیوں کو اپنی دستارِ فضیلت سنبھال سنبھال کر گوشۂ عافیت تلاش کرنا پڑا لیکن جس تاریخ سے رضا شاہ نے عنانِ حکومت اپنے مبارک ہاتھ میں لی وہ سب حشرات الارض اپنے ہم جنس کیڑوں مکوڑوں کی طرح ناپید ہو گئے۔ جو ہر برسات کے بعد فنا ہو جایا کرتے ہیں۔ رضا شاہ نے ادھر ملکی تنظیم شروع کی ادھر کلام ناموزوں خود بخود موزوں اور منظوم ہونے لگا اور شاعری کی صاف شفاف نہر جو کچھ عرصے کے لئے کثیف اور گدلی ہو گئی تھی ایران میں پھر آئینہ کی طرح چمکنے لگی اور اس برباد کن تحریک کا کوئی دیرپا اثر فارسی ادب پر قائم نہ رہ سکا۔ وجہ یہ تھی وہ کلام معرا ان تمام اجزا سے عاری تھا جو کلام کو بقائے دوام بخشنے کے لئے ازحد ضروری ہیں۔

کلام کو بقائے دوام بخشنے اور اُسے ہر زمانے میں تر و تازہ رکھنے کے لئے شعر میں سلاست۔ سادگی بیان کی بے ساختگی برمحل الفاظ کی برجستگی خیال کی تازگی اور معنوں کی ندرت اور بیان کی شگفتگی وغیرہ ازبس ضروری ہیں۔ یوں تو حافظ کا ہر شعر ایک چلتا ہوا جادو ہے جس میں بیان کی ندرت، خیال کی تازگی مضمون

کی رفعت، فصاحت بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر شعر زبانِ زد خاص و عام نہ ہو سکا۔ وجہ یہ ہے کہ کہیں الفاظ ندرت خیال کا ساتھ نہ دے سکے۔ کہیں رفعتِ خیال سے پیرایۂ بیان ہم آہنگ نہ ہو سکا کہیں بلاغت مضمون عام فہم نہ ہو سکی کہیں الفاظ کے ترنم نے مفہوم کو پس پشت ڈال دیا، کہیں تسہیل نے کنارہ کشی کی لیکن جہاں الفاظ نے محاسن بالا کا پورا پورا ساتھ دیا اور فصاحت و بلاغت بھی باقی رہی الفاظ کے ترنم نے معنیٰ کو اور چمکا دیا الفاظ کی سادگی نے تسہیل بھی بخشی تو ان اشعار کو گویا آبِ حیات پلا دیا گیا کہ صدیوں سے زبان زد خلائق ہیں اور ان کی خوبی مرورِ ایام کے ساتھ بجائے گھٹنے کے اور جلا پاتی جاتی ہے۔ مثلاً

فکرِ ہرکس بہ قدرِ ہمتِ اوست

یہ ایک نہ مرنے والی حقیقت ہے جسے حافظ نے یوں کہدیا۔ حق تو یہ ہے کہ حکماء اور عقلاء نے اپنی تعلیمات کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے تاکہ آنے والی نسلیں اُسے شمع ہدایت بنائیں اور وہ ضائع ہونے سے بچ جائیں، اپنی تلخ نصیحتوں کار آمد تجربوں اور صداقت اور حقائق کے اسباق کو عارفانہ اور حکیمانہ انداز سے موزوں الفاظ میں ظاہر کیا کیوں کہ وہ اس امر سے آگاہ تھے کہ کلام ناموزوں جس میں الفاظ کی شیرینی۔ ترنم اور سلاست نہ ہو زندہ نہیں رہ سکتا۔ الفاظ کے ترنم اور لفظوں کی سادگی ہی سے کلام دل میں گھر کر لیتا اور حافظہ پر مرتسم ہو جاتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قافیہ صرف برائے بیت ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے بہت سے اہم اور اچھے پہلو ہیں ایک طرف تو حسنِ کلام میں اضافہ کرتا ہے۔ دوسری طرف محافظِ کلام ہے۔ خاص کر اُردو شاعری میں یہ خوبی ہے کہ اس سے سند کا کام لیا جاتا ہے۔ اگرچہ فارسی اور عربی اس سے محروم نہیں لیکن عربی قافیے زمانہ جاہلیت کے بعد ترقی نہ پا سکے اور اس لئے سند دشوار ہو جاتی ہے اگرچہ فارسی نظم میں تصرف بہت ہوا ہے لیکن اس بارے میں وہ اُردو سے کم نہیں۔ اسی لئے شاعر کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ تلفظ الفاظ سے بخوبی واقف ہو تاکہ وہ ایک قانون داں ماہر فن کی طرح جو قانون کے تمام تصرفات کے نظائر سے واقف رہتا ہے اُن تمام اساتذہ کے تصرفات سے واقف ہو جن سے تہنید، تقریب، تقریس۔ اشباع۔ امالہ وغیرہ کی مثالیں قائم ہوئی ہوں۔ قافیہ کی صحت کے لئے صحیح تلفظ کا جاننا اور برقرار رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک دفعہ یہ تکرار ہو گئی کہ سپرا (یعنی چھ کا ہوا شکل ﴿ پ ﴾) کا تلفظ۔ سِپر ہے یا سپیر ہے یعنی بالفتح سین یائے مجہول اور رائے ساکن سے ہے یا بالکسر ﴿ ۲ ﴾ یائے مجہول اور رائے ساکن سے ہے۔ کسی نے اکبر مرحوم کا یہ شعر۔ برجستہ سُنایا اور

قصہ تمام ہوا۔ ؎

زندگی سے بھائی میرا سیر ہے پھر بھی خوراک اس کی ڈھائی سیر ہے

بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کو اساتذہ نے دو طریقوں سے باندھا ہے مثلاً سُخُن اور کافِر کے لفظ کو اساتذہ نے سُخَن اور کافَر متعدد جگہ باندھا ہے اسی طرح قدما کے کلام میں قافیہ سے سند دینے کی جو رسم پیدا ہوئی اُس نے الفاظ کے تلفظ کی بہت حفاظت کی ہے۔ قافیہ کے لزوم نے شاعر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ الفاظ کے بہت بڑے ذخیرے سے واقف رہے اور اسے بڑھاتا ہی چلا جائے، اسی طرح شعرا کی وجہ سے زبان میں ہر قسم کے الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا ہی چلا اور اس کا سبب قافیہ کا لزوم بحر کی پابندی تھی یعنی جس چیز کو آج کل یورپ میں ورڈز بلڈنگ اور الفاظی معموں سے رواج دیا جا رہا ہے اور حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے وہ اردو ادب میں ابتدا ہی سے موجود ہے، جسے ہم نادانی سے مٹا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے شاعر کے پاس ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کے لئے الفاظ کا ذخیرہ کم ہو گیا ہے۔ اور آج کل کا ترقی پسند ادب کا حامی شاعر ملک الموت درخشاں، عرق، للہ الحمد، جیسے الفاظ کے تلفظ تک سے ناواقف ہے،

قافیہ دراصل ایک ترقی ہے۔ ترقی پسند اگر اپنے کلام کو قافیہ سے محروم کر رہا ہے تو یہ ترقی نہیں ہے۔ یہ ترقی پسندی ہرگز نہ کہلائے گی اگر آپ اس امر کی کوشش فرمائیں کہ جن ادوار کو زمانہ زینہ بنا کے آگے بڑھ چکا ہے پھر ان کی طرف لوٹیں یقیناً ابتدائی ادوار میں نظم کا وجود ہی نہ ہوگا۔ جب کائنات کا ہر ذرہ آئین و اصول کی خوبصورت بندشوں کے رشتہ میں نہ پرو دیا گیا تھا۔ شیرازہ عالم بکھرا ہوا تھا۔ تو نثر ہی کا دَورِ دورہ تھا۔ لیکن جوں جوں انسان نے اس انتشار کو پابند انتظام کرنا چاہا موجودات کی موزونی صلاحیت ربط۔ یک رنگی۔ یکسانیت۔ ہم آہنگی سے واقف ہوتا گیا تو اس نے کلام کو موزوں و مرتب اور پھر اس موزوں و مرتب کلام کو مقفیٰ کیا اور پھر اس پر مدتوں بعد ردیف کا اضافہ ہوا۔ اس طرح برسوں ترقی کی منزلیں طے کر کے کلام میں قافیہ اور ردیف کا ظہور ہوا۔ قافیہ کا اُڑانا ترقی پسندی نہیں بلکہ رجعت پسندی ہوگا۔

محض اعلےٰ خیال کو شعر کہنا غلطی ہے۔ خیالات ہی سے شاعری نہیں۔ بہت سے ایسے عالی خیال خوش فکر آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی طبیعت نہایت ناموزوں ہوتی ہے۔ شعر کا لفظ ہی ثبوت دے رہا ہے کہ اس میں شعور اور احساس کو کتنا دخل ہے۔ جذبۂ دل اور وارداتِ قلبی سے کتنا تعلق ہے۔ تخیل کے

یہ میٹھے اور موزوں ہیجان، دل کی گہرائی کے لطیف احساسات، آنکھوں سے دیکھے ہوئے حسن اور کانوں سے سنے ہوئے نغموں کے قلب و دماغ پر طاری ہونے والے اثرات کی موزوں مترنم الفاظ میں ترجمانی کا نام شعر ہے۔ چونکہ ایسے اشعار سراپا جذبہ ہوتے ہیں جب کانوں تک اُن الفاظ کے ذریعے آواز پہنچتی ہے تو احساس اور جذبہ کو متحرک کر دیتے ہیں۔ مثلاً

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یا

جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آئے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

میرؔ کا سارا کلام اسی قسم کے اشعار سے بھرا ہوا ہے اور بادشۂ سخن ہونے کا سارا راز اسی میں ہے کہ اشعار میں تک بندی کم ہے اور جذبہ اور احساس کی ترجمانی صاف اور مترنم الفاظ میں کی گئی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ وہی کلام موزوں جس میں جذبہ زیادہ اور تک بندی کم ہو شعر کہلانے کے لائق ہے۔ ایسے شعر سے متاثر ہونے کے لئے "مجتہدِ عالم۔ زبردست بیاس۔ خالص فلسفی" ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ محض ایک دل کی اور ایک احساس رکھنے والے دل کی ضرورت ہے۔

تک بندی ہی شعر ہے تو پھر مولانا آزاد سے بڑھ کر بلکہ سر سید احمد خاں سے زیادہ اُردو زبان کا سب سے بڑا شاعر کہلانے کا کوئی مستحق نہیں۔ خوش فکری۔ بلند خیالی۔ قادر الکلامی۔ شوکتِ الفاظ ندرتِ بیان۔ آخر کس چیز کی کمی ہے؟ "نیرنگِ خیال" تو آزاد کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ لیکن نثر کا یہ بادشاہ علی الاطلاق جس کی عظمت کے آگے ہر ایک سر جھکائے دیتا ہے، میدانِ شاعری میں گھٹنوں کے بل چل رہا ہے۔ آخر کہتے ہیں جو مولانا آزاد کو ناظم اشعار دُرِ صفا کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ نیرنگ خیال کی رنگینی کے آگے اشعار کی بے رنگی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں۔ ؎

بیٹھا نقب لگائے کسی کے مکاں میں ہے
اور ہاتھ ڈالے اس کی ہر اک این و آں میں ہے

اس سے انکار نہ ہو سکے گا کہ اعلیٰ خیالات کے اظہار۔ علم کے بیان، تفسیر۔ فلسفہ۔ حکمت۔ منطق استدلال ہر قسم کے بڑے چھوٹے خیال کے اظہار کے لئے نثر سے زیادہ موزوں کوئی طریقۂ اظہار نہیں۔ نثر اسی لئے ہے کہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار بآسانی ہو سکے اور کوئی قید نہ ہو۔ بخوشی اپنا مدعا کہئے بحر اور

قافیہ ٹانگ پکڑنے نہ آئیں گے۔

سارا جھگڑا پاک ہو جائے اگر ہم ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کریں کہ آخر نظم معرا کس مرض کی دوا ہے، کیا در اصل ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ کیا بلا اس کے ہمارے ادب، نظم، معاشرت اور الغرض سارے کاروبار کا پہیا ہی رک جائے گا؟ ترقی پسند ادیب اس بات کا یوں جواب دیتا ہے کہ ضرورت نہ ہوتی تو نظم معرا معرض وجود ہی میں نہ آتی۔ یہ جواب درست نہیں۔ ہر ایجاد ضرورت ہی کے بطن سے نہیں نکلتی بلکہ بہت سی ایجادیں محض موجدوں کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ یقیناً ضروری نہیں کہ ہم لانبے بال چھوڑ دیں۔ اور ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کر دیں۔ یا خالص مونچھ ہی مونچھ رکھ چار ابرو کا صفایا فرما دیں۔ بندہ پرور یہ جدتِ طبع ہے جو اس بات کی خواہش مند ہے کہ کسی نہ کسی مخصوص علامت سے اپنے آپ کو ممتاز بنائے ایسی ایجادیں جلد ہی موجدوں کے ساتھ فنا ہو جاتی ہیں۔ اور نظم معرا بہت کچھ اسی جدتِ طبع کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔ کوئی اور ضرورت تو معلوم نہیں ہوتی۔

یہ الزام نہایت ہی نامعقول ہے کہ قافیہ کی وجہ مسلسل مضمون کہنا نہ صرف دشوار بلکہ محال ہے آخر بتائیے کہ کون سا ایسا خیال ہے۔ کونسا ایسا مضمون ہے جو بہ پابندیٔ ردیف و قافیہ نہیں کہا گیا معلوم ہونا چاہئے کہ غزل کے ارتقا سے پہلے جو بھی کچھ کہا جاتا تھا مسلسل ہی کہا جاتا تھا یہاں تک کہ ابتدائی ادوار میں غزل مسلسل ہی ہوا کرتی تھی۔ بہت دنوں بعد جب غزل میں ہر ایک قسم کے مضامین داخل ہونے لگے۔ غزل کا ہر شعر بلحاظ مضمون اور خیال آزاد ہونے لگا۔ تب یہ ضروری ہوا کہ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہو۔ اسی لئے غزل ہی سب سے ممتاز صنف شاعری سمجھی گئی۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔ مسدس۔ مخمس۔ سب مسلسل ہی کہنے کے لئے ہیں۔ فردوسی کے شاہنامے میں مسلسل واقعات بیان ہوئے ہیں۔ مولوی روم کی مثنوی میں ہر طرح عارفانہ اور صوفیانہ مسائل کا نہ صرف صراحت و وضاحت سے مسلسل بیان ہے بلکہ جگہ جگہ واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور نتیجے اخذ کئے گئے ہیں۔ سعدی۔ جامی۔ نظامی۔ فیضی۔ کی نلدمن، یوسف زلیخا۔ سکندر نامہ۔ لیلیٰ مجنون۔ بوستان، اور ان کے علاوہ بیسیوں ایسی تفصیلات ملیں گی جن میں بے تکلف ہر قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور مسلسل واقعات کو منظوم کیا گیا ہے۔ یہ اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ بہ پابندی ردیف وقافیہ و بجہانیت بحر ہر قسم کے خیالات ہر قسم کے مسلسل واقعات کو نظم کیا جا سکتا ہے۔

اردو نظم کی ترقی سے مایوسی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جیسے جسم انسانی نے اتنے ہزار برس کی ترقی کے بعد ایک خاص وضع اختیار کر لی ہے اسی طرح شاعری نے بھی اتنے زمانہ کے بعد نظم کا

یہ موزوں ڈھانچہ اختیار کرلیا ہے اب اس کے بعد جو ترقی ہو گی وہ رُوح اور عقل کی ترقی ہوگی۔ بدن میں نہایت ہی ہلکا سا تغیر و تبدل ہو گا۔ بس اتنا ہی جتنا ہم کو ہمارے اجداد سے جُدا کرتا ہے۔ لیکن انسان دماغی اور رُوحانی حیثیت سے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرتا ہی جائے گا۔ اسی طرح قالب نظم وہی رہے گا لیکن جان شاعری ہمیشہ بدلتی رہے گی اور یہ جان اپنی رنگینی اور تازگی سے جسم کو تازگی بخشے گی۔ اور فی الحقیقت ایسی ترقی کا رُکنا محال ہے۔ شاعری کے سانچوں کی تبدیلی کے متعلق اتنی پیش قیاسی کی جا سکتی ہے کہ بجائے اس کے کہ مسدس میں چار مصرعے ایک ہی قافیہ رکھتے ہیں اور باقی دو مصرعے علیحدہ قافیہ رکھتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ان چار مصرعوں کو شاعر ملا کر ایک مصرع بنائے اور ایک قافیہ رکھے اور پانچویں اور چھٹے مصرعوں کو ملا کر بطور مستزاد الگ رکھے۔ اسی قسم سے نئی بحریں ایجاد کرے۔ نئے اوزان قائم کرے۔ رہا ثقیل الفاظ کا مسئلہ تو الفاظ خود بخود فصیح ہوتے ہی جائیں گے۔ اور ان کی حرکتیں، تشدیدیں۔ اضافتیں غائب ہوتی جائیں گے۔ اور ایسے ہزاروں الفاظ ہیں مثلاً ولیّ عہد تھا ولی عہد ہوا۔ صاحبِ علم۔ صاحب خانہ تھا۔ صاحب علم اور صاحب خانہ ہوا۔ زَقّوم ثقیل تھا اور ادائی میں تکلّف ہوتا تھا ذوق نے یوں باندھا۔

شجر زقوم دوزخ میں بھی خشک دوَر ہوتا۔

ایسی ہزاروں تبدیلیاں ہوئیں اور ہوتی ہی جائیں گی۔ یہ کلام کو نکھارتی ہی جائیں گی اور اصلی مفہوم ترقی کا یہی ہو گا۔ اسی کو ترقی کہنا بجا ہو گا۔

ان تمام گنجائشوں کے بعد نظم معرّا کے اختیار کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں معلوم ہوتی۔ ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ نظم معرّا کی ہمیں کوئی ضرورت ہی نہیں۔ یہ بجائے ترقی کے رجعت، بجائے حسن کے قباحت ہے اور ہرگز اردو شاعری کی معراج کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ جس میں موزونی کا، زبان کا الفاظ کا، حسن ترتیب کا خون ہو۔ ثقالت، ناموزونی نفرت اور حسد یہاں سے وہاں تک بھرے ہوئے ہوں۔ وہ شاعری یا نظم کہلانے کے کہاں تک مستحق ہو سکتی ہے؟

سچ کہا کہ "دنیا کو شاعری کی ضرورت رہے گی بھی یا نہیں؟" یقیناً جب دُنیا ترقی کر کے اس مقام پر پہونچے گی کہ خدائی کیلئے خود خُدا کی، حکومت کے لئے حکمرانوں اور حکمرانوں کے لئے عقل، اور عقل کے لئے قانون کی ضرورت نہ ہو گی تو ضرور شعر ہو گا نہ شعر کے لئے شاعر کی ضرورت ہوگی بس انجام سامنے ہو گا۔ قیامت قریب ہو گی۔

کسی کی حکایت و شکایت منظور ہو تو مسلسل مثنوی کہیئے۔ خیالات کا طوفان اُمڈا آرہا ہو تو قصیدہ کہیئے۔ کسی مضمون کی وضاحت درکار ہو تو نظمیں کہیئے۔ طبیعت کی فراخی و کھانی منظور ہو تو بحرِ طویل فرمائیے۔ تنگ بساط ہو تو رباعی پر قناعت فرمائیے۔ مضامین فرد فرد ہوں اور جی چاہتا ہے کہ سلیقے سے ایک لڑی میں پروئے جائیں تو غزل کہیئے۔ طبیعت مشکل پسند پائی ہے تو ردیف لمبی کرکے کہیئے اور سہل راستہ منظور ہو تو محض قافیہ پر ہی اکتفا کیجیئے۔ الغرض ہر طبیعت کی مناسبت کے لحاظ سے سانچے موجود ہیں جو بھی پسند خاطر ہو اختیار فرمائیں۔

قاضی بشیر الدین

متعلم سال دوم

دنیا ہے طرفہ میکدۂ بے خودی امیرؔ — سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

امیرؔ

دل ڈھونڈھتا ہے شدتِ غم میں سکونِ تام — تو اُس جگہ بھی انجمن آرا ہے کیا کروں

عبدالہادی

شوخی تھی قیامت تری مستانہ ادا میں — فتنوں نے قدم چوم لیئے لغزشِ پا میں

امیرؔ

ابتدا تھی ابھی کہانی کی — ہائے کیا نیند ہے جوانی کی

جوشؔ

شاعر کی موت

(ایک سچا افسانہ)

۱۔ جیسے بہار کی ایک صبح کسی سرسبز چمن میں گلاب کی پہلی کلی کھلتی ہے اور چاروں کونوں سے آ آ کے بھونرے اس کے گرد پھرتے ہیں، اسی طرح بدایون شہر کے ایک شریف متمول، زمیندار کے ہاں بچہ پیدا اور گھر بھر اس پر نثار ہونے لگا۔

بچپن میں حسین و جمیل نہیں تھا لیکن کالی چمکدار آنکھیں اور ہنس مکھ چہرہ رکھتا تھا شوخ، شریر، مگر شریف۔ جوانی میں بانکا اور شکیل نہیں تھا پھر بھی رنگ گندمی تھا اور کھلتا ہوا جسم اکہرا تھا مگر بھرا اور گٹھا ہوا، قامت سیدھا تھا اور موزوں۔ مزاج و طبیعت شوخ چشم و دل بیر، اور جذبات و افکار شاعرانہ۔ بڑھاپا؟ بڑھاپا دراصل آنے ہی نہ پایا۔ اخیر عمر میں چہرہ متین ہو گیا تھا، مزاج سنجیدہ، جسم لاغر اور نگاہ تیز تر۔

بچپن، کھیل تماشے اور لاڈ پیار میں گزرا، جوانی، مکتب کالج اور یونیورسٹی کے ہنگاموں، گھر اور باہر کی محفل آرائیوں، ایک صرف ایک دلربا و دل نواز ہستی کے خیال و جستجو میں گزری اور جب وہ نہ رہی تو اس کی یاد میں مگر وہ کیا نہ رہی کچھ نہ رہا۔ کئی برس اسی سوگ میں بیتے۔ اس کے بعد؟ شاعر طبیعت، خیالی اور بے عمل، اس پر یہ غم، انتظام جائداد کا بگڑ گیا، وکالت میں دل نہ لگا اور گھر کا خرچ رہا وہی شاہانہ، خود ناز پرور وہ، بیٹیا، بیٹی ناز پروردہ پھر اب کیا ہوا؟ یہ صحیح ہے کہ طبیعت کی موزونی نے، تعلیم نے، تکلیفوں نے، دل کو گداز کر کے زبان کو اس کی لونڈی بنا دیا تھا اور فکر و خیال کو غلام۔ مگر کیا شاعری کی جنس بے بہا کو بازار میں لاتا اور اس پر بولی لگواتا۔ یہ ہیرا ہزار میں، یہ لعل لاکھ میں اور یہ موتی مفت — ہرگز نہیں، یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں، قیمت ان کی نہ سو ہے، نہ ہزار، نہ لاکھ" پھر معاش کی کیا سبیل ہو؟ در در جاؤں، ہاتھ پھیلاؤں؟ ہرگز ہرگز نہیں، خداوندا یہ کیا خیالات آج ستاتے ہیں

آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر آصف جاہی

صدر المہام تعمیرات حکومت سرکار عالی

آپ نے بزم اتحاد اردو کے سالانہ مشاعرہ کی صدارت قبول فرمائی

جس میں ہندوستان کے نامی شعراء حسرت موہانی

اور جگر مراد آبادی نے بھی شرکت کی

تو پھر نوکری ہی! کیا ؟ زمیندار کا لڑکا اور نوکری' فاقے کروں پر یہ نہ کروں' مگر کتنے ہی صاحبانِ غیرت بھی تو نوکری کر رہے ہیں' پھر مجھے تو ایک سیر چشم' عالی ذوق' امیر ابن امیر راجہ یا بان بلا رہا ہے۔ اچھا یہی سہی۔ چل اے دل مقدر ذرا آزمائیں۔

یہ سوچ کر وہ اُتر سے دکّن آیا اور بڑی عزت وقار کے ساتھ زندگی کا ایک دور یہاں گزارا' بھیک نہیں مانگی۔ کہیں جا کے پڑ نہیں رہا' ہاتھ پیر مارے اور روزی کمائی' مگر گردشِ روزگار نے تو جسے اپنی لپیٹ میں لیا سو لیا۔

ملازمت گئی' بیٹی مری' بیوی مری' لڑکے جوان تھے مگر بے روزگار رہے' پھر رہا کون ؟ ایک وہ خود' تو وہ بھی کیا۔ یہ سب بار یکایک جو اس ناز پروردہ کے کاندھوں پر پڑے تو زبان سے اُف نہ کی مگر دل بجھ گیا' صحت جواب دے بیٹھی اور اس کی جواں جولاں طبیعت غم کے بے تھا سمندر میں ڈوب گئی۔

اب جو اس شخص کو دیکھتا' حیران رہتا۔ باتیں اب بھی وہ ہنس ہنس کر کرتا تھا' فقرے شوخ انداز میں چست کرتا تھا۔ اور ملتا ملاتا تھا صاف دل اور بے شکن پیشانی سے مگر نظر والوں سے بزبانِ خاموشی کہتا کہ ؎

وہ جام ہوں جو خونِ تمنا سے بھر چکا
یہ میرا ظرف ہے کہ چھلکتا نہیں ہوں میں

بارہ برس ۔۔۔! خداوندا !! اور کیسے بارہ برس ۔ مصیبت و ناداری کے بیماری آزادی کے ! کمال کی ناقدری کے' بغض کے حسد کے طعن و تشنیع و تعصب کے !!

میری شہرت ہے' دُور' دُور' گاؤں گاؤں' شہر شہر میرا نام لیا جاتا ہے' بوڑھے بچے اور جوان میرے شعر پڑھتے ہیں' اور میں ؟..... گھر بار کو چھوڑے مسافرت میں پڑا ہوں میں اور میرے بچے' بیمار و ناتواں ہوں اور میں' اندر اندر سلگ رہا ہوں۔ آج کے آذوقے کی ٹھیک ہے نہ کل کے رزق کا انتظام' حالانکہ دنیا میرے اشعار کو میرے موتی اور لعل بتلاتی ہے پکار پکار کر کہتی ہے کہ اردو شاعری کا خزانہ ان سے مالا مال ہوا ہے اور میں جانتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے' مگر پھر ؟ لوگ میرے ظرف اور رکھ رکھاؤ کی قسم کھاتے ہیں' مگر پھر ؟ شاید یہ امتحان ہے۔ مراد یہ ہے کہ وضع داری میں فرق نہ آنے پائے۔ ایسا کچھ کر کے چلوں یاں کہ بہت یاد رہوں۔ اچھا تو اے بے نیازِ حقیقی یونہی ہوگا' اور بیشک تو ہی میرا مددگار ہے۔

اب سے جو کوئی اس زندہ درگور کا حال پوچھتا تو ہنس کر کہتا، مالک کا شکر ہے کہئے آپ کا مزاج کیسا ہے.....؟

..... کے دن صبح کے وقت، ایک جنازہ ملے پلّی کے سرکاری مکانوں سے نکالا گیا اور خطۂ صالحین کی طرف کاندھوں کاندھوں روانہ ہوا۔ چند لوگ ہمراہ تھے۔ چپ، خاموش، آبدیدہ، آہستہ آہستہ چل رہے تھے، اکثر کے دلوں میں اور چند کی زبانوں پر یہ شعر تھا کہ ؎

فانی کی زندگی بھی، کیا زندگی تھی یارب
کچھ فرق چاہیئے تھا موت اور زندگی میں

"کون مر گیا؟ کب مر گیا؟" راہ گیر بڑھ بڑھ کر پوچھنے لگے۔ کوئی کیا بتاتا کہ کون مر گیا عرصے سے وہ زندہ کب تھا جو آج مر گیا۔

اسرائیل احمد مینائی

تیرا میکدہ سلامت ترے خُم کی خیر ساقی
مرا نشہ کیوں اُترتا مجھے کیوں خمار ہوتا

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

امیر

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
بہت عالم کرے گا غم ہمارا

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا دیر تک ماتم ہمارا

میر

ٹیموشنکو

سمیان ٹیموشنکو ۱۸۹۵ء میں بسوبیا کے ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا اس کا باپ کانسٹانٹن زراعت پیشہ تھا لیکن وہ ایک ایسے گروہ کا فرد تھا جو خود کسی زرعی اراضی کا مالک نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کی زمین پر اجرت لے کر کام کرتا ہے۔ روسی زبان میں یہ طبقہ بیڈنیاک کہلاتا ہے۔ سمیان جب ذرا بڑا ہوا تو اسے گاؤں کے چھوٹے سے مدرسے میں شریک کر دیا گیا جہاں ایک دو سال میں صرف اتنا ہی سکھایا گیا کہ کچھ لکھ پڑھ سکے۔ سو تک ہندسے گن لے۔ اور کبھی کوئی پوچھے تو زار کا نام اس کے تمام خطابات کے ساتھ فوراً سنا دے۔ دیہی مدرسہ چھوڑنے کے بعد ٹیموشنکو کی عمر کے تقریباً بارہ سال کھیتوں پر گزرے۔ پھر ۱۹۱۵ء میں مغربی محاذ پر جرمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے شاہی فوج میں اس کی بھرتی ہوگئی۔ ٹیموشنکو کے مزاج میں غصہ بہت تھا۔ جب اپنے ایک عہدہ دار سے کچھ ان بن ہوگئی تو اسے پیٹ ہی دیا۔ فوجی قواعد نظم و ضبط کے مطابق اس کا کورٹ مارشل ہوا اور قید کی سزا سنائی گئی۔ مگر ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب کے شعلے بھڑکے تو گڑبڑ میں ٹیموشنکو بھی بچ نکلا۔ ان دنوں بالشیوک جماعت کرینسکی کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ کرینسکی جنگ کا علمبردار تھا اور وہ امن کی خواہاں۔ سیاسی ہلچل اور انتشار کے اس پر آشوب زمانے میں ٹیموشنکو لینن کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوا۔

۱۹۱۸ء میں ایک مختصر سے فوجی دستہ کا سردار بن کر کریمیا پہنچا اور چھپ چھپ کر ان لوگوں کے خلاف جنگ جاری رکھی جو اشتراکیت کے جانی دشمن تھے۔ بارہا ڈان کاسکس اور جنرل کالیڈین کی فوجوں سے ٹیموشنکو کی مڈبھیڑ ہوئی۔ قفقاز میں اس کی رجمنٹ کو بری طرح شکست ہوئی اس کے بعد اس کو شارتسین میں پناہ لینی پڑی گوشہ عافیت کی تلاش میں اگر وہ کہیں اور چل پڑتا تو نہ جانے اس کی موجودہ شخصیت کیا سے کیا ہو جاتی۔ سارٹسن اسٹالن گراڈ کا قدیم نام ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسٹالن۔ واروشی لوف بڈینی اور ٹیموشنکو کے برادرانہ تعلقات کی نشوونما ہوئی اور ان کی دوستی کا پودا پروان چڑھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ان ہستیوں کی ذہنی و عملی تربیت ہوئی جن کی قسمت میں روس کے سفید و سیاہ کا مالک ہونا لکھا تھا۔ ان کی دوستی کے بندھن اس قدر مضبوط تھے کہ نہ خانہ جنگی نے اسے توڑا۔ نہ ہی جماعتی فسادات نے

افترا پردازیوں اور اشتعال انگیزیوں نے کچھ نقصان پہنچایا۔ ان کی زندگی کی بعض منزلیں بڑی کٹھن گزری ہیں لیکن خلوص و محبت کی قندیل کی روشنی میں وہ اس مہیب تاریکی کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جبکہ شہرت و اقبال کے آفتاب کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور ان کیلئے ایک ایسی صبح طلوع ہو رہی تھی جس کی کوئی شام ہی نہیں۔

ان دنوں سارٹ سن یا اسٹالن گراڈ کی حفاظت و مدافعت اسٹالن کے ذمہ تھی۔ اسٹالن نے اپنے رفیق ٹیموشنکو کو اپنی فوج میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز کیا۔ ٹیموشنکو نے رات کے اندھیرے میں اچانک حملہ کرنے کی مشق شروع کی اور بہت جلد ماہر ہو گیا تھوڑے ہی دنوں میں اس کے آگے جنرل ڈینی کن کے "سفید محافظ دستوں" کے قدم اکھڑ گئے۔ ٹیموشنکو کی زندگی کا سب سے بڑا ڈرامائی کارنامہ تسخیر روسٹوف ہے۔ ایک روز افواج مخالف کے عہدہ دار رات کے کھانے میں مشغول تھے اتفاقاً ان کی نظریں ایک طرف کو اٹھیں تو بجلی سی گر پڑی۔ یا تو کمرے میں قہقہوں کی ہنگامہ آرائی تھی یا یکایک موت کا سناٹا چھا گیا۔ ان کے سامنے ٹیموشنکو کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ "کھانا تو ختم کر لو۔ اس کے بعد راسٹوف میرے حوالہ کر دینا" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۱۹۲۰ء میں جب روس اور پولینڈ کی جنگ چھڑی تو بیڈینی کے ساتھ پلیسوڈسکی کے سپاہیوں کا مقابلہ کرتا ہوا وہ سُرخ فوج کو لے کر وارسا کے دروازوں تک جا پہنچا۔ اسی سال کریمیا میں بارن رانگل سیپیری کوپ کے قریب اس کے فوجی دستوں کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ ٹیموشنکو خود بُری طرح زخمی ہوا لیکن دشمن کو کبھی پیٹھ نہ دکھائی۔

جب سُرخ فوجیں اندرونی و بیرونی مخالفین کا خاتمہ کر چکیں تو ٹیموشنکو کی توجہ پھر پڑھائی کی طرف مبذول ہوئی دوسرے عہدہ داروں کے ساتھ اسے فوجی سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے فرنزی اکیڈمی بھیجا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں یہاں کا نصاب ختم کر کے وہ فوجی اور سیاسی اکیڈمی میں شریک ہو گیا اور جب ۱۹۳۰ء میں یہاں سے کامیاب ہوا تو روس میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ اس کے باوجود اسٹالن نے اسے ترقی بہت دھیرے دھیرے دی۔ ۱۹۳۶ء تک ٹیموشنکو جنرل یاکر کے تحت ضلع کیف میں ایک معمولی مدت خدمت پر کارگزار رہا ایک سال بعد اسے قفقاز کا کماندار مقرر کیا گیا وہاں سے اسی عہدہ کے ساتھ خار قوف پر تبادلہ ہوا اور وہاں سے لوٹا تو پھر کیف آ گیا۔ انہی دنوں پولینڈ کی تقسیم کے متعلق اسٹالن اور ہٹلر کا معاہدہ ہوا تھا۔ جب رُوسی فوجیں اپنا حصہ وصول کرنے کے لئے پولینڈ میں داخل ہوئیں تو ٹیموشنکو ہی ان کا کماندار تھا۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جب روس فن لینڈ پر حملہ آور ہوا تو دنیا یہی کہتی رہی کہ بیچارہ فن لینڈ کوئی دن کا مہمان ہے لیکن جب دن گزرتے گئے اور روس کی دال گلتی نظر نہ آئی تو سب انگشت بہ دندان ہو گئے دو اہم سبب تھے جن کی وجہ سے لڑائی طول پکڑ رہی تھی ایک تو شدت کی سردی اور برف باری دوسرے ناقابل تسخیر مانرہیم لائین۔ اسٹالن نے اپنے دوست ٹیموشنکو کو لینن گراڈ بلایا اور اس زبردست مہم سر کرنے کا بوجھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔ فن لینڈ کی شکست کی جب خبر آئی تو لوگوں کو کئی ہفتوں تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اسٹالن کی عزت۔ شوکت اور عظمت کا بچانے والا درحقیقت کون ہے۔ ۷ مئی سنہ ۱۹۴۰ء کو بوشائی کو آپیرا ہاؤس میں ایک قومی تقریب منائی جا رہی تھی اسٹالن کے بازو ٹیموشنکو بیٹھا ہوا تھا اور مشتاق نگاہیں اسے دیکھ کر مسرور ہو رہی تھیں دوسرے دن روس کے تمام اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں۔ اسے اتحاد روس کے ہیرو کا سب سے بڑا خطاب دیا گیا۔ فن لینڈ میں اور پولینڈ میں بہادری دکھانے کے صلے میں ٹیموشنکو کو آرڈر آف لینن کا بھی خطاب بھی دیا گیا اسے سرخ فوج کا مارشل بنا دیا گیا اور سب سے بڑھ کر اسے عوام کا "کمی سار" مقرر کیا گیا۔ ۸ مئی سنہ ۱۹۴۰ء کو ٹیموشنکو کو عوام کے کمی سار کی ایسی خدمت پر مامور کیا گیا جس پر کبھی ٹراٹسکی اور فرانزی بھی فائز تھے، اس یادگار دن سے پہلے بہت کم روسی اس کا کے نام سے واقف اور اس کے صورت شناس تھے فوجی حلقوں کے باہر اس کا کوئی مداح اور قدر داں نہ تھا۔ جتنی بھی سویٹ انسائیکلوپیڈیا شائع ہوئیں ان میں ٹیموشنکو کا کہیں ذکر نہیں۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں ایک فوجی انسائیکلوپیڈیا چھپی جس میں کرنل کے درجہ کے اوپر کے تمام عہدہ داروں کے حالات درج تھے اس میں بھی ٹیموشنکو کا نام درج نہ تھا گمنامی کا جب پردہ اٹھا تو وہ دیوتا بن گیا سارا روس اس کی پرستش کرنے لگا آج وہ مادر روس کی آنکھوں کا سب سے درخشاں تارا ہے جب اتحاد سویٹ نے رومانیہ سے بیسربیا واپس لے لیا تو ٹیموشنکو بڑے حشمت و تجمل سے اپنے وطن قصبہ فارمانکا پہنچا تقریباً چھبیس سال کے بعد اس نے اپنے بھائی افرم سے ملاقات کی ٹیموشنکو کی آمد پر گاؤں میں گھر گھر شادیانے بجنے لگے۔

۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء کو ٹیموشنکو نے "قواعد انضباط سرخ فوج" مرتب کئے۔ اس کے بموجب سب سے نمایاں اصلاح جو ہوئی وہ یہ تھی کہ سیاسی کمی سار کا ہر فوجی کارروائی پر دستخط کرنے کا جو فضول طریقہ رائج تھا وہ بالکل ترک کر دیا گیا۔ ٹیموشنکو نے تمام روسی سپاہیوں کی فوجی تعلیم پر اپنی سخت نگرانی رکھی اور انھیں رات کی برف باری میں سلا کر صبح کی سردی اور ٹھنڈے پانی میں نہلوا کر اور کبھی ساری رات پیدل چلا کر ہر بپتا کو برداشت کرنے کے قابل بنا دیا، جب نازی خون کی ہولی کھیلتے ہوئے سرزمین روس میں داخل ہوئے

تو اسٹالن اپنے تین قدیم دوستوں واروشی لوف۔ بڈینی اور ٹیموشنکو کو ساتھ لے کر مقابلے کے لئے کمربستہ ہوا۔ ۱۱ر جولائی ۱۹۴۱ء کو تینوں نے اپنی کمان سنبھالی۔ دارالحکومت کی حفاظت ٹیموشنکو کے ذمہ ہوئی۔ لینن گراڈ کی واروشی لوف، اور یوکرائن کی بیڈینی کے ذمہ، عوام کے کمی سار کی حیثیت سے جو کام ٹیموشنکو کو انجام دینے پڑتے تھے۔ ان کو اسٹالن نے اپنے فرائض میں شریک کرلیا۔ گویا اب وہ اپنے دوسرے عہدوں کے علاوہ عوام کا کمی سار بھی تھا۔

تینوں کمانداروں میں ٹیموشنکو ہی تھا جس نے ایسا مضبوط بند تیار کیا کہ جرمن سیلاب بڑی حد تک رک گیا مگر جنوب میں حالات بگڑنے لگے تو بیڈینی کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ پر ٹیموشنکو کو متعین کیا گیا۔ ٹیموشنکو نے ہٹلر کو دن میں جس طرح تارے دکھائے ہیں ویسے کسی نے نہ دکھائے۔ پہلی شکست تو ستمبر ۱۹۴۱ء میں ہوئی۔ نازی فوجیں ماسکو کی دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر گئیں۔ دوسری روسٹوف میں۔ تیسری گزشتہ مارچ میں ڈونٹز کی لڑائی میں۔ نازی فوجوں کو گھیر کر ٹیموشنکو نے ایسے چھکے دیئے تھے کہ ہٹلر مرتے دم تک بھی نہ بھول سکے گا۔

آج جرمنی کو روس جو ایک شکست کے نشیب سے دوسری شکست کے زیادہ خطرناک ڈھلوان کی طرف ڈھکیلنے میں کامیاب ہو۔ چاہئے وہ بہت کچھ مارشل ٹیموشنکو کی جانبازی کا نتیجہ ہے۔

بعض لوگ اسٹالن اور ٹیموشنکو کی دوستی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اور عارضی سمجھتے ہیں۔ اسٹالن کا ٹیموشنکو کو "کمی سار" کے عہدہ سے ہٹا کر خود اس جگہ بیٹھ جانا اس شبہ کی کافی تصدیق کرتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسٹالن کو ٹیموشنکو پر کامل بھروسہ نہیں۔ چونکہ اسٹالن کئی مرتبہ سیاسی رقابتوں کا شکار ہو چکا ہے اس لئے اگر وہ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھے تو کوئی تعجب نہیں لیکن ساتھ ہی یہ کہنا ضروری ہے کہ ٹیموشنکو نے اب تک سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے منصوبے نہیں باندھے وہ ۱۹۱۹ء سے اشتراکی جماعت کا رکن ہے لیکن ہمیشہ سیاسی معاملات کی پرخار جھاڑیوں سے دامن بچا کر نکل کھڑا ہوا اس کے ارادے ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہیں۔ ٹیموشنکو کی شخصیت نہ صرف موجودہ جنگ کی مصیبت بھری گھڑیوں میں روس کو تسلی دیتی رہے گی بلکہ آئندہ روسی نسلوں کو بھی اپنی زندگی سنوارنے میں بڑی مدد دے گی۔

شوکت علی خاں
متعلم ایم اے (ابتدائی)

ماتا

اے مادر ہندوستان تجھے کون بزدل کہہ کر پکار سکتا ہے ؟
تجھے کون حقارت کی نظر سے دیکھ سکتا ہے ؟ وہ تنگ ظرف ہے۔ وہ کم نظر ہے !
ماتا ! تو ایک خنجر ہے مگر زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے !
تو ایک فیل مست ہے مگر تیری موجیں بے تلاطم ہیں !
تجھے یاد ہے وہ اپنی پُرانی جاہ و حشمت ؟ تجھے یاد ہے وہ اپنی پُرانی شان ؟
آہ ماتا ! تیرے پامال شدہ محلات۔ تیری شان و شوکت آئینہ دار ہیں شاندار ماضی کے !
وہ دیکھ خستہ جھونپڑیاں۔ وہ بوسیدہ مکان۔
وہ دیکھ تباہ کردہ ایوانات۔ وہ برباد کئے ہوئے چمن۔
وہ بے بسی کا عالم۔ وہ گداگری کی زندگی۔
ہاں ماتا ! اب یہی تیرا سرمایہ حیات ہے۔ اب یہی تیری کائنات زندگی ہے !
وہ دیکھ امیدوں کی قربانگاہ۔ وہ پژمردہ دل۔ وہ نیم جان جسم !
وہ چلچلاتی دھوپ میں بھوک کی دردانگیز آواز !
وہ اندھیری رات میں بیماروں کی الم ناک صدا !
وہ ظلمت کدہ میں ظلم و استبداد کی کرخت آواز !
ہاں ماتا ! اب یہی تیرا سرمایہ حیات ہے ! اب یہی تیری جیون ساتھی ہے !

ماتا ! تیرا شباب ایک اندھی بدصورت دوشیزہ کا سا ہے۔ تیری بہاروں میں خزاں کی جھلک نظر آتی ہے۔ تیرے گلستان میں کمھلائے ہوئے پھولوں کی بو مہکتی ہے ! تیرے چمن میں کلیاں مسکراتی ہیں اور رنجور ہو کر گر جاتی ہیں !

ماتا ! وہ لوگ آگے بڑھتے جا رہے ہیں مگر تو خاموش یہاں کیوں آنسو بہا رہی ہے !
اٹھ ماتا ! جاگ ماتا ! بہت کچھ ہو چکا۔ سب کچھ [illegible] جائے گا۔

تجھے قسم اس کھیتی کی جو سرسبز وشاداب ہے !
تجھے قسم اس ریگستان کی جس میں بھولے سے بھی مسافر نہ بھٹکتے ہوں !
تجھے قسم ان تاروں کی جو آسمان پر پوری طرح سے منوّر ہیں !
تجھے قسم اس آندھی کی جو ہزاروں محلوں کو روند ڈالتی ہے ! تو جاگ ماتا !
اب کیوں تیرا لہو سرد ہو چکا ہے۔ اب کیوں تو اداس ہے ؟
تیری آنکھیں زرد کیسے ہیں ! تیرا آنچل سُرخ کیوں ہے ؟
ماتا تو کیوں اتنی رنجیدہ و غمزدہ ہے ؟
جب سب لوگ خاموش سو رہے ہیں پھر تو کیوں آنسو بہا رہی ہے !
ماتا ! یاد رکھ دنیا بہادروں کی ہے ! تو بھی بہادر ہے ۔
چیر ڈال ان سمندروں کو جو تیرے راستہ میں حائل ہوں !
توڑ ڈال اُن پہاڑوں کو جو تیرا راستہ رُوکتے ہیں :
ماتا تیرے نوجوان بے وفا ہیں ! اُن کے دلوں میں محبت کی دھڑکن معدوم ہے انکی زندگی ہیچ ہے !
ماتا ! تیرے نغموں سے میرا دل تھرتھرا اُٹھتا ہے ! تیرے گیتوں سے میرا جسم کانپ اٹھتا ہے !
تیرے غمزدہ نالوں کی گونج میرے دل میں ہُوک بن کر اٹھتی ہے !
تیری چیخ رات کو بن مانیوں کو لرزہ براندام کر دیتی ہے !
تیری پکار اُن بھولے چرواہوں کے دلوں میں جو صبح کی مدھم روشنی میں بانسری بجاتے پھرتے ہیں ایک حسرت و یاس کی خوفزدہ آواز بن کر اُٹھتی ہے ! تیرے دلدوز نالوں سے خوابیدہ مسافروں کی بے بصر آنکھیں کھل جاتی ہیں !
ماتا ! تو اتنی ڈراونی رات میں کیوں رو رہی ہے ، جاگ ماتا ! اُٹھ ماتا !
آہ ! تیری خون آشام تلوار بھی اب زنگ آلود ہو چکی ہے !
وہاں نیام گرد آلود پڑا ہوا ہے :
وہ دیکھ دریا کتنے سکون سے چل رہا ہے ! وہ دیکھ فضا کتنی خاموش ہے !
وہ سُن المناک سکتے کو چیرنے والی فاختہ کی دلگداز آواز ۔ پھر وہی خاموشی۔ وہی اداس خاموشی !
وہ دیکھ پرندے کتنے افسردہ درختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ سب تیری اس دل شکن حالت پہ اشک بار ہیں ! وہ سب تیری غمگین زندگی سے ملول ہیں !

ہاں ماتا! مشکل ہے سوئے ہوئے دلوں کو جگانا۔ مشکل ہے افسردہ دلوں کو اکسانا۔ مشکل ہے
بزدلوں کو ہمت دلانا۔ وہ سب بزدل ہیں۔ وہ سب بے حس ہیں۔ ہاں ماتا وہ بزدل ہیں!
ماتا! ماتا! اب بہت کچھ ہو چکا ہے! اب سب کچھ ہو جائے گا!
وہ دیکھ آگ بھڑکتی ہوئی آگے چلی آ رہی ہے! ادھر دیکھ بجلی کیسے کوند رہی ہے! وہ دیکھ
رعد کی کیسی تھرتھراتی ہوئی لہریں آسمان پر پھیر پھیر جا رہی ہیں! وہ دیکھ گھنگھور گھٹائیں۔ وہ ہیں کڑاکے
کی گرج! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج آسمان پھٹ جائے گا۔ زمین کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔
ہاں ماتا آج تیرا پرچم باد صرصر کو محسوس کر رہا ہے!
ہمیں کٹھن گھڑی سے بچانا تیرا فرض ہے! اس آندھی سے بچانا تیرا ذمہ ہے!
پھر تو یہاں کیوں خاموش کھڑی ہے! تو یہاں خاموش موت کا انتظار کیوں کئے جا رہی ہے!
جاگ ماتا! اُٹھ ماتا۔
اُٹھ اور اپنے غریبوں کو اٹھا۔ اُٹھ ماتا نئی صبح و شام کر۔ دنیا میں چاروں طرف امن قائم کر
وہ دیکھ تیرے سامنے اس چلچلاتی دھوپ میں تیرے غریب پہاڑ کاٹ رہے ہیں۔ پتھر جل رہے
ہیں ان کے پاؤں مجسم چھالے بن چکے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اپنے کام میں محو ہیں۔
ماتا! ان کا خون اجارہ داروں کی رگوں میں دوڑ رہا ہے!
ماتا! ان سے ہمدردی پیدا کر۔ ان سے محبت کر۔ ان کو اپنا ہمنوا بنا!
ماتا! یاد رکھ محبت فاتح عالم ہے! محبت مردوں کی شمشیر ہے۔ عورتوں کی ڈھال ہے!
یہ ہی وہ دیوی ہے جس کے سامنے ہر ایک نے اپنا سر نیاز خم کیا ہے!
ماتا تو جانتی نہیں یہ ہی محبت ہے جس کی وجہ سے ہر پھول کے توڑنے پر عندلیب کی آواز آتی ہے!
یہ ہی محبت ہے جو چنگاری کو شعلہ بنا دیتی ہے!
جو نغمہ تیرے دل نشین ہوتا ہے وہ محبت ہی کی وجہ سے ہے!
اُٹھ ماتا! جاگ ماتا! اب بہت کچھ ہو چکا! سب کچھ ہو جائے گا!
ہمیں مرنا برحق ہے۔ تو کیوں نہ ہم تجھ پر اپنی جاں نثار کر دیں۔
پھر کیوں نہ ہم اپنی مادر گیتی کے لئے اپنا سر کٹوا دیں!
کہہ ماتا تو کب تک ان غم و اندوہ کی زنجیروں میں جکڑی رہے گی!
اگر تجھے ہمیشہ کے لئے رہنا منظور ہے تو آج ہی ہمارے کلیجے چیر دے۔ ہم کو آج ہی زمین تلے کر دے!

برکھا کی رت کیسی پیاری ہے پپیت کتنا سہانا ہے! مگر تو ان کے اصلی لطف سے محروم ہے!
ملہار کے گیت آسمانوں میں گونج رہے ہیں! تیری موسیقی آسمانوں سے ٹکراتی ہے!
تیری موسیقی سنگین دلوں کو بھی رلا دیتی ہے! تیرے نغمے زمین کو دہلا دیتے ہیں! تیرے گیت اس بھولے آہو تیز گام کو فریفتہ کر لیتے ہیں!

تیرے ساز کی جھنکار سے ننھی ننھی کلیاں چونک پڑتی ہیں۔ اور وہ نحیف پھول افسردہ ہو کر گر پڑتے ہیں!

موت تیرے سرہانے کھڑی تجھے ڈرا رہی ہے! ماتا یاد رکھ! موت تکمیل کا نام ہے! موت اصلی زندگی کا نام ہے؟ تو اس کو اپنا ساتھی بنا!

ماتا! تیری اس حالت کو دیکھ کر تیرے مرے ہوئے شہنشاہ اپنی قبروں میں کروٹیں بدل رہے ہیں! ان کی بے بس روح جنگلوں میں تجھے ڈھونڈنے کے لئے مضطرب ہے! لیکن تو خاموش آنسو بہا رہی ہے!

ہاں ماتا سن ہماری آواز ان خون میں غلطاں تلواروں کی جھنکار میں۔
سن ہماری آواز سولی پر چڑھے ہوئے سینیوں میں!
سن ہماری آواز کٹتے ہوئے بہادروں میں!
سن ہمارے نام ان محبت کے دیوانوں میں!

یحییٰ محمد سلام اللہ خاں
متعلم سال اول

جانِ سمند رو دل پروانہ دے مجھے ❊ اے سوزِ عشق ہمت پروانہ دے مجھے

امیر

جانے کب ہو جائیں ساز دل کے پردے نغمہ ریز ❊ ہر نفس کو گوش بر آواز رہنا چاہئے

ماہر

پوچھو نہ اس زمانے میں الفت کا حال کچھ ❊ اک رسم تھی قدیم سو موقوف ہو گئی

امیر

موسم بہار ہے۔ چاروں طرف سبزہ لہلہاتا نظر آرہا ہے۔ ٹتھونس[1] ایک ایسے مقام پر ہے جہاں سے ساری دُنیا اس کے تلے نظر آتی ہے۔ چوطرف نظروں کو دوڑاتا ہے اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو جاتی ہیں۔ یہ مقام عوام کی نظر سے دُور اور مشرق میں انسانوں کی حدنظر ہے جہاں سے آفتاب رُونما ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ٹتھونس کی آپ بیتی سنکر سارے سننے والے محوِ حیرت ہو جاتے ہیں۔ وہ دنیا کی ہر چیز پر نظر ڈالتا ہے اور آنسو ڈبڈبا آتے ہیں۔

دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ درخت و اشجار پھلتے پھولتے ہیں اور پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ انھیں نذرِ آتش کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔ انسان اتنی محنت و جانفشانی سے کھیتی باڑی کرتا ہے اور بالآخر زمین میں دفن ہو جاتا ہے۔ تاز بھی ایک نہ ایک دن اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے لیکن میں! میں ہی اتنا بد قسمت ہوں کہ اس زندگی سے چھٹکارا ہی نہیں پاتا۔ ارورا[2]! میں تیرے پہلو میں ہی مرجھایا جارہا ہوں۔ نہ مجھے موت ہی میسر ہے نہ دائمی جوانی۔ بقائے دوام کے ساتھ جوانی نہ ہو تو پھر زندگی کا لطف ہی کیا؟ بول! میری محبوبہ بول! چپ کیوں ہے؟ سچ کس بات کا ہے؟ تیرے چہرے پر یہ اداسی کیوں چھائی ہوئی ہے، تیری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں چھلک رہے ہیں؟ کہاں ہے تیرا وہ تبسم؟ کہاں ہے تیرا وہ شوخ چہرہ جس کے مسکرانے سے ساری دنیا میں اُجالا ہی اُجالا نظر آتا ہے۔ اس فانی دنیا کی زندگی کے لئے انسان کتنے کوشاں رہتے ہیں لیکن میں! میں تو تنگ آگیا ہوں۔ اے خدا مجھے موت دے! ایک دن وہ تھا جب میں نے خود ہی التجا کی تھی کہ مجھے عمرِ لافانی دے لیکن اب میں وہی ٹتھونس ہوں کہ موت کو دعوت دے رہا ہوں۔ میں تیرا رہینِ منت رہوں گا! وہ زمانہ تجھے یاد ہے کہ تو نے مجھے ٹرائے کے نوجوانوں میں سے اپنے لئے منتخب کیا تھا۔ آہ میں کتنا خوش قسمت تھا!! لیکن اب! اب میں کہاں! وہ جوانی کہاں: وہ رنگ کہاں! وہ روپ کہاں! اب تو میں ٹتھونس نہیں بلکہ ٹتھونس کا سایہ بن گیا ہوں جو ایک معمولی ہوا کے جھونکے سے اڑ جاتا ہے۔ لیکن موت نہیں آتی۔

---

[1]۔ یو میڈان کا بیٹا، اور پرائم بادشاہ ٹرائے کا بھائی

[2]۔ یونانی کلاسیک میں صبح کی دیوی

صبح کے پانچ بج رہے ہیں۔ ارورا جس نے تھتونس کے ساتھ عیش سے زندگی بسر کی تھی آج رنج و غم میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ اور آنکھ سے آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں کو چوم رہے ہیں۔ ارورا نے تھتونس کو منتخب کیا تھا اور ایک عرصے تک اس کے ساتھ گزر گئی لیکن اب تھتونس خود اپنی کمزوری کو محسوس کر رہا ہے۔ ارورا تو ایک دیوی تھی۔ تھتونس کو دیوتا نہیں بنایا جا سکتا تھا ارورا کی محبت نے اسے لافانی زندگی عطا کی تھی۔ لافانی جوانی نہیں۔ لافانی جوش نہیں لیکن محبت تو لافانی تھی۔

"اے دیوی! تو نے لافانی زندگی اس طرح بخشی جیسے کوئی رئیس کسی غریب کی مدد کر دیتا ہے اور اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں پڑتی۔ لیکن عرصہ گزرتا گیا۔ گھنٹوں سے دن اور دن سے سال بیت گئے۔ گویہ ساعتیں مجھے نیست و نابود نہ کر سکیں لیکن زندگی کا لطف مجھ سے چھین لیا گیا اور اس لئے زندہ رکھا گیا ہوں کہ دنیا کے تعیش کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھوں اور آہ سرد بھروں۔ تو ہی بتا! میری دیوی! کیا اب بھی تو میری مدد نہ کرے گی! میری خواہش صرف یہ ہے کہ مجھے موت دے۔ کیا! تو میری اس درد بھری داستان کو سن کر رو رہی ہے! مجھے میری زندگی واپس کر۔ اور فنا ہونے دے۔ انسان ایک بنے ہوئے نظام کی خلاف ورزی کیونکر کر سکتا ہے۔ وہ کس طرح اس قانون کو توڑ سکتا ہے۔ اس کا خیال مجھے پہلے نہ تھا۔ لیکن اب! اب میں بے بس ہوں! مجبور ہوں! رحم کر اور مجھے نجات دے۔"

" دیکھ! ادھر دیکھ! وہی میری پیدائش کا مقام ہے۔ میں نے وہیں پر اپنا بچپن گزارا۔ بڑا ہوا۔ وہی جگہ ہے جہاں پر میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ اور اس خواب کی تعبیر اس طرح ہوئی کہ تو مجھے یہاں لائی۔ کاش تو مجھے واپس جانے دیتی!! ارورا! پھر تیرا چہرہ تمتما اٹھا ہے۔ پھر وہی سرخی رخساروں پر چھا رہی ہے۔ اور وہی جوش پھر سے دورہ کر رہا ہے۔ تیری آنکھوں کی روشنی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور تاروں کو نظر سے چھپا رہی ہے۔ اٹھ اور اٹھ کر دنیا سے اس تاریکی کے پردے کو اٹھا دے۔ تھوڑی ہی دیر میں سورج نکلے گا اور دنیا میں اپنی روشنی پھیلائے گا۔ جا! اپنا فرض انجام دے۔ یہ نظام رک نہیں سکتا!

دیکھ تیری خاموشی اور تیرا سکوت تیرے حسن و جمال کو دوبالا کر رہا ہے! اور آن کی آن میں تیرے آنسو میرے گالوں پر سے ڈھلک رہے ہیں۔ اب یہ ستم سہا نہ جائے گا! اب میں اس مصیبت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا!!! "دیوتا اپنی خیرات واپس نہیں لیتے؟ نہیں! نہیں! ارورا ایسا نہ ہوگا! ایسا نہ کہہ! یہ ظلم ہے! یہ زیادتی ہے! مجھے موت دے! میں اب دنیا کی لذتوں سے محروم ہوں مجھے

جانے دے۔ یہ زندگی اب دوبھر ہو گئی۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ کسی کو بقائے دوام حاصل نہیں۔ پانی کی لہریں بھی خشک ہو جاتی ہیں۔ اگر خشک نہیں بھی ہوتیں تو ایک بڑے دریا سے جا ملتی ہیں جہاں پر اُن کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ لیکن ٹتھونس کی زندگی کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ اس کی خواہش ایک مرتبہ پوری ہو چکی تھی جب کہ وہ جوانی کے جوش میں نادان تھا۔ اس نے دُور اندیشی سے کام نہ لیا تھا اس لئے آج اسے یہ دن دیکھنا پڑا۔

لیکن اے حسن کی دیوی! میرے لئے یہ سزا کافی ہے۔ مجھے اب زیادہ اس مقام پر نہ رہنے دے۔ اب مجھ میں اور تیری جوانی میں کوئی مناسبت باقی نہیں رہی۔ اب بڑھاپے کے پورے آثار مجھ میں نمایاں ہو چکے ہیں! دیکھ! یہ چہرے کی جھریاں! یہ سفید بال! یہ رعشہ! یہ کمزوری! کیا یہ سب علامات ضعیفی کی نہیں۔ کیا اب میں اس قابل نہیں کہ تجھ سے جدا ہو سکوں۔ مجھ سے زیادہ تو وہی خوش ہیں! دیکھ اس کھیت کی طرف! کم سے کم وہ زندگی سے نجات تو پا سکتے ہیں لیکن میں تو بے بس ہو چکا۔ مجھے چھوڑ دے! اور دنیا میں پھر سے جانے دے۔ تو سب چیزیں دیکھتی ہے۔ اسی طرح جب سورج کی کرنیں میری قبر پر پڑیں گی تو وہ بھی نظر آئے گی! تیرے حسن میں روز بروز ترقی ہوتی جائے گی اور میں ان سب کو ایک خواب کی طرح بھول جاؤں گا! کیا! پھر وہی الفاظ!! کیا میں اپنی فنا کا طلبگار نہیں ہو سکتا؟ یہ تو میرا پیدائشی حق ہے! اتنا ظلم نہ ڈھا!

"ہاں مجھے معلوم ہے تو نے خوب کوشش کی لیکن خیر اگر کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تو ایک ٹڈی کی صورت ہی میں مجھے پھر اس دنیا کو بھیج دے جہاں سے تو لائی تھی۔"

تیج نارائن
بی۔ اے

زمانہ چل رہا ہے ان کے آنکھوں کے اشاروں پر ۔۔۔ مکمل خود بخود تاریخ عالم ہوتی جاتی ہے
عجب کیا ہے کہ فرقِ ناظر و منظور مٹ جائے ۔۔۔ تجلی بڑھتی جاتی ہے نظر کم ہوتی جاتی ہے

حیرت بدایونی

شادی میں رُکاوٹ

افتخار حسین ۔ شہر کے رئیس۔ رضیہ ۔ ان کی بیوی۔
خالدہ ۔ ایک تعلیم یافتہ حسین لڑکی اور افتخار حسین کی صاحبزادی۔ صفیہ ۔ محمود کی والدہ
محمود بی اے ۔ خالدہ کا منگیتر نصیبن ۔ ایک تفرقہ پرداز عورت

پہلا منظر (لڑکی والے)

(ایک آراستہ کمرے میں دونوں ماں بیٹی سلائی کے کام میں مشغول ہیں۔ نصیبن کو آتا دیکھ کر خالدہ برابر کے دروازے سے باہر چلی جاتی ہے۔ رضیہ آگے سے کپڑے اٹھا کر پیچھے رکھ دیتی ہے)

رضیہ۔ کہو بوا نصیبن آج کیسے آنا ہوا تم تو عید کا چاند ہو گئیں۔

نصیبن۔ کیا کروں بیٹی فرصت ہی نہیں ملتی۔ جی ملنے کو بہتیرا تڑپتا ہے۔ آخر اسی ہی گھر میں آپ لوگوں کے سایہ میں تو بچپن سے پلی بڑھی ہوں۔ آپ لوگوں کو بھلا کیسے بھول سکتی ہوں بیگم صاحب اللہ کی قسم سچ کہتی ہوں ہر وقت آپ ہی لوگوں میں جی پڑا رہتا ہے۔ ہاں میں نے اُڑتی پڑتی سنی ہے کہ خالدہ بیگم کی بات چیت پکی ہو گئی ہے۔ اللہ جانتا ہے مجھے تو بڑی خوشی ہوئی۔ مبارک ہو! کہاں بات چیت ہوئی ہے؟

رضیہ۔ خدا انجام بخیر کرے۔ اے بی کیا تمھیں نہیں معلوم جو مجھ سے پوچھتی ہو کہاں نسبت ٹھیری ہے

نصیبن۔ (ہونٹ کو دانت میں دباتے ہوئے) اللہ کی قسم مجھے خبر نہیں اگر معلوم ہوتا پوچھتی کاہے کو۔

رضیہ ۔یہیں محلے میں سامنے جو ڈپٹی ذاکر حسین رہتے ہیں نا۔ اُن کے بڑے لڑکے محمود کے ساتھ بات ٹھیری ہے۔ تمھارا لڑکا تو وہیں نوکر ہے۔ تم تو ان کے گھر ضرور آتی جاتی ہو گی۔ اُس گھرانے کی عورتیں کیسی ہیں؟

نصیبن ۔ ہاں ہاں بیگم صاحب میں خوب جانتی ہوں۔ اب آپ سے کیا کہوں بس چاند گرہن میں آ گیا۔

رضیہ (گھبرا کر) اللہ نہ کرے صاف صاف کہو کیا بات ہے۔

نصیبن ۔ نا بیوی میں تو کچھ نہیں بولتی سارے میں بدنام ہو جاؤں گی۔ ڈپٹی کی بیوی ایسی بدزبان اور منہ پھٹ عورت ہے کہ میری سات پشتوں کو کہہ ڈالے گی۔

رضیہ ۔ استغفر اللہ اس قدر بدگمانی۔ میں سچ کہتی ہوں کسی سے نہ کہوں گی۔ تم بے دھڑک سب باتیں کہہ دو۔

نصیبن ۔ اے بیگم ایسی بدمزاج اور غصیلی عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ ہر وقت غصہ ناک پر رہتا ہے۔ بس ویسے ہی غصیلے بچے بھی ہیں۔ طعن و تشنیع کے مارے بچی کو خون کے آنسو رلوا دیں گی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکا بھی ٹھیک نہیں۔ مرگی کے دورے اس کو پڑتے رہتے ہیں۔ خونی بواسیر کا مرض بھی پچھلے سال سے ہو گیا ہے۔ اللہ میری تو یہ سنا ہے کہ صحبت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے شراب پینے کی عادت بھی پڑ گئی ہے تھوڑے دن ہوئے میں یوں ہی ان کے یہاں چلی گئی تھی۔ تو کسی نے اندر جانے نہ دیا۔ بعد میں میرے لڑکے نے بتایا کہ اس وقت مرگی کا دورہ پڑا تھا۔

رضیہ ۔ (افسردگی سے) میں نے تو سنا ہے کہ لڑکا بڑا اچھا اور خوش اطوار ہے۔

نصیبن ۔ اے بیوی اپنے چھاچھ کو کون کھٹا کہتا ہے۔ ماں تو بیٹے کی تعریفوں کے پل باندھتی ہے۔ اچھا بس اب میں چلتی ہوں۔ خدا کے لئے یہ بات اپنے ہی تک رکھنا۔

رضیہ ۔ توبہ کرو یہ بات کسی سے کہنے کی ہے۔

(نصیبن دعائیں دیتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اتنے میں دوسرے دروازے سے افتخار حسین داخل ہوتے ہیں۔)

افتخار حسین ۔ (بیوی کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر) کیوں بیگم خیر تو ہے آج اتنی افسردہ کیوں ہو؟

رضیہ (بھرائی ہوئی آواز میں) واہ اچھی جگہ میری بچی کو دینے لگے تھے۔ کیا بھاری ہے بیٹی جو ایسوں کو سونپ دوں۔ مٹی کا برتن بھی لیتے ہیں تو ٹھونک بجا کر یہ بات تو زندگی بھر کی ہے۔ جتنی چھان بین کیجائے کم ہے۔ لیکن آپ نے تو کھیل سمجھ لیا ہے۔

افتخار حسین ۔ بیگم پہلے بات تو کہو بعد میں نصیحتیں کرنا۔

(رضیہ نصیبن کی سب باتیں دہراتی ہے۔)

افتخار حسین ۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں میرا جہاں تک خیال ہے یہ سب باتیں جھوٹ ہیں۔ بہرحال مزید اطمینان کے لئے میں خود بھی جاؤں گا اور کسی کو بھی بھیجوں گا۔ اگر خدانخواستہ یہ بات سچ ہوئی تو نسبت توڑ دیں گے تم فکر نہ کرو۔

دوسرا منظر (لڑکے والے)

(صفیہ ایک کرسی پر بیٹھی ہے سہ پہر کا وقت ہے صحن میں چھڑکاؤ کے بعد کرسیاں رکھ دی گئی ہیں۔ پاس ہی ایک چارپائی پڑی ہوئی ہے۔ صفیہ پھل تراش رہی ہے۔ اتنے میں نصیبن داخل ہوتی ہے۔)

صفیہ۔ (مسکراتے ہوئے) واہ نصیبن اچھا وعدہ ہے تمہارا مجھ سے کہہ گئیں تھیں کہ ابھی آتی ہوں۔

نصیبن۔ (چارپائی پر بیٹھتے ہوئے) وہاں باتوں باتوں میں اتنی دیر ہو گئی کہ پھر اس طرف آنے کو وقت نہیں رہا۔ وہیں سے گھر چلی گئی۔

صفیہ۔ اچھا خیر بتاؤ لڑکی کیا کر رہی تھی۔

نصیبن۔ میں گئی تو سی رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ سانولا رنگ ہے اور چہرے پر چیچک کے داغ ہیں۔

صفیہ۔ (حیران ہو کر) یہ چیچک کب نکلی میں نے جب دیکھا تھا اس وقت تو چہرہ صاف تھا۔

نصیبن۔ چیچک کوئی چار برس ہوئے جب نکلی تھی۔ اس ہی سے رنگ سانولا ہو گیا۔ محمود میاں کے لئے بالکل موزوں نہیں زمین آسمان کا فرق ہے۔

صفیہ۔ (مایوسی کے لہجہ میں) ہمارے متعلق کیسے خیالات ہیں؟

نصیبن۔ اے بہت اچھے۔ چراغ لے کر ڈھونڈیں جب بھی ایسا بَر نہ ملے۔ وہ تو دعائیں مانگتی ہیں کہ کل کی ہوتی آج ہی شادی ہو جائے۔ لڑکی کچھ بہت پڑھی لکھی تو ہے نہیں۔ بھلا بیوی پڑھے لکھے میاں کی زندگی جاہل بیوی کے ساتھ کیسے گزرے گی۔

صفیہ۔ بے شک اگر دل مل گئے تو گھر محبت و اتفاق سے جنّت کا نمونہ بنا رہے گا ورنہ جیتے جی جہنم ہے۔ والدین کے لئے الگ سوختت رہے گی۔

نصیبن۔ سچ پوچھو تو اسی خیال سے کہہ بھی دیا۔ آج کل تو کوئی یہ بھی نہیں پوچھتا کہ چولھا پھونکنا بھی آتا ہے یا نہیں۔ لڑکے پہلے سوال کرتے ہیں کہاں تک پڑھی ہوئی ہے۔ مجھے تو محمود میاں سے اپنے بچوں کی سی محبت ہے۔ خدا خوش رکھے اور چاند سی دلہن ملے۔

صفیہ۔ خیر حُسن تو ایک عارضی شئے ہے البتہ اعلیٰ تعلیم اور تربیت خوش قسمتی کی دلیل ہے۔

(نصیبن حتی الامکان خالدہ کے خلاف زہر اگل کر چلی جاتی ہے اور صفیہ چوری چھپی سے خالدہ کو دیکھنے کی تدبیر سوچتی ہے۔)

(مختلف ذرائع سے لڑکی کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے لیکن کوئی بات قابل اعتراض نظر نہ آنے پر تزک و احتشام کے ساتھ شادی سرانجام کو پہنچی ہے۔

تیسرا منظر (دولھا والے)

(شادی کے بعد دُولھا والے اپنی جگہ حسین تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار بہو کے ملنے پر خنداں ہیں اور دلہن والے لائق داماد کے ملنے پر شاد ہیں۔)

(خالدہ ڈریسنگ روم میں سنگار میز کے سامنے کھڑی دراز زلفیں سنوار رہی ہے۔ محمود ڈرائنگ رُوم میں اپنی والدہ سے گفتگو کر رہا ہے۔)

محمود۔ اماں جان آپ نے اس بڑھیا آفت کی پڑیا نصیبن کے کرتوت دیکھے کیسی مکار عورت ہے۔

صفیہ۔ ہاں بیٹا سب دیکھے اور سُنے بھی اس کم بخت نے تو شادی میں رکاوٹیں ڈالنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ وہ تو کہو خدا کو یہ رشتہ منظور تھا۔

محمود۔ مجھے تو سب سے زیادہ بیچاری خالدہ کو مطعون و بدنام کرنے پر غصہ آتا ہے۔ مکار نے کیسی بے سروپا باتیں کی تھیں اب ذرا ملے تو ایسے آڑے ہاتھوں لوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔

صفیہ۔ میں نے تو اس دن سے اُسے دیکھا ہی نہیں نہ معلوم کہاں چھو منتر ہو گئی۔

محمود۔ اس نے مُنہ دکھانے کی بات ہی نہیں کی۔ نہ جانے کہاں ڈُوب مری۔ خدا جانے ایسا کرنے میں کیا فائدہ ہوتا ہے۔ ناصر کی نسبت بھی تو اسی نے چھڑوائی تھی۔ اس نے خیال کیا ہو گا کہ یہاں بھی یہ منتر چل جائے گا۔

صفیہ۔ بیٹا ذاتی فائدہ تو شاذ و نادر ہی ہوا کرتا ہے۔ عام طور پر حسد سے تفرقہ ڈلوا دیتے ہیں۔

محمود۔ ایسی حاسد عورتوں کی باتوں پر اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔ میرا بس چلے تو گھر میں قدم نہ رکھنے دوں۔

صفیہ۔ (مسکرا کر) چاہیئے تو یہی!

(محمود ملازمہ سے کسی دوست کے آنے کی خبر سُن کر باہر چلا جاتا ہے دوسرے دروازے سے خالدہ نفیس ساڑی زیب تن کئے شرمائی لجاتی داخل ہوتی ہے۔

مس میمونہ زاہد علی
متعلم سال دوم

کالج کے چند دوست

(۱)

دریاؤں والی فضا کے رہنے والے ہیں۔ کافی بڑی بڑی آنکھیں جن میں سُرخی کے ڈورے پڑے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخمور ہیں۔ "نے کا" استعمال اکثر کرتے ہیں۔ رُک رُک کر بولتے ہیں اور اُردو کی مٹی خراب کرتے ہیں۔ ذراسی چھیڑ پر برہم ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ خنجر بکف رہتے ہیں۔ جلد بگڑ جاتے ہیں خود مذاق کرتے ہیں لیکن اوروں کے مذاق پر بگڑ جاتے ہیں۔ سینما دیکھنے کا بڑا شوق۔ لائبریری کی اکثر کتابیں چاٹ چکے ہیں۔ آدمی معقول تو ہیں مگر حد درجہ خطرناک ان کی مکرم ہتی ...... کسی ظریف سے کم نہیں

(۲)

اکثر کالج کے سائبان اور لائبریری میں نسوانی وقار سے خراماں نظر آتے ہیں' قدرے سانولے اور بیچچک رُو ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے دوستوں میں بہت مقبول ہیں کتابوں سے خاص رغبت رکھتے ہیں۔ حسن پرست اور ساتھ ہی ساتھ عشق پرست بھی ہیں۔ کچھ گا بھی لیتے ہیں۔ کرکٹ اچھا کھیلتے ہیں حال ہی میں ایک دوستانہ مقابلہ میں اپنی انگلی توڑ لی۔ آجکل ان کی انگلی زیر علاج ہے بہت مزیدار آدمی ہیں بالوں کے پیچ و خم میں حُسن کی دُنیا بسائے رہتے ہیں۔ ہوٹل اور پنواڑی کی دوکان کو ضرور سرفراز کرتے ہیں۔ ارادہ ہے کہ "نظام ادب" میں تہلکہ مچادیں' خدا اُن کی اس اُمید کو برلائے۔

(۳)

آپ میرے پُرانے دوست ہیں۔ چار سال سے میرے ساتھ تعلیم پارہے ہیں۔ پہلے ثمر میلے تھے۔ امتحان سرکاری میں درجہ اوّل کو تھوڑے سے نمبروں کی کمی کی وجہ سے کھو دیا۔ کالج میں آنے کے بعد اپنی نئی پارٹی قائم کرلی ہے۔ قدرے دراز قامت۔ سانولا سا رنگ۔ بڑی بڑی آنکھیں' جن میں بے پناہ شوخی و شرارت کا ایک بے پناہ دریا ہمیشہ موجزن رہتا ہے۔ گوشہ کلاہ سے بال ہمیشہ نظر بازی کرتے رہتے ہیں۔ جوانی کو حُسن کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کا موقع دیتے ہیں۔ میکدہ بردوش نہیں تو میکدہ ساز ضرور ہیں۔ انگریزی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ کبھی کبھی فرنگی بن جاتے ہیں۔ ٹینس سے خاص دلچسپی ہے۔

آج کل کورٹ بند ہو جانے کی وجہ سے پریشان ہیں۔

(۴)

آپ ایک انتہائی محنتی طالبعلم ہیں۔ آپ کو بھی آجکل ٹینس کا شوق ہے ان حضرت کا اور میرا ساتھ سات سال سے ہے۔ آپ میرے محسن ہیں۔ ہم دونوں میں اسکول کی زندگی میں اکثر مضامین میں مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے۔ گاتے ہیں اور اچھا گاتے ہیں۔ ہر وقت فرنگی بنے رہتے ہیں۔ خلیق اور ملنسار ہیں۔ گانے میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ طبلہ اور ہارمونیم بھی خوب بجاتے ہیں۔

(۵)

آپ میرے نہایت مخلص دوست ہیں۔ ان حضرت سے بھائی چارہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اپنی کرکٹ ٹیم کے کپتان تھے۔ میری ٹیم سے حضرت نے تین دفعہ میچ کھیلا لیکن تینوں دفعہ شکست ہوئی۔ جناب کو ان فرنگی کھیلوں سے اتنا شوق پیدا ہو گیا ہے کہ آپ ہر وقت ان کا ذکر فرماتے رہتے ہیں۔ حضرت کی کپتانی ختم ہو گئی۔ محنتی طالبعلم ہیں۔ رنج و غم کو خدا کی لعنت سمجھتے ہیں۔ ادبی خدمات انجام دینے کا بہت شوق رکھتے ہیں۔

(۶)

یہ میرے پرانے دوست ہیں۔ کالج میں آنے کے بعد دوستی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ آپ اوسط قد اور اوسط درجہ کے آدمی ہیں۔ گانا خوب جانتے ہیں اور رکارڈوں کی نقل بھی خوب کرتے ہیں۔ فرنگی کھیلوں سے دلچسپی ہے۔ کرکٹ اور ٹیبل ٹینس میں کافی مہارت ہے۔

(۷)

ان حضرت سے میری دوستی کالج میں آنے کے بعد ہوئی۔ شرکت کے زمانے میں ان کا تعارف مجھ سے ایک پروفیسر نے کرایا۔ ہر وقت خوش و خرم رہتے ہیں۔ خوش مزاج اور ملنسار واقع ہوئے ہیں۔ کالج میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ فارسی، انگریزی اور اردو میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ یہ اپنی شیروانی کی وجہ سے کالج میں بہت مقبول ہیں۔ ہر روز ایک نئی شیروانی میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

رام لعل واگرے
سال اول نظام کالج

ہمت افزائیاں

گزشتہ شمارہ کو دیکھ کر جن اصحاب نے ہمیں اپنی رائے سے نوازا اُن میں سے مشاہیر کے چند خطوط پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان حضرات نے جو تنقیدی پہلو نکالے ہیں اور جس طرح ہمت افزائی فرمائی ہے اس کے لئے شکریہ کے الفاظ نہیں ملتے۔ دکھانا صرف اتنا ہے کہ طلباء کی پر خلوص ادبی کوششیں بھی جو صحیح راہ پالیں تو اہلِ کمال کی نظروں میں کس قدر وقعت حاصل کر لیتی ہیں۔ بیشک ہم کو بھی اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا احساس و اعتراف ضرور ہے۔ فقط

اسرائیل احمد مینائی
معتمد

۶

مکرم

السّلام علیکم

یاد فرمائی کا شکریہ نظام ادب کا پہلا شمارہ اب نظر سے گزرا سفر میں تھا، آپ نے میری جو قدر افزائی فرمائی ہے اوس کے لئے سپاس گزار ہوں۔

آپ کا یہ مضمون بجائے خود نہایت ادیبانہ اور انشاپردازانہ ہے جو آپ کی کہنہ مشقی، حسن نگارش، اور نکتہ سنجی پر دال ہے۔ میں نے کہنہ مشقی کہہ کر آپ کی نوجوانی کی توہین کی ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح بعض لوگ کسباً "ولی ہوتے ہیں" بعض ولی مادرزاد گو عمر میں چھوٹے ہوں، اسیطرح آپ کسباً نہیں بلکہ خلیفتہً ادیب معلوم ہوتے ہیں، انشاءاللہ محنت اور مشق، مہارتِ فن کو اور بڑھائینگی۔

آپ کی اس ادبی پیمائش نے ایک بڑے اہم معرکہ کا فیصلہ کیا ہے یعنی یہ کہ عناصرِ اربعہ اردو میں کس کی کرسی آگے ہے، حالی یا شبلی، یا آزاد یا نذیر احمد کی تو جمہور کا فیصلہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اوّل یا تو شبلی ہیں، یا معاً آزاد کے بعد، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا شبلی کی کتابوں میں ابھی مدتوں

" لوئی " نہیں لگے گی۔

والسّلام سیّد سلیمان ۱۱ مئی ۱۹۴۳ء

بسم اللہ

اخبار " صِدق "

دریاباد۔ ضلع بارہ بنکی ________________ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۴۳ء

عزیز مکرم، سلام و رحمت

یہ آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے! ایسے مہذب، ایسے باادب، ایسے نستعلیق کہ میں تو دنگ رہ گیا! مسرت سے زیادہ حیرت اور حیرت سے زیادہ مسرت! اتنے سن میں اتنا سلیقہ، یہ نوک پلک کا رکھ رکھاؤ آپ کو آ کہاں سے گیا! بہرحال بارک اللہ، ماشاءاللہ۔

میں اسرائیلی تو باپ دادا کے وقت سے ہوں (اودھ کے قدوائی خاندان کا سلسلۂ نسب حضرت اسرائیل پیغمبر سے ملتا ہے) اب کیا اس سن پر پہنچ کر " اسرائیلی " ایک دوسرے معنی میں بھی بننا پڑے گا؟

" آگ دنیا میں نہ آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے "!

اس خاص الخاص لکھنوی رنگ کے مصرع کے معنی اب جا کر کھلے!

اردو کے " مینا بازار " کے آراستہ کرنے کا حق، حق یہ ہے کہ ایک مینائی نے آج ادا ہی کر دیا، اچھا ہوا کہ گھر کی دولت گھر ہی میں رہی!

مکتوباتِ قدیم تینوں بہت خوب نکلے۔ لیکن داغ اور رشاد تک تو خیر، باقی یہ آپ کو کیا دلگی سوجھی کہ آپ نے مکتوب امیرؔ بھی اس رسالہ میں چھاپ دیا! یہ بھی کوئی راہ نجات ہے؟ کیمیائے سعادت ہے؟ ادبی رسالہ کا کوئی دلائل الخیرات نمبر ہے؟ یہ پھبتیاں اور فقرے عالمِ خیال میں برابر سن رہا ہوں۔ مانا کہ میں خود اس خط کی معنویت پر لوٹ لوٹ گیا، لیکن کیا آپ کا رسالہ صرف عبدالماجد اور سیّد سلیمان ندوی تک محدود رہے گا؟ آخر " روشن خیال " " ترقی پسند " ادیبوں اور ادیباؤں[1] کو کیا مُنہ دکھائے گا؟

حضرت امیرؔ کی وہ مقبول و مشہور مناجات، برسات والی اب تک صرف زبانی سُنی تھی،

---

[1] ادیبہ کی جمع ہے ادیبہ کی۔

وہ بھی اُڑی پڑی ادہوری۔ پوری اور چھپی ہوئی پہلی بار نظر سے گزری۔ کلام امیر کے اور بھی جو ٹکڑے آپ نے جابجا درج کئے ہیں: وہ ایک اعلان اور اشتہار ہیں آپ کے حُسن انتخاب اور سلاست ذوق کا۔

اور یہ آپکے ماہر صاحب بھی خوب نکلے، ان کی نظم بھی اپنی "رجعت پسندی" میں امیر کی نثر سے کچھ کم نہیں۔ چلے ہیں کالج والوں کے پرچے میں نام رُومی اور غزالی کا لینے، اور اقبال کے ہم زبان ہوکر مقام علم سمجھانے! اچھی چھی! رسالہ کالج والوں کا، اور باتیں خانقاہ والوں کی سی! — اور پھر ذکر ایک بار بھی نہ "انقلاب" کا، نہ "بھوک" اور "روٹی" کا اور نہ "خون" اور "سرمایہ داری" کا! اور خطاب ایک بار بھی نہ کسی "رقاصہ" سے نہ کسی "بیسوا" سے! بلکہ یہ سب چھوڑ چھاڑ کلام جلیل اور حسرت کا، اور جگر کا! حد کردی آپ نے بھی قدامت نوازی کی! — کیا آپ کے کالج میں ہوا اب تک وہی مشرق ہی کی چلی آرہی ہے؟

رسالہ شروع سے آخر تک پڑھنے کا وقت کہاں سے لاتا، بس جتنا دیکھ لیا، اسی نے باغ باغ کردیا۔ آگے خدا کو خبر کہ اوروں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں!

ہاں صاحب اس دفتر "اسرائیلیات" کا ضعیف ترین باب بھی سُن لیجئے۔ وہ مکتوب امیر کی تمہید کے دو ایک گرما گرم فقرے ہیں۔ جو آگ مدت ہوئی بجھ چکی، اُسے اکسانے کی ہرگز ضرورت نہیں، ہاں اگر کوئی جنگ نامہ امیر تصنیف شائع کرنے کا خیال ہو تو بات ہی اور ہے دونوں استاد اپنی اپنی جگہ باکمال تھے۔ اپنی اپنی خصوصیات کے مالک۔ اور میں نے تو ریاض الاخبار کی وہ جلد ابھی حال ہی میں اتفاق سے دیکھی جس میں حضرت امیر کے سفر دکن اور پھر سفر آخرت کے مفصل حالات درج ہیں۔ اس آئینے میں مجھے دو دوست ہی نظر آئے۔ یگانگت اور محبت کے ساتھ ایک دوسرے سے بغلگیر۔

والسّلام

دُعاگو

عبدالماجد

ادبستان۔ دین دیال روڈ لکھنؤ۔ ۳ر جون ۱۹۴۳ء

مکرمی تسلیم

رسالہ پہنچا۔ دیکھ کر دل خوش ہوا۔ آپ کی جدتِ طبع نے جو گل کھلائے ہیں ان کی بہار دیکھی۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"۔ ادبی مذاق کا اختلاف اور کس حد کا اختلاف! مگر یہ اختلاف مذاق ہی علم و ادب کے مختلف شعبوں کی ترقی کا ضامن ہے۔

والسّلام
نیاز کیش
سید مسعود حسن رضوی

بارود خانہ۔ لاہور ۹ر مارچ ۱۹۴۳ء

مکرم محترم بندہ۔ السّلام علیکم۔

"نظامِ ادب" ملا۔ شکریہ!

رسالے کے متعلق آپ میری رائے پوچھتے ہیں۔ میں نے شروع سے اخیر تک رسالہ دیکھا ہے۔ اور صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ ؎

ہر ایک پھول بجائے خود ایک گلشن ہے
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

والسّلام۔ نیازمند
ایم اسلم

عزیز گرامی منزلت۔

ہدیہ سلام و رحمت! "نظامِ ادب" کا خصوصی نمبر میں نے پڑھا، اور ہر ورق پر آپ کے "ذوقِ انتخاب" کی داد دی!

ابن خلدون کی کہی ہوئی بات کا اب یقین آیا کہ انسانوں کو بعض خصائل و کمالات نسباً و نسلاً ورثہ میں ملتے ہیں۔ حضرت امیر مینائی قدس سرہٗ کے سرمایۂ علم و ادب سے آپ کو وافر حصہ ملا ہے۔ حق بحقدار رسید۔ اس دور میں جبکہ شعر و ادب ذاتی پروپگنڈے کا کھلونا بن گیا ہے، اور "ترقی پسندی" کے نام پر زبان و شعریت کا گلا گھونٹا جا رہا ہے، آپ کی یہ ادبی کوشش بے شمار تبریک و تحسین کی مستحق ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ آپ کے جوان رجحانات

"ادب جدید" کے گمراہ کن تقاضوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ اور آپ شعر و ادب کو صرف "روٹی اور پیٹ" کے پیمانے سے نہیں ناپتے۔

آپ کا مُرتب کیا ہوا پرچہ آپ کی صحتِ ذوق کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے!

مَیں بہت دن سے مسلسل سفر میں ہوں، مفصل اظہار رائے کی فرصت کہاں! اگر میری رائے کی اربابِ حکومت کی نگاہ میں کوئی وقعت ہوتی تو کالجوں اور اسکولوں کے نصاب میں آپ کے پرچے کے بعض اقتباسات شامل کرا دیتا۔

یقین ہے کہ دوسرا شمارہ "نقشِ ثانی" ثابت ہوگا! میری تمنائیں اور دعائیں آپکے ساتھ ہیں!

بمبئی — ۷ رجون ۱۹۴۳ء

ماہرالقادری

نہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل — تری ہمت کی کوتاہی، تری قسمت کی پستی ہے

نہ گھبرا اے دلِ واماندہ اب منزل قریب آئی — اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے

امیر

تو یہ تو رنگ بدلتی ہے تجلی ان کی — دیکھنے والے نگاہوں پہ بھروسہ نہ کریں

ماہر

آ کے بگڑی ہوئی اس باغ کی دیکھی جو ہوا — مشورے کوچ کے شب بھر گل و شبنم میں رہے

امیر

آپ کے در کا گدا، آپ کا شیدا اخترؔ — کشورِ عشق کا سلطان ہوا جاتا ہے

اختر مینائی

گُل و گُلزار

اس مضمون کے شروع کا حصہ راقم کے ایک لانبے مضمون کا چھوٹا ٹکڑا ہے۔ وہ مضمون ابھی مکمل نہیں، علاوہ ازیں شعرائے گرامی کے خطوط کے سلسلے میں اس پورے مضمون کو پیش کرنے کا کوئی محل بھی نہیں جس میں موجودہ قوموں کی زندگی کے معاشی اور سیاسی، اخلاقی سماجی اور ادبی پہلوؤں پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔ "گل و گلزار" میں صرف اتنا حصہ بطور تمہید پیش ہے۔ جو اس سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے[۱] اس میں وہ کیفیات دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے جو حسن کے سراپا[۲] نفس کے جذبات[۳]، محبت اور غم[۴]، عجز اور انکسار[۵]، انسانی ظرف[۶]، گستاخی بلند خیالی[۷]، زندگی[۸] اور اس کی جد و جہد وغیرہ مضامین کے حامل اشعار کے سننے سے اس ہستی پر طاری ہو سکتی ہیں جو اپنے پہلو میں دل انسان کا رکھتی ہے۔

اسرائیل احمد مینائی

ایک بار کا ذکر ہے، بارگاہِ ایزدی میں، عرشِ بریں کے گرداگرد فرشتے ہجوم کر رہے ہیں، ایک صف دست بستہ کھڑی ہے، دوسری رکوع میں ہے، تیسری سربسجود کہ اکبارگی ایک سجدہ کرنیوالے نے سر اٹھایا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

پوچھا گیا "کیا مراد ہے"؟

عرض کیا "اپنے پہلو میں انسان کا دل چاہتا ہوں۔

ملائکہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے، ساری کی ساری محفل حیران ہوئی کہ آج ان میں سے ایک کو آخر یہ ہوا کیا ہے۔

---

[۱]۔ جو حصے حذف کر دیئے گئے ہیں نقطوں سے ان کو واضح کیا گیا ہے۔

آواز آئی کہ تو اُس کا متحمل بھی ہوگا؟
عرض کیا کہ میں اتنے عرصے سے مقرب بارگاہِ سبحانی ہوں اور انسان مدتوں سے دَور، میں سرتا سر نوری ہوں اور وہ خاکی، وہ فانی ہے اور میں جاودانی۔
ارشاد ہوا کہ تو متحمل نہ ہوسکے گا مگر دل انسان کا تجھے عطا کیا گیا۔ جا اور دیکھ اور سیکھ اور واپس آ۔
فرطِ خوشی سے فرشتہ رونے لگا، انسانی دل کے مل جانے کی یہ پہلی نشانی تھی، پھر وہاں سے روانہ ہوا، اور ایک جوانِ جمیل کی شکل میں آدم کے مرز بوم عراق میں اُترا ....
.... ان سے بیزار ہوا اور آگے بڑھا۔ افریقہ سے ہوتا ہوا یورپ و امریکہ پہنچا.......
.... یہاں سے وہ دل گرفتہ جاپان و چین آیا.......... چین سے وہ طے مراحل کرتا اس سرزمین پہنچا جسے شمال میں گنگا جمنا اور سندھ سیراب کرتے ہیں اور جنوب میں نربدا و کرشنا۔
یہاں کا نقشہ سب سے جُدا تھا۔ مشرق اور مغرب کی ساری نئی اور پُرانی تہذیبوں کا اُس نے یہاں سنگم ہوتے دیکھا۔ اللہ سے محبت کرنے والے بھی دیکھے، بے خبر بھی، مذہب والے بھی دیکھے لامذہب بھی، تنک تنک، بھانت بھانت کے لوگ آ آ کر جمع ہو گئے تھے ....
.... یہاں اس نے ستارہ شناس اور نجومی دیکھے نقشے اور زائچے سامنے دھرے، دوربینیں لگائے آسمان پیمائیاں کرتے جاتے اور حکم مستقبل کے متعلق لگاتے جاتے۔ گویّوں کو تال سُر میں اور مصوروں کو شکلیں بنانے بگاڑنے میں مشغول دیکھا۔ سائنس دانوں کو دیکھا کہ آگ کو پانی اور پانی کو آگ میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فلسفی کو خیال کی، مورخ کو ماضی کی، سیاس کو حال کی، اور معاشین کو استقبال (مستقبل) کی گتھیوں سے دست و گریباں پایا! اور یکایک اُسے شاعر کا خیال آیا۔ یہیں کے ایک گستاخ ذہین شاعر اقبال نے اپنے تخیل اور سوزِ دل کے بل پر اُسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنے سے کمتر بتلایا ہے اور کہا ہے کہ ؎

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں قدسیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

آج تو وہ بھی انسانی احساس کا مالک ہے کیوں نہ چل کر شعراء کی محفل کا رنگ بھی دیکھے اور اس گستاخ شاعر کے دعوے کو آزمائے۔ یہ سوچ کر وہ اڑا اور اس بزم صد رنگ میں آیا جہاں نئے پرانے شعراء کا کلام سُنایا جا رہا تھا۔
اس بزم میں جونہی قدم رکھا، سنا کہ ایک شیریں بیاں، سراپا معشوقانہ عالم کا کھینچ رہا ہے

قامت و رُخ کے نقشے یہ کہہ کر اتار رہا ہے کہ ؎

گل اندام و گُل پوش و گل رنگ نقاب و گلگوں رو مست ادا و مست نگاہ و مست خرام و مشکیں مو
سیمیں ساق و سیمیں ساعد، سرو قد و ناہید جبیں غنچہ دہان و مینا گردن آہو چشم و ہلال ابرو
بانکے ترچھے، شوخ چھبیلے سب تیکھی چتون والے پینے اور پلانے والے، بے امدادِ جام و سبو
ظاہر میں الھڑ شرمیلے، بے خبر آئینِ جفا باطن میں بیباک و پُرفن، فتنہ نواز و آتش خو
خلوتیانِ محفلِ مستی، مہ رُو، معشوقانِ جہاں
روزِ ازل سے ان کا سکہ مشرق اور مغرب میں رواں

اُس نے یہ شعر سُنے تو ایسا معلوم ہوا گویا دریچے حافظے کے کُھل گئے۔ خیال کے مصوّر نے البم کے ورق اُلٹے ہر نقشے ہر تصویر کو ہر پہلو ہر عنوان سے پیش کیا اور وادیِ فرغانہ کے آہو خرام، وادیِ نیل کے گیسو دراز، قاف اور کشمیر کے پری چہرہ، اطالیہ و اندلس کے گل رخسار، آنکھوں تلے پھرنے لگے۔ امریکہ و یورپ کے معشوقانِ طناز سامنے آگئے، بانکے، ترچھے، شوخ شریر ظالم، باتوں باتوں میں متاعِ ہوش اور اشاروں اشاروں میں دل اڑا دینے والے۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور سینہ پر پڑا، کیا بات ہے، یہ آج پہلو میں کیسا حشر بپا ہے۔ باغِ بہشت میں حوروں کو تو ہزار بار دیکھا تھا، کیا بات ہے جو اس جہان میں آنے سے پہلے یہ حال نہ ہوا تھا، تب اکبارگی، جیسے بھولا ہوا تھا، یاد آگیا کہ آج تو پہلو میں انسانی دل ہے، یہ مضغہ گوشت! اُس نے کہا مگر زیادہ کہنے کی مہلت نہ پائی، کانوں میں وہی شیریں آواز آئی کہ ؎

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

تصوّر کھینچ کر لے گیا اور فرشتے نے اپنے آپ کو ترکستانِ روس میں ایک حسینہ کی خوابگاہِ ناز میں پایا جو بیدار کے بستر سے پر جاگی، خود کو جھنجوڑتی، نیند کو بھگاتی، مست خواب آنکھوں کو کھولتی اُٹھ اٹھ بیٹھتی اور لیٹ لیٹ جاتی، شاخِ صنوبر پر قمری کی آواز سے اکبارگی چونکی، ریشم کی چادر کو پرے ہٹاتی، کمخواب کے تکیوں کا سہارا ڈھونڈتی، اُٹھی تو انگڑائی لیتی ہوئی۔ گداز جسم قامت قیامت، یکایک خم ہوا۔ مرمریں بازو چوڑیوں کی چھن چھن میں اوپر اٹھے اور ماہِ تاباں کے گرد ہالا بن گئے دہن مثالِ غنچہ کھلا۔ موتی جیسے دانتوں کی آب، دہن کی لالی، نیم وا شربتی شرابی آنکھیں، صراحی دار بلوریں گردن، بال کچھ الجھے الجھے، کچھ بکھرے بکھرے، کچھ آگے کچھ پیچھے پڑے ہوئے اور ان سب کا نظارہ ایک خاص انداز ایک خاص زاویہ سے!! دیکھنے والا نقدِ جاں کھو بیٹھے۔ انگڑائیوں پہ انگڑائیاں لیتی

قدم بہکے بہکے ڈالتی، چلی دروازے کی جانب۔

کوئی کیسے بھول جائے، فرشتے نے کہا اور پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ پسینہ کے قطرے زمین پر گر کے ابھی پوری طرح جذب نہیں ہونے پائے تھے کہ ایک اور شعر پڑھا گیا ؎

ہر رونگٹے کی جاگ اُٹھی پیاس الاماں

پہلے پہل شباب کا احساس! الاماں

اور فرشتے کو اودھ کی راجدھانی لکھناؤتی (لکھنؤ) کا دھیان آیا۔ خیال اس کا کوچہ و بازار سے گزرتا وہاں پہنچا جہاں شب بھر فضا، عطر و گلاب سے مہکی رہی، ہار پھول کی بارش ہوتی رہی۔ ساز و رقص و نغمہ و حسن، باہم بہم ملتے، سنورتے، گونجتے، نکھرتے رہے۔ اس سمے سناٹا تھا پر ایک سولہ سالہ شاہدِ رعنا، ہزار بار سنگار کے بعد، قدِ آدم آئینوں کے سامنے، رُخ پر آنچل کھینچے، پہلو میں پلّو ڈالے، سینہ تانے گاتی، باندھے، ہاتھ نچاتی، کمر لچکاتی، بوٹی بوٹی کو پھڑکاتی، قدم قدم پر گھنگرو بجاتی

چھن چھن، چھن چھن، چھن چھن

چھن ......ن...ن.... چھن

چھن......ن...ن ..... چھن

چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن! چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن!

چھن...... ن......... چھن

چھن .... ن

چھن ......

چھ........

اُٹھتی، بیٹھتی، گھومتی، پھرتی۔ پھر جیسے کچھ سوچتی، اپنے کو روکتی۔ نظر جھکاتی، خود جھک جاتی، گھٹنے ٹیکتی، دامن کو پھیلاتی۔ گردن گھماتی، ابرو سمیٹتی۔ بھنوؤں کو خنجر، پلکوں کو برچھی، نظروں کو تیر بناتی۔ آئینہ میں خود کو دیکھتی۔ کبھی شرماتی سمٹتی جاتی۔ کبھی ناز کرتی، خفا ہو جاتی۔ کبھی سُرخ ہوتی غیض دکھاتی۔ کبھی ہنستی برق گراتی، اپنے ہی دل پر تیر چلاتی۔ اکبارگی رُکی۔ آئینے کے بالکل پاس آگئی۔ آنکھوں کو دیکھا اور شرمائی، ہونٹوں کو دیکھا اور مسکرائی، جسم کو دیکھا، ساق کو دیکھا، بازو دیکھے، گردن دیکھی۔ بندھی ہوئی چوٹی کھول ڈالی۔ لانبے لانبے گھونگریالے، ہاتھوں میں لے کر کبھی سونگھے، کبھی انگلیوں سے لچھے ڈالے۔ یکایک سر کو آئینہ پر جھکا دیا، جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا، بازوؤں کو کھول دیا اور

آہ بھری کچھ رونا آیا کچھ ہنسی "کیا بات ہے رعنا" خود ہی پوچھا "ان روزوں دل کیسا کیسا ہوتا ہے؟"
فرشتہ کانپ کانپ اٹھا۔ وہ بے پاؤں وہاں سے نکلا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنی ہستی سے جدا کوئی شئے ہے اور ماضی میں نہیں حقیقتاً اب اسی دم اپنے آپ کو وہاں سے نکلتا دیکھ رہا ہے! حالانکہ مدت گزر چکی تھی۔ میں اب سمجھا اس نے کہا ع ہر رونگٹے کی جاگ اٹھی پیاس...... الاماں!!

تصور نے ماضی قریب کا ایک اور سین بھی دکھلایا۔ اسکول کی لڑکیاں کھیل رہی ہیں مگر ایک ہے کہ الگ تھلک بنچ پر بیٹھی ہے اور دیکھ رہی ہے۔ شریف صورت، قبول صورت۔ کبھی خوش نظر آتی کبھی ملول، کبھی آپ ہی مسکراتی کبھی افسردہ ہو جاتی۔ ہمسنوں نے چھیڑا.....

ایک نے کہا کچھ گم صم ہیں، شاید خفگی پڑی۔
دوسری بولی نہیں بیٹی ہیں۔
تیسری نے کہا امتحان کا خیال ہے۔
چوتھی چمک کر بولی کچھ نہیں، شادی کے دن آئے ہیں۔
ابھی تک چپ سادھی تھی، اس پر قہقہہ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی، آنکھوں میں چمک آئی، چہرہ پر رنگ۔ اس ہمسن کو دھکا دیا کہ چل ہٹ، اپنی بات ہم پر ٹالتی ہے۔ دیکھیں تو سہی آج کون بازی لے جاتا ہے۔ دوڑ میں کوئی اس کی گرد کو نہ پا سکا، جست میں کوئی پاسنگ نہ آسکا، کشیدہ کاڑھا خوب مگر کروشیا ہاتھ میں بھونک لی، پکوان پکایا اچھا مگر ہاتھ جلا لیا، کالک جو بے احتیاطی سے لگ گئی پاس والی لڑکی کے منہ پر مل دی۔ اس طرارہ نے فقرہ کسا "اوہو! اوہو بادشاہ زادی آج کونسے باغ کی سیر ہو رہی ہے ہاتھ جلا لیا خبر نہ ہوئی، سوئی بھونک لی خیال نہ ہوا، کچھ تن بدن کی سدھ نہیں رہی ہے۔ بیوی تم تو کوئی محل تلاش کرو، ملکہ بنو"۔ اس پر اس کا جھینپنا، شرمانا، کھسیانی ہو کر کہنا "اچھا، اچھا ٹھہر! تیری خبر نہ لی ہو تو سہی!"

اسکول سے واپس آئی، چھوٹی بہن کو چمکارتی، بھائی کو پیار کرتی مگر ساتھ کھیلے اپنے سے بڑے چچیرے بھائی کے سامنے، قدم قاعدے سے ڈالتی اور پڑتا اتھڑ پن سے، دوپٹہ قاعدہ سے اوڑھتی اور سرک سرک جاتا۔ گھبراتی، جھنجلاتی، شرماتی۔ اب بچپن نہیں رہا تھا، رک رک کر بات کرتی۔ آنکھیں جھکائے ہوئے، بدن چرائے ہوئے اور دل ہی دل میں سوچتی کہ خداوندا! یہ کیا انقلاب برپا ہے۔
رات کو لیٹی تو دیر تک نہ سوئی، خیال میں باغوں کی سیر کیا کی۔ سوئی تو خوب سوئی، خواب میں خود کو تتلی دیکھا، فضا میں اڑی جا رہی ہے۔ بلندیوں کو ناکتی۔ وادیوں میں اترتی۔ پھول بن تلاش کرتی، بلبل کے

نالوں پر آہیں بھرتی۔ کوئل کی کوک پہ رُوتی۔ غنچہ و گل کی بو باس سونگھتی، رس چوستی، گرد پھرتی، صدقے ہوتی۔ موسم کے ساتھ ناچتی، شیاما کے ساتھ گاتی۔ جھرنوں کا شور سنتی، چشموں سے باتیں کرتی ۔ سویرے سویرے اٹھی، کیف میں ڈوبی ڈوبی، نشے میں چور چور۔ وضو کیا، سلطانِ کائنات کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوئی اور دعا مانگی کہ

اے معبود! اے میرے اچھے حافظ! میں تیری پناہ میں آئی شیطانی مردود کی چھیڑ سے اور نفس کی ہر اس اکساہٹ سے جو بدی کی طرف لے جائے ۔

فرشتے کی آنکھوں میں اس خیال ہی سے آنسو بھر آئے۔ پہلے پہل شباب کا احساس! اس نے پھریری لیتے ہوئے کہا! الاماں! الاماں!

تصور کی اس دنیا سے نکل کر جو آیا تو ایک صاحب تمکنت کو پڑھتے سنا کہ

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم ۔۔۔ اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

فرشتے نے دل میں کہا کہ اللہ رے گھمنڈ اور کسی نے آواز دی کہ تعلّی بھی دیکھیو! اس نے دھیان کیا تو سنا کہ

انجمن خاموش تھی حسنِ ازل کے راز کی ۔۔۔ میں ہی تھا ناطق کہ میں نے گفتگو آغاز کی

ہاں! اس نے طنزاً پوچھا اور جواب میں ایک تیکھے تیور والے بگڑے دل کے یہ اشعار سننا پڑے، پروردگار سے عرض کرتا تھا کہ ؎

گناہگار و غریب الدّیار ہوں لیکن ۔۔۔ ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں ۔۔۔ انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اللہ رے تعلّی، اس کی زبان سے نکلا، پھر جیسے کسی نے کہا کہ اس میں تعلّی ہے تو کیا؟ کیا خالقِ ارض و سماوات نے امانتِ عشق موجوداتِ عالم کو نہیں دکھائی تھی۔ سب گھبرا اٹھے، انکار کر بیٹھے، اور کیا انسان ہی نے بصدِ شوق اس بارِ گراں کو نہ اٹھا لیا، اس شوق سے کہ خود خالق کو بے اختیار پیار آ گیا ارشاد ہوا کہ

"جاہل ہے۔ اپنے اوپر ظلم کرنے والا"

اور کیا انسان نے ثابت نہ کر دکھایا کہ بیشک وہی تھا اس کا اہل ۔۔۔ ابنِ صادق؟!!

ماننا تو پڑے گا، فرشتے نے دل میں کہا، مگر ماننے کو جی نہیں چاہتا!

اتنے میں ایک مستِ مئے مجاز آگے بڑھا اور پڑھا کہ

نغمہ و زمزمہ و جلوہ و شعر و مئے و جام ۔۔۔ وا دریغا کہ ہے ان میں سے ہر اک چیز حرام

خنجرِ زہد کی ترکش سے بپا ہے کہرام — لیکن اس کوئے ہلاکت میں بھی ہیں گرم خرام

زلف بردوش مسیحا نفساں! کیا کہنا

دین میں عشوۂ بیباک ہے شایانِ عذاب — غمزہ و ناز پہ اک عمر سے ہے چشمِ عتاب

دستِ ہمت شکنی میں ہے سرِ زلفِ شباب — پر بہ ایں شدتِ آیات و احادیثِ حجاب

دستِ خوباں میں ہے عشووں کی عناں! کیا کہنا

سامعین میں سے اکثر کو دیکھا کہ شاعر کی آواز پر آواز دے رہے ہیں! اس نے ایک بار کہا کیا کہنا اور یہاں پے در پے کہا گیا۔ شور مچ گیا۔ وہ حیران ہوا کہ یہ کیسے بندے ہیں۔ بغاوت پر اتنے آمادہ حسین و شیریں الفاظ میں نفس کی دعوت پر اس قدر جلد لبیک کہنے والے!

خیالات میں غرق ہو کر ایسا معلوم ہوا جیسے وہ دُنیا میں نہیں، عرش ہی کے گرد قدوسیوں کے جھرمٹ میں، کامل خاموشی و سکون کے ساتھ، محوِ مراقبہ ہے کہ اکیا رگی کہیں دُور سے ایک پُرکشت آواز آئی جس میں غم انتہائی تھا، درد بلا کا تھا مگر ضد بھی تھی، ہٹ بھی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ ؎

باغ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں — کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

جونہی اس نے یہ شعر سُنا، ہوش آگیا۔ سمجھ گیا کہ کس نے پڑھا اور کہاں پڑھا۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا کہ آخر وہ پھٹ کیوں نہیں پڑتا اور زمین کو ساکت دیکھ کر حیران ہوا۔ اُسے تو چل پڑنا تھا۔ مگر زمین و آسماں جہاں اور جیسے تھے وہیں اور ویسے ہی رہے۔ تب عجز کے انداز میں سر جھکا لیا اور کہا کہ۔

" بیشک، تیری مشیت میں نہ مجھے دخل نہ کسی اور کو "

معاً ایک اور شاعر کو دیکھا، آگے بڑھ کر آیا ہے اور کمالِ عاجزی و انکسار کی ایسی تصویر بنا کھڑا ہے جو انسانوں ہی سے اور معبودِ حقیقی ہی کے روبرو ممکن ہے، کہہ رہا ہے کہ ؎

ایک موہوم حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں — میں تری ذات سے نسبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اللہ اللہ، اس نے دل میں کہا، کبھی اتنے گستاخ ہو جاتے ہیں یہ انسان اور کبھی اتنے عجز بیان۔ کسی نے آواز دی کہ یہ بھی سنیو۔ وہ متوجہ ہوا تو سنا کہ ؎

میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

فرشتہ انسان کے ظرف اور جذبۂ احسان مندی و شکرگزاری پر آش آش کرنے لگا۔ "بیشک" اس نے دل میں کہا، شکر ادا کرنے کا جو ڈھنگ انسانوں کو آتا ہے کسی اور مخلوق کو کیسے آنے لگا۔ اللہ و اکبر!

خاک کے اُن پتلوں کے دل جب چوٹ کھاتے ہیں تو کن کن جذباتِ پاک و لطیف و عالی کے حامل نہیں ہو جاتے
پھر جیسے وہ چونکا، ور پاس والوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک عالی خیال عالی ظرف شاعر کے دل نے جب
"غم" کی تیز آنچ پائی تو ساری کثافتوں کو پھاڑ کر "زندگی" کندن بن کر اُبھر آئی اور اُس کے افکار کو اپنے
رموز کا ایسا محرم بنایا کہ وہ ایسا شعر کہہ پایا۔ جسم فانی تھا "نام فانی رکھ لیا تھا مگر کلام چھوڑ گیا جاودانی۔
پھر اسی صاحبِ دل شیریں بیان نے وارفتہ مزاجوں کے انداز میں یہ شعر پڑھا کہ

ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں
جیئے جانے کی تہمت کس سے اُٹھتی کس طرح اُٹھتی

"جیئے جانے کی تہمت"! اس نے خیال کیا "یہ انسان کس کس پہلو سے بات کہتے ہیں۔ مطلب کو کہاں سے کہاں
پہنچا دیتے ہیں ــــ پھر اکبارگی خیالات نے رُخ بدلا۔ نقشے اس کی نگاہوں میں وہ پھر گئے جہاں انسانوں نے
ہر ہر دور میں "ملک و مال کی محبت میں اللہ کی زمین کو اللہ کے بندوں کے خون سے لال کر دیا۔ جاہ و
مناصب کی چاہ میں" اعلیٰ علیین کے مقامِ جلیل سے گرا کر خود کو اسفل السافلین بنا لیا۔ شاہد و ثروت کے
پیچھے بھائی نے بھائی اور باپ نے بیٹے کو چھوڑ دیا۔ تب اس نے زہرخند کیا کہ "یہ بیچارے! یہ انساں!
کوئی ان ناوانوں سے محبت کے معنی تو ذرا پوچھے"! تو جیسے کسی نے اس کا یہ خاموش طنز سن لیا ہو
ایک عارف نے بیباکانہ کہا کہ

محبت خویشتن بینی! محبت خویشتن داری

اس کے بعد ذرا رُکا، پھر صاف واضح قطعی انداز لیکن دھیمی آواز میں کہا کہ

محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

جیسے بجلی کی لہر انسانی جسم میں دوڑے تو جسم ساکت ہو جاتا ہے، فرشتہ کو سکتہ ہو گیا اور حیران حیران اس
عارف کے مُنہ کو تکنے لگا۔ پھر جب اسی کی زبانی یہ شعر سنے کہ

عشق سے پیدا نوائے زندگی کے زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
برگِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

تو انسانی دل فرشتے کے پہلو میں گرمایا، پھڑکا، زور زور سے دھڑکنے لگا اور یہ شعر سُن کر کہ ؎

وہ پُرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے اُنھیں بے سوزن و تار رفو

اس کی زبان پر بے اختیار "بیشک بیشک" کے الفاظ جاری ہو گئے جیسے اس نے ایسا ہوتے دیکھا ہو
یا جیسے وہ خود نہ کہہ رہا ہو، کوئی اس سے کہلوا رہا ہو۔ سر جھکا کے کھڑا ہو گیا مگر جب یہ سنا کہ ؎

ولی، اُس گوہرِ کانِ حیا کا واہ کیا کہنا
مرے گھر اس طرح آئے ہے جیوں سینے میں راز آوے

تو محبوب تھا پر سر اٹھایا، آنسو جو بھر آئے تھے بہنے لگے، وہ مسکرایا اور سوچنے لگا کہ یہ دُنیا والے کتنے لطیف انداز میں اپنے محبوب کا ذکر کرتے ہیں۔ باغ بہشت میں آنے والے، گلاب و یاسمن کی خوشبو میں بسے ہوئے نرم رو نسیم کے جھونکے کا حال بھی کوئی کیا اس احتیاط، اس لطف سے بیان کرپائیگا مگر ان کا محبوب ہے تو کون ؟ اب وہ سنبھل چکا تھا

ایک اللہ مست کا یہ شعر جو سُنا کہ ؎

رہی اے گل نُبک روحوں کو تیری جستجو برسوں پھرا کی کو بکو پیراہن یوسف کی بُو برسوں

تو اس کے خیال نے اوراق تاریخ کو اوراق بنا کر اُلٹنا شروع کر دیا اور الفاظ کو جامہ تصویروں کا پہنا دیا اُس نے دیکھا کہ

صاحبانِ ہوش و علم، صاحبانِ جذب و مستی، صاحبانِ ارادہ و ظرف، صاحبانِ عرفان و ایمان صاحبانِ حلم و سلم، صاحبانِ حیا و غیرت، پاک نفس، پاک خیال، صاحب نظر، صاحب دلوں کا ایک گروہ ہے جو کائنات میں ہر کہیں ــــ ہر گوشہ ہر مسئلے اور ہر واقعہ میں ــــ اُسی محبوب محبوباں کا متلاشی ہے جس کی یاد ہی سے جان کو آرام آتا ہے اور بنا جس کے دل چین نہیں پاتے دنیا والوں کا ایک انبوہ ہے جو بھونرے اور بلبل کی طرح ان کے گرد پھر رہا ہے، لیکن یہ اپنے یوسف کی تلاش میں فلسفہ کو چھان رہے ہیں، ریاضی کے مسائل کو حل کر رہے ہیں، حکمت کی گہرائیوں میں غرق ہیں زندگی کی ہر وسعت ہر گہرائی، اور ہر بلندی میں اسی کو ڈھونڈھتے پھر رہے ہیں، بلا امتیاز ملک و مذہب و ملت۔

" اللہ و غنی ، اس نے لرزتے ہوئے کہا ، " اے اللہ یہ تو تو ہی ہے .... تو ہی ہے "۔ منشا ، اگر اللہ کا نہ ہوتا تو یقین ہے کہ فرشتہ گر جاتا اور پھر کبھی ہوش میں نہ آتا مگر ارشاد تو یہ ہو چکا تھا کہ

" جا اور دیکھ اور سیکھ اور واپس آ "

اسی لئے اسے سہارا ملا۔ پاس والے حیران ہوئے کہ یہ حسین و جمیل آدمی مثل بید کے کانپ کیوں رہا ہے۔ یکایک وہ ساکت کھڑا ہو گیا اور یہ شعر جو پڑھا گیا تو نہایت ہی غور سے سُنا کہ ؎

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی

آنکھیں جھکائیں، خیال نے ہاتھ ماضی کا جا تھاما۔ ماضی نے بات مان لی، اپنا دامن جھٹکا اور فرشتہ نے دیکھا کہ جب قوموں کو عشق نے یہ آداب خود آگاہی سکھلائے تو فرعون مع ساز و سپاہ کے ڈوبا اور مصر کے بازاروں میں ڈنکے ان غلاموں کے نام کے بجنے لگے۔ قیصر و کسریٰ کے تخت آ لیٹے اور

سلطنتِ رُوما کی اینٹ سے اینٹ انہی غلاموں کے ہاتھوں بجا دی گئی۔ خدیو و خاقان و دارا کے تاج ہائے زریں زمین پر آرہے، علم ہائے کیانی سرنگوں ہوگئے، اور جھنڈے انہی کے یورپ افریقہ وایشیا کے بلند و پست میں گڑ گئے، پرچم اُن کی امیری و بلندنامی کے مشرق و مغرب میں لہرائے خود فطرت نے خزانے رازوں کے کھول دیئے اور جھوم جھوم کر ترانے ان کے کمال و عظمت کے گائے

اتنے میں ایک عاشقِ وارفتہ مزاج اُٹھا اور اعلان کیا کہ ؎

پا کے اک بُت کے آستانے کو ہم نے ٹھکرا دیا زمانے کو

فرشتہ کسی اور حال میں ہوتا تو طنز کرتا لیکن اب تو اس کی سمجھ میں آچکا تھا جس کا آستانہ پاکر انسان زمانے کو ٹھکرا سکتے ہیں۔ اس کی آنکھوں نے کتنے ہی مقامات پر انسانوں کو حق کے پیچھے فی الواقعی تاجِ کسریٰ و تختِ کیکاؤس کو ٹھکراتے دیکھا اور بعض کو تو قناعت و بے نیازی کے اس مقامِ جلیل پر سرفراز پایا جہاں سے کملی اوڑھے، گدڑی پہنے، کلاہِ نمد سر پہ دھرے، قدموں سے لگے ہوئے جاہ حشم و خیل و خدم کو ٹھکراتے ہوئے یہ فقیر، امیر عشقِ حقیقی کی شان دکھاتے، صاحبانِ طاقت و جبروت کے پتّے پانی کرتے، اہلِ دولت کو شرماتے اور عوام الناس کے دلوں پر سکّہ محبت کی شہنشاہی کا چلاتے، نقش محبوبِ جاودانی بٹھاتے گئے تو بھی اس دیارِ فانی سے لیکن۔

عالم پہ آشکار، عجب بھید کر گئے اور اپنا نام زندۂ جاوید کر گئے

فرشتہ رو یا، پھوٹ کر رُو یا اور کہا بیشک

عالم پہ آشکار عجب بھید کر گئے

لیکن، ابھی، اس کو اس سے زیادہ رونا تھا۔ ایک الم نصیب ہر ہا کے مارے کو دیکھا، آہیں بھر رہا ہے اور شعر پڑھ رہا ہے کہ ؎

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسو کو کسی سے ہم منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

اب جو نظر کی تو پایا کہ محفل میں بچے، جوان، بوڑھے، سب موجود ہیں، کوئی خاموش کھڑا آہیں بھر رہا ہے۔ کوئی مُسکرا رہا ہے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے۔ اُن کی ہنسی پر اس بے لوث، بے ریا، معصوم، زود اثر پذیر دل والے کا یہ حال ہوا کہ ایک ایک کا منہ تکتا اور روتا، جیسے عاشق پہ نہیں کہنے والے پہ نہیں، خود اسی پر یہ واردات گزر رہی ہو۔ اور جب پُر درد پُر التجا لہجہ میں سنا کہ ؎

اتنا پیغام درد کا کہنا گر صبا کوئے یار میں گزرے
کونسی رات آن ملئے گا دن بہت انتظار میں گزرے

تو اس کے سینہ میں ہوک اٹھی۔ دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ دردؔ، عاشق، معشوقِ حقیقی کا تھا۔ جب تک اس دیار میں رہا دیدار و وصلِ یار کو ترستا تڑپتا رہا۔ ہر جاننے والے جلنے والے سے یہی پیغام کہلواتا تا آنکہ مُراد پائی اور اُس سے جا ملا۔

اُس نے آنسو پونچھے اور یہ شعر سُننے لگا کہ ؎

جب سے اُس نے پھیریں نظریں، رنگ تباہی آہ نہ پوچھ　　سینہ خالی آنکھیں ویراں، دل کی حالت کیا کہئے

فرشتے نے آہ بھری اور کہا خداوندا!! یہ ظالم تو نہ جانے کیا کیا کچھ سہتے ہیں اور چپ رہتے ہیں یا آنسو بہاتے ہیں یا جو کہتے ہیں سو کہتے ہیں۔ پر مَیں نے اپنے کو کہیں کا نہ رکھا، میں اپنے دل کی حالت کیا کہوں۔ اے دانائے حقیقی تو نے غم میں کیا رکھ دیا ہے جو مٹی کے یہ پتلے کھاتے ہیں اور مرتے ہیں پھر بھی آرزو کرتے ہیں، مَیں تو ذرا ہی دیر کو ان کا دل پا کر بے حال ہوا جا رہا ہوں، ضبط کرتا ہوں اور نہیں ہوتا، خدایا! عشاق یہ ستم کیونکر سہتے ہیں؟ — جواب ملا کہ ایسے۔ اور اس نے ایک پڑھنے والے کو سنا، سر جھکائے ہاتھ باندھے آنکھیں بند کئے شکایت نہیں، التجا کر رہا ہے کہ

اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یارب　　درو دیوار دیئے، اب انھیں ویرانی دے

فرشتے کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو جم کر رہ گئے اور آواز آئی کہ ایسے دیوانے کے ایسا کہنے پر ہم بھی شرماتے ہیں مگر ایسا دیوانہ ہمیں بہت عزیز ہے۔ اس سے فرشتے کے دل کی پریشانی اور خیال کی حیرانی سوا ہو گئی، پھر یہ شعر سن کر کہ ؎

سمجھے گا کون اُس کا دردِ شورشِ کائنات میں　　تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

وہ بے قابو ہو گیا اور دل سے مجبور ہو کر آسمان کی طرف دیکھا، فرشتہ کی حیثیت سے نہیں انسان کی حیثیت سے، گویا پوچھ رہا ہے کہ بیشک بتا۔　　جواب ملا کہ ہم،

فرشتہ متعجب ہوا، از حد متعجب، دل تھام کر بیٹھ گیا۔ اب پہلو میں اس کے دل کیا تھا، ایک سوز تھا، ایک خلش تھی، ایک درد تھا، ایک ہلچل تھی اور جب تک اُس نے ایک انسان ہی سے یہ شعر نہ سُن لیا کہ۔ ؎

آہ وُہ نیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں　　پہلوئے ہستی میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

وہ اپنی اس بےچینی اور دل کی اس کیفیت کو سمجھ نہ سکا۔ اب جو سمجھا تو دیر تک "پہلوئے ہستی" و "ہنگامۂ خاموش" کی بلاغت و معانی آفرینی پر سر دھنتا رہا۔

اکبارگی اک شیریں بیان نے رنگ محفل کا پلٹا۔ اس عالمِ کشاکش کا ذکر کرتے ہوئے اندر با ہر سب کو مخاطب کیا اور کہا کہ ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

تاریخ عالم نے ایک بار اور اپنا البم فرشتے کی نگاہوں کے سامنے کھول دیا۔ ورق الٹتے گئے اور فرشتہ دیکھتا گیا۔ کتنی ہی قومیں اور ہزارہا افراد اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔ پڑھنے والے بھی رکنے والے بھی تیز قدم بھی سست رفتار بھی موقعے سے فائدہ اُٹھانے والے ہوشیار بھی اور نہ اٹھانے والے بیہوش بھی، عراقی اور مصری، یونانی و رُومی، اہل پارس و اہل عرب، چینی و آریا، فرانسیسی و انگریز، مُوسائی، عیسائی، ہندو، مسلمان سب اس بزمِ ہستی میں آگے بڑھتے ہوئے جامِ مئے آتشیں اُٹھائے ہوئے، پیتے ہوئے — جو آگے بڑھنا بھول جاتا، یا مغرور یا ست ہوکر جہاں کے تہاں رُک جاتا، وہ وہیں رہتا، دوسرے آگے بڑھتے جام پر جام لُنڈھاتے، اس تک دور نہ آتا اور دیکھتے ہی دیکھتے رندوں کی اس بزم میں یا تو وہ اجنبی ہو جاتا یا لوگ اُسے بھول جاتے یا خاطر میں نہ لاتے، یا پھر طنز کرتے ایذا پہنچاتے۔ بڑے بڑے بادہ مست جو کبھی اُس کی رونق اور اس کی کبھی جان تھے، دیکھتے ہی دیکھتے یا تو فراموش کر دئے گئے تھے یا ذلت کے ہاتھوں اسیر عذاب الیم تھے۔

فرشتہ نے سر اُٹھایا اور کہا "بیشک! یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی۔"
پھر وہ زندگی کی ماہیت پر غور کرنے لگا تو ایک کہنے والے کو سُنا کہ

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے؟ انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

کیا واقعی؟ اس کی پیشانی پر شکن ہو گئی، صرف اتنی ہی؟

اس بار ایک عارفِ ہستی، لذت یافتہ مستی اُٹھا اور نہایت ہی پُر درد آواز لیکن از حد متین انداز میں کہا کہ

کھلا جب چمن میں کتب خانۂ گُل — نہ کام آیا مُلّا کو علمِ کتابی
متانت شکن تھی ہوائے بہاراں — غزلخواں ہوا پیرکِ اندرابی
کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے — کہ اسرارِ جاں کی ہوں میں بے حجابی
سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو — نہاں اس کی تعمیر میں ہے خرابی
نہیں زندگی سلسلہ رُوز و شب کا — نہیں زندگی مستی و نیم خوابی
جہان است در آتشِ خود تپیدن — خوش آں دم کہ ایں نکتہ را باز یابی
اگر ز آتشِ خود شرارے بگیری — تواں کرد زیرِ فلک آفتابی

اور فرشتے کو وہ مردانِ جلیل یاد آئے جو آگ میں پھینکے گئے تو ہنستے تھے، سُولی پر چڑھائے گئے

تو مسکراتے تھے، راہِ خدا میں ستائے گئے، قوم کے ہاتھوں ہر نوع ظلم سے آزمائے گئے تو دعا کرتے تھے کہ اے ارحم الرّاحمین یہ ناواقف ہیں، یہ ابھی جانتے نہیں۔

مجاہدانِ جواں ہمت نظروں کے سامنے آئے، ہر دَور، ہر قوم اور ہر دیار میں، اس نے انھیں پایا۔ دیکھا کہ کام جو کرتے ہیں انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر کرتے ہیں ــــ بے لاگ، بے ریا۔ بات جو کہتے ہیں عالم کو سنوارنے، بدی کو اکھاڑنے اور نیکی کا جھنڈا گاڑنے کی غرض سے کہتے ہیں ــــ سچی اور بے غرض۔ باطل کے اندھیروں کے درمیان پھنسے اور گھرے ہوئے۔ ایمان کی روشنی، ظرف و خلوص کا گرزِ گراں بار لئے ہوئے، خود اعتمادِ حق کا سر پہ دھرے، زرہ صداقت کی پہنے، چار آئینہ اُمید کا لگائے ہوئے، ڈھال دانش کی پکڑے، شمشیرِ عدل و انصاف کی زیبِ کمر کئے اور نیزے مساوات کے اُٹھائے ہوئے۔ چومکھی لڑ رہے ہیں۔ قدم قدم پر خطرات کا سامنا کر رہے ہیں مگر سعیٔ کامل سے باز نہیں آتے اور اسی جد و جہد کو اصل زندگی بتلاتے ہیں ــــ

یہ مردانِ جلیل القدر اس کے لئے کوئی اجنبی نہ تھے۔ وہ اُن کے تذکرے محفلِ ملائکہ میں بھی سُن چکا تھا اور رہگبرت اُن کی فتح اور اُن کے کارناموں کے گاچکا تھا۔ اس نے دھرایا کہ بیشک ع

توان کرد زیرِ فلک آفتابی

پھر جب اُسی عارفِ کامل کو زندگی کے متعلق یہ کہتے سُنا کہ

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب ۔۔۔ اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ ۔۔۔ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

تو اس کے پہلو میں انسانی دل جذبۂ آزادی و حریت کے اس سوز سے گرمایا جو ایک طرح سے اپنے میں ایزدی بے پناہی و وسعت رکھتا ہے اور جس کی رفعت کی کوئی حد نہیں۔ فطرت کے ہاتھ نے دن رات کا پردۂ ابلق رنگ درمیان سے ہٹا کر وقت کے چہرے کو مثالِ رُوزِ روشن اُس کے رُوبرو کر دیا اور فرشتے نے ایک ہی گرامی قوم میں، ماضی کے افرادِ جلیل و آزاد اور حال کے غلاموں کو بیک ساعت قدم اُٹھاتے دیکھا مگر فرق یہ پایا کہ وہ جسے ترقی کہتے تھے یہ اُسے تنزل کہتے ہیں اس لئے وہ مشرق کو آرہے تھے تو یہ مغرب کو جا رہے ہیں۔ ایک زندگی کو جوان ثابت کرتا تھا فلاح و خیر و انصاف کے جھنڈے گاڑنے کی پیہم کوششوں اور ہر لحظہ و ہر آن بڑھنے والی اُمنگوں سے، دوسرا ثابت کرتا ہے اور کرتا رہا ہے جذباتِ شیطانی ــــ قمار و شاہد و شراب ــــ کی ترقی و ترویج و شگفتی سے۔ مصر و عراق و شام و ہندوستان کے وہ غلام بھی اُن کے

سامنے آئے جنھیں چھوٹے بڑے سب علی الاعلان غلام سمجھ اور پکار رہے ہیں اور یورپ ایشیا کے وہ غلام بھی جو خود کو کہتے ہیں آزاد اور کہلاتے ہیں آزاد مگر کوئی چنگیز کی کمند میں پھنسا ہوا ہے. کوئی نیرو کی پنجے میں گرفتار اور یہ سب نفس کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالے، بیچارگی وآلام کے اس دور سے گزر رہے ہیں جس کو آزادی کامل وحریتِ حقیقی سے اتنا بھی علاقہ نہیں جتنا افق کے قریں ملنے والے آسمان و زمین کے کناروں کو ہے وہ ان سب کو ابھی ابھی دیکھ کر آرہا تھا مگر تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا گویا پھر ان کے درمیان سے گزر رہا ہے اور اُس کا جی چاہا کہ ایک ایک کا شانہ ہلا کر کہے کہ تم میں سے جنھیں اپنے غلام ہونے کا اقرار ہے وہ بھی اور جنھیں اس سے انکار ہے وہ بھی سُن لیں کہ آزادی نام ہے اطاعت واتباعِ حق کا اور غلامی نام ہے اس سے انحراف اور باطل کے اتباع کا' سو ہوش میں آؤ!!

اتنے میں اسی دانش ور نے یہ راز بھی بزم پر کھولا کہ

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت سے نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور فرشتہ کو ایسا معلوم ہوا گویا لندن و برلین کی درس گاہوں' روم و یونان و پیرس کے ایوانوں' قسطنطنیہ و ماسکو کی علمی مجلسوں' نیویارک' ٹوکیو اور دہلی کے تعلیمی اداروں میں طلباء اور اساتذہ فلسفی اور منطقی' ڈراما نویس' ناول نگار اور شعراء' یہاں تک کہ ہر کس و ناکس اس دورِ پرخود غلطی میں پکار پکار کر اوراحسن الخالقین کو موردِ الزام ٹھہرا ٹھہرا کر جس حقیقتِ عظیم کا بطلان کر رہا ہے' یہ عارف ان کی رَد میں اسی کی تائید کرتا ہے اور برملا کرتا ہے۔ تصور نے انسانوں کو بنتے بھی دیکھا بگڑتے بھی' ڈوبتے بھی دیکھا اُبھرتے بھی۔ عروج وکمال کی بلندیوں پر سرفراز دیکھا اور وہاں سے گرتے بھی۔ پر جب اور جہاں نگاہِ حق آگاہ ڈالی' عمل کو کارفرما پایا اور صاحبانِ عمل کو ذمہ دار۔ اس نے صاف دیکھا کہ یورپ وایشیا بلکہ سارے عالم کے بسنے والے عذابِ دوزخ کی جو سختیاں اُٹھا رہے ہیں۔ اس کی تیاری ان کے ہاتھوں اور پیروں اور آنکھوں' دل اور دماغ اور رُوح نے زندگی کے ہر زاویے ہر پہلو میں' اور اللہ کی زمین کے ہر چپے ہر گوشے میں برسوں پہلے شروع کر دی تھی۔ جن قوموں نے جنت بنائی جنت پائی' جو دوزخ بناتے رہے دوزخ میں گرے ــــ!! کسی کو قائل کرنا نہ تھا' اس نے دیکھا' سمجھا اور مطمئن ہوگیا۔

اب جو یہ سنا کہ ؎

اِس بزمِ ساحری میں جہالت کا ذکر کیا خود علم کے حواس بھی رہنے نہیں بجا

اوہام جب دلوں میں بجاتے ہیں دائرا
عقلوں کو سوجھتا ہی نہیں رقص کے سوا
تاریخ جھومتی ہے فسانوں کے غول میں
بوڑھے بھی ناچتے ہیں جوانوں کے غول میں

توا وہام پرستی، قبر پرستی اور رسوم پرستی کے بہت سے آنکھوں دیکھے سین آنِ واحد میں سامنے سے گزر گئے۔ اُس نے بھبوت ملے، شراب میں دھت، ننگ دھڑنگ انسانوں کو ناچتے کودتے دیکھا۔ ویدوں اور اپنشدوں کے پڑھنے والوں کو دیکھا، شاہد و شراب سے دل بہلا رہے ہیں، جوے میں وقت اور دولت اور عزتِ نفس گنوا رہے ہیں، جو اس نے پوچھا کہ تمھیں ایسا کہنے کو کس نے کہا تو انھوں نے اللہ کے اُن نیک بندوں کا نام لیا جن کے تقدس کے قسم کھائیے۔ غول کے غول دیکھے، جانوروں کی تصویریں بنائے، ڈھول پیٹتے کاغذ اور کھپچ کے خول کاندھوں پر اٹھائے جا رہے ہیں یا مورتیاں سجائے بیٹھے ہیں اُن سے مرادیں مانگ رہے ہیں۔ خرافات کو واقعات بتلاتے ہوئے، میدانِ پرہول و پرُغار کربلا میں، شادیاں کرواتے، ناچ تی بجواتے، قریشیوں کے ہاتھوں میں کنگھنے بندھواتے مہندی لگواتے، آلِ رسول جیسے بہادر، ضابط، صابر، جواں مرد، عاشقانِ شریعتِ حقّا کو صبر و شریعت کا ہر آئین توڑنے بتلا رہے ہیں۔ اُس کو اپنے کانوں اور آنکھوں پر اعتبار نہ آیا اور پوچھا کہ یہ تم کس کا ذکر کر رہے ہو تو جواب میں نام ان کا سُنا جن کے تشرع، تہور اور حمیت پر ارض و سماوات اور خود خالقِ ارض و سماوات گواہ ہیں۔ یا پایا کہ قبروں کو سجا سجا کر بُت بنا لیا ہے، ہاتھ جوڑے کوئی کھڑا ہے، کوئی گرد پھر رہا ہے کوئی نیم قد بیٹھا ہے کوئی سر بسجود ہے گڑگڑا رہا ہے۔ منتیں مُرادیں مانگی جا رہی ہیں۔ جو حال ان کا پوچھا تو کسی نے اپنے کو حنفی بتلایا کسی نے مالکی، کسی نے شافعی اور کسی نے حنبلی اور جو سبب اس طریق کا دریافت کیا تو اپنے عمل کو جائز کسی نے قرآن سے بتلایا کسی نے حدیث سے۔ اچھے اچھے علم والوں کی مجلسوں کا دھیان جما جہاں بوڑھے اور جوان، روایتی و نقلی دلائل کے ذریعہ، سلسلے اُن بندوں کے جو اپنی بندگی کے علی الاعلان اور بشدت مقر تھے اور انسان ہونے پر فخر کرتے تھے، دیوؤں اور پریوں سے ملاتے رہے۔ افعال ان کے ارواح و اجنہ کے بتلاتے رہے۔ قصے گھڑتے رہے باتیں بناتے رہے، خدا کے بندوں کو کہیں خدا بتلایا کہیں اُس کا شریک، کہیں شیطان ٹھہرایا کہیں فرشتہ۔ الغرض علم کے ان عالی مقاموں نے اُنھیں انسان کہنا کبھی گوارا نہ فرمایا۔

خیال اور حافظہ یہ ڈرامہ دیکھ ہی رہے تھے کہ یکبارگی اس نے سنا ؎

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں ... ہر جزو جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

فرشتے کا دماغ چکرانے لگا۔ ہاتھ اپنا وہ کبھی پیشانی پر پھیرتا اور کبھی دل پر رکھتا مگر مطلب خاک سمجھ میں نہ آتا۔ تب وہ پسینہ پسینہ ہوگیا کہ انسان کچھ ایسے مطالب بھی اپنی گفتگو میں بیان کرتے ہیں۔ جو قدسیوں کے فہم سے ماورا ہوں۔ عالم بےبسی میں خالق اکبر کی طرف رجوع کی تو القاء ہوا کہ یہ انسان ہم کو معشوق خود بیں بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہم ہی جذبہ خود بینی کے تحت اپنی یکتائی کا جلوہ دیکھنا نہ چاہتے تو کائنات عالم وجود میں نہ آتی۔ سو دعویٰ یہ ہے کہ یہ دنیا ہماری یکتائی کا جلوہ ہے اور کُن اِس لئے ہوئی کہ ہم خود اس جلوے کے دیکھنے کے مشتاق تھے۔

فرشتے کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ فرط خوف و تعجب سے لرزہ براندام ہوگیا۔ خوف، ہیبت و عظمت الٰہی کا تھا اور تعجب انسان کے بیان و طرز بیان کے ساتھ ہی خالق انسان کی اس شان بے نیازی پر بھی تھا کہ اُس نے اِن خاک کے پتلوں کو ایسا رسا ذہن اور ایسا رفیع تخیل عنایت فرمایا۔

اتنے میں ایک اور شعر اسی گستاخ و رفیع الخیال شاعر کا پڑھا گیا کہ

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ... ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

القاء کے دروازے ابھی بند نہ ہوئے تھے۔ فرشتے نے جب یہ شعر سُنا اور مطلب اُس کا اُس پر کُھلا تو بجائے انسان کو بُرا کہنے ملامت کرنے کے (جیسا کہ ایسے موقعوں پر اُس کا طریق رہا تھا) اس نے تعریف و ثنائے الٰہی کی وہ تسبیح زیرلب شروع کی جو وہ عرش کے گرد کھڑے اور بیٹھے اور سجدے میں پڑے، پڑھا کرتا تھا۔ پھر کہا کہ

"بیشک میں ناچیز ہوں اور تیری مصلحتوں کو سمجھنے سے قاصر۔ بیشک تو حکیم کامل و مختارِ مطلق ہے۔ تو نے جو کچھ کیا ہے، ٹھیک ہی کیا ہے لیکن اب مجھ میں تاب اور کچھ سُننے کی نہیں میں اس مخلوق کو سمجھنے سے عاجز رہا۔ ...."

فرشتہ جب عالم بالا پہنچا تو ارشاد ہوا "کیا دیکھا" ؟ عرض کی کہ "تُو تو دیکھتا تھا" پھر سر اٹھایا اور کہا

تماشہ تیری قدرت اور خداوندی کا دیکھا ـــــ"

ابھی جس بزم صد رنگ سے یہ فرشتہ عالم بالا سدھارا تھا اُسی بزم کے چند مسند نشینوں سے ملنے کا موقعہ ملا تو ہم نے اُن سے اُن کا انتخاب اور دوسروں کا انتخاب چاہا، اُن کا حال اور

دوسروں کا حال پوچھا اور بہت عاجزی و انکسار کے ساتھ درخواست کی کہ ہمیں اپنے افکار و خیالات و حالات سے مطلع فرمائیے تاکہ ہم دوسروں تک اُس کو پہنچا ئیں، ادب کی ایک طرح سے خدمت کریں، اور اپنے مضمون کو ان ادبی پھولوں سے گل و گلزار بنائیں۔ اُن میں سے کتنے ہی راضی ہوگئے اور ہمیں نوازا، کتنوں ہی نے تبسم زیرِ لب فرمایا۔ بعض نے جواب ہی نہ دیا، بعض نے خط کا جواب تو دیا مگر سوالات کا جواب دینے سے معذوری ظاہر کی، شکایت کس سے کیجیے اور کیا کیجیے، البتہ جنھوں نے خط کے جواب میں کچھ بھی نہ لکھا اُن کا شکریہ ادا کرنا ضرور ہے۔

انیس شعرائے گرامی نے ہم کو جواب سے سرفراز فرمایا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر اتنے مشہور ہیں کہ قارئین سے اُن کا تعارف کرانا سورج کو چراغ ہے دکھانا۔ ان کے نام حسبِ ذیل ہیں:

(۱) حسرت موہانی (۲) ناطق لکھنوی (۳) سیماب اکبرآبادی (۴) دل شاہجہانپوری (۵) یگانہ چنگیزی (۶) فراق گورکھپوری (۷) علی اختر حیدرآبادی (۸) جگر بسوانی (۹) وحشت (۱۰) محوی لکھنوی (۱۱) اختر شیرانی (۱۲) ماہر القادری (۱۳) امجد حیدرآبادی۔ (۱۴) حیدر لکھنوی (۱۵) تسنیم بینائی (۱۶) صفیہ شمیم لکھنوی۔

حضرت صفی لکھنوی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور حفیظ جالندھری نے خط کا جواب دیا لیکن سوالات کے جوابات مرحمت نہ فرمائے۔[1]

پہلا سوال تھا کہ شعرائے ماضی و حال کے وہ کونسے بارہ پندرہ اشعار ہیں جو آپ کو بیحد پسند ہیں؟ بہتر ہوتا جو ہم اپنے مفہوم کو واضح تر کردیتے یعنی یہ بھی لکھ دیتے کہ "اور جو آپ اپنی یاد سے لکھ سکتے ہیں"۔ اس صورت میں یہ اعتراض رفع ہو جاتا کہ تمام اردو شعرا کے دواوین کی ورق گردانی کون کرے جو ایسے بارہ پندرہ نایاب موتی چن کر لائے۔ بہرحال جن اصحاب نے ہمارا مفہوم سمجھ لیا انھوں نے بے تامل جواب دیا چنانچہ انہی میں حسرت موہانی جیسے گرامی پایہ بھی ہیں۔

دوسرا سوال تھا کہ آپ کو اردو شعرا میں علی الترتیب کونسے شعرا (ماضی و حال) پسند ہیں؟ اپنے اپنے انداز میں اکثر نے اس کا جواب دیا ہے۔ گرامی شعرا نے جہاں جہاں احتیاط برتی ہے اور پہلو بچائے ہیں اس کا لطف خطوط کے پڑھنے ہی سے حاصل ہوگا۔ ہمارا کام

---

[1] حضرت جوش، جگر، ساغر، روش، اور احسان دانش نے جواب نہ دیا۔

یہ تھا کہ اعداد و شمار جمع کر دیں سو ہم ایک تختہ[1] مرتب کر کے پیش کر رہے ہیں، ان سے نتائج اخذ کرنے کا کام قارئینِ کرام کی پُر حزم و احتیاط طبیعت، حقیقت شناس نظر اور شعر نواز دل پر چھوڑتے ہیں لیکن یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ :-

(۱) یہ اعداد و شمار نہ تو فیصلۂ ناطق کا حکم رکھتے ہیں نہ فیصلۂ آخر کا۔ وہ صرف مُلک کے شاعر طبقہ کے رجحان اور پسند کے ایک گونہ ترجمان ہیں۔

(۲) پھر یہ کہ مندرجہ بالا سوالات کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ صرف انہی کے جوابات پر ایک شاعر کو دوسرے سے بڑھا دینا درست نہ ہوگا، البتہ اُس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فی الوقت خواص کے اس گروہ میں قبولِ عام کن شعرائے ماضی و حال کو حاصل ہے۔ چنانچہ کتنے ہی قدرتی امور صاف طور پر سامنے آ رہے ہیں۔ غالب کو تقریباً سب نے پسند کیا اور بحیثیت مجموعی سب سے زیادہ پسند کیا۔ پھر نام میر کا لیا، مومن کا لیا، اقبال کا لیا۔

(۳) تیسرے یہ کہ چند شعراء کے اشعار ایک ہی شخص نے کئی کئی گنائے ہیں مثلاً میر، غالب، اقبال، فانی وغیرہم۔ یعنی گو فانی کو (۸) حضرات نے گنایا ہے اور امیر کو (۹) نے لیکن زیادہ بار نام اقبال و فانی ہی کا لیا گیا ہے۔ اس لئے وقتِ فیصلہ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

دوسرا سوال تھا کہ اپنے وہ کونسے بارہ اشعار ہیں جو آپ کو بیحد مرغوب ہیں؟ کیا آپ ہم سے اتفاق نہ کریں گے کہ سوال وقت طلب اور جرأت آزما ہی ہی لیکن اس کے جوابات کا دلچسپ ہونے کے ساتھ اہم ہونا ایک فطری اور کھلی بات ہے۔ گو اُستادِ عصر حضرتِ صفیؔ لکھنوی کا دُہرایا ہوا اور غالب جیسے باکمال کا کہا ہوا شعر سر آنکھوں پر کہ ؎

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ　　شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

پر اُس کی اہمیت اور اس کے لطف کا حال کچھ ان سے پوچھئے جو شعرائے باکمال کا کلام پڑھتے ہیں اور اکثر سوچتے ہیں کہ ہمیں یہ شعر پسند ہیں۔ اور انھیں وہ شعر پسند مگر اللہ جانے کہنے والے کو کونسے پسند ہوں گے؟

تیسرا سوال یہ تھا کہ اُردو شعراء میں علی الترتیب آپ کو کون کون پسند ہیں؟

چوتھا سوال تھا کہ آپ کی شاعری کن واقعات، حالات، کتابوں اور اشخاص سے متاثر ہوئی ہے؟

اب ہم شعرائے کرام کے خطوط کو بجنسہٖ پیش کرتے ہیں۔

[1] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۷ و ۱۱۸

از جناب حسرت موہانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بجواب سوال (۱) و (۳) :- [۱]

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ [۲]	نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا	میرؔ
سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ	کیا جانئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا	سوداؔ
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی	ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا	دردؔ
ترے کوچے اس بہانے مجھے دن کو رات کرنا	کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا	مصحفیؔ
محفل وعظ تو تا دیر رہے گی قائمؔ	یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں	قائمؔ
روئے ہے بات بات پہ جرأت	ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں	جرأتؔ
بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائے گی	وہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے	غالبؔ
تھا مقدر میں اس سے کم ملنا	کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی	مومنؔ
اُس بلائے جاں سے آتشؔ دیکھئے کیونکر بنے	دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خو ہے دوست	آتشؔ
بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ	اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں	حالیؔ
ہم تھوڑے سے بھی جرم پہ شرمائیں ہیں کیا کیا	اک جرعۂ مے پی کے عرق آئے ہیں کیا کیا	جلالؔ
دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم	میں آپ آیا نہیں لایا گیا ہوں	شاد عظیم آبادیؔ

بجواب سوال (۲) و (۴) :-

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا	شغل بیکار ہیں سب اُن کی محبت کے سوا
علم و حکمت کا جنھیں شوق ہو آئیں نہ اِدھر	کچھ نہیں فلسفۂ عشق میں حیرت کے سوا
سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم	اس میں اک شان فراغت بھی ہے راحت کے سوا [۳]
عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا	کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرت کے سوا

[۱] - فخر المتغزلین حسرت موہانی نے یہاں وہی جگہ اختیار کر لی ہے جو نثر نگار حضرات میں مولانا سید سلیمان ندوی کو حاصل تھی، چنانچہ فرط شفقت میں القاب لکھنا بھول گئے۔ فوراً حرف مطلب پر آگئے۔

[۲] اگرچہ بحیثیت مجموعی پسندیدہ شاعر کی حیثیت سے غالب کا نام سب سے زیادہ لیا گیا ہے لیکن غالباً قارئین کی نگاہ سے یہ حیرت انگیز امر پوشیدہ نہ رہے گا کہ بیشتر خطوط میں میر تقی ہی میر رہے ہیں۔ سب سے پہلے نام انھیں کا آیا ہے۔ حالانکہ ان سے پہلے کے شعراء مثلاً ولی کے اشعار بھی دئے گئے ہیں۔

[۳] مولانا کو دیکھنے اور ملنے کا جن خوش قسمتوں کو اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ حسرت جیسے وضع دار اور ظرف والے شاعر پر یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے۔

قسمتِ شوق آزما نہ سکے | ان سے ہم آنکھ بھی ملا نہ سکے
ہم سے دل آپ نے اٹھا تو لیا | پر کہیں اور بھی لگا نہ سکے
اب کہاں تم کہاں وہ ربط و فا | یاد بھی جس کی ہم دلا نہ سکے
ہم تو کیا بھولتے انہیں حسرتؔ | دل سے وہ بھی ہمیں بھلا نہ سکے
عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر | آرزوئی زندگی بیکار ہے تیرے بغیر
جس فراغت کا تمنائی تھا میں تیرے لئے | اب وہ حاصل ہے تو اک آزار ہے تیرے بغیر
دردِ دل جو تھا کبھی وجہ مباہات و شرف | ہر حسرت موجب صد عار ہے تیرے بغیر
ہر لحظہ وظیفہ ہے جان و دلِ آگہ کا | الحسن ہو الحق کا و العشق ہو اللہ کا[1]

حسرت موہانی

از جناب ناطق لکھنوی

محترمی تسلیم۔ حضرت علامہ ناطق کی خدمت میں آپ نے جو خط ارسال فرمایا تھا، اس کے جواب میں گزارش ہے کہ حضرت علامہ ان دنوں علیل ہیں اس لئے نہ اپنے دست مبارک سے جواب لکھ سکتے ہیں اور نہ امور زیر نظر میں آپ کو کافی مدد دے سکتے ہیں خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ بعض امور بہت غور طلب ہیں مثلاً آپ نے انتخاب اشعار کے وجوہ بھی طلب فرمائے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جو اشعار بہت عمدہ اور سہل ممتنع ہوتے ہیں۔ ان میں ایک ایسی کیفیت وجدانی ہوتی ہے جو بیان میں نہیں آسکتی اور جب کوئی غلطی سے ان پر تنقید کرتا ہے تو وہ ایسے تباہ ہوتے ہیں، جیسے گلاب کا پھول تجزیہ کرنے سے[2]

دوسرا امر یہ ہے کہ جب صدہا اشعار منتخب اصرار کر رہے ہوں کہ ہمیں ضرور سب سے پہلے انتخاب کرو، تو بارہ شعر علامہ ناطق کے یا کسی ایسے ہی بلند پایہ شاعر کے کلام سے انتخاب کرنا ناممکن ہے۔ یہ کام حکیم صاحب نے ہم لوگوں کے سپرد کیا تھا۔ ہم لوگ اس امر میں سخت عاجز ہوئے لہذا اشعار کی جب انتہا نہ دیکھی تو مجبوراً چند مطلعے نقل کر کے آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اگر یہ زیادہ ہوں تو آپ خود ان میں سے انتخاب کر لیجئے۔

---

[1] ۔ اس مطلع سے متعلق مولانا نے راقم کے بھائی سے ایک بار فرمایا کہ لوگ ابھی تک عشق ہو اللہ تو کہتے رہے ہیں لیکن حسن ہو الحق کی جدت ہماری اپنی ہے اور دونوں تراکیب کو مطلع میں یکجا کر کے ہم نے خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے
[2] ۔ نسیم قریشی صاحب نے جس سادہ و صاف الفاظ میں "سہل ممتنع" کی تشریح کی ہے اس پر بے اختیار زبان سے تعریف نکلتی ہے
[3] جناب ناطق نے یہ جواب اپنے شاگرد جناب نسیم قریشی ایم اے ریسرچ اسکالر سے لکھوایا ہے۔

سوال نمبر ۴ کے متعلق موصوف فرماتے ہیں کہ حضرت امیر مینائی مرحوم و مغفور اور ان کے کلام بلاغت نظام کے علاوہ، وہ فارسی اساتذہ فن میں خاص طور پر رومی، حافظ، نظیری اور عرفی اور اردو شعراء میں بالخصوص حضور، غالب، میر، مومن اور ذوق کے کلام سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔

حضرت علامہ کی رائے میں آپ کی یہ تجاویز ذوق ادب کے لئے بہت مفید اور دلچسپ ہیں[1] اور حضرت امیر مینائی سے آپ کا تعلق نسبی اس پر بہت موثر ہے۔ دعا فرمایئے کہ باری تعالےٰ حکیم صاحب موصوف کو صحت کلی عطا فرمائے تاکہ شعر و ادب کی دوسری خدمات کے ساتھ ساتھ آپ کی فرمائشیں بھی پوری ہو سکیں۔

نیاز کیش نسیم قریشی
ایم۔ اے۔ بی۔ اے۔ آنرز ریسرچ اسکالر

"انتخاب"

انجمن خاموش تھی حسن ازل کے راز کی
میں ہی تھا ناطق کہ میں نے گفتگو آغاز کی

پرتو نہیں، تصویر نہیں، عکس نہیں ہے
اک صورت بے نقش ہے جو ذہن نشیں ہے

وہ بے نقاب کہیں بے نقاب ہوتا ہے
کہ آفتاب خود اپنا حجاب ہوتا ہے

آتش حسن ازل سے اک شرر نازل ہوا
ہستئ عاشق کے خرمن میں گرا اور دل ہوا

دیکھ کر ان کو نظر میں یہ اثر آتا ہے
کہ ہر اک چیز میں اک حسن نظر آتا ہے

میکشوں کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

کون ہے ارمان جس کو آپ کا رہتا نہیں
فرق اتنا ہے کہ سب کہتے ہیں میں کہتا نہیں

مجھ سے افسردہ نہ اے جوش بہاراں ہوتا
کیف میں بھول گیا چاک گریباں ہوتا

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

کوئی نہ سن سکا مرا قصہ زمانے میں
اتنا اثر بھی ہو نہ کسی کے فسانے میں

کہیں جو آپ میں آیا بھی تیرا دیوانہ
تو جس طرح کوئی پردیس میں ہو بیگانہ

وقت بیہوشی جب آ جائے جب ہی آرام ہے
دل مسافر کا جہاں ڈوبے وہیں پر شام ہے

[1] کاش جناب علامہ ہماری سفارش چند ایسے بزرگوں سے کرتے جو اس وقت "بابائے شاعری" کی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی حضرت صفی و حضرت جلیل۔ ہم اس مضمون کو پوری طرح مکمل ہونے پر کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔

از جناب سیماب اکبرآبادی

باسمہٖ تعالیٰ

مکرمی! السلام علیکم، والانامہ شرف صدور لایا۔ یاد فرمائی کا ممنون ہوں۔ آپ نے جو سوال کئے ہیں اُن کے مختصر جواب حسب ذیل ہیں۔

(۱) شعرائے ماضی وحال کے اشعار مجھے بکثرت پسند ہیں۔ لیکن آپ نے دس بارہ اشعار کی تحدید کر دی ہے اس لئے صرف اتنے ہی اشعار قلمبند کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

کوئی اس وقت برہمن کی صباحت دیکھے	نکلے جب رات کا جاگا ہوا بتخانے سے	لا اعلم
گردوں کا ایک دور تھا ساغر کا ایک دور	نکلے جو میکدہ سے تو دُنیا بدل گئی	لا اعلم
آہ دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں	پہلوئے ہستی میں اک ہنگامۂ خاموش ہے	اقبال
غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا	ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا	صفی
میں تری یاد میں ہوں اور کافر	مسجدوں میں نماز ہوتی ہے	مرحوش
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا	مومن
نہ پوچھ دل کی حقیقت مگر یہ کہتے ہیں	وہ بیقرار رہے جس نے بیقرار کیا	داغ
پردے میں بھی منہ موت دکھاتی نہیں مجھکو	کافور سے بوئے کفن آتی نہیں مجھ کو	امیر
نہ چلا کے رو قبر پہ رونے والے	بدلنے لگے کروٹیں سونے والے	جلال
بکھرا کے زلف کو نہ جنازے پہ آئیے	اس تیرگی میں لاش نہ اُٹھ جائے	جاوید
تنگ آ گئے ہیں اس بُتِ ناآشنا سے ہم	فریاد برہمن سے کریں یا خدا سے ہم	طاہر
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں	موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں	غالب

ان اشعار کے علاوہ میر و غالب، امیر و داغ اور جلال و اقبال کے مجھے اکثر اشعار پسند ہیں۔

(۲) مجھے اپنے تمام اشعار پسند ہیں۔ اگر پسند نہ ہوتے تو ان کا کہنا فضول تھا۔ بطور امتثال امر چند اشعار لکھے دیتا ہوں۔

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر	ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر
جسے دیوانگی کہتے ہیں "الفت کی نبوّت ہے	غنیمت ہے جو صدیوں میں کوئی دیوانہ ہو جائے
کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے	جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
وہاں لائی ہے حرصِ آدمیت منفعل کرنے	جہاں صدیوں میں پیدا ایک انساں ہو نہیں سکتا

مری نگاہوں سے دور ہے تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہوگا — کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں الٹ دیا تھا نقاب تیرا

دماغ و روح یکساں چاہیئے انسان کامل میں — یہ کیا تقسیم ناقص ہے، خودی سر میں، خدا دل میں

کوئی یہ شکوہ سرایانِ جور سے پوچھے — وفا بھی حسن ہی کرتا، تو آپ کیا کرتے [۱]

صدائے صور سے میں حشر میں نہ چونکوں گا — کسی حسین ہوئی آواز سے پکار مجھے

ذرا کھل کر پکار اے صورِ مجذوبانِ الفت کو — یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

وہ سجدہ کیا، رہے احساس جس میں سر اٹھانے کا — عبادت، اور بقیدِ ہوش، توہینِ عبادت ہے

خود اپنے حال میں بے ضابطہ تبدیلیاں کر لیں — میں کرتا انتظارِ انقلابِ آسماں کب تک

ہے غارتِ چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ — شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتا ہوں میں

مرے پاؤں زنجیر میں ہیں تو کیا ہے — مرا ہاتھ ہے انقلابِ چمن میں

آپ پوچھتے ہیں کہ اپنے یہ اشعار مجھے کیوں پسند ہیں؟ اس کا جواب بجز اس کے اور کیا دے سکتا ہوں کہ یہ میرے اشعار ہیں اس لئے مجھے پسند ہیں۔ اور شاید اس لئے بھی کہ "لوگ انھیں پسند کرتے ہیں۔"

(۳) اردو شعراء میں۔ میرؔ، غالبؔ، داغؔ، امیرؔ، جلالؔ، فانیؔ اور اقبالؔ مجھے پسند ہیں۔ اس پسندیدگی کا سبب ان کے شاعرانہ کمالات ہیں۔ اور ان کے مطالعہ سے اردو شاعری کی عظمت و اہمیت کا ادراک ہوتا ہے۔

(۴) میں بحیثیت شاعر بہت کم شعراء سے متاثر ہوا ہوں۔ ان میں فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی مرحوم اور مرزا غالبؔ اکبرآبادی مغفور کا تاثر سب سے زیادہ غالب رہا ہے۔

میری شاعری جن کتابوں کے مطالعے سے متاثر ہوئی ہے وہ زیادہ تر ادبی اور علمی کتابیں ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً میری نگاہ سے گزرتی رہیں۔ اور کچھ اُن شعراء کے دیوان ہیں جن کو میں پسند کرتا ہوں۔

شاعری، حالات اور ماحول سے بھی متاثر ضرور ہوتی ہے۔ لیکن بہت کم۔[۲] میری شاعری عصری حالات سے ہمیشہ متاثر ہوتی رہی ہے۔ اور میرا تمام کلام ان حالات کا آئینہ ہے جو مختلف ادوار میں رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی، اس دورِ انقلاب میں، میری کوئی غزل ایسی نہیں جس میں انقلاب کے ہر صحتی پہلوؤں کی ترجمانی نہ ہو۔

---

[۱] قارئین اپنی رائے خود قائم کریں گے لیکن شاید کم ہی ایسے ہوں جو مولانا کے اس فیصلہ سے اتفاق فرمائیں۔
[۲] مولانا کا یہ سوال واقعی پوچھنے کا ہے۔ دیکھئے جو یہ "شکوہ سرایانِ جور" کچھ جواب دیں بھی۔

میری شاعری عوام (لوگوں) سے کبھی متاثر نہیں ہوئی۔ یعنی سوسائٹی کا اثر میری شاعری پر کبھی غالب نہ ہو سکا۔ بلکہ میں نے ہمیشہ عوام پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ اور عوام میری شاعری سے متاثر ہوتے رہے۔

میں بہت مصروف ہوں اس لئے تفصیل کے ساتھ آپ کے خط کا جواب نہ دے سکا۔ اُمید کہ میرا یہ نامۂ مختصر آپ کے سوالوں کی ایک حد تک تسکین کر سکے گا۔

سیماب اکبر آبادی

ازجناب حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ[1]

محترمی۔ السلام علیکم۔ تاخیر جواب کی معافی چاہتا ہوں۔ دوران جنگ میں اشیا کی گرانی نے غیر مطمئن کر دیا ہے۔ بجواب استفسارات گزارش ہے اگر مجھ سے دریافت کیا جائے کہ ہندوستان میں بہ اعتبار سے کس شاعر کی منزلت ارفع ہے تو میں عرض کروں گا کہ امیرؔ مینائی کی۔

متقدمین میں میں میرؔ و مصحفیؔ غالبؔ و مومنؔ کا معترف ہوں بلکہ مقلد بھی۔ باعتبار نقاشی مناظرِ قدرت میر انیسؔ کا مرتبہ بلند ہے۔ تصنع میری فطرت کے خلاف ہے۔ جذبات محاکات واقعیت کے انداز میں نظم ہوں۔ دورِ حاضر میں۔ اصغرؔ و فانیؔ اور عزیزؔ مرحوم کو بہتر غزل گو سمجھا۔ حضرت ریاضؔ مرحوم اپنے رنگ میں بے مثل تھے۔ موجودہ شعرا میں جناب جلیلؔ، حسرتؔ موہانی، جگرؔ مراد آبادی، اثرؔ لکھنوی، صفیؔ لکھنوی۔ سیمابؔ اکبر آبادی، آرزوؔ لکھنوی، مرزا یگانہؔ اپنے اپنے رنگ میں ممتاز ہیں۔ نظم میں جوشؔ ملیح آبادی ہیں۔

متقدمین کے انتخاب اشعار بارہ کی قید سے معذور ہوں کس شعر کو انتخاب میں پیش کروں۔ کس کو نظر انداز کروں یہ انتخاب دشوار ہے۔ اگر آپ مجبور فرمائیں گے تو آئندہ بعد مطالعہ کلام پیش کر سکتا ہوں، اپنے اشعار پر بھی بالاستیعاب اس وقت نظر نہیں کر سکتا۔ تاہم جو یاد آگئے وہ پیشِ خدمت بغیر ترجیح ہیں ہر رنگ و مذاق کے اعتبار سے۔ اوپر پندرہ شعر نقل کر دیئے تین شعر آپ قلمزد فرما دیجئے۔ سرسری یاد کا انتخاب ہے ممکن ہے کہ اس سے بہتر اشعار مجموعہ کلام میں اپنی پسند کے ہوں۔ رعنائی حسن نے میرے جذبات شاعری کو سنوارا۔ فیضِ امیرؔ سے اعتبار الملک مشہور ہوا یہ ہے میری شاعرانہ زندگی۔

(اعتبار الملک) حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ خوشہ چین خرمن فیض امیرؔ مینائی

---

[1] جناب دلؔ کی اپنے استاد سے اس قدر عقیدت قابلِ داد ہے۔ امیرؔ مینائی مرحوم اس معاملہ میں ازحد خوش قسمت تھے، انکے تمام شاگرد انکے بیحد والہ و شیفتہ رہے اور ہیں چنانچہ زاہدؔ، آہؔ، ریاضؔ، جلالؔ آشیاں ہوئے جلیلؔ، ناطقؔ، دلؔ وغیرہم اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں۔

آغاز محبت سے انجام محبت تک — گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا
وقتِ رخصت تسلیاں دیکر — اور بھی تم نے بیقرار کیا
نہ وہ آرامِ جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ — اسی دھن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں
نارسائی کا سبب کیا ہے؟ یہی جوشِ طلب — بڑھ گئے ہم اس قدر آگے کہ رہبر رہ گیا
پہنچنے تک کھنچے کیا کیا امید و یاس کے نقشے — تلاطم میں تھی کشتی سامنے نظروں کے ساحل تھا
اسے قلق ہے مرا حالِ زار سن سن کر — یہ وقت تھا کوئی تدبیرِ چارہ جو کرتے
اک بے خبر ہوش کا عالم ہی جدا ہے — نالے ہیں نہ آہیں نہ اثر ہے نہ دعا ہے
بس انتہا ہے کہ سنگِ درِ حبیب سے ہم — بیان کرتے ہیں جو دل کا حال ہوتا ہے
اے احترامِ ساقیِ محفل سنبھالنا — لغزش ہوئی ہے ساغر و مینا لئے ہوئے
تقوے بھی آج ہوگیا قربان میکدہ — ہر جام میں بہار کے آثار دیکھ کر
بہار جام بکف جھومتی ہوئی آئی — شکستِ عہد نہ کرتے تو اور کیا کرتے
نظروں سے نہاں کیوں رہتے ہو جب جان لیا پہچان لیا — منشاء حجاب آخر کیا ہے تم کو تو خدا بھی مان لیا
ہوچکی برباد گو اے شمع پروانوں کی خاک — ذرہ ذرہ میں ہے پنہاں اک جہانِ زندگی
مرا حال تھا جہاں تک وہ ادا کیا زباں سے — جو کہیں گے اشکِ رنگیں وہ الگ ہے داستاں ہے
تا بلب آنے سے پہلے خود ہیں شکوے منفعل — حسن کی معصوم فطرت کو پشیماں دیکھ کر

دلؔ شاہجہانپوری

از جناب میرزا بیگانہ چنگیزی۔

سلام علیکم۔ عنایت نامہ مورخہ (×) وصول ہوا۔ جواباً عرض ہے کہ پہلے آپ اپنے سوالات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ کس قسم کے "بہترین اشعار" آپ کو مطلوب ہیں۔ انسان کی کیفیت نفسی بدلتی رہتی ہے۔ وقت بدلتا رہتا ہے۔ ماحول بدلتا رہتا ہے۔ سلسلۂ تغیر و انقلاب کے ساتھ ساتھ شعر کی بلکہ ہر چیز کی اضافی قدر و قیمت بدلتی رہتی ہے۔

(رباعی)

ہاں فکر رسا دیکھ بڑا بول نہ بول — گنجینۂ راز اندھی نگری میں نہ کھول
جس کی جتنی ضرورت اتنی قیمت — ہیرا کبھی کنکر ہے کبھی ہے انمول

بہترین اشعار سے آپ کی کیا مراد ہے۔ مردانہ و شریفانہ؟ یا جوانانہ و عیاشانہ؟ حکیمانہ و فلسفیانہ؟ یا جوشانہ و جگرانہ؟۔ محبت، عداوت۔ غصہ۔ نفرت۔ ولولہ۔ ہمت۔ فلسفہ۔ حکمت۔ انواع و اقسام

کے مضامین پر "بہترین اشعار" پیش کئے جا سکتے ہیں اور ان سب کی قدر و قیمت وقت اور ماحول کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ کیفیاتِ نفسی اور ماحول کے تحت شعر اثر ڈالتا ہے۔ لہٰذا آپ پہلے یہ سوچیں کہ کس قسم کے بہترین اشعار آپ کو مطلوب ہیں۔ جرأتؔ کے اشعار بھی بہتر سے بہتر موجود ہیں[1] جانؔ صاحب کے بھی۔ داغؔ کے بھی جگرؔ کے بھی۔ جوشؔ کے بھی۔ میرؔ اور غالبؔ کے بھی میرزا صائبؔ اور میرزا بیدلؔ کے بھی۔

آپ کے سوالات کا ذمہ داری کے ساتھ جواب دینے کے لئے پہلے سوالات کو سمجھنے کی ضرورت ہے اور بعد ازاں وقت کی۔ فی الحال اُردو زبان کی اک غزل آپ کو بھیجتا ہوں جس کے بارے میں دیانت و ذمہ داری کے ساتھ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دو سو برس کے اندر کسی نے ایسی غزل نہیں کہی[2] جو آرٹ کی جملہ خصوصیات کے ساتھ اتنی مکمل، جذباتِ صادق سے اتنی مملو، حکمت و دانش سے اتنی لبریز ہو۔ دو سو برس کے اُردو لٹریچر میں لاکھ دو لاکھ غزلیں ضرور ہوں گی۔ ان میں سے ہر ہر غزل کے ساتھ اس غزل کا جہاں تک مقابلہ کیا جائے گا۔ جس قدر پرکھی جائے گی اس کے جوہر کھلتے[3] جائیں گے۔ یہ سوال فضول ہوگا کہ اس غزل کا مصنف کون ہے؟

غزل

بہارِ زندگی نادان بہارِ جاوداں کیوں ہو	یہ دنیا ہے تو ہر کروٹ وہی آرامِ جاں کیوں ہو
خدارا میرے اور ان کے اور کوئی درمیاں کیوں ہو	پیمبر کیوں بنے آخر کسی کا رازداں کیوں ہو

---

[1]۔ مرزا صاحب سے یہ عرض کرنا ہے کہ ہم نے ان سے ان کی پسند کے بہترین اشعار مانگے تھے اب اگر اُن کو مردانہ و شریفانہ اشعار پسند تھے تو وہ لکھ بھیجتے اور جوانانہ و عیاشانہ پسند تھے تو وہ۔ یہاں سوال "ادب برائے ادب" کا نہیں تھا، صاف اور صریح طور سے "پسند" دریافت کی گئی تھی سو اگر مرزا صاحب کو جرأتؔ کے کچھ اشعار سب سے زیادہ پسند آئے تو انہیں اجازت تھی تحریر فرماتے۔

[2]۔ افسوس کہ ہم مرزا صاحب کی اس رائے سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتے، کیونکہ جس غزل میں "مرغے کی آذاں" اور "(　　) سے بہتر کیوں ہے ظالم" کے جیسے غیر شاعرانہ اور زبانِ غزل سے ہٹے ہوئے ٹکڑے موجود ہوں وہ اہلِ نقد و شعرائے گرامی کے نظروں میں سخت ترین تنقید کا سبب بن جائے گی۔ ہم اُن سے سفارش کریں گے کہ اسی زمین میں مرزا نوشہ غالبؔ کی غزل کو بے تعصب ہو کر ایک بار اور پڑھ ڈالیں۔

[3]۔ شاعر کو اجازت ہے وہ اشعار میں بڑائی بھی کر سکتا ہے چنانچہ میرؔ و غالبؔ و انیسؔ جیسے باکمالوں کے ہاں بھی اس کی مثالیں ملیں گی لیکن مرزا یگانہ نے نثر میں تعلّی کی جو بنا ڈالی وہ اہلِ نقد و صاحبانِ مذاقِ سلیم کو دعوتِ نظر دے رہی ہے۔

کبھی جلوہ دکھاتے ہو تو آئینہ در آئینہ
کھلا پردہ سہی، پھر بھی یہ پردہ درمیاں کیوں ہو؟

مرے دل میں سما کر دیکھ اپنے حسن کا عالم
کسی آئینہ خانے پر نگاہِ امتحاں کیوں ہو

کوئی ناگفتنی مطلب ہے ان نیچی نگاہوں کا
زباں تک آ نہیں سکتا تو آنکھوں سے بیاں کیوں ہو

گنہگارِ محبت کو اسی عالم میں رہنے دے
سزا واجب سہی لیکن بہشتِ جاوداں کیوں ہو

جلا پایا ایسے ویسوں کو جبھی تو ناک میں دم ہے
ہم ایسے خاکساروں کو نتپاؤ تو دھواں کیوں ہو؟

مرے ہوتے غریبوں کو ستانا اور پچھتانا ؟
تمھیں دردِ پشیمانی نصیبِ دشمناں کیوں ہو

جفا کو ہم وفا سمجھے، نہیں تو چل بسے ہوتے
مگر وہ پوچھتے کیا ہیں کہ تم اب تک جواں کیوں ہو

مزہ جب ہے کہ رفتہ رفتہ امیدیں پھلیں پھولیں
مگر نازل کوئی فضلِ الٰہی ناگہاں کیوں ہو

مرا دشمن خود اپنی موت، تو نے تو نہیں مارا
کوئی مردِ عمل جھوٹی خوشی پر شادماں کیوں ہو

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

یہ ناہموار ہی ہموار ہو جائے تو کیا کم ہے؟
زمیں سے جب نہیں فرصت، تو فکرِ آسماں کیوں ہو

ارے یہ کیا کہ چاہوں بھی تو حق سے پھر نہیں سکتا
خود اپنے ہاتھوں گمراہی کی کوشش رائگاں کیوں ہو

سمجھ میں کچھ نہیں آتا پڑھے جاؤں تو کیا حاصل؟
نمازوں کا ہے کچھ مطلب، تو پردیسی زباں کیوں ہو

کہیں رسمی عبادت روح کو بیدار کرتی ہے!
نمازِ بے عمل سے حقِ مذہب رائگاں کیوں ہو

اک آنکھیں ہیں کہ تکتی ہیں کسی کو ٹکٹکی باندھے
یہاں سر ہے نہ سودا ہے تو سجدوں کا نشاں کیوں ہو

کہاں بلبل کا یہ نغمہ کہ حال آ جائے عارف کو
بھلا اس وجد کے عالم میں مرغے کی اذاں کیوں ہو

تجھی سے اڑ چلے ہیں پر لگا کر خاک کے پتلے
خداوندا زمیں سے پست اتنا آسماں کیوں ہو

کہاں خواب و خیال اتنے حقائق ہر طرف جتنے
نگاہِ نارسا یہ نقدِ فطرت رائگاں کیوں ہو

(　　) سے بھڑکتا کیوں ہے ظالم ماجرا کیا ہے
تجھی میں چور ہے ورنہ یہ کھٹکا درمیاں کیوں ہو؟

میرزا یگانہ چنگیزی

ؔ مسلمان دن بھر میں ایک نہیں دو نہیں پانچ پانچ بار نماز پڑھتا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں جو مسلمان سے زیادہ عبادت کرتی ہو۔ پھر بھی خدا اوس کی نہیں سنتا، دنیا میں اوسے فلاح نہیں۔ دین کا حال خدا ہی جانے کہنے کو تو دن بھر میں پانچ پانچ بار نماز پڑھتا ہے اور دوسری قوموں سے نماز کے لئے جھگڑے فساد کرنے سے بھی باز نہیں آتا مگر باوجود اس کے وہ کچھ نہیں

سمجھتا کہ جو کچھ وہ پڑھتا ہے اوس کا مطلب کیا ہے اوس کا حاصل کیا ہے۔ جس زبان میں وہ نماز پڑھتا ہے اوس سے واقف ہی نہیں تو پھر یہ نماز کیا ہوئی؟ پردیسی زبان میں نماز پڑھنا ایسا ہی ہے جیسے طوطے کا قرآن پڑھنا! نماز کے لئے تو دل کی زبان چاہئے۔ سوچو اور سمجھو شاعر نے کیا کہا ہے؟[1]

از جناب فراقؔ گورکھپوری

اردو شعراء ماضی و حال کے وہ اشعار جو مجھے بہت پسند ہیں:-

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں	کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے	میرؔ
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں	تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں	میرؔ
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر	نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے	غالبؔ
سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ	خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے	"
بہاریں ہم کو بھولیں یاد اتنا ہے کہ گلشن میں	گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا	حسرتؔ
نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں	لگا کے آگ مجھے قافلہ روانہ ہوا	آتشؔ
جنوں پسند ہمیں کیا چھاؤں ہے ببولوں کی	عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی	ناسخؔ
دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو	بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے	ثاقبؔ
چل اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں	اگر دل بیٹھ جائیگا تو اٹھ آئیں گے محفل سے	"
ہر چند بگولا مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے	اک کیف تو ہے اک رقص تو ہے بیکار سہی برباد سہی	اکبرؔ الہ آبادی
زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں	کوئی صاحب نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو	یگانہؔ
کہاں وہم و گماں اتنے حقائق ہر طرف جتنے	نگاہِ نارسا یہ نقدِ فطرت رائیگاں کیوں ہو	چنگیزی
ہاتھ میں لے کے جامِ مے آج وہ مسکرا دیا	عقل کو سرد کر دیا روح کو جگمگا دیا	اصغرؔ گونڈوی
ولیؔ اس گوہرِ کانِ حیا کا واہ کیا کہنا	مرے گھر اس طرح آوے ہے جیوں سینے میں راز آوے	ولیؔ دکنی
تمام عمر اسی احتیاط میں گزری	کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو	محشرؔ لکھنوی
کیا ڈھونڈھتی ہے باغ میں میرے تو اے خزاں	تو جانتی ہے سب کے چمن میں بہار ہے	عبرتؔ گورکھپوری
نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ	کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں	اقبالؔ
سمجھیگا کون اس کا دردِ شورشِ کائنات میں	تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں	جوشؔ

---

[1] ۔ ہم صاحبانِ ذوق اور اہلِ نظر کو کم از کم اس ٹکڑے کی طرف تو ضرور متوجہ کرنیکی جرأت کریں گے کہ ”سوچو اور سمجھو شاعر نے کیا کہا،

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے — شاد عظیم آبادی

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات — جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے — فانی بدایونی

میرے وہ اشعار جو مجھے بہت محبوب و مرغوب ہیں :-

جو لانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں — منزل نہ کر حدودِ سے و نیا ہی نہیں

ابھی فطرت سے ہوتا ہے نمایاں شانِ انسانی — ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

حیات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل — کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

دیکھئے تو دیتا جائے کب تک آدم کا گناہ — دیکھئے اٹھتا ہے کب تک خونِ انساں سے دھواں

آج بھی ہے خاک اور خوں سے بنا انساں کا دل — آشنائے کینۂ یزداں، اہرمن کا رازداں

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اُٹھا — کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں — دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تو نے تو خیر بے وفائی کی

آج آنکھوں میں کاٹ لے شبِ ہجر — زندگانی پڑی ہے سو لینا

خیال کر تو خدا کیا ہے بس یہی دنیا — یہ اور بات کہ دنیا ہے آدمی کے لئے

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی — کہ مسکراتے ہوں جس طرح مندروں میں چراغ

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات — یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

مجھے مندرجہ بالا اشعار اس لئے پسند ہیں کہ میں شاعری کا مقصد سمجھتا ہوں حیات و کائنات کی طہارت و عظمت کا وجدانی احساس پیدا کرنا۔ اس ذریعہ سے شاعر اور اس کے سامعین کی زندگی میں طہارت و عظمت پیدا ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں یہ احساس کارفرما ہے[1] میں اخلاق و عملی و عقلی علم سے اس وجدانی احساس کا مرتبہ بلند سمجھتا ہوں۔ بلکہ اخلاق، عمل اور ادراک کو لطیف بنانے اور سنوارنے میں تخیلِ انسانی کی یہ تہذیب (Culture of Imagination.) بہت معاون ہو سکتی ہے۔ شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ اخلاق سے زیادہ با اخلاق ہیں۔

یوں تو اردو کے سینکڑوں شعرا ہیں جن کے یہاں کچھ جواہر پارے مل جاتے ہیں لیکن میں میرؔ کو ان سب سے بڑا مانتا ہوں رائے عامہ کی بنا پر نہیں بلکہ پوری سوجھ بوجھ کی

---

[1] ہم نہایت ادب سے جناب کیفیؔ اور مرزا یگانہؔ چنگیزی کو اس طرف متوجہ کرنے کی جرأت کریں گے۔

بنا پر۔ کبھی کبھی مجھے بھی یہ شبہ ہوا ہے کہ اقبال، میر سے بڑے ہیں لیکن میرا دل ہی نہیں دماغ بھی پھر میر ہی کی طرف جھک جاتا ہے۔ کیوں کہ میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میر کا شاعرانہ شعور اقبال کے شاعرانہ شعور سے بلند تر ہے۔ اور میر حقائق کے شاعرانہ و وجدانی مرکز سے قریب ترہے[1]۔ میرے نزدیک میر، غالب، اقبال، انیس، نظیر اکبر آبادی، آتش، یگانہ، حسرت، جوش ملیح آبادی اُردو کے سب سے بڑے شعرا ہیں۔ آدھے درجن نام اور جوڑے جاسکتے ہیں لیکن وہ سب مندرجہ بالا مشاہیر کے بعد آئیں گے۔

میری شاعری کو متاثر کرنے میں اُن رجحانات و تاثرات نے سب سے زیادہ حصّہ لیا جن کا احساس مجھے بچپن ہی سے ہوتا تھا۔ جس آواز کی نَے پہلے پہل میرے دل میں بیٹھی وہ میرے والد مرحوم عبرت گورکھپوری کے کلام کی آواز اور اس کا لب و لہجہ تھا۔ پھر ہندو تہذیب کی نرمی طہارت اور کائنات سے اس کی ہم آہنگی کے احساس نے میرے مزاج شاعری کی تعمیر میں مدد دی۔ اُردو شعرا میں سب سے مستقل اور اہم اثر مجھ پر اور میری شاعری پر میر کا ہے۔ لیکن استفادہ میں نے سب سے کیا ہے۔ اقبال، غالب، آتش، اصغر، شاد عظیم آبادی، یگانہ، حسرت، امیر مینائی، حالی، عزیز، مومن، داغ، جگر، فانی کے کلام کا قدرداں ہوتے ہوئے بھی اسی طرح انیس، اور چکبست کا مرتبہ شناس ہوتے ہوئے بھی اپنی شاعری میں ان کے کلام کا اثر میں نہیں لے سکا چونکہ ان کے کلام کا مزاج دوسرا ہے۔ انگریزی ادبا میں ورڈس ورتھ اور کیٹس کا میری شاعری پر بہت اثر ہے اور شیکسپیر کے وسعتِ نظر سے مستفید ہونے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ حافظ اور دیگر فارسی شعرا کے اثرات کو بھی جذب کرنے کی طرف مائل رہا ہوں۔ سنسکرت فلسفہ اور قدیم وجدید مغربی فلسفہ اور عام طور پر دنیا بھر کے قدیم و جدید کلچر سے مستفید ہونا میرا محبوب مشغلہ رہا ہے۔

فراق گورکھپوری

ازجناب علی اختر صاحب

صدیقی المکرم۔ تسلیمات۔ یادآوری کا شکریہ قبول فرمائیے۔ میں آج کل پریشان ہوں، ادھر آپ عجلت فرما رہے ہیں۔ اس لئے جس طرح بن پڑے گا آپ کے سوالوں کا جواب ادا کروں گا:-

۱۔ دوسروں کے بہت سے اشعار ہیں جو مجھے کبھی پسند تھے اور اب بھی پسند ہیں۔

---

[1] جناب فراق نے یہ سطور لکھ کر صرف اپنی ہی نہیں، ایک مخصوص طبقہ کی ترجمانی کی ہے۔

لیکن آپ صرف (۱۲) اشعار چاہتے ہیں، اس لئے یوں سمجھئے کہ حسب ذیل اشعار میری پسند کے ہیں:

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند ۔ یعنی رات بہت جاگے تھے صبح ہوئی آرام کیا ۔ میرؔ

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے ۔ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے ۔ "

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے ۔ بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے ۔ غالبؔ

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا ۔ کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر ۔ "

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد ۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے ۔ حسرتؔ موہانی

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا ۔ دیوانے یہ ہوش نہیں ہے یہ تو ہوش پرستی ہے ۔ فانیؔ

فنائے ذات نام ہے لطافتِ حیات کا ۔ غبارِ راہ کارواں ہے کارواں لئے ہوئے ۔ "

اب تک نہ خبر تھی مجھے اجڑے ہوئے گھر کی ۔ تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا ۔ جوشؔ

ہنستا ہے عشق مجھ کو گرانبار دیکھ کر ۔ زندانِ آب و گل میں گرفتار دیکھ کر ۔ یگانہؔ

نظم عبودیت پڑھی میں نے کچھ ایسے لحن سے ۔ ہنس کے رباب اٹھا لیا نغمہ زنِ الست نے ۔ جوشؔ

ہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی ۔ نقاب اٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی ۔ جگرؔ

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں ۔ محبت کا زمانہ آ رہا ہے ۔ "

۲۔ اس سوال کا جواب فی الحقیقت نہایت مشکل ہے، ۳۰، ۳۵ برس سے شعر کہہ رہا ہوں نہ جانے کتنے شعر کہے ہیں اور کس کس عالم میں کہے ہیں، بہت سے اشعار ایسے ہیں جن کے ساتھ کچھ "اسرار درون پردہ" بھی ہیں، جی چاہتا ہے کہ یہ سب اشعار لکھ دوں اور ان واقعات کو بھی دہراتا چلا جاؤں، ہائے جوانی! بہرحال بلا غور و فکر جو اشعار یاد آ رہے ہیں وہ لکھ رہا ہوں:-

فصلِ گل کیا، زندگی کا اک تصور تھا جسے ۔ رنگ و بوئے کارواں در کارواں سمجھا تھا میں

بہ قدرِ ظرفِ جنوں حسنِ آب و گل پایا ۔ کسی کو درد ملا اور کسی نے دل پایا

مجھے دی ہے طاقتِ دید اگر تو یہ اہتمامِ حجاب کیا ۔ میں نظر کو کیسے فریب دوں کہ یہ تیری جلوہ شناس ہے

حیران ہیں اہلِ فکر و نظر برہم ہے نظامِ ہوش و خرد ۔ یہ شانِ تصور ہے جس کی وہ فتنۂ دوراں کیا ہوگا

عقل ہے پھر حریفِ عشق اب یہ بساط الٹ نہ دو ۔ پردہ اٹھا کے آ نہ جاؤ عالمِ امتیاز میں

کھیل ہے اس کا جو لوٹ نہ جائے ۔ بیت ہی جائیں گے یہ ہجر کے دن

ہنستی ہوئی کلیوں کے رُخ سے اٹھے جو تبسم کے پردے ۔ عبرت ہی کا اک عالم دیکھا حسرت ہی کی اک تصویر ملی

زندگی کیا ہے جو دل ہو تشنۂ ذوقِ فنا ۔ یعنی یہ پردہ تو اٹھ سکتا ہے آسانی کے ساتھ

غم فنا سے بیاعیش جاوداں میں نے   متاع عشق کو اتنا کیا گراں میں نے
بساط ہوش سے تا جلوہ گاہ مستیٔ و کیف   تجھے تلاش کیا ہے کہاں کہاں میں نے
وسعتِ کونین سے آگے نکل آیا ہے عشق   اب تنگ طرفی نظر آتی ہے دنیا ہو کہ دیں
تدبیر کی نبضیں ڈوبی ہوئی، تعمیر کے اجزا بکھرے ہوئے   دنیا سے کوئی پوچھے اختر آب اور پریشاں کیا ہوگا

۳۔ اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں سب سے پہلے مجھے اقبال، نادر اور چکبست کی نظموں نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ غزل گو حضرات میں مولانا حسرت موہانی اور جناب فانی مرحوم مجھے پسند تھے، فانی عمر میں مجھ سے دس سال بڑے تھے اور حسرت اس سے کچھ زیادہ۔ متقدمین میں میر، خواجہ میر درد، قائم اور غالب میری پسند کے شاعر ہیں معاصرین میں جوش، اختر لکھنوی جگر، اصغر، یگانہ اور حفیظ کی شاعرانہ شخصیتوں کا مجھے اعتراف ہمیشہ رہا ہے۔ نوجوانوں میں ساغر کا ذہن رسا اور ماہر القادری کی رعنائی گفتار اور سادگی، احسان کا انداز فکر اور دردمندی بھی بھولنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ اور کوئی شک نہیں کہ روش صدیقی، اختر شیرانی، مخدوم شاہد صدیقی، حسرت ترمذی، تسنیم مینائی اور وجد بھی اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ دکن اور پنجاب کے بہت سے نوجوان شعرا کی میں دل میں عزت کرتا ہوں، یہ لوگ بہت جلد ایک خاص منزل تک پہنچ کر رہیں گے۔[1]

شعر و ادب کا ماحول میرے گھرانے میں ہمیشہ رہا ہے۔ والد مرحوم بھی شاعر تھے اور میرے چچا بھی شاعر ہیں۔ حضرت والد مرحوم نے جناب داغ اور حضرت امیر دونوں سے استفادہ کیا تھا۔ میرے چچا داغ مرحوم کے شاگرد ہیں۔

مگر اس کے باوصف کہ میں جناب داغ اور حضرت امیر کو بڑے درجہ کا شاعر تسلیم کرتا ہوں اور میرے دل میں ان کا وہی احترام ہے۔ جو ان کے مرتبوں کے لحاظ سے ہونا چاہئے مگر میں بالطبع ان کے اصول شعر کی جانب مائل نہ ہو سکا۔ کچھ تو اس لئے کہ میرے زمانۂ طفلی ہی سے نظم اردو کی بساط قدیم پر تغیر اور انقلاب کے آثار نمایاں ہو چلے تھے اور کچھ میری فطرت شروع ہی سے کسی نئے اور وسیع میدان کی جانب نگراں تھی۔ مجھ پر ابتداءً یعنی (زمانۂ تعلیم) فارسی میں بیدل اور اردو میں غالب کے انداز تخیل کا بڑا گہرا اثر تھا لیکن جیسے جیسے

---

[1] جناب علی اختر کا جذبۂ ہمت افزائی قابل داد ہے۔

وقت گزرتا گیا اور میری نظر زندگی کے آثار کو سمجھنے کے قابل ہوئی تو میری فطرت شاعرانہ بھی بیدار ہوتی چلی گئی۔ اور میں خود اپنا ایک راستہ نکالنے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ میری تعمیر میں بعض انگریزی شعرا کا بھی ہاتھ ہے جن میں ورڈس ورتھ شیلے اور کیٹس سے میں بہت متاثر رہا ہوں گوئٹے کے "فاوسٹ" اور دانتے کی "ڈوائن کومیڈی" اور انگریزی کے ہر طالب علم کی طرح ملٹن کی تصنیفات بھی مدت تک میرا سرمایہ غور و فکر رہی ہیں میری زندگی میں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا تھا جو ممکن ہے آپ کو بھی پیش آئے۔ بہرحال اس واقعہ نے درد اور لذت درد کے حقیقی اور افسانوی تخیل کو میرے سینے میں پیدا کر ہی دیا۔ اور یہیں سے میں ایک مستقل شاعر کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔ آپ اس واقعہ کو سن کر کیا کریں گے۔

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا، بہرنہم نیاز اس کا یقین کرنا نہیں چاہئے کہ میرا دل کبھی محبت کی کسک سے بھی آشنا رہا ہے۔ بچپن میں مارہرے اور سندیلے کے شاعروں علیگڈھ اور مین پوری کی شعر و سخن کی صحبتوں میں اپنے بزرگوں کے ہمراہ مجھے بھی شرکت کے موقع ملتے رہتے تھے۔ جنھوں نے میرے سینے میں دبی ہوئی چنگاریوں کو اکسایا اور ہوا دی ہے میں نے فن شعر میں تین ابتدائی غزلوں کی حد تک جناب نواب ناظم علیخاں صاحب شاہجہاں پوری سے مشورہ کیا ہے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب "زبان" کے نام سے ایک رسالہ مرحوم شاہجہاں پور سے نکال رہے تھے۔ میرے والد مرحوم سے ان کے خاص تعلقات تھے اور میں انھیں چچا کہتا تھا، میرے خیال میں آپ کے ارشاد کی تعمیل ہوگئی، اور اگر کچھ رہ گیا ہو تو میرے موجودہ حالات کے لحاظ سے رہنے ہی دیجئے۔ کیا آپ بھی مجھ پر رحم نہ فرمائیں گے۔

علی اختر

لے۔ ہم اہل ذوق سے سفارش کریں گے کہ وہ وسیع و منتخب مطالعہ کے اثرات و آثار کی تلاش حضرت اختر کے دیوان "انوار" اور دیگر کلام میں کریں۔ جناب اختر کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے یورپ کے باکمالان شاعری سے پورے استفادہ کی کوشش کی ہے اور یقین ہے کہ اس کیلئے ان کو بے حد محنت و مطالعہ کی ضرورت پڑی ہوگی۔ لیکن ترجمہ پھر ترجمہ ہے وہ انگریزی ہی میں کیوں نہ ہو کاش وہ لاطینی اور جرمن بانیوں کا بھی جائزہ لیتے

از جناب حکیم جگر صدیقی وارثی بسوانی

جناب معتمد صاحب۔ تسلیم۔ اپنی پسند کے اشعار پیش کرتا ہوں لیکن شعر کی تشریح شعر کی توہین سمجھتا ہوں حکیم جگر صدیقی وارثی بسوانی کے بارہ اشعار کی تشریح و تنقید ناظرین کرام پر منحصر ہے

پڑے ہیں تو پڑے رہنے دو میرے خون کے دھبے   تمھیں دیکھیں گے سب محشر میں داماں کون دیکھیگا

بال بکھرا کے سرِ شام نکلنے والے   ہو مبارک دلِ عالم کو پریشان کرنا

ذرا نگاہ ملا کر ہمیں بتا دیتے   کہاں حضور گئے تھے کہاں سے آتے ہیں

تم کو ہنستا ہو رقیبوں سے مبارک لیکن   نظر انداز نہ ہو دیدۂ گریاں اپنا

تمھیں ظالم کہے سارا زمانہ   مگر ہم کیا کہیں اپنی زباں سے

دمِ نزع سب آئے اپنے پرائے   خدا جانے وہ دیکھنے کیوں نہ آئے

جہاں سنئے ہمارا قصۂ غم لوگ کہتے ہیں   مگر ہم سے نہیں سنتا ہماری داستاں کوئی

ہماری قبر سے چن لیجئے پژمردہ گل کوئی   نشانی کچھ تو لیتے جائیے گورِ غریباں سے

آج وہ کہہ دیجئے جو کچھ ہے دل میں آپ کے   آج وہ سن لیجئے جو کچھ ہمارے دل میں ہے

کوئی آیا ہے تو بیٹھے کوئی اٹھ جائے تو جائے   اُن کی محفل میں کسی کا نہیں پرساں کوئی

اچھے جمال والوں کو اچھی جگہ ملی   کعبے سے بُت نکل کے مرے دل میں آگئے

ہمارے دل کے ستانے والوں میں ہو رہی ہیں باہم صلاحیں   کچھ آسماں ان سے کہہ رہا ہے وہ کہہ رہے ہیں کچھ آسماں سے

ہوئے برباد عشق میں ہم مٹے ہوئے حسن پر ہمیں ہیں   جگر کو کیا جانتے نہیں تم جگر ہمیں ہیں جگر ہمیں ہیں

شعرائے ماضی و حال کے جو اشعار مجھے بیحد پسند ہیں درج کرتا ہوں۔

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے   ہم رات کو اٹھکر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے   میر

ترے در پہ اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا   کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا   مصحفی

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا   زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے   آتش

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے   کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں   غالب

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے   اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے   ذوق

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے   ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہونگے   مومن

ساغر ہمارے ساتھ لب آبجو پیو   تنہا جو مے پیو تو ہمارا لہو پیو   اسیر

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں   میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں   امیر مینائی

ہماری لغزشِ پا میں طواف کعبہ ہے ۔۔۔ پیئے ہوئے درِ پیرِ مغاں سے آتے ہیں ۔۔۔ ریاضؔ

وہ جو روش بھی تو مسجد میں تھا خدا جانے ۔۔۔ نماز کس نے ادا کی ہوئی قضا کس کی ۔۔۔ آصفؔ

۳۔ شعرائے اُردو میں بہت سے کامل فن حضرات موجود ہیں جن کی شاعری پر ادبِ اُردو کو ناز ہے۔ حضرت صفیؔ لکھنوی مدظلہٗ نے خداداد با اثر طبیعت پائی ہے ساٹھ برس کی مشق کامل حاصل ہے اور آپ گذشتگان گرانمایہ کے بنائے ہوئے راستے سے سرمو تجاوز نہیں فرماتے۔ امام الفن جلیل القدر حضرت جلیلؔ فصاحت جنگ شاعر کامل ہیں اور دوران انحطاط عمر میں آپ کی شاعری جوانی کے نور سے مزین ہو رہی ہے۔

حضرت نوحؔ رئیس نارہ فصیح الملک حضرت داغؔ مرحوم کے شاگرد رشید ہیں اور اپنے استاد کے ہمخیال با اثر شعر کہنے پر قادر ہیں۔

حضرت ضمیر حسن خاں دلؔ امیرؔ مینائی کے شاگرد ہیں۔ بیحد زوردار طبیعت پائی ہے

حضرت سیمابؔ وارثی مدیر شاعر آگرہ واجب التعظیم حامیٔ زبان اُردو ہیں اور اُستاد کامل کہے جانے کے مستحق ہیں۔

۴۔ ابتدائے عمر سے طبیعت شاعری کی طرف مائل ہوئی میرے والد مرحوم شیخ امیر علی جزاؔ خواجہ آتشؔ مرحوم کے شاگرد تھے مرحوم کی شاعری سے میں بیحد متاثر ہوا آپ کے کلام سے خواجہ آتشؔ کا رنگ نمایاں ہے دو شعر میں لکھتا ہوں۔ سہ

بنے تھے خاک سے بارِ گراں اُٹھا نہ سکے ۔۔۔ خدا کے بندے تھے جو رنباں اُٹھا نہ سکے ۔۔۔ جزاؔ

ہمارے پاس جو یوسف کو بیچنے لائیں ۔۔۔ وہ مول دیں کہ جسے کارواں اُٹھا نہ سکے ۔۔۔ "

نامور گزشتگاں مثل میرؔ۔ مصحفیؔ۔ آتشؔ۔ مومنؔ۔ اسیرؔ۔ رندؔ۔ امیرؔ۔ داغؔ حضرات کے ہزارہا شعر ہر وقت ورد زبان رہے۔ راجہ نوشاد علیخاں نوشادؔ مرحوم رئیس جہانگیر آباد جن کی رگ رگ میں سخن سنجی کا خون موجزن تھا برسوں اُن کے ساتھ رہا ۱۸۹۲ء میں رامپور جاکر خدائے سخن حضرت امیرؔ مینائی رحمۃ اللہ علیہ کا شاگرد ہوا استاد مرحوم کے فیض نے مجھے خاک سے پاک کردیا اور مجھے یہ کہنے کی جرأت ہوئی۔ سہ

باریابی جو ہوئی بزمِ سخن میں حاصل
یہ جگرؔ فیضِ امیر احمد مینائی ہے

آپ کا دعاگو
حکیم جگرؔ صدیقی وارثی بسوانی

از جناب مسعود علی صاحب محوی

عزیزی سلمکم اللہ تعالیٰ۔

آپ کا عنایت نامہ مطبوعہ مجھے ملا۔ جو سوالات آپ نے اس میں کئے ہیں اگر وہ فارسی گو شعرا اور ان کے اشعار کے متعلق ہوتے تو شاید میں بہتر جوابات دے سکتا۔ بہرحال اردو گو شعرائے ماضی یا حال کے جو اشعار اس وقت ذہن میں ہیں اور جنھیں میں عمر کے اس حصہ میں پسند کرتا اور پڑھتا رہتا ہوں وہ یہ ہیں۔

کل ہم آئینہ میں رُخ کی جھریاں دیکھا کئے	کاروانِ عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کئے	صفی
ہم نبرکسہ میں بس اب کرے زیارت مجنوں	سر پہ پڑتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو	ذوق
نفس کی آمد و شد ہے نماز اہلِ حیات	جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو	〃
لیتے ہیں ثمر شاخ ثمرور کو جھکا کر	جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ	〃
یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے	زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے	〃
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک	میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا	غالب
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں	مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں	〃
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد	یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے	〃
ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے	کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا	میر
اب تو جاتے ہیں میکدہ سے میر	پھر ملیں گے اگر خدا لایا	〃
شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ	یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا	〃
ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں	تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں	سودا
انہا عیش جہاں کی جو تو دیکھا چاہے	بزمِ مستاں پہ نگہ غور سے کر آخر شب	〃
خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی	خبر ہے نعش پہ اس بیوفا کے آنے کی	مومن

یہ کہنا کہ جو اشعار میں نے اوپر لکھے ہیں وہ ان شعرا کے بہترین اشعار ہیں شاید صحیح نہ ہو کیونکہ اگر انکا کل کلام دیکھا جائے تو ممکن ہے کہ ان سے زیادہ تر بہتر اشعار نکل آئیں۔ مجھے جو پسند اور ذہن میں تھے وہ لکھ دئے ہیں[1]۔ یہ بتانا کہ وہ کیوں مرغوب اور پسند ہیں۔ نفسیات اور اصول بلاغت و فصاحت کی باریک مباحث میں داخل ہونا ہے جس کے لئے کثیر فرصت کی ضرورت ہے۔ ہر انسان کی ذہنی حالت عمر کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے جو اشعار (اور اشعار پر کیا منحصر ہے ہر شئے) بچپن

[1] جناب والا نے بالکل صحیح ارشاد فرمایا۔ دراصل یہی ہمارا مطلب بھی تھا۔ اس جواب سے غالباً جناب نے یہ نکالا ہے کہ تو ہمارا سوال سمجھنے میں آسانی ہو۔

اور جوانی میں مرغوب ہوتے ہیں وہ عام طور سے زندگی کے اخیر حصّوں میں زیادہ مرغوب نہیں رہتے۔ اس سے آپ کو سوالات نمبر (۱) اور (۲) کا جواب مل جائے گا۔

سوال نمبر ۳ کا جواب یہ ہے کہ میں متقدمین کو چھوڑ کر متوسطین میں سودا کو تمام اصناف شعر پر قادر ہونے کی وجہ سے سب سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد میرؔ ہیں، غالبؔ ہیں مومنؔ ہیں دردؔ ہیں آتشؔ ہیں ذوقؔ ہیں۔ حالیہ اور جدید طرز کے لکھنے والوں کے امام مولانا حالیؔ مرحوم ہیں۔ اپنے رنگ میں اکبرؔ مرحوم ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور انقلابی شعرا میں جوشؔ ملیح آبادی کا کلام میں پسند کرتا ہوں۔ چونکہ میں زیادہ تر فارسی لکھتا ہوں اس لئے سوال نمبر (۴) کا تعلق مجھ سے نہیں جب کبھی اردو لکھتا ہوں اس میں مولانا حالی کی اتباع کی کوشش کرتا ہے۔

چونکہ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو جواب کس پتہ سے دیا جائے، اس لئے نظام ادب کے پتہ سے یہ خط بھیجا جاتا ہے۔ والسّلام

مخلص۔ مسعود علی (بی۔ اے) علیگ سابق سشن جج

از جناب رضا علی وحشتؔ — جواب سوالات

(۱) ذیل کے اشعار مجھے خاص طور پر پسند آئے

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نجائے گا — میرؔ

اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے — لوح مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے — دردؔ

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو — غالبؔ

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے — تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پہ — ؍

تاب نظارہ کہاں آئینہ کیا دیکھنے دول — اور بنجائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے — مومنؔ

نہ آیا ڈر سے تیرے پاس کوئی نیچا نوں کے — مگر رونا کبھی چوری سے بعد از نیم شب آیا — ذوقؔ

خود نویدِ زندگی لائی قضا میرے لئے — شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے — انیسؔ

نظر کر دیدۂ مشتاق پر یا دیکھ آئینہ — تجھے بھی کچھ خبر ہے تجھ میں کیا عالم نکلتا ہے — داغؔ

انگور میں تھی یہ مئے پانی کی چار بوندیں — جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہوگئی ہے — اکبرؔ

رہی اے گل سبک روحوں کو تیری جستجو برسوں — پھرا کی کو بکو پیراہن یوسف کی بو برسوں — امیرؔ

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم — ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے — حالیؔ

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ — صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا — اقبالؔ

(۲) اپنے بارہ اشعار

پتا ملتا نہیں جنس وفا کا اب زمانے میں
کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے[1]

مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے ہم بیان کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے

حرم کیا دیر کیا یکساں کشش تھی سارے عالم کی
خدائی جمع ہوتی خود نمائی تم جہاں کرتے

نگاہیں پڑتی ہیں مجھ پر بھی اے ترے صدقے
تری نگاہ نے کیا کر دیا ہے کیا سے مجھے

اس دلنشیں ادا کا مطلب کبھی نہ سمجھے
جب ہم نے کچھ کہا ہے وہ مسکرا دئے ہیں

کبھی جو دیکھتے تھے خواب ہم جمعیتِ دل کے
وہ اب نذرِ خیالاتِ پریشاں ہوتے جاتے ہیں

کریگا کون کس کا رشک بزمِ جانفروشاں میں
سبھی محوِ جمالِ روئے جاناں ہوتے جاتے ہیں

بزمِ اغیار میں معذور نہ تھے وہ وحشت
بات اگر کر نہیں سکتے تھے، اشارا کرتے

یقیں نامرادی پر بھی حالت ہے وہی دل کی
تمھیں سے چاہتا ہوں داد اپنی سعیٔ باطل کی

چشم کو میں نے ہر سو نگراں دیکھا ہے
نہیں معلوم ترا جلوہ کہاں دیکھا ہے

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمعِ انجمن کے لئے

تیری بیگانہ خوئی پردہ دارِ رازِ الفت تھی
کیا وحشت کو رسوا جب نگاہِ آشنا ڈالی

(۳) فہرستِ شعرائے اردو علیٰ قدرِ مراتب

(۱) ولیؔ (۲) میرؔ (۳) سوداؔ (۴) دردؔ (۵) غالبؔ (۶) مومنؔ (۷) ذوقؔ (۸) انیسؔ (۹) داغؔ۔
(۱۰) امیرؔ (۱۱) حالیؔ (۱۲) اقبالؔ۔

(۴) اثرات

(۱) ذیل کے شعراء کے کلام نے خاص طور پر اثر ڈالا

(۱) میرؔ۔ (۲) غالبؔ۔

(۲) حالات۔ جب میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں طالب العلم تھا تو ایک مدرس (مولوی خلیل احمد ام۔ اے مرحوم) اساتذہ کے اشعار لکھایا کرتے تھے۔ میں اِن اشعار سے لطف اندوز ہوتا تھا رفتہ رفتہ خود کہنے کا شوق پیدا ہوا۔

(۳) مرزا احمد علی بیگ کوکبؔ مرحوم جوتیاں دہلوی کے بیٹے تھے۔ اور تپش دہلوی (شاگرد خواجہ میر دردؔ)

---

[1] جناب وحشت کا یہ شعر ایک لطیف طنز کی معراج معلوم ہوتا ہے۔

کے پوتے کلکتہ میں مقیم تھے۔ ان کی صحبت اور حضرت استاد ابو القاسم محمد شمس مرحوم ابن خان بہادر
عبد الغفور نساخ کی چشم عنایت نے مجھے فن شعر کی طرف خاص طور پر مائل کیا۔

کلکتہ ۱۱ فروری ۴۳ء رضا علی وحشت

از جناب اختر شیرانی

مکرمی، تسلیم۔ آپ کے سوالات کے جوابات علی الترتیب درج ذیل ہیں۔

ساعد سیمیں دونوں اسکے ہاتھ میں لے کر چھوڑ دئے   بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا   میر تقی
آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو   ہے بوالہوسی پر بھی ستم ناز تو دیکھو   مومن
انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا   اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی   غالب
جنوں پسند ہے مجھ کو ہوا بگولوں کی   عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی   ناسخ
زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا   بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے   آتش
خیال خاطرِ احباب چاہیے ہر دم   انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو   انیس
ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار   ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار   نامعلوم
جلوہ دیکھا تری رعنائی کا   کیا کلیجہ ہے تماشائی کا   داغ
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط   الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا   حالی
یہ کہہ گئی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی   زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی   آصف
جو نقش ہے ہستی کا دھوکا نظر آتا ہے   پردے پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے   اصغر
بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا   مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا   فانی

(۲) مجھے اپنے بارہ سے زیادہ اشعار پسند ہیں۔ فرمائش کی تعمیل میں صرف بارہ درج کرتا ہوں لیکن
یہ نہیں بتا سکتا کہ مجھے یہ اشعار کیوں پسند ہیں۔ شائد اس لئے کہ میرے ہیں۔ ؎

ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی لیکن   یہ سیلِ نور، ستم ہے شراب ہو نہ سکا
حاصلِ عمر ہے شباب مگر   ایک ہی وقت ہے گنوانے کا
دل میں خیالِ نرگسِ مستانہ آگیا   پھولوں سے کھیلتا ہوا دیوانہ آگیا
جو مذاقِ دل نہ بدل سکا تو نظامِ دہر کا کیا گلہ   وہی تلخیاں ہیں ثواب میں، وہی لذتیں ہیں گناہ میں
الزامِ پارسائی نہ آئے شباب میں   جو پارسا ہوں وہ میرے حق میں دعا کریں
شبِ وصل کی بیخودی چھا رہی ہے   کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں

ترے خیال کی بیتابیاں، معاذ اللہ | کہ ایک بار بھلاؤں تو لاکھ بار آئے
پارسائی کی جوانمرگی نہ پوچھ | توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھاگئی
عشق کہ جس کے دین میں صبر و سکوں حرام ہے | ایک نظر کا کام ہے ایک اثر کا نام ہے
توبہ بھلائے دیتی تھی پیرمغاں کا گھر | اٹھ کر بتادیا ہمیں ابرِ بہار نے
اُن رس بھری آنکھوں میں حیا کھیل رہی ہے | دو زہر کے پیالوں پہ قضا کھیل رہی ہے
اس کے عہدِ شباب میں جینا: جینے والو تمھیں ہوا کیا ہے؟

(۳) اردو شاعروں میں (بحیثیت مجموعی) کوئی شاعر پسند نہیں ہے۔ میر، غالب اور مومن کے ہاں بیشتر اشعار پسندیدہ ہیں۔

(۴) میری شاعری کو متاثر کرنے میں، اردو کے "شاعروں"، "کتابوں"، "لوگوں" کا بہت کم حصہ ہے۔ البتہ "حالات" کا اثر ناگزیر تھا ع دلِ من پیرِ تعلیم است و من طفلِ زباندانش!

بنابریں، اگر کہیں "حضرت دل" مل جائیں تو انھی سے اس سوال کا جواب حاصل کیجئے[1] ع

میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے!

والسلام۔ مخلص اختر شیرانی

ازجناب ماہرالقادری

عزیز محترم۔ اسلام علیکم! گرامی نامہ وصول ہوا، آپ کے سوالات کا جواب دیدیا ہے، اس سے زیادہ نہ اختصار ممکن ہے اور نہ وضاحت:

میں بحمد اللہ خیریت سے ہوں، اور "پائے رفتار" گردشِ تقدیر کا ساتھ دے رہا ہے۔

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

(۱) میں مندرجہ ذیل اشعار اکثر تنہائی میں گنگناتا ہوں، یہ مجھے بہت محبوب ہیں:۔

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں | گُل سے بھی ہوسکی نہ گریباں کی احتیاط | خواجہ میر درد
اک موج ہوا پیچاں اے میر! نظر آئی | شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی | میر تقی
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے | کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور | غالب
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے | ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو | "
میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے | تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی | مومن

---

[1] ہم جناب اختر شیرانی کو کیونکر بتائیں کہ جب یہ حضرت دل مل جاتے ہیں تو سوائے آہ و نالے کے درسے سوالوں کے جواب میں گونگے بنجاتے ہیں۔

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو — کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا — امیر مینائی

مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے — چمن اڑ گئے آندھیاں آتے آتے — داغ

بہت باریک ہیں واعظ کی چالیں — لرز اٹھتا ہے آوازِ اذاں سے — اقبال

آپ نے عہد کیا ہے مری غمخواری کا — اب اجازت ہو تو یہ عہد مجھے یاد رہے — فانی

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا — نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا — یاس

اے شمع! تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح — میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح — ناطق لکھنوی

تیرے غم کا تو کیا بدل ہوتا — مے و مینا سے دن گزارے ہیں — تسنیم مینائی

بہار آئی ہے اور آتی رہے گی — مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں — جلیل رامپوری

اور ہاں! آتش لکھنوی کا یہ مصرع تو اکثر وردِ زباں رہتا ہے:-

ع "دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوئے دوست"

(۲) اچھے اشعار، شاعر کے لختہائے جگر اور خونِ دل کے قطرے ہوتے ہیں، اس بات کا انتخاب مشکل ہے کہ جگر کا کونسا ٹکڑا اور دل کے لہو کی کونسی بوند زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے، آپ کے سوال نے بڑی کشمکش میں ڈال دیا ہے، بہرحال آپ کی ذہانت اور شوخیٔ طبع کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے منتخب اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں:-

ایک اک گام پہ دنیا مجھے ٹھکراتی ہے — مجھ کو اس زحمتِ بیجا پہ ہنسی آتی ہے

میرے جہانِ دل کو تو ہونا ہی تھا خراب — ان کی بھی اک نگاہ کا نقصان ہو گیا

خلشِ دل کی قدر کر ناداں — یہ کہیں بار بار ہوتی ہے

ایک موہوم حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں — میں تری ذات سے نسبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا — سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی

پھولوں کی ذرا روش تو دیکھو — کانٹوں سے نباہ کر رہا ہے

با خبر بابِ حریمِ ناز وا ہو یا نہ ہو — بس یہی اک وہم تھا سنگِ گرانِ کوئے دوست

مانا مری نگاہ پہ ثابت ہے جرمِ دید — تیری نگاہ بھی تو شریکِ گناہ تھی

الجھیں ترے رخسار سے گستاخ نگاہیں — تو اور ہو مجروح تماشا مرے آگے

رکھی ہے کل کیلئے میکشوں نے بھر کے شراب — اسی کا نام غمِ روزگار ہے ساقی

چند نغمے گائے جاتے ہیں شکستہ ساز پر — ہے ازل کے دن سے دنیا ایک ہی انداز پر

گذر رہی ہے کچھ اس ڈھب سے زندگی ماہر کہ جیسے میری ضرورت نہیں زمانے کو

یہ اشعار مجھے کیوں محبوب و مرغوب ہیں ؟ کاش ! میں اپنا دل آپ کو دکھا سکتا۔

(۳) اُردو شاعروں میں غالب اور اقبال مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں، ان دونوں باکمالوں کے فکر و خیال نے اُردو شاعری کو دُنیا کی بلند سے بلند شاعری کا ہم پلہ بلکہ حریف بنا دیا۔

(۴) (الف) غالب اور اقبال کے کلام نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا، جس کا اثر میری شاعری پر پڑا بھی اور پڑنا چاہیے، مگر مذہب کے سوا تمام باتوں میں "رسمی تقلید" سے میری طبیعت بغاوت کرتی ہے، میری شاعری میں "انفرادیت" کی جھلکیاں بھی آپ کو نظر آئیں گی۔ اس سے زیادہ مجالِ عرض نہیں کہ "خود ستائی" کی منزل ایک قدم کے فاصلے پر ہے

(ب) دیوانِ غالب، کلیات اکبر الہ آبادی، میر انیس کے مرثیے، مثنوی گلزار نسیم اور زہرِ عشق، بانگِ درا (مخصوص نظمیں) بالِ جبریل اور ضربِ کلیم، نیز شبلی نعمانی کی تنقیدی کتابوں نے تو میرے ذوقِ شعری کو خاص طور پر متاثر کیا۔

(ج) حالات ——— اور اشخاص ——— ! یہ نہ پوچھئے ——— آہ !

اک تیر میرے دل پہ وہ مارا کہ ہائے ! ہائے !

دل کے کس کس کانٹے کو کاغذ پر نکال کر رکھوں، مصائب اور نا اُمیدی نے مجھ سے بہت زیادہ شعر کہلوائے ہیں اور عشرت و اُمید، سو اس کی زندگی "چشمکِ برق و شرار" سے بھی کم نکلی :

پہلو بشگافید و ببینید دلم را تا چند بگویم کہ چنان است چناں نیست

ماہر القادری

ازجناب امجد حیدرآبادی

(۱) اُردو شعراء ماضی میں مجھے خواجہ میر درد کامل طور پر، اور غالب منتخبات کی حد تک اور شعراء حال میں اکبر الہ آبادی باعتبار اصلاح حال اور جوش ملیح آبادی باعتبار قادر الکلامی

(۲) اُردو کے اشعار تو اس وقت یاد نہیں ہیں۔

فارسی کے دو شعر ایک حضرت سعدی کا

او سخن از گفتن من می کند من بہ ہمیں خوش کہ سخن می کند

اور ایک شعر غالب کا

تیر قضا ہر آئینہ در دست قدرت است اما کشاد او ز کمانِ محمد است

مجھے اس قدر پسند ہیں اور اس قدر ان اشعار سے متاثر ہوں جسکی کیفیت حدِ بیان سے باہر ہے

(۳) مجھے تو اپنے شعر بحیثیت اپنے ہونے کے سبھی پسند ہیں بالفعل ایک غزل لکھدیتا ہوں

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا　　کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈتی ہیں جسے میری آنکھیں　　وہ تماشا نظر نہیں آتا
اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھوں گا　　مجھے ایسا نظر نہیں آتا
ہو چلی ختم، انتظار میں عمر　　کوئی آتا نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں　　دینے والا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے　　جو ہے اپنا نظر نہیں آتا
زیر سایہ ہوں اس کے اے امجد　　جس کا سایہ نظر نہیں آتا

اس کا چھٹا شعر بہت ہی قابل غور ہے۔

(۴) میری شاعری صرف قرآن وحدیث سے متاثر ہے۔

اللہ بس باقی ہوس۔　امجد حیدرآبادی متصٓب خطہ صالحین

از جناب قدیر لکھنوی

کرمفرمائے بندہ محترمی جناب اسرائیل احمد صاحب بینائی زاد الطافکم

ہدیۂ تسلیم و تحفۂ نیاز۔ جناب کا نوازشنامہ مورخہ ۲ر فروری ۱۹۴۳ء اہ ماہ رواں کو دستیاب ہو گیا تھا۔ جواب خط لکھنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی جس کے لئے معافی خواہ ہوں۔ حالانکہ بقول غالب:
"ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا" حقیقت امر یہ ہے کہ میں امرتسر اور لاہور کے مشاعروں سے واپسی پر شدید بخار اور نزلہ میں مبتلا ہو گیا جس کا سلسلہ ہنوز باقی ہے۔ حتیٰ کہ ابھی تک اپنی سرکاری ملازمت کے فرائض بھی انجام دینے سے قاصر ہوں۔ الحمد للہ کہ اب میری حالت کسی قدر روبہ اصلاح ہے اور آج اپنے میں اتنی صلاحیت پاتا ہوں کہ یہ چند سطور سپرد قلم کر رہا ہوں۔

قبل اس کے کہ میں آپ کے استفسارات کے جوابات قلمبند کروں۔ میں اپنا اولیں فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی محبت آمیز عزت افزائی و ذرہ نوازی کا دلی شکریہ ادا کروں۔ کہ آپ نے مجھ ایسے ہیچمدان کو اون باکمال ادباء و شعراء کی فہرست میں رکھا۔ جس کا میں کسی طرح اہل نہیں۔ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" کہاں میں اور کہاں میرے محترم مولانا حسرت صاحب موہانی۔ مولانا صفی صاحب لکھنوی وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال۔ انچہ از دوست میرسد نیکوست۔ آپ کے ستم ظریفانہ حسن انتخاب کی داد دیتے ہوئے۔ مندرجۂ ذیل

سطور میں تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

سوال (۱) اردو شعرا۔ ماضی یا حال۔ کے وہ کون سے دس بارہ شعر ہیں جنھیں آپ بہترین تصور کرتے ہیں۔

جواب۔ بحالت موجودہ حافظہ سے کام لینے کے بعد جتنے شعر مجھے یاد آتے ہیں اونھیں درج کئے دیتا ہوں لیکن میرا جواب صحیح معنوں میں تشنہ رہے گا۔

دل سے اک بات کہی تھی جینے　　ہائے کمبخت برا مان گیا　　میرؔ

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ　　مذہبِ عشق اختیار کیا　　〃

بھر نظر تجھ کو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے　　حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے　　سوداؔ

اشکِ خوں آنکھوں میں آکر جم گئے　　دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے　　سوزؔ

شمع کے مانند ہم اس بزم میں　　چشمِ تر آئے تھے دامن تر چلے　　دردؔ

موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی　　غالبؔ

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک　　ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا　　انیسؔ

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　دوسرا جب کوئی نہیں ہوتا　　مومنؔ

دیر میں کون ہے کعبہ میں گزر کس کا ہے　　یار کا گھر یہ اگر ہے تو وہ گھر کس کا ہے　　امیرؔ

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ　　دیکھا مجھے تو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ　　نظامؔ

ایک خاموشی ہمارے دلکو دیتی ہے ملال　　اور سب باتیں پسند آئیں تیری تصویر کی　　رشیدؔ

کل ہم[۱] آئینہ میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے　　کاروانِ عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کئے　　صفیؔ

سونے والے رات بھر سویا کئے　　جاگنے والے تجھے کیا مل گیا　　نظمؔ

مومن کے جہان کی حد نہیں ہے　　مومن کا مقام ہر کہیں ہے　　اقبالؔ

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن　　بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا　　عزیزؔ

مدتیں ہوگئیں ہیں چپ رہتے　　کوئی سنتا تو ہم بھی کچھ کہتے　　محشرؔ

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں　　یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں　　جگرؔ

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے　　اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی　　سراجؔ

سوال (۲) اپنے وہ کون سے بارہ اشعار ہیں جو آپ کو سب سے زیادہ محبوب و مرغوب ہیں، اور کیوں

۱؎ تین لکھنے والوں نے اپنے خطوط میں جناب صفیؔ کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

جواب پسندیدہ اشعار کی تعداد تو زیادہ ہے۔ مگر بخوف طوالت وخود ستائی۔ صرف بارہ ہی شعر درج کئے دیتا ہوں۔ خدا کرے کہ یہ آپ اور آپ کے ناظرین کو بھی پسند آجائیں۔ تاکہ مجھے اپنی دماغ سوزی کی داد مل جائے۔ حالانکہ اپنی ہیچمدانی کے باعث مقبولیت کی توقع کم ہے۔ پسندیدگی کے اسباب اس لئے نہیں بتا سکتا کہ تفصیل طولانی ہو جائے گی۔ لہذا شعروں کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ ناظرین کی خوش مذاقی اور ذوقِ سلیم کے سپرد ہے۔

کبھی پہ ختم یارب گردشِ ایام ہو جائے	شبِ غم کی سحر ہو زندگی کی شام ہو جائے
نہ دو قدم بھی زمانہ ہمارے ساتھ چلا	ہمیں کو ساتھ میں چلنا پڑا زمانے کے
کچھ اس طرح سے محبت میں زندگی گزری	یہی سمجھ میں نہ آیا کہ زندگی کیا ہے
دنیائے رنگ وبو میں کٹی میری زندگی	پھر بھی یہی راز دارِ گلستاں نہ ہو سکا
رہِ طلب میں بھی لازم ہے اپنی خودداری	دعا کو ہاتھ اُٹھائے مگر دعا نہ کرے
قدیرؔ عشق کے آغاز کا ہے مرگ انجام	جو انتہا نہ سمجھ لے وہ ابتدا نہ کرے
یہ ملا عشق میں مٹنے کا نتیجہ مجھ کو	یاد کرتی ہے ترے نام سے دُنیا مجھ کو
ساقی اسی چھلکتے ہوئے جام کی قسم	پہلے پہل کیا ہے ارادہ گناہ کا
مرا حالِ دل عیاں ہے مری چشمِ خونفشاں سے	مرے اشک کہہ رہے ہیں جو نہ کہہ سکا زباں سے
دیکھتا کیا ہوں رہِ الفت میں مٹ جانے کے بعد	پاؤں جس منزل میں رکھا تھا اوسی منزل میں ہے
پا کے اِک بت کے آستانے کو	میں نے ٹھکرا دیا زمانے کو
قدیرؔ جی کے مجھے اس لئے خوشی نہ ہوئی	کہ زندگی کے طریقہ سے زندگی نہ ہوئی

سوال (۳) اُردو شعرا کی فہرست میں آپ کو علے قدر مراتب کون سے شعرا پسند ہیں۔ کوئی سبب

جواب۔ صرف چند شعرائے ماضی وحال کے تخلص درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ورنہ فہرست نہایت طویل ہو جائے گی۔ میرے اس جواب کو تشنہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ جناب میر تقی میرؔ۔ جناب مرزا سوداؔ جناب میر سوزؔ۔ جناب میر دردؔ۔ جناب غالبؔ۔ جناب میر انیسؔ۔ جناب مومنؔ۔ جناب امیر مینائیؔ جناب تعشقؔ۔ جناب رشیدؔ۔ جناب علامہ اقبالؔ۔ جناب مولانا صفیؔ۔ جناب حکیم ناطقؔ۔ جناب مولانا حسرتؔ موہانی۔ جناب جگر مراد آبادی۔ جناب جوشؔ ملیح آبادی (بہ استثنائے مضامین کفر والحاد) جناب اکبر الہ آبادی۔ جناب ظریفؔ لکھنوی۔ جناب آرزوؔ لکھنوی۔ جناب سراجؔ لکھنوی۔ جناب یاسؔ خیر آبادی۔ جناب نوحؔ ناروی۔ جناب اصغرؔ گونڈوی۔ جناب فانیؔ بدایونی۔ جناب اثرؔ لکھنوی

جناب جلیل مانکپوری وغیرہم۔ مندرجہ بالا فہرست شعرا۔ اول تو نامکمل ہے۔ اس لئے کہ صدہا قابل ذکر شعرائے ماضی وحال کے تخلص درج نہیں۔ دوسرے یہ کہ قدیم وجدید شعرا کی ترکیب غیر ارادی طور پر علے قدر مراتب نہیں دیکھئی بلکہ صرف حافظہ کی مدد سے کام لیا گیا ہے اور جتنے شعرائے ماضی وحال کے تخلص یاد آگئے انھیں سپرد قلم کر دیا گیا ہے۔

سوال (۴) آپ کی شاعری کو متاثر کرنے میں (۱) کن شعرا (۲) کن کتابوں (۳) کن حالات اور (۴) کن لوگوں نے نمایاں حصہ لیا۔

جواب۔ جن شعرا کے تخلص جوابات ۱ اور ۲ میں درج ہیں انھیں کے دواوین وتصانیف کے مطالعہ سے میری شاعری متاثر ہوئی۔ علی الخصوص میرے والد ماجد صاحب جناب منشی احمد خانصاحب نظم لکھنوی اور جناب پیارے صاحب رشید لکھنوی اعلی اللہ مقامہم کا خاص فیضان تھا جن کی توجہ نے مجھے اس قابل بنا دیا کہ آج دنیائے ادب میں بعض حضرات مجھ سے روشناس ہیں۔ اب میرے خیال میں جملہ استفسارات کے جوابات ختم ہوگئے سوائے ایک کے یعنی سوال نمبر (۴) کی تیسری مد "کن حالات سے شاعری متاثر ہوئی"۔ تو اس کا جواب صرف یہ ہے کہ حضرت عشق کے تصدق میں۔

الحمد للہ کہ آج میں ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہوگیا۔ یعنی جواب خط کی تکمیل ہوگئی۔ ورنہ آپ کو اس اخلاقی شکوہ کے ساتھ ساتھ کہ مطلوبہ سوالات کے جوابات نہیں آئے یہ قلق بھی رہتا کہ چھ پیسے کی رقم بھی مفت گئی۔ اس لئے کہ جوابی لفافہ آپ نے اپنے خط کے ہمراہ روانہ فرما دیا تھا۔ اور مجھے بھی اللہ نے خوب بچایا ورنہ جب تک زندہ رہتا آپ سے محجوب ہونا پڑتا اور مرنے کے بعد حشر میں جواب وہی کرنا پڑتی۔

میرے مخصوص کرمفرما حضرات جناب ہوش بلگرامی۔ جناب حکیم آشفتہ لکھنوی۔ جناب نواب یار جنگ جناب شہید یار جنگ اور جناب حکیم مقصود علیخانصاحب کی خدمت میں بشرط ملاقات میرا سلام شوق پہونچا دیجئے گا۔ ممنون ہوں گا فقط والسلام بندۂ حقیر۔ قدیر لکھنوی

از جناب اسمعیل احمد مینائی تسنیم

برادر عزیز۔ سلام ودعا آپ کا سوال نامہ تو مجھ کو ملا نہیں۔ شائد لانے والے کے تلون کے نذر ہوا، یاد کے بھروسے پر بسم اللہ کرتا ہوں، میں کیا بلحاظ مرتبت کیا بنظر شہرت اس کا مستحق نہیں کہ اردو کے مشاہیر سخنوروں کے ساتھ مخاطب کیا جاؤں، پھر وہ جو مثل مشہور ہے "گھر کی مرغی دال برابر" اس کے پیش نظر بھی آپ کا مجھ سے خطاب کرنا کم تعجب خیز نہیں، بایں ہمہ بندہ نوازی (اگر وہ

محض برادر نوازی نہیں) کا پاس گزار ہوں،

سخنورانِ اُردو کے بارہ پندرہ بہترین اشعار منتخب کرنا تو میرے بس کی بات نہیں، ہاں یہ ضرور اک گونہ سہل ہے کہ ایسے بارہ پندرہ شعر لکھ دوں جو مجھ کو پسند بہت ہیں۔ میرے خیال میں غالباً آپ کے پہلے سوال کا مفہوم بھی یہی ہے، غالبؔ نے ایک جگہ شعروں کے انتخاب میں " دل کا معاملہ کھلنے" اور "رسوا ہونے" کی شکایت کی ہے۔ آپ کے پہلے دو سوالوں کا جواب لکھتے ہوئے اسی اندیشے کا شکار ہوں، سوال لاکھ "بے تکا" ہو خلاف مصلحت (Indiscreet) نہیں سمجھا جاتا، جواب کیسے ہی "بے تک" کا ہو، خلافِ مصلحتی (Indiscretion) کے الزام کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

میں یہ پندرہ شعر جس ترتیب سے لکھ رہا ہوں اسی اعتبار سے مجھ کو پسند بھی ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے	اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے	غالبؔ
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی	وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے	"
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے	رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے	"
جو پوچھا کہ گل کا ہے کتنا ثبات	کلی نے یہ سن کر تبسم کیا	میرؔ
چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم	کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا	مصحفیؔ
بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو	رکھیگا کون تم سے عزیز اپنی جان کو	میرؔ
جیئے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی	ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں	فانیؔ
آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا	جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا	اصغرؔ
گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں	مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں	امیرؔ
نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے	پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے	انورؔ
ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں	مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں	اقبالؔ
ہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی	نقاب الٹ دو، بدل دو فضا زمانے کی	جگرؔ
وہ نہیں بھولتا، جہاں جاؤں	ہائے میں کیا کروں، کہاں جاؤں	ناسخؔ
اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح	میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح	ناطقؔ
اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا	سو بار جنوں نے تری تصویر دکھا دی	ماہرؔ

اُردو ادب کے باکمال سخنوروں میں غالبؔ مجھ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس کے

متعدد اسباب ہیں، غالب اس اعلیٰ راہ پر گامزن ہے جہاں مستقبل کی کامیابیاں اور کامرانیاں بھی انگشت بدنداں رہیں گی۔ اس کے اشعار میں حقیقت اور زندگی کا جو امتزاج پایا جاتا ہے اس پر وجدان سر دھنتا ہے۔ ایک "شاعر نوخیز و نو آموز" نے قدیم شعرا پر بشمول غالب یہ الزام لگایا تھا کہ ان کی شاعری زندگی کے حقائق سے دور رہتی ہے۔ میری دانست میں ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق ٭ نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اس سے زیادہ زندگی کی ٹھوس اور تلخ حقیقتوں سے قریب تر شاعری آج بھی کہیں نظر نہیں آتی، غالب پرستی کا سب سے بڑا سبب لیکن یہ ہے کہ غالب کی شاعرانہ ذات، ضامنِ آفرینش ہوئی اقبال جیسے حکیم و مومن، شاعر و مفکر کی ذات کی، غالب کی شاعری وہ اساس ہے جس پر اقبال کے کلام کی بنیادیں استوار ہوئیں، غالب کے بعد اقبال اور پھر میر کا نمبر میری فہرست میں آتا ہے۔ اقبال کیوں سب کو محبوب ہیں اس کی اگر آپ کو یا دوسرے قارئین کو خبر نہیں تو اس "کیوں" کی شرح کرنا بھی بے سود ہے۔ میر کی زبان کی پاکیزہ حلاوت (داغ کی ہوسناک زبان سے تخصیص منظور ہے) ان کے مضامین کی عاشقانہ خستگی اور والہانہ ربودگی، ان کے اندازِ بیان کی خستگی و تشنگی ان کے بعد اردو کے کسی سخنور کو نصیب نہ ہوئی، اور نہ ہو، پھر فانیؔ ہیں جو غالبؔ اور میرؔ کے انفرادی اور امتیازی رنگوں کو ایک دوسرے میں سمو کر اردو شاعری کے افق پر پہلی قوسِ قزح کو معرضِ وجود میں لائے[1] تبشس کا مقام بھی کسی سے کم نہیں، زبان معلوم ہوتا ہے نہا کر جیسے آئی ہو ابھی کوثر کے پانی میں۔ نکھری، ستھری، نرم و نازک جیسے ہری ہری نئی دوب پر باریک باریک پھوار پڑے، امیرؔ مینائی کا درجہ اس کے بعد ہے ان کی سی جامع الکمال ہستی سے بساطِ شاعری ۱۹۰۰ء میں جو خالی ہوئی تو پھر آج تک نہ بھری، اور اب کیا بھرے گی! علم و مذہب جو ان کی امتیازی خصوصیتیں تھیں آج کے بازار "برخود غلطاں" میں "متاعِ کاسد" ہیں۔ آخر میں مجھ کو اکبرؔ اپنی خوش طبعی، ناطقؔ لکھنوی اپنی اعلیٰ خیالی، اصغرؔ گونڈوی اپنی معنے یابی، جگرؔ اپنی کیف آفرینی حسرتؔ موہانی اپنی شیریں بیانی اور ماہر القادری اپنی تصور زا اور تفکر افروز رنگین گوئی کے باعث محبوب ہیں۔

معاف کیجئے گا میں نے آپ کے تیسرے سوال کا جواب دوسرے سوال سے پہلے دیا ہے،

---

[1] ہمیں یقین ہے کہ مرحوم فانیؔ بدایونی کا صحیح رنگِ شاعری متعین کرنے میں جناب تسنیم کی اس رائے سے بڑی مدد ملے گی

میں "رسم زمانہ کے خلاف حال" سے پہلے "قال" کا قائل ہوں، پہلے درویش ہوئے پھر خویش، دوسرا اور چوتھا سوال دونوں میری ذات سے متعلق ہیں اب ان کا جواب لیجئے، میں ان لوگوں میں نہیں جو اپنے اشعار کو "جگر پارے" ٹھہرا کر یہ جتاتے ہیں کہ عزیز تو سب ہی ہیں، ممکن ہے حضرت جگر کی حد تک یہ اصطلاح درست ہو، اشعار تو فکر پارے ہوتے ہیں جیسے ذہن میں یہ اہلیت ہوتی ہے کہ علوم طبقات الارض، تشریح الاعضا کی اہمیت و افادیت کے اقتضا زیر نظر کر کے ان کے مدارج قرار دے شاعر کی فکر بھی اپنے "افکار" میں مراتب و درجات قائم کر سکتی ہے، مجھ کو شعر کے محاسن میں "صناعانہ ضبط" (Artistic Restraint) جس کو ایجاز سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں طبعاً سب سے زیادہ مرغوب ہے، ورنہ بلند سے بلند خیال کو خوبصورت لفظوں، دلآویز ترکیبوں، اور جذبات انگیز استعاروں کا لباس پہنا دینا تو چنداں مشکل نہیں میں نے اپنے بارہ شعر اسی نقطۂ نظر سے انتخاب کئے ہیں۔

تیرے غم کا تو کیا بدل ہوتا ‎ — ‎ بے دلی سے دن گزارے ہیں
شکستِ دل پہ ہوں اندوہگیں ہم ‎ — ‎ اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہم
پھر سادگیٔ حسن کا یہ لطف کہاں تھا ‎ — ‎ اچھا ہے کہ تجھ سے ترے انداز چھپے ہیں
وہ یہ کہتے ہوئے سدھارے ہیں ‎ — ‎ تو نے تنہا بھی دن گزارے ہیں
سنتا ہوں یاد ان کو بھی آنے لگا ہوں میں ‎ — ‎ سوز دروں کی خیر منانے لگا ہوں میں
شیشۂ دل کو ڈرتے گزری ‎ — ‎ اب یہ ٹوٹا اب یہ ٹوٹا
یہ طرز بے رخی کہ مسرت بھی کامیاب ‎ — ‎ وہ شانِ التفات کہ غم رائیگاں نہیں
وفا کا تذکرہ ان کی زباں پہ بار بار آیا ‎ — ‎ نہ میں اس کو غلط سمجھا نہ مجھ کو اعتبار آیا
جب ناخدا سے لے کر کشتی خدا پہ چھوڑی ‎ — ‎ پھر اس سے کیا تعلق کس رخ کی ہیں ہوائیں
وہ حرف تمنا پہ کچھ یوں متبسم ہیں ‎ — ‎ اب ترک تمنا بھی مشکل نظر آتا ہے
نظریں پکار تھیں ان کی مرا دل سادہ مزاج ‎ — ‎ لفظ بڑھتے گئے بڑھتے گئے افسانے میں
کب تک بقائے عشق کا ٹھہریں گی اک سبب ‎ — ‎ یکطرفہ اعتبار کی یہ سخت جانیاں

میری شاعری جہاں تک مجھ کو یاد پڑتا ہے کسی شاعر، کسی شخص اور کسی کتاب کی زیر بار منت نہیں، کیا بلحاظ تاثر کیا بلحاظ تحریک، البتہ "حبیب لبیب" (یہ ترکیب ماہر صاحب ہی کی ہے) ماہر القادری صاحب سے یکجائی نے ‏ ‏ شاعری کے لئے تازیانے کا کام ضرور کیا ہے یعنی

شعر کہنا تفنن طبع کے لئے شروع کیا تھا مگر سال ہی بھر میں اس مشغلے کو دیمک لگ گئی اور اس دور کے اشعار میں سے ایک بھی نہ میرے پاس قلمبند ہے نہ مجھ کو یاد احباب و اقارب کا یہ اصرار کہ "تم کیسے ہوتے ہو شعر کہو" شعر گوئی کا مادی محرک ہوا، خلقی عمیق احساس پذیری مزاج کی زود افسردگی، ذہن کی مستقل اضطراب شعاری اور قوائے تخیلی کی تصور زائی، میری شاعری کے فکری محرکات ہیں، میری نجی زندگی کے بعض حوادث کے نتائج بھی اس مشغلۂ لطیف کے استمرار میں ممد و معاون ہوئے، آخر آخر میں "طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا" کے مشاہدے اور مطالعے نے دل کو خاکستر بنا کر ایک نیا ہیجان میری صلاحیت شعری کے لئے بہم پہنچایا ہے مگر اس کا صحیح اندازہ آپ کو میری نظموں اور قطعات سے ہوگا، غزلوں سے نہیں۔ فقط والسلام

اسمٰعیل احمد مینائی تسنیم

از جناب صفیہ شمیم

میرے پسندیدہ اشعار

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم — منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم — میر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا — مومن

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا — "

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے — ذوق

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو — غالب

ہزار بار ہوئی گو مآلِ گل سے دوچار — کلی سے خو نہ گئی پھر بھی مسکرانے کی — جوش

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے — اقبال

آہ وہ یاد کہ جس یاد کو ہو کر مجبور — دلِ مایوس نے برسوں سے بھلا رکھا ہے — حسرت

موت وہ دن بھی دکھائے مجھے جس دن فانی — زندگی اپنی جفاؤں پہ پشیماں ہو جائے — فانی

مرغانِ قفس سے پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا ہے — آجاؤ جو تم کو آنا ہے ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم — شاد عظیم آبادی

کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے — آئینہ میں اپنے رخ کی جھریاں دیکھا کئے — صفی لکھنوی

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر — نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے — فانی

"انتخاب اشعار"

تنگ ہے خیال کی وسعت ارے معاذ اللہ — کہ دل میں آرزوئے دوجہاں نہیں رکھتے

کس منہ سے تیرا شکر کروں خالقِ جہاں — دے کر حیات ڈال دیا ہے عذاب میں
ہو خطرۂ جزاء و سزا کس لئے مجھے — جب ہے نظامِ دہر ترے اختیار میں
مری فکر و نظر گرمِ سفر ہے ایسے عالم میں — جہاں کی وسعتوں تک عقلِ انسانی نہیں جاتی
دے موت ہی شاید غم و افکار سے فرصت — ہستی تو ہے اک صورتِ زنداں مرے لئے
اے ہم نشیں نہ چھیڑ حکایاتِ رنگ و بو — مدت ہوئی کہ بھول چکے ہم بہار کو
رونا مجھے خزاں کا نہیں کچھ مگر شمیمؔ — اس کا گلہ ہے آئی چمن میں بہار کیوں
اَوجِ خودی بڑھائے جا سجدوں میں سر جھکائے جا — لذتِ بندگی اٹھا، پستیٔ بندگی نہ دیکھ
صرف اجل ہی زیست کا کرتی ہے قائم اعتبار — شکلِ اجل نظر میں رکھ جانبِ زندگی نہ دیکھ
اجل بھی مرے غم پہ آنسو بہائے — اگر نالۂ زندگانی سنا دوں
گر ہے نئے نظام کی تخلیق کا خیال — آبادیوں کو نذرِ بیاباں تو کیجئے
یہ کیا خیال کوئی نہیں ناخدا تو کیا — کشتی سپردِ شورش و طوفاں تو کیجئے

میں شاعروں میں میرؔ۔ نظیرؔ۔ غالبؔ۔ انیسؔ۔ حسرتؔ۔ اقبالؔ۔ فانیؔ اور جوشؔ کی معتقد ہوں اور انھیں کے کلام نے میرے تخیل اور فکر پر ایک نامعلوم اثر ڈالا ہے۔

صفیہ شمیمؔ ملیح آبادی

ازجناب صفیؔ لکھنوی

جناب والا دامت معالیکم۔

تسلیم بالتحیۃ والتکریم۔ عنایت نامہ ملا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ مرسلہ چار سوالوں میں ضمنی بھی دو سوال جواب طلب ہیں۔ پہلے دو سوال انتخاب اشعار، تیسرا سوال انتخاب شعرا بدرجہ بندی ضمنی دونوں سوال وجہ انتخاب، چوتھا سوال شاعری کے اسباب تاثر سے متعلق ہے۔

ان سب کے جواب کے لئے کافی ریسرچ (تجسس) کی ضرورت ہے۔ ورنہ محض بر بنائے اختصار کوئی اظہار خیال، استقرائے ناقص و نامکمل ہوگا۔ اس لئے انتخاب کے معاملے میں حضرت غالبؔ مرحوم کی نصیحت پر کاربند رہنا مناسب ہے:۔

۵ کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اشعار سے کہیں زیادہ شعرا کا انتخاب علے قدر مراتب یعنی بطور ون (Win) پلیس (Place) تھرڈ (Third) ان کے نمبر قائم کرنا خطرناک اور موجب ہنگامہ آرائی ہوگا، یہ

مجھے پسند نہیں :- ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔ ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

قوائے مضمحل اور اعراضِ پیری دماغی کاوشوں کی اجازت نہیں دیتے لہذا ان باتوں سے اب جی چراتا ہوں۔ امید ہے کہ جناب والا بھی حضرت سعدی علیہ الرحمہ کے اس شعر پر عمل فرمائیں گے ؎

رسم است کہ مالکانِ تحریر ۔ آزاد کنند بندۂ پیر

والسلام خیر ختام۔ خاکسار۔ صفی عفی عنہ

از جناب دتاتریہ کیفی

حضرت تسلیم۔ آپ کا ارشادات نامہ ملا۔ شکریہ۔ جناب یہ تو بڑی فرصت کی باتیں ہیں۔ اوروں کا میں کیا جانوں، مجھے تو فرصت ہرگز نہیں کہ آپ کے ارشادات کی تعمیل کے قابل ہو سکوں [۲]

وہ کونسا شاعر ہے جسے اپنا تمام کلام پسند نہیں [۳]

افسانہ لکھنے والے عنوان اور بیچ بیچ میں اکثر اشعار ڈال دیتے ہیں وہ شاید آپ کو اچھے شعر بھیج سکیں [۴]

مجھے تو اپنا یہ شعر بہت پسند ہے :-

غم رہا ان کا جو دوزخ میں پڑے جلتے ہیں ۔ میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا

اور مرزا غالب کا یہ شعر بہت پسند ہے :-

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم ۔ اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

امید ہے کہ میرا مختصر جواب آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔ میری مصروفیتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے آپ مجھے معذور رکھیں گے۔ نیازمند۔ برجموہن دتاتریہ کیفی

از جناب حفیظ جالندھری

میرے محترم جناب بینائی۔ السلام علیکم۔ آپ کا مطلوبہ سوالنامہ ملا۔ میں آجکل انتہا سے زیادہ مصروف ہوں۔ آپ اس خاندان سے ہیں۔ اور اس زندہ جاوید شاعر کے پوتے ہیں۔ جسکی شاعری سے میں بچپن میں بڑی حد تک متاثر ہوا ہوں اس لئے باوجود مصروفیتوں کے آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا، لیکن کب ؟ یہ بتانا آج میرے بس کی بات نہیں۔ انشاء اللہ پہلی فرصت میں۔

---

۱ ارشادِ گرامی سر آنکھوں پر لیکن بقول آتش ؎ جب میں جواں تھا تو میری شاعری تھی پیر۔ اب شاعری جواں ہے تو میں پیر ہو گیا اس کے علاوہ اور بھی امور ہیں جن کی بناء پر جناب صفی کا جواب باصواب ہے درکار ہے۔ ۲ کیفی صاحب نے یہ لکھ کر ہماری ہمت افزائی کی کوشش کی ہے! دل شکنی مقصود نہیں ہے۔ ۳ لیکن کیا ہر شعر یکساں پسند ہے۔ ۴ ہم مولانا حسرت موہانی کو خاص طور پر اس طرف متوجہ کریں گے ۵ ہم نے یاد کئی بار دلایا مگر افسوس کہ حفیظ صاحب کو فرصت آج تک نہ ملی۔ خدا کرے جلد فرصت پائیں اور جواب دیں تا کہ مضمون مکمل ہو سکے۔

سوال ۱، ۲ اور ۳ کی روشنی میں یہ تختہ مرتب کیا گیا ہے

نام شاعر	پسند کرنے والوں کے نام	کل تعداد
غالب	حسرت موہانی۔ ناطق لکھنوی، سیماب، فراق، جگر بسوانی، وحشت کیفی، امجد۔ دل۔ اختر شیرانی۔ قدیر۔ ماہر۔ محوی۔ علی اختر۔ تسنیم۔ شمیم	۱۶
میر تقی میر	حسرت موہانی۔ ناطق۔ دل۔ فراق۔ علی اختر۔ جگر بسوانی۔ قدیر۔ وحشت۔ ماہر۔ محوی۔ اختر شیرانی۔ تسنیم۔ شمیم۔	۱۳
مومن	حسرت موہانی۔ ناطق۔ سیماب۔ دل۔ محوی۔ ماہر۔ وحشت۔ قدیر۔ اختر شیرانی۔ جگر بسوانی	۱۱
امیر مینائی	ناطق۔ فراق۔ سیماب۔ وحشت۔ قدیر۔ دل۔ جگر بسوانی۔ ماہر۔ تسنیم۔	۹
اقبال	سیماب۔ فراق۔ علی اختر۔ وحشت۔ قدیر۔ ماہر۔ تسنیم۔ شمیم۔	۸
فانی	دل۔ اختر۔ فراق۔ اختر شیرانی۔ قدیر۔ ماہر۔ تسنیم۔ شمیم	۸
انیس	دل۔ وحشت۔ اختر شیرانی۔ قدیر۔ تسنیم۔ فراق۔ شمیم	۷
درد	حسرت موہانی۔ علی اختر۔ امجد۔ وحشت۔ قدیر۔ ماہر	۶
داغ	سیماب۔ فراق۔ وحشت۔ اختر شیرانی۔ ماہر۔ جگر بسوانی	۶
حسرت موہانی	فراق۔ دل۔ علی اختر۔ قدیر۔ شمیم۔ تسنیم	۶
جوش	فراق۔ علی اختر۔ امجد۔ محوی۔ قدیر۔ شمیم	۶
آتش	حسرت موہانی۔ اختر شیرانی۔ فراق۔ ماہر۔ جگر بسوانی۔	۵
ذوق	ناطق۔ وحشت۔ محوی۔ جگر بسوانی۔ شمیم۔	۵
اکبر الہ آبادی	فراق۔ محوی۔ امجد۔ ماہر۔ قدیر	۵
صفی	سیماب۔ دل۔ قدیر۔ محوی۔ شمیم۔	۵
اصغر گونڈوی	فراق۔ دل۔ علی اختر۔ تسنیم۔ اختر شیرانی	۵
مصحفی	حسرت موہانی۔ دل۔ جگر بسوانی۔ تسنیم	۴
حالی	حسرت موہانی۔ اختر شیرانی۔ وحشت۔ محوی	۴

جگر مرادآبادی	علی اختر۔ دل۔ قدیر۔ تسنیم	۴	جلیل رامپوری	ماہر	۱
یگانہ چنگیزی	یگانہ چنگیزی۔ دل۔ فراق۔ ماہر	۴	تعشق	قدیر	۱
			جرأت	حسرت موہانی	۱
سودا	حسرت موہانی۔ قدیر۔ مجوی	۳	پیارے صاحب رشید	قدیر	۱
ناسخ	فراق۔ اختر شیرانی۔ تسنیم	۳	نظم لکھنوی	قدیر	۱
شاد عظیم آبادی	حسرت موہانی۔ فراق۔ شمیم	۳	حضور	ناطق	۱
ریاض	دل۔ قدیر۔ جگر بسوانی	۳	سیماب	دل	۱
جلیل	دل۔ قدیر۔ جگر بسوانی	۳	انور	تسنیم	۱
عزیز	دل۔ قدیر۔ فراق	۳	حفیظ جالندھری	علی اختر	۱
نظیر اکبرآبادی	فراق۔ شمیم	۲	سراج لکھنوی	قدیر	۱
قائم	حسرت موہانی۔ علی اختر	۲	ظریف	قدیر	۱
جلال	حسرت موہانی۔ سیماب	۲	دل	جگر بسوانی	۱
ناطق لکھنوی	ماہر۔ تسنیم	۲	ثاقب قزلباش	فراق	۱
محشر	فراق۔ قدیر	۲	روش	علی اختر	۱
آرزو	دل۔ قدیر	۲	احسان	علی اختر	۱
اثر	دل۔ علی اختر	۲	اختر شیرانی	علی اختر	۱
آصف	اختر شیرانی۔ جگر بسوانی	۲	ساغر	علی اختر	۱
ماہر القادری	تسنیم۔ علی اختر	۲	طاہر	سیماب	۱
نوح	قدیر۔ جگر بسوانی	۲	جاوید	سیماب	۱
تسنیم	ماہر۔ علی اختر	۲	مدہوش	سیماب	۱
ولی دکنی	فراق	۱	وجد	علی اختر	۱
میر سوز	قدیر	۱	شاہد صدیقی	علی اختر	۱
اسیر	جگر بسوانی	۱	مخدوم	علی اختر	۱
نظام رامپوری	قدیر	۱	حسرت ترمذی	علی اختر	۱

اسرائیل احمد مینائی

وہ رات!

رات کے کوئی بارہ بج چکے ہوں گے۔ سیاہ گھٹائیں فضا میں منڈلا رہی تھیں۔ سارے عالم پر سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن میں کافی انہماک کے ساتھ ایک دردانگیز اور نہایت دلچسپ قصہ پڑھ رہا تھا۔ نہ جانے میں کتنی دیر اس طرح کتاب دیکھنے میں غرق رہتا لیکن بھیا کمرے داخل ہوئے اور مجھے اس طرح مشغول دیکھ کر انھوں نے کہا۔ "موہن کتنی رات تک اس طرح پڑھتے رہوگے؟" میں نے جواباً خاموشی اختیار کی اور کتاب کے مطالعہ میں بدستور منہمک رہا۔ چند منٹ تک وہ مجھے کھڑے دیکھتے رہے مگر پھر آواز دے کہنے لگے۔ "موہن اب بس کرو اور سو جاؤ"۔ "میں نے عرض کیا" بھیا یہ قصہ غیر معمولی دلچسپ ہے اسے ختم کرنے دو۔ دراصل مجھے نیند بھی نہیں آرہی ہے۔"

بھیا نے میری بات کی کوئی پرواہ نہ کی۔ میرے ہاتھ سے کتاب چھین لی اور اسے طاق پر رکھ دیا۔ میں نے بہت عاجزی کی مگر وہ اپنی دھن کے بہت پکے تھے۔

بالآخر مجبور ہو کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بہت دیر اسی کے دھیان میں غرق رہا۔ سُراغ رساں اور قاتلوں کا قصہ تھا اور میں نے صرف پون حصہ ختم کیا تھا۔ قاتل کدھر فرار ہو گئے؟ اس کا انجام کیا ہوا کیا سُراغ رساں نے ان کا پتہ لگایا؟ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا۔ کاش بھیا اس قسم کی مداخلت نہ کرتے! غصہ کے مارے میں بے تاب ہو رہا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ قاتل گرفتار ہوئے یا نہیں گرفتار ہوئے تو کس طرح؟ کہاں پر؟

اسی سوچ میں شائد آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ مجھے کمرے میں ایک ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ لیکن کچھ دیر تک کوئی آواز نہ آنے پر میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ شائد وہ آواز صرف ہوا کی وجہ سے ہو۔ لیکن ..... وہ کیا تھا؟...... میرا سانس زور زور سے چلنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پھر وہی آہٹ جیسے کوئی شخص دبے پاؤں میرے کمرے میں پھر رہا ہے۔ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دل اس طرح دھڑک رہا تھا کہ ایک میل کے فاصلے پر بھی اس کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ یہ تو بے شک صحیح تھا کہ کوئی شخص کمرے میں ہے لیکن ہے کون؟

شائد بڑے بھیّا یہ دیکھنے آئے تھے کہ میں سو رہا ہوں یا نہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی گزرا کہ بھیّا اس طرح نہیں چھپتے۔ پھر میرے دل و دماغ پر ایک بجلی سی کوند گئی۔ شائد کوئی چور ہوگا! جونہی یہ خوفناک خیال دل میں آیا میں اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ غضب خدا کا! ایک چور نہیں بلکہ تیں اور تیسوں میرے ہی کمرے میں!...... میں چلانا چاہتا تھا کہ تمام گھر والے ہوشیار ہو جائیں مگر آواز کہاں! ...... خوف کے مارے ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ بے اختیار میں دعائیں کرنے لگا۔ اے خدا! جس طرح بھی ہو مجھے ان قاتلوں سے محفوظ رکھ۔ اس آفت کو دُور کر دے۔ مجھے بچا لے ...... اور پھر بھیّا؟........ بھیّا کہاں! اور ایک بار میں نے کوشش کی کہ کسی کو پکاروں لیکن زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں خوف سے بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔

اس عرصے میں چور میرے کمرے کو ٹٹول چکے تھے۔ اور خدا جانے وہ کیا لے جا رہے تھے وہ سب کے سب ایک کھڑکی کی طرف جھانک رہے تھے ان میں سے ایک کھڑکی کی طرف بڑھا اور پھر اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اس کے پیچھے چلے آئیں۔ اس وقت نہ معلوم ان کمبختوں کو کیا گمان پیدا ہوا وہ پھر وہاں سے کمرے میں واپس آئے۔ یا خدا! وہ اس طرف بڑھ رہے ہیں۔ خوف و ہراس کے عالم میں میں ایک پتھر کی بے جان مورت بنا بیٹھا تھا لیکن دفعتاً معاملہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے مجھ میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت میری حیات معرضِ خطر میں تھی۔ میں پلنگ سے اُچھل پڑا اور چلانے والا تھا کہ پہلے چوروں نے میرے مُنہ میں ایک کپڑا ٹھونس دیا اور مجھے پکڑ کر انتہائی بے رحمی سے گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ میں نے بارہا کوشش کی کہ خود کو ان ظالموں کے پنجے سے چھڑا لوں۔ لیکن میری تمام جد و جہد بے سُود تھی۔ اتنے میں میرا سر دیوار سے ایسا ٹکرایا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب میری آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو گھر کے باہر پایا۔

غفلت میں میں یہ نہ معلوم کر سکا کہ وہ مجھے کس طرح باہر لے گئے۔ وہ اسی طرح گھسیٹ کر لے جا رہے تھے کہ اس کشمکش میں میرے مُنہ سے کپڑا نکل گیا اور میں پکارنے لگا۔ ارے مجھے چھوڑ دو۔ میں نے کیا خطا کی؟ مجھے کہاں لے جاؤ گے؟ اس کا جواب صرف یہ تھا کہ وہ اور تیزی سے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے میں نے اپنے ملازموں کو آواز دی۔ پھر بھیّا کو بلایا۔ لیکن آواز بھی شائد اس تاریکی میں گم ہو گئی۔ اور میں ان کے چنگل سے باہر تھا۔ میں نے انھیں ڈرایا ...... دھمکی دی ...... عاجزی کی اور بالآخر رونا شروع کر دیا۔ لیکن میرے رونے پر اُن ظالموں کو کچھ رحم نہ آیا........ میری موت میرے سامنے کھڑی تھی۔ خیال ہوا کہ یقیناً یہ مجھے قتل کر دیں گے۔ میں نے سوچا کہ میں خدا کا نام لے کر اس پیغامِ اجل کا جواب

دوں۔ دفعتاً میری نظر چوروں کے سردار پر پڑی۔ وہ اپنی تلوار نکالے ہوئے میری طرف ... ہمت ٹوٹ گئی اور میں دیوانوں کی طرح چلایا........ مجھے کوئی بچالو..... ان کے ہاتھ سے بھیا... بھیا.. کہاں ہو۔ اے خدا! میں نے کیا گناہ کیا تھا کہ مجھے اس طرح سزا دی جائے گی اور یہ ان کمینوں اور ظالموں کے ہاتھ ہلاک ہو رہا ہوں........ آہ! میری نظر میں سارا عالم چکر کھا رہا تھا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ تلوار کی مار ابھی نہیں پڑی تھی... یہ اذیت فوراً کیوں ختم نہیں کی جاتی! میں زمین سے اٹھایا جا رہا ہوں۔ کس وجہ سے؟...... اللہ!..... اللہ!.... پھر وہ کیا؟..... ایک زور کا قہقہہ..... پھر..... پھر کیا مجھے فرشتے فضائے بسیط میں سے پرندہ کی طرح لے جا رہے ہیں میں ہاتھ آگے بڑھاتا ہوں لیکن ہاتھ کچھ نہیں آتا...... اللہ مجھ پر رحم کریں اندھے کنوئیں میں گر رہا ہوں! کیا اس وجہ سے کہ میرا سر اور بدن چکنا چور ہو جائے؟ میں نے ایک دردناک آواز نکالی اور اس کنوئیں میں گر پڑا۔!!!

....

موہن! موہن!

میری آنکھ کھلی۔ بھیا پاس کھڑے ہوئے مسکرا رہے تھے کیوں جناب سر پھوڑنے کے ارادے سے اس طرح بستر پر لوٹ رہے تھے کہ نیچے گر پڑے؟

میں نے اپنے کانپتے ہوئے جسم کو تھوڑی دیر میں سنبھال لیا پھر بھیا کے کندھے پر سر رکھ دیا... اور..... پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"موہن"

متعلم سال اوّل

کن وفادار غلاموں نے بغاوت کر دی	خواجگی سر بہ گریباں نظر آتی ہے مجھے	شاہد
پھول پھول ہنستا ہے ڈال ڈال گاتی ہے	تم چمن میں آتے ہو یا بہار آتی ہے	حیرت
چمن میں سوگ ہے اس بدنصیب غنچہ کا	جو ایک رات بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکا	ناہر
وہم کا منتہا ہے عقل، عقل سے ماورا ہے عشق	عشق نہ ہو تو فتنۂ دیر و حرم قدم قدم	ہادی
کارفرما تھا خم ابروئے دوست	آسماں کرتا ستم ایجاد کیا	خالد
چشم جاناں میں وہ انداز ستم بھی نہ رہا	عیش تو کیا مری تقدیر میں غم بھی نہ رہا	حسام

غزل

جناب ہیم چندر پرشاد صاحب فہیمؔ

نہ کچھ قرار میں لذت نہ اضطراب میں ہے
جو زندگی کا مزا ہے تو انقلاب میں ہے

پلانا ہے تجھے ساقی تو بس پلائے جا
کہ لطفِ بادہ کشی عالمِ شباب میں ہے

جو بھول کر بھی ہمیں یاد تک نہیں کرتا
اُسی کی یاد دلِ خانماں خراب میں ہے

جنابِ شادؔ ہیں نظروں سے گو نہاں لیکن
کلامِ شادؔ ہر اک چشمِ انتخاب میں ہے

فراقِ یار کی حالت بیان کیا کیجے
یہ مختصر ہے کہ جانِ حزیں عذاب میں ہے

جو دل کی آنکھ سے دیکھا تو یہ نظر آیا
شہود میں ہے وہی اور وہی حجاب میں ہے

تجلیٔ رُخِ پُر نور جب سے دیکھی ہے
حسد کا داغ پڑا قلبِ ماہتاب میں ہے

فہیمؔ پر نگہ التفات ہو جائے
اُمیدوار کرم کا تیری جناب میں ہے

مسٹر ہیم چندر پرشاد

نائب صدر دوم اتحاد اردو

روئداد بزم اتحاد اردو

بزم اتحاد اردو کی کابینہ بابتہ سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء حسب ذیل عہدہ داروں پر مشتمل تھی

صدر ۔ جناب پروفیسر احمد عبداللہ صاحب صدیقی

نائب صدر ۔ جناب ہیم چندر پرشاد صاحب

معتمدین ۔ جناب محمد جعفر صاحب
محمد امیر اللہ خاں

خازن ۔ جناب محمد فصیح الدین صاحب

اراکین ۔ جناب حامد علی صاحب ۔ جناب حامد حسین صاحب ۔ جناب عالم حبیب صاحب ۔ جناب علی محمد خسرو ۔ جناب انیس الرحمن صاحب ۔ جناب مس عاصمۃ الرحمن ۔ جناب مس صلوبی فریب

بزم کی کارروائیوں کا آغاز جلسہ افتتاحیہ سے ہوا۔ عالیجناب نواب ظہیر یار جنگ بہادر امیر پائیگاہ نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ اس موقع پر قاضی عبدالغفار صاحب اڈیٹر "پیام" نے "طلبا سے خطاب" کے عنوان پر ایک بصیرت افروز تقریر فرمائی[1]۔ آپ نے کہا کہ طلبا کو سیاسیات میں عملی حصہ نہیں لینا چاہیے۔ لیکن سیاسی حالات سے خود کو ضرور باخبر رکھنا چاہیے۔ جناب ساغر صاحب نظامی نے جو اتفاق سے ان دنوں حیدرآباد میں مقیم تھے اپنا منتخب کلام سنایا۔ صدارتی اختتامی تقریر میں نواب صاحب نے فرمایا کہ "مجھے بزم اتحاد اردو سے اس لیے خاص دلچسپی ہے کہ اس کا مقصد اولین اردو ادب کو ترقی دینا ہے۔ ہندوستان کو اگر دنیا کے سامنے ایک متحدہ قوم کی شکل میں آنا ہے تو ہندوستان کو ایک مشترکہ زبان کی ضرورت ہے

---

[1] "خطاب" کے عنوان سے یہ تقریر گزشتہ شمارہ میں شائع ہو چکی ہے۔ (اسرائیل احمد مینائی)

جو اس ملک کی قومی زبان کہلائی جا سکے۔ میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ صرف اردو ہی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔" صدارتی تقریر کے بعد جلسہ کامیابی کیساتھ اختتام کو پہنچا۔ جلسہ میں معزز مہمانوں کے علاوہ کالج کے قدیم طلبانے بھی شرکت فرمائی۔

بزم نے سال کے آغاز پر تقریری جلسوں اور مباحثوں کا ایک مکمل نظام العمل مرتب کرکے شائع کیا۔ اور پورے سال بھر اس پر عمل پیرا رہی۔ اس سال کا نظام العمل سترہ جلسوں پر مشتمل تھا جن کی تفصیل یہ ہے۔

نشان سلسلہ	موضوعات	محرک	مخالف
۱	ع "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی"	بدری نارائن اتھی سال چہارم	قاضی محمد بشیر الدین سال دوم
۲	ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی تجدید بیروزگاری کا صحیح حل ہے۔	سید ضیاء الحسن جعفری ، دوم	سید علی محمد خسرو ، ،
۳	اُردو ادب میں نئے رجحانات "	حامد حسین ، چہارم	(مقالہ)
۴	فی البدیہہ تقریری مقابلہ میقات اول		
۵	ہندوستان کی ترقی کا راز اس کی صنعت وحرفت سے زیادہ اس کی زراعت پر منحصر ہے	ہنمنت راؤ ایم۔ اے فائنل	محمد فرید الدین احمد ایم۔ اے فائنل (مقالہ)
۶	"اُردو کی مشترکہ حیثیت "	محمد جعفر سال سوم	
۷	ہندوستان کو سیاسی سے زیادہ سماجی اصلاحات کی ضرورت ہے۔	میر مصطفیٰ علیخاں سال چہارم	محمد عبد الہادی سال چہارم
۸	اشتراکیت ایک فرسودہ نظام ہے۔	احمد عبد اللہ ایم اے ابتدائی	عابد حسن سال اول
۹	ہندوستان میں متحدہ قومیت ممکن ہے۔	شیخ سعادت علی ایم اے فائنل	ناگشتی بی۔ ایس۔ سی ابتدائی
۱۰	ع افراد پہ موقوف ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ	ابو الحسن محمد حبیب اللہ سال دوم	قاضی محمد بشیر الدین سال دوم
۱۱	فی البدیہہ تقریری مقابلہ میقات دوم		

۱۲۔ سائنس نے نوع انسانی کو نقصان سے زیادہ فائدہ پہنچایا ہے	عبدالحکیم ایم۔ اے (ابتدائی)	احمد عبداللہ ایم۔ اے (ابتدائی)
۱۳۔ اچھی حکومت کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ جمہوری ہی ہو۔	حامد حسین صاحب سال چہارم	احمد علی خاں صاحب سال چہارم
۱۴۔ جمہوریت ہندوستان کے لئے ناموزوں ہے۔	محمد عبدالہادی سال چہارم	حامد حسین سال چہارم
۱۵۔ جب مذہب سیاست سے جدا ہو تو رہ جاتی ہے چنگیزی	ابوالحسن محمد حبیب اللہ ، دوم	سید نورالوہاب ، دوم
۱۶۔ فی البدیہ تقریری مقابلہ میقات سوم	....	....
۱۷۔ عدم تشدد قانون فطرت کے خلاف ہے۔	عابد حسین سال اول	بصرت پال سال دوم

طلبا نے ان جلسوں میں عملی طور پر شرکت کر کے جذبہ اشتراک عمل کا امید افزا ثبوت دیا۔ ایوان میں سامعین کی تعداد ہمیشہ حوصلہ افزا رہی مقررین کی تعداد گزشتہ سال کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔ ہر جماعت کے طلبا تقریروں اور مباحثوں میں حصہ لینے کے علاوہ مختلف معیاری مقالے بھی پڑھے گئے۔

طلبا میں تقریر کا ذوق پیدا کرنے کے لئے انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے طلباء کے لئے علیحدہ علیحدہ فی البدیہ تقریری مقابلے رکھے گئے۔ جو ہر میقات کے آغاز میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ طلبا نے ان مقابلوں میں پوری طرح دلچسپی لی۔ حسب ذیل طلبا تیسری میقات کے اختتام پر انعام کے مستحق قرار پائے۔

بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی

۱۔ جناب عبدالہادی صاحب اوّل

۲۔ جناب حامد حسین صاحب دوم

انٹرمیڈیٹ

۱۔ جناب قاضی احمد بشیر الدین صاحب اوّل

۲ ، ابوالحسن محمد حبیب اللہ صاحب دوم

۳ ، عابد حسین صاحب ،

بزم کی جانب سے "غیر معمولی" جلسہ بھی منعقد کئے گئے۔ ایک جلسہ

پروفیسر غلام دستگیر صاحب رشید کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں خواجہ عبدالمجید خانصاحب دہلوی نے جو نظام کالج کے ایک قدیم طالب علم اور ہندوستان کے نامور ادیب ہیں دکنی اور دہلوی اُردو کی امتیازی خصوصیات پر تقریر فرمائی۔

ایک جلسہ کی صدارت راجہ گرو داس صاحب معتمد کمیٹی جاگیرداران نے فرمائی۔ "ہندوستان میں متحدہ قومیت ممکن ہے" موضوع مباحثہ تھا۔ کالج کے اچھے مقرروں نے موافقت و مخالفت میں دلچسپ تقریریں کیں۔ جناب صدر نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ "مذہبی معاملات اور سیاسی مسائل کو آپس میں کبھی نہیں ٹکرانا چاہئے۔ کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ اس کے بسنے والوں میں اتحاد و اتفاق نہ ہو اور وسیع النظری سے کام نہ لیا جاتا ہو۔ ہمارے آپس کے عارضی اختلافات بہت جلد دُور ہوسکتے ہیں اور ہندوستان ایک متحدہ قومیت کا اعلیٰ اور قابل تقلید نمونہ پیش کرسکتا ہے۔

بزم کا سالانہ بین الکلیاتی سالار جنگ فی البدیہ تقریری مقابلہ ماہ فروری کے تیسرے ہفتے میں منعقد ہوا۔ نظام کالج اور سٹی کالج کے طلباء نے اس میں شرکت کی ہر کلیہ کی جانب سے دو جماعتیں شریک تھیں۔ جناب مولوی محمد عبدالرحمٰن خانصاحب سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ۔ جناب مولوی مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب سابق رکن عدالت العالیہ اور جناب مولوی خواجہ معین الدین صاحب انصاری معتمد سیاسیات بحیثیت حکم شریک جلسہ تھے۔

مقابلہ کے لئے حسب ذیل موضوعات دئے گئے تھے۔

۱ - اشیاء پر سرکار عالی کی نگرانی کی وجہ سے رعایا پر کیا اثرات پڑرہے ہیں۔

۲ - طلباء کو سیاسیات میں کس حد تک حصہ لینا چاہئے۔

۳ - موجودہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان کی صنعت پر کیا اثرات پڑرہے ہیں اور جنگ کے بعد کیا اثرات پڑنے کی توقع ہے۔

سٹی کالج کی جماعت جو مجید احمد صاحب فاروقی اور سید حامد علی صاحب پر مشتمل تھی اول رہی۔

بزم کا سالانہ مشاعرہ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا۔ آنریبل راجہ دھرم کرن بہادر آصفجاہی

صدرالمہام تعمیرات نے مشاعرہ کی صدارت فرمائی تقریباً (۳۰) مشہور مقامی و بیرونی شعراء نے اپنا منتخب کلام سنایا۔ شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر نے اپنی غزل سے سرفراز فرما کر مشاعرہ کو عزت بخشی۔ ہندوستان کے مشہور شعراء جناب مولانا حسرت موہانی، جناب جگر مرادآبادی، جناب تمنا عمادی اور جناب بزم نے اپنی شرکت سے مشاعرہ کو کامیاب بنایا۔

بزم اتحاد اردو کی جانب سے ایک ششماہی رسالہ "نظام ادب" شائع کیا جاتا ہے۔ اس پرچہ کی ادارت اردو ادب کی مایۂ ناز ہستی پروفیسر آغا حیدر حسن کے سپرد کی گئی ہے۔ صاحب موصوف کی دلچسپی کی وجہ طلباء و طالبات میں اردو ادب کا ذوق صحیح پیدا ہو رہا ہے۔ اس سال نظام ادب کی معتمدی کے لئے اسرائیل احمد صاحب مینائی کا انتخاب عمل میں آیا۔ اور قاضی عبدالرشید صاحب شریک معتمد نامزد کئے گئے اسرائیل احمد صاحب کی دلچسپی اور جانفشانی نے پرچہ کے معیار کو بلند کر دیا۔ طلباء و طالبات کے مختلف موضوعات پر دلچسپ مضامین کے علاوہ ہندوستان کے مشہور ادیبوں نے قلمی معاونت سے ادب نوازی کا ثبوت دے کر پرچے کی رونق میں چار چاند لگا دیئے۔ نظام ادب اپنے بلند پایۂ مضامین کے لحاظ سے نہ صرف حیدرآباد، بلکہ بیرون ملک میں بھی مقبول ہوا۔ ایک مدت سے یہ بات محسوس کی جا رہی تھی کہ نظام ادب کو ایک پائدار اساس پر قائم کرنے کے لئے یہ امر ضروری ہے کہ، انگریزی میگزین کی طرح اردو رسالہ کے لئے بھی طلباء، اور طالبات پر چندہ دینا لازمی قرار دیا جائے۔ تاکہ نظام ادب کی مستقل زندگی کی ضمانت دی جا سکے۔

بزم اردو جناب قادر حسین خانصاحب صدر کلیہ کی شکرگزار ہے کہ صاحب موصوف نے ازراہ ادب نوازی اس تحریک کو منظور فرمایا جس کی وجہ سے پرچہ کی اشاعت میں جو مالی مشکلات سد راہ ہوتی تھیں ہمیشہ کے لئے رفع ہوگئیں۔

بزم کا یوم سالانہ عالیجناب نواب صدر اعظم بہادر بالقابہ کی صدارت میں منایا گیا۔ ودا عیہ خطابہ عالیجناب غلام محمد صاحب صدرالمہام فینانس نے ارشاد فرمایا۔ صاحبان موصوف کی شرکت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان حضرات کو اردو ادب کی ترقی سے کس درجہ دلچسپی ہے۔ عالیجناب نواب صدر اعظم بہادر، اور صاحب فینانس

ممبر نے جس مشفقانہ اور حکیمانہ انداز میں اپنی بصیرت افروز تقاریر میں طلباء کی راہ نمائی فرمائی وہ بزم اتحاد اردو نظام کالج کی تاریخ میں ایک عہد آفریں واقعہ ہے۔ جلسہ میں حیدرآباد کے دیگر معززین کے علاوہ کلیہ کے سابق طلبا بھی شریک رہے۔

بزم کی کارروائیوں کو روبہ عمل لانے کے لئے محترم صدر کلیہ نے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں اور اپنی گرانقدر ہدایات سے ہماری رہبری فرمائی۔ ہماری آئندہ اُمیدیں بھی آپ ہی کی ذات سے وابستہ ہیں۔ پروفیسر صاحبان نے بھی بزم سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اس خصوص میں بزم پروفیسر احمد عبداللہ صاحب صدیقی صدر بزم پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب ڈاکٹر زاہد علی صاحب اور پروفیسر غلام دستگیر صاحب رشید کی حد درجہ ممنون ہے قدیم طلبا نے بزم کے معاملات میں ہر طرح سے اعانت فرمائی ہم بزم کی جانب سے ان کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتے ہیں۔

آخر میں میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ عالیجناب پرنسپل صاحب و صدر صاحب بزم و نائب صدر صاحب بزم کا دلی شکریہ ادا کروں جنہوں نے فرائض کی تکمیل میں میری گرانقدر رہنمائی فرمائی۔ معزز اراکین بزم بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے متعدی سے اپنے فرائض انجام دیئے۔"

محمد امیر اللہ خان
معتمد بزم اتحاد اردو

یہ آفتاب سے گرمی اسکی کبریائی کا — کہ ذرہ ذرہ ہے آئینہ خودنمائی کا — امیر

سرد آہیں جب کسی نے کہیں وطن یاد آگیا — چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے چمن یاد آگیا — "

ترے تیر کی خطا کیا مری حسرتوں نے روکا — نہ لپٹتیں یہ بلائیں تو وہ دل کے پار ہوتا — "

جمال یار کو کہتے ہو تم کہ ہاں دیکھا — کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا — "

کونسی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں — شوق دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر — "

پڑے سے اسکی ذات کو کیا کام تھا امیر — چھپ کر صفات نامتناہی میں رہ گئی — "

NIZAM COLLEGE

نظامِ ادب

جلد ۲ — بابتہ ستمبر سنہ ۱۹۴۲ عیسوی — شمارہ ۱

طلبائے نظام کالج کا ششماہی رسالہ

زیر نگرانی

جناب آغا حیدر حسن صاحب دہلوی پروفیسر اردو

جناب احمد عبداللہ صاحب صدیقی پروفیسر اردو

جناب غلام دستگیر صاحب رشید پروفیسر فارسی

جناب سید بادشاہ حسین صاحب (سابق طالب علم)

مجلس ادارت

مدیر — سید منظور الحسن ہاشمی صاحب (سال چہارم)

شریک مدیر — غلام جیلانی صاحب (سال چہارم)

معتمد — میر غلام حسن علی (سال سوم)

شریک معتمد — سید ناظم الدین صاحب (سال سوم)

اراکین

عبدالہادی صاحب (سال دوم) — ضیاء الحسن جعفری صاحب (مدرسہ عالیہ)

ہیم چندر پرشاد صاحب (سال دوم)

سالانہ چندہ دو روپیہ

شرح اشتہارات

پورا صفحہ ———————— دس روپیہ

نصف صفحہ ———————— چھ روپیہ

مضامین اور چندہ ارسال کرنے کا پتہ

"معتمد نظام ادب" نظام کالج حیدرآباد دکن

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز اعظم بلڈنگس حیدرآباد

فہرست مضامین

شذرات

نظام اَدب کی زندگی کا یہ دوسرا سال ہے۔ سارے ملک کے علمی اور ادبی حلقوں نے گذشتہ اِشاعت کو جس نظر قبولیت سے دیکھا اور ہندوستان کے مختلف رسائل اور اخبارات نے جس طرز میں اس پر اظہار رائے کیا وہ یقیناً سال گذشتہ کے اراکین بزم اور مجلس ادارت کی پرخلوص کوششوں کا حوصلہ افزا صلہ ہے۔ زیر نظر اشاعت میں اس امر کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے کہ مضامین میں تنوع ہونے کے سوا زیادہ سے زیادہ دلچسپی بھی ہو۔ ہم اسے اپنی خوش قسمتی پر محمول کرتے ہیں کہ رسالہ سے دلچسپی رکھنے والے نہ صرف طلبائے کلیہ ہیں بلکہ اساتذہ کلیہ اور طلبائے قدیم بھی جنھوں نے ہر طرح اشتراک عمل کیا۔

پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب دہلوی کے مضمون "حیدرآباد سے کشمیر تک" کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ آغا صاحب کی تحریر میں جو خاص رنگ پایا جاتا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ یہ مضمون آغا صاحب کا تازہ ترین ہے۔ کچھ عرصہ پہلے آپ کشمیر تشریف لے گئے تھے اور حال ہی میں حیدرآباد کی نشرگاہ کی فرمائش پر آپ نے اپنے مشاہدات اور تجربات سنائے۔ وقت کی تنگی کا لحاظ رکھتے ہوئے مضمون کو جا بجا مختصر کر دیا گیا تھا اور اب ہم اسی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔

پروفیسر آئنگار صاحب کا مضمون "حیدرآباد کی معاشیات" کا مطالعہ کافی دلچسپ اور مفید ہوگا۔ آئنگار صاحب کا مطالعہ بہت وسیع اور عمیق ہے۔ خصوصاً حیدرآباد کی معاشی زندگی سے آپ کو گہرا لگاؤ ہے۔ مضمون زیر اشاعت میں آپ نے حیدرآباد کی موجودہ معاشی حالت پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن امکانات پر بحث کی ہے جن سے حیدرآباد کا معاشی نظام بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مقالہ ناظرین کے لئے کارآمد ثابت ہوگا۔

پروفیسر ہنمنت راؤ صاحب کے فلسفیانہ مضمون Education of Soul کا ترجمہ احمد الدین صدیقی صاحب نے سلیس اور عام فہم زبان میں کیا ہے۔ مضمون ایک نئے زاویہ نگاہ سے لکھا گیا ہے جو موجودہ زمانے کے لحاظ سے جس کا رجحان زیادہ تر مادیت کی طرف ہے دعوت فکر و عمل دیتا ہے۔

"ناکارہ" حیدرآبادی کا ڈرامہ مزاحیہ طرز تحریر کا پاکیزہ نمونہ ہے۔ اس میں طنز کی وہ جھلک موجود ہے۔ جو شعراء کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ممکن ہے باعث مسرت نہ ہو۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ناظرین اس میں حقیقت حال کی دلچسپ تصویر دیکھیں گے۔

بادشاہ حسین صاحب کا مزاحیہ افسانہ "مجھے بلیوں سے نفرت ہے" اپنی طرز کا انوکھا اور بہت ہی دلچسپ افسانہ ہے۔ جدید تہذیب پر جس نے کتے بلیوں سے شیفتگی کو شائستگی قرار دے رکھا ہے بہت ہی لطیف طنز ہے۔ یہ اس وقت اور زیادہ لطف دیتا ہے جبکہ ہماری نظروں کے سامنے کبوتر اور بٹیر والی معاشرت اپنی بدحالیوں کے ساتھ موجود ہو۔

طلبائے نظام کالج کے مضامین میں "پریم چند اور ان کے افسانے" "مکاتیب اُردو" "دستور انگلستان" وغیرہ کافی دلچسپ ہیں۔ شوکت علی خاں صاحب نے پریم چند کے افسانوں پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے اس پہلو پر زیادہ روشنی ڈالی ہے کہ افسانوں میں پریم چند کا ذاتی مشاہدہ اور خود ان کی زندگی کی جھلک کس حد تک موجود ہے۔ "مکاتیب اُردو" ایک دلچسپ مقالہ ہے جس میں غلام جیلانی صاحب نے بڑی محنت سے مختلف خطوط کے مجموعوں سے نمونے پیش کئے ہیں اور ہر مصنف کی طرز تحریر پر اپنے اور دیگر ناقدین اُردو کے خیالات پیش کئے ہیں۔ "دستور انگلستان" کو عباس جعفری صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے عبارت سلیس اور آسان ہے جسے ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ مقالہ کافی جستجو اور محنت کے بعد سپرد قلم کیا گیا ہے۔ علی عباس صاحب نے ایک دلچسپ ڈرامہ صاف زبان میں پیش کیا ہے۔ حسن علی صاحب کا مقالہ "ہندوستان کے عہد قدیم کی جامعات" تلاش و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کو پڑھنے کے بعد ہم قدیم ہندوستان کی علم پروری اور علم دوستی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کچھ عرصے سے طلبا، مدرسہ عالیہ ایک علٰحدہ رسالہ "ادب عالیہ" کے نام سے جاری کرنے کی فکر میں تھے۔ لیکن اَب باہمی مشورے کے بعد طے پایا ہے کہ جس طرح مدرسہ عالیہ نظام کالج میں شامل ہے اسی طرح مدرسہ کا رسالہ بھی کالج کے رسالے میں شامل کر لیا جائے۔ اس میں مدرسہ کی چھوٹی جماعتوں کے بچوں کے مضامین بھی درج ہونگے۔ اس کی مجلس ادارت اور مجلس نگران الگ قائم رہے گی اور یہ حصہ نظام ادب کا ایک مستقل ضمیمہ سمجھا جائیگا۔ امید ہے کہ اس تعاون سے اچھے نتائج برآمد ہونگے۔

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی نے اپنی خداداد ذہانت سے جو عظیم ترین کامیابی حاصل کی ہے اسے ملک کی بیدار بختی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ریاست نے علوم و فنون کی ترقی میں جو سعی پیہم کی اس کا ثمر اسے بالآخر مل ہی گیا گو یہ صحیح ہے کہ کوئی ملک "نوبل پرائز" حاصل کرنے والا پیدا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ غیر معمولی فرس اور ذہین انسان اتفاق ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر بھی اسے ایسے فرزند پر فخر کرنے کا حق تو بہر حال حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کامیابی نہ صرف جامعہ عثمانیہ کے لئے یا سارے حیدرآباد کے لئے بلکہ سارے ہندوستان کے لئے یکساں مایۂ افتخار ہے کہ اس نے پہلے ادب اور اب طبعیات میں دوسری مرتبہ اپنا لوہا خداوندان مغرب سے منوا ہی لیا۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پر خلوص ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کی وفات نہ صرف ریاست حیدرآباد کے لئے ایک نقصان عظیم ہے بلکہ نظام کالج کے لئے ایک ایسا المناک سانحہ ہے جس کا اظہار قلم کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا مہاراجہ بہادر اس درسگاہ کے قدیم ترین فرزندوں میں سے تھے اُنہیں اس سے جو والہانہ محبت تھی اس کا معمولی سا مظاہرہ اکثر و بیشتر سالانہ جلسوں اور مشاعروں کی صدارت سے ہوتا تھا۔ اِس لئے مہاراجہ کی غیر موجودگی میں ہم یہ محسوس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک پُر خلوص سرپرست سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔

مہاراجہ کو اردو ادب کا محسن سمجھنا چاہیئے۔ اپنی بے مثال فیاضیوں کے سوا نثر و نظم کے ذریعہ جو گراں بہا خدمات انجام دیں وہ یقیناً ناقابل فراموش ہیں ہیں اُن کے صاحبزادوں

اور دوسرے اراکین خاندان سے دلی ہمدردی ہے۔

لیڈی حیدری کے انتقال سے حیدرآباد کو اور خصوصاً یہاں کے طبقہ اناث کو جو نقصان پہونچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ آپ ایک روشن خیال اور ہمدرد خاتون تھیں۔ حیدرآباد کی عورتوں کی فلاح و بہبودی کے لئے کثیر مصروفیات کے باوجود آپ نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی خدا مرحومہ کو غریق رحمت فرمائے۔ اور رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ اور اُن کے فرزندوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

بیگم آغا حیدر حسن کا انتقال ایک تیسرا سانحہ ہے جس نے حیدرآباد کو ایک ایسی خاتون سے محروم کر دیا جو علم و ادب کا پاکیزہ ذوق رکھتی تھیں۔ خدا مرحومہ کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ ہمیں پروفیسر آغا حیدر حسن صاحب سے دلی ہمدردی ہے۔

مدیر

ایک ممتاز اولڈ بوائے

آنجہانی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر
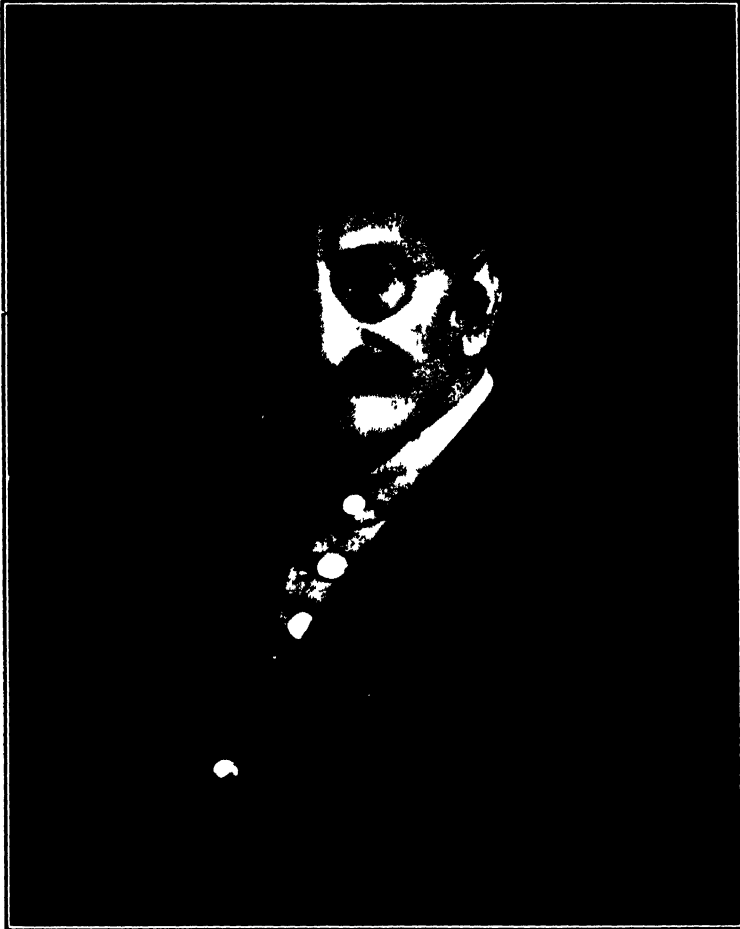
(نتیجۂ فکر عالیجناب نواب معین الدولہ بہادر معینؔ امیر پائیگاہ)

کچھ کھیل نہیں تھا لینا ارباب وفا کی جانوں کا
بس شمع بھی جلکر ڈھیر ہوئی یہ صبر پڑا پروانوں کا

دل کا ہی سفینہ ڈوب گیا آزاد ہوں اب تو ہر غم سے
تشویش نہیں کچھ موجوں کی کچھ خوف نہیں طوفانوں کا

گو نذر کیا سر قاتل کی حسرت بھی نکالی سب دل کی
پھر بھی یہ رہا افسوس ہمیں بدلہ نہ ہوا احسانوں کا

کیا خانۂ دل کا حال کہوں ویرانی سی ویرانی ہے
تھی بھیڑ کبھی حسرت کی یہاں مجمع تھا کبھی ارمانوں کا

نظروں سے گرا کر آہ مجھے توقیر بڑھائی غیروں کی
یہ کہہ کے اٹھایا محفل سے کیا کام یہاں بیگانوں کا

وہ لطف نہ اب عشرت میں رہا اب عیش میں وہ لذت نہ رہی
وہ آنکھ نہیں ہے ساقی کی وہ رنگ نہیں میخانوں کا

جتنی چاہوں پیتا ہوں معیںؔ ساقی کو مجھ سے شکوہ نہیں
خالی ہوں جہاں پر خم کے خم کیا ذکر وہاں پیمانوں کا

حیدرآباد سے کشمیر تک

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں تو مرزا بیچارے نے حیدرآباد دکھن سے کشمیر کا ارادہ کیا۔ بھوپال آگرے ہوتا ہوا دلی پہونچا۔ یہاں اپنے عزیزوں سے ملا۔ کوئی ایک دن مشکل سے رہا ہوگا کہ رستے میں شہر دلی جاتے ہوئے غالب جنگ مرحوم کے گھرانے والے ملے۔ جمعدار فتح جنگ اور انکے دو فرزند نواب جانی اور پیارے نواب ساتھ تھے۔ زنانی سواریوں میں سات خاصے کی بیگمات اور ماما اصیلوں۔ لونڈیوں باندیوں کا قافلہ ساتھ تھا۔ رستے میں علیک سلیک ہوئی۔ کیوں بھئی تم کہاں۔ کیوں بھئی تم کہاں کے سوال جواب ہوئے تو جواب کشمیر ملا۔ ایلو پھر کیا تھا۔ انہوں نے شرم حضوری منھ چوانے کو مرزا سے کہا کہ چلو ہمارے ساتھ ہی چلو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مرزا نے اس تکلف کی رسمی دعوت کو بڑی بے تکلفی کے انداز میں قبول کیا اور گلے کا ہار ہوگیا۔ یہ ہیبت کہ کہیں انکار سے ارادہ رفاقت نہ بدل جائے۔ لاسے کی طرح چپک گیا۔ اور ایک لمحہ کو ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ مرزا کا ارادہ تھا کہ دلی سے جڑاول کا سامان لیس کرے تو کشمیر جائے۔ اب جو ایسا اچھا ساتھ ملا تو بھلا اس کو کیا چھوڑنے والا تھا۔ کسی کی شال۔ کسی کی رضائی۔ کسی سے بالاپوش تو کسی سے توشک۔ سامان سمیٹ سمٹا باندھ بوندھ سب کے ساتھ محلہ جا جموں کی سدھ کھینچی۔ عزیز و اقارب رو کتے ہی رہے یہہ روانہ ہوگیا۔ جیسے تیراسوت نہ میری بُنائی جنگلی توتے کی طرح یہ جا وہ جا۔ جیٹھ بیساکھ کی گرمیاں بلا کی ہوتی ہیں۔ وہ لوکہ الحفیظ الامان۔ برف کی سلیں کی سلیں لے لے کے ڈبہ میں جائیں رومال تولئے بھگو بھگو کے سروں پر رکھتے

رنگتروں کے شربت پیتے۔ اللہ اللہ کرکے لاہور پہونچے۔

مہاراجہ ہری سنگھ جی والی کشمیر کی خاصے کی ڈاک گاڑی دلی کے محطہ پر ملی تھی اُن کے ہاں مہاراجکمار ولادت میں پیدا ہوئے تھے۔ ساتھ مہارانی صاحبہ مہان عملہ فعلہ کے لوگ معززمہمان حضرت شاہ صاحب جو خلد آشیان کے مرشد کے گھرانے کے ہیں اور نواب قیصر جنگ جو بیحد حسین ہیں۔ عمر چالیس سے تجاوز کر چکی ہے لیکن صورت میں وہ موہنی ہے کہ دلوں کو موہے لیتی ہے۔ مرزا اُن کو بیحد چاہتا اور منہ بولا رشتہ لگا۔ محبوب ماموں جان کہتا۔ ان لوگوں نے جمعدار صاحب سے ساتھ چلنے کو کہا لیکن لاہور کی سیر کے ارادے سے یہ ساتھ ہوئے لاہور اُترے نورجہاں اور جہانگیر کے مقبروں کی سیر کی۔ چلچلاتی دہوپ میں ادہر کے ادہر مارے تماڑے پڑے پھرا کئے۔ لاہور سے وزیرآباد ہوتے ہوئے جموں پہونچے۔ مہاراجہ ہری سنگھ جی پہلے پہونچ چکے تھے۔ اس سب کو جموں پہونچتے پہونچتے خوب اندہیرا ہوگیا تھا۔ کوئی دس بارہ کوس سے جموں کا شہر اُونچے مقام پر بسا ہوا۔ روشنی سے جگمگ جگمگ کرتا کاڑی میں سے نظر آرہا تھا۔ سُرخ اور سبز رنگ کے قمقمے عالیشان عمارتوں پر لگائے گئے تھے۔ دُور سے بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمرد اور یاقوت کے گردے کی جڑائی کے گنبد اور منارے ہیں۔ عمارتیں ایسی ہیں جن کے خاکے چھنیوں اور پنسوں سے بنائے گئے ہیں۔ اس اندہیرے گھپ میں یہ جواہر نما روشن خطوط کے عمارتی خاکے بڑی بہار دکہاتے تھے۔ ان لوگوں کو روشنی کا بڑا سلیقہ ہے۔ یہ روشنی کرنے میں صرف ایک رنگ کے قمقموں کا استعمال کرتے ہیں۔ نیلے پیلے لال سبز ملا جلا کر دیوالی کی کلھیا نہیں بنا دیتے۔ ہر ایک عمارت پر صرف ایک ہی رنگ کی روشنی کیجاتی جو بہت عمدہ اثر پیدا کرتی ہے۔ سب سے زیادہ مرزا اس روشنی کے لئے تڑپ رہا تھا۔ دعائیں مانگتا تھا کہ اللہ کرے جلدی سے جموں پہونچ جائیں۔ اور جی بھر کے روشنی کی سیر کریں۔ مہاراجکمار کی ولادت کی خوشی میں یہ چراغاں ہو رہا تھا۔ لیکن پہونچتے پہونچتے نو ساڑھے نو بج گئے اور محطہ سے روانہ ہوتے ہوتے کوئی گیارہ بج گئے یہاں محصول خانہ پر بڑی سختی سے سامان کی تلاشی لیجاتی ہے راستوں پر آہنی دروازے لگے ہیں۔ وہ اس وقت تک نہیں کہولے جاتے جب تک کہ محصول خانہ کی چٹھی نہ دکھا دیجائے۔

ایک لوہے کے پل پر سے ہو کر دریائے ناری کو عبور کرکے ہماری سواریاں اپنے مقام پر پہونچیں لیتے لٹاتے کوئی بارہ بج گئے۔ تہکے تہکا پڑ سو رہے۔ مرزا اُٹھا صبح چھت پر جو نظر گئی تو ساری چھتیں خاتم بندی کی اور وہ نفیس و باریک کشمیری نقاشی کے کام کہ دیکھ عقل دنگ رہ گئی۔ طرح طرح کے نمونے اور گلکاریاں۔

وہ وہ عجیب کہ سبحان اللہ صل علی۔ بادام۔ شال۔ دیکھت بھولی۔ بندروم۔ ہزارگلہ۔ چنار۔ گل مزار۔ زعفران۔ گلاب۔ گل چینی۔ گل یارقند۔ گل خطائی۔ گل مرجان۔ اور جانے کن کن پھول گلون کے تختے ان لکڑی کے تختوں پر کھل رہے تھے جو سدا رنگ اور سدا بہار تھے۔ نہ کمھلانے والے تھے۔ نہ مرجھاتے تھے۔ مرزا ان چھتوں کی خاتم بندیوں کی خوب جی بھر کے سیر کرتا رہا۔ سارا دن یونہی گذرا تیسرے پہر پیارے نواب اور نواب جانی کو لیکر مرزا ہوا خوری کو نکلا۔ نواب پیارے کوئی سترہ اٹھارہ برس کا نواب جانی کوئی چودہ پندرہ برس کا۔ مرزا کا سن ان دونوں کی عمر ملا کے۔ یہ لڑکے مرزا کو بھائی کہتے۔ مرزا اُن کے ساتھ برابر والوں کا سا برتاؤ کرتا۔ کھیل کود شرارت شوخی میں اُن سے دو قدم آگے رہتا۔ لمبی لمبی ذرا انگلیٹ چھوٹی اور اُن بچوں کے ماشاءاللہ ہاڑ اچھے کھینچ تان کر میزان برابر ہی کر لی تھی۔ یہ تینوں ملکے سیر کو نکلے جھٹ پٹے کے وقت ایک جگہ پہونچے جہاں خوب چہل پہل تھی اور روشنی ہو رہی تھی۔ ایک بڑا سا پھاٹک تھا۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ کہا مہاراجہ کی منڈی مرزا بیچارہ سمجھا جیسے سبزی منڈی پھول کی منڈی وغیرہ بڑے شہروں میں محلے ہوتے ہیں۔ یا منڈیاں ویسے ہی یہ بھی کوئی جگہ ہے یہ تینوں فرنگی لباس زیب تن کئے ہوئے تھے۔ ٹوپ اُتار سے بغلوں میں لئے جونہی پھاٹک میں گھسے پہرہ والوں نے ٹوکا کہ ننگے سر مت داخل ہو۔ تینوں نے اپنے سر ڈھنک لئے، اَب جو اندر داخل ہوئے تو ایک چارچمن نظر آیا۔ جس کے چاروں طرف اُونچی اُونچی عالیشان عمارتوں کا سلسلہ چلا گیا ہے اور چمن کے بیچوں بیچ کوئی پندرہ بیس سیڑھیوں کا وسیع کشادہ چبوترہ سنگ مرمر کا فرش چاروں طرف کٹھرا چبوترے پر ایک طرف مناسبت اور موقع سے ایک مستطیل سنگ مرمر کی چبوتری کوئی آدھا گز اُونچی۔ چمن کی روشوں پر مینا بازار لگا ہوا سودا سلف والے سودا بیچ رہے ہیں۔ کوئی آٹھ دس ہزار آدمیوں کا مجمع۔ مرزا نے جو قلفی کی برف والے کو دیکھا اُسے بلایا۔ وہ آیا۔ تین قلفیاں کھولنے کو کہیں۔ عصر کا وقت قریب تھا۔ بچپن سے نماز کا مرزا پابند سدا کا۔ رستے میں گاڑی میں وقت ہوگیا۔ وضو کو پانی نہیں۔ وہیں نشستوں کی گدیوں پر ہاتھ مارا۔ تیمم کر نماز پڑھ لی۔ اَب جو عصر کی نماز کی ٹھانی وضو گھر کا کئے تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھ اس چبوترے پر جا ریشمی رومال بچھا نیت باندھ کھڑا ہوگیا۔ وہ دونوں بچے اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ ہوا سے رومال اُٹھتا اُس کو بچھا کر ٹھیک کر دیتے۔ مرزا نماز پڑھ سلام پھیر دُعا مانگ اَب جو برف کی قلفیاں کھانے آیا۔ دو لیکر دونوں لڑکوں کو دی تھیں تیسرے کا انتظار تھا کہ کیا دیکھتا ہے ایک سپاہی یہ لمبا لٹھ لئے چاروں طرف گھماتا کالا[illegible] تیا چلا آتا ہے۔ اُس سپاہی نے بڑی درشتی اور بدتمیزی سے مرزا کی طرف رُخ کر کے پوچھا۔

تو ؔسی نے نماز پڑھی ہے۔" مرزا کے منہ سے عادتاً نہیں بلکہ مارے خوف کے سچی بات نکل گئی کہ ہاں میں نے نماز پڑھی ہے۔ اُس نے کہا کہ چل تجھے جیل ہی میں ڈالونگا۔ اور دونوں بچوں کی طرف بھی مخاطب ہوکر کہا کہ تم بھی چلو۔ اس کے بعد سوال کیا کہ یہ لڑکے کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ مرزا نے جواب دیا "حیدرآباد سے" اور ڈرتے ہوئے کہا کہ " نواب قیصر جنگ کے بھانجے ہیں۔ اِتنا سُننا تھا کہ اس کے تو طور ہی بدل گئے سپاہیوں کو گالیاں دے۔ مجمع کو ڈانٹ مرزا کی طرف بڑی تپاک سے جھکا اور کہا کہ " اجی حضرت یہ آپ ہی کا محل ہے۔ اس جگہ تشریف لیجائیں۔ اس محل کا سامان قابل دید ہے۔" وہ ہال کھو لو یہ کمرہ دکھاؤ" مرزا نے بچوں سے کہا کہ ارے بھاگو یہاں سے کیسا دیکھنا دکھانا ہے۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ وہ پتہ توڑ سر پہ پاؤں رکھ لیاں پیاں بھاگے کہ مڑکر بھی نہ دیکھا۔ برف والا پیچھے پیچھے پیسوں کے لئے دوڑا۔ بھلا ایسی ہیبت میں برف کس سے کھائی جاتی اور کس کے حلق سے اُترتی۔ یونہی کھلی قلفیاں پھینک اس کے پیسے حوالہ کر اپنی سواری میں بیٹھ چنپت ہوئے۔ جب وہ جگہ آنکھوں سے ذرا اوجھل ہوئی اور اوسانوں میں سمائے تو مرزا کو ہنسی کا دورہ اُٹھا۔ اپنی دہشت بے بسی۔ بیکسی کی حالت بچوں کی فق فق صورت کا تصور کرتا تو لوٹ لوٹ جاتا ہنستے ہنستے پیٹ دکھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہنسی کسی عنوان نہ تھمتی تھی۔ دیوانوں کی طرح ہنستے اپنے ٹھکانے پر پہونچے۔

جموں میں نہر اور پانی کا انتظام وغیرہ دیکھا۔ دوسرے دن یہاں سے سری نگر کو روانگی ہوئی۔ مہاراجہ اور ان کے ساتھی جانے والے تھے۔ راستوں پر خوب انتظام تھا۔ ہوا گاڑیاں ملتی نہ تھیں۔ دو ہوا گاڑیاں کرایہ پر ٹھرائی گئیں۔ دس وہ سب تھے گیارہواں مرزا۔ اَب مرزا کدھر کھپتے۔ سواریوں کی تعداد مقرر۔ مجبوری۔ ابھی مستورات مرزا سے اتنی مانوس نہ ہوئی تھیں۔ جو اس کا خیال کرتیں اور ساتھ لے چلنے پر مصر ہوتیں طرح دیکر چپ ہو رہیں۔ اور مرزا سے کہلوا دیا گیا کہ آج تو گاڑیوں کا انتظام ہو ہی نہیں سکتا۔ بمشکل تمام دو میسر آئیں آپ کل کوئی اِنتظام کرکے آجائیے گا۔ مرزا نے اپنے دل میں کہا کہ اگر اس کا علم ایک روز پہلے ہوتا تو وہ اپنے چلنے کا کوئی انتظام اَبتک الگ ہی کر لیتا اور ساتھ نہ چھوڑتا۔ اَب تنت کیا کرے۔ مرزا میراقی خفقانی پیچھے اسطرح اکیلے چھوٹ جانے کو اپنی ہتک اور ذلت پر محمول کیا۔ مرزا کا چہرہ سکڑ کر کھٹائی کی پھانک ہوگیا۔ دل کا کمزور اور کچا۔ آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے پیئے جانے کی کوشش کرتا اور اپنی نظروں کو کوشش کر اپنی کمزوری اور جھوٹی عزت کی لاج رکھنے ساتھیوں سے بچانا چاہتا تاکہ وہ اس کی ہوائیاں اڑے چہرہ کو دیکھ کر یہ نہ معلوم کرلیں کہ مرزا کی توہین ہوئی

یا یہ کوئی ہتک آمیز برتاؤ تھا۔ اگر تھا بھی تو مرزا نہیں سمجھا۔ جوں جوں اپنے چہرے کے طوروں کو سنبھالنے کی کوشش کرتا وہ اور کہڈے جاتے اور مرزا کی قلبی کیفیات اور اس کی ذکی الحسی کا پتہ دیتے۔ اور چہرے کے طوروں کو قابو میں نکر لینے میں ناکامی کا احساس اس کو اور اعصاب زدہ بنائے دیتا۔ اور اس کی آنکھوں میں التجائے رحم اور رفاقت کی آرزو اس کے حلیہ کو اور زار نزار بنائے دیتی۔ اِس توہین کے اثر کو چھپانے کی جتنی کوشش کیجاتی وہ خود بخود چہرہ پر ظاہر ہو کر خجل کئے دیتا۔ نواب فتح جنگ جنھوں نے مرزا کو ساتھ لیا تھا وہ ذرا اس حالت کو محسوس کرنے لگے۔ چونکہ اُنہوں نے بغیر اپنے ہاں کی مستورات کے استصواب کے مرزا کو ساتھ لیلیا تھا۔ اور مرزا کو یہ ساتھ غنیمت معلوم ہوا تھا اَب مرزا نے اس بے رخی کو بہت زیادہ محسوس کیا۔ لیکن یہ خیال کرکے اپنی آپ اَشک شوئی کرلی کہ جوں جوں یہ مجھ سے واقف ہونگی مانوس ہوتی جائینگی۔ جمعدار صاحب کی حالت چہ کنم میں تھی۔ آخر ایک بڑی ہوا گاڑی جو نوکروں اور سامان کے لئے آئی تھی اس میں سے کچھ سامان نکالا گیا اور ایک جگہ چلانے والے کے برابر میں مرزا کے لئے نکالی گئی۔ اور مرزا سے کہا جی چاہے تو یہاں آ جاؤ مرزا طوعاً و کرہاً اس میں سوار ہوگیا۔

سری نگر یہاں سے کوئی سوا سو ڈیڑھ سو کوس ہے۔ وہ دونوں گاڑیاں تو شام تک صبح کی چلی سری نگر پہونچ گئیں۔ لیکن یہ جہاز کی جہاز ہوا گاڑی شام کو بنی ہل پہونچی۔ یہاں خوب سردی تھی۔ اس کے آگے ایک برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی کا پہاڑ ہے۔ اور برف سے ڈھکی ہوئی سُرنگ میں سے راستہ کاٹا گیا ہے جس میں سے کشمیر کی وادی میں اُترتے ہیں۔ مرزا نے ڈاک بنگلہ میں کا ایک حصہ لے لیا۔ خوابگاہ میں اپنا پلنگ بچھوایا اور نشست کا حجرہ آدمیوں کے سونے کو دیدیا۔ یہاں گھی، شہد اور انڈے بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ پہاڑی مرغیوں کے اَنڈے بڑے بڑے۔ سوندھے۔ پستہ اور بادام کے مزے کے ہوتے ہیں۔ شہد صاف شفاف سفید موم جیسے چاندی کا پتر۔ مزا مَلائی سے اچھا۔ مرزا نے ناشتہ میں نان پاؤ کی قاشیں سکوا کر شہد اور موم کے ساتھ کھائیں۔ بڑی لذیذ معلوم ہوئیں۔ اَخروٹ کاغذی اور بہت اچھے تھے۔ گھی زرد رنگ کا تھا۔ روپئے کا سیر سوا سیر تھا۔ اَنڈے دو دو پیسے بہت بڑے بڑے تھے۔ اَخروٹ بھی بڑے عمدہ اور کاغذی دو تین آنہ سیکڑہ تھے۔

جمون سے جو سڑک سری نگر آتی ہے بہت عمدہ اور آرام دہ ہے رَستے میں آہنی دروازے ملتے ہیں جہاں محصولی اَشیا کی جانچ پڑتال کی جاتی لیکن مرزا کو ایک منتر یاد تھا جہاں سرکاری آدمی آئے اور مرزا نے نواب قیصر جنگ کا نام لے دیا بس کھل سم سم بند ہوجا سم سم کا اثر تھا۔ نام لیتے لیتے ہی دروازے کھل جاتے اور

مشکل آسان ہو جاتی ۔ کھنابل کے پہاڑ کی چڑھائی شروع ہوئی ۔ راستہ بہت صاف جگہ جگہ چشمے جاری پہاڑوں کی چوٹیاں
برف سے سفید ۔ کہیں کہیں برف پگھل گئی ہے ۔ اور اپنے ساتھ پہاڑ کے ٹکڑے کاٹتی ہوئی نیچے لے گئی ہے
چیل یا دیودار پہاڑوں میں بڑے خوبصورت معلوم ہوتے تھے ۔ سرنگ کے اوپر کشمیر کی وادی کی طرف کروڑوں
من برف کی چٹان جھکی ہوئی تھی ۔ صاف سفید جیسے بلور آدمیوں نے خوب کھرچ کھرچ کر جمع کیں ۔ گیندیں بنائیں
اور ایک دوسرے پر پھینکیں ۔ جی بھر کے اودھم مچایا ۔ یہاں سے کشمیر کی وادی اچھی طرح دکھائی دیتی ہے ۔ جہلم اور
دوسری ندیوں نالوں کا ایک بہتا جال سا پھیلا ہوا ہے ۔ چاروں طرف سر بفلک برف سے ڈھکی پہاڑوں کی
چوٹیاں بیچوں بیچ سرسبز و شاداب وادی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہیرے کے گردے میں زمرد کا نگینہ جڑ دیا ہے ۔ دس
گیارہ بجے تک نواب قیصر جنگ کی کوٹھی پر پہونچ گئے مرزا کو دیکھ کر سب بہت خوش ہوئے ۔ اور ہاتھوں ہاتھ لے
گئے ۔ جمعدار صاحب کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی ۔ کیونکہ یہ سب سارے رستے اس کو یاد کرتے آئے تھے ۔ اور
ہر فضا کی جگہ اس کو یاد کرتے ۔ برف کی سرنگ کے پاس تو سب نے بہت یاد کیا ۔ دو تین دن میں بیگم جمعدار صاحب
مرزا سے قدرے مانوس ہوگئیں اور اس کی خوخصلت سے اطمینان ہوگیا ۔ اس کا پاس لحاظ کرنے لگیں ۔
باورچی خانے کا انتظام اپنی لڑکیوں کے سپرد کیا ۔ میز خانے کا انتظام بھانجیوں کے حوالے کیا ۔ مودی خانہ مرزا اور
اپنے لڑکوں کو سونپا ۔ مرزا روز جاکر جنس تلوا جھکوا نوکروں کو دے دیتا ۔ مرزا پیارے نواب جانی نواب جاکر کوئی پانسو
ساڑھے پانسو کا خرید کر لائے ۔ یہاں سارے کے سارے بنئے مسلمان ہیں اور بہت چھوت چھات کے قائل
ہیں ۔ غیر مسلموں سے بڑا پرہیز کرتے ہیں ۔ مرزا نے ایک ہندو حلوائی کے ہاں سے بنگالی مٹھائی خرید کر کھائی اور
جس کے ہاں سے اچار پت خریدی تھی اس سے ایک آبخورہ پانی مانگا اس نے اپنے برتن میں پلانے سے
انکار کر دیا اور کہا کہ آپ نے نجس مٹھائی کھائی ہے ۔ ہم اپنے برتن نہیں خراب کر سکتے ۔ مرزا کھانے پینے کے معاملے
میں صفائی کا قائل تھا ۔ طہارت تو اس کے ہاں تکمیل کی آخری منزل تھی ۔ وہ کہتا تھا کہ طہارت تو تکمیل کی آخری صورت ہے
جب تک صفائی میں کمال نہ ہو اور اس کو پورے طور پر اختیار نہ کیا جائے طہارت ہو ہی نہیں سکتی ۔ بغیر صفائی کے طہارت
ناممکن ہے ۔ جیسے بغیر حروف ہجا آنے کے کوئی شخص کسی زبان میں لکھ پڑھ نہیں سکتا ۔ اسی طرح سے بغیر صاف
رہے کوئی شخص طاہر نہیں کہلایا جا سکتا ۔ اگر کسی صاف ستھرے نے سوکھے ہاتھوں کوئی سوکھی چیز دے دی تو
اس کے کھانے میں کوئی قباحت نہیں لیکن ایسے ہاتھوں کی چیزوں سے کراہت کرتا تھا کہ جن کے نیلے نیلے ناخن
ہوں اور انگلیاں ہر وقت نتھنوں کے خزانوں میں جمع جکڑی ٹٹولتی رہتی ہوں یا باچھوں کی تراوت کو پونچھتی اور

خوشبو اور بسانده کو سونگھتی رہتی ہوں یا جگہ بجگہ کھانے کے مصرف میں آتی ہوں۔

کھانے بہت پر تکلف ہوتے تھے۔ آٹھ سات قسم کے سالن۔ دو تین طرح کی مٹھائیں۔ اچار۔ چٹنیاں۔ مُربے۔ میوے وغیرہ۔ میز بڑی مناسبت سے سجائی جاتی جس قسم کا میز پوش ہوتا اسی قسم کے زانو پوش ہوتے چینی کے برتن بہت خوبصورت نفیس۔ چاندی کے چمچے۔ چھری۔ کانٹے۔ میز کرسیاں جدید مذاق کے مطابق کبھی کافوری رنگ کے میز پوش اور زانو پوش ہوتے تو کبھی انگوری رنگ کے کبھی ہلکے کاسنی۔ کھانے کی میز پر بیٹھنا اِمتحان دینے کے برابر تھا۔ نواب قیصر جنگ اپنے مقابل پر مرزا کو بیٹھاتے۔ مرزا اور نواب صاحب کے بیچ میں پھولوں کا بھرا گلدان تھا۔ اِن پھولوں کی اوٹ سے مرزا قیصر جنگ کو دیکھا کرتا اور قیصر جنگ کا چہرا نیم شگفتہ کلی کی طرح معلوم ہوتا۔ مرزا کو کبھی جمعدار صاحب اپنے پاس بٹھالیتے اور ہنسی مذاق ہوتا رہتا میز کے مقررہ قاعدوں اور ضابطوں کی اگر کوئی ذرا بھی فروگذاشت ہوجاتی تو نواب قیصر جنگ ناراض ہوتے۔ جمعدار صاحب اُن کو ہمیشہ ستانے کے لئے کوئی نہ کوئی بے عنوانی کرتے۔ اور خوب سالے بہنوئی میں چھیڑ چھاڑ ہوتی سب کے سب ہنستے ہنستے لوٹ جاتے۔ کوئی ساڑھے نو بجے کھانے سے فراغت ہوتی اور سب اٹھ کر ملاقات کے کمرے میں جا بیٹھتے۔ یہاں ناچ کا رنگ جمتا جس قدر ناچ تو سے تھے وہ سب بہترین انگریزی اور فرانسیسی گیتوں۔ گتوں باجوں اور ناچوں کے تھے۔ کچھ توسے گوہر جان۔ پیارے صاحب۔ جانکی بائی کے بھی تھے۔ مرزا اور جمعدار صاحب دونوں ملکر خوب گاتے۔ مرزا کو ٹھمریاں بہت پسند تھیں۔ وہ ٹھمریاں زیادہ گاتا۔ دھرپد اور ترانے بھی کبھی کبھی گا لیتا۔ غزلوں کی فرمائش ہوتی تو وہ بھی گالیتا سب بیحد خوش ہوتے۔ کبھی کبھی مرزا کو گاتے گاتے ہنسی کا دورہ پڑجاتا۔ اور اس کو دیکھ کر سب لڑکے عورت مرد ہنستے ہنستے لوٹ جاتے۔ مرزا کو نرت کرنا بھی تھوڑا سا آتا تھا۔ ہنسی اس کے نرتوں پر شروع ہوتی۔ مرزا کو ناچنے کا بھی شوق تھا۔ ہندوستانی ناچ کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ لیکن وہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے دیسی ناچنے کی تو ہمت نہ ہوتی البتہ انگریزی ناچ سے دل کا ارمان نکال لیتا۔ اس کو نواب قیصر جنگ سکھایا کرتے اور ساتھ لیکر ناچتے پھر مرزا خود اِس سبق کو دہراتا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ ناچا کرتا۔ یہاں تک کہ بارہ ایک بجے کے قریب جب وہ کشتی گھر سونے جاتا جو نواب صاحب کی کوٹھی سے کوئی پانسو چھ سو گز کے فاصلہ پر سرکاری مہمان خانے کے قریب جہلم میں سرکاری گھاٹ پر کھڑا رہتا تھا۔ تو سارے رستے مرزا ناچتا جاتا اور ہاتھوں کو اس طرح رکھتا گویا وہ کسی فرنگن کو لپٹائے ناچ رہا ہے۔ مرزا کے ناچ کا دلچسپ واقعہ کسی دوسرے موقعہ پر بیان کیا جائیگا۔ ایک دفعہ سب کھانا کھا رہے تھے کہ ایک دَم مہاراجہ

ہری سنگھ جی تشریف لے آئے اور کھانے کے کمرے میں داخل ہو گئے تیصر جنگ نے اپنی کرسی خالی کر دی اور مہاراج اس پر بیٹھ گئے ایک طرف مہاراج کے تیصر جنگ ہو بیٹھے اور دوسری طرف جمعدار صاحب بیٹھے تھے۔ جمعدار صاحب کے برابر مرزا بیٹھا تھا۔ نواب تیصر جنگ نے مرزا کا تعارف مہاراجہ سے کرایا اور کہا کہ سرکار انہوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے۔

مہاراجہ نے دریافت فرمایا کہ حضرت آپ نے نماز کیوں چھوڑ دی مرزا نے جواب دیا "مہاراج کچھ بھی نہیں مہاراجہ نے کہا آپ کو میرے سر کی سوگند آپ نے کیوں نماز چھوڑ دی" اس وقت مرزا نے سارا واقعہ خوب نمک مرچ لگا کر سنایا۔ مہاراجہ کی یہ حالت ہوئی کہ ہنستے ہنستے آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور زانو پوش کو منہ میں دبا لیا۔ مرزا کو بڑی حیرت ہوئی کہ بجائے شرمندہ ہونے کے یہ اس قدر ہنس رہے ہیں۔ مرزا نے مہاراجہ سے جب ذرا ان کی ہنسی کم ہوئی تو پوچھا "مہاراج آخر اس قدر ہنسنے کی کیا وجہ ہے" تب انہوں نے فرمایا کہ معاف کیجئے گا میں کبھی اس قدر کسی کے سامنے پہلی ملاقات میں نہیں ہنسا۔ حضرت آپ بڑے خوش قسمت تھے جو زندہ بچ گئے اگر پچاس ساٹھ برس پہلے آپ وہاں نماز پڑھتے تو آپ کی گردن اُتار دی جاتی۔ آپ تو کشمیر کے گدی نشین ہو گئے۔ جہاں آپ نے نماز پڑھی وہ ریاست کی گدی ہے اور سوائے رئیس کے کوئی اس پر قدم نہیں رکھ سکتا اگر کوئی ہندو ہوتا اور اس پر چڑھ کر پوجا پاٹ کرتا تو وہ بھی قتل کر دیا جاتا۔ آپ خود فرمائیے دہلی میں اگر کوئی شخص شاہ جہاں کے تخت پر بیٹھ کر قرآن پڑھتا تو تخت پر قدم رکھنے اور چڑھنے کے جرم میں کیا سزا دیجاتی۔ وہاں نماز کا سوال نہیں۔ وہاں تو اس بے ادبی کی سزا ہے۔ جو غیر مستحق کو تخت پر بیباکانہ قدم رکھنے کے بدلے میں دیجاتی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ وہاں تک پہونچ کیسے گئے کیونکہ وہاں تو سخت پہرا رہتا ہے غالباً سپاہی سیر تماشے میں اپنے چوکی پہرے سے بے خبر ہو گئے۔ اور آپ کو وہاں جانے کا موقعہ ملا اور پکڑے گئے کیونکہ آپ وہاں نماز پڑھ رہے تھے اور وہ لمبی جوتیاں پہنے۔ اور آپ کے دونوں ساتھی جوتیاں پہنے اس جگہ بیٹھے تھے۔ اس لئے نام نماز کا ہوا اور آپ پکڑے گئے آپ جہاں چاہیں جائیں لیکن پہلے تختے جو لکھے ہوئے لگے رہتے ہیں اُنہیں پڑھ لیا کیجئے۔ کل آپ سب میرے یہاں آکر کھانا کھائیے اور مہارانی صاحبہ کو یہ سارا واقعہ خود سنائیے۔ مجھے یہ علم نہ تھا کہ آپ اس قدر دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ نے اپنے صرف ایک دفعہ پکڑے جانے کا قصہ سنایا۔ یہاں سری نگر میں جو پکڑے گئے تھے اسے چھپا ہی رکھا ہے۔ یہ سنکر سب کو حیرت ہوئی کیونکہ مرزا نے اپنا سری نگر کا پکڑا جانا سب سے چھپایا تھا۔ کہ کس طرح پیارے نواب جانی نواب مرزا پریوں کے محل میں جاتے ہوئے

پکڑے گئے تھے۔ مرزا نے دونوں لڑکوں سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس واقعہ کی اطلاع گھر میں ہوئی تو پھر سب کا باہر نکلنا بند ہو جائیگا۔ اب تو مہاراج اور سب مرزا کے سَر ہو گئے کہ وہ خود اس واقعہ کو سنائیں۔

پروفیسر آغا حیدر حسن دہلوی

(باجازت محکمۂ نشرگاہ لاسلکی حیدرآباد)

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر

شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہوجا

گذر جا بن کے سیل تندرو کوہ و بیاباں سے

گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہوجا

ضمیر لالہ سے روشن چراغ آرزو کردے

چمن کے ذرے ذرے کو شہید جستجو کردے

نتیجۂ فکر حضرت فانی بدایونی

ہر سانس کے ساتھ جا رہا ہون
میں تیرے قریب آ رہا ہون

یہ دل میں کراہنے لگا کون
رو رو کے کسے رُلا رہا ہون

اب عشق کو بے نقاب کر کے
میں حُسن کو آزما رہا ہون

اسرار جمال کھل رہے ہیں
ہستی کا سراغ پا رہا ہون

تنہائی شام غم کے ڈر سے
سوتے فتنے جگا رہا ہون

کچھ مجھ سے خطاب ہو رہا ہے
کچھ اُن سے جواب پا رہا ہون

لذت کش آرزو ہون فانی
دانستہ فریب کھا رہا ہون

حیدرآباد کی معاشیات

یہ زمانہ معاشی قومیت کا ہے ۔ دیگر ممالک کو بیدار ہوتے ہوئے دیکھ کر حیدرآباد نے بھی معاشی زندگی میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے ایک زبردست تنظیم کی افتتاح کی ہے اس تنظیم کا نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ ملک کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوگا اور رعایا کی عام حالت بھی بہتر ہو جائے گی ۔ ملکی صنعتوں کی سرپرستی کا رجحان شہر میں زیادہ نظر آنے لگا ہے ۔ تجارت گاہ مصنوعات ملکی ۔ نمائش باغ عامہ یا دعوتی رقعوں کے لئے ملکی کاغذ استعمال کرنا اسکی نمایاں مثالیں ہیں ۔

اس پُر اُمید زمانہ میں ہر شخص کو اپنے ملک کی پیداوار اور تجارت کے متعلق چند اعداد معلوم کرنے کی خواہش ضرور ہوتی ہے ۔ پیداوار کی اعداد شماری برٹش انڈیا میں ہے اور نہ ریاست حیدرآباد میں ۔ صرف چند اہم پیداوار کے متعلق اندازہ کیا جاتا ہے جو حقیقی اعداد کے مقابلہ میں اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں ۔ سرکاری مطبوعات سے جن میں رسالہ اعداد و شمار بھی شامل ہے اس ریاست کی پیداوار اور تجارت کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوتے ہیں ۔ اس رسالہ کی حالیہ اشاعت سنہ ۱۳۴۷ف کے متعلق ہے ۔ حیدرآباد کی معاشی حالت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس روئداد کا تبصرہ دلچسپ اور پراز معلومات ہوگا ۔

روئداد زیر بحث میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے تجارتی توازن (Balance of trade) اور ظاہرا تجارتی توازن (Visible Balance of trade) کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اور اول الذکر ۳۲ لاکھ روپئے ناموافق سلک (Adverse Balance) اور آخرالذکر ۱۵ ء ۹۴ لاکھ روپئے موافق ظاہرا تجارتی توازن (Favourable Visible balance of trade) بتایا گیا ہے ۔ جن اشیاء پر محصول عائد نہیں کیا گیا ہے ان میں سے چند اشیاء ان میں شامل نہیں ہیں ۔ محکمہ جات سرکار عالی، علاقہ رزیڈنسی، برطانوی افواج اور سنگرینی کی کانوں کی درآمد کردہ اشیاء جن کی مجموعی مالیت تقریباً ۸۰ لاکھ روپئے ہوتی ہے، ان اعداد میں شامل نہیں ہیں ۔

اوران اشیار کی تفصیل بھی معلوم نہیں ۔ محکمہ ریلوے کی درآمد کردہ اشیار کی تفصیل جس طرح بتائی جاتی ہے اسی طرح اس ۸۰ لاکھ کی تفصیل بھی بتائی جاتی تو زیادہ مفید ہوتا ۔ علاوہ ازیں اگر طلا کی برآمد نظرانداز کردی جائے تو ظاہرا توازن تجارت کا معلوم کرنا غیر ممکن ہوجاتا ہے ۔ ۴۰-۱۹۳۹ء میں ہندوستان سے ۳۶ ر ۱۴۱ کروڑ روپئے کا طلار برآمد کیا گیا ہے ۔ اور مردم شماری کے لحاظ سے ممالک محروسہ سرکار عالی سے کم از کم ۴۴ ر ۵۰ لاکھ روپئے سکہ کلدار کا طلار برآمد ہوا ہوگا ۔ مقامی سکہ میں اس کی قیمت تقریباً ۶۰ لاکھ روپئے ہوتی ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ برآمد اس سے زیادہ مقدار میں ہوئی ہو لیکن کسی صورت سے بھی وہ اس سے کم نہیں ہے ۔ تختہ توازن تجارت میں اس مد کے مقابل کوئی اعداد نہیں بتائے گئے ۔ بلکہ اس تختہ میں اس مد کا وجود ہی نہیں ۔ ممکن ہے کہ اعداد حاصل نہ ہوسکے ہوں اور ملک سے سارا سونا یا اس کی ایک بڑی مقدار بلا کسی اندراج یا عمل کے برآمد کردی گئی ہو ۔ حکومت کو چاہیئے کہ اس کے متعلق صحیح اعداد فراہم کرنے کی کوشش کرے ۔ تمام برآمد شدہ اشیار ' ہمراہی ' اور پارسل وغیرہ کی کافی جانچ پڑتال کرے ۔ اگر یہ ممکن نہیں تو روئداد میں واضح کردینا چاہیئے کہ سونا اور دیگر اہم اشیار شریک نہیں کی گئی ہیں ۔ اسی مردم شماری کے تناسب سے حیدرآباد میں چاندی کی درآمد سال مذکور میں تقریباً ساڑھے دس لاکھ روپئے کی ہونی چاہیئے لیکن روئداد صرف ۷ ر ۷ لاکھ ہی بتاتی ہے ۔ چاندی کی حقیقی درآمد ساڑھے دس لاکھ سے بھی متجاوز ہونی چاہیئے کیونکہ کپاس اور ولائتی مونگ حیدرآباد کی اہم نقدی پیداوار ہیں اور ان کا زیادہ تر حصہ بیرونی ممالک کو جاتا ہے ۔ ان اجناس کے بدلے کاشتکاروں کو سونا تو نہیں ملتا ۔ چنانچہ لازمی طور پر چاندی ہی زیادہ مقدار میں درآمد کی گئی ہوگی ۔

مزید براں ریاست حیدرآباد کی سرحد کا پورا حصہ زمین ہے ۔ جس کی وجہ سے خلاف قانون درآمد اور برآمد کے لئے کچھ گنجایش چھوڑنا بھی ضروری ہے کیونکہ ان اعداد کو تجارتی اعداد سے خارج کردینے سے جو نقصان ہوتا ہے وہ محصول کروڑگیری کے نقصان سے بھی زیادہ ہے ۔ اس وجہ سے کہ درآمد اور برآمد جیسے اہم مدات کی نسبت ہر شخص صحیح اعداد چاہتا ہے ۔ سررشتہ کروڑگیری کا انتظام کچھ عرصہ سے باضابطہ اور اطمینان بخش ہے ۔ تاہم گھاٹوں اور بنڈی کے راستوں کی موجودگی کی وجہ سے نیز وسعت سرحد کی وجہ سے معقول مقدار میں مال کا بلاادائی محصول پار ہونا لازمی ہے تخمینہ پیداوار کا ' سررشتہ کروڑگیری کے تختہ جات آمدنی اور ملک کے سلک شدہ مال سے مقابلہ کرنے کے بعد ان اعداد میں نمایاں تفاوت پایا جاتا ہے ۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیدرآباد سے کثیر مقدار میں مال کی درآمد و برآمد خلاف قانون ہوتی ہے ۔

بہتر ہوگا اگر اس روداد میں اس مد کے لئے بھی تھوڑی سی گنجائش پیدا کر دی جائے۔

ظاہر اتوازن تجارت ۔ قرضہ اور تجارتی بقائے The balance of Payments & of indebtedness) کا ایک جزو ہے جو اس سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے متعلق اعداد حاصل کرنے کے لئے اس روداد میں سرکاری اور خانگی اشخاص سے بذریعہ منی آرڈر، چک اور دیگر مماثل ذرایع سے جو رقم ملک میں داخل ہوئی ہو یا ملک سے گئی ہو اس کا بھی اندراج ہونا چاہئے۔ صیغۂ حساب، ٹپہ خانہ جات بنکوں اور سررشتہ کروڑگیری سے ایسے اعداد فراہم کئے جائیں تو خود حکومت کو اور عوام کو یہ معلوم ہوگا کہ آیا حیدرآباد کی دولت باہر جارہی ہے یا بیرون ملک سے حیدرآباد میں سرمایہ جمع ہو رہا ہے۔ اور دونوں صورتوں میں اس کی مقدار بھی معلوم ہو سکے گی۔ سوئزرستان جیسے چھوٹے سے ملک میں بھی ایسے اعداد فراہم کئے جاتے ہیں کیونکہ یہ اعداد قومی وسائل دولت کے نظم ونسق کے لئے بے حد ضروری ہیں۔ اگر ایسے اعداد کی فراہمی ناممکن ثابت ہو تو کم از کم اعداد وشمار کو ملک کی خام پیداوار اور غلہ کی حد تک ہی محدود رکھیں تاکہ اقتصادی خود اعتمادی حاصل کرنے کی حتی الامکان کوشش ہو سکے اور مقامی مزدوروں و مقامی سرمایہ کے نقطۂ نظر سے قومی آمدنی کا اضافہ ہو سکے۔ ذیل میں ان ہی چیزوں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اوّلاً ہم کپاس کی طرف متوجہ ہوں گے کیونکہ اس کی حالت زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ کپاس پیدا کرنے والے ہندوستان کے بڑے رقبوں میں حیدرآباد کو چوتھا درجہ حاصل ہے (کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان دنیا میں دوسرے درجہ پر ہے) اگر حیدرآباد سے خام کپاس کی برآمد سب سے زیادہ ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی تیار شدہ سوتی اشیاء مثلاً پارچہ اور بٹے ہوئے سوت کی درآمد میں بھی سب سے آگے ہے۔ ۱۳۴۸ف میں یہاں ۵,۷۰,۰۰۰ گٹھے روئی کی پیداوار ہوئی جس کے منجملہ ۷۰ فی صدی روئی خام حالت ہی میں بیرون ملک کو برآمد کی گئی۔ ۱۳,۸ فی صد روئی مقامی گرنیوں اور جلاہوں نے استعمال کی اور ختم ہنگام پر بشمول سلک سال گزشتہ ۱,۶۱,۰۰۰ گٹھے خام روئی بیوپاریوں کے پاس بطور سلک موجود تھی۔ یعنی تقریباً ۲۸,۳ فی صد خام روئی ملک میں خام حالت میں دھری رہی گویا ریاست میں ۲۱۰ لاکھ پونڈ سوت اور ۴۸۰ لاکھ گز پارچہ تیار ہوا۔ لیکن ہمارے پارچہ کی برآمد صرف ۲۳,۶ لاکھ روپئے مالیت کی تھی جب کہ خام روئی کی قیمت جو ملک سے برآمد کی گئی ۴۱۰ لاکھ روپئے تھی۔ اس کے برخلاف بعد منہائی مالیت برآمد ہم نے ۳۴۴ لاکھ روپئے کا سوت اور ۱۸۱,۷۳ لاکھ روپئے کا

سوتی کپڑا درآمد کیا۔ غرض سوت اور سوتی اشیار کی درآمد کی مالیت بعد منہائی مالیت برآمد ۲۲۴،۷۳ لاکھ روپئے ہوتی ہے۔ حیدرآباد میں پارچہ کا اوسط خرچ ۱۲،۸ گز فی کس ہے اور سارے ہندوستان میں ۱۸ گز فی کس۔ جب کہ قومی معیار کے لحاظ سے کم از کم خرچ ۳۰ گز ہونا چاہئے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ہمارے ملک میں کثیر مقداریں روئی پیدا ہوتی ہے لیکن مقامی گرنیاں ہماری ضروریات کا ایک حصہ بھی پورا نہیں کرسکتیں۔ جب کہ پارچہ کی مانگ میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے یعنی قابل غور بات یہ ہے کہ ہم نے پارچہ کی تیاری پر جتنا بھی منافع ادا کیا ہے وہ زیادہ تر غیر ملکی مالکان گرنیوں کو حاصل ہوا! ریاست ہی میں ایک ایسے نظام العمل کو ترتیب دینے کے کیا امکانات ہیں جس سے کہ ۲۲۴،۷۳ لاکھ روپیے کی مالیت کا مزید سوت اور سوتی پارچہ تیار کیا جاسکے۔ مقامی گرنیوں کو روئی بمبئی کے نرخ سے نسبتاً کم نرخ پر مہیا ہوسکتی ہے۔ کیونکہ مقامی بیوپاریوں کو محصول کروڑگیری جو پانچ فیصد ہے اور کرایہ حمل ونقل جو بیرون ملک کے بیوپاریوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، دونوں کی بچت ہوتی ہے۔ بیرونی ممالک سے جو پارچہ درآمد کیا جاتا ہے اس پر جو پانچ فیصد محصول ادا کرنا پڑتا ہے اس محصول کی کمی مقامی کارخانہ دار کو ایک قسم کی امداد ہے۔ برآمد پارچہ پر بھی محصول کروڑگیری معاف ہے۔ اگر یہ تصور کرلیا جائے کہ اخراجات تیاری دونوں مقام پر ایک ہیں تو بھی مقامی پارچہ پانچ فیصد کم دام پر اندرون حیدرآباد فروخت کیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت اخراجات یکساں نہیں ہوسکتے اس وجہ سے کہ بیرونی ممالک کے بیوپاریوں کو کرایہ ریل کی وجہ سے زیادہ اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں حیدرآباد میں سرمایہ اور مزدور دونوں بھی کم شرح پر مہیا ہوسکتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ حیدرآباد سے ایک کثیر مقدار میں خام روئی برآمد ہوتی ہے اور کثیر مقدار میں پارچہ کی درآمد ہوتی ہے؟۔ اس سوال کا ایک ہی جواب ہوسکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کاروباری ذہنیت کا فقدان ہے اسی وجہ سے نقصان کا پلہ بھاری ہے۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ عوام میں ضروری ذہنیت پیدا ہونے تک ہم اسی حالت میں پڑے رہیں؟ کیا ہمیں بیرونی کارخانہ داروں کو آزادانہ ہمارے وسائل سے فائدہ اٹھانے دینا چاہئے؟ جب کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے (۲۱) اراکین نے ان مصنوعات کو جو ضروریات عامہ تصور کئے جاتے ہیں اور جو اس وقت تک بیرونی اثرات کے تحت تھے ایک قومی بنیاد پر قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مزدوری، سود اور منافع وغیرہ کی قسم سے پارچہ کی تجارت میں ہم اپنی قوت خرید میں ہر سال مجموعی طور پر کم از کم ایک کروڑ روپئے کا نقصان

برداشت کر رہے ہیں۔

مقامی پیداوار کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارے غلہ کی حالت زیادہ اطمینان بخش ہونی چاہئے تھی۔ لیکن سنہ ۱۳۴۷ف کے اعداد سے واضح ہوتا ہے کہ اس سال ۳۳۵ لاکھ روپئے کا غلہ درآمد کیا گیا اور صرف ۲۳۹ لاکھ روپئے کا غلہ برآمد ہوا۔ یعنی بعد وضعات قیمت برآمدہ درآمدہ مال کی قیمت ۹۶ لاکھ روپیہ ہوئی۔ خالص برآمد شدہ جوار اور جوار کے آٹے کی قیمت ۱ر۷۴ لاکھ روپئے تھی اور خالص درآمد کردہ چاول کی قیمت ۷ر۷ لاکھ روپئے تھی۔ سنہ ۳۷-۱۹۳۸ء میں ہندوستان میں ۴۳ر۱۰ لاکھ ٹن چاول کی خالص درآمد ہوئی اور اس ریاست کی حالت بھی اسی مناسبت سے ہے۔ دیگر اجناس کی تجارت میں حکومت کو دخل دینے کی چنداں ضرورت نہیں لیکن چاول کی نسبت خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے کیونکہ چاول جیسی اہم جنس کے لئے بیرونی ممالک کے تابع رہنا خطرناک ہے۔ چاول کی کاشت کے لئے زیادہ زمین درکار ہے امریکہ نے پیداوار کی نگرانی کے لئے جو قوانین حال ہی میں تیار کئے ہیں ان کی مثال سے ہماری حکومت کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔

ہمارے ملک کے روغنی تخم کی حالت ویسی ہی ہے جیسی کہ روئی کی ہے اس میں شک نہیں کہ تیار شدہ اشیاء کی درآمد اتنی ناقابل برداشت نہیں ہے جتنی کہ سوتی اشیاء کی ہے۔ سنہ ۱۳۴۷ف میں ہمارے ملک نے ۲۷ر۵۰۸ لاکھ روپئے کے روغنی تخم ۱۱ر۴۱ لاکھ روپئے قیمت کے نباتاتی روغنیات اور ۴۴ لاکھ روپئے کی کھلی خالصتاً برآمد کی۔ کشید گی روغن کے لئے ملک سے روغنی تخم کا بیرون ملک برآمد ہونا تعجب خیز امر ہے۔ بجائے روغنی تخم کے اگر روغنیات برآمد کئے جائیں تو دونوں کے لئے مفید ہوگا۔ فروخت کنندہ کو کھلی جیسی ذیلی پیداوار کی بچت ہوتی ہے اور خریدار کو اس کے اخراجات حمل ونقل میں بچت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مقامی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے لئے ایک نیا میدان نکل آئے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بیرونی ممالک کے تاجر تیار مال حاصل کر سکیں گے جس کی وجہ سے ان کی جلد سے جلد بکری ہو سکے گی۔ حیدرآباد میں ناریل کی کاشت کی آسانیوں کے باوجود ۸ر۷ر۱۳ لاکھ روپئے کا روغن ناریل درآمد ہوتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ آجکل مشنری کے لئے زیادہ تر نباتاتی روغنیات استعمال ہو رہے ہیں اس لئے ان روغنیات کا مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہے۔

سمنٹ اور کوئلہ کی صنعت نے حکومت کی سرپرستی میں کافی ترقی کی ہے۔ گو یہ کارخانے مشترکہ سرمایہ سے چلائے جاتے ہیں (Joint Stock Companies) لیکن اسٹیٹ ریلوے کے مقابلہ میں ان کارخانہ جات کی ترقی قابل ذکر نہیں ہے۔ کاغذ اور صابن کے کارخانے حال ہی میں قایم ہوئے ہیں۔ یہی حال شکر سازی کا بھی ہے۔ اس وجہ سے ان کے مستقبل کے متعلق کسی قسم کی پیشین گوئی کرنا قبل از وقت ہوگا لیکن ان مدات میں بھی سرکاری امداد کی کمی نہیں ہے۔ چائے، نمک، تمباکو، تجارتی الکوہل، چرم تیار شدہ اور ادویات کی تیاری میں بہت کچھ ترقی کے امکانات ہیں۔ گو سرکاری اور امدادی کارخانوں کا فرق معلوم کرنا آسان نہیں تاہم حکومت کو ان تجارتوں میں جلد سے جلد رہنمائی کرنے کے موقع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں سالانہ ۶۰ لاکھ روپیئے کا نمک درآمد ہوتا ہے۔ حالانکہ ضلع رائچور اور گلبرگہ میں نمک کی کافی مقدار موجود ہے۔ اور ان اضلاع میں ہزارہا کاشتکار نمک سازی کے کام سے بخوبی واقف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بابا بڈھن ریاست میسور میں پہلی مرتبہ کافی کا درخت لائے اور آج اس ریاست میں کافی کی کاشت اچھی خاصی ترقی کر چکی ہے۔ ہمارے ملک کے پہاڑی حصوں میں چائے کی کاشت کے امکانات موجود ہوں گے اور تاوقتیکہ حکومت بطور خاص متوجہ ہو کر عملی تجربہ نہ کرے اس سے مایوس ہوجانا بے وجہ ہے۔ گل مہوہ سے تجارتی الکوہل تیار کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں ۲۸۰ لاکھ گیلن پٹرول ہر سال درآمد کیا جاتا ہے۔ اس وقت صوبہ متحدہ و ریاست میسور میں تجارتی الکوہل کی تیاری اور اس کا استعمال سواریوں میں شروع ہوچکا ہے۔ کم از کم اب تو ہمیں قطعی طور پر بیدار ہوجانا چاہیئے۔ ہمارے ملک میں سگریٹ کی درآمد بہت ہی کثیر ہوتی ہے۔ ہمارے اکثر عہدہ دار ملکی مال کے استعمال کی ترغیب کی خاطر اعلانات جاری کرتے ہیں لیکن اس وقت بھی جب کہ ان اعلانات پر دستخط کرتے ہیں ان کے ہاتھ میں غیر ملکی سگریٹ جلتا رہتا ہے۔

کام کی اچھی ابتدا ہی نصف کام کی تکمیل کے برابر ہوتی ہے۔ ریلوے، ریلوے موٹر سرویس اور برقی قوت پیدا کرنے میں حکومتی انتظام بہت فائدہ مند ثابت ہوچکا ہے۔ کیونکہ اس سے تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ دونوں طبقوں کی بے روزگاری ایک حد تک کم ہوگئی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عوام مزید محصولات کے بار سے سبکدوش ہوگئے ہیں۔ ان راہوں پر جو کامیابی حاصل ہوچکی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ دوسری اہم مصنوعات کو بھی قومی پیمانہ پر ترقی دی جائے

اور ایسا کرنے کا واحد اور بہترین ذریعہ حکومت ہی ہوسکتی ہے ۔ اگر حکومت ان چیزوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر کام شروع کردے تو اس کی سالانہ آمدنی میں معتد بہ اضافہ ہوجائے گا ۔ اور ساتھ ہی ساتھ مسئلہ بے روزگاری بھی ایک حد تک دور ہوسکے گا ۔ نہ صرف یہ بلکہ انفرادی آمدنی پر لگان (Incometax) عائد کرنے اور مسئلہ بے روزگاری کو حل کرنے کے لئے ایک جدید محکمہ قائم کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہ رہے گی ۔ ہمارے سامنے ریاست ہائے متحدہ امریکہ بہترین مثال کے طور پر موجود ہیں ۔ جہاں موجودہ بین الاقوامی حالت اور جنگ کے قطع نظر سب سے بڑے تجارتی بنک کا کام بھی وفاقی حکومت ہی دیتی ہے ۔ وہ قومی سرمایہ سے ایسی مصدقہ ٹھیکہ دار کمپنیوں کو مدد دیتی ہے جو ملک کی ترقی کے تحت کام کرتی ہیں ۔ موجودہ صدر روزولٹ کو میزانیہ میں خسارہ آنے کی مطلق پروا نہیں ہے ۔ صرف مقصد کا اعلان اور صنعتی وزارت پر بین الاقوامی تجربہ رکھنے والی شخصیت کا تقرر عوام کا اعتماد حاصل کرلینے کے لئے کافی ہے طریقہ کار و ضروری ذرائع خود بخود عمل پیرا ہوجاتے ہیں ۔ ایک ریاستی بنک کے لئے جسکی حال ہی میں منظوری دی گئی ہے وہ خود اس مقالہ کے استدلال کو اور بھی قوی بنادیتی ہے ۔

ایس ۔ کیشو ۔ آئنگار

(پروفیسر ہمنت راؤ صاحب کے مضمون Education of Soul کا ترجمہ)

آکسفورڈ جانے سے پہلے آندھرا یونیورسٹی کے سربرآوردہ وائس چانسلر نے اپنی اکثر وداعی تقریروں میں نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اِس بات پر زور دیا کہ وہ ہر روز چند ساعت تربیت رُوح میں اُسی طرح صرف کریں جس طرح اُنھیں آج کل جسمانی ورزش پر روز چند منٹ صرف کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

تمدن کی تمام کمزوریوں اور بُرائیوں کو مغرب و مشرق دونوں جگہ بے ڈھنگی نشوونما پر مبنی قرار دیا جاتا ہے۔ ہم نے فہم اور جسم کو لا محدود حد تک سنوارا مگر رُوح کو بیمار ہی رہنے دیا جس کے علاج کی ضرورت ہے۔ وہ معاشرت جو کہ موٹر۔ ہوائی جہاز۔ ریل۔ دُخانی جہاز۔ ٹیلیفون۔ تار برقی۔ لاسلکی۔ اور سینما تیار کرسکتی ہے۔ عام طور پر ترقی یافتہ خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہر زمانہ کی چند قابل ہستیوں نے اِس امر کو محسوس کیا ہے کہ صحیح معاشرت و تمدن "صرف مادّی ترقی" نہیں بلکہ معاشرت کے معنی اُس سے کچھ زیادہ ہیں۔ اُنہوں نے رُوحانی ترقی کو بھی ضروری سمجھا کیونکہ تمام مادّی اشیاء آرام و آسائش مہیا کرکے رُوحانی ترقی کا موقع بہم پہونچاتی ہیں۔

اَب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رُوح۔ نفس۔ رُوحانی ترقی جیسے الفاظ کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ وہ لوگ جو عملی کہلائے جاتے ہیں ان الفاظ کو دماغی سودا سمجھ کر نظرانداز کردیتے ہیں۔ اپنی کتاب ماڈرن مسٹکس (Modern Mystics) میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ Sir Francis Young Husband نے یہ بتلایا ہے کہ کس طرح رُوحانی تاثرات کو جنون یا وہم تصور کرکے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "یہ ناممکن تھا کہ سینٹ تھامس آکنیاس (St Themns Acquinas) فادر پولین (Father Poulain)

پادری اینج (Dean Inge) جیسے مشہور مفکر اس کی چھان بین میں اتنی ذہنی قوت صرف کرتے اگر اُن کے خیال میں اسے واقعی کوئی اہمیت حاصل نہ ہوتی۔" مختلف زمانوں میں اور مختلف ممالک میں ایسے مرد اور ایسی عورتیں بہت کم گذری ہیں جن میں رُوحانی تاثرات جو تصوف کہلاتے ہیں پیدا ہوتے ہوں۔ گو دان کے احباب نے انہیں دیوانہ قرار دیا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان چند افراد کا جنھیں ہم صوفی پکارتے ہیں براہِ راست خدا سے تعلق تھا جسمیں تخلیق کی قوت ہے اور جو کائنات کی رُوح ہے۔ اُنہوں نے عوام پر اپنا گہرا اثر ڈالا۔ سر فرانسس نے دورِ حاضرہ کے ہندوستان۔ ایران۔ فرانس۔ انگلستان اور ویلز کے ہندو مسلمان اور عیسائیوں میں سے ایسے مردوں اور عورتوں کی مثالیں دی ہیں جنھوں نے رُوحانیت کا تجربہ کیا۔ کشب چندر سین۔ راماکرشنا۔ ولیو کانند۔ باب سینٹ تھریس اور رایولن رابرٹس اور آن کے مقلد سبھوں نے بھی اس قسم کے تجربات حاصل کئے" انہیں سے ہر ایک ناقابلِ تسخیر راستبازی۔ ارادہ اور کردار کے خلوص کے لئے مشہور ہے۔ ان میں سے اکثر کو مذہبی رسومات ترک کرنا پڑا۔ لیکن اُن کے لئے خاندانی و معاشرتی تعلقات کا توڑنا اور بھی مشکل تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر ایک کو اُن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جن کا تجربہ شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ لیکن سبھوں نے اُن ناقابلِ بیان تکالیف میں بھی بے انتہا مسرت محسوس کی اور انہیں یقین کامل تھا کہ انسان سطحی طور پر کتنا ہی کمزور اور برا کیوں نہ نظر آئے درحقیقت بُرا نہیں۔ ہر چیز کی بنیاد نیکی ہی ہے۔ اس نیکی میں ایسی قوت ہے کہ وہ برائی پر غالب آجاتی ہے اور اس کو نیکی میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ان لوگوں نے محسوس کیا کہ تمام انسانوں میں کچھ نہ کچھ ضرور مشترک ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دلوں میں دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ موجزن پاتے تھے۔ اور ان کی خواہش تھی کہ جو سکون اور مسرت اُنہیں حاصل ہے۔ وہ دوسروں کو بھی پہونچائیں ۔یقیناً انہیں معلوم تھا کہ مشترک انسانیت مشترک ربانیت ہے۔

آخر صوفیانہ تجربوں کا عملی فائدہ کیا ہے؟ عارف یہ جواب دیتا ہے کہ " وہ کام بھی جو بالکلیۃً عملی ہوتا ہے۔ اس میں بالآخر روحانیت ہی سے کام پڑتا ہے۔ سائنس اور فلسفہ سے صرف اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ تمام اشیاء ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور وہ سب ملکر ایک زندہ جاویدشکل اختیار کرتی ہیں۔ مگر انسان کو جوش ولولہ۔ خوشکن ہمت الہام۔ اور یقین کامل سوائے تصوف کے کہیں اور نہیں مل سکتا۔ وہ تصوف ہی ہے جو انسان کو علم کے صحیح راستہ پر لگاتا ہے، پامال اور فرسودہ راستے سے بچاتے ہوئے نامعلوم بلندیوں پر پہونچاتا ہے۔"

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تصوف عملی حیثیت سے بہت کچھ کار آمد ہے۔ اگر انسان کو مرکزی طور پر یقین حاصل ہو اور اسے ایک گونہ سکون و اطمینان نصیب ہو تو یہ انقلابات اور حوادث زندگی کا سامنا کرنے میں گران بہا چیز ثابت ہوتی ہے۔ شر و فساد میں بھی ان چیزوں سے بے انتہا مدد ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اگر اسے بے انتہا مسرت حاصل ہو تو اس میں سخت سے سخت طوفان کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور موجوں کے تھپیڑوں کا سامنا کرتے ہوئے بدبختیوں کے سمندر کو فتح و نصرت کے ساتھ عبور کر لینے سے اُس کی قیمت دوچند ہو جاتی ہے۔ اگر اُس تقویت آمیز مسرت پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہو جائے تو وہ ہر عمل میں تیزی و قوت پیدا کر دیگی۔ ان میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ ایک نور افشاں جلوہ کی طرح چمکے گی جس سے اُس کے دل سے خوف۔ حرص۔ حسد۔ نفرت۔ اور دوسری کمزوریوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اُس صورت میں تصوف کی قدر و قیمت اور بڑھ جائیگی۔ اور آخر میں اگر انسان یہ محسوس کرے کہ اُس کی روح میں کوئی نئی قوت پیدا ہوئی ہے، اس کی رُوح دوسروں کی خدمت کے لئے تیار ہے، اس میں سچائی اور راستبازی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے، اس میں الہامی نکتہ رسی جس سے اس پر دوسرے دلوں کے راز افشا ہوتے ہوں؟ اور وہ ایک لمحہ میں انسان کا اصل جوہر دریافت کر سکتا ہے۔ جو انسان کی سطحی کمزوریوں کی وجہ سے نمایاں ہونے نہیں پاتا لیکن عارف کی نگاہ سے پوشیدہ بھی نہیں ہوتا، اگر انسان کو یہ الہامی قوت میسر آجائے تو واقعی تصوف کا رُتبہ کہیں زیادہ بلند ہو جاتا ہے۔ ایسا یقین کامل۔ ایسا سکون و فتح یاب انبساط انسان کی عملی زندگی میں بیحد کارآمد ثابت ہوگا۔ اپنے فنی۔ دفتری۔ یا خانگی کاروبار میں ہر قسم کے تشدد و اشتعال کے باوجود وہ اپنے آپ کو سنجیدہ رکھ سکتا ہے۔ اپنے غصہ پر قادر رہ سکتا ہے۔ اپنی دماغی حالت متاثر ہونے نہیں دیتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ دوسروں کے خیالات سے آگاہی حاصل کر لینے کے بعد ایسی روش اختیار کرتا ہے کہ وہ خوشی خوشی اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اور اس کی مقصد برآری میں مدد پہونچاتے ہیں ان تمام چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہونیکی وجہ سے تصوف کسی قیمت بھی گراں نہیں۔

سر فرانسس کو اس امر کا افسوس ہے کہ ان روحانی تجربوں کی اتنی بڑی قیمت ہونے کے باوجود جامعات میں تعلیم کے اس پہلو کی ترقی کے لئے کوئی کوشش نہیں کی جاتی "جامعات سے بڑے بڑے محقق، قابل مدبر اور عہدیدار۔ نامور سائنسدان پیدا ہوئے ہیں۔ مگر وہ جامعہ کہاں ہے جو ان لوگوں کی روح کی تربیت کو جو ان کی تمام زندگی میں مددگار رہوتی ہے۔ اپنا اہم ترین اصول و طریقۂ تعلیم قرار دیتی ہے؟ یورپ

وامریکہ کی اکثر جامعات و مدارس میں جسمانی صحت۔ ذہنی قوت۔ چال چلن کی درستی اور حب الوطنی کو کافی اہمیت دیجاتی ہے مگر کس حد تک روح کے بنیادی اُصول یعنی حب الکائنات کو جس سے تمام دنیا وجود میں آئی اہم قرار دیا گیا ہے۔ وہ صحیح تربیتِ روح جس کی اِنسانی ترقی کے لئے سخت ضرورت ہے کہاں دستیاب ہوسکتی ہے؟ رُوح کی غذا کہاں میسّر آتی ہے؟

روح کی باقاعدہ تربیت کے لئے سر فرانسس نے اپنے چند نظریئے پیش کئے ہیں۔ جو نہ صرف روزانہ غور و فکر اور تمام خیالات کو کامل ترین ہستی پر منعطف کرنے پر زور دیتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جدید ترقی حمل و نقل سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان اشخاص سے ربط و ضبط پیدا کرنا جو معرفت کا درجہ حاصل کرچکے ہیں پوجا پاٹ، نماز۔ مراقبہ اور کشف اولیا، اللہ کی تعلیق زندہ صوفی و بزرگوں کی تقلید، وہ ذرائع ہیں جن سے اِنسان میں رُوحانی احساس پیدا ہوسکتا ہے۔ جو کامل اِنسانیت کے لئے ضروری ہے آج کل دنیا کی ترقی کے لئے ہمیں ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو صرف خاص خاص اُصولوں پر ہی مبنی نہو بلکہ جو خدا کے قادر مطلق ہونے اور اِنسان کی برادری کا شدید اِحساس پیدا کرتا ہو۔

احمد الدّین صدیقی

سال چہارم

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز

یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے

جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

"مجھے بلیوں سے نفرت ہے!"

بہار کی ایک صبح تھی۔ میں دلکشا نامی قہوہ خانہ میں دریچہ کے پاس بیٹھا تھا۔ میری میز پر سوائے میرے کوئی اور نہ تھا۔ نوکر کو قہوہ لانیکا حکم دیکر میں نے سگریٹ جلایا اور دریچہ کا پردہ ہٹا کر دھواں باہر پھونکنے لگا بھورے اور سیاہ رنگ کے بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے ہوا کے کندھوں پر فضائے بسیط میں اڑے جا رہے تھے۔ آفتاب کبھی کالے اور کبھی بھورے بادلوں میں چھپ جاتا اور کبھی کنکھیوں سے زمین والوں پر ایک نظر خوش گذر ڈال لیتا۔

"قہوہ حاضر ہے" ہوٹل کے نوکر نے قہوہ کی کشتی میز پر رکھتے ہوئے کہا مگر میں نے سنی اَن سنی کردی کیونکہ میں یہ دیکھنے کے لئے بے چین تھا کہ ابر کا بھورا ٹکڑا یا کالا ٹکڑا کون پہلے آفتاب تک جا پہنچتا ہے۔ دفعتاً میری میز پر ایک دھماکہ ہوا اور قہوہ کا سارا سامان ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا اور میاؤں میاؤں کرتی ہوئی ایک بلی چھلانگتی ہوئی دریچہ کی راہ سے فرار ہوگئی ——

"معاف فرمائیے جناب!" ایک شخص جو وضع قطع سے شریف معلوم ہوتا تھا میرے سامنے کھڑا بڑی شائستگی سے معافی کا خواستگار تھا" میری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی —— کمبخت اس بلی کو بھی آپ ہی کی طرف جانا تھا اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے کوٹ پر سے قہوہ صاف کردوں ——"

"نہیں نہیں، آپ تکلیف نہ کریں۔ میں خود صاف کروں گا" میرا غصہ اس کی شائستگی کی وجہ سے ٹھنڈا پڑ چکا تھا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بلیوں سے نفرت ہے"

"نفرت، عداوت، کراہت، بیزاری، انتقام اور جانے کون کون سے جذبے بلی کو دیکھکر مجھ میں پیدا ہو جاتے ہیں" اس کا لہجہ پُرجوش اور جذباتی تھا "یوں تو مجھے تمام جانوروں اور پرندوں سے نفرت ہے لیکن بلی اُف بلی سے آپ نہ پوچھئے کتنی سخت نفرت ہے"

"انسانی طبیعتوں میں عجیب و غریب قسم کا اختلاف ہے، بعض لوگوں کو جانوروں سے دلچسپی نہیں ہوتی حتیٰ کہ پالتو جانوروں سے بھی ——"

"مگر جناب! میری نفرت کی وجہ ہے اور وہ بھی نہایت معقول —— اگر آپ سُننا پسند کریں تو میں اپنا واقعہ سناؤں؟"

"ضرور سنائیے، مجھے ایسے قصّوں سے بڑی دلچسپی ہے۔"

"قصّہ؟"

"نہیں نہیں میں کہنا چاہتا تھا واقعہ!"

"آپ کہیں اَفسانہ نویس تو نہیں"

"کیوں؟ اِس سوال سے بلّی والے واقعہ کو کیا تعلق؟"

"بات یہ ہے جناب! اَفسانہ نویس دوسروں کے واقعات کو اپنے اَفسانے بنا ڈالتے ہیں اور انہیں اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ اس اَفسانوی رنگ سے اس شخص کے دل پر کیا گذرتی ہے جس پر کہ اصل واقعہ گذرا ہے ——"

"سنئے جناب! صاف صاف یہ ہے کہ میں واقعی افسانہ نویس ہوں اور یہاں دراصل افسانے کے پلاٹ کی تلاش میں آیا ہوں اور یہ بھی کہنے میں تامل نہیں کرتا کہ آپ سے سُنا ہوا واقعہ اگر مجھے پسند آجائے تو یقیناً لکھ ڈالوں گا لیکن اِتنا آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ آپ جس طرح کہیں گے اسی طرح لکھوں گا اور یہ بھی ظاہر کردوں گا کہ یہ ایک سچّا واقعہ ہے جس کو میں نے اپنے کانوں سے لفظ بہ لفظ سُنا ہے —— اَب اگر آپ کا جی چاہے تو واقعہ بیان کیجئے اور اگر جی نہ چاہے تو ——"

آپ کی صاف گوئی مجھے بیحد پسند آئی" وہ شخص میرے طرزِ کلام سے متاثر ہو کر کہنے لگا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس طرح لکھینگے کہ واقعہ واقعہ ہی رہے اَفسانہ نہ بن جائے" وہ میری ہی میز پر ٹک گیا اور سگریٹ جلاتے ہوئے بولا "بمبئی میں میرے چچا کا ایک بڑا ہوٹل ہے "دل شاد" —— آپنے غالباً نام سُنا ہوگا۔ شہر سے باہر دریا کے کنارہ بستی سے بالکل الگ تھلگ، کھانے پینے اور رہائش کا بہت ہی اچھا اِنتظام، آپ فرمائیے مسافرین کو اور کس بات کی ضرورت ہوتی ہے؟ لیکن کاروباری دنیا سے کیقدر فاصلہ پر ہونے کی وجہ سے اس میں صرف وہی لوگ رہتے تھے جو اس شہر رنگ و بو میں گلچھرے اُڑانے کیلئے

آتے تھے ـــــــــ اوہ! ابھی تک میرا ذکر ہی نہیں آیا میرا نام عزیز الحسن ہے میں اپنے والد کا اکلوتا لڑکا تھا اور والد کے انتقال کے بعد چچا ہی کے زیر پرورش تھا۔ چچا کے سوا جہاں تک مجھے معلوم ہے میرا کوئی قریبی عزیز نہ تھا اور چچا کا بھی میرے سوا، کوئی نہ تھا۔

" چچا کی سختی کے باوجود بھی میں نے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ تعلیم سے میری مراد یونیورسٹی کی تعلیم ہے ورنہ ایسے تو میں ڈگری کے سوا تعلیم کے تمام ذرائع سے استفادہ کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ میں فطرتاً مصور تھا اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مصور شاعر کی طرح تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے اور اس کی درسگاہ مادی یونیورسٹیاں نہیں ہوتیں بلکہ قدرت کے رُوح پرور نظارے ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں اپنا وقت زیادہ تر مشاہدات میں صرف کرتا تھا جس کو سوء اتفاق سے کاروباری دماغ رکھنے والے چچا وقت کا بیجا اسراف سمجھتے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے میری مرضی کے خلاف مجھے ہوٹل کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے منیجر کے ساتھ شریک کار کر دیا ـــــــ قسمت دیکھئے کہ جو شخص پیدائشی مصور ہو اس کو ہوٹل چلانے کا دھندا اختیار کرنا پڑا! ہزار بار جی چاہتا تھا کہ ہوٹل کے مسافروں کی دیکھ بھال اور ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام کرنے سے صاف انکار کر دوں مگر بےچارگی، مفلسی اور بیگانگی ہمیشہ صاف گوئی سے روکتی رہی۔

" آپ کہیں گے اس واقعہ کو بلیوں کی نفرت سے کیا تعلق؟ ٹھیریئے ٹھیریئے میں سب کچھ کہوں گا۔ بات کو میں زبردستی طول نہیں دے رہا ہوں بلکہ واقعہ کی اہمیت نمایاں کرنے کے لئے مجبوراً ضروری تفصیلات پیش کر رہا ہوں ـــــــ تو ہاں جناب یہ ایک واقعہ تھا کہ ہمارا ہوٹل بےفکروں کی رہائش گاہ تھا اور اُن میں اگر آپ تلاش کریں تو یقیناً بہت سے نواب، راجہ اور زمیندار ملینگے۔ ایک چیز یہاں گرہ میں باندھ رکھنے کی یہ ہے کہ اس قسم کے جتنے دولتمند بےفکرے ہوتے ہیں سب کو کسی نہ کسی جانور پالنے کا شوق ضرور ہوتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ ہی ان کے جانور بھی ہمارے ہوٹل میں ٹھہرتے تھے۔ آپ یقین کیجئے کہ کسی کے ساتھ بلّی ہوتی تو کسی کے ساتھ کتا۔ کسی کے ساتھ لومڑی ہوتی تو کسی کے ساتھ بھیڑیا۔ ایک راجہ صاحب برس میں دو مہینے ضرور ہمارے ہاں رہتے تھے اور ان کے ساتھ ان کا خاص جانور اونٹ ضرور ہوتا تھا۔ راجہ صاحب اپنے لئے ایک دوہرا کمرہ لیتے اور اپنے اونٹ کے لئے بھی ایک دوہرا کمرہ اور یقین مانیئے کہ اونٹ بھی ہوٹل کے خاص کمروں ہی میں ٹھہرتا تھا۔ ایک دفعہ میں نے کہا تھا کہ اس کو ہوٹل کے طویلے میں کیوں نہ رکھا جائے تو اس پر راجہ صاحب اتنے خفا ہوئے، اتنے خفا ہوئے گویا کہ میں نے اُن کے جدِ امجد ہی کو بُرا بھلا کہا ہے۔ ایک اور نواب صاحب تھے

انہیں کینگروکا بڑا شوق تھا اور میری حالت یہ کہ اُسے دیکھتے ہی طبیعت متلانے لگتی ـــــ بہرحال آپ یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارا ہوٹل ان نوابوں، راجاؤں اور زمینداروں کے قیام کی وجہ سے ایک عجائب گھر سا ہوگیا تھا پھر اُس پر ان جانوروں نے تو چڑیا گھر ہی بنا دیا۔

" ان سب کا ذکر جانے دیجئے، مجھے اب مطلب پر آنا ہے ـــــ ایک خاتون تھیں میں اُن کا نام نہیں بتاؤں گا، ان کے ساتھ ایک بلی تھی جس کا نام اُنھوں نے بڑے پیار سے لیلیٰ رکھا تھا۔ اس کالی موٹی اور بھدی بلی میں نہ معلوم اس خاتون کو کیا بات نظر آتی تھی جو صبح سے شام تک سینہ سے لگائے رکھتی تھی ان کی یہ عجیب و غریب عادت تھی کہ جب کبھی میری میز کے سامنے سے گذرتیں تو ضرور بلی کو میز پر چھوڑ کر فرمائش کرتیں کہ وہ مجھے سلام کرے۔

" جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ ہوٹل کو چڑیا گھر میں تبدیل ہوتے دیکھکر مجھے جانوروں اور ان کے مالکوں سے بھی ایک قسم کی نفرت سی ہوگئی تھی۔ اس پر طرہ اس خاتون کی مہربانی تھی۔ انسان ایک آدھ دفعہ ضبط کرسکتا ہے لیکن دن میں چار پانچ بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ ضبط نہیں کرسکتا۔ شروع شروع میں ایک دو وقت میں نے سینہ پر پتھر رکھکر اور دانتیں نکوس کر ظاہر داری کی اور ہاتھ بڑھا کر بلی کو تھپکنے کی کوشش کی مگر آپ یہ یاد رکھیں کہ میں نے کبھی تھپکا نہیں بلکہ ہر دفعہ بڑی خوبی سے پہلو تہی کرتا گیا۔ دو ایک روز بعد میں نے ظاہر داری بھی چھوڑ دی اور صاف انجان ہوگیا۔ اس پر بھی خاتون نے اپنی وضع داری باقی رکھی۔ چند روز بعد جوں ہی میں انھیں آتا دیکھتا فوراً ہی میز چھوڑ کر کہیں اور چلا جاتا لیکن خاتون کی نظریں میرا تعاقب کرتیں اور مجھے ڈھونڈھ کر اپنی وضع داری قائم رکھتیں۔

" ایک دن میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ ابن آدم ہوں۔ قابیل نے تو ہابیل کو ذبح ہی کر دیا تھا مگر میں نے نہ خاتون کو ذبح کیا اور نہ ان کی بلی کو البتہ ـــــ ہاں تو ہوا یہ کہ ایک صبح جب میں اپنے کام میں بے انتہا منہمک تھا وہی خاتون بلا توقع آموجود ہوئیں اور حسب عادت بلی کو میز پر چھوڑ کر حکم دیا کہ وہ مجھے سلام کرے۔ بلی میرے قریب پہنچ گئی اور میرے کوٹ سے پیٹھ رگڑتے ہوئے دم اُٹھا کر چاہتی تھی کہ غلاظت کرے ـــــ ایسے میں میں بے قابو ہوگیا اور وہ کر گذرا جس کی کسی کو خصوصاً میرے چچا کو بالکل توقع نہ تھی ـــــ جناب! آپ سمجھے کہ میں نے کیا کیا؟ ٹھہریے بتاؤں آپ کو! یقین مانئیے کہ فوراً ہی بلی کی دم پکڑ کر اس زور سے گھمایا کہ جس طرح کوئی گوپن میں پتھر رکھکر پھراتا ہو اور دفعتاً ایک لمحہ بعد بلی کو ہاتھ سے جو چھوڑا ہے تو ـــــ

آپ نے چوتھی یا پانچویں جماعت میں ایک انگریزی نظم پڑھی ہوگی، دماغ پر بار ڈال کر اسے یاد کیجئے "میں نے
ہوا میں ایک تیر چلایا . . . . . . وہ زمین پر کہیں گرا . . . . . . میں نہیں جانتا کہ کہاں . . . . . "
آگے چلکر شاعر کہتا ہے کہ اُسے تیر کا کھوج ملا۔ وہ تیر اس کے ایک دوست کے سینہ میں پیوست ہو گیا تھا۔
ہاں تو میں نے بلی کو چلکر دیکر جو چھوڑا ہے تو وہ سیدھے جاکر میرے چچا کے منہ پر گری ہے۔

" خاتون جو ہمارے ہوٹل کے خاص سرپرستوں میں سے تھیں فوراً ہی ہوٹل چھوڑ کر چلی گئیں۔ چچا یوں بھی ذرا تیز طبیعت کے مالک ہیں اس پر دولت کا نشہ ایسے مواقع پر غصہ کا پارہ اور بھی چڑھا دیتا ہے ———— یہ تو میں آپ سے کہہ ہی چکا ہوں کہ میں ایک بے سہارا مفلس نوجوان تھا اس لئے چچا نے بڑا کرم کیا جو مجھکو نکالتے وقت ایک ہزار روپئے کا چک دیدیا اور تاکید کی کہ دوبارہ میں ان کی صورت نہ دیکھوں۔

" اول تو میں سونچا کہ مرضی کے خلاف پیشہ تھا اچھا ہوا جو چھوٹ گیا۔ ایک چھوٹے سے ذاتی نگار خانے کا منصوبہ سونچنے لگا۔ آپ جانتے ہیں منصوبے سونچنے کے لئے عمدہ ہوٹل ہی موزوں مقام ہوتا ہے۔ میں قریب کے ایک رستوران میں پہنچا۔ سنتا تھا کہ یہ بہت گراں ہے۔ لیکن اس وقت میرے پاس بھی تو پورے ہزار روپئے تھے۔ بہترین کھانے کا حکم دیا اور ایک بہت قیمتی سگرٹیوں کا ڈبہ منگوایا۔ سگریٹ سے سگریٹ جلانا پراگندہ خیالات کو یکجا کرنے میں بہت مدد دیتا ہے۔

" آپ سے کیا چھپاؤں واقعہ یہ تھا کہ دوپہر ہو چکی تھی لیکن میں کسی قطعی نتیجہ پر نہ پہنچا تھا۔ ذاتی نگار خانے کا اندازہ تفصیلات کے ساتھ ایک ہزار سے زیادہ کا تھا اور پھر خیال آتا تھا کہ میں نے کبھی عملی طور پر مصوری کے درس تک نہیں لئے لاکھ پیدائشی اور فطری مصور سہی لیکن نگار خانہ کھولکر فوراً ہی روپیہ کس طرح کما سکوں گا۔

" بیٹھے بیٹھے طبیعت کند ہو رہی تھی اس لئے میں نے میٹنی شو دیکھنے کا تصفیہ کیا۔ نہیں معلوم کہ کھیل ہی اچھا نہ تھا یا منتشر خیالات کی وجہ سے مجھے کوئی لطف نہ آیا۔ کھیل ختم کر کے پارک کا رُخ کیا اور وہاں ٹہلتے ٹہلتے جب پاؤں تھک گئے تو میں پاس کے ایک ہوٹل میں کھانے کے لئے پہنچا۔ سگریٹ کا ڈبہ ختم ہو چکا تھا اور اُن میں اب کوئی دلچسپی بھی نہ رہی تھی اس لئے سگار کا ایک ڈبہ خریدا۔ نو بجے کے قریب خیال ہوا کہ کسی اور سینما میں دوسرا شو دیکھنا چاہیئے۔ سوء اتفاق سے یہ المیہ ڈراما تھا۔ اِس لئے میں ڈراما دیکھنا چھوڑ کر آس پاس کی صورتوں کو گھورنے لگا۔ اس سے بھی دلچسپی نہ ہوئی تو باہر نکل کر تصویریں دیکھنے لگا یکایک میرے کان میں آواز آئی "بولو مٹھو بیٹے! عورتوں کا بول بالا، مردوں کا منہ کالا" ایک لمحہ بعد ہی ایک بڑا سا طوطا کہیں سے اُڑکر میرے کندھے پر

آ بیٹھا اور چلّا چلّا کر کہنے لگا " بولو مٹھو بیٹے! عورتوں کا بول بالا، مردوں کا منہ کالا" میں اِس اچانک حملہ سے اِتنا گھبرایا کہ تصویروں کے چوکھٹے پر گرتے گرتے بچا۔ میرے منہ سے بے تحاشا ایک چیخ نکلی اور میں اِدھر سے اُدھر بھاگ رہا تھا لیکن اِس ڈر سے کہ کہیں طوطا میری آنکھ پھوڑ نہ دے یا ناک کاٹ نہ لے میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کو پکڑ رکھا تھا۔

" یوں تو بہت سے تماشائی کھیل چھوڑ کر دوڑے ہوئے میرا تماشہ کرنے آ گئے لیکن ایک خوبصورت جوان عورت مجمع کو چیرتی پھاڑتی میری طرف لپکی اور جلدی جلدی خوشی سے پھولی نہ سما کر کہنے لگی " اوہ! میرا مٹھو! شکریہ شکریہ! آپ نے خوب پکڑا اسے! یہ کل سے لاپتہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" وہ نوجوان لڑکی سمجھ رہی تھی کہ میں نے بڑی بہادری سے اس کا طوطا پکڑ رکھا ہے اور خصوصاً جب وہ مجھے پہچان گئی کہ میں " دل شاد" ہوٹل کا شریک منیجر ہوں تو اُس کو پختہ یقین ہو گیا کہ میں نے اُس کے طوطے کو پہچان کر پکڑ لیا۔ مجھے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ دل شاد کی میری کرم فرما خاتون اور خصوصاً اس کی بلّی لیلیٰ سے اس کو کتنی نفرت ہے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ لیلیٰ ہی کے خوف سے اس کا مٹھو اڑ گیا تھا۔ دبی زبان سے اس نے صبح کے واقعہ پر بھی روشنی ڈالی اور لیلیٰ کی دم پکڑ کر گھمانے پر مجھے مبارکباد دی۔

" کھیل ختم ہونے پر وہ اِصرار کرنے لگی کہ میں اس کے ساتھ موٹر میں چلوں۔ وہ یہ تو جانتی تھی کہ میں " دلشاد" سے نکل چکا ہوں لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ اَب کہاں ہوں دراصل یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہ تھا اِس لئے جب وہ پوچھنے لگی کہ :-

" دل شاد سے اُٹھ کر آپ کہاں گئے؟" اور جواب کا اِنتظار کئے بغیر بولی " کہیں یہ سامنے والے ہوٹل " فردوس " میں تو نہیں ؟"

مجھے بہرحال کہیں نہ کہیں رہنا تھا اِس لئے اس اشارہ کو غنیمت سمجھ کر بولا " جی ہاں یہیں ہوں، خوب پہچانا آپ نے "

" کل میں سہ پہر کو آپ کے ہاں آؤں گی، اگر آپ کو فرصت ہو تو میرا انتظار کیجئے" وہ ذرا بے تکلف ہو کر بولی " ہم کل تھیئٹر چلیں گے۔ کھانا بھی آپ میرے ساتھ ہی کھائیں گے "

اُس نے اپنا موٹر فردوس کی پھاٹک پر روکا ———— اوہ میں نے اس لڑکی کا نام ہی نہیں بتایا ———— یاسمین تھا نام اس کا! یاسمین مسکرا کر مجھ سے رخصت ہوئی اور میں رُونی صورت بنا کر ہوٹل میں

داخل ہوا۔ کمرہ کرایہ پر لیا ــــــ کرایہ بہت گراں تھا، مگر مجبوری تھی۔

"رات کیسی گذری؟ اُف! بجائے خود ایک طولانی داستان ہے، کہاں تک کہوں، آپ اُکتا نہ جائیں بس دو لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یاسمین کی اس ملاقات نے مجھے زندگی کے ایک نئے دروازہ پر کھڑا کر دیا۔ صاحب! آپ یقین کیجئے کہ مصور ہونا بھی غضب ہے اور وہ بھی پیدائشی اور فطری! اور ویسے بھی میرا دل ذرا زیادہ حساس واقع ہوا ہے۔ یاسمین کے اس حسن سلوک سے اتنا متاثر ہوا کہ ساری کائنات میں مجھے سوائے اپنے اور یاسمین کے کسی تیسری چیز کی موجودگی کا علم نہ رہا لیکن میں سوچنے لگا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے اس کا کھویا ہوا طوطا واپس دلایا اور وہ میری بے حد ممنون ہے مگر ــــــ اس جیسی دولت مند لڑکی کیا مجھ جیسے بے سہارا، مفلس سے شادی کرنا پسند کرے گی؟ کبھی دل کہتا کہ وہ مجھے ضرور پسند کرتی ہے اور یقیناً میری مالی حالت کی طرف توجہ نہ کرے گی اور کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ اگر میں ذرا سی ہمت کروں تو سونے کی چڑیا ہاتھ آجائے گی۔ مختصر یہ کہ دوسرے دن سہ پہر کو یاسمین حسب وعدہ آئی۔ شام تک ہم خوب سیر کرتے رہے، بہت سی باتیں ہوئیں، علمی مسائل پر بھی بحث ہوئی (میں نے یہ بات عمداً اس لئے کہی کہ آپ کہیں مجھے نالائق نہ سمجھیں محض اس لئے کہ میں نے ڈگری نہیں لی) پھر آرٹ پر تبادلۂ خیال ہوا۔ اس کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ میں مصور ہوں اور اپنی آئندہ زندگی مصور کی حیثیت سے گذارنے کا تصفیہ کرچکا ہوں۔ شام ہوئی تو ہم ایک ہوٹل میں کھانا کھانے پہنچے۔

"میں آپ کی تصویریں دیکھنا چاہتی ہوں" کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے اُس نے یہ عجیب وغریب خواہش ظاہر کی "آپ مناظر قدرت کی تصویریں زیادہ بناتے ہیں یا انسانوں کی؟"

"میں ــــــ میں ــــــ جی میں ــــــ" میں بے حد پریشان تھا کہ کیا کہوں۔ واقعہ تو میں نے آپ سے کہہ ہی دیا ہے کہ میں نے صحیح معنوں میں کسی اسکول آف آرٹ میں تعلیم نہیں پائی، کینوس اور برش سے مشق کا اتفاق نہیں ہوا، رنگوں کو منتخب کرنے یا ان کو ایک دوسرے سے ملانے کا موقع نہیں ملا، ماڈل، ہاں ماڈل دیکھے تو بیسیوں ہیں لیکن ان کی تصویر بنانے کی کوشش کبھی نہیں کی مگران تمام باتوں کے باوجود بھی میں مصور تھا اور پیدائشی اور فطری مصور ــــــ

"میں پوچھ رہی تھی کہ آپ مناظر قدرت کی تصویریں زیادہ بناتے ہیں یا انسانوں کی؟" یاسمین نے مجھے پریشان دیکھکر پھر پوچھا۔ "یہ آپ میں میں جی جی کیا کہہ رہے ہیں۔ مسٹر، مسٹر کیا نام ہے آپ کا

معاف کیجئے ــــــــ"

"مجھے عزیز الحسن کہتے ہیں، اور تصویروں کے متعلق آپ یوں سمجھ سکتی ہیں کہ مناظر قدرت کا زیادہ شایق ہوں" میں نے ہمت کر کے اور یہ سوچ کر کہ اگر انسانی تصویروں کا ذکر کروں تو کہیں وہ اپنی تصویر بنانے کی فوراً ہی خواہش نہ کر دے کہا

"اوہ! مناظر قدرت واقعی بڑی دلچسپی کی چیز ہوتے ہیں خصوصاً مصوروں کے لئے"

"میں ایک پیدائشی اور فطری مصور ہوں ــــــــ"

"آپ کا نگار خانہ کہاں ہے؟ مجھے آپ کی تصویریں دیکھنے کی انتہائی خواہش ہے"

"نگار خانہ ــــــــ وہ، وہ تو پرسوں ہی جل گیا" میں نے بغیر سوچے سمجھے بات ختم کرنے کے لئے کہا۔

"اوہ! جل گیا، کیونکر؟ کیسے؟ آپ کو بہت رنج ہوا ہوگا، مجھے دلی ہمدردی ہے آپ سے"

"قسمت کی بات ہے کوئی کیا کر سکتا ہے سوائے ہمدردی کے" میں نے ایک آہ سرد کھینچ کر کہا "واقعہ یہ ہے کہ میں فرصت کے اوقات میں نگار خانہ میں کام کیا کرتا تھا اور جیسا کہ آپ جانتی ہیں دل شاد ہوٹل کی مصروفیات مجھے بعض بعض دفعہ کئی کئی دن نگار خانہ جانے سے روک رکھتی تھیں۔ پرسوں میں نگار خانہ کو جو گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ راکھ کا ایک ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے اور بس۔ ہمسایہ کہتا تھا کہ ایک رات پہلے دفعتاً آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آناً فاناً جل کر خاکستر ہو گیا"

"کسی عجائب خانہ یا کسی دوست کے ہاں تو آپ کی تصویریں ہوں گی، براہ کرم مجھے ان ہی کو دکھا دیجئے"

"عجائب خانہ؟ بات یہ ہے خاتون کہ مجھے اس قسم کی نمائشی چیزیں پسند نہیں۔ میں ایک پیدائشی اور فطری مصور ہوں۔ میں تصویریں اس لئے رنگتا ہوں کہ اپنے جذبات، احساسات اور مشاہدات کی عکاسی کروں، آپ یقین مانئے میں مصوری کو پیشہ بنا کر روپیہ کمانا نہیں چاہتا۔ میں اسے الہامی جذبہ سمجھتا ہوں اور الہامی جذبہ کے تاثرات کو بیچنا قدرت کی توہین ہے صریح توہین۔!"

"عزیز صاحب! میں آپ کے خیالات کی قدر کرتی ہوں ــــــــ"

"شکریہ، بہت شکریہ۔ میں دراصل آرٹ آرٹ کی خاطر کا علمبردار ہوں نہ کہ آرٹ پیٹ کی

خاطر کا۔"

"درست ہے، مگر آپ فوراً ہی دوسرا اسٹوڈیو تیار کر لیجئے۔"

"خاتون! میں مصوری میں عجلت پسندی کو دخل نہیں دینے دیتا۔ بغیر الہام کے نہ میں تصویر شروع کرتا ہوں اور نہ ختم۔ دوسرے نگارخانے کی تعمیر کے لئے بھی میں مبداءِ فیض سے اکتساب الہام کئے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا ——— خیر اس بحث کو جانے دیجئے، میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں تھیٹر کا رُخ کرنا چاہیئے۔"

میں چونکہ پیدائشی اور فطری مصور ہوں اس لئے میرا مشاہدہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ اسی لئے میں نے یاسمین کے چہرہ پر اس کے دلی تاثرات کی جھلک دیکھی۔ وہ مجھ سے مرعوب تھی، میری مصوری سے غائبانہ عقیدت رکھتی تھی اور میری طرزِ گفتگو سے بہت محظوظ ہوئی تھی۔ ان سب جذبات کے سوا ایک اور جذبے کی جھلک سرخی بنکر اس کے چہرہ پر اس وقت جھلکی جب ہم ڈراما دیکھ رہے تھے۔ ڈراما جذباتِ لطیف سے پُر تھا اور وہ تھیٹر کی مدھم روشنی میں بار بار مجھے کنکھیوں سے دیکھتی تھی اور رہ رہ کر میرا ہاتھ بڑی گرمجوشی سے دباتی تھی۔ میرا بھی تنفس تیز تھا اور دماغ آسمان پر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنے پر نہ صرف راضی ہو جائے گی بلکہ خوشی سے پھولی نہ سمائے گی۔

ڈراما دیکھکر واپس ہوئے تو "فردوس" کے پھاٹک پر اس نے مجھے مطلع کیا کہ کل صبح کی گاڑی سے وہ لاہور واپس جا رہی ہے لاہور اس کا وطن ہے اور وہاں کے ایک بڑے دولت مند "میاں صاحب" کی اکلوتی لڑکی ہے۔ اکثر و بیشتر وہ اپنے والد کے ساتھ ہی بمبئی آتی تھی اور "دل شاد" میں دونوں ٹھہرتے تھے لیکن اس دفعہ وہ تنہا ہی آئی تھی۔ وہ بی۔ اے میں پڑھتی تھی اور اب طویل تعطیلات کے بعد کالج کھلنے ہی کو تھا۔ اس لئے واپس جانا ضروری تھا۔

"لاہور آپ نے دیکھا ہے؟" اس نے پوچھا

"نہیں"

"تو پھر چلئے نا ساتھ ——— اگر آپ نے لاہور نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا، بڑا ہی مردم خیز خطہ ہے۔"

"جی ہاں میں نے بھی لاہور کی بڑی تعریف سُنی ہے، اشتیاق ضرور ہے مگر اس دفعہ نہیں

پھر کبھی چلوں گا۔"

"میں نہیں سمجھتی کہ آپ کو یہاں کوئی خاص کام ہوگا؟" اُس نے بڑی محبت سے کہا" اور ایسے بھی آپ "دل شاد" چھوڑ چکے ہیں اور یہاں نگار خانہ بھی جل چکا ہے ــــــــ"

"یہ سب صحیح ہے مگر ــــــــ"

"یہ اگر مگر میں کچھ نہیں جانتی ــــــــ کل صبح آٹھ بجے ٹھیک میں آؤں گی آپ تیار رہیں، سامان رات ہی کو درست کر لیجئے۔ لاہور بڑی اچھی جگہ ہے آپ کا دل بہل جائے گا ــــــــ والد بھی آپ سے مِل کر خوش ہوں گے۔"

یاسمین کی موٹر چلی گئی اور میں بہت دیر تک سوچتا کھڑا رہا کہ آخری فقرہ سے اِس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں شادی کے بارے میں اُس کے والد سے گفتگو چھیڑ دوں، بڑے اچھے آدمی ہیں، اجازت دیدیں گے۔ ہزار روپیوں میں سے میں نے ابھی پچاس ساٹھ ہی خرچ کئے تھے اِس لئے سوچا کہ اُن کی مدد سے جوا کھیلا جائے اور قسمت کو آزمایا جائے۔

دوسری صبح یاسمین آئی اور میں اِسٹیشن گیا۔ تیسرے دن لاہور پہنچے اور یہ واقعہ ہے کہ یاسمین نے لاہور کے متعلق غلط بیانی نہیں کی تھی۔ شہر بھی اچھا تھا اور اس کی مردم خیزی میں بھی کلام نہیں اور اس کے والد بھی بہت اچھی طرح پیش آئے وہ مجھ سے نہیں بلکہ میرے چچا سے "دل شاد" میں بار ہا ٹھہرنے کی وجہ سے خوب واقف تھے۔ میں جب سے کاروبار میں لگا تھا وہ آئے نہ تھے اس لئے نہ میں اُن سے واقف تھا اور نہ وہ مجھ سے۔

گھر میں اور باہر ہر طرح کا آرام تھا لیکن چند ہی روز میں دو باتوں کی مجھے ایک گونہ تکلیف ہونے لگی۔ ایک تو یہ کہ یاسمین مجھے مصوری کی ترغیب دلانے لگی اور دوسرے یہ کہ ایک لفٹنٹ صاحب گھر میں بے تکلف آتے جاتے تھے۔ اُن کا نام حمید تھا اور وہ غالباً مجھے اپنا رقیب سمجھنے لگے تھے اور اُن کے اسی رویّہ سے میں بھی انہیں برا سمجھتا تھا حالانکہ میں جانتا تھا کہ یاسمین حمید پر مجھے ہر طرح ترجیح دیتی ہے لیکن آپ سے دل کی بات کیا چھپاؤں۔ محبت بُری چیز ہے اور میں لاہور جا کر یاسمین سے بُری طرح محبت کرنے لگا تھا۔ حمید کی بے تکلفی مجھے بڑی تکلیف دیتی تھی اور میں اس کو کسی طرح اپنے راستہ سے ہٹانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔

ایک دن غضب یہ ہوا کہ حمید ایک بلی لایا اور زمین آسمان کے قلابے ملا کر یاسمین کو بطور تحفہ پیش کیا اور وہ بھی بہت خوش ہوئی لیکن میں' اف! کچھ نہ پوچھو میری کیا حالت ہوئی؟ میرا خون کھولنے لگا اور بے اختیار جی چاہا کہ اسکی بھی دُم پکڑ کر حمید کے منہ پر دے ماروں مگر مجبوری تھی سخت مجبوری! پھر بھی میں نے کہا کہ طوطے کی جان کی خیر نہیں ہے اور گھر میں یا تو طوطا رہ سکتا ہے یا بلی مگر حمید نے میری ایک نہ چلنے دی۔

یوں بھی مجھے بلیوں سے سخت ترین نفرت ہے اس پر طرہ یہ ہوا کہ حمید اس کارگزاری کے سلسلہ میں منہ چڑھنے لگا دو چار ہی روز میں میں نے تصفیہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے اس بلی کو تو ضرور دفع کروں گا۔ مار پھینکنے یا زہر دینے یا کسی کو چرا لینے پر اکسانے کی ترکیبیں سوچنے لگا مگر ان تمام میں کچھ نہ کچھ خامی نظر آتی تھی۔ حسن اتفاق سے یہ تدبیر سوجھی کہ کیوں نہ میں خود ایک دن موقع پا کر بلی کو کسی ڈبہ میں بند کر کے محکمہ حفظان صحت کے اُس شعبہ میں چھوڑ آؤں جہاں بیمار بلیوں کو شہریوں کی زندگی کی حفاظت کے سلسلہ میں مار دیا جاتا ہے۔ اس تدبیر میں بظاہر کوئی خامی نہ تھی اور توقع سے جلد مجھے اس پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یاسمین کو بلی کا رنج تھا' حمید نے اسکی تلاش میں سر گاڑی اور پاؤں پہیہ کر رکھا تھا لیکن میں بالکل بے تعلق تھا اور یہ ظاہر کر رہا تھا کہ مجھے مصوری کی ترغیب ہو رہی ہے۔ مگر تیسرے ہی دن ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ دوپہر کے قریب حمید آیا اور آتے ہی بڑی خوشی سے کہنے لگا۔

"یاسمین! میں نے تمھاری بلی آخر ڈھونڈھ نکالی"

"اوہ! ڈھونڈھ نکالی! کہاں ہے وہ؟"

"چلو میرے ساتھ جلدی چلو' وہ تمھیں ابھی ابھی مل جائے گی۔ حفظان صحت کے اس شعبہ میں جہاں بلیاں ماری جاتی ہیں تمھاری بلی موجود ہے۔ میں اسے لے آتا لیکن وہاں چونکہ کئی اور بلیاں ہیں اسی لئے میں نے مناسب سمجھا کہ تم چل کر ٹھیک طور پر شناخت کر کے لے آؤ"

"چلو' میں ابھی ابھی چلتی ہوں۔ عزیز! تم بھی چلو گے نا' کیا تم میری بلی کا خیر مقدم کرنے نہیں چلو گے؟"

یہ جان کر کہ انکار کرنے پر میرا وہی حشر ہوگا جو شیطان کا ایک سجدہ نہ کرنے سے ہوا تھا ساتھ ہو گیا۔ یاسمین اور حمید نے بلی پہچان لی اور نگران کار نے بلی واپس دے بھی دی۔ جب انھوں نے یہ دریافت کرنا چاہا کہ کس بدمعاش نے بلی یہاں پہنچائی تو میری روح کانپ ہی تو گئی مگر یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ نگران کار نے مجھے نہیں پہچانا۔

"مگر ٹھہریئے خاتون" میں آپ کو بلی لانے والے صاحب کا پتہ شائد بتا سکوں" نگران کار نے کہا اور لپک کر ایک ڈبہ لے آیا اور سلسلہ جاری رکھا" یہ دیکھئے! اسی ڈبہ میں بلی کو رکھکر ایک نوجوان پرسوں ہمارے ہاں پہنچا تھا:

" اوہ!" یاسمین کے منہ سے بے تحاشا چیخ نکل گئی کیونکہ ڈبہ کے اندر پنسل سے میرا نام میرے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا جس کو یاسمین خوب پہچانتی تھی۔" اچھا تو آپ نے اس کو یہاں پہنچایا۔"

"مگر یاسمین" میں نے گردن نیچی کر کے کہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں، میں سب سمجھتی ہوں" وہ غصہ سے بولی" جو شخص میری بلی کو نہیں چاہتا وہ مجھے بھی نہیں چاہ سکتا ـــــ"

"بے شک بے شک یہ تو ایک عام نفسیاتی اور متفقہ طور پر تسلیم شدہ امر ہے" حمید بیچ میں بولا" جو شخص میری بلی سے نفرت کر سکتا ہے وہ مجھ سے بھی نفرت کر سکتا ہے اور جو مجھ سے نفرت کر سکتا ہے میں اس سے کس طرح محبت کر سکتی ہوں، سمجھے عزیز؟" یہ کہکر وہ تیزی کے ساتھ موٹر کی طرف بڑھ گئی حمید اسکی بلی بغل میں دبائے ہوئے تھا اور میں، میرا کچھ نہ پوچھو کیا حال تھا؟

وہ دن اور آج کا دن ـــــ میں نے پھر کبھی یاسمین سے آنکھیں نہیں ملائیں، یاسمین سے کیا کسی اور عورت سے بھی نہیں۔ دس برس گذر گئے اور میں بدستور بلی اور عورت دونوں سے نفرت کرتا ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ مجھے بلی سے زیادہ نفرت ہے یا عورت کے تلون سے!"

یہ کہکر عزیز نے جلدی سے ٹوپی اٹھائی اور قریب کے دروازے سے تیزی کے ساتھ نکل گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک عورت سامنے سے آرہی تھی۔

سید بادشاہ حسین حیدرآبادی

"کھوئی ہوئی راتیں"

وہ شبِ مہ کی لطافت، وہ کنارِ جوئبار
وہ مناظرِ رُوح پرور، وہ گلستاں کی بہار
وہ سکوتِ جانفزا، جس پر تکلم بھی نثار
دمبدم بادِ صبا کا جھومنا مستانہ وار
آہ! وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں مجھے

رات کی خاموشیوں میں گنگنانا وہ ترا
دیکھکر ترچھی نظر سے مسکرانا وہ ترا
مست آنکھوں سے مجھے بیخود بنانا وہ ترا
وجد میں اس دل کے ہر ذرہ کو لانا وہ ترا
آہ! وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں مجھے

تیری اُلفت میں نہاں تھا میرا رازِ زندگی
نغمۂ عشرت سے تھا معمور سازِ زندگی
تھا عجب راحت فزا سوز و گدازِ زندگی
غیرتِ صد ناز تھا گویا نیازِ زندگی
آہ! وہ پُرکیف راتیں یاد آتی ہیں مجھے

عیش کی مستی میں تھا کون و مکاں سے بیخبر
گردشِ افلاک سے دورِ زماں سے بیخبر
ہو گیا تھا میں زمین و آسماں سے بے خبر
تھا تری آغوش میں کیا دو جہاں سے بیخبر!

آہ! وہ پُر کیف راتیں یاد آتی ہیں مجھے

کاش وہ دَورِ مسرت ایکبار آجائے پھر!

بے کلی جاتی رہے دل کو قرار آجائے پھر!

ہاں چمن زارِ محبت میں بہار آجائے پھر!

وہ مری جانب اگر مستانہ وار آجائے پھر!

آہ! وہ پُر کیف راتیں یاد آتی ہیں مجھے

عباس جعفری

(متعلم ایم۔ اے)

خود شناسی

امریکہ کا مشہور ظرافت نگار مارک ٹوین بڑا کاہل الوجود انسان تھا۔ ابتدائی دَور میں وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازم تھا۔ وہ ایک روز دفتر کو حسبِ معمول بڑی دیر سے گیا۔ اخبار کے ایڈیٹر نے غصہ ہو کر کہا۔ "ناک میں دَم آگیا۔ ایسا کاہل، سست، بے پروا آدمی دیکھنے میں نہیں آیا۔ تم نہ کام برابر کرتے ہو اور نہ وقت پر آتے ہی ہو۔ چھ مہینے سے ہو مگر کچھ بھی نہ کیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اِتنے نالائق اور نااہل واقع ہوئے ہو۔"

مارک ٹوین نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "مگر مجھے تو چھ مہینے پہلے بھی اِس چیز کا علم تھا۔"

مکاتیبِ اُردو

خط نویسی نثر نگاری کی ایک مستقل صنف ہے جو دنیا کی تمام اَدبی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ مولٰنا سید سلیمان نَدوی تحریر فرماتے ہیں:۔

"خط کیا ہے؟ آپس میں دو آدمیوں کی بات چیت؟

اور یہ بھی مشہور ہے کہ "المکتوب نصف ملاقات" تو ظاہر ہے کہ بات چیت اور ملاقات کی طرح خط نویسی بھی ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے۔

خطوط کو محفوظ رکھنے کا دستور بہت پرانا ہے۔ عیسائیوں میں مقدس حواریوں کے خطوط کی خاص اَہمیت ہے۔ اور وہ مجموعے اِنجیل کے ضروری جزو خیال کئے جاتے ہیں۔ اور قبول کے ہاتھوں لئے اور اَدب کی نگاہوں سے پڑھے جاتے ہیں" ہر زبان میں مشہور انشا پردازوں کے خطوط کتابی صورت میں موجود ہیں جو اَدبیات کا ایک خاص جزو تصور کئے جاتے ہیں۔ اُردو زبان میں بھی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

جس طرح اُردو زبان کی نشو و نما پر فارسی اَدب کا اثر پڑا۔ اور جس طرح اُردو کے شعراء نے فارسی شاعری کو نمونہ بنایا۔ اُسی طرح اُردو رقعات نویسوں نے بھی فارسی کی تقلید میں دقت پسندی اختیار کی۔ اور یہی طریقہ ایک عرصہ تک رائج رہا۔ خطوط نویسوں نے مسجع و مقفیٰ طرز اِختیار کی اور اپنی تحریروں کو جان بوجھ کر پیچیدہ بنانا پسند کیا۔ لمبے چوڑے اور پُر تکلف القاب اور ایک خاص طرز کی ابتدا و خط کا ضروری حصہ تصور کی جاتی تھی۔ اِنشاء خرد اَفروز۔ مکتوبات احمدی و محمدی۔ رقعات عنایت علی۔ اِنشاء اُردو و سرور وغیرہ اسی طرز کی کتابیں ہیں

ذیل میں ایک خط " رقعاتِ عنایت علی " میں سے بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔

" قبلۂ برحق و کعبۂ مطلق دام ظلہم

آپ کا نصیحت نامہ فیض شمامہ فدوی کے حق میں اکسیر ہوا۔ ہر فقرہ اس کا تاثیر بخش کثیر ہوا۔ اب تک بندہ سے جو کچھ بدعنوانی ہوئی۔ اس سے از بس نادم ہو کر صدق دل سے توبہ کر کے دست بستہ عرض پرداز ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اب آئندہ کو آپ کے ارشاد کے موافق پورا پورا عمل کرے گا۔ سرمو فرق نہ ہوگا "

یہی رنگ مرزا اسد اللہ خاں غالب تک باقی رہا۔ بلکہ خود مرزا غالب بھی ابتداء میں اسی رنگ میں لکھا کرتے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اُنہوں نے ان مسجع و مقفیٰ عبارتوں کی خرابی کو محسوس کر لیا اور اس کے دفعیہ پر کمر ہمت باندھ لی۔ اور فن خطوط نویسی میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا کہ آج تک کسی نے بھی مقلد ہونے کا یا تقلید کرنے کا دعویٰ نہ کیا۔ غالب کی خطوط نویسی کے متعلق آغا محمد طاہر لکھتے ہیں۔

" جناب مرزا نے اس کی ابتداء کی۔ اور اس شان سے کی کہ قطرہ کو دریا بنا دیا اور خط و کتابت میں ایسا نا پیدا کنار سمندر چھوڑا کہ قیامت تک یادگار باقی رہیگا۔ اور مضمون آفرینی بے تکلفی طبیعت کی اصلی کیفیت جو کسی امر کے اظہار کے وقت انسان کے چہرے اور بدن کے مختلف حرکات سے صادر ہوتی ہے لفظوں میں ادا کر دی۔ غرضیکہ خط جو غائبانہ ضرورت کے لئے استعمال میں آتا تھا۔ اس کو ایسا مانجھا کہ انشاء پردازی کی ایک شاخ علیحدہ نظر آنے لگی۔ بلکہ غائبانہ سے مکالمہ بن گیا۔ اور وہ وہ باتیں جن کا لطف آمنے سامنے بیٹھکر بھی حاصل نہ ہوا ہو ان کاغذوں کے قاصدوں کے ذریعہ دوچند بلکہ سہ چند اُٹھا لیجئے "

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ خطوط نویسی میں غالب نے ایک انقلاب عظیم پیدا کیا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کا طریقہ عمل کیا تھا؟ اور وہ ذرائع کیا تھے جنھوں نے اس انقلاب کو کامیاب بنایا؟ غالب نے سب سے پہلے پرانے طرز القاب و آداب اور عبارتِ خاتمہ کو بالکل ترک کیا۔ اور جیسا وہ خود لکھتے ہیں کہ " جب قلم و کاغذ ہاتھ میں لیتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس لفظ کے ساتھ جو اس کی حالت کے موافق ہو صفحہ کے شروع میں پکارتا ہوں "۔ . . . . " یہی لفظ " پکارنا " اس عظیم الشان انقلاب کا پتہ دیتا ہے جو مرزا نے اپنے خطوط کے ذریعہ سے اُردو نثر نگاری میں پیدا کیا ہے " یہاں چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ مرزا غالب مکتوب الیہ کو کس طرح " پکارتے " ہیں۔

مرزا تفتہ کو یوں مخاطب کیا ہے۔ " نورِ نظر لختِ جگر " " مہاراج " " منشی صاحب " " آؤ

مرزا تفتہ گلے لگ جاؤ" وغیرہ۔

میر مہدی مجروح کو "برخوردار کامگار" "نور چشم جان غالب" "میاں لڑکے" "میاں سید زادے" "اہا ہا ہا! میرا پیارا مہدی آیا" وغیرہ

یا جن سے بے تکلفی نہ ہوتی تو بھی سیدھی سادھی مخاطبت ہوتی مثلاً "جناب مولوی صاحب" "منشی شیو نارائن" "قبلہ" "بھائی صاحب" وغیرہ

پھر پرانے طرز کے بے مزہ مقفیٰ و مسجع فقرے جن کی قدیم نثر نگاروں کے ہاں کثرت تھی ترک کر دئے

ذیل میں ایک خط اُردوئے معلیٰ سے نقل کیا جاتا ہے جو میر مہدی مجروح کو لکھا گیا تھا۔

"اہا ہا ہا! میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو یہ رام پور ہے۔ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے۔ وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے۔ اور کوسی اُسکا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی بوت اوس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔ تمہارا خط پہنچا۔ تردد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب۔ اور ڈاک منشی میرا دوست ہے۔ نہ عرف لکھنے کی حاجت نہ محلے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیجدیا کیجئے اور جواب لیا کیجئے۔ یہاں کا حال سب طرح خوب ہے۔ اور صحبت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعلیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہے۔ لڑکے دونوں ساتھ آئے ہیں۔ اس وقت اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ غالب"

ایسی تحریروں کی وجہ سے ہی خط "مکالمہ بن گیا" اور اس کے متعلق یادگار غالب میں مولانا حالی فرماتے ہیں "وہ چیز جس نے اُن مکاتبات کو ناول اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ وہ شوخی تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگوں نے خط و کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت پر رکھنی چاہی مگر اُن کی اور مرزا کی تحریر میں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ و بہروپ میں ہوتا ہے۔ . . . . "

ہر کامیاب انقلاب کی طرح غالب کی طرز تحریر بھی حد درجہ مقبول ہوئی نہ صرف مقبول ہوئی بلکہ اس کا اثر اُردو نثر نگاری پر بہت گہرا اور دیرپا پڑا۔ غالب کے بعد سے اَب تک کے تمام انشاء پردازوں نے

غالب کی سادگی کو فن خطوط نویسی کا ضروری جزو قرار دیا یہاں تک کے مولانا سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔ ع
"سادگی گہنا ہے اِس فن کے لئے"

اَب دیکھنا یہ ہے کہ غالب کے بعد سے اس وقت تک اُردو خطوط کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں اس انقلاب کا اثر کہاں تک پایا جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد کے خطوط کے متعلق آغا محمد طاہر لکھتے ہیں "جہاں حضرت آزاد نے نظم میں تبدیلیاں کیں نثر کی بلند عمارتیں چنیں وہاں خط وکتابت سے بھی غافل نہیں رہے۔ بلکہ خطوط میں ایسی جدت اور آسانیاں پیدا کیں کہ تحریر میں تقریر کا مزہ آتا ہے" مکتوبات آزاد کے دیباچہ میں خواجہ حسن نظامی تحریر فرماتے ہیں کہ "مکتوبات کا بھی یہی عالم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے موثر آسان اور سمجھ میں آنے والے الفاظ" ان ہی وجوہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ غالب اور آزاد کے رقعات میں بہت کچھ شاہت ہے۔ آزاد منشی ذکاءاللہ کو لکھتے ہیں :-

"لو بھئی اب آگے سنو۔ کل صبح کو میں بموجب معمول کے ہوا کھانے نکلا۔ شہر کے باہر پہونچا تو دیکھتا ہوں ایک پیر مقدس متقی و پرہیزگار صورت۔ جبہ پہنے ہیں۔ حاجیان عرب کا عمامہ سر پر۔ ہزار دانہ کی تسبیح ہاتھ میں۔ آہستہ آہستہ سڑک پر چلے جاتے ہیں اَن کے چہرہ کو سفید داڑھی کے نور نے روشن کیا تھا۔ جبہ کے سبز رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت خضر ہیں مگر عصا کہتا تھا کہ حضرت موسیٰ بھی ہیں ...."

خط کیا ہے لفظی تصویر ہے۔ ایک دوسرے خط میں لالہ دولی چند کو لکھتے ہیں۔

"اجی آؤ صاحب۔ آپ نے تو بڑی راہ دکھائی۔ میں نے تو جانا روٹھ گئے۔ اَب دیکھئے کیونکر منیں گے بارے الحمدللہ کہ آج ، مرکو خط آیا سب حال معلوم ہوا۔ اتفاق یہ کہ میں آج یہاں سے روانہ ہونے والا تھا۔ مگر سردار گوردت سنگھ نے کہا کہ آج ہمارا کام ختم ہو جائیگا۔ کل ہم بھی چلیں گے۔ میں نے کہا کہ ایسا ساتھ کہاں ملتا ہے اِس سلئے توقف کیا ......"

اِس خط میں محمد حسین آزاد نے واقعی مکالمہ کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ اور زور قلم اور تحریر کی بیساختگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غالب کی طرز خطوط نویسی سے کتنے متاثر تھے۔

سرسید کے خطوط بھی جوہر سادگی سے آراستہ ہیں۔ چونکہ وہ ایک عملی انسان تھے اس لئے اَن کے خطوط کاروباری خطوط کی طرح مطالب کو بے اِنتہا سادہ پیرایہ میں واضح کرتے ہیں۔ اَن کی ہمیشہ یہی کوشش

ہوتی کہ "اصل معاملہ اپنے حقیقی خط وخال کے ساتھ ہر طبقہ کے شائقین کے ذہن میں یکساں طور پر اُتر جائے" سر سید کے خطوط "سے ایک مختصر سا خط بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

" عزیزی محمد عنایت اللہ

امید کہ تمہاری طبیعت سب طرح اچھی ہوگی۔ تم نے جو بیرونی کی لائف لکھی تھی۔ اور وہ پچھلے سال کانفرنس میں پیش نہیں ہوسکی تھی۔ اس سال اس کو پیش کردو۔ اس کے پڑھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ صرف تھوڑی سی گفتگو کے بعد پیش کرسکوگے۔ بعض حالات دیکھنے کو انگریزی کتاب۔ انڈیا بیرونی کی تم کو ضرورت تھی وہ میں نے رکھ لی ہے۔ پس اس رسالہ کے پیش کردینے میں کچھ دقت نہیں ہے۔ والسلام

خاکسار سید احمد"

مولانا الطاف حسین حالی پر غالب کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ اور ایسا ہی ہوا اُن کے مکتوبات جذبات کا آئینہ ہوا کرتے تھے۔ اُن مکتوبات کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ "خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو بھاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا۔ خطوں میں کاتب مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے سے آپ باتیں کرنے لگتا ہے۔ جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اُسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے اگر وہ دل ایسا ہو کہ جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردی بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو۔ بتاؤ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم ایسے دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ اور دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔"

حالی محمد حسین آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ " . . . . . . آپ لوگوں کی یاوہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیئے من صنف قد استہدف خیال رکھئے۔ اور اپنا کام کئے جائے۔ نکتہ چینوں کے خوف سے مفید کام بند نہیں کئے جاسکتے۔ اگر دو نکتہ چین ہیں تو ہزار مداح و ثناگو بھی تو ہیں . . . . . ."

مولانا شبلی نعمانی کے خطوط بھی تین جلدوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ اپنی سادگی اور اختصار کے سبب سے بیحد دلچسپ ہیں۔

علیہ بیگم کے نام کا خط ملاحظہ فرمائیے۔

"عزیزی -

تم نے میرے دو خطوں کا جواب نہیں لکھا۔ ان کے انتظار میں اشعار پڑے پڑے باسی ہوتے جاتے ہیں۔ سکوت سے اور بھی تردد انگیز خیالات پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے جواب جلد لکھو۔ مولوی مشیر حسین نے تمہارے ارادۂ سفر کی خوش خبری سُنائی۔ لیکن وہ فقرہ یاد رہے کہ میرے ہوتے ہوئے کہیں اور ٹھیرو گی تو میں لکھنو سے نکل جاؤں گا۔ اب کے تم کو مستقل اور جداگانہ مکان مل سکے گا۔ "شبلی"

تقریباً یہی حال محسن الملک اور مختار الملک کے مکاتیب کا ہے ان لوگوں نے غالب کی تقلید میں سادگی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ بیجا الفاظی اور مقفیٰ و مسجع عبارت بڑے بڑے القاب سب ترک کر دیئے۔ یقیناً یہ اسی انقلاب کا اثر ہے جس کے علمبردار غالب ہیں۔

لسان العصر حضرت اکبر حسین صاحب اکبرالہ آبادی کے مکتوبات کے متعلق سر شیخ عبدالقادر فرماتے ہیں "گو یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ نثر کی خوبی خیالات کی گوناگونی میں مکتوبات اس پایہ کے ہیں جو غالب کے اُردو خطوط کو حاصل ہے۔ یا ان میں مکتوبات آزاد کا سا لطف آتا ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ جب کبھی حضرت اکبر کی طبیعت پریشانی افکار سے آزاد ہوتی ہے تو اُن کے خط پڑھنے اور سنبھال کر رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اُن کے ایک مختصر سے رقعہ میں ان کی طبیعت کی جھلک ان کی غیر معمولی شخصیت کا پَرتو اور ان کی محبت اور دوست پروری کا اظہار ہوتا ہے۔"

جس طرح اکبرالہ آبادی کی شاعری اپنا ایک خاص رنگ رکھتی ہے اُسیطرح ان کے خطوط بھی خاص رنگ کے ہوتے ہیں۔ جن میں بے انتہا لطائف ہاتھ آئینگے۔ مثلاً ایک القاب ہے کہ "محبی و مکرمی و کیا کچھ نہیں سلمہ اللہ تعالیٰ" یا ایک خط میں لکھتے ہیں "شبِ گذشتہ آپ کا کارڈ لکھنؤ میں مجھکو ایسے وقت ملا کہ میں دو مہینے کے قیام کے بعد یہاں آ رہا تھا۔ گویا ٹکٹ بدست تھا۔ (بجائے پا برکاب کے یہ الفاظ میں نے اختیار کئے۔ اکبر) کیا کہوں کیسی حسرت و پریشانی ہوئی۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں "اور تماشہ سنیئے "خطیب" دہلی کے پچھلے پرچے میں کوئی صاحب آصف نامی ہیں۔ اُنہوں نے مسز سروجنی نائیڈو کے اشعار کا ترجمہ چھپوایا ہے۔ عنوان یہ ہے "ہمشیرہ محترمہ سروجنی نائیڈو" میں "خطیب" سے پوچھتا ہوں کہ ہمشیرہ کس قاعدہ سے لکھا گیا۔ یہ ریمارک اپنے مروجہ مراسم تمدن کے لحاظ سے ہے ورنہ ماں بہن کہنا تو اچھی بات ہے۔"

مولوی سید افتخار حسن صاحب کو لکھتے ہیں۔ "میں آپ کی تشریف آوری پر اس سبب سے زور نہیں دیتا کہ آپ کو ابھی فالتو نہیں سمجھا۔ آپ مجھکو ایسا سمجھتے ہیں اور حق بجانب ہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ یہاں تشریف لائیں تو فقط میں ہوں۔ میں وہاں آؤں تو لکھنؤ بھی ہے"

اب ہم اُن مکاتیب کا ذکر کرینگے جن کی طرز انشاء کے متعلق شبلی نعمانی فرماتے ہیں "مضمون دیکھا نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ وہی مرزاپوری دوست ہیں۔ یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا رہا اور احباب کو دکھلاتا رہا" مہدی حسن افادی کے خطوط اتنے مزے دار ہیں کہ اُنہیں کئی بار پڑھنے کو طبیعت چاہتی ہے۔ اور محمد حسین آزاد اور غالب کے خطوط کی یاد آتی ہے۔ ان مکاتیب پر مقدمہ لکھتے ہوئے مولانا سلیمان ندوی نے اُن کی خصوصیات گنائی ہیں۔ اور اُن پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں ہم اِس بحث کے چند حصے پیش کرتے ہیں تاکہ اُن مکاتیب کی خوبی پوری طرح ظاہر ہو سکے۔

۱۔ مہدی حسن کے خطوط کا رنگ سب سے جدا ہوتا ہے۔ اور ان کے خیالات کسی لفاظی کے ممنون احسان نہیں ہوتے۔

۲۔ "نوک قلم پر جو بات آجاتی وہ "ناگفتنی" بھی ہوتی تو "گفتنی" ہو کر نکل جاتی اور پھر اس طرح نکلتی کہ شوخی صدقہ ہوتی اور متانت آنکھیں نیچی کر لیتی۔ چنانچہ مرحوم کے اِس قسم کے فقرے اپنی عریانی کے باوجود جس قدر مستور ہیں وہ زیرلب داد کے مستحق ہیں" مثلاً

"دیکھئے پھولوں کی سیج پر" جوانی کی ورزش "کی شائقہ اپنے چاہنے والے سے کیا کہتی ہے۔ ؎ دوسرا تیسرا یہ چلا ہے۔ یہ بھی کیا کوئی شہر شملہ ہے۔" یا ایک "صاحب قلم" کے نکاح ثانی کی ضرورت اور تحسین میں یہ فقرے کچھ زیادہ کھولنے کے محتاج نہیں"

"دو آتشہ" اچھی کھنچی ہوئی ہو تو نشاط ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ میں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں"

۳۔ مہدی حسن تلمیحات سے بیحد کام لیتے تھے۔ اور مختصر سی مختصر عبارت میں صفحوں کا مطلب ادا کر لیتے تھے۔ مثلاً شبلی نعمانی کو لکھتے ہیں "ہندوستانی ماؤں کی طرح کہ ایک گود میں ایک پیٹ میں۔ آپ کے طبعزاد معنوی بھی اُنہی ترکیب سے وجود میں آتے رہتے ہیں" اور ایک مرتبہ ایک انگریز کی غلط رپورٹ سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں "گورے کے دل کی سیاہی جب قلم سے ٹپکتی ہے تو زیادہ پھیلتی ہے"

۴۔ "متین رنگینی اور سنجیدہ شوخی مہدی مرحوم کا حصہ ہے۔ ایک صاحب کو جو نکاح کی شب اول میں بیمار تھے لکھتے ہیں: "جیسے "بستر شکن" ہونا تھا۔ وہ شاعری کی اِصطلاح میں صرف "شکن بستر" نکلا۔" "ایک صاحب قلم دوست کو جو نوکری کے جھمیلوں سے چھوٹے ہیں لکھتے ہیں۔ .... "آپ لکھتے ہیں وقت اپنا ہے قلم اپنا ہے دماغ اپنا ہے۔ ایک صاحبہ فرماتی ہیں صاف کیوں نہیں کہتے "بیگم" بنی ہیں: "یہ نکتہ رہ گیا تھا کہ پوری کھلے دیتا ہوں؟ یا یہ کہ "میں نے عورت کے "سینہ" کے لئے جس پر "سبزہ خود رو" نہیں ہوتا آپ لوگوں سے ایک لفظ مانگا تھا۔ اِسی طرح مجھ کو اِصرار ہے کہ وہ کرتا نہیں کرتی پہنتی ہے۔ کیا یہی حیا سوزی ہے جسے باوصف لذت کشی آپ بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے۔"

۵۔ "وہ نئی ترکیبوں کے پیدا کرنے کا شوق بیحد رکھتے تھے۔" مثلاً "سمندر کے کف کی پری" "سینہ کا سبزہ خود رو" "محبت کا ثمر اولین" وغیرہ وغیرہ۔

۶۔ "نئے انگریزی خیالات اور اصطلاحوں کے لئے اُن کو عربی و فارسی الفاظ بنانے کا خاص چسکا تھا۔ .... مثلاً ان ڈیفرنس کے لئے بیرخی۔ لپ سرویس کے لئے وظیفہ لب۔ جوائنگ ٹائم کے لئے سبکدوشی۔ اور ہنی مون کے لئے عہد زفاف" وغیرہ وغیرہ۔

۷۔ ایک اور خوبی مہدی حسن کی تحریرات میں پائی جاتی ہے وہ یہ کہ جس طرح وہ انگریزی الفاظ کا اِستعمال اردو میں پسند نہیں کرتے تھے اُسی طرح فارسی و عربی کے بھی غیر مانوس و ثقیل الفاظ کے اِستعمال سے ہمیشہ پرہیز کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد ہم ایک اور مجموعہ خطوط کا ذکر کریں گے جس کو آپ "مکتوبات نیاز" کے نام سے جانتے ہیں۔ نیاز کی تحریریں چست بندشوں، معنیٰ آفریں ترکیبوں اور بے ساختہ پن کو خاص امتیاز حاصل ہے اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو اگر مکتوبات میں پائی جائیں تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اِسی وجہ سے نیاز کے مکتوبات کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔

نیاز کو پُرتکلف القاب سے نفرت ہے۔ جن القاب یا الفاظ مخاطبت کو وہ اِستعمال کرتے ہیں وہ خاص ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ موزوں بھی۔ مکتوبات نیاز کے چند خاص القاب سے نیاز کی شوخ اور بے تکلف طرز آشکارا ہوتی ہے۔

"نیاز نواز!!" "بندہ نواز!" "میرے دوست" "قبلہ" "منموہن" "جراحت نواز"

تجانِ من "،" اسے "، "ریا" وغیرہ۔

اِن القاب میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ ایک ہی نظر میں بتا دیتے ہیں کہ نفسِ خط کس قسم کا ہے خط کا لہجہ کیا ہوگا۔ اِس مجموعے سے ایک مختصر سا خط یہاں نقل کیا جاتا ہے جو اُن کے طنز کا اچھا نمونہ ہوسکتا ہے۔

" اِدھر آؤ لیلوں بلائیں تمہاری!

خدا کی قسم کیا کام کیا ہے۔ رستم و اسفندیار کی رُوحیں کانپ اٹھی ہونگی۔ سکندر و نپولین کی قبروں پر لرزہ طاری ہوگیا ہوگا۔ آج کل کے سینڈو اور گاما کا کیا ذکر۔

وہ لوگ بزدل ہیں جو اپنے سے قوی کو ٹوکتے ہیں۔ نامرد ہیں جو زبردست دشمن کے ساتھ معرکہ آراء ہوتے ہیں۔ بہادری نام ہے صرف کمزور کو ستانے کا۔ ضعیف کو پامال کردینے کا پھر ظاہر ہے کہ بیوی سے زیادہ کمزور ہستی تمہیں اپنی شجاعت دکھانے کے لئے کہاں مِل سکتی تھی۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

وہی قلم جس نے تیر کی طرح چبھتے ہوئے فقرے لکھے تھے۔ جس وقت رومانی تحریر لکھتا ہے تو پڑھنے والا دل تھام کر رہ جاتا ہے۔

" رات کِس درجہ یاد آئے ہو تم!

ہائے ایک پُوری رات سکر و بیخودی میں گذر جائے اور تم مجھ سے دور رہو " واقعہ کربلا" تو نہیں مگر " دہلی کی تباہی " کے بعد غالباً یہ دوسرا ظلم اپنی قسم کا تھا۔ جسے قدرت نے روا رکھا۔ اچھا سُنو ٹھیک دس بجے " شمع کافوری " روشن ہوئی۔ ہاں ہاں وہی۔ ہاتھ آجائیں اگر ہاتھ لگائے نہ بنے۔ اُف وہ گلابی رنگ کا آنچل یہ معلوم ہوتا تھا کہ چہرے کی روشنی ایک جگہ قائم ہوکر رہ گئی ہے۔ باور کرو کہ معصوم آنکھوں کی "عصیاں کاریاں" بالکل بے نقاب تھیں۔ اور میری روح لرزاں تھی اُس موج بادہ کے ساتھ ساتھ جو آنکھوں کے " جام نرگسیں" سے تبسم بنی چھلکی پڑ رہی تھی۔ بے حجابی بڑھی۔ تکلف گھٹا۔ اور اِمن کے پُرجلال سروں میں رادھا و کرشن کی وہ کہانی شروع ہوگئی جس نے آج کل عالم "کافری" کو یکسر نغمہ و رنگ بنا رکھا ہے۔ وہ کرشن کا بازو تھام لینا اور پھر کسی کا لجائی ہوئی ادا سے " ہٹو ۔ چلو ۔ شیام موری بنہیاں نہ مرور " کہنا ۔ اُف ۔ دُہائی ہے مرلی والے کی!

" رات بھر مسلسل تیر و پیکاں کی بارش شاید کافی سزا نہ تھی کہ صبح کو بھرویں سے بھی ذبح کرنے کی ضرورت سمجھی گئی۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس سے قبل اسی بھرویں نے میرے ساتھ کیا سلوک

کیا تھا۔ ظالم کی یادداشت تو دیکھو بالکل وہی چیز۔ وہی سماں وہی ادا۔

" پھول گیند وانا مارو لگت کریجوا میں چوٹ "

غلام جیلانی

سال چہارم

ڈراما اور اکثریت و اقلیت

جارج برنارڈ شا کے ابتدائی دور ڈراما نگاری کا ذکر ہے۔ وہ کچھ زیادہ مشہور نہیں ہوا تھا۔ اُس کا ایک ڈراما اسٹیج کیا جا رہا تھا۔ برنارڈ شا تھیٹر میں بیٹھا کھیل دیکھ رہا تھا۔ تماشائی طرح طرح سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک صاحب جو شا کے پاس ہی بیٹھے تھے بہت ناخوش تھے اور شا کے کان میں کہنے لگے " بیوقوف ہیں یہ لوگ۔ اِس ڈرامے میں آخر کونسی خوبی ہے جس پر یہ تالیاں بجاتے ہیں؟" وغیرہ وغیرہ۔ شا ضبط کر کے سب کچھ سُنتا رہا۔ کھیل کے ختم پر منیجر اسٹیج پر آیا اور کہنے لگا " خوش قسمتی سے ڈرامے کے مصنف بھی یہاں موجود ہیں۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ اِسٹیج پر آکر حاضرین کو مخاطب کریں "

برنارڈ شا اپنی جگہ سے اُٹھا یہ دیکھ کر اُن صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ شا نے اِسٹیج پر جا کر تقریر شروع کی اور اُن صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

" جناب والا! میں آپ سے متفق ہوں کہ اس ڈرامے میں کوئی خوبی نہیں۔ لیکن اُسے کیا کیا جائے کہ ان سینکڑوں حاضرین کی رائے میں یہ ڈراما بہت اچھا ہے۔ اب فرمایئے اتنی مخلوق کے مقابلے میں ہم دو کی مخالفانہ رائے کی کیا وقعت ہو سکتی ہے!"

سترھویں صدی عیسوی کی چند یورپی سیاح

سترھویں صدی عیسوی سے ہندوستان کی سیاحت کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس وقت تک ہندوستان کی سیاحت سیاسی اور معاشی رنگوں سے متاثر نہ تھی لیکن اب جتنے بھی سیاح ہندوستان آئے ان میں سے اکثر اپنی اپنی قوم کی نمائندگی کرنے آئے اور ان کی کوشش یہی رہی کہ اپنی قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ تجارتی معلومات فراہم کرکے راستہ ہموار کریں اور شاہان مغلیہ سے تجارتی تعلقات مستحکم بنیادوں پر قائم کریں اسی زمانہ سے ہندوستان مختلف یورپی قوموں کی رزمگاہ بن گیا۔
ہیگن فان لشولن ولندیزی Hayghen Van Litcholen فرانکو پرارڈ دی لاویل Francois Pyrard de Laval ایک فرانسی ان سیاحوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے ملکوں کی تجارتی بنیاد ڈالی۔ ایک اور اطالوی سیاح پٹرو دلاویل سترھویں صدی کے شروع میں ہندوستان سیاحت کی غرض سے آیا۔ اتفاق سے یہ تینوں سیاح چالیس سال کے اندر اندر یکے بعد دیگرے آئے چونکہ ہیگن فان لشولن نے سولھویں صدی ہی میں اپنا سفر ختم کرلیا تھا اس لئے اس کا تذکرہ اس مضمون میں نہیں کیا جائے گا۔ ۱۵۹۶ء میں لشولن نے اپنا سفرنامہ شائع کیا۔ اسے پڑھ کر سارے یورپ میں ہندوستان سے ایک عام دلچسپی پیدا ہوگئی اور اس دولت مند ملک کی سیاحت کا خبط زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دماغ میں پیدا ہونے لگا۔ اس سفرنامہ کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

فرینکو پرارڈ دی لاویل نے (Francois Pyrard de Laval) ۱۶۰۱ء میں اپنا سفر شروع کیا۔ بیچارے کی قسمت اچھی تھی جو زندہ بچا اور ہندوستان کی سیاحت کی ورنہ یہ بھی اپنے انھیں ساتھیوں میں سے ہوتا جو طوفان میں گھر کر نذرِ اجل ہوگئے۔ کالی کٹ میں آٹھ مہینے تک تو نہایت اطمینان سے ٹھہرا رہا لیکن اس کے بعد پرتگالیوں نے اسے قید کرلیا۔ قیدخانہ میں اسے جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں

ان کا بہت ہی دردناک نقشہ کھینچا ہے۔ پرتگالیوں کی شکایت صرف اسی نے نہیں کی ہے بلکہ ہندوستان میں انھوں نے جو جو مظالم ڈھائے ہیں ان کی تصدیق اور دوسرے سیاحوں سے بھی ہوتی ہے۔

ان دونوں کے بعد اطالوی سیاح پٹرو ڈلاویل Pietro della Valle ہندوستان آیا۔ گبن اور سدی نے اس کی بے حد تعریف کی ہے۔ ویل ۱۶۲۳ء میں ہندوستان پہونچا راستہ میں اسے بھی انہی تلخ تجربات سے دوچار ہونا پڑا اور مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں جو لاول کو پیش آئی تھیں۔ اس نے مغل بادشاہوں کے متعلق بہت اچھی رائے قائم کی ہے۔ لکھتا ہے کہ "مغل بادشاہ انصاف پسند اور عادل ہیں۔ ان کے نزدیک سب انسان برابر ہیں خواہ امیر ہوں یا غریب۔ عزیز ہوں یا غیر ان کے نزدیک کوئی امتیاز نہیں رکھتے"۔ ہندو معاشرت سے بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "عورتیں چہرہ کھولے ہوئے باہر آتی جاتی ہیں۔ ہندؤں میں بچپن میں شادی کرنے کا رواج بہت عام ہے"۔ ویل نے کیمبے کی بھی سیاحت کی یہاں اس نے جو خاص بات دیکھی وہ یہ تھی کہ جانوروں کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور انھیں آرام پہونچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک دواخانہ بھی دیکھا جو پرندوں کے علاج کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ "اگرچہ ہندوستان میں ۸۴ فرقے موجود ہیں لیکن ان میں اتفاق اور اتحاد بہت کافی پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کا اخلاقی معیار بحیثیت مجموعی بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہے"۔ اسے یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ ستی جیسی ظالم رسم کے انسداد کے لئے شاہان مغلیہ نے کافی کوشش کی ہے۔ یہاں سے اس کے سفر کا رُخ احمدآباد کی طرف پھرا۔ اس کے بعد ملابار کے ساحل کی سیر کی اور سنہ ۱۶۲۴ء کے ختم پر اس کا سفر ختم ہوا اور وہ اپنے وطن اطالیہ کو واپس چلا گیا۔

دربار جہانگیری میں انگریز سفیر جیمس دوم کے عہدِ حکومت میں دو سفیر جہانگیر کے دربار میں بھیجے گئے جن میں سے ایک ولیم ہاکنس اور دوسرا تھامس رو تھا۔ ماہ اپریل میں ہاکنس آگرہ پہونچا۔ شاہی دربار میں اس کی بہت جلد باریابی ہوئی۔ اس نے شاہ جیمس کا خط دیا جو اپنے ساتھ لایا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ ترکی زبان سے واقف تھا جس کو جہانگیر بھی سمجھتا تھا۔ یہ چیز اس کے لئے بے انتہا کارآمد ثابت ہوئی کیونکہ اس زبان کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کا اظہار بخوبی کرسکتا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ان تمام جھگڑوں کی کہانی شروع سے آخر تک

کہہ سنائی جو پرتگالیوں اور انگریزوں کے درمیان پیدا ہو چکے تھے اور پرتگالیوں کے خلاف خوب ہی زہر اگلا۔ جہانگیر اس سفیر کے ساتھ بہت ہی خوش اخلاقی سے پیش آیا اور یقین دلایا کہ انگریزوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے میں وہ ہر وقت تیار ہے۔ اسے خان کا خطاب اور تین ہزار دو سو پونڈ کا وظیفہ عطا کیا گیا۔ دو سال تک اسے شہنشاہ کی نظر عنایت حاصل رہی لیکن ان تمام مہربانیوں کے باوجود شہنشاہ نے انگریز قوم کو کوئی ایسی اجازت نہیں دی کہ جس سے وہ ہندوستانی تجارت کے اجارہ دار بن جاتے جب اسے کامیابی کی کوئی امید نہ رہی تو چار و ناچار آگرہ کو خیرباد کہا۔ اور اپنے وطن کی طرف روانہ ہوا۔ مگر افسوس کہ گھر نہ پہونچنے پایا تھا کہ راستہ ہی میں پیغام اجل آپہونچا۔ ہاکنس کا مشاہدہ بہت ہی سطحی تھا۔ اور اس نے کسی چیز پر فلسفیانہ نظر نہیں ڈالی۔

ہاکنس کے جانے کے بعد ۱۶۱۵ء تک کوئی قابل ذکر انگریز سیاح ہندوستان نہیں آیا۔ سنہ ۱۶۱۵ء میں سر تھامس رو کو انگلستان کے تجارتی معاملات طے کرنے کے لئے بھیجا گیا وہ ایک اوسط درجہ کے خاندان کا فرد تھا۔ لیکن آگے چل کر ایک نامور سیاح ۔ مہذب درباری اور جوشیلا مقرر نکلا۔ اس وقت مغل شہنشاہ اجمیر میں مقیم تھا۔ تھامس رو بھی وہاں پہونچا شہنشاہ نے خلوص دل سے خیر مقدم کیا تھامس رو نے بھی ساری کوششیں صرف کردیں تاکہ انگریزی تجارت کی بنیادیں ہندوستان کے سمندروں میں زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو جائیں۔

تھامس رو نے بھی اپنے مشاہدات قلمبند کئے ۔ لیکن انھیں وہی درجہ حاصل ہے جو ہاکنس کے سفرنامہ کو حاصل تھا۔ اس کا مشاہدہ بالکل سطحی ہے اور خصوصاً اس نے عام زندگی سے بہت کم بحث کی ہے۔ اس کی تحریروں میں مغل بادشاہوں کی پرشوکت طرز زندگی اور دوسرے امرائے سلطنت سے تعلقات کے متعلق تذکرے ملتے ہیں۔

ولیم فنچ ایک انگریز سیاح ہاکنس کے ساتھ ہندوستان آیا تھا لیکن نہ معلوم کس لئے ایک زمانہ تک سورت میں ٹھیرا رہا۔ اس کے بعد آگرہ پہونچا۔ فنچ کے روزنامچہ میں بہت سی کارآمد اور مفید باتیں ملتی ہیں۔ ان عام درباروں کا بہت تفصیل کے ساتھ ذکر ملتا ہے جو عہد جہانگیری کو خاص امتیاز بخشتے ہیں۔ اسے یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ غریب سے غریب مظلوم کی فریاد سننے کے لئے شہنشاہ نے طلائی گھنٹے کا انتظام رکھا ہے تاکہ ہر فریادی جس پر انصاف کا دروازہ بند ہو چکا ہو اگر زنجیر کھینچے

محل میں گھنٹوں کی آواز گونجنے لگتی تھی اور جہانگیر کو خبر ہو جاتی تھی کہ کوئی بےکس اور مجبور فریادی انصاف چاہنے آیا ہے۔

جرمن سیاح ۱۶۳۸ء میں ایک جرمن سیاح ہندوستان آیا جس کا نام مینڈیلو (Mandeslo) تھا۔ سب سے پہلے وہ احمد آباد گیا جہاں بہت ہی فراخدلی سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن دربار مغلیہ کے دیکھنے کی دیرینہ آرزو اسے آگرہ لے گئی۔ مگر شاہجہاں سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس نے بیجاپور جیسی دولت مند اور طاقتور ریاست کی بھی سیر کی۔ اپنے سفرنامہ میں اس توپ کا بھی ذکر کیا ہے جو ۸۰۰ پونڈ وزنی گولہ پھینک سکتی تھی اور جس کے لئے ایک وقت میں ۵۰۰ پونڈ بارود کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس کا سفرنامہ البرنیس (   ) نے اس کے واپس ہونے کے فوراً بعد ہی شائع کیا جس میں عوام کی زندگی پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن اس نے جو کچھ لکھا ہے اس میں زیادہ تر دوسروں کے کہے ہوئے قصے اور واقعات ملتے ہیں اور بہت کم ایسی باتیں ہیں جو خود اس کے مشاہدہ پر مبنی ہوں۔

فرانسیسی سیاح سترھویں صدی کا آخری دور ہندوستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس وقت دو بڑے فرانسیسی سیاح برنیر (Bernier) اور ٹورنیر (Tavernier) جیسے دقیق النظر اور علم دوست ہندوستان آئے۔ کہا جاتا ہے کہ ٹورنیر نے مشرق کی چھ مرتبہ سیاحت کی جس میں ہندوستان کا سفر بھی شامل ہے۔ سب سے پہلی مشرقی سیاحت ۱۶۳۱ء میں کی لیکن ہندوستان ۱۶۴۱ء میں آیا۔ پہلے سفر میں ڈھاکہ۔ آگرہ۔ سورت۔ برہان پور۔ احمد آباد اور گوئا جیسے مشہور مقامات کی سیر کی اور گولکنڈہ کی مشہور ہیرے کی کان دیکھی۔ دوسری مرتبہ ہندوستان پھر آیا اور تین سال ادھر ادھر خوب گھوما۔ تیسری مرتبہ مچھلی بندر پر اترا۔ اس دفعہ اسے گجرات کے شائستہ خان نے مدعو کیا تھا۔ یہاں سے احمد آباد گیا۔ ۱۶۶۳ء میں ٹورنیر کا چھٹا اور آخری سفر تھا۔ اس مرتبہ اس نے شہنشاہ اورنگ زیب سے بھی ملاقات کی اور تحفہ تحائف پیش کئے۔ اسی موقع پر برنیر سے بھی ملاقات ہوئی اور دونوں نے ایک ساتھ الہ آباد۔ پٹنہ اور بنارس کی سیر کی۔

اب ہم یہاں ٹورنیر کے سفرنامہ سے وہ اقتباسات پیش کریں گے جن سے ہندوستان کی صنعت اور تجارت کی اس عظمت کا پتہ چلتا ہے جو آج داستان پارینہ بن چکی ہے۔ انھیں پڑھ کر

حیرت ہوتی ہے اور دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ٹورنیر جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں واقعی کچھ صداقت بھی ہے یا محض افسانہ ہے جو ہمارے دل کو خوش کرنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"مجھے کامل یقین ہے کہ اس وقت تک عظیم الشان سلطنت مغلیہ کے بارے میں جو کچھ بھی سیاحوں نے لکھا ہے انھوں نے اپنا فریضہ یہ نہیں سمجھا کہ ان تمام اشیار کی مفصل فہرست پیش کریں جو بطریق تجارت دور دراز ملکوں کو روانہ کی جاتی ہیں۔"

ریشم کی صنعت پر کافی روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھتا ہے "قاسم بازار بنگال کا ایک گاؤں ہے جہاں سے بائیس ہزار ریشم کے گٹھے سالانہ نکلتے ہیں جنہیں سے چھ سات ہزار تو جاپان اور ولندیز جیسے دور دراز مشرقی و مغربی ممالک کو تاجر لے جاتے ہیں۔ باقی مال احمد آباد اور سورت روانہ کیا جاتا ہے جو بہت ہی اہم اور مشہور صنعتی مرکز ہیں جہاں ایسے قالین تیار کئے جاتے ہیں جن میں سنہری یا گنگا جمنی کام کیا ہوا ہوتا ہے۔"

"اونی قالین کی صنعت فتحپور سیکری میں معراج کمال کو پہونچی ہوئی ہے۔ سنہرے اور روپہلے کام کئے ہوئے اطلس یا ریشمی کپڑے جو بہت ہی نرم اور ملائم ہوتے ہیں جن پر رنگ برنگ کے سبک اور نازک سنہرے اور روپہلے پھول ہوتے احمد آباد میں تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ مال زیادہ تر فلپائن اور بورنیو روانہ کیا جاتا ہے۔"

"قاسم بازار کا ریشم زردی مائل رنگ لئے ہوئے ہوتا ہے جیسا کہ ایران اور سسلی کا کچا ریشم لیکن قاسم بازار کے کاریگر ریشم کو سفید بنانے کے فن سے پوری طرح واقف ہیں۔"

"سلطنت مغلیہ میں جو چھینٹ تیار ہوتی ہے وہ چھپی ہوئی ہوتی ہے اور اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ مچھلی بندر اور برہان پور میں زیادہ تر چھینٹ تیار ہوتی ہے لیکن موخر الذکر مقام کی چھینٹ بہت چمکدار ہوتی ہے۔"

ٹورنیر ہندوستان کی صنعتی ترقی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور ایک جگہ حیرت سے لکھتا ہے "ہندوستانی ایک خاص قسم کے پانی سے واقف ہیں جس میں کپڑا ڈال دیا جاتا ہے تو عجیب و غریب رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو آنکھوں کو بہت بھاتا ہے۔"

اب آپ سوتی صنعت کا حال سنئے۔ "آگرہ۔ لاہور۔ بڑودہ۔ بڑوچ اس وقت سوتی صنعت کے

بہت بڑے مرکز ہیں۔ کپڑوں کو کیمیاوی طریقہ سے سفید بنانے کا کام نوساری اور بروچ میں بہت ترقی پر ہے۔"

ٹورنیر نے اکثر مقامات پر ہندوستان کی اس ململ کا ذکر کیا ہے جو باریکی کی وجہ سے آنکھوں کو مشکل سے دکھائی دیتی تھی ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو " محمد علی جو ایران سے سفیر بن کر ہندوستان آیا تھا جب اپنے ملک کو واپس لوٹا تو اس کے ساتھ ہندوستان کی چند نادر چیزیں تھی۔ ایک ناریل شترمرغ کے انڈے کے برابر ہیرے جواہرات کے بہترین کام سے مرصع تھا جب اسے کھولا گیا تو اس کے اندر سے ایک شملہ برآمد ہوا جس کی لانبان ساٹھ کیوبٹ ( ) تھی۔ یہ بہت ہی نفیس ململ تھی اور اس قدر باریک کہ آپ سمجھ نہ سکتے تھے کہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔"

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ " ڈواگر کی ملکہ اپنی سہیلوں کی جھرمٹ میں کھڑی ہوئی ہندوستان کی ململ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ تاگہ اس قدر باریک تھا کہ دکھائی نہ دیتا تھا "

ٹورنیر نے ہندوستان میں کیمیا۔ طبیعات کی غیر معمولی ترقی پر ایک مبسوط نوٹ لکھا ہے اور اسے حیرت ہے کہ ہندوستان سائنس میں کس قدر ترقی یافتہ ہے۔ شکر کی صنعت کے بارے میں لکھتا ہے کہ " پکی شکر کی برآمد بنگال سے بڑی مقدار میں ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہگلی پٹنہ اور ڈھاکہ میں بڑی چہل پہل ہے۔ احمد آباد میں مصری تیار کی جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ شکر صاف کرنے کے فن سے پوری طرح واقف ہیں اسی لئے یہاں کی شکر شاہی شکر کہلاتی ہے"

ٹورنیر نے ہندوستان کی اکثر کانوں کو دیکھا اور فن ہیرا تراشی کی اس نے خوب ہی تعریف کی ہے۔ ٹورنیر کا حال ختم کرتے ہوئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا بھی اقتباس پیش کیا جائے جو مادی ترقی کے ساتھ ہندوستانیوں کی اخلاقی ترقی کا نمونہ بھی پیش کرتا ہو وہ لکھتا ہے " ہندوستانیوں کا اجنبیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک رہتا ہے۔ میں جس وقت کان دیکھنے کے لئے گیا تو وہاں کے حاکم نے مجھے سینہ سے لگالیا اور بڑی گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا۔"

اب صرف ایک سیاح رہ جاتا ہے جس کے تذکرہ کے بعد سترھویں صدی کے سیاحوں کا ذکر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا نام برنیر ہے برنیر کا سفر بھی وہی اہمیت رکھتا ہے جو ٹورنیر کے سفر کو حاصل ہے۔ لیکن برنیر کے حالات اور اس کے تاثرات کو میں تفصیل کے ساتھ پیش کرنا نہیں چاہتا کیونکہ

برنیر نے وہی حالات قلمبند کئے ہیں جنھیں آپ ٹورنیر کے بیان میں پڑھ چکے ہیں۔

برنیر کی پیدائش ۲۵ ستمبر ۱۶۲۰ء کو ہوئی۔ اس کے والدین کاشتکار تھے۔ اس نے یورپ کے تقریباً تمام ممالک جرمنی۔ پولینڈ۔ سوئٹزرلینڈ اطالیہ کی ۱۶۴۷ء اور ۱۶۵۲ء کے درمیان سیاحت کی۔ اس نے اسلامی ممالک مثلاً فلسطین۔ شام اور مصر کا بھی دورہ کیا۔ ہندوستان غالباً ۱۶۵۸ء یا ۱۶۵۹ء میں آیا۔ ان دنوں اورنگ زیب اور داراشکوہ کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ برنیر کچھ عرصہ تک داراشکوہ کے ساتھ ایک شاہی طبیب کی حیثیت سے رہا۔ لیکن بہت جلد داراشکوہ کا ساتھ چھوٹ گیا اور وہ احمد آباد چلا گیا جہاں مغل امرا نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ برنیر ان کے ساتھ ساتھ لاہور گیا۔ پھر کشمیر کی سیر و سیاحت کی۔ اس کے بعد بنگال کا رخ کیا۔ یہاں ٹورنیر سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ برنیر نے ۱۶۶۷ء میں ہندوستان کو خیرباد کہا۔ ۱۶۶۹ء میں وہ اپنے سفرنامے کو شائع کرنے کی پیرس میں کوشش کر رہا تھا۔

ریشم اور سوت کی صنعت کے متعلق کچھ اور لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی البتہ شال کی صنعت رہ گئی ہے اس کے متعلق برنیر کے خیالات ملاحظہ ہوں۔

"ملک کی صنعتی ترقی کے لئے جن خام پیداوار کی ضرورت پیش آتی ہے وہ یہاں بکثرت موجود ہیں۔ شال کی صنعت سے لوگوں کو کافی روزگار ملتا ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے اپنی بساط کے موافق محنت کر کے پیسہ پیدا کرتے ہیں۔ شال ڈیڑھ الف لانبی اور ایک الف چوڑی ہوتی ہے۔ ان کے حاشیوں پر زردوزی اور کارچوبی کا کام کیا ہوا ہوتا ہے۔ شالیں دو قسم کی تیار ہوتی ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس میں ایسا اون جو ہسپانیہ کے اون سے زیادہ نرم ہوتا ہے استعمال کیا جاتا ہے۔ شال کی ایک دوسری قسم ہے جس کے لئے اون تبت سے آتا ہے۔ تبت میں ایک خاص قسم کی بھیڑ ہوتی ہے جس کے سینہ پر بال بہت نرم اور نفیس ہوتے ہیں۔ اس اون کی شالیں بہت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ اور دیسی اون کی شالوں پر انھیں ترجیح دی جاتی ہے۔"

یوں تو شالیں کشمیر کی بہترین ہوتی تھیں لیکن شالوں کی صنعت پٹنہ، آگرہ اور لاہور میں بھی ترقی پر تھی۔ دوسری جگہ کی شالیں کشمیری شالوں کی نفاست کا کسی طرح مقابلہ نہ کر سکتی تھیں۔ برنیر کا خیال ہے کہ "چونکہ کشمیر کے پانی میں خاص قسم کے خواص پائے جاتے ہیں اس لئے وہاں کی شالیں اعلیٰ ترین قسم کی

ہوتی ہیں"۔

برنیر نے ہندوستان کے فنون اور صنعت کی عظمت کو چند الفاظ میں پیش کیا ہے۔
" ہندوستانی بندوقیں وغیرہ اور زیورات اس قدر عمدہ بناتے ہیں کہ یورپی کاریگروں سے اس سے زیادہ فن کاری کی توقع تک نہیں کی جا سکتی"

ہندوستان کی مصوری اسے حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے " میں اکثر تصویروں کی خوبصورتی، نزاکت اور موزونیت کو حیرت سے دیکھتا ہوں خصوصاً ایک تصویر کو دیکھ کر میں مبہوت سا رہ گیا جو ایک ڈھال پر کھنچی ہوئی تھی نامور مصور نے اسے تیار کرنے میں سات سال صرف کئے تھے"۔

برنیر ہندوستان کی سیاحت اس زمانہ میں کر رہا تھا جب کہ یہاں کی صنعت اور تجارت بام عروج پر پہونچی ہوئی تھی۔ ایک جگہ لکھتا ہے " ہندوستان کی صنعتی اشیاء حاصل کرنے کے لئے دور دور سے تاجر آتے ہیں۔ یہ وہ اشیاء ہیں جن کے متعلق میں نہیں جانتا کہ کسی اور ملک سے بھی فراہم ہو سکتی ہیں۔ شکر کے علاوہ جس کے متعلق میں کہہ چکا ہوں کہ قیمتی اشیاء کی فہرست میں جگہ دی جانی چاہئے، بنگال میں ریشمی اور سوتی کپڑوں کی اس قدر افراط ہے کہ نہ صرف سارے ہندوستان یا سلطنت مغلیہ بلکہ آس پاس کی دوسری سلطنتیں یہاں تک کہ سارے یورپ کے لئے کافی ہیں۔ یہ دیکھ کر میں اکثر حیرت کرنے لگتا ہوں کہ ہر قسم کا کپڑا، نفیس یا معمولی، سفید یا رنگین۔ سوتی یا ریشمی اس کثرت سے تیار ہوتا ہے کہ ولندیزی جاپان اور یورپ لے جا کر فروخت کرتے ہیں۔ نہ صرف ولندیزی تاجر بلکہ انگریز، پرتگالی اور خود ہندوستانی تاجر بڑے پیمانہ پر کاروبار چلاتے ہیں"۔

برنیر کے بعد چند اور سیاح مثلاً تھیونو وغیرہ ہندوستان آئے لیکن وہ کسی خاص شہرت کے مالک نہیں ہیں اور نہ ان کی تحریروں سے ہندوستان کے تمدن اور معاشرت پر کسی قسم کی روشنی پڑتی ہے۔ بہر حال ٹورنیر اور برنیر سترھویں صدی عیسوی کے آخری اور سب سے زیادہ اہم سیاح کہلائے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی تہذیب اور یہاں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ ان سیاحوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بڑی حد تک ہندوستانی معاشرت کی سچی تصویر نظر آتی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان دو سیاحوں کے بعد کوئی اور یورپی سیاح اسی قدر وسیع القلب اور وسیع النظر ہندوستان آیا ہو جس کی تحریریں تعصب کے رنگ سے آزاد ہوں۔

سید منظور الحسن ہاشمی

شاعری کا بھوت

(ریڈیو ڈراما)

نسیمہ ۔ میں کہتی ہوں، یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟ بارہ بارہ بجے رات تک دیوانخانے میں گھسے رہتے ہیں اور میں یہاں اکیلی پڑی پڑی سوکھا کرتی ہوں۔ مارے ڈر کے بُرا حال ہو جاتا ہے۔

شیخ داؤد۔ نہیں نہیں نسیمہ۔ ڈرنے کی کیا بات ہے؟

نسیمہ ۔ اے واہ! ڈرنے کی بات کیوں نہیں؟ لوگ کہتے ہیں، اس مکان میں بھوت ہے۔ رات کو گھوما کرتا ہے۔

شیخ داؤد۔ سب جھوٹ۔ ہم کو یہاں آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا۔ ہمیں تو کبھی نظر نہیں آیا۔

نسیمہ ۔ توبہ! توبہ! خدا نہ کرے، کبھی نظر آئے۔ بھوت پریت کے نام سے میرا تو دم نکلتا ہے۔

شیخ داؤد۔ نہیں نہیں۔ نسیمہ۔ اطمینان رکھو۔ بھوت ووت کچھ نہیں۔ مکان زیادہ دن خالی رہے تو لوگ یوں ہی مشہور کر دیا کرتے ہیں ــــ اور پھر یہ مکان چچا مرحوم کا تھا۔ وصیت میں انھوں نے میرے نام لکھ دیا۔ اور ــــ

نسیمہ ۔ (یکایک) کہیں وہ بھوت چچا ہی کا نہ ہو۔

شیخ داؤد۔ بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ خدا بخشے چچا شاعر تھے، بہت بڑے شاعر۔ حضرت شیخ احمد المتخلص بہ اجلؔ کا نام کون نہیں جانتا۔ بھلا کہیں شاعروں کے بھوت ہوا کرتے ہیں!

نسیمہ ۔ اے واہ! کیوں نہیں؟ شاعر فرشتے تو نہیں ہوا کرتے۔ وہ بھی انسان ہی تو ہیں۔

شیخ داؤد۔ (لاجواب ہو کر) لو تم نے کٹ حجتی شروع کر دی۔ میں دیکھ رہا ہوں، جب سے اس مکان میں آئے ہیں،

تم میری ہر بات کاٹنے کی عادی ہوگئی ہو۔ تمہارا رنگ ہی بدل گیا ہے۔

نسیمہ ۔ لو اور سنو! رنگ میرا بدل گیا ہے یا آپ کا ؟ ادھر اس گھر میں اُٹھ آئے اور ادھر آپ کے سر میں شاعری کا سودا سما گیا۔ پہلے ایسے تو نہیں تھے۔ میرے دُکھ درد کا خیال رکھتے تھے۔ بیوپار دل لگا کر کیا کرتے تھے۔ شاعروں کو بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔ پر اب حال یہ ہے بیوپار گیا چولہے بھاڑ میں۔ بس جو بیس گھنٹے شاعری کی دھن ہے ــــ ہونہہ ! چمڑے کا بیوپار چھوڑ کر چلے ہیں شاعر بننے۔

شیخ داؤد۔ دیکھو جی۔ تم نے پھر وہی طعنہ دیا۔ میں پوچھتا ہوں، چمڑے کے بیوپاری شاعر بننے کا حق نہیں رکھتے کیا ؟

نسیمہ ۔ حق وق میں نہیں جانتی۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ شاعری نحوست ہے۔ دیکھ لو۔ ایک مہینہ ابھی پورا نہیں ہوا، بیوپار میں نقصان آنے لگا۔ یہ نحوست نہیں تو کیا ہے ؟

شیخ داؤد۔ کفر مت بکو۔ تم کیا جانو، شاعری کیا چیز ہے ؟ میں بتاؤں تمہیں ؟ شاعری ــــ شعر شاعری ــــ ایک ایسی ابھی ــــ ایک ــــ یعنی انسان شاعر ــــ خیر تم سمجھ نہ سکو گی۔ پڑھی لکھی ہوتیں تو بتاتا کہ ــــ

نسیمہ ۔ خود کونسے پڑھے لکھے ہیں! تخلص تو خیر سے فاضل رکھ لیا ہے۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل!

شیخ داؤد۔ دیکھو نسیمہ ۔ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ تم جانتی ہو، میں میٹرک پاس ہوں۔ پھر بھی کہتی ہو، میں پڑھا لکھا نہیں۔ سچ ہے، گھر کی مرغی دال برابر۔

نسیمہ۔ کچھ بھی ہو۔ میں تو سمجھتی ہوں، بُرے دن آگئے۔ قسمت پھوٹ گئی۔ جانے کونسی منحوس گھڑی تھی کہ ہم اس گھر میں آئے۔

شیخ داؤد ۔ نہیں نہیں۔ ایسا نہ کہو۔ چچا کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔ بات تو خوش ہونے کی ہے نسیمہ۔ سب کو ایسے چچا تھوڑے ہی نصیب ہوتے ہیں۔ چچا شاعر باکمال تھے۔ اُستادوں میں شمار ہوتا ہے انکا۔ خدا تم کو نیکی دے۔ کوئی تیس پینتیس سال انھوں نے اس مکان میں شعر شاعری کرتے گزارے اور تم اس مکان میں رہنے کا اثر دیکھ رہی ہو۔ میں بھی شاعر بنتا جارہا ہوں۔ (نسیمہ کے جمائی لینے کی آواز) اوہو! تمھیں تو نیند آرہی ہے۔ جمائیاں لے رہی ہو۔ اچھا اب سوجاؤ۔ بارہ

بج چکے — ہوں — ذرا چراغ گل کردوں — (پھونک مار کر چراغ گل کرنے کی آواز) — ہوں — نسیمہ ۔ یہ پلنگ ۔ اس کی نواڑ ڈھیلی ہوگئی ہے ۔ پلنگ جھولی بنتا جارہا ہے ۔ کل اس کو — ہاں نسیمہ ذرا اپنا سر اٹھاؤ ۔ یہ بیاض ۔ ذرا اس کو تکیہ کے نیچے رکھ دوں — ہاں بس ٹھیک ہے — اور ٹارچ؟ ٹارچ کہاں رکھ دی؟ — ہاں یہ ہے — ہوں — اکثر رات کو شعر ہو جاتے ہیں ۔ فوراً بیاض میں لکھ لینا چاہئے ۔ صبح تک ذہن سے اتر نہ جائیں — (خاموشی)

نسیمہ ۔ سردی لگ رہی ہے ۔

شیخ داؤد ۔ سردی؟ نہیں تو — ہاں سرد ہوا کا جھونکا تو آیا ضرور —

نسیمہ ۔ (زور سے دم سادھنے کی آواز) سنو سنو! کچھ آواز — (کھڑبڑ ۔ پھر نسیمہ کی چیخ)

شیخ داؤد ۔ (گھبرا کر) کیا ہے؟ کیا ہے؟

نسیمہ ۔ وہ دیکھو ۔ وہ دیکھو ۔ دروازے کے پاس ۔ وہ سفید سفید — یا اللہ!

شیخ داؤد ۔ ہاں ہاں ۔ کچھ ہے ضرور — ڈرو نہیں ۔ نسیمہ ڈرو نہیں ۔ میں ہوں نا — (زور سے) کون ہے؟

(پھٹ پھٹ — پھٹ — قدموں کی آواز قریب آتی ہے)

نسیمہ ۔ یا میرے اللہ! بھوت! بھوت! — جل تو جلال تو — ادھر ہی آرہا ہے — (چیخ)

شیخ داؤد ۔ ٹارچ دو ۔ ٹارچ کہاں ہے؟ — ہاں یہ — ارے! یہ تو چچا کا بھوت ہے!

بھوت (بھاری کھوکھلی آواز میں آہستہ آہستہ بولتا ہے) ہاں ۔ بیٹا شیخ داؤد ۔ میں تمہارے چچا کا بھوت ہوں ۔

شیخ داؤد ۔ آداب عرض چچا! آداب عرض! مزاج تو اچھا ہے؟ بہت دن کے بعد درشن دئے — ارے نسیمہ! آداب کرو ۔ چچا کو آداب کرو ۔ ڈرتی کیوں ہو؟ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ۔ یہ تو چچا مرحوم ہیں — ارے! آپ تو کھڑے ہوئے ہیں ۔ بیٹھئے چچا ۔ بیٹھئے کرسی یہ ہے ۔ (کرسی گھسیٹنے کی آواز)

بھوت ۔ بیٹا داؤد! میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں ۔ اس سے پہلے بھی تین چار بار آیا تھا ۔ مگر تم نیند میں تھے ۔ جگانا مناسب نہ سمجھا ۔ تم دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر چلا گیا ۔ آج اتفاق سے —

شیخ داؤد۔ معاف کرنا چچا۔ آپ کو تکلیف ہوئی۔ مگر مجھے معلوم نہ تھا۔ نسیمہ نے کہا بھی۔ مگر میں نے ــــ کیوں نسیمہ ؟ ــــ ارے ! تم تو ابھی تک خوف زدہ ہو۔ نسیمہ۔ ڈرنے کی کیا بات ہے ؟ دیکھو چچا ہیں۔ ہمارے محسن۔ وصیت میں یہ مکان ہمارے نام لکھ گئے۔

بھوت۔ بھائی صاحب مرحوم کے اکلوتے بیٹے کے ساتھ سلوک کئے بغیر میں کس طرح مر سکتا تھا ؟

شیخ داؤد۔ چچا آپ کے احسان سے میری گردن ہمیشہ جھکی رہے گی۔

بھوت۔ نہیں نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ مگر بیٹا۔ یہ مکان مجھ کو بہت عزیز تھا اور ہے۔

شیخ داؤد۔ اسی لئے تو آپ اب بھی آیا کرتے ہیں۔ اسی مکان میں تو آپ نے ساری عمر گذاری۔ شعر و شاعری کی۔ نام پایا۔ دو مجموعے اپنی یادگار چھوڑے۔ اس مکان سے آپ کا تعلق بھلا کیسے ٹوٹ سکتا تھا ؟۔ آپ کے جسم نے تو اسے چھوڑ دیا۔ مگر روح۔ اس کو ــــ

نسیمہ۔ (بات کاٹ کر) چچا۔ جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں۔ یہ بھی شاعری کرنے لگے ہیں۔

شیخ داؤد۔ پھر وہی ! ــــ چچا۔ خدا آپ ہی نسیمہ کو سمجھائیے۔ یہ مانتیں نہیں۔ قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ شاعری کو اتنا برا سمجھتی ہیں کہ ــــ کہ بس میں آپ سے کیا کہوں۔

نسیمہ۔ مگر کاروبار کا نقصان جو ہو رہا ہے۔ بیوپار نہ چلے تو کھانے کو کیا ملے گا ؟

بھوت۔ نہیں بیٹی نسیمہ ! شاعری کو برا نہ سمجھو۔ سچا شاعر جو ہے، بنی نوع انسان کو بہت فائدہ پہنچاتا ہے۔ آج جو یہ فتنہ و فساد برپا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی شاعرانہ صلاحیتیں گھٹتی جا رہی ہیں۔ وہ لطیف جذبات و احساسات، انسانیت سے وہ محبت و شیفتگی، جو شاعر کا طرۂ امتیاز ہیں، یہ سب ناپید ہوتے جاتے ہیں۔ قصر انسانیت لڑکھڑا رہا ہے۔ اس کو بچانے کے لئے آج شاعروں کی ضرورت ہے۔

شیخ داؤد۔ سن لیا نسیمہ ؟ میں کیا کہتا تھا ؟ میں بھی تو یہی کہتا تھا۔ اب تو آیا تمہاری سمجھ میں۔

بھوت۔ بیٹا داؤد ! نسیمہ کو دیکھتا ہوں تو تمہاری چچی جان مرحومہ یاد آ جاتی ہیں۔ خدا غریق رحمت کرے۔ ان سے بھی ہمیشہ اسی بات پر جھگڑا رہا کرتا تھا۔ وہ بھی شاعروں کو پانی پی پی کر کوستی تھیں۔ آخر عمر میں تو بہت بد مزاج ہو گئی تھیں۔ مگر خیر۔ وہ مر گئیں۔ میں بھی مر گیا۔ مگر خوش ہوں کہ میری زندگی رائیگاں نہیں گئی۔

شیخ داؤد۔ جی ہاں، شاعر کی زندگی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس کا احساس چچا مجھے یہاں آنے کے بعد ہوا۔ دل نے آواز دی، تو شاعروں کا دشمن تھا۔ مگر غافل بندے! خدا نے تو تجھے شاعر بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ بس چچا اس آواز کا آنا تھا کہ میں جھرجھری لیکر اُٹھا۔ اور آپ کے کتب خانہ کی سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ شاعروں کے دیوان، تنقیدی تصنیفیں، علم عروض کی کتابیں، تذکرے۔ غرض کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ غالب اور اقبال کا کلام اگرچہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن دنیا اس کو آنکھوں سے لگاتی ہے۔ اس لئے میں نے کہا 'ان میں کوئی نہ کوئی خوبی ہوگی ضرور — اور چچا۔ میں نے آپ کے دونوں مجموعے کئی بار پڑھے۔ یہاں تک کہ بہت سا حصہ حفظ ہوگیا۔ واقعی چچا۔ کیا لاجواب کلام ہے! انسان ایک دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

بھوت۔ ہاں بیٹا۔ شاعری خدا کی دین ہے۔

شیخ داؤد۔ چچا۔ اب میں سمجھ گیا ہوں، آپ کی شہرت وعزت کی کیا وجہ تھی؟ آپ کی وفات حسرت آیات پر دنیائے علم وادب میں اس قدر ماتم کیوں برپا ہوا؟

بھوت۔ پھر بھی بیٹا۔ ہمارا ملک اپنے مشاہیر کی قدر کرنا نہیں جانتا۔ اگر میں کسی ترقی یافتہ ملک میں پیدا ہوتا تو تم دیکھتے کہ — گلہ شکوہ سے اب کیا فائدہ؟

شیخ داؤد۔ ہاں چچا۔ ان کتابوں کا مطالعہ میں نے کرلیا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر شاعرانہ قوتیں انگڑائیاں لیکر بیدار ہو رہی ہیں — اور پھر چچا۔ آپ کو حیرت ہوگی۔ مصرعے اور شعر خود بخود موزوں ہونے لگے۔

بھوت۔ ہاں۔ اس گھر کے ماحول کا اثر ہے۔ میں نے پینتیس[۳۵] سال یہاں شعر کہتے ہوئے گذارے۔

شیخ داؤد۔ ہاں چچا۔ عجیب پُرکیف فضا ہے اس مکان کی۔ شعریت سے بھری ہوئی۔ انسان پر ایک بےخودی سی چھا جاتی ہے۔

نسیمہ۔ مگر چچا۔ مچھر بہت ہیں۔

شیخ داؤد۔ اجی تم کیا جانو؟ اس مکان کے مچھر بھی شاعر ہوں گے — بہرحال چچا۔ میں تو اس کو آپ کا روحانی فیض سمجھتا ہوں۔ ایک مہینہ ابھی پورا نہیں ہوا۔ اور میں غزلیں کہنے لگا۔ تخلص اپنا فاضل رکھ لیا دوسرے اچھے اچھے تخلص یار لوگوں کا مال بن گئے۔ یہی ایک موزوں تخلص سمجھ میں آیا۔ کیوں کیسا ہے؟

بھوت ۔ ہاں اچھا ہے۔ تخلص چاہے کیسا ہی ہو۔ کلام اچھا ہونا چاہیئے۔

شیخ داؤد۔ میں اپنے اشعار آپ کو سناؤں ؟ نسیمہ ذرا وہ بیاض تو دینا ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ چند تازہ شعر سنئے۔ غزل ابھی پوری نہیں ہوئی۔ (ورق الٹنے کی آواز) چچا۔ مطلع عرض کیا ہے۔

مرتے وقت تم نے اگر شکل دکھائی ہوتی۔ کچھ مرے جینے کی ترکیب نکل آئی ہوتی

کہئے کیسا شعر ہے ؟

بھوت ۔ ہوں ۔ پہلے مصرعہ میں "وقت" کی "ت" تقطیع سے گر رہی ہے۔ "وقت" کے بجائے "دم" ٹھیک رہے گا ۔۔۔ مرتے دم تم نے اگر شکل دکھائی ہوتی ۔ مصرعہ اب موزوں ہو گیا۔ دوسرا مصرعہ ہے۔ کچھ مرے جینے کی ترکیب نکل آئی ہوتی ۔ یہاں "ترکیب" کے بجائے "صورت" کا لفظ چاہیئے ۔ پہلے مصرعہ میں "شکل" اور دوسرے مصرعہ میں "صورت" اب دیکھو شعر کیا سے کیا ہو گیا۔

مرتے دم تم نے اگر شکل دکھائی ہوتی ۔ کچھ مرے جینے کی صورت نکل آئی ہوتی

شیخ داؤد۔ واللہ! چچا ! کیا اُستادانہ اصلاح ہے، شعر میں ایک حسن پیدا ہو گیا۔ واقعی شاعری میں کسی اُستاد کی رہنمائی نہایت ضروری ہے ۔۔۔ اچھا اب دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔ عرض کیا ہے:۔

ساقیا جام کی حاجت تو تھی نادیدوں کو ۔ سب کے بدلے مجھے ہاتھوں سے پلائی ہوتی

بھوت ۔ ہوں ۔ پہلے مصرعہ میں "تو" کا لفظ بھرتی کا ہے۔ اور پھر "نادیدوں" کا لفظ کچھ بے تکا ہے۔ "جام" کی رعایت سے "کم ظرفوں" کا لفظ نہایت موزوں رہے گا۔ دوسرے مصرعہ میں "ہاتھوں سے پلانا"۔ فصحا یہ نہیں کہتے ۔ محاورہ ہے۔ "چلّو" سے پلانا ۔ اب دیکھو شعر کی صورت کیا ہو گئی۔

ساقیا جام کی تکلیف تھی کم ظرفوں کو ۔ سب کے بدلے مجھے چلّو سے پلائی ہوتی

شیخ داؤد۔ آداب عرض ! آداب عرض ! بہت خوب اصلاح دی چچا آپ نے ۔ کیا زبان ہے ! کیا روزمرہ ہے ! کیا روانی ہے ! میں تو پھولا نہیں سما رہا۔

بھوت ۔ اچھا تیسرا شعر۔

شیخ داؤد۔ دل کسی رشک لیلیٰ سے لگاتے نہ اگر   کبھی عالم میں نہ انگشت نمائی ہوتی

بھوت۔ پہلا مصرعہ ٹھیک نہیں۔ "لیلیٰ" کے بجائے کوئی اور لفظ چاہئے۔ "انگشت نمائی" کی رعایت سے "مہ نو" کا لفظ رکھو۔ دیکھو اب شعر میں خوبی پیدا ہو گئی۔

دل کسی رشک مہ نو سے لگاتے نہ اگر   کبھی عالم میں نہ انگشت نمائی ہوتی

شیخ داؤد۔ خدا کی قسم! چچا آپ کا ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ اصلاح ہو تو ایسی ہو۔ شعر آسمان پر پہنچ گیا۔ چار چاند لگ گئے۔ کیوں نہ ہو۔ جائے اُستاد خالی ہے (منت سے) چچا مہربانی کر کے کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے۔ میں اصلاح لے لیا کروں گا۔ آپ کے بیسیوں شاگرد ہیں۔ مگر میں۔ میں آپ کا روحانی شاگرد بن جاؤں گا۔ دنیائے شعر و سخن میں یہ ایک انوکھی بات ہو گی۔ میں آپ کا تلمیذ رشید، آپ کا جانشین بننا چاہتا ہوں۔ کیوں چچا۔ آپ میری خاطر سے تکلیف گوارا فرمائیں گے نا؟

بھوت۔ ہاں ہاں بیٹا۔ تمھاری خواہش کس طرح رد کر سکتا ہوں؟ تمھارے کلام میں اصلاح دینے سے مجھے دلی خوشی ہو گی ــــ اور پھر اپنا تازہ کلام تمھیں سنانے کا موقع ملتا رہے گا۔

شیخ داؤد۔ (حیرت سے) آپ اب بھی شعر کہتے ہیں؟

بھوت۔ ہاں کیوں نہیں؟ اتنے سال کی مشق کیسے چھوٹ سکتی؟ یاد رکھو۔ شاعر مرنے کے بعد بھی شاعر ہی رہتا ہے ــــ اچھا تو چند تازہ شعر سنو۔ مطلع ابھی نہیں ہوا۔ قافیہ ہے 'بسمل'، منزل'، ساحل' وغیرہ اور ردیف ہے "کے پہلو میں"۔ سنو (اپنی بھونڈی، کھوکھلی بھوتوں کی سی آواز میں گا کر پڑھتا ہے)

بنی کوئے حسیناں میں پس مُردن مری تربت   مجھے منزل ملی فردوس کی منزل کے پہلو میں

شیخ داؤد۔ اہاہا! کیا بات ہے! پس مردن! مری تربت! کتنا مطابق حال! کمال ہے چچا کمال!

بھوت۔ اچھا یہ بتاؤ اس کی بحر کونسی ہے؟

شیخ داؤد۔ مجھے منزل ملی فردوس کی منزل کے پہلو میں۔ (سوچ کر) مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔

بھوت۔ نہیں نہیں۔ بحر ہے۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ــــ دیکھو مجھے منزل مفاعیلن ملی فردو مفاعیلن سکی منزل مفاعیلن۔ کے پہلو میں مفاعیلن۔ سمجھے؟

شیخ داؤد۔ ہاں چچا۔ سمجھ گیا۔ غلطی ہو گئی۔ آپ جائیں، ابھی تو ابتدا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ روز ہوئے ہیں۔

بھوت۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں ــــ اچھا دوسرا شعر سنو۔

رہا جب نیم کشتہ خنجر ابروئے قاتل سے لگایا چرخ نے تیر قضا بسمل کے پہلو میں

شیخ داؤد۔ کیا خوب! لگایا چرخ نے تیر قضا! کیا کوثر میں دھلی ہوئی زبان ہے!

بھوت۔ ہوا جب وصل دلبر جان نکلی فرط شادی سے پہنچ کر غرق کشتی ہو گئی ساحل کے پہلو میں

شیخ داؤد۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ! خدا مغفرت کرے۔ کیا مرصع غزل کہی ہے!

بھوت۔ مقطع ہو گیا ہے۔

لحد میں اے اجل اب اشک آنکھوں سے جاری ہیں رواں جس طرح دریا ہو کسی ساحل کے پہلو میں

شیخ داؤد۔ سبحان اللہ! کیا دلدوز کیفیت ہے! کیا سوز و گداز ہے! ــــ چچا۔ دوسرے شعرا زندگی ہی میں موت، قبر وغیرہ کا ذکر انٹ سنٹ کر دیتے ہیں۔ لیکن آپ کی بات کسی کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔ آپ اپنے مشاہدے اور تجربے کو شعر کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ واقعی چچا۔ یہ تبرکات آنکھوں سے لگا رکھنے کے قابل ہیں۔

بھوت۔ اچھا بیٹا۔ اب میں چلتا ہوں۔ مگر جانے سے پہلے تمھیں چند نصیحتیں کر دوں۔ دیکھو۔ شاعری میں کبھی چوری نہ کرنا۔ یہ اخلاقی کمزوری عام ہے۔ دوسری بات۔ شعر میں زیادہ لفاظی نہ کرنا۔ سادہ زبان دل میں اُتر جاتی ہے۔

شیخ داؤد۔ بہت اچھا چچا۔ آپ کی ان قیمتی ہدایتوں پر ہمیشہ عمل کیا کروں گا۔

بھوت۔ مجھے دلی مسرت ہوئی کہ تم نے شاعری شروع کر دی۔ اس مکان کا ماحول آخر تمھارے احساسات لطیف کو جگائے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک مہینہ کے اندر ہی اندر تم شعر کہنے لگے۔ تین چار مہینے اور اس مکان میں رہ کر مشق مسلسل جاری رکھو۔ یقین ہے تم پکے شاعر بن جاؤ گے۔ تب تمھیں میری اصلاح کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔ لیکن اگر اس دوران میں تم نے یہ مکان چھوڑ دیا تو پھر وہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔ اور تمہاری حسرت دل ہی میں رہ جائے گی۔ سمجھے؟

شیخ داؤد۔ ہاں چچا۔ سمجھا۔ لوگ کہتے ہیں۔ شاعر پیدا ہوتا ہے۔ مگر میں دنیا کو دکھا دوں گا کہ شاعر بنتا بھی ہے۔

بھوت۔ اور بیٹی نسیمہ! اپنے شوہر سے شاعری کے معاملہ میں لڑنا جھگڑنا مت۔ کاروبار چلتا ہی رہتا ہے۔ خدا رزاق ہے۔ انسان کو بھوکا نہیں رکھتا۔ لیکن شاعری خداداد نعمت ہے۔ اپنے شوہر کو

شاعر بننے سے روکنا کفران نعمت سے کم نہیں۔ میرے بعد اس مکان میں ایسا آدمی نہیں رہے گا، جو شاعر نہ ہو یہ خیال کر کے میری روح کو سکون نصیب ہوتا ہے۔

شیخ داؤد۔ خدا آپ کی روح پُرفتوح پر رحمت کے پھول برسائے۔ میں آپ کے مزار پر کتبہ لگوانا چاہتا ہوں قطعۂ تاریخ آپ کے انتقال پُر ملال کا لکھنے والا ہوں۔ لکھنے کے بعد آپ کو دکھاؤں گا آپ اس میں اصلاح دیدیں۔

بھوت۔ دیکھا جائے گا ــــ اچھا اب تم سو رہو۔

نسیمہ۔ آداب عرض چچا۔

بھوت۔ جیتی رہو بیٹی!

شیخ داؤد۔ خدا حافظ چچا۔

بھوت۔ خدا حافظ بیٹا! میرا مکان تم پر اپنا ساحرانہ اثر زیادہ سے زیادہ ڈالے۔

(پھٹ ــــ پھٹ ــــ پھٹ ــــ بھوت کے جانے کی آواز۔ خاموشی۔ پھر دروازہ کھلنے اور نسیمہ کے جلدی جلدی آنے کی آواز)

نسیمہ۔ اُٹھو اُٹھو۔ اجی اُٹھو۔ آرام کرسی ہی پر سو گئے۔

شیخ داؤد۔ (چونک کر بے ساختہ) ہاں! ہاں! میں کہاں ہوں؟

نسیمہ۔ دیوانخانے میں۔ اور کہاں؟ ناشتہ کر کے یہاں آئے اور کرسی پر لیٹے لیٹے سو گئے۔

شیخ داؤد۔ اچھا میں سو گیا تھا؟

نسیمہ۔ اور نہیں تو کیا؟ رات کو جاگ جاگ کر شعر کہا کرتے ہیں۔ دن کو نیند نہ آئے تو کیا ہو۔ اچھی حالت ہے! اُٹھئے دس بج گئے۔ دُکان کو نہیں جائیں گے کیا؟

شیخ داؤد۔ ہاں ہاں جاؤں گا۔

نسیمہ۔ کیا خاک جائیں گے! بیوپار جائے چولھے بھاڑ میں، آپ کو کیا؟ آپ کے اوپر تو بس شاعری کا بھوت سوار ہے۔

شیخ داؤد۔ بھوت! تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

نسیمہ۔ لو اور سنو! معلوم کیسے نہ ہوتا؟ اندھی تو ہوں نہیں۔ دن رات دیکھتی ہوں، قلم اور بیاض لئے سوچ رہے ہیں

اور شعر بنا رہے ہیں۔

شیخ داؤد ۔ نہیں نہیں۔ میں بھوت کو کہہ رہا ہوں ۔ ابھی ابھی ـــــ یعنی چچا مرحوم خواب میں آئے تھے۔ میرے کلام میں اصلاح دے گئے ۔ اپنا تازہ کلام سنایا۔ تلقین فرمائی کہ شاعری کی مشق جاری رکھو۔

نسیمہ ۔ میرے خواب میں کبھی آئیں تو سہی۔ ایسی بے نقط سناؤں کہ قیامت تک یاد ہی کریں۔

شیخ داؤد ۔ کیا بیہودگی ہے ! چچا مرحوم ۔ خدا اُنھیں جوار رحمت میں جگہ دے ۔ ان کی شان میں یہ گستاخی ! بھوت کبھی رات کو آکر تمھیں ستائے تب قدر عافیت معلوم ہو۔

نسیمہ ۔ بھوت ووت سے میں ڈرنے والی نہیں ۔ میں بھی تو دیکھوں ، موا بھوت اس مکان میں آتا کیسے ہے ؟

شیخ داؤد ۔ واہ ! تم روکنے والی ہوتی کون ہو ؟ یہ مکان چچا مرحوم ہی کا تو تھا ۔ ازراہ کرم انھوں نے ہمیں دے دیا۔

نسیمہ ۔ بس یہی تو غلطی ہوئی کہ اس مکان میں اُٹھ آئے ۔ شاعری کا بھوت سوار ہو گیا ـــــ توبہ ہے ! یہ کیسا خبط ہے !

شیخ داؤد ۔ اسی کو کہتے ہیں ماحول اور فضا کا اثر ۔ ساری عمر چچا مرحوم کی اسی مکان میں شعر کہتے گزری ۔ اور اب دیکھ لو ۔ ایک ہی مہینہ میں میں شعر بے تکان کہنے لگا ۔ تین چار مہینے اور اس مکان میں رہ کر مشق جاری رکھوں تو تم دیکھنا کہ ایک بڑا شاعر بن جاؤں گا ۔ چچا کی طرح ۔ اخباروں رسالوں میں میری غزلیں چھپنے لگیں گی ۔ مشاعروں میں لوگ خوشامد کرکے بلایا کریں گے ۔ طوائفیں میری غزلیں گانے لگیں گی ۔ ریڈیو پر کلام سُنایا کروں گا ـــــ غرض کہ میری شاعری کی دھوم مچ جائے گی ۔

نسیمہ ۔ اور چمڑے کا بیوپار کون کرے گا ؟

شیخ داؤد ۔ اوہ ! تم کو تو بس چمڑے کے بیوپار کی پڑی ہے ۔ ارے بابا ! بیوپار تو ہوتا رہے گا ۔ خدا رزاق ہے ۔ انسان کو بھوکا نہیں رکھتا ۔ مگر شاعری خداداد نعمت ہے ۔ مجھے شہرت ملے گی تو کاروبار خودبخود چمک اُٹھے گا ۔ اتنی موٹی سی بات نہیں سمجھتیں ۔ دیکھو چچا مرحوم کی کیسی شہرت تھی ۔

نسیمہ ۔ بس رہنے دیجئے ۔ میں ایسے جھانسوں میں آنے والی نہیں ۔ دیکھئے میں صاف صاف کہے دیتی ہوں ، آپ اس طور پر شاعری کی ٹانگ توڑنے میں لگے رہیں گے تو میں تو میکے چلی جاؤں گی ایسے

مکان میں میں نہیں رہنا چاہتی۔ باوا آدم کے زمانہ کا ہے۔ نہ ہوا آتی ہے نہ روشنی۔ دن کو مکھیاں اور رات کو مچھر۔ گلی اندھیری۔ محلہ غلیظ۔ سارے محلہ والے تنگ ہیں۔ جدھر دیکھو۔ بخار، کھانسی، پیچش، بلا بدتر۔

شیخ داؤد۔ مگر ہم کو کرایہ کی بچت جو ہوئی ہے۔

نسیمہ۔ کرایہ کی بچت کا تو فقط نام ہے۔ آپ کاروبار کا جو نقصان کر رہے ہیں، وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے آپ کا کیا ہے؟ گھر کا کاروبار کبھی خود چلاؤ تو معلوم ہو۔ شاعری میں پڑکر ایک روگ میری جان کو لگا دیا۔

شیخ داؤد۔ دیکھو جی۔ تم بہت بڑھتی چلیں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ جب سے اس گھر میں آئی ہو، بدمزاج اور نافرمان ہوگئی ہو۔ چچی کا بھی یہی حال تھا۔ چچا مرحوم ہمیشہ ان سے نالاں رہے۔ دن رات اسی طرح بک بک جھک جھک ہوتی رہتی تھی۔ تم بھی چچی کا نمونہ بنتی جا رہی ہو۔ اس مکان کا ماحول۔ اس کا اثر تم پر بھی ہو رہا ہے۔

نسیمہ۔ خدا نہ کرے، مجھ پر اثر ہو۔ میں تو وہی نسیمہ ہوں جو پہلے تھی۔ اثر تو آپ پر ہوگیا ہے۔ خدا کی سنوار ایسے گھر پر!

شیخ داؤد۔ کوسنے سے کیا ہوتا ہے! چچی بھی اسی طرح کوسا کاٹا کرتی تھیں۔ مگر ان کی مخالفت چچا کو ایک مسلم الثبوت اُستاد بننے سے نہ روک سکی۔ میں بھی اپنی دھن کا پکا ہوں۔ تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں۔ سمجھیں؟ (ہنستا ہے)

(دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز)

تم اندر چلی جاؤ۔ کوئی آیا ہے۔ (نسیمہ کے جانے کی آواز) اندر آئیے۔ (دروازہ کھلنے اور سلیم کے داخل ہونے کی آواز)

سلیم۔ آداب عرض۔

شیخ داؤد۔ آداب عرض۔ آئیے۔ بیٹھئے۔ (کرسی گھسیٹنے کی آواز) فرمائیے۔

سلیم۔ آپ ہی شیخ داؤد صاحب ہیں؟

شیخ داؤد۔ جی ہاں۔ میں ہی شیخ داؤد فاضل ہوں۔

سلیم۔ یہ مکان آپ کا ذاتی ہے؟

شیخ داؤد۔ جی ہاں۔ پہلے یہ میرے چچا کا تھا۔ آپ نے نام سنا ہوگا۔ شیخ احمد صاحب افضل مرحوم

بہت بڑے شاعر تھے ۔ خوب کلام ہے صاحب ان کا ۔ میں ان کا شاگرد رشید ہوں ۔ اور بھتیجا بھی ۔ وصیت کی رو سے یہ مکان مجھے ملا ہے ۔

سلیم ۔ جی ـــ آپ جانتے ہیں، یہ محلہ بہت غلیظ ہے ۔ پبلک کی صحت کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے ۔

شیخ داؤد ۔ جی ہاں صاحب ۔ کیا کہیں ؟ صفائی کا انتظام ٹھیک نہیں ۔

سلیم ۔ جی ہاں ۔ بہت سی درخواستیں محلہ والوں نے میونسپلٹی میں دیں ۔ اور ـــ

شیخ داؤد ۔ قطع کلام معاف ۔ آپ کا اسم گرامی ؟

سلیم ۔ جی مجھے محمد سلیم کہتے ہیں ۔ میرا تعلق میونسپلٹی سے ہے ۔ میں اس مکان کی پیمایش کرنے آیا ہوں ۔

شیخ داؤد ۔ پیمایش ؟ کس لئے ؟

سلیم ۔ اندازہ لگانا ہے کہ اس مکان کی قیمت کیا ہو گی ۔ آپ کو سرکاری مراسلہ دو ایک روز میں مل جائے گا بات یہ ہے کہ ہمارے محکمہ نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ اس گندہ محلہ کے سب مکانات توڑ دئے جائیں ۔ اور ان کی جگہ نئی وضع کے مکانات ـــ

شیخ داؤد ۔ نہیں نہیں ۔ یہ نہیں ہو سکتا ۔

سلیم ۔ سب محلہ والے تو راضی ہیں ۔ بہت سے مکانوں کی پیمایش ہو چکی ہے ۔ مگر حیرت ہے کہ آپ ـــ

شیخ داؤد ۔ نہیں نہیں ۔ میں اجازت نہیں دے سکتا ۔ زبردستی تھوڑی ہے ! میرے چچا کا مکان ـــ اس کا ماحول ـــ میری ـ میری شاعری ـــ میرا شاندار مستقبل ـــ نہیں نہیں اس کو میں خاک میں ملتا نہیں دیکھ سکتا ـــ یا اللہ! یہ کیسا ظلم ہے ! رعایا کو مکانات توڑ کر بے گھر کیا جاتا ہے ۔

نسیمہ ۔ (آواز دور سے گویا دروازے کے پیچھے سے) یہ دیکھئے ۔ مکانات توڑنے کا کام جلد شروع ہو جائے گا نا ؟

سلیم ۔ جی ہاں ۔ بہت جلد ۔ مکان خالی کرنے کی نوٹس دیدی جائے گی ۔ رقم بھی ادا کر دی جائے گی ۔ اس کے بعد مکانات توڑ دئے جائیں گے ۔

نسیمہ ۔ اچھی بات ہے ۔ آپ پیمایش شروع کر دیجئے ۔ اس مکان میں بھوت ہے ۔ سب سے پہلے اس مکان کو توڑنے کا انتظام کیجئے ۔ میرے والد کے مکان میں ہم منتقل ہو جائیں گے ۔

سلیم ۔ بہت اچھا ۔ آدمی باہر ہیں ۔ انھیں بلا لاؤں ۔ (جانے کی آواز)

شیخ داؤد ۔ (چیخ کر) نہیں نہیں ۔ ایسا نہیں ہوسکتا ـــ ہائے چچا نے کہا تھا ـــ میری شاعری ـــ نہیں نہیں ـــ ایسا نہیں ہوسکتا ـــ او چچا ـــ مدد ! مدد ! ـــ

(آواز مدھم پڑتی جاتی ہے)

"ناکارہ" حیدرآبادی

غزل

شاہدِ گلعذار آتا ہے　　یا پیامِ بہار آتا ہے

جب نظر روئے یار آتا ہے　　مجھ کو لطفِ بہار آتا ہے

نہ وہ غفلت شعار آتا ہے　　نہ تو دل کو قرار آتا ہے

دل کی راحت کا اب خدا حافظ　　آفتِ روزگار آتا ہے

ذکر میرا اور اُس کی محفل میں　　کیا سبب ! بار بار آتا ہے

زندگی میں نہ لی خبر جس نے　　کیوں وہ سوئے مزار آتا ہے

شبِ فرقت میں اشکباری سے　　دل کو میرے قرار آتا ہے

جان جاتی ہے زلفِ مشکیں پر　　رخِ رنگیں پہ پیار آتا ہے

دیکھو پھر وہ فہیمؔ دیوانہ
جانبِ کوئے یار آتا ہے

ہیم چندر پرشاد فہیم
سال دوم

ہندوستان کے عہد قدیم کی جامعات

تاریخ ہند کا طالب علم جانتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان ابتدائی ہندو تہذیب کا گہوارہ تھا اس لئے وہ ایک مدت تک ہندو علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔

کشمیر اور بدری کے آشرم اپنی علم پروری کے لئے مشہور تھے۔

ٹکسلا

معلوم ہوتا ہے کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں علوم و فنون کا مرکز ٹکسلا میں منتقل ہو چکا تھا۔ ٹکسلا برہمنی علوم و فنون کا صدر مقام تھا۔ ٹکسلا کی جامعہ کا نصاب تعلیم کافی وسیع تھا۔ اس میں تینوں ویدا اور ان کے ضمنی مضامین اور ویدانتا فلسفہ شامل تھے۔ اٹھارہ مختلف فنون اور پیشوں کی تعلیم بھی شامل تھی۔ اٹھارہ مدارس تھے جن میں نقاشی۔ سنگ تراشی۔ بت تراشی۔ دست کاری طب اور جراحی تیر کشی (اور دیگر سپاہیانہ فنون) علم ہیئت نجوم محاسبی تجارت زراعت پیش گوئی (علم غیب) اور سحر وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مشہور قواعد دان پانی نی اور چندر گپت کا وزیر چانکیہ یہیں کے تعلیم یافتہ تھے۔ طالب علم کو تعلیم کے لئے فیس ادا کرنی پڑتی تھی۔

یہ جامعہ طب میں ترقی حاصل کرنے کی وجہ سے خاص طور پر مشہور تھی۔ شاہی طبیب جیوکا نے جس نے مگدھ کے راجہ بمبسارا اور مہاتما بدھ کو چند بہت ہی تکلیف دہ بیماریوں سے نجات دلوائی تھی یہاں پر بڑے رشی اور حکیم آتریا کی نگرانی میں طب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس جامعہ میں سات برس تعلیم پانے کے بعد جیوکا کو امتحان دینا پڑا جس میں اس سے شہر ٹکسلا سے پندرہ میل کے حلقہ میں

پائی جانے والی تمام نباتات بیل جڑی بوٹی کے طبی فوائد کی تفصیل پوچھی گئی تھی جیوکا نے ان کا چار دن تک مشاہدہ کیا اور اس کے بعد اپنے نتائج پیش کئے اور بتلایا کہ ایک پودا بھی ایسا نہ تھا جو طبی خصوصیات نہ رکھتا ہو۔ اس سے ہمیں اس زمانہ کے طریقۂ امتحان کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

اس جامعہ کی کئی صدیوں تک شہرت قائم رہی اور تیسری صدی قبل مسیح میں جبکہ راجہ اشوک ہندوستان کا حکمراں تھا بہت عروج پر تھی۔ راجہ اشوک کے دورحکومت میں ہندوستان کی حالت بیان کرتے ہوئے ونسنٹ اسمتھ لکھتا ہے کہ اعلیٰ طبقے امیروں، برہمنوں اور تاجروں کے لڑکے ہندوستانی علوم وفنون اور خاص کر طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ٹکسلا میں جمع ہوتے تھے۔

جوں جوں تہذیب کی روشنی جنوب اور مشرق کی طرف پھیلتی گئی ویسے ہی علوم وفنون کے مرکز بھی مختلف وہاروں میں جو کہ مہاتما بدھ کی وفات کے بعد سے ملک کے مختلف گوشوں میں قائم ہوئے تھے منتقل ہوتے گئے۔

درختوں کے سایہ میں عوام کو روحانی تعلیم دی جاتی تھی اور یہیں بدھ مت کے مُنی قیام کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ملک کے اندر اور باہر بدھ مت کے مُنیوں نے ہی علم کی روشنی پھیلائی۔ جہاں بھی وہ خانقاہوں یا وہاروں میں جمع ہوئے ایک جامعہ کا قیام عمل میں آیا۔ ہر ایک وہارے کی صدارت ایک کُل پتی کے ذمہ ہوا کرتی تھی جو کہ جدید کالج کے صدر کے مانند ہوتا تھا۔

سریدہان کٹک

سریدہان کٹک کی جامعہ دریائے کرشنا کے کنارے و یدار بھا۔ (جدید امروتی قریب گنٹور) میں واقع تھی۔ بدھ ناگرجن کے زمانہ میں اس جامعہ کو برہمنی اور بدھ مت کے علوم وفنون کا مرکز ہونے کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل تھی۔ لاھشا کے قریب دو پانگ کی خانقاہ میں ایک جامعہ ہے اور اس جامعہ میں چھ کلیئے ہیں۔ یہ جامعہ سریدہان کٹک کے نمونہ پر تعمیر کی گئی تھی۔

نالندہ

وہ جامعہ جس کو ایک زمانہ تک ہندوستان کا سب سے مشہور علمی مرکز ہونے کی عزت حاصل تھی اور جہاں ایشیا کے مختلف دور دراز ممالک سے طلبا تحصیل علم کے لئے جمع ہوتے تھے نالندہ کے بڑے وہارے میں واقع تھی۔ اس کے کھنڈر بارہ گاؤں میں

(جو بہار میں راج گیر سے سات میل شمال میں اور پٹنہ سے چالیس میل جنوب مغرب کی جانب واقع ہے) پائے جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں وہ تمام ملک مگدھ میں دھرما گنج کے نام سے مشہور تھی۔ اس وقت جب کہ یورپ پر بربریت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور جبکہ عربی مدارس کا وجود بھی نہ تھا یہ جامعہ معراج کمال کو پہونچ چکی تھی اور اس میں ایشیا کے مختلف ملکوں کے رہنے والے دس ہزار طلبا تعلیم پاتے تھے۔

ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہوئنگ چنگ ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے جب یہاں وارد ہوا اس جامعہ کو قائم ہوے سات صدیاں گذر چکی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ چار راجاؤں (سکرادتیا۔ بدھ گپتا۔ تتھا گپتا اور بالادتیا) نے یکے بعد دیگرے اپنی تمام توجہات اور قوتوں کو اس جامعہ کی عمارت سازی میں صرف کیا تھا۔ لیکن اس کا تاریخی دور بالادتیا کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں حکمراں تھا۔

سب سے بڑا کلیہ درمیان میں تھا اور آٹھ دیگر ایوان اس کے اطراف واقع تھے۔ بہت پروہت ان عمارتوں سے کچھ فاصلہ پر کمروں میں قیام کرتے۔ رسدگاہیں عمارتوں سے متعلقہ احاطہ میں قائم تھیں ان کی تین سب سے شاندار عمارتیں، رتن ساگر۔ رتن دہادی اور رتن رنجاکو کے نام سے موسوم تھیں ان میں سے آخر الذکر نو منزلہ تھی۔ اور اس میں ایک کتب خانہ تھا جو اس زمانہ میں ہندوستان کا سب سے بڑا کتب خانہ تصور کیا جاتا تھا۔ ہوئنگ چنگ کے یہاں قیام کے وقت اس خانقاہ کا صدر سلا بدھر تھا جو دہرماپل کا شاگرد رشید تھا۔ اکثر طلبا یہاں تحصیل علم کے لئے کم از کم بارہ سال ٹھہرتے تھے۔

نصاب تعلیم نالندہ میں جو تعلیم دی جاتی تھی وہ یک طرفہ نہ ہوتی تھی بلکہ دینی بھی ہوتی اور دنیوی بھی۔ نیز یہ کہ نہ صرف بدھ مت کی مقدس کتابوں پر اکتفا کی جاتی تھی بلکہ بدھ مت کے اٹھارہ فرقوں کے عقائد اور ان کے علاوہ ویدا اور دوسری ہندو اور جین کتب کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور اس چیز کی بالکل کوشش نہ کی جاتی کہ مخالف فرقوں میں سے کسی ایک کے عقائد کی کم تائید کی جائے اور دوسرے کی زیادہ۔ یہاں پر جو مضامین پڑھائے جاتے تھے ان کی تفصیل یہ ہے۔ قواعد۔ منطق۔ طب۔ فلسفہ اور ما بعد الطبیعیات۔ اور ان کے علاوہ دوسرے مختلف مضامین جن میں غالباً سنسکرت اور پالی کی نثر اور نظم بھی شامل تھی۔

یہ خیال کسی طرح بیجا نہیں کہ نالندہ کی جامعہ میں جہاں علوم وفنون کے ساتھ ساتھ قوت فکر کو کامل آزادی حاصل تھی۔ طلبا کا معیار بہت ہی بلند تھا۔ جامعہ نالندہ کا سب سے بڑا اور قابل قدر کارنامہ منطق کی اعلیٰ تعلیم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نالندہ کے مدرسوں کی تعلیم میں سب سے مشکل تعلیم منطق کی ہوتی تھی۔ ہونگ چنگ کا سوانح نویس ایک جگہ لکھتا ہے "اُن طلباء میں سے جو غیر ممالک سے علم منطق کے حصول کی غرض سے آتے تھے اکثر مسائل کی پیچیدگیوں سے گھبرا کر نکل جاتے اور جو قدیم اور جدید علوم میں دستگاہ رکھتے تھے اُن میں سے بھی دس میں سے دو یا تین شریک کئے جاتے تھے"۔

تنظیم نالندہ کی جامعہ جدید تبتی جامعات کی طرح خانقاہی جامعہ تھی اس لئے اصولاً یہاں ایسے طلباء شریک کئے جاتے تھے جو راہبانہ زندگی بسر کرنے پر تیار ہوتے تھے۔ چین۔ تبت۔ وسط ایشیا۔ بخارا اور کوریا کے مُنی یہاں پر نہ صرف مفت تعلیم پاتے بلکہ اُن سے قیام اور طعام کے اخراجات بھی نہیں لئے جاتے تھے۔

ہر مضمون کی تعلیم جامعہ کے چھ کلیوں میں سے ایک میں مضمون کے خاص پنڈت کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ پنڈتوں کو ان قابل تعظیم منیوں میں سے چنا جاتا جو دماغی قابلیت ضعیفی عمر اور عمدہ کردار کے سبب امتیاز رکھتے تھے۔ جدید جامعات کے پروفیسروں کی طرح جامعہ نالندہ کا ہر ایک پنڈت صرف ایک ہی مضمون کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ طلباء حسب ضرورت ایک یا زیادہ پنڈتوں سے استفادہ کرتے لیکن تمام اہم مضامین میں اوسط درجہ کے معلومات کا رکھنا لازمی ہوتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جامعہ نالندہ کے نصاب سے تمام فنی مضامین خارج تھے اس لئے ٹکسیلا کا نصاب یہاں کے نصاب سے زیادہ وسیع تھا۔ اور وہاں مضامین زیادہ تھے۔ لیکن نالندہ کی عظمت مضامین کی کثرت میں نہ تھی۔ بلکہ اُس تبحر علمی میں جو یہاں کے علماء اپنے اندر رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ چیز کہ فنی تعلیم نالندہ کے نصاب سے خارج تھی اس لئے تعجب خیز نہیں ہے کہ یہاں کے مُنیوں کو قیام طعام اور کپڑوں کی فکر نہ تھی۔ کیونکہ یہ چیزیں مفت حاصل ہو جاتی تھیں۔ سچ یہ ہے کہ یہاں کے منی شاید ہی کوئی دنیاوی فکر رکھتے ہوں اور ان کی

تمام کوششیں دماغی اور روحانی ترقی حاصل کرنے پر صرف ہوتی تھیں یہاں کے بعض علماء نے بدھ مت کے مختلف اقسام۔ فلسفے۔ منطق۔ اور قواعد پر جامع کتابیں لکھی ہیں۔ اُن مشہور علماء میں سے چند کا نام لینا ضروری ہے۔ ونآگا نے جس کا زمانہ پانچویں صدی عیسوی کا ہے منطق پر کئی کتابیں لکھیں۔ شتھرماتی نے جو پانچویں صدی عیسوی کے آخری اور چھٹی صدی کے ابتدائی دور میں بقیدحیات تھا کئی سنسکرت کی کتابوں کا تبتی زبان میں ترجمہ کیا۔ دھرماپال نے ساتویں صدی کے ابتدائی حصہ میں صرف۔ منطق۔ اور مابعدالطبیعیات پر کئی رسالے لکھے۔

یہ جامعہ سلادتیا کی سرپرستی میں عروج کو پہونچی لیکن اس کی وفات کے بعد اس کا زوال شروع ہوا اور وہ جوں توں نویں صدی کے آخر تک چلتی رہی۔

اودانتاپوری جامعہ نالندہ کے زوال کے زمانہ میں ایک اور خانقاہی کلیہ اودانتاپوری میں گوپال یا لوکاپال نے جو کہا جاتا ہے کہ ۷۳۰ء عیسوی میں بنگال کے تخت پر بیٹھا تھا قائم کیا۔ اس میں برہمنی اور بدھ کتابوں کا ایک نہایت ہی عمدہ کتب خانہ تھا۔ اس جامعہ کو ۱۱۹۷ء میں زوال ہوا۔

وکرماسلا بنگال کے راجہ گوپال کے لڑکے دھرماپال نے آٹھویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں وکرماسلا (بہار) میں ایک اور خانقاہ تعمیر کرائی۔ اس خانقاہ اور نالندہ کی جامعہ کے درمیان بہت دنوں تک علمی تعلقات قائم رہے۔ یہ خانقاہ ایک عرصہ دراز تک تنتری بدھ مت کا شہرۂ آفاق مرکز رہی ہے۔ جہاں دور دراز مقامات سے علم کے خواہاں آیا کرتے تھے۔

نالندہ کی طرح وکرماسلا کی خانقاہ میں ایک جامعہ تھی اور اُس میں چھ کلیئے تھے یہ کلیئے راجہ بہایا پال کے زمانہ حکومت میں چھ دوارا پنڈتوں کی نگرانی میں رکھے گئے تھے ان میں سے چار کلیئوں کی عمارتیں خانقاہ کے چار طرف استادہ تھیں اور ان میں ہر کس و ناکس مفت تعلیم حاصل کرسکتا تھا۔ درمیانی عمارت جو دارالسائنس کے نام سے موسوم تھی مُنیوں کے استعمال میں تھی جہاں پر وہ پراگناپرامیتا تحریروں کا مطالعہ کرتے تھے وسطی کلیہ میں جو دو پنڈت الہٰیات کا سبق دیتے تھے ستون کلیئے کہلائے جاتے تھے یہاں کے مقیم طلبا کو خانقاہ سے مفت خوراک ملتی تھی۔ اقامت خانوں کے

مصارف ملک کے راجہ اور امرا برداشت کرتے تھے۔

یہ جامعہ چار سو سال تک علم کی روشنی پھیلاتی رہی، ہندو راج کے زوال کے ساتھ اس کا بھی زوال شروع ہوا۔

ان مشہور جامعات کے علاوہ ہندو اور بدھ مندرون سے ملحقہ کئی مدارس تھے جو ملک کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوے تھے۔ ضلع بیجاپور میں سالوگٹی دسویں اور گیارویں صدی عیسوی میں مشہور علمی مرکز تھا۔ غالباً اس میں صرف ویدوں کی تعلیم ہوئی تھی اور یہ ترائی پروشا کے مندر سے ملحقہ تھا، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں طلبار کے لئے کئی بڑے ایوان تھے۔

جنوبی ارکاٹ میں انیناری رام کا مدرسہ گیارھویں صدی کی ابتدا میں عروج پر تھا۔ تیرہ اتالیق کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ مضامین میں چاروں وید میماسا اور ویدانتا فلسفہ اور قواعد شامل تھے

تروملکوڈل تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے تقریباً انیناری رام ہی کے زمانہ میں سرسبز ہوا کلیہ کے علاوہ مندر سے ملحقہ ایک اقامت خانہ اور ایک شفاخانہ بھی تھا۔ یہ چنگل پیٹھ ضلع میں واقع تھا۔

Tiruvoyrruyur کا مدرسہ بھی چنگل پیٹھ ضلع میں واقع تھا۔ یہ تیرھویں اور چودھویں صدی میں پھلا پھولا۔ یہ خاص طور پر قواعد کی تعلیم کے لئے وقف تھا۔ اور شیو مندر سے ملحقہ ایک بڑے ایوان میں واقع تھا۔

گنٹور ضلع میں مالکاپورم تیرھویں صدی کے وسط میں عروج پر تھا۔ یہاں آٹھ اتالیقوں کے لئے تنخواہیں مقرر تھیں۔ اور تقریباً (۱۵۰) طلبا کے لئے اس میں گنجائش تھی۔ یہاں پر بھی مندر سے ملحقہ نہ صرف یہ مدرسہ تھا بلکہ ایک اقامت خانہ اور شفاخانہ بھی تھا۔

اِن چند کے علاوہ ایسے بہت سے کلیے تھے جو مندروں سے ملحقہ تھے اور وسطی زمانہ میں جنوبی ہند میں سرسبز ہوئے۔ جنوبی ہند میں بہت سے کتبے ملتے ہیں جو تعلیمی مقاصد کے لئے عطیوں کے متعلق اشارہ کرتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک ہر ایک مذہبی مرکز ایک نہ ایک مدرسہ رکھتا تھا جہاں سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔

بنارس دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ہندو مذہب کا مرکز رہا ہے اس لئے

یقینی طور پر وہ ہندو علوم و فنون کا بھی مرکز رہا ہوگا۔ لیکن اس کا حال معلوم نہ ہو سکا۔ بنارس کو ٹکسیلا کے برابر شہرت حاصل نہ تھی۔ لیکن بہت سے پنڈت جو یہاں رہتے تھے اکثر اپنے گھروں میں شاگردوں کو جمع کر لیا کرتے تھے۔ بنارس میں بہت سے مشہور پنڈت اور عالم گذرے ہیں لیکن بنارس میں دماغ سے زیادہ روح کی طرف توجہ کی جاتی تھی اور اس لئے دماغ کی پوری طرح نشو و نما نہ ہوتی تھی۔

ویدی ہندوئیت کی تجدید کے زمانہ میں ہندو تعلیمات کے مرکز قنوج اور بنارس رہے ہیں بنگال کے سین راجاؤں (۱۱۱۹ــ ۱۲۰۰ء) کی سرپرستی میں سنسکرت کی تعلیم متھیلا اور اس کے بعد نوادوپ میں جاری رہی۔ نوادوپ نے قرون وسطیٰ میں بہت بڑے عالم مثلاً رگھوناتھ رگھو نندن اور سری چتیا نیا وغیرہ پیدا کئے۔ یہاں جن مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی وہ یہ ہیں منطق۔ سمرتی (دیوانی اور مذہبی قانون) جوتش۔ صرف و نحو۔ ادب اور تنترا (سنسکرت کی مقدس کتابیں جن میں زیادہ تر سحر و نجات کا ذکر ہے)

آئین اکبری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کے زمانہ تک بھی بنارس ہندو علوم و فنون کا مرکز رہا اور اچھی حالت میں۔

دکن میں۔ بیجا نگر ایک مدت تک (چودھویں صدی عیسوی) علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔ بنارس اور نوادوپ اب بھی ہندو علوم و فنون کے صدر مقام ہیں بنگال اور بہار میں اب بھی قدیم وضع کے مکتب ہیں جہاں سنسکرت اور ہندو علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔

حسن علی

سال سوم

اِنگلستان کا دستورِ حکومت
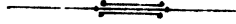
برطانوی دستور کی خصوصیات برطانوی دستور کا مطالعہ اِس لئے سب سے اہم نہیں ہے کہ ہم سیاسی حیثیت سے اُس سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ تمام جدید جمہوری ممالک کے دساتیر اِسی سے ماخوذ ہیں۔ یہ دیگر ممالک کے دساتیر کے برخلاف تحریری یا دستاویزی نہیں ہے بلکہ اسکا ایک بڑا حصہ صدیوں کے رسم و رواج اور روایات پر مبنی ہے۔ یہ کسی "مجلس دستور ساز" کی کاوشوں سے ظہور پذیر نہیں ہوا بلکہ اِرتقاء اور تسلسل اُس کی ہمیشہ سے اِمتیازی خصوصیت رہی ہے۔ اس اِرتقاء کا ایک اہم سبب اِنگلستان کی جغرافیائی علیحدگی ہے جس کی وجہ سے وہ بّرِ اعظم کے دیگر ممالک کی سیاسی تحریکوں سے بہت کم متاثر ہوا ہے۔ اِس کے علاوہ قدیم رومیوں کی طرح اعتدال پسندی انگریزوں کی بھی قومی صفت ہے۔ اِس دستور کی دوسری خصوصیت اس کا لچکدار ہونا ہے۔ یعنی وہاں عام اور دستوری قوانین میں کوئی اِمتیاز نہیں ہوتا۔ پارلیمنٹ جو وہاں کی قانون ساز جماعت ہے بغیر کسی دشواری کے دستور اساسی میں بھی ترمیم و تغیر کر سکتی ہے۔ اُس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ قوم کی اِجتماعی خواہش اور زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ دستور میں آسانی سے مطابقت پیدا کی جا سکتی ہے۔ برطانوی دستور کا ایک اور اہم اُصول جس کی دُنیا کے بہت سے ممالک نے نقل کی ہے یہ ہے کہ یہ عاملہ یا حکومت، نظم و نسق کے علاوہ قانون سازی کی بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کی چوتھی اِمتیازی خصوصیت قانون کی حکومت ہے۔ یعنی وہاں کا ہر باشندہ بلا لحاظ درجہ قانون کا تابع ہوتا ہے۔ ادنیٰ مزدور سے لیکر وزیر اعظم تک ہر شخص پر اپنے ہر غیر قانونی فعل کے لئے

عدالت کے آگے یکساں ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ برطانیہ عظمیٰ میں کوئی شخص اس وقت تک مستوجب سزا نہیں ہوتا جبتک عدالت کے آگے اس کی خلاف ورزی قانون کے متعلق کوئی قطعی ثبوت موجود نہ ہو۔

عَاملہ

برطانوی عاملہ تین اِداروں پر مشتمل ہے:- (۱) بادشاہت (۲) کابینہ اور (۳) سول سروس

بادشاہت۔ برطانوی دستور میں بادشاہ قانوناً تمام عاملانہ اختیارات کا مظہر ہوتا ہے۔ وہ عزّت و وقار اور عدل و انصاف کا سرچشمہ، کلیسا کا صدر، فوج کا کماندار اعلیٰ اور تمام اراضی کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ سب عہدیدار اس کے تابع اور محکوم ہوتے ہیں۔ غیر ممالک سے معاہدات اسی کے نام سے کئے جاتے ہیں۔ نو آبادیات اور مقبوضات کے گورنر اور حاکم اور مختلف ممالک کے سفیر اسی کے نمایندے ہوتے ہیں۔ اُسی کی خواہش پر پارلیمنٹ کا اجتماع یا انفساخ ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین پر اس کی اجازت ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ نظری حیثیت سے بادشاہ کے اقتدار و اختیار کی کوئی تحدید سوائے اس کے نہیں ہے کہ وہ بغیر پارلیمنٹ کی رضامندی کے نہ تو جدید محصول لگا سکتا ہے اور نہ قوانین ہی میں ردوبدل کر سکتا ہے۔ لیکن عملی اعتبار سے بادشاہ یہ تمام وظائف وزیروں کے مشورہ اور ذریعہ سے انجام دیتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قانونی اور سیاسی حیثیت سے بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔

تاج کے اختیارات دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ اختیارات ہیں جو پارلیمنٹ کے قوانین کی رُو سے اُس کو حاصل ہیں۔ اُن کو "منضبطہ اختیارات" کہا جاتا ہے۔ دوسرے روایاتی اختیارات ہیں جو صدیوں کے رسم و رواج کا نتیجہ ہیں۔

انگلستان میں بادشاہ کا اثر و اقتدار بتدریج بڑھ رہا ہے۔ ستر سال قبل "والٹر بیجہٹ" نے تاج کے جو تین حقوق یعنی مشورہ لینے کا حق، ہمت افزائی کا حق اور انتباہ کا حق بیان کئے تھے اُن کو بادشاہ نے نہایت مصلحت اندیشی اور موقع شناسی سے مملکت کی فلاح و صلاح کے لئے استعمال کیا ہے۔ دستوری تعطل کو دور کرنے اور دیگر مسائل مملکت کو سُلجھانے کے لئے بادشاہ نے گذشتہ پچیس تیس سال کے دور میں

بعض نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ مثلاً سنہ ۱۹۱۴ء میں آئرستان کی دو سیاسی پارٹیوں کے درمیان خانہ جنگی ہوجانے کے قوی اِمکانات تھے۔ ایسے نازک وقت میں بادشاہ نے وزراء کی مرضی کے بغیر تمام جماعتوں کی ایک کانفرنس طلب کی جس نے اس تنازعہ کا خاتمہ کر دیا۔

تاج کے اِس بڑھتے ہوئے اَثر کی شہادت نہ صرف برطانوی سرکاری مراسلت سے ملتی ہے بلکہ عصر جدید کے مشاہیر کے سوانح حیات بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ چونکہ اِنگلستان کے وزراء جماعتی قائدین ہوا کرتے ہیں اِس لئے وہ حکومت کی حکمت عملی کو اپنی ہی جماعت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف بادشاہ جماعتی سیاسیات سے بالاتر ہوتا ہے اور کسی جماعت یا فرقہ سے اس کا تعلق نہیں ہوتا۔ اُمور سلطنت اور مسائل حکومت کے بارے میں اس کا زاویہ نگاہ غیر جانبدارانہ ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ اراکین کابینہ کے اِقتدار کی مدت عارضی ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ وزراء کو مقننہ میں جب اکثریت کا اِعتماد حاصل نہیں رہتا وہ مستعفی ہوجاتے ہیں اور اُن کی جگہ ایک نئی کابینہ تشکیل دیجاتی ہے۔ اِس کے برعکس بادشاہ ایک مستقل اور غیر متبدل رکن ہونے کی حیثیت سے کاروبار سلطنت سے زیادہ واقفیت اور وسیع تجربہ رکھتا ہے۔ اِنہی وجوہ کی بنا پر اِنگلستان کے تمام مکاتبِ خیال خواہ وہ قدامت پسند ہوں یا آزاد خیال، سرمایہ دار ہوں یا اشتراکیت پسند۔ سب کے سب بادشاہت کی حمایت میں ہم خیال ہیں۔ حتیٰ کہ حزب العمال کے سب سے زیادہ اشتراکی ارکان بھی بادشاہت کو نظام حکومت کا ایک ضروری جزو تسلیم کرتے ہیں۔

قطع نظر ان سب اُمور کے برطانوی بادشاہ کی ایک اہم خصوصیت جو اس کو دوسرے بادشاہوں سے متمایز کرتی ہے یہ ہے کہ بادشاہ کی ذات ہی سلطنتِ برطانیہ کے مختلف ممالک اور نوآبادیات کو متحد کرتی ہے۔ اِس لئے اس کو "سنہری کڑی" کہا گیا ہے۔ اس کا موجودہ موقف "ہرمن فائنز" کے ان الفاظ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ "بہرحال بحیثیت مجموعی سیاسیات کے پہیئے شاہی مداخلت کے بغیر گردش کرتے ہیں اور تاج جمہوری عمارت کی اعلیٰ ترین زینت و آرائش، ایک ایسا بلند و پُرشکوہ منظر جس کے ساتھ ملکی، ہندوستانی اور نوآبادیاتی باشندے جذبۂ اِطاعت و وفاداری رکھتے ہیں، برطانوی دولت عامہ کی دولتوں کے درمیان ایک دلاویز اور خاندانی کڑی ہے۔"

کابینہ۔ اگر تاج عاملہ کا آرائشی حصہ ہے تو فعال حصہ دو عناصر پر مشتمل ہے۔ ایک عارضی عنصر یعنی

وزارت اور دوسرے مستقل عنصر یعنی سول سروس ان دونوں کی متحدہ شکل کو "حکومت" کی عام اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وزارت اور کابینہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں دونوں ایوانوں کے وہ تمام اراکین شامل ہوتے ہیں جو مختلف سیاسی عہدوں پر وزیر اعظم کی مرضی سے مقرر کئے جاتے ہیں ان کی تعداد عام طور پر ۶۶ ہوتی ہے۔ ان میں کی ایک چھوٹی منتخبہ جماعت جو اجتماعی طور پر حکومت کی حکمت عملی متعین کرتی ہے اور انفرادی طور پر مختلف محکمہ جات کے نظم ونسق کی دیکھ بھال کرتی ہے کابینہ کہلاتی ہے۔ اس کے اراکین کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ گلاڈسٹن اور ڈسرائیلی کے عہد میں اُن کی تعداد چودہ تھی۔ سن ۱۹۲۰ء میں اکیس ہوگئی۔ اس اضافہ کا سبب یہ ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حکومت کے مشاغل میں وسعت ہوتی جارہی ہے۔ کابینہ کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ عاملہ کی تمام ذمہ داریاں اور کل اختیارات اسی میں مرکوز ہوتے ہیں۔ خواہ وہ اختیارات تاج کے ہوں یا دارالعوام کے ان کو بروئے کار لانے کا ذریعہ کابینہ ہی ہے۔ یہاں تک کہ عدالتی حکم بھی اسی کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر ان کا کوئی فیصلہ اس کی مرضی کے خلاف ہو تو وہ پارلیمنٹ کے قانون کے ذریعہ اس کو منسوخ کراسکتی ہے۔ تمام بڑے عہدہ دار جیسے وائسرائے، گورنر، سفیر، قونصل، بیشپ، بری بحری اور ہوائی افواج کے اعلیٰ عہدہ دار، حکام اور مجسٹریٹ ان سب کا تقرر وزیر اعظم یا کابینہ کا کوئی رکن کرتا ہے۔ حکومت کا سارا نظم ونسق جیسے امن وقانون کا قیام، مریضوں کا انتظام، معذوروں کی پرورش، ذرائع نقل وحمل، معدن کوئلہ اور دیگر اہم قومی صنعتوں کی دیکھ بھال، تعلیم، اُجرتوں اور اوقاتِ کار کا تعین، حفظانِ صحت، مختصر یہ کہ وہ تمام چیزیں جو ایک جدید مملکت کی بقا وترقی کے اجزائے لاینفک سمجھی جاتی ہیں کابینہ ہی کے دائرہ اختیار میں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ سپاہیوں کی تنظیم وتربیت، ملک کی خارجی حکمت عملی اور پالیسی بالکلیہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ غیر ممالک سے سیاسی یا معاشی معاہدات اسی کے ذریعہ طے پاتے ہیں۔ اگرچہ پارلیمنٹ کا کام قانون سازی سمجھا جاتا ہے مگر عملی اعتبار سے کسی پرائیوٹ رکن کو قوانین کے پیش کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اور حکومت ہی اہم قوانین کے مسودات تیار کرنے اور پارلیمنٹ کی منظوری کے لئے پیش کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ خزانہ کی کنجیاں دارالعوام کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ لیکن محاصل کے ذرائع تجویز کرنا اور ان کا خرچ سے توازن قائم رکھنا کابینہ ہی کا کام ہے۔

بادشاہ وزارتِ عظمیٰ پر ایک ایسے شخص کا تقرر کرتا ہے جو دارالعوام کی اکثریتی جماعت کا لیڈر ہوتا ہے۔ اپنی جماعت کے ذی اثر ارباب کے مشورہ کے بعد وزیر اعظم کابینہ کے دیگر ارکان کا انتخاب کرتا ہے

جو پارلیمنٹ کے بھی رکن ہوتے ہیں۔ اسی لئے وزیر اعظم کو "جہاز مملکت کا ناخدا" کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک حد معینہ کے اندر وہ وزراء کی تعداد میں بھی کمی یا بیشی کر سکتا ہے۔

برطانوی کابینہ کی ایک اور نمایاں خصوصیت وزراء کی متحدہ ذمہ داری ہے یعنی اگرچہ وزراء انفرادی طور پر اپنے محکمہ جات کے نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے ہیں مگر اجتماعی طور پر ان کی عام پالیسی میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ "کابینہ ایک وحدت ہے بادشاہ کے نزدیک بھی اور مجلس قانون ساز کے نزدیک بھی۔ اس کے خیالات بادشاہ اور پارلیمنٹ دونوں کے سامنے اس طرح پیش کئے جاتے ہیں گویا وہ ایک ہی آدمی کے خیالات ہیں۔" اس کا سبب یہ ہے کہ کابینہ ہم آہنگ ہوتی ہے یعنی اس کے سب ارکان عموماً ایک ہی مکتب خیال سے تعلق رکھتے ہیں اس کو "متحدہ حکومت" HOMOGENEOUS GOVT. کا نام دیا گیا ہے۔ البتہ غیر معمولی حالات میں وزراء مختلف مکاتب خیال کے نمایندے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کو مخلوط حکومت COALITION GOVERNMENT کہا جاتا ہے۔ کابینہ کے فیصلے زیادہ تر وزیر اعظم کے خیالات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر وزراء کی اکثریت وزیر اعظم کی رائے سے اختلاف کرے تو وہ مستعفی ہو جانے کی دھمکی دے سکتا ہے۔ کابینہ کے جلسوں کی صدارت بادشاہ نہیں کرتا بلکہ اس کا صدر وزیر اعظم ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً بادشاہ کو کابینہ کے فیصلوں سے مطلع کرتا ہے۔ اس طرح برطانوی وزیر اعظم یورپ کے بہت سے آئینی بادشاہوں سے بڑھکر اختیارات رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کا اقتدار جبتک پارلیمنٹ میں اس کو اکثریت کا اعتماد حاصل ہے ممالک متحدہ امریکہ کے صدر سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

قانون کی نظر میں کابینہ کی کوئی مسلم حیثیت نہیں ہے بلکہ اس کا وجود ملک کے سیاسی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ قانون کے نزدیک وزیر اعظم اولین امیر خزانہ FIRST LORD OF THE TREASARY ہے۔ کابینہ کے جلسوں کی روئداد کو شائع نہیں کیا جاتا۔ ۱۹۱۶ء عیسوی تک اس کی کارروائیاں صیغہ راز میں ہوتی تھیں۔ اس سال اس کو سرکاری جماعت تسلیم کیا گیا۔ اور متعلقہ محکموں کو کابینہ کے فیصلوں کی اطلاع دینے کے لئے ایک معتمدی کا قیام عمل میں آیا۔

برطانوی کابینہ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ کاروبار کی کثرت اور مشاغل کی وسعت کی وجہ سے وہ مختلف محکمہ جات کے نظم و نسق کی اچھی طرح نگرانی نہیں کر سکتی۔ عصر جدید میں مملکت کے مسائل اس قدر دشوار اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ کابینہ تفصیلات کا مطالعہ کئے بغیر اپنے ماتحتین کی تجاویز کو منظور کر لیتی ہے۔ اس

خرابی کو دور کرنے کے لئے یہ تجویز کی گئی ہے کہ کابینہ کی رکنیت کو دس یا بارہ ارکان تک محدود کر دیا جائے اور سارے اختیارات قانون سازی کو مقننہ پھر اپنے ہاتھ میں لیلے۔ بہرحال یہ صرف ایک تجویز ہی ہے اور چونکہ پچیس تیس سال سے انگلستان ایک نازک دور سے گذر رہا ہے اس لئے اس کو روبہ عمل لانے کے لئے کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی جاسکی۔

سول سروس چونکہ وزراء جماعتی قائدین ہوا کرتے ہیں اور اُن کے اقتدار کا انحصار پارلیمنٹ کی اکثریت پر ہوتا ہے اس لئے ان کی حکومت مستقل اور پائدار نہیں ہوتی اور مملکت کے پیچ در پیچ مسائل پر اُن کو اچھی طرح عبور حاصل نہیں ہوتا لیکن ایک وزیر کا کام صرف اپنے محکمہ کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے اور باقی سب خدمات ماہرین کے ایک مستقل ادارہ کے ذریعہ تکمیل پاتے ہیں جن کو سول سروس کہا جاتا ہے۔ ہر جدید اور متمدن ملک میں سول سروس کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور اس کے ارکان کی تعداد اور ان کے مشاغل میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ موجودہ دور میں بہت سی ایسی چیزیں حکومت کے فرائض میں داخل ہو گئی ہیں جو پچھلے زمانہ میں اس کے احاطے سے باہر سمجھی جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ جمہوری ممالک میں بھی اُس کا اقتدار روز بروز بڑھ رہا ہے۔

مستقل سول سروس کو قائم ہوئے تقریباً اَسّی سال گزرے۔ اس کے پہلے وزارت کے ساتھ ساتھ عہدہ دار بھی تبدیل ہوتے تھے۔ ۱۸۳۰ء عیسوی کے بعد سے اُس میں بتدریج تغیر رونما ہونے لگا اور سول سروس بھی ایک مستقل ادارہ بن گیا۔ مسابقتی امتحانوں کا طریقہ ۱۸۵۵ء عیسوی سے رائج ہوا جس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اہم اور بڑے عہدوں پر جامعات کے بہترین طلبہ کا تقرر ہونے لگا اور کارکردگی اور فنی مہارت کے حصول کے علاوہ حکومت کے مشاغل بھی بڑھنے لگے۔ ان امتحانوں سے کسی مخصوص شعبۂ علم کی آزمائش مقصود نہیں ہوتی بلکہ اُن میں عام معلومات اور ذہانت کو اس اُصول پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص میں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ذہانت بھی پائی جاتی ہو تو اُس میں اچھے مدبر بننے کی صلاحیت موجود رہتی ہے۔ سول سروس کے اعلیٰ مدارج میں صرف وہی لوگ لیئے جاتے ہیں جو غیر معمولی قابلیت کے حامل ہوں۔ سول سروس کے عہدہ دار جماعت بندیوں اور سیاسی رقابتوں سے بالکل علیٰحدہ رہتے ہیں۔ خواہ کوئی جماعت برسرِ اقتدار ہو اس کے ساتھ تعاون کرنا اُن کا فرض ہوتا ہے۔ اگر کوئی عہدہ دار عملی سیاسیات میں حصہ لینا چاہے تو پہلے اس کو اپنے عہدہ سے علیٰحدہ ہو جانا پڑتا ہے۔

نظری اعتبار سے سولین وزراء کے تابع ہوتے ہیں مگر عملی طور پر اپنی فنی مہارت وسیع تجربہ اور مستقل حیثیت کی وجہ سے وہ نظم و نسق کے سب سے موثر اور اہم عنصر بن گئے ہیں اُن کا کام وزیر متعلقہ کے احکام کی تعمیل سمجھا جاتا ہے لیکن آخر الذکر کو اپنے محکمہ کے پیچیدہ اُمور کا کما حقہٗ علم نہیں ہوتا۔ اس کا وقت زیادہ تر کابینہ اور پارلیمنٹ کے جلسوں اور معاشرتی مصروفیات میں گذرتا ہے۔ اِن حالات میں مستقل عہدہ داروں کی اعانت کے بغیر اِنتظام مملکت کے سینکڑوں اُلجھے ہوئے مسائل کو ایک فوق البشر ہی سلجھا سکتا ہے۔ اِس واسطے ایک وزیر کے لئے اپنے ماتحتین کے خیالات کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا پارلیمنٹ میں اس سے جو سوالات کیئے جاتے ہیں اُن کے جوابات محکمۂ متعلقہ ہی فراہم کرتا ہے۔ اُس کی تقاریر زیادہ تر دفتر ہی کے مہیا کئے ہوئے مواد پر مبنی ہوتی ہیں حتیٰ کہ قانون سازی میں بھی سول سروس کے عہدہ داروں کا کچھ کم اثر نہیں ہوتا۔ پارلیمنٹ کے جدید قوانین صرف عام اُصول کی نشاندہی کر دیتے ہیں اور تفصیلات کو متعلقہ محکموں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اِس لئے بعض مصنفین نے سول سروس کے اُن وسیع اِختیارات کو (BUREACRATIC GOVT.) یعنی دفتری حکومت سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اگر وزراء وقتاً فوقتاً سول سروس کی نگرانی اور اُس کے اِقتدار کی تحدید کرتے رہیں تو یہ نقص بڑی حد تک دور ہو جا سکتا ہے۔

عباس جعفری

ایم۔ اے۔ اِبتدائی

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

جراٴت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے

اے مرد خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

پریم چند اور اُن کے افسانے

مرزا رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب ہندوستان میں افسانہ نویسی کے شوق کو پھیلانے کا باعث ہوا۔ اُس کے بعد سرشار کے افسانے بھی عوام کے سامنے آئے اور اُن پر تحسین کے پھول نچھاور کئے گئے۔ سرشار کے افسانوں میں زیادہ تر لکھنؤ کے زوال پذیر تمدن کا رنگین خاکہ تھا اور ہر طبقے کی خاطر خواہ ترجمانی کی گئی تھی۔ غرض اُس زمانے کا کچھ رنگ ہی ایسا تھا۔ اُس کے بعد ادیب اور ناظرین عشق و محبت کی رنگین وادیوں میں بھٹکنے لگے تھے۔ اور ایسے افسانوں کی چمک دمک جنکی محض تخیل کی کارفرمائی سے تشکیل ہوئی تھی اور جن میں زندگی کے اسرار کا کہیں انکشاف نہ تھا آہستہ آہستہ ماند پڑ رہی تھی۔ لوگوں میں اب یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ایسے لایعنی قصّے کہانیوں کو ترک کر کے حقائق زندگی کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ مگر ایسی راہ جس پر مدتوں سے اہل قلم چلتے آئے تھے اُس کو چھوڑ کر کسی نئے راستے پر چلنا ایک اولوالعزم شخص ہی کا کام ہو سکتا تھا۔

منشی پریم چند کی بدولت اردو افسانوی ادب میں ایک انقلاب واقع ہوا۔ پریم چند نے مختصر افسانوں کا سنگ بنیاد رکھا اور اس پر چابکدست فن کاری کی مدد سے ایسی خوبصورت عمارت تعمیر کی کہ افسانوی ادب کی ہر دل عزیزی دن دونی رات چوگنی بڑھتی ہی گئی۔ اُن کی سعی پیہم سے نہ صرف اُردو ادب کو فائدہ پہنچا بلکہ ہندی ادب کا خزانہ بھی گوہر نایاب سے معمور ہو گیا۔ اُردو افسانہ نویسوں میں انکو ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے اور ہندی میں بھی اُنہیں " اپنیاس سمراٹ " یعنی " افسانہ نگاری کا بادشاہ خیال کیا جاتا ہے۔ اُن کی اس غیر معمولی مقبولیت کا راز اس نئی طرز میں مضمر تھا جسکو اُنہوں نے افسانہ نگاری کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ خیال آرائی، رنگینی اور لفظی صناعی کو انہوں نے بالکل غیر ضروری سمجھا اور ایک دلکش سادگی سے اپنی تحریروں کی آرائش و زیبائش کی۔ حقیقتاً یہی سادگی تھی جو انسانی جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کر سکتی تھی۔

پریم چند نے مغربی طرز پر مختصر افسانہ نویسی کی ابتدا کی اور اپنے قلم سے دیو اور پری کی بھیانک

اور خوبصورت تصویریں کھینچنے کی بجائے ہماری معاشرت کے اصلی مرقع پیش کئے ۔ مشرق و مغرب کے تمدنوں کے غیر فطری امتزاج سے جو نقصان رساں اثرات ہمارے ماحول پر پڑ رہے ہیں اُن کو واضح کرنیکی کوشش کی اور چاہا کہ معاشرت کے تاریک پہلوؤں کو تنقید کی روشنی سے منور کر دیں۔ انہوں نے اس اصلاحی کام کو تعصب کی آلائشوں سے پاک رکھا۔ پریم چند جانتے تھے کہ قوم کا مرض پند و نصائح کی تلخیوں کو برداشت نہ کر سکے گا ۔ اس لئے اس کو دور کرنیکے لئے انھوں نے ایسی دوا تجویز کی جو شیریں بھی تھی اور زود اثر بھی وہ نفسیات کے ماہر تھے اور " خوب جانتے تھے کہ کامیابی کا راستہ فطرت کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے اور اس رستے تک پہنچنے کے لئے فطرت پر قابو حاصل کرنیکی ضرورت ہے ۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ فطرت کی آزادی کے لئے سنگ راہ بھی نہیں بننا چاہتے تھے ۔ چنانچہ انہوں نے وہ راہ اختیار کی جو انسانی فطرت کے اس چھپے ہوئے راستے سے زیادہ قریب تھی ۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ افسانہ فطرت انسانی کا سب سے محبوب دیوتا اور عبرت اور بصیرت پیدا کرنیکا سب سے کارگر آلہ ہے ۔ اسی چیز کو پیش نظر رکھکر انہوں نے اُردو کی ایک فرسودہ صنف کے توسط سے ایک ناقدر ماحول میں رہکر بھی جو کچھ کیا وہ ریاض اُردو کے ایسے سدا بہار پھول ہیں جنھیں امتداد زمانہ کی خزاں کے جھونکے کمھلا نہیں سکتے۔ یہ ایسے نقوش ہیں جن کی آب و تاب . . . . . گزرتے ہوئے وقت اور بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ ماند نہیں پڑ سکتی "۔

پریم چند کے گلشن حیات میں مسرت و شادمانی کی بہاریں بہت کم آئی تھیں۔ اُن کو زندگی کی مشکل ترین اور مہیب گھاٹیوں سے گذرنا پڑا تھا ۔ وہ عسرت و تنگدستی کی دل شکن مجبوریوں سے واقف تھے۔ انکا دل درد آشنا تھا اسی لئے وہ دوسروں کے دُکھ درد کو اچھی طرح محسوس کر سکتے تھے ۔ غریبوں سے اُن کو دلی ہمدردی تھی ۔ غربت کی کالی گھٹائیں ہمیشہ کسانوں کے بھی چاروں طرف گھری رہتی ہیں۔ اسی سے متاثر ہو کر انہوں نے غریبوں اور کسانوں کا اپنے ناولوں اور افسانوں میں تذکرہ کیا ہے ۔ کسان اور سرمایہ دار کا رشتہ ایک دائمی رشتہ ہے ۔ سرمایہ داروں کی استبدادیت اُن کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ احتجاجاً انہوں نے کئی مرتبہ صدائیں بلند کیں ۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ کبھی نہ چاہتے تھے کہ سرمایہ داری کا گھنا دُنا درخت سوکھ جائے کیونکہ اسی کی چھاؤں میں غریب زندگی کے دن گزارتے ہیں۔

پریم چند شہروں کے شور و شغب اور شہریوں کے لہو و لعب سے متنفر ہو کر اکثر دیہات کی

پاکیزہ فضا میں چلے جاتے تھے۔ شہروں میں جہاں قدم قدم پر مکر و فریب کا جال بچھا رہتا ہے، جہاں افترا اور جھوٹ کی گرم بازاری ہوتی ہے، جہاں نفسانیت ہر طرف حکمراں رہتی ہے وہ سکون و اطمینان میسر نہیں ہوتا جو دیہاتیوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اُن میں جو صداقت و محبت کے جذبات ہیں وہ واقعی قابل احترام ہیں۔ غریب جو مغربی تہذیب کی سنہری زنجیروں میں جکڑے ہوئے نہیں ہوتے، جنکی ذہنیتیں احساس کمتری سے مسموم نہیں ہوتیں کیا اس قابل نہیں کہ ہم اُن کی عزت کریں ؟

پریم چند کی شہرت کا باعث اُن کی سیرت نگاری ہے۔ ایسے مقام سے جہاں اکثر مصنفین نے ٹھوکر کھائی تھی پریم چند کامیابی کے ساتھ بے خطر اور بے پروا گزر گئے۔ اُن کے کردار صرف مجسمۂ نیکی یا صرف مجموعۂ بدی نہیں ہوتے بلکہ ایسے افراد ہوتے ہیں جن میں عیب و ہنر دونوں موجود ہوں کیونکہ ہر انسان کی فطرت میں ان دونوں چیزوں کا قدرتی امتزاج ہوتا ہے۔ پریم چند کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ جب کبھی انہوں نے اپنے ناول یا افسانوں میں کسی کردار کو قارئین کے سامنے پیش کیا تو اس کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیوں کو بھی بغیر کسی تذبذب کے بے نقاب کر دیا۔ اسی لئے اُن کے کردار وہی اشخاص ہوتے ہیں جن سے ہم کو روزانہ زندگی میں کئی مرتبہ دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ممکن ہے پریم چند کے ناولوں میں بعض کردار نامکمل رہ گئے ہوں مگر جہاں تک اُن کے افسانوں کا تعلق ہے کردار نگاری بڑی حد تک مکمل ہے

سیرت نگاری کے علاوہ پریم چند کا اچھوتا انداز بیان ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے۔ اُنکے افسانوں کے پلاٹ کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ، انبساط یا اضطراب کے ساتھ آنے والے واقعات کا انتظار کرتا ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں کے دلکش پلاٹ پر طرحدار زبان کی افشاں چھڑک کر ایک ایسا پیکر حسن بنایا جو حقیقتاً ہمیشہ کے لئے سرمایۂ انبساط ہو سکتا ہے۔ مگر سادگی جو پریم چند کی تحریروں میں تھی پامال ترکیبوں اور فرسودہ طرز بیان پر مشتمل نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسی فن کارانہ کوشش جو کسی منظر، کسی واقعہ، یا کسی تاثیر کو اُبھار کر دکھانے کے سلسلہ میں کسی مخصوص طرز تک بلند ہونے کے لئے کیجائے غیر مستحسن قرار نہیں دی جاسکتی۔ وہ تو افسانے کے مقصد کو تقویت ہی پہنچائیگی۔ ایسے الفاظ سے جن میں فن کارانہ مہارت اور سلیقہ مندانہ انتخاب کو دخل ہو اور جن میں جذبات کی رنگا رنگی واضح کی گئی ہو پڑھنے والے کے احساسات میں ایک طوفان سا برپا کرتے ہیں۔ پریم چند اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ موزوں اثر پیدا کرنے کے لئے سادگی ضروری ہے۔ اگر یہ نہیں تو

اثر بھی نہیں۔

اثر کو دیرپا کرنیکے لیئے تصویر کشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض افسانوں میں تو یہ تصویر کشی ہی افسانہ کا پس منظر تعمیر کرتی ہے۔ پریم چند نے بعض بعض جگہ ایسی منظر نگاری کی ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے آگے واقعات کی ایک حقیقی جھلک نظر آجاتی ہے۔ ایک غریب کے گھر کی تصویر ملاحظہ کیجیئے۔

> ..... پڑوس کے گھر سے آگ مانگ لایا۔ پیڑوں کے نیچے سے کچھ سوکھی ٹہنیاں جمع کر رکھی تھیں۔ انھیں سے چولھا جلایا۔ جھونپڑی میں تھوڑی سی روشنی ہوئی۔ بے سروسامانی کا نظارہ کتنا دل شکن تھا۔ نہ کھاٹ، نہ بستر، نہ برتن، نہ بھانڈے۔ ایک گوشے میں مٹی کا ایک گھڑا تھا۔ جسکی عمر کا اندازہ اُسپر جمی ہوئی کائی سے ہو سکتا تھا۔ چولھے کے پاس ایک ہانڈی تھی۔ پُرانا اور سوراخوں سے بھرا ہوا ایک لوہے کا توا۔ ایک چھوٹی کھٹرت اور ایک لوٹا بس یہی اس گھر کی ساری دولت تھی۔ انسانی خواہشات کا کتنا مکمل خلاصہ . . . اس دھندلی سی روشنی میں اس کا لاغر جسم اور اس کے بوسیدہ کپڑے انسانوں کی اس نحبت کا مضحکہ اُڑا رہے تھے جو اُن کو زندگی کے ساتھ فطرتاً ہوا کرتی ہے۔

پریم چند جب غریبوں اور کسانوں کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو خود بھی آنسو بہاتے ہیں اور ہماری آنکھوں سے بھی آنسو بہ نکلتے ہیں لیکن جب خوش حالی کا نقشہ کھینچتے ہیں تو ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ اور جب کبھی وہ کسی سیاہ کار کو اس کی اپنی زندگی کے دہشت ناک جہنم میں تڑپتا ہوا دکھلاتے ہیں تو اس عبرت ناک نظارے سے ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ایسے تاثرات پیدا کرنے میں پریم چند کو بڑی مہارت حاصل تھی۔

منشی صاحب کے افسانے ہوں یا ناول، اصلاحی تجویزوں کا موضوع زیادہ تر ہندو مذہب، ہندو معاشرت اور تہذیب ہوتی ہے۔ مگر وہ مذہب کے معاملہ میں آزاد خیال تھے۔" وہ مذہب کو عبادت اور عبادت گاہ کی چہار دیواری تک محدود نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ رسم و رواج کی پابندی کو بیکار اور پوجا پاٹ کو محض دہرم کا سوانگ سمجھ کر اُن سے علیحدہ رہنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک ایشور بھگتی آدمیوں کی سچائی اور ایمانداری کا نام تھا۔ وہ لوگوں کو اس مذہب کی طرف لیجانا چاہتے تھے جو دنیا کو اپنے دامن میں لے سکے اور جس میں روح کی صفائی کرنے اور قلب کو اطمینان بخشنے کی قوت ہو۔ انسان کی سیوا کرنا اور اپنے ضمیر کی آواز پر

چلنا یہی سب سے بڑا دھرم ہے۔"

بعض لوگوں کو اس پر اعتراض ہے کہ پریم چند نے اکثر دیہاتی محاوروں کو کیوں زبان میں شامل کیا واقعہ یہ ہے کہ پریم چند کا ایک احسان اُردو افسانوں پر یہ بھی ہے کہ انہوں نے ہمارے نچلے طبقے کے ایسے الفاظ و محاورات جو صرف بول چال میں زبانوں پر تھے، ادبی زبان میں داخل کر دیئے۔ ان سے طرزِ ادا میں ایک خاص لچک پیدا ہو گئی۔ اس کے سوا ایک دوسرا عام اعتراض یہ ہے کہ موضوع کی یکسانیت کی وجہ سے ان کے افسانوں کی فضا میں اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے لیکن یہاں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر اس مصنف کی تحریروں میں جو ایک خاص مقصد کے تحت اظہارِ خیال کرتا ہے اس قسم کے اندیشے پیدا ہو جاتے ہیں۔ بڑے سے بڑے افسانہ نگار اس یکسانیت سے بچ نہ سکے لیکن .... اُردو افسانہ نگاروں اور خاص طور پر اصلاحی اور سماجی افسانہ نگاروں میں جتنے ہر دلعزیز پریم چند کے افسانے ہوئے اتنے کسی اور کے نہیں۔ یہ واقعہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ موضوع کی یکسانیت ان کے ہاں اکتاہٹ پیدا کرنے والی فضا نہیں پیدا کرتی۔

شوکت علی خان متعلم سال سوم

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں سے اُلجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

[سین :- بمبئی کے ایک ہوٹل کا کمرہ ۔

کمرہ میں چراغ کی روشنی تو نہیں لیکن چاند کی شعاعیں کھڑکی میں سے اندر آ رہی ہیں۔ یکایک ایک آدمی بھی اسی کھڑکی سے اندر آتا ہے۔ پتلون اور قمیص گرد آلود ہے اور وہ بہت ہی پریشان معلوم ہوتا ہے۔ اچھا خوبصورت جوان ہے۔ جس کی عمر ۲۹ ۔ ۳۰ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے داڑھی اور مونچھ بھی ہیں اور اس کا نام خالد ہے۔ چراغ جلا کر کمرہ کا معائنہ کرتا ہے۔ لیکن جوں ہی باہر سے باتوں کی آواز آتی ہے۔ وہ فوراً چراغ گل کر دیتا ہے۔ کھڑکی کی طرف باہر بھاگنے کے لئے دوڑتا ہے لیکن کچھ سوچکر واپس ہوجاتا ہے اور پلنگ کے نیچے چھپ جاتا ہے]

منیجر - (باہر سے) یہ کمرہ نہیں بیگم صاحبہ، اس میں چلئے ۔

[دروازہ کھلتا ہے اور خورشید بانو ہاتھ میں ایک بیگ لئے داخل ہوتی ہے۔ ساتھ ہی منیجر اور ایک نوکر سامان لئے آتے ہیں۔ خورشید بانو بہت ہی خوبصورت جوان لڑکی ہے۔ روپہلی کور کی سفید ریشمی ساڑی اس کے حسن میں چار چاند لگا رہی ہے ۔]

خورشید بانو - اچھا اب سامان رکھ دو۔ شکریہ ۔

[نوکر باہر جانا چاہتا ہے لیکن منیجر اسے روکتا ہے ۔]

منیجر - ذرا ٹھیرو۔ خورشید بانو! آپ کیا کھائینگی ؟

خورشید بانو - آپ کے پاس کیا چیز تیار مل سکے گی ۔

منیجر - (چراغ روشن کرتے ہوئے) ہر چیز مل سکتی ہے۔ مچھلی - مرغی - انڈے - کباب ۔

پلاؤ وغیرہ۔

خورشید بانو۔ اچھی بات ہے۔ مُرغ۔ روٹی اور کچھ پھل بھیجدو۔

مینیجر ۔ مرغ روٹی اور پھل۔ بہت خوب۔

خورشید بانو۔ ہاں ساتھ ہی چائے بھی بھیجدینا۔

مینیجر ۔ دیکھوں تم کتنی جلد آتے ہو۔ آئیے؟

(کھڑکی کے قریب جاتا ہے اور پردہ چھوڑنا چاہتا ہے)

آپ یہ پردہ چھوڑ لینگی نا۔ صبح میں دھوپ اندر آتی ہے آپ کو تکلیف ہوگی۔

خورشید بانو۔ جی نہیں۔ میں سویرے باہر جانا چاہتی ہون۔

مینیجر ۔ آپ بہت تھکی ہوئی ہیں۔

خورشید بانو۔ ابھی کچھ زیادہ رات نہیں ہوئی سونے کے لئے کافی وقت ہے۔

مینیجر ۔ اچھی بات ہے۔ کیا میں سامان درست کرنے میں آپ کی مدد کرسکتا ہون؟

خورشید۔ شکریہ۔ آپ کو خواہ مخواہ تکلیف تو نہوگی؟

[دونوں ملکر سامان درست کرتے ہیں۔]

مینیجر ۔ (صندوق کھولتے ہوئے) آپ کی ٹرین بڑی دیر میں پہونچی۔

خورشید ۔ ہاں لیٹ ہوگئی۔ راستہ میں پولس نے ٹرین روک کر ساری گاڑی کی تلاشی لی۔

مینیجر ۔ کیوں!

خورشید ۔ وہ ایک غریب مجرم کو تلاش کر رہے تھے۔

مینیجر ۔ کیا وہ انہیں ملا۔

خورشید۔ شکر ہے خدا کا کہ وہ نہیں ملا۔

مینیجر ۔ شکر ہے خدا کا!

خورشید۔ میں مجرموں کو پسند کرتی ہون۔

مینیجر ۔ اگر آپ کی ایک آدہ سے مڈبھیڑ ہوجائے تو یہ پسند وسند سب غائب ہوجائیگی۔ اچھا خورشید بانو کیا میں آپ کا "محبت" فلم والا لباس دیکھ سکتا ہون۔

خورشید۔ معاف کرنا وہ میرے ساتھ نہیں۔ وہ کپڑے اسٹوڈیو ہی میں ہیں۔ فی الحال میرے پاس
بہت ہی سادے سیدھے کپڑے ہیں۔

منیجر ۔ لیکن آپ کے جسم پر وہ بھی نہایت قیمتی معلوم ہوتے ہیں۔

خورشید۔ اگر واقعی یہ بات ہے تو میری محنت ٹھکانے لگی۔ میں نے خود ان کپڑوں کو تیار کیا ہے اور
یہ بہت ہی معمولی ہیں۔

منیجر ۔ معاف کیجئے لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ میری بیوی کے کپڑے اس قدر بہاری اور خوبصورت
کیوں نہیں نظر آتے حالانکہ وہ بھی اپنے ہی ہاتھوں سے تیار کرتی ہے۔

[نوکر کشتی میں کھانا لئے اندر آتا ہے]

منیجر ۔ شاباش میز پر کھانا چن دو۔ خورشید بانو ہمارے ہوٹل کا باورچی بڑے مزے کے کھانے
پکاتا ہے۔

خورشید ۔ تو پھر میں نے اچھا ہوٹل انتخاب کیا۔

نوکر ۔ اس میں کیا شک، کھانے کے سوا آپ دیکھیں گے کہ یہاں کے دوسرے لوگ بھی آپ کی ہر طرح
خاطر داری کریں گے۔

خورشید۔ اچھا اب میں کھانا کھاؤں گی۔ آپ جا سکتے ہیں۔ معاف کیجئے میں نے آپ کو بڑی زحمت دی۔

[کھانا شروع کرتی ہے]

منیجر ۔ (جاتے ہوئے) یہ تو بتا دیجئے کہ کھانا مزے کا ہے یا نہیں۔

خورشید۔ آپ کے باورچی کے کیا کہنے اگر لوکولس کے زمانہ میں ہوتا تو اس کی بڑی قدر کی جاتی۔

منیجر ۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اچھا خدا حافظ۔

[منیجر اور نوکر باہر جاتے ہیں۔]

[تھوڑی دیر بعد خالد پلنگ کے نیچے سے نکل آتا ہے اور ہاتھ میں پستول لئے ہوئے خورشید بانو
کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔]

خالد ۔ (آہستہ سے) مجھے یہ ڈر تھا کہ آپ میری آہٹ سنتے ہی برتن ہاتھ سے چھوڑ دینگی (خورشید
پلٹ کر دیکھتی ہے) گھبرائیے مت۔ میں آپ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاؤنگا۔ لیکن مجھے دروازہ تو

بند کر دینا چاہیئے۔

[دروازہ بند کرتا ہے۔]

خالد - یہ صرف احتیاطی کارروائی ہے۔ کیونکہ ابھی ہم ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ میں اپنا قصہ سناتا ہوں۔ آپ گھبرا تو نہیں رہی ہیں۔

[وہ کھڑکی کا پردہ چھوڑ دیتا ہے]

خورشید - نہیں۔ لیکن۔

خالد - "لیکن" میں جانتا ہوں کہ آپ کا دل ضرورت سے زیادہ دھڑک رہا ہے۔ یہ دھڑکن بہت جلد معتدل ہو جائیگی۔ مگر میں آپ سے بیحد شرمندہ ہوں کہ ابھی تک پستول کو میں نے جیب میں نہیں رکھا۔

[پستول جیب میں رکھ لیتا ہے]

کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟

خورشید۔ میں تمہیں روک نہیں سکتی۔

خالد - یقیناً تم مجھے روک سکتی ہو۔ اگر منع کرو گی تو میں ہرگز نہ بیٹھوں گا۔ میری تربیت اچھی ہوئی ہے۔

[خورشید اس کو غور سے دیکھتی ہے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔]

میں سچ کہہ رہا ہوں۔

خورشید۔ (ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تشریف رکھیئے۔

خالد - شکریہ (کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)۔

خورشید۔ فرمائیے۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟

خالد - معاف کرنا میں یہاں آنیکی وجہ بتانا تو بھول ہی گیا لیکن کیا آپ کو بہت بھوک معلوم ہوتی ہے۔

خورشید۔ بہت تو نہیں۔ کیوں۔

خالد - کیا آپ مجھے کچھ روٹی اور چائے دے سکتی ہیں۔ آج صبح مجھے صرف دو بسکٹ ملے اور دوپہر میں بالکل تھوڑا سا کھانا میسر ہوا دن بھر بھاگتا رہا۔ اب بھوک سے بُرا حال ہے۔

خورشید - تمہیں ایسی زور کی بھوک لگ رہی ہے تو تھوڑا مرغ کیوں نہیں لیتے۔

خالد - شکریہ۔ تم بڑی رحمدل ہو لیکن روٹی اور چائے ہی بہت کافی ہیں۔

[ایک پلیٹ میں روٹی رکھکر اور پیالی جس میں چائے ڈال چکی تھی خالد کو دیتی ہے ۔]

خالد ۔ نہیں نہیں ۔ خورشید میں تمہاری پیالی تو نہ لونگا ۔

خورشید ۔ اس کے علاوہ ایک اور پیالی بھی ہے ۔

خالد ۔ اچھی بات ہے (وہ چائے پیتا ہے) بہت اچھی بنی ہے ۔

خورشید ۔ (تھوڑی دیر کے بعد) فرمایئے ۔

خالد ۔ ہاں میں کیوں دن بھر بھاگتا رہا اور یہاں کیا کر رہا ہون !

(خورشید سر ہلاتی ہے) بالکل صاف بات ہے ۔ میں ناانصافی کا شکار ہون میرے لئے انصاف اکثر عورتوں کی طرح ظالم ثابت ہوا ہے ۔

خورشید ۔ کیا عورتیں ظالم ہوتی ہیں ۔

خالد ۔ ہاں ۔

خورشید ۔ اچھا ۔ یہ تو بتاؤ کہ تم مجرم کس لئے قرار پائے ۔

خالد ۔ مجھ پر قتل کا الزام لگایا گیا ہے ۔

خورشید ۔ قتل !

خالد ۔ لیکن میں بے قصور ہون ۔ کیا تم یقین نہیں کرتیں خورشید ۔

خورشید ۔ یہ تو میں کہہ سکتی ہون کہ تم قاتل معلوم نہیں ہوتے ۔

خالد ۔ پھر تو تم مجھ سے نہ گھبراؤگی ۔

خورشید ۔ ہاں مجھے تم سے کسی قسم کا ڈر محسوس نہیں ہوتا ۔

خالد ۔ اس کے لئے میں تمہارا ممنون ہون ۔ تم بڑی رحمدل ہو ۔ دیکھو خورشید گرفتاری کے بعد اگر میں اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنا چاہون تو لوگ میرے اور دشمن ہو جائینگے اور سمجھینگے کہ میں ان کو بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہون اِس لئے بہتر یہی ہے کہ میں اپنے آپ کو سچ مچ قاتل بتاؤں ۔

خورشید ۔ اس سے کیا ہوگا ۔

خالد ۔ اس سے یہ ہوگا کہ جوری کے اکثر رکن مجھ پر رحم کھائینگے کیونکہ وہ خود بھی ایک طرح سے قاتل ہی

ہوتے ہیں۔

خورشید۔ تمہارا خیال دوسروں کے بارے میں بہت خراب ہے۔

خالد ۔میں یہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں ۔ خیر۔ جانے دو اس بحث کو۔ کوئی دلچسپ تذکرہ چھیڑو۔

خورشید۔ تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ اس لئے تم ہی کہے جاؤ۔

خالد ۔ معاف کیجئے میں اُسے سچ نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ عورت تو مرد کی خوشامدانہ باتوں سے بہت خوش ہوتی ہے۔ لیکن میری سچی کہانی سننے سے پیشتر آپ یہ بتائیے کہ کیا آپ ابھی مجھ سے ڈر رہی ہیں۔

خورشید۔ میں آخر ڈروں کس لئے ؟

خالد ۔ سچ ؟

خورشید۔ ہاں۔ لیکن مرغ تو تم نے کھایا ہی نہیں۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ دن بھر بھاگتے رہے اور کھانے کو صرف دو بسکٹ ملے۔ پھر اب کھاتے کیوں نہیں۔

خالد ۔ تم بڑی اچھی لڑکی ہو خورشید۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ تمہیں "مجرم ہمیشہ پسند آتے ہیں"

خورشید۔ اب ان باتوں کو رہنے بھی دو۔ کیوں مرغ بڑے مزے کا ہے نا۔

خالد ۔ بہت اچھا ہے۔ سنو میرا پورا نام خالد بن احمد ہے۔ ایک زمانہ میں کلکتہ یونیورسٹی میں عربی کا پروفیسر تھا لیکن اب میں سیاست دان اور گھوڑوں کا سوداگر ہوں۔ کل میری عمر ۳۰ برس کی ہوگی۔

خورشید۔ اچھا تو کل آپ کی سالگرہ ہے۔

خالد [ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے] جی ہاں۔ لیکن اَب اس قتل کے بارے میں سنئے۔ مقتول کا نام وحید الدین ہے۔ وہ محمد اصغر اور میں صوبہ کی مجلس کی رکنیت کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ ہم اپنی تقریروں میں ایک دوسرے پر اکثر حملے کرتے تھے۔ وحید الدین یعنے مقتول تو بالکل کھلم کھلا مجھے بُرا بھلا کہتا تھا۔

خورشید۔ وحید الدین کیسے قتل ہوا۔

خالد ۔ یہ مجھے معلوم نہیں۔ کل قریب کے ایک گاؤں میں تقریر کرنے گیا تھا رات مسافر خانہ میں گذاری صبح میں دیکھتا کیا ہوں کہ وحید الدین مرا ہوا برآمدہ میں پڑا ہے۔

خورشید۔ اُف کس قدر خوفناک واقعہ ہے۔

خالد - ہاں۔ کیا پوچھتی ہو وحید کو مرا ہوا دیکھا تو مجھ پر بجلی سی گری اور شہر کے راستہ کی طرف جو نظر پڑی تو دیکھتا کیا ہوں کہ پولیس کے آٹھ دس سپاہی سرپٹ چلے آرہے ہیں میں سمجھا کہ وہ مجھی کو گرفتار کرنے آرہے ہیں اس لئے میں بھاگا اور کسی نہ کسی طرح یہاں پہنچ گیا۔

خورشید۔ میں تمہاری ضرور مدد کرونگی۔

خالد - میں کن الفاظ میں تمہارا شکریہ ادا کروں۔

(کوئی دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے)

خورشید۔ کون ہے؟

نوکر - کیا میں برتن لے جا سکتا ہوں؟

خورشید۔ میں نے ابھی کھانا ختم نہیں کیا۔

نوکر - پھر تو میں باہر ہی ٹھیرتا ہوں۔

خورشید۔ نہیں۔ تمہارے ٹھیرنے کی ضرورت نہیں۔ صبح لے جانا۔

نوکر - بیگم صاحبہ میں مجبور ہوں یہاں رات ہی میں برتن صاف کرنے کا قاعدہ ہے۔

[خالد پھر آہستہ سے پلنگ کے نیچے چھپ جاتا ہے]

نوکر - کیا میں برتن لے جا سکتا ہوں۔

خورشید۔ ہاں جلد لے جاؤ مجھے نیند آرہی ہے۔

(نوکر برتن لے جاتا ہے اور خالد پھر نکل آتا ہے)

خورشید۔ خالد اب ہمیں کچھ کرنا چاہئیے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں ایک نیا روپ بدلنا چاہئیے۔

خالد - ہاں ٹھیک تو ہے۔

خورشید۔ یہ قینچی لو اور اپنی داڑھی اور مونچھ کا صفایا کر ڈالو۔ دیکھو وہاں آئینہ ہے۔ جاؤ۔ جلدی کرو۔

خالد - اچھا تو دیکھو دونوں صفاچٹ ہوگئے۔ میری ہئیت کچھ عجیب سی ہوگئی ہے۔

خورشید۔ یقین مانو تم اب بہت ٹھیک ہوگئے ہو۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ایک سولہ سترہ برس کا لڑکا میرے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

خالد - فارغ البالی چیز ہی ایسی ہے۔

خورشید۔ تم بڑے شریر ہو۔ لیکن دیکھو پھر کسی کی باتوں کی آواز آرہی ہے۔ خدا خیر کرے۔
[دروازہ کھٹ کھٹایا جاتا ہے]
خورشید۔ پھر کون آیا ہے۔ نہیں معلوم یہ لوگ مجھے سونے بھی دینگے یا نہیں (آہستہ سے) تم اپنی جگہ چلے جاؤ خالد۔
مینجر۔ (باہر سے) معاف کرنا خورشید بانو۔ پولیس کے انسپکٹر صاحب تشریف لائے ہیں اور وہ آپکے کمرہ کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ انہیں ایک قاتل کی تلاش ہے۔ جلدی کیجئے۔
خورشید۔ تھوڑی دیر تو ٹھیریئے۔ میں شب خوابی کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔
(آہستہ سے) کیوں خالد اچھی طرح چھپ گئے نا۔
خالد۔ (بہت آہستہ) ہاں ہاں تم اب دروازہ کھول سکتی ہو۔
خورشید۔ (دروازہ کھولتی ہے) آیئے تشریف لایئے۔
انسپکٹر۔ آداب عرض ہے۔ معاف کرنا آپ کو تکلیف ہوئی۔
خورشید۔ فرمایئے آپ کیا چاہتے ہیں۔
انسپکٹر۔ کیا میں آپ کا کمرہ دیکھ سکتا ہوں۔ گو مجھے یقین ہے کہ یہاں کوئی نہ ہوگا۔
خورشید۔ شوق سے آپ ضرور دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو اطمینان دلا سکتی ہوں کہ یہاں کوئی نہیں۔
انسپکٹر۔ پھر تو ٹھیک ہے۔ مگر کیا آپ کو کل کے قتل کا واقعہ معلوم ہے۔
خورشید۔ جی نہیں۔ کیا کل کوئی قتل ہوگیا؟
انسپکٹر۔ ہاں کل رات میں وحید الدین کو خالد نامی شخص نے سیتا نگر کے ڈاک بنگلہ میں قتل کر دیا۔ ہمارے آدمیوں کے پہونچنے تک قاتل وہاں سے بھاگ گیا۔ میں بھی اسی کی تلاش میں یہاں آیا تھا اب میں حاضر ہوتا ہوں۔ آپ کو خواہ مخواہ میں نے تکلیف دی۔
خورشید۔ کوئی بات نہیں۔
انسپکٹر۔ خدا حافظ۔
خورشید۔ خدا حافظ۔

[انسپکٹر باہر جاتا ہے]

خالد ۔ اُف ۔ بال بال بچ گیا ۔ لیکن خورشید میری طرف سے تم پر کوئی آفت نہ آجائے ۔ بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں ۔

خورشید ۔ خدا کے لئے جلدی نہ کرو خالد ۔ بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا ۔

خالد ۔ خورشید تم کتنی اچھی ہو دل چاہتا ہے کہ بس دن رات تمہاری پوجا کیا کروں ۔

خورشید ۔ جناب پجاری صاحب یہ باتیں اب رہنے دیجئے ۔ [دروازہ پر کھٹکا ہوتا ہے] شاید پھر کوئی آیا ہے ۔

خالد ۔ وہی انسپکٹر ہوگا ۔ معلوم ہوتا ہے وہ بھی تم پر ریجھ گیا ۔

اِنسپکٹر ۔ (باہر ہی سے) معاف فرمایئے ۔ غالباً میری چھڑی اندر رہ گئی ۔

خالد ۔ (آہستہ سے) دیکھا تم نے کیسا اچھا بہانہ نکالا ہے ۔

خورشید ۔ مجھے تو یہاں چھڑی نظر نہیں آتی ۔

اِنسپکٹر ۔ آپ کو تکلیف نہ ہو تو میں خود آکر دیکھ لوں ۔

خالد ۔ (آہستہ سے) چھڑی کو نہیں بلکہ تمہیں ایک اور بار دیکھنا چاہتا ہے ۔

خورشید ۔ (آہستہ سے) عجیب آدمی ہے ۔ (دروازہ کھولتی ہے) آیئے دیکھ لیجئے ۔

اِنسپکٹر ۔ معاف کرنا آپ کو بڑی زحمت ہوئی لیکن کیا کروں مجھے چھڑی کی سخت ضرورت ہے ۔ پرسوں ہی انعام میں ملی تھی ۔ کمبخت کہاں رہ گئی نہیں معلوم ۔

خورشید ۔ آپ ایسا کیجئے کل صبح کو پھر یہاں تشریف لایئے میں چھڑی اور قاتل دونوں کو ڈھونڈھ کر رکھتی ہوں ۔

اِنسپکٹر ۔ کیا مجھے کل صبح آنے کا شرف حاصل ہو سکتا ہے ۔

خورشید ۔ ضرور آیئے میں آپ کی دونوں چیزوں کو حفاظت سے رکھونگی ۔

اِنسپکٹر ۔ میں آپ کا بڑا ممنون ہونگا ۔ مگر دیکھئے قاتل کی عمر تیس برس کی ہوگی ۔ رنگ زیادہ گورا نہیں ہے داڑھی موچھ دونوں نہیں ۔

خالد ۔ (ایکدم باہر آجاتا ہے اور حیرت سے) ہائیں کیا کہا ؟ داڑھی موچھ دونوں نہیں ! غلط بالکل غلط ۔

اِنسپکٹر ۔ صحیح بالکل صحیح ! یہ دیکھو تمہاری داڑھی اور مونچھ دونوں صاف ہیں ۔

خالد ۔ مگر تمہیں مجھے دیکھکر نہیں بلکہ مسودہ کو دیکھکر کہنا چاہیئے ۔

انسکپٹر ۔ تو پھر اس کا فیصلہ پرامپٹر صاحب کریں گے ۔

پرامپٹر ۔ ڈاڑھی مونچھ دونوں ہیں ۔

خالد ۔ دیکھا —— بڑے ایکٹر کی نشانی یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنا پارٹ یاد کرتا ہے بلکہ دوسرے کرداروں کا بھی ——

پرامپٹر ۔ خیر تو پھر آگے چلئے ۔

انسپکٹر ۔ اوہ ! ابھی اس کے بعد بھی کچھ ہے ۔ میرے مسودہ میں بس یہیں ختم ہو گیا ۔ میں سمجھا کہ یہ سین یہیں ختم ہوتا ہے ۔

پرامپٹر ۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد کا صفحہ کہیں رہ گیا ۔

انسپکٹر ۔ تو اس میں میرا کیا قصور ہے ۔ اچھا اگر آپ اجازت دیں تو میں فی البدیہہ اس کو ختم کرتا ہوں —— خورشید، پیاری خورشید ! تم قاتل کو کیوں ڈھونڈھنے کی زحمت میں مبتلا ہوتی ہو ۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ میں جو تمہیں مل گیا ہوں مجھ ہی کو گم ہونے نہ دو ۔ ————

خالد ۔ بس بس ۔ واہیات، بے تکا مکالمہ ۔ تم پہلے اپنا پارٹ یاد کرو پھر ہوگا ۔

ریہرسل ————

سید علی عباس

ایم ۔ اے ۔ ابتدائی

ہندوستان پر جاپان کی للچائی ہوئی نظریں

کیا نہر کرا والی اسکیم کو عملی جامہ پہنایا جائیگا

(از)

فوجی نامہ نگار لیورپول

جاپان کا رجحان برطانیہ کے کٹھن وقت سے فائدہ اٹھانے کا ہے تاکہ سارے مشرقی ایشیا پر اس کا تسلط جم جائے گو یہ کوئی نئی بات نہیں لیکن اس سے ایسی فضا پیدا ہو جائیگی جس کا روس اور امریکہ پر بھی اثر پڑنا ضروری ہے جاپان نہ صرف سارے ساحل بحر الکاہل کے بیرونی اثرات اور مقبوضات پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہا ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ بحر ہند پر بھی تجارتی فروغ کی خاطر جاپانی پرچم لہراتا نظر آئے۔

جاپانیوں کا اقدام ہندوستان کے لئے ایک دفاعی مسئلہ ہے کیونکہ مغربی چین کی فتح کے بعد جاپانی تجارت کے لئے برما کی راہ کھل جائیگی تمام ہندوستانیوں میں ضرورت دفاع کا احساس پیدا ہو چکا ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ جرمنی کی فتح مشرقی خطرہ کو اور بھی بڑھا دیگی۔

سنگاپور کے استحکام کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ بحر ہند کی ناکہ بندی کرے اور آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ محض اسی استحکام کی وجہ سے مشرق بعید میں امن قائم رہ سکا۔ اس انتظام کے خلاف جو جاپان کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے کیا گیا ہے۔ جاپانیوں کی ناراضگی کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔

جاپان کا جنگ سے قبل ہی سیام سے دوستانہ تعلقات کی بنیاد ڈالنا ایک لازمی امر تھا کہ وہ سنگاپور کے استحکام کو ایک حد تک بے سود کر دینا چاہتا تھا۔ اس دوستی کی تہہ میں خاکنائے کرا پر

ایک نہر کی تعمیر تھی جس کے امکانات جاپانی انجینروں نے ظاہر کیا تھا۔ اِس نہر کے ذریعہ جاپانی جہاز چین کے جنوبی سمندر سے بالراست خلیج بنگال میں داخل ہو سکینگے۔ تب انہیں سنگاپور پر سے گذرنے کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔

اِس اِسکیم کے متعلق بہت کم سننے میں آیا ہے۔ لیکن اِس میں فرانس کا مفاد بھی مضمر ہے۔ کہ اس سے ہندچین کا ایک قریبی راستہ نکل آئیگا۔ موجودہ حالات کے تحت جبکہ فرانس نازی بھائی چارے میں شریک ہو چکا ہے۔ جس کی وجہ سے جاپان سے اس کے تعلقات زیادہ مستقل ہو چکے ہیں۔ برما کا راستہ نقشے پر اور بھی دلچسپ ہو گیا ہے۔

چند جاپانیوں کا خیال ہے کہ ہندوستان اور وسطی مشرق میں جاپانی سامان، اس نہر کی تعمیر کے بجائے اگر وسط سیام سے گذرتی ہوئی ایک ریل کی پٹری ڈالی جائے تو نسبتاً کم لاگت پر کثیر مقدار میں پہونچایا جا سکیگا۔ خواہ ریل ہو یا نہر بحرِ ہند میں جاپانی بحری دستے کا قیام ایک مستقل خطرہ بن جائیگا۔ کیونکہ تجارتی تسلط کے بعد پرچم کا لہرانا بھی ایک لازمی اَمر ہے۔

ناظم الدین

سال سوم

(ترجمہ از "ہندوستان ٹائمز" مورخہ ۲۳ر جولائی ۱۹۴۰ء)

نقد و نظر

اردو کے قاعدے

بچوں کی نفسی اور جذباتی زندگی اور ان کی اردو تعلیم کی ابتدائی دشواریوں کے مدنظر ایک عرصے سے چند کارآمد اور موزوں قاعدوں کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ ہمیں یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی کہ جامعہ ملیہ دہلی نے اب اس کمی کو ایک حد تک پورا کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔ اس ادارے نے گیارہ کتابوں کا ایک سٹ کافی جستجو کے بعد مرتب کیا ہے۔ جاذب نظر ٹائیٹل اور خوشنما تصاویر کی وجہ سے بچوں کے لئے ایک خاص کشش پیدا ہوگئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سٹ میں مدرس کا قاعدہ اور رہنمائے قاعدہ بھی شریک ہیں جو بیحد مفید ثابت ہونگے۔ اِن قاعدوں کی ترتیب میں بچوں کی تعلیم کے ترقی یافتہ اُصولوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس سٹ میں چند قاعدے ایسے بھی ہیں جو مدراس یا بمبئی جیسے صوبوں کے لئے جہاں اردو کم سمجھی اور بولی جاتی ہے نہایت موزوں ہیں۔ کیونکہ ان میں مقامی ماحول کو خاص طور پر اہمیت دیگئی ہے ہمیں اُمید ہے کہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کو بنظر غائر دیکھیں گے اور جامعہ کی ان کوششوں کو سراہیں گے۔

ترانۂ عشق

جناب حکیم عبدالباسط صاحب عشق کے اردو فارسی کلام کا مجموعہ جناب محمد عبدالباسط صاحب نے مرتب کیا ہے۔ طباعت و کتابت بھی کافی اچھی ہے۔ جناب عشق صاحب کے فارسی کلام میں پختہ رنگ پایا جاتا ہے اور اردو کلام کے مقابلے میں قدرے بلند ہے۔ رباعیات پاکیزہ مذاق سخن کا پتہ دیتی ہیں۔

اِطلاع

نقد و نظر کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے وصول ہونا ضروری ہے کتب معتمد "نظام ادب" کے نام روانہ کئے جانا چاہیئے۔

ہمیں اِس بات کا افسوس ہے کہ ان تمام کتب پر تبصرہ نہیں کیا جاسکا جو کہ وصول ہوئی تھی۔ آئندہ اِشاعت میں تلافی کردی جائے گی۔

روداد بزم اُردو نظام کالج

۱۹۴۰ء ۔ ۱۹۴۱ء کے اکادمی سال کے شروع میں حسب ذیل انتخابات عمل میں آئے۔

صدر بزم ۔ جناب آغا حیدر حسن صاحب پروفیسر اُردو اَدب
نائب صدر ۔ جناب سید منظور الحسن صاحب ہاشمی ۔ متعلم سال چہارم
معتمد ۔ ریاض الحسن ۔ متعلم سال سوم
خازن ۔ جناب محمد ابراہیم صاحب متعلم سال سوم

اراکین کابینہ
جناب محمد جعفر صاحب متعلم سال اول
جناب پرشوتم راج سکسینہ صاحب متعلم سال دوم
جناب عثمان ابوطالب صاحب " " سوم
جناب مرزا بابر بیگ صاحب " " چہارم
عاصمۃ الرحمان صاحبہ " " سوم
کرلا والا صاحبہ " " دوم

بزم اُردو کا افتتاحیہ جلسہ بتاریخ ۱۱ر جولائی ۱۹۴۰ء بصدارت مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو منعقد ہوا۔

ڈاکٹر یوسف حسین صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے "اقبال کا پیام نوجوانانِ وطن کے نام" کے عنوان پر ایک بلیغ، پر مغز اور دلچسپ تقریر کی۔ آپ نے نہایت ہی صاف اور سلجھے ہوئے پیرائے میں بتایا کہ اقبال ایک زبردست مصلح قوم ہے اور نوجوان طبقہ کے لئے بڑا موزون رہبر و ہادی ہے شاعر نے مشرق و مغرب کے فلسفۂ حیات کا عمیق مطالعہ و مشاہدہ کیا اور بالآخر اپنا ایک خاص فلسفۂ حیات

پیش کیا۔ اس حکیم کے نزدیک زندگی حرکت کا نام ہے۔ پیہم کوشش و عمل زندگی کا راز ہے۔ مقرر موصوف نے ایک عام غلط فہمی کو دور کیا اور بتایا کہ اقبال کو صرف مسلمانوں سے منسوب کرنا عین ناسمجھی بلکہ اس کی شخصیت کی بے حرمتی ہوگی وہ ہمارے ملک کے زبردست قوم پرستوں میں ہیں۔

صدارتی تقریر میں مولوی عبدالحق صاحب نے بزم اردو کے طلباء و طالبات سے مطالبہ کیا کہ وہ اُردو کی خدمت کا سچا جوش و جذبہ پیدا کریں اور جہاں تک ہو عملی کام انجام دیں یعنی اُردو ادب میں ٹھوس اور مفید تحریروں کا اضافہ کریں۔

ابتک بزم اردو کے تین معمولی جلسے ہوئے اور حسب ذیل عنوانوں پر مباحثے ہوئے جن میں کالج کے مقررین نے انہماک اور دلچسپی سے حصہ لیا:۔

۱۔ "انسانی ترقی کے لئے جنگ ضروری ہے"

۲۔ عدم تشدد چونکہ قانون فطرت کے خلاف ہے اس لئے قومیں اسے اپنا مسلک نہیں بنا سکتی ہیں"

۳۔ "جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

بزم اُردو کا سہ ماہی تقریری مقابلہ کچھ دن بعد مقرر ہے۔ اُمید ہے کہ کالج کے طلباء و طالبات گرم جوشی سے حصہ لیں گے۔

معتمد بزم اُردو

نور اللغات

مرتبہ مولوی نور الحسن صاحب نیر بی۔ اے۔ ایل۔ ایل بی

ہماری اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مفصل اور مستند لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی شکر ہے کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اس طرف توجہ کی۔ امیر الشعرا حضرت امیر مینائی کے بعد حضرت سید احمد دہلوی نے فرہنگ آصفیہ کے نام سے کئی جلدوں میں ایک لغت لکھا ہے اس کے ایک عرصے کے بعد حضرت نیر کاکوروی نے برسوں کی تلاش و تحقیق کے بعد ایک نہایت ضخیم لغت تیار کیا ہے جو چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اردو زبان کے ایک ایک حرف کے متعلق بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے داد تحقیق دیگئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام ایسے اچھے پیمانے پر ایک فرد واحد سے کیسے انجام پا گیا بعض بعض جگہ ایک ایک لفظ کی تشریح و تحقیق میں کئی کئی صفحے بھرے ہوئے ہیں۔ انداز بیان بہت سادہ لیکن عالمانہ و حکیمانہ غرض لغت کے سلسلے میں اب تک یہ آخری اور مستند کوشش ہے اور حامیان اردو کی قدر دانی کی مستحق۔

دو رائیں

اردو زبان کی لغات میں نور اللغات اپنے طرز کی تنہا لغت ہے جو بالکل جدید اصول پر مرتب کی گئی ہے اور الفاظ کے لحاظ سے بھی غالباً تمام دوسرے لغات سے افضل ہے مرتب نے اسے بیحد محنت اور جانفشانی کے بعد مکمل کیا ہے اس لغت کی اشاعت سے اردو زبان کی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے امید ہے کہ اہل علم و زبان دان حضرات اس کی قدر کما حقہ کریں گے۔ اور مرتب کی محنت کی داد دینگے۔ **زمانہ**

اردو کے تمام مروجہ الفاظ، محاورات، ضرب المثال، دخیل کلمات کا پورا استقصاء کیا گیا ہے۔

دیباچہ میں متروک الاستعمال سے بھی دلچسپ بحث کی گئی ہے اور قواعد کے لحاظ سے الفاظ کی فصاحت پر جس قدر اثر پڑتا ہے اُسے متعدد مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ **نگار**

صدر دفتر۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی

شاخیں۔ ۱؎ جامعہ مسجد دہلی ۲؎ لوہاری دروازہ لاہور۔ ۳؎ امین آباد لکھنؤ ۴؎ پرنسس بلڈنگ جے جے اسپتال بمبئی

مقامی ایجنسی۔ کتاب خانہ عابد شاپ، حیدرآباد دکن

دیگر ایجنسیاں ۱؎ اقبال بکڈپو، پیر بہور، مہندرو، پٹنہ۔ ۲؎ سرحد بک ایجنسی، بازار قصہ خوانی، پشاور۔

(طلباء مدرسہ عالیہ کے مضامین)

مجلسِ انتظامی

جناب سید احمد علی صاحب آدیب (صدر مدرس)

جناب محمد عبد الغنی صاحب (مدرس)

جناب صاحبزادہ اشرف الدین خاں صاحب اشرف (مدرس)

مجلسِ ادارت

مدیر
سید علی محمد خسرو صاحب متعلم سکستھ فارم

شریک مدیر
سید علی نقی صاحب متعلم ففتھ فارم

معتمد
سید ضیاء الحسن صاحب جعفری متعلم سکستھ فارم

منتظم
محمد شمس الدین خانصاحب متعلم ففتھ فارم

خازن
غلام عباس صاحب متعلم سکستھ فارم

اِداریہ

علم وعمل کے کسی شعبے میں مدرسۂ عالیہ دوسرے مدارس سے پیچھے نہیں۔ صرف ایک کمی تھی تو یہ کہ بعض مدارس سے ماہانہ، سہ ماہی، شش ماہی یا سالانہ رسالے شائع ہوتے تھے، لیکن مدرسۂ عالیہ سے اس قسم کا کوئی پرچہ نہ نکلتا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ کمی بھی اب پوری ہوگئی۔ بہت دنوں سے یہ تجویز زیرِ غور تھی، لیکن اَب تک ہم کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے تھے۔ مگر اَب یہ مسئلہ بڑی دقتوں کے بعد حل ہوگیا اور مدرسۂ عالیہ و نظام کالج کا یہ مشترکہ پرچہ "نظام اَدب" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ اوائل ۱۹۳۶ء میں مولوی سید احمد علی صاحب آدیب نے بمشورہ جناب مولوی قادر حسین صاحب ایم۔ اے بار ایٹ لا پرنسپل نظام کالج۔ ایک تحریک پیش کی کہ مدرسۂ عالیہ سے ایک پرچہ جاری کیا جائے جس میں مدرسہ کے طلباء کے مضامین شائع ہوا کریں۔ اِس پرچے کا نام "اَدب عالیہ" تجویز کیا گیا۔ صاحب موصوف نے نہ صرف تجویز ہی پیش کی بلکہ اس کے کامیاب بنانے میں نہایت سرگرمی سے کوشش کی چندے جمع کرنے کا کام بھی شروع کیا گیا لیکن ایک قلیل عرصے میں اِتنے بڑے کام کا انجام پانا نہایت مشکل تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جناب میر حسن صاحب جیسا علم دوست اُستاد ہم کو مل گیا چنانچہ مناسب یہ خیال کیا گیا کہ یہ کام آپ ہی کے سپرد کیا جائے۔ لیکن شومیٔ قسمت سے بہت جلد آپ کا تبادلہ سررشتۂ لاسلکی میں ہوگیا اور اس کے کچھ ہی دن بعد گرمیوں کی تعطیل ہوگئی اور یہ کارروائی چند روز کے لئے ملتوی کردینی پڑی اور ملتوی بھی ہوئی تو ایسی کہ اس کا دوبارہ میدان عمل میں آنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔

مدرسہ کھلنے کے بعد کسی نے اس پر توجہ نہ کی اور اکثر طلباء کا یہ خیال تھا کہ اب پرچے کا شائع ہونا مشکل ہے۔ اور فی الواقعی پرچہ نکلتا بھی کیسے تاوقتیکہ طلباء اس کی اشاعت میں مدد نہ کرتے۔ اس کے باوجود مولوی سید احمد علی صاحب اور مولوی نجابت علی صاحب کی کوششوں نے اس میں نئی جان ڈال دی اور پھر

اِداریہ

علم و عمل کے کسی شعبے میں مدرسہ عالیہ دوسرے مدارس سے پیچھے نہیں۔ صرف ایک کمی تھی تو یہ کہ بعض مدارس سے ماہانہ، سہ ماہی، شش ماہی یا سالانہ رسالے شائع ہوتے تھے، لیکن مدرسہ عالیہ سے اس قسم کا کوئی پرچہ نہ نکلتا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ کمی بھی اب پوری ہوگئی۔ بہت دنوں سے یہ تجویز زیر غور تھی لیکن اب تک ہم کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے تھے۔ مگر اب یہ مسئلہ بڑی دقتوں کے بعد حل ہوگیا اور مدرسہ عالیہ و نظام کالج کا یہ مشترکہ پرچہ "نظام ادب" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ اوائل ۱۹۳۶ء میں مولوی سید احمد علی صاحب آدیب نے بمشورہ جناب مولوی قادر حسین صاحب ایم۔ اے بار ایٹ لاء پرنسپل نظام کالج۔ ایک تحریک پیش کی کہ مدرسہ عالیہ سے ایک پرچہ جاری کیا جائے جس میں مدرسہ کے طلباء کے مضامین شائع ہوا کریں۔ اِس پرچے کا نام "اَدب عالیہ" تجویز کیا گیا۔ صاحب موصوف نے نہ صرف تجویز ہی پیش کی بلکہ اس کے کامیاب بنانے میں نہایت سرگرمی سے کوشش کی چندے جمع کرنے کا کام بھی شروع کیا گیا لیکن ایک قلیل عرصے میں اتنے بڑے کام کا انجام پانا نہایت مشکل تھا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جناب میر حسن صاحب جیسا علم دوست استاد ہم کو مل گیا چنانچہ مناسب یہ خیال کیا گیا [illegible] یہ کام آپ ہی کے سپرد کیا جائے۔ لیکن شومی قسمت سے بہت جلد آپ کا تبادلہ سررشتۂ لاسلکی میں ہو گیا [illegible] کے کچھ ہی دن بعد گرمیوں کی تعطیل ہوگئی اور یہ کارروائی چند روز کے لئے ملتوی کر دینی پڑی اور ملتوی بھی [illegible] اس کا دوبارہ میدان عمل میں آنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔

[illegible] کے بعد کسی نے اس پر توجہ نہ کی اور اکثر طلباء کا یہ خیال تھا کہ اب پرچے کا شائع ہونا [illegible] پرچہ نکلنا ہی کیسے تاوقتیکہ طلباء اس کی اشاعت میں مدد نہ کرتے۔ اس کے باوجود [illegible] نجابت علی صاحب کی کوششوں نے اس میں نئی جان ڈال دی اور پھر

اُسی سرگرمی کے ساتھ کام دوبارہ شروع ہوگیا۔

قاعدہ ہے کہ ہر شخص میں بہت نہیں تو تھوڑا کفایت شعاری کا مادہ ضرور رہتا ہے۔ چنانچہ طلباء نے بھی چندے دینے میں بڑا پس وپیش کیا۔ لیکن موقعے کی مناسبت سے کبھی انہیں سمجھا بجھا کر اور کبھی اس بات کا یقین دلاکر کہ بغیر ان کی دلچسپی کے پرچے کا شائع ہونا ایک دشوار امر ہے انہیں چندہ دینے پر آمادہ کیا گیا جن اصحاب نے اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لیا تھا ان کی کوششوں کی داد دینی چاہیئے، کہ انھوں نے اتنی تکلیف اُٹھاکر بھی ہمت نہ ہاری، اور برابر اپنا فرض ادا کرتے رہے اِسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ چندے کے علاوہ مضامین بھی کافی تعداد میں جمع ہوگئے۔

ایسے وقت میں جبکہ ۹۰ فیصد طلباء چندہ دے چکے تھے، ایک اور مایوس کن اور مشکل مسئلہ ہمارے سامنے آیا۔ وہ یہ کہ سرکاری طور پر ایک ہی مدرسے سے ایک سے زائد پرچوں کے شائع کرنے کی اجازت نہیں اور اس وقت جبکہ نظام کالج سے بجائے خود ایک پرچہ " نظام اَدب " کے نام سے شائع ہوتا ہو" اَدب عالیہ" کی اِشاعت کی کیا صورت ہوسکتی تھی ؟

مجبوری کی حالت میں اس پر غور کرنے کے بعد یہ طے پایا، کہ پرچے کا شائع ہونا دشوار ہے، اور اس حالت میں جبکہ سرکاری اجازت نہیں ہے، کسی طرح سے یہ پرچہ نہیں نکل سکتا۔ جتنی مشکلوں سے یہ اہم مسئلہ حل ہوا تھا، اور جس قدر محنت اس میں لگی تھی وہ سب کی سب اکارت گئی۔ اور وہ چندہ جو بڑی مشکلوں سے جمع کیا گیا تھا، بادل ناخواستہ واپس کردیا گیا۔

طلباء نے جب دیکھا کہ پرچے کی اِشاعت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو ان میں سے اکثر وں کو بڑا افسوس ہوا۔ اور اُن کو تو یقیناً بہت زیادہ ہوا ہوگا، جنہوں نے صرف " اَدب عالیہ " کی خاطر اپنا بہت سا وقت ضائع کر کے مضامین تیار کئے تھے۔ چونکہ بہت سے مضامین تیار تھے اِس لئے تھرڈ فارم، فورتھ فارم اور ففتھ فارم کے طلباء نے بہتر سمجھا کہ اپنی اپنی جماعت سے ایک ایک پرچہ نکالا کریں، اور یہ پرچہ صرف مدرسۂ عالیہ کے دارالمطالعہ میں رکھا جائے۔ ہر جماعت سے ایک ایک لڑکا مدیر منتخب کیا گیا، اور ہر جماعت کے طلباء کے مضامین کو کتاب کی صورت میں علیحدہ علیحدہ جمع کر کے اس کو مجلد کردیا گیا۔ یہ ماہنامے پوری پابندی کے ساتھ مدرسۂ عالیہ کے دارالمطالعہ میں رکھے جانے لگے۔ تھرڈ فارم سے سید محمد خاں صاحب، فورتھ فارم سے افتخار احمد صاحب اور ففتھ فارم سے سید شمس الدین صاحب مدیر قرار پائے۔ تھرڈ فارم کے پرچے کا نام

"اَدب" فورتھ فارم کے پرچے کا نام "نورتن" اور ففتھ فارم کے پرچے کا نام "حقیقت" تجویز کیا گیا۔
مسرت کا مقام ہے کہ طلبا نے اپنے پرچوں کی بہبودی کے لئے پوری کوشش کی، اور برابر مضامین لکھتے رہے۔ اور کیوں نہ لکھتے جبکہ اُنہوں نے اپنی خوشی سے اس کام کو شروع کیا تھا۔ ان مضامین کے پڑھنے سے طلباء کے شوق کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے۔ اور جس نے اِن پرچوں کو دیکھا، پسند کیا۔

میدانِ عمل میں کوئی طالبِ علم اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتا، جب تک وہ اپنے آپ کو اَدب کی خدمت کے لئے وقف نہ کردے۔ اور جو طالبِ علم ہمیشہ اِس میں منہمک رہتا ہے، اس کی نسبت یہ قطعی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ یا تو آگے چل کر یہ قوم کا سچا خادم اور بہی خواہ ہوگا، یا دنیا میں بلند مرتبہ حاصل کرے گا مدرسۂ عالیہ کے طلباء کا اَدب سے یہ لگاؤ، اِنہماک اور اس کی ترقی میں ان کی کوششیں، اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ آگے چل کر اُردو کے سچے خیرخواہ ہوں گے۔

غرض یہ کہ یہ پرچے نہایت کامیاب ثابت ہوئے۔ ان میں مضامین کے علاوہ قصے، لطیفے، تصاویر اور کارٹون بھی ہوتے تھے جو خاصے دلچسپ اور دلخوشکن تھے۔

چند روز پہلے ایک اور خیال یہ پیدا ہوا کہ ایک مدرسے سے دو پرچے تو نہیں نکل سکتے، لیکن پہلی تجویز کے مطابق شائع ہونے والے پرچے "اَدبِ عالیہ" کو نظام کالج سے نکلنے والے پرچے "نظامِ اَدب" میں کیوں نہ ضم کردیا جائے؟ بہت سے طلباء اور اساتذہ نے اس سے اِتفاق کیا۔ چند کمیٹیاں بھی ہوئیں، جن میں اس تجویز کی موافقت کی گئی، اور اراکین سے کہا گیا کہ وہ اس کام کو دوبارہ شروع کردیں، جو "اَدب عالیہ" کی اِشاعت کے سلسلے میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ اب دوبارہ اس کام کی ابتداء ہوئی ہے۔ مضامین تو نہایت آسانی سے جمع ہوسکتے ہیں، کیونکہ طلباء میں خود مضمون نگاری کا ذوق ہے۔ اس پرچے کے مسلسل اور پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف وہی "چندہ" ہے اور اِنشاءاللہ تعالیٰ یہ جھگڑا بھی باقی نہ رہے گا اگر طلباء برابر اپنے پرچے کا خیال رکھیں۔

آخر میں ہم کو مولوی احمد علی صاحب، مولوی نجابت علی صاحب، مولوی میر حسن صاحب، مولوی عبدالغنی صاحب اور مولوی اشرف الدین صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جن کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے یہ پرچہ شائع ہوا، اور مدرسۂ عالیہ کے طلباء کو اس بات کا موقعہ ملا کہ وہ اپنی استعداد میں اِضافہ کریں۔ ساتھ ہی ساتھ ہم کو یقین رکھنا چاہیئے کہ ہمارا یہ پرچہ آئندہ خوب ترقی کریگا۔ بشرطیکہ ہم بذاتِ خود اس کا خیال رکھیں

چونکہ اپنی قابلیت کے بڑھانے کا اس سے بہتر موقعہ ہمارے لئے کوئی نہیں اِس لئے ہم کو چاہیئے کہ اس کی خدمت اپنا فرض سمجھیں اور اس سے ممکنہ فائدہ اُٹھائیں۔

علی محمدؐ خسرو

"مدیر"

آنکھوں میں میری اشک ہیں منہ میں زباں نہیں
مانندِ شمع مجھکو مجالِ بیاں نہیں

کس کو سناؤں درد کہوں کس سے حالِ دل
یہ بے کسی ہے کوئی سرار رازداں نہیں

اے دوست خستہ حالیِ دل کیا بیاں کرون
وہ کونسی زمین ہے جہاں آسماں نہیں

موجوں میں عشق کی ہے مری زندگی کی ناؤ
لنگر نہیں ہے اس کا کوئی بادباں نہیں

بلبل بھی کیا کرے مرے نالوں کی ہمسری
آواز ہے یہ دل کی کچھ آہ و فغاں نہیں

گوشہ ملا ہے سایۂ دیوارِ یار کا
مدفن وہاں بنا ہے جہاں آسماں نہیں

احمد تو بے رُخی سے نہ ہو اس کی ناامید
محنت کسی کی جاتی کبھی رائیگاں نہیں

صاحبزادہ میر احمد علیخاں
سکستھ فارم

Lead, Kindly Light !

رہبری روشنضمیری رہبری

Lead, Kindly Light, amid the encircling gloom	رہبری اے مہرباں روشنضمیری رہبری ہر طرف ظلمت ہی ظلمت اور منزل ہے کڑی
Lead Thou me on !	رہبری روشنضمیری رہبری!
The night is dark, and I am far from home,	رات کا ہے وقت اور تاریکی ہے چھائی ہوئی اپنے گھر سے دور ہوں مشکل بڑی ہے آپڑی
Lead Thou me on !	رہبری روشنضمیری رہبری!
Keep Thou my feet, I do not ask to see	رکھ مجھے ثابت قدم میری تمنا یہ نہیں دور کے منظر کو دیکھوں۔ اِک قدم کافی ہیں
The distant scene one step enough for me	رہبری روشنضمیری رہبری!
I was not ever thus, nor pray'd that Thou	اب جو حالت ہے مری ایسی نہ حالت تھی کبھی رہبری کر تو مری ایسی دعا اب تک نہ کی
Should'st lead me on	رہبری روشنضمیری رہبری!
I loved to choose and see my path, but now	راستہ خود ڈھونڈ لینا بس کی اپنے بات تھی اب مری خواہش دلی ہے کر مری تو رہبری
Lead Thou me on !	رہبری روشنضمیری رہبری!
I loved the garish day, and spite of fears,	زرق برق بھاتا تھا مجھکو جانا جو کچھ میں نے کیا بخش دے پچھلی خطائیں۔ کبر سے مجبور تھا
Pride ruled my will, remember not past years	رہبری روشنضمیری رہبری!
So long Thy power hath blest me, sure it still	آجتک تو میں پلا آغوشِ رحمت میں تری ہے یقین اب بھی کریگی تو ہی میری رہبری
Will lead me on,	رہبری روشنضمیری رہبری!
O'er moor and fen, o'er crag and torrent, till	لق ودق میدان ہے دلدل اِدہر دلدل اُدہر کوہ حائل سیل ہے پر شب گذر جائے مری
The night is gone ,	رہبری روشنضمیری رہبری!
And with the morn those angel faces smile,	صبح لائے مسکراتی صورتیں ہوں جن پہ فدا مدتوں چاہا ہے جنکو گو وہ آنکھوں سے ہیں دور
Which I have loved long since, and lost a while.	رہبری روشنضمیری رہبری!

John Henry, Cardinal Newman

مترجمہ سید احمد علی آدیب

بی۔اے (مدراس)

ہندوستانی کا آغاز اور ارتقا

تعجب تو اس امر کا ہے کہ جو زبان ہم بولتے ۔ سنتے اور سمجھتے ہیں اُسی کے بارے میں ہم کو اتنے کم معلومات حاصل ہیں کہ اس کے آغاز اور ارتقاء پر کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ پہلے تو اس پر کوئی غور وخوص کیا ہی نہیں گیا اور جتنا بھی کیا گیا وہ اس قدر نا کافی ہے کہ ابھی بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے۔

فی الحال جو کچھ بھی مواد ہمارے پیش نظر ہے اس کو چار قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) قدیم تذکرے۔

(۲) فرانسیسی اور انگریزی تصنیفات۔

(۳) عہد متوسط کی تحریریں۔

(۴) عہد حاضر کی تحقیقات۔

تذکروں سے متعلق میں یہ کہونگا کہ یہ کیا اور ان کی تعداد کتنی مگر چونکہ یہ مستند مانے ہی گئے ہیں انہیں اہمیت دینی پڑتی ہے۔ یہ تذکرے اکثر فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں جن میں بعض تذکرون مثلاً تذکرہ میر حسن۔ نکات الشعراء۔ مخزن نکات۔ تذکرہ مصحفی۔ اور گلزار ابراہیم وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ ان میں بھی ایک آدھ جگہ کے سوا، زبان اُردو کے آغاز اور ارتقاء پر تذکرہ نویسوں نے اپنا خیال ظاہر نہیں کیا۔ البتہ انشاء اللہ خاں کی کتاب "دریائے لطافت" کو تھوڑا بہت ہمارے موضوع سے ضرور تعلق ہے۔

ہم گارسان دتاسی کے مرہون منت ہیں کہ اس نے ہماری بڑی مدد کی اور اس کی کتاب "تاریخ اَدبیاتِ ہندوستانی" نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا۔ اس کے علاوہ چند اور اُردو دوست اَصحاب

کے نام ہم بغیر گنوائے نہیں رہ سکتے جن کی اَدبی کوششوں نے ہماری راہیں آسان کر دیں اور وہ گلکرسٹ۔ شکسپیر۔ فیلن۔اور اسٹوارٹ ہیں۔

عہد متوسط کے مواد سے متعلق باغ و بہار کا دیباچہ اور آزاد کی "آبِ حیات" کا مقدمہ ہے اس کے علاوہ سرسید اور ان کے رفقا کی اکثر عبارتیں اور چند مضامین ہیں جن سے ہندوستانی پر روشنی پڑتی ہے۔ اور سب سے آخر میں عہد حاضر کی چند مشہور کتابیں جن سے ہماری رہبری ہوتی ہے وہ "اردو قدیم" "دکن میں اُردو" "پنجاب میں اُردو" "تاریخ اَدب اُردو" (سکسینہ) اور "اُردو شہ پارے ہیں" اِن تمام گتھیوں کے سُلجھانے پر بھی تحقیقات کرنے والا ایک عجیب کشمکش میں پڑجاتا ہے کہ صحت پر کون ہے اور غلطی پر کون؟ اگر ایک کسی بات کا اِقرار کرتا ہے تو دوسرے کو اتفاق نہیں اور تیسرا تو اس کی سختی کے ساتھ مخالفت کرتا ہے لیکن اِتنا ضرور پتہ چلتا اور سب کو اس سے اِتفاق ہے کہ اُردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس سوال کا جواب کہ اس کی ابتداء کہاں ہوئی اور کیونکر ہوئی پھر ہمیں پیچ دار گلیوں میں لیجاتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں عرب کی ایک بڑی جماعت تجارت کی غرض سے ہندوستان آتی ہے اور ساحل مالابار پر رہنا شروع کرتی ہے۔ مدراس کے اکثر مسلمان خاندان اس بات کا اِعتراف کرتے ہیں کہ وہ انہیں عربوں کی اَولاد ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے جو ایک زبان وجود میں آئی تھی وہ اصل میں اُردو کی ماں ہے۔ لیکن یہ خیال کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اس واسطے کہ پہلے عربوں نے ایک ایسے مقام کو اپنا وطن بنایا جہاں دراویدی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ آئی ہوئی قوم نے مہاراشٹر میں قیام کیا تو اس قسم کے میل جول کا نتیجہ ضرور ایک ایسی زبان ہوتی جو عربی اور مہاراشٹری عناصر پر مبنی ہوتی۔ حالانکہ اُردو میں بجائے عربی فارسی کا عنصر زیادہ ہے۔

کچھ عرصہ گذرنے بھی نہیں پاتا کہ عربستان سے ایک جماعت تجارت کی غرض سے ہندوستان آتی ہے اور سندھ کے ساحل کو اپنی سکونت گاہ بناتی ہے لیکن اَب کی مرتبہ اُن کا خیال تجارت کے ساتھ ساتھ اپنے مقبوضات کو وسیع بھی کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ مسلمان سندھ میں عرصہ تک سکونت پذیر رہے۔ یہاں ایک اور زبان وجود میں آئی جس کو اکثر لوگ اُردو کہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی اس وجہ سے ٹھیک نہیں ہے کہ وہ اس زبان کی قدیم شکل تھی جس کو آج سندھی کہا جاتا ہے۔ محمود غزنوی جب پنجاب کو فتح کرکے دسویں عیسوی کے

او اخر میں اس پر قابض ہوگیا تو ایسے وقت میں پنجاب کی حکومت آزاد تھی اور اس کا دار الخلافہ لاہور تھا
اس کے بعد محمد غوری نے دلی فتح ہی نہیں کی بلکہ رہنا سہنا شروع کر دیا اور اس طرح پنجاب دلی کا ایک
صوبہ بن گیا۔ لیکن اس فتح سے پہلے پنجاب میں ایک زبان بن چکی تھی۔ چنانچہ حافظ محمود شیرانی نے اپنی
کتاب " پنجاب میں اُردو" میں یہ بتلانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے کہ اُردو زبان کو بجائے
برج بھاشا قدیم پنجابی سے بہت قریبی تعلق ہے۔ آپ نے دلچسپ اور اہم لسانی پہلوؤں پر بحث
کی ہے۔ جس سے یہ بات پایۂ ثبوت پر پہنچ جاتی ہے کہ اردو اور پنجابی دونوں ایک ہی اُصول کے
تحت لسانی اور نحوی اِرتقاء پاتے رہے۔ ان تمام چیزوں سے ہٹ کر جب ہماری نظر اور چیزوں
پر پڑتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام اور مستند رائے کے مطابق اردو کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے
جب کہ محمد غوری نے ۱۱۹۳ء میں دلی فتح کی۔ اکثر مصنفوں کا یہ خیال ہے کہ اردو زبان فارسی اور ہندی
کے میل جول کا نتیجہ ہے جو دلی میں پیدا ہوئی اور محمد تغلق کے زمانہ تک برابر بولی جاتی تھی۔ چنانچہ اسی
بادشاہ کی فوجوں نے اس کو دکن پہنچایا۔ اور یہی خیال سب سے زیادہ مستند و معتبر ہے۔ اس طرح
ہندوستانی کوئی سو سال کے قریب دلی میں رہنے کے بعد دکن پہنچتی ہے۔ یہ ایک حسنِ اتفاق تھا
کہ جیسی ہی یہ دکن پہونچی سیاسی انقلابات شروع ہوگئے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مقام دوسرے
سے الگ ہوگیا۔ اور اس طرح ہندوستانی۔ گجرات۔ دکن۔ اور دلی میں الگ الگ پرورش پانے لگی۔
دکن پہنچکر ہندوستانی کا کھڑی بولی سے بچا رہنا اس بات کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ شمالی ہند سے جدا ہوتی
رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند اور جنوبی ہند کی زبانوں میں آج تک اختلافات موجود ہیں۔

دکن میں ہندوستانی کا آئے دن ترقی کرنا اور بہت جلد ادبی زبان بن جانا کئی ایک باتوں پر
دلالت کرتا ہے جب ہندوستانی سلطان علاؤالدین خلجی اور خاص کر محمد تغلق کے ساتھ دکن پہنچی تو اس کی
حالت بالکل ابتدائی تھی اور یہ جیسی آئی ویسی ہی دکن کے باشندوں میں رائج ہوگئی۔ یہ باشندے یا تو یہیں
کے رہنے والے تھے یا ایرانی اور عربی مہاجر کی اولاد سے تھے۔ مگر جب بہمنی سلطنت وجود میں آئی
تو دکن چند سیاسی انقلابات کی بنا پر جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں شمال سے جدا ہوگیا اور اس طرح ان دونوں
جگہ کی زبانوں میں فرق پیدا ہونے لگا۔ دلی اور اس کے گرد و نواح میں سب کی ایک ہی بولی تھی۔ لیکن
دکن میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ کہیں آریائی زبان تھی تو کہیں دراوڑی۔ اس طرح دلی میں ہندوستانی

ایک خاص اثر کے تحت ترقی پا رہی تھی اور ہر روز اس کو نئے نئے محاورات۔ الفاظ۔ اور بندشوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ لیکن دکن میں یہ بات نہیں تھی پہلے تو یہاں کے باشندوں کے لئے خود ہندوستانی ایک نئی زبان تھی۔ اور پھر اس کا دکن کی اور زبانوں مثلاً تامل۔ تلنگی۔ ڈراویدی سے کیونکر میل ہو سکتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ اُن زبانوں سے کسی طرح میل نہیں کھا سکی اور جس طرح یہ دکن میں آئی تھی اسی شکل و صورت میں قائم رہی۔ فارسی اور ترکی بولنے والے ممالک سے دکن بہت دور تھا۔ اس کے علاوہ شمالی ہند پر ہمیشہ باہر والوں کے حملے ہوتے ہی رہے۔ قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ہر حکومت کرنے والا خاندان باہر ہی کا تھا۔ اور ہر باہر کے آنے والے کی زبان شمالی ہند کے لئے ایک نئی زبان تھی۔ اس طرح ہر روز ہندوستانی کو نئی نئی زبانوں سے مقابلہ کرنا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی میں بہت سے تغیرات پیدا ہو گئے۔ فارسی کا اثر اس پر زیادہ ہو گیا۔ عربی الفاظ بھی اس میں کثرت سے داخل ہو گئے۔ اس کے خلاف دکنی سلطنتوں کے بانی وہی تھے جو دکن میں ایک مدت سے مقیم تھے۔ حسن گنگو کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ یہ ایک برہمن کا غلام تھا۔ اس کا ہندوستانی سے ناواقف رہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ تیمور کا ہندوستانی سے واقف ہونا۔

شمال کے بالعموم تمام بادشاہ زبان فارسی ہی سے واقف تھے۔ تغلق سے لیکر محمد شاہ تک کسی نے بھی ہندوستانی میں نہ نثر لکھی نہ نظم۔ دکن کے صلح پرور اور علم دوست بادشاہ نہ صرف اساتذہ وقت اور علما کے قدردان تھے بلکہ یہ خود ایک بلند پایہ شاعر اور نثار تھے۔ ان کی زبان بجائے فارسی ہندوستانی تھی ان کے کلام کے اکثر حصے آج کل ابتدائی ہندوستانی کی سند میں پیش کئے جاتے ہیں۔ بادشاہوں کے علاوہ شمالی ہند کے امرا اور علما اُردو میں بولنے اور لکھنے کو عیب سمجھتے تھے۔ جب کبھی ترکستان اور ایران میں قحط سالی ہوتی تو وہاں کے لوگ ٹکڑیوں کی شکل میں چلے آتے اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دلی کے امرا کے دسترخوان کی وسعت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ جہاں کوئی آیا کہ اُنھوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چونکہ دربار وغیرہ میں فارسی کو بہت دخل تھا یہ نو وارد بہت جلد اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دئے جاتے اس طرح ہندوستانی کے ارتقا پر دلی کے درباروں میں کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ لیکن دکن کے علماء اور امرا جن کا ہندوستانی کی ترقی میں بہت بڑا حصہ ہے اور جس کا ذکر ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی کتاب "اردو کی نشو نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" میں کیا ہے۔ یہ اپنے بادشاہِ وقت کو ہندوستانی میں بولتا اور لکھتا دیکھکر خود بھی اُسی

رنگ میں اُتر آئے اور یہاں کے باشندوں کو فیض پہنچانے کی غرض سے ہندوستانی ہی کو اپنی تصنیف وتالیف کا ذریعہ بنایا۔ اسی طرح جب کبھی کوئی باہر کا آدمی دکن میں آجاتا وہ بھی اسی فضا میں جلد رنگ لیا جاتا۔ اس طرح دکن میں ہندوستانی کے ارتقا میں کبھی کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہونے نہیں پائی۔

سیاسی انقلابات سے ہٹ کر جب ادبی فضا پر ہماری نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دلی کے درباروں میں وہی شاعر اور نثار کچھ کام کر جاتے تھے جو فارسی جانتے تھے۔ بڑے بڑے انعامات اور صلے انہی حضرات کو دئے جاتے جو فارسی میں قصیدے کہکر لاتے اور پادشاہ کو فارسی میں قصے اور کہانیاں سُناتے۔ شمال میں ہندو اور مسلمان دربار کے علاوہ جہاں کہیں ملتے جلتے ہندوستانی بولتے جس کی وجہ سے یہاں روزمرہ کی زبان میں ارتقا ہوتا گیا لیکن دکن میں یہ بات اس وجہ سے نہیں ہوسکی کہ یہاں کے ہندؤں کے لئے ہندوستانی ایک بالکل نئی زبان تھی اور باوجود صدیوں کی علمی سرپرستیوں کے مقامی بولیوں سے مختلف تھی۔ اور اتنے عرصہ کے میل جول پر بھی یہاں کے باشندے اس کو اپنی بولیوں میں ضم نہیں کرسکے۔ مغلیہ سلطنت کے آخر زمانے میں جبکہ ہندو اور مسلمان کی زبان ایک ہوگئی تو ہندؤں نے یہ کیا کہ اپنی ادبی زبان برج بھاشا کو ترک کرکے فارسی میں تصنیف وتالیف شروع کی جسکی وجہ سے روزمرہ بہت متاثر ہوا لیکن دکن کے ہندو فارسی میں تصنیف وتالیف کرنا چاہتے تو ان کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔ ویسے ہی ہندوستانی ان کے لئے ایک نئی زبان تھی اب جو وہ فارسی کی طرف آتے تو شائد وہ مثل صادق آتی کہ کوا ہنس کی چال چلنے جاکر اپنی بھی چال بھول گیا اور لگا پھدکنے اس لحاظ سے دکن کا روزمرہ باہر کے اجزاء سے متاثر نہیں ہوسکا۔

اِن تمام اُمور کی بنا پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شمالی ہندوستانی پر کھڑی بولی کا گہرا اثر پڑا جسکی وجہ سے اس کی اصلی شکل وصورت بہت کچھ تبدیل ہوگئی اور جو باقی رہ گئی وہ مسخ شدہ حالت میں ہے۔ مگر دکن میں جس طرح ہندوستانی آئی تھی ویسی ہی صورت میں قائم اور محفوظ رہی۔ چنانچہ اب اگر ہندوستانی کی ابتدائی شکل کسی کو دیکھنا ہے تو وہ ہمارے دیہات کے بسنے والوں کی زبان سنے جن کے سینے اس بیش بہا خزانہ کو اپنے میں محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ اِس طرح ہندوستانی نے جو دلی میں پیدا ہوئی تھی وہ اپنے وطن سے دور بہت دور دکن میں پرورش پائی۔

صاحبزادہ میر اشرف الدین علیخاں (ایم۔ اے۔) عثمانیہ

تاریخ انگلستان میں ملکہ ایلیزابتھ کی اہمیت

جب ہم تواریخ عالم کی ورق گردانی کرتے ہیں تو یہ امر بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ ہر شہنشاہ یا ملکہ نے عہد حکومت میں ایسے کام کئے ہیں جو بعض اوقات تو ملک اور قوم کی بہبودی اور بھلائی کا باعث ہوئے اور کبھی ان کی تباہی اور بربادی کا موجب قرار دیئے گئے ہیں۔

تاریخ انگلستان شروع سے آخر تک بادشاہوں اور عوام کی مسلسل کشمکش کا مرقع ہے۔ جب کبھی بادشاہ کمزور نااہل اور عیش پرست ہوتا تو پارلیمنٹ کو اپنے اقتدار بڑھانے اور بادشاہ کے حقوق کو پامال کرنے کا بہترین موقع حاصل ہوجاتا۔ اس کے برخلاف جب بادشاہ ہوشیار اور حوصلہ مند ہوتا تو پہلے اپنا اقتدار بڑھاتا اور پھر پارلیمنٹ کو ماتحت کرکے جس طرح چاہتا حکومت کرتا۔ اگر رعایا کی بہبودی اور بھلائی کا جذبہ دل میں رہا تو حتی الامکان اُن کی خوشحالی اور ملک میں امن وامان قایم رکھنے کے تدابیر اختیار کرتا۔

تاریخ انگلستان میں ہنری ہشتم کو عزّت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے کیونکہ اس نے اپنے عہد حکومت میں مختلف اہم سیاسی مسائل کو عمدہ پیمانے پر حل کرکے اہل ملک اور بالخصوص عوام کی خدمت کی ہے۔ ہنری نے اپنے بستر مرگ پر یہ اعلان کیا تھا کہ اس کا جانشین اڈورڈ کو بنایا جائے اگر اڈورڈ لاولد انتقال کرجائے تو میری ٹیوڈر کو اُس کا جانشین قرار دیا جائے اس کے بعد اگر ملکہ بھی لاولد مرجائے تو ایلیزابتھ تخت انگلستان کی وارث ہوگی۔

ہنری ہشتم کے انتقال پر اڈورڈ ششم جانشین ہوا اور اس نے ۱۵۴۷ء سے ۱۵۵۳ء تک حکومت کی اس کے بعد ہنری کی وصیت کے مطابق میری ٹیوڈر کو ملکہ انگلستان بنایا گیا جس نے ۱۵۵۳ء

سے ۱۵۵۵ئہ تک حکومت کے کاروبار انجام دیئیے۔

اِس کے بعد انگلستان کی حالت دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھی اور ایسے وقت میں اِنگلستان کو ایک مدبر۔ حوصلہ مند۔ کفایت شعار۔ اِنصاف پسند۔ بہادر۔ عقلمند اور ذہین بادشاہ کی ضرورت تھی جو اپنے اقتدار کو قایم رکھتے ہوئے سرمایہ داروں کی کشمکش۔ آئے دن کی خانہ جنگیوں۔ اہل کلیسا کے غیرمعمولی عروج اور ملک کی بدامنی کو روکتے ہوئے اس کی سیاسی، معاشرتی۔ مذہبی اور فوجی قوت کو فروغ دیکر ملک میں ایسا امن وامان قائم رکھے کہ انگلستان بھی دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ خیال کیا جائے۔ درحقیقت انگلستان اُس وقت ایسے نازک دور سے گذر رہا تھا اور ایسے وقت میں اس کے قدم ذرا بھی ڈگمگاتے تو ہمیشہ کے لئے آزادی کو خیرباد کہنا پڑتا۔ ایسی کٹھن گھڑی اور انتہائی درجہ کے نازک وقت میں ایلیزابتھ ملکہ انگلستان بنائی جاتی ہے۔

ملکہ ایلیزابتھ کو انگلستان کے ان چند حکمرانوں میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے جن کی دانشمندی تدبر۔ فراست۔ اور اہم خدمات کی بدولت انگلستان کو وہ عظیم الشان مرتبہ حاصل ہوا جو تاریخ عالم میں بے مثل ہے۔ ملکہ ایلیزابتھ کے عہد کو بجاطور پر تاریخ انگلستان کا عہد زرین کہا جاتا ہے۔ اس ملکہ نے باوجود عورت ہونے کے اپنے ملک کی ایسی اہم خدمات انجام دی ہیں جن کو اہل انگلستان کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ ملکہ ایلیزابتھ کو انگلستان کے حکمرانوں میں جو زبردست عظمت حاصل ہے وہ ابتک کسی دوسری ملکہ کو نصیب نہیں ہوئی۔

ایسی عظیم المرتبت ملکہ کے عہد میں اِنگلستان نے اس قدر ترقی کی اور اس درجہ قوت اور عظمت حاصل کی جو اس سے پہلے اس کو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ درحقیقت ملکہ ایلیزابتھ کے عہد حکومت کے آخری حصہ میں اِنگلستان تمام دیگر دول یورپ سے زیادہ طاقتور ہوگیا تھا۔ ملکہ ایلیزابتھ ہی کی قابل قدر حکمت عملی کا نتیجہ تھا جو انگلستان نے صنعت وحرفت کے میدان میں بے مثل ترقی کی اور انگریزوں کی وسیع اور شاندار نوآبادیات کا آغاز اسی ملکہ کے مبارک ہاتھوں سے ہوا۔

فرانس کے متعصب اور ناعاقبت اندیش کتھولک حکمرانوں کے مظالم سے تنگ آکر وہاں کے بیشمار پروٹسنٹ صناع انگلستان میں آکر ملکہ ایلیزابتھ کے پُرامن سایۂ عاطفت میں سکونت پذیر ہوگئے ان فرانسیسی دستکاروں اور اہل حرفہ کی امداد سے اِنگلستان کی صنعت وحرفت کو زبردست

فروغ حاصل ہوا۔ اور ان ہی کی کوششوں کی بدولت آیندہ چل کر انگلستان صنعت و حرفت کے میدان میں یورپ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بنگیا۔ بہت سے تجربہ کار اور منچلے انگریز سیاحوں نے بالخصوص سر والٹر رالے (Sir Walter Raleigh) نے نئی دنیا یعنی امریکہ میں انگریزی نوآبادیات کی بنیاد ڈالی رالے نے شمالی امریکہ میں ورجینیا کی مشہور نوآبادی قائم کی جس کا نام ملکہ ایلیزابتھ کے ورجن (ناکتخدا) ہونیکی وجہ سے ورجینا رکھا گیا تھا۔ یہی وہ شاندار اقدامات اور نمایان کارنامے تھے جن کی وجہ سے انگلستان کے نوآبادیات تجارت اور صنعت و حرفت کا سکہ تمام دنیا میں قایم ہوگیا۔ ایلیزابتھ نے بحری مہات اور سمندری قزاقی کی ممکنہ حوصلہ افزائی کی جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ رفتہ رفتہ انگلستان کی بحری قوت ناقابل تسخیر تصور کی جانے لگی۔

ملکہ ایلیزابتھ کی داخلی حکمت عملی بھی اس قدر عاقبت اندیشانہ اور دور رس تھی کہ اس کی وجہ سے انگریزوں میں حرّیت۔ قومیت۔ حب الوطنی اور اتحاد کے قیمتی جذبات نے نہایت تیزی کے ساتھ نشو و نما پائی۔ اس کا بے مثل تدبر۔ اعتدال پسندی اور عدل گستری نے اہل انگلستان کو اس قدر متحد اور طاقتور بنادیا کہ وہ ہر بیرونی حملے کی کامیاب مدافعت کرنے کے قابل بنگیا۔

ملکہ ایلیزابتھ کے عہد حکومت میں متوسط طبقے کو ترقی حاصل کرنے کا زرین موقع حاصل ہوا۔ اور اس کے عہد حکومت کے اختتام تک پارلیمنٹ پر اسی اہم طبقے کا تسلط قائم ہوگیا۔ آیندہ چل کر اسی طبقے کی کوششوں سے پارلیمنٹ کو اقتدار حاصل ہوا۔ اور بادشاہوں کی مضرت رسان مطلق العنانی کا خاتمہ ہوا۔ اگرچہ ملکہ ایلیزابتھ خود مطلق العنانی کی خواہاں تھی اور اپنی حکمتِ عملی کی بدولت اس نے پارلیمنٹ کو زیادہ قوت حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ لیکن پھر بھی عوام الناس میں اس قدر بیداری اور آزاد پسندی ترقی کرگئی تھی کہ ملکہ ایلیزابتھ جیسی ہر دلعزیز ملکہ کو اپنے آخری عہد حکومت میں اجاروں کے معاملے میں پارلیمنٹ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

عہد ایلیزابتھ کے خاتمے کے وقت یہ نظر آرہا تھا کہ انگلستان اور اسکاچستان میں حقیقی اتحاد قائم ہونے والا ہے۔ چنانچہ اپنے بستر مرگ پر اس نے اس تجویز کو منظور کیا کہ اس کے انتقال کے بعد اسکاچستان کے جیمس ششم کو اس کا جانشین بنایا جائے اور اس کی وفات کے بعد اسکاچستان اور انگلستان ایک ہی بادشاہ یعنی جیمس ششم کے ماتحت ہوگئے جو انگلستان کا جیمز اول بنا۔

ایلیزابتھ کی مذہبی حکمت عملی اس قدر کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی کہ چند ذیلی تبدیلیوں کے علاوہ آج تک انگلستان میں وہی کلیسائی نظام قائم ہے۔ جس کو ملکہ ایلیزابتھ نے قائم کیا تھا۔ اس کو بلاشبہ ملکہ کا درخشان ترین کارنامہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اعتدال پسندی کی بدولت اس تباہ کن مذہبی خانہ جنگی کا خاتمہ ہوگیا جس کی وجہ سے اس کے پیش رؤں کے عہد میں انگلستان کو زبردست نقصان پہنچا تھا یعنی ملکہ نے اپنی انتہائی فراست سے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں کی باہمی دشمنی کا استیصال کر دیا۔

ملکہ ایلیزابتھ کے عہد میں جو خوشحالی اور امن وامان کا دور دورہ ہوا اس کی بدولت انگریزی ادب میں زبردست ترقی رونما ہوئی۔ سپنسر۔ مارلو۔ کڈ۔ بنجامن اور شیکسپیر انگریزی ادب کے جو درخشان ستارے ہیں اسی کے عہد سے مشہور ہونا شروع ہوئے۔

مشہور ومعروف قانون غربا (Poor Law) کو ایلیزابتھ ہی نے منظور کیا اس قانون کے ذریعہ ہر قریہ اور شہر میں محتاج خانے قائم کئے گئے جہاں حکومت کی طرف سے غریبوں اور محتاجوں کی دستگیری کی جاتی تھی۔ اور بھیک مانگنے کو جرم قرار دیا گیا تھا۔

مختصر یہ کہ ملکہ ایلیزابتھ کے زرین عہد حکومت میں انگلستان میں زبردست قومی اتحاد قائم ہوا مذہبی مناقشات کا خاتمہ ہوا۔ پروٹسٹنٹ فرقے کو دائمی استحکام حاصل ہوا صنعت وحرفت اور تجارت میں بے نظیر ترقی عمل میں آئی ادب کے شاہکار وجود میں آئے ہسپانیہ کے ناقابل شکست بیڑے (Spanish Armada) کی ناکامی نے انگلستان کی بحری قوت کا سکہ تمام یورپ بلکہ تمام دنیا پر بٹھا دیا۔ امریکہ میں انگریزی نوآبادیات کے قیام نے عالمگیر سیاست میں انگریزوں کو نہایت ممتاز درجہ عطا کر دیا۔ اور یہ کہنا بالکل حقیقت پر مبنی ہے کہ عظیم الشان سلطنت برطانیہ کا سنگ بنیاد ملکہ ایلیزابتھ ہی نے اپنے مبارک ہاتھوں سے رکھا۔

آغا سید ہاشم

سکستھ فارم

شاہِ میداس کی بدنصیبیاں

عہد ماضی کا ذکر ہے کہ جب فرجیا کا بادشاہ فوت ہوا تو تخت نشینی کی بحث پیدا ہوئی کیوں کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ بننے کے لائق نہ تھا۔ اُن کا عقیدہ دیوتاؤں پر تھا اس لئے وہ دیوتاؤں ہی سے امداد طلب کرنے لگے۔ اور ایک دیوتا سے التجا کی جس کو زمانہ مستقبل کا علم ہوا کرتا تھا۔

دیوتا نے بہت دیر تک عبادت کی۔ غیب سے آواز آئی کہ جو پہلا شخص سفید بیلوں والی بنڈی میں بیٹھا شہر میں داخل ہو اس کو تخت نشین کیا جائے۔

لوگ یہ سنتے ہی شہر کے دروازہ کی طرف بھاگے تاکہ اس شخص کو تلاش کریں۔ تھوڑی دیر بعد ایک کسان گاڑی ہانکتا شہر کے دروازہ میں داخل ہوا۔ سبھوں نے اس کو روک کر اپنی تمنا کا اظہار کیا اور اس نے تخت شاہی پر بیٹھنا منظور کر لیا۔

گو گارڈین ایک کسان تھا لیکن بہت ہی عقلمند اور ہوشیار حکمران ثابت ہوا۔ اپنی خوش نصیبی کی شکرگذاری میں اس نے پہلے یہ کام کیا کہ اپنی گاڑی مندر کو لے گیا اور چمڑے کے پٹوں سے جو بیلوں کو باندھنے کے کام آتے تھے اپنی گاڑی قربان گاہ سے باندھ دی۔ اور ایسی مشکل اور عجیب گرہ لگائی کہ اس پٹے کے دونوں سرے نظر نہ آنے لگے۔ ہاتف غیبی سے آواز آئی کہ جو شخص اس عجیب غریب گرہ کو کھول لیگا وہ تمام ایشیا پر حکمران ہوگا۔

بہت سے لوگوں کو اس پیشین گوئی نے گرویدہ کیا لیکن باوجود انتہائی کوششوں کے کسی سے وہ گرہ نہ کھل سکی۔ گارڈین کی وفات کے ایک عرصہ بعد سکندر اعظم نے جو اس ملک کے قریب ہی حکومت کرتا تھا اس عقدہ اور پیشین گوئی کے متعلق سنا اور وہ گرہ دیکھنے کے لئے آیا۔ یہ سمجھ گیا کہ معمولی طریقہ سے وہ گرہ

نہ کھل سکیگی۔ اس لئے اس نے اپنی تلوار کھینچی اور گرہ کاٹ دی۔ اس طرح وہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور سکندر تمام ایشیاء پر حکمران ہوگیا۔ ابتک اس واقعہ کا اثر انگریزی زبان پر اس طرح چھوڑا ہے کہ جب کبھی کوئی مشکل پیش آتی ہے اور حل نہیں ہوسکتی۔ تو ہم کہتے ہیں کہ یہ عقدۂ گارڈین ہے۔ اور جب کوئی شخص ایسی شکل کو حل کرتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس نے عقدۂ گارڈین کو حل کیا۔

گارڈین کا ایک بیٹا میداس نامی تھا۔ جو اپنی باری پر تخت نشین ہوا۔ یہ خاموش اور سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور بہت ذہین نہ تھا۔ اس نے عقدہ کشائی کی کوشش اِس لئے نہ کی کہ وہ ایشیاء کا حکمران ہونا نہیں چاہتا اس کو اس کا علم نہ تھا کہ اس کی خاموش اور بے لوث زندگی میں اِنتشار پیدا ہوگا اور اس کی کارگذاریاں لوگوں میں اس کے بعد کئی صدیوں تک مشہور رہیں گی۔ اس نے اپنا تمام کام وزراء پر چھوڑ رکھا تھا۔

تھوڑا عرصہ گذرا تھا کہ ایک دن چند شاہی چرواہے اپنے کام پر جا رہے تھے کہ اُنھوں نے دیکھا کہ ایک شخص شراب پیا ہوا جنگل میں گشت لگا رہا ہے۔ چرواہوں نے اس کو شاہی محل میں پیش کیا میداس دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ شخص شراب کے دیوتا ڈیونیسس کا پوجاری اور دوست ہے۔ اس کو میداس نے چند دنوں تک اپنا مہمان رکھا اور اس کے بعد ڈیونیسس کے پاس بھجوا دیا۔ جب ڈیونیسس نے اپنے دوست کو دیکھا تو اس کی خوشی کی کوئی اِنتہا نہ رہی اور میداس کو کہلا بھیجا کہ وہ جو چیز مانگے گا یہ عطا کر دے گا۔ میداس بہت کنجوس تھا اور ہمیشہ سونا جمع کرنے کی فکر میں رہتا تھا۔ اس لئے اس نے خواہش کی کہ جس چیز کو وہ چھولے وہ سونے میں تبدیل ہو جائے۔ یہ طاقت میداس کو شراب کے دیوتا نے عطا کر دی۔ چونکہ کئی گھنٹوں سے میداس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ بھوک سے بیتاب تھا۔ صبح کا وقت تھا ناشتہ کرنے کے لئے بیٹھ گیا اور جون ہی پانی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ہونٹوں سے لگایا وہ سونے میں تبدیل ہوگیا۔ جب پانی نہ پی سکا تو ترکاری کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ اسی سے پیٹ بھرے لیکن ترکاری سے ہاتھ کا مس ہونا ہی تھا کہ وہ سونے میں تبدیل ہوگئی۔ میداس بہت خوف زدہ ہوا اور سمجھا کہ وہ بھوک سے مرجائیگا۔ اس نے رُونا شروع کیا۔ اور جب آنسو گالوں پر بہنے لگے تو وہ بھی سونے میں تبدیل ہوگئے۔ آخرکار مایوس ہوکر اپنی پیاری لڑکی کی طرف پلٹا جو اس کے بازو بیٹھی تھی اور اس کو گلے لگا لیا۔ اس کے گلے سے لگنا ہی تھا کہ لڑکی سونے کی ہوگئی اور ایک خوبصورت مورت میں تبدیل ہوگئی۔ میداس رنج و خوف سے گھبرانے لگا۔ جب میداس نے یہ ٹھوکر کھائی تو اپنی حماقت کا احساس ہوا جس کے لئے اس نے دیوتا سے درخواست کی تھی۔ اور فوراً

مندر کو بھاگا اور وہاں جاکر دعا مانگی کہ اس سے یہ قوت چھین لیجائے۔ ڈیونیس نے احمق بادشاہ سے کہا کہ وہ جاکر دریائے پاکٹولس میں نہائے تاکہ اس کا اثر زائل ہوجائے۔ بادشاہ نے اسی طرح کیا۔ اور اس بلا سے نجات حاصل کی۔ چنانچہ آج تک اِس دریا کے پتھر اور ریت سُونے کے ہیں۔

اِس خوفناک تجربہ سے میداس کا دل سونے سے اُچاٹ ہوگیا۔ محلوں میں رہنے سے نفرت ہوگئی اور وہ تھوڑے عرصہ کے لئے صحرانشین ہوگیا۔ وہاں اس کی ملاقات دیوتا پین سے ہوئی۔ یہ فطرت کا دیوتا تھا۔ جس کی بڑی شخصیت تھی۔ اور صحت اور روح سے مملو تھی۔ پین کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ جنگل میں رہے اور پھول اور جانور اس کے اردگرد ہوں اور اسے اپنا دیوتا سمجھیں۔ وہ کھلی بانس جو دریا کے کنارے اُگتی تھی اس سے بانسری بناتا تھا جس کے بجانے میں وہ ماہر تھا۔ درندے اور پرندے کوسوں تک اس کے پیچھے پیچھے راگ سننے کے لئے چلتے تھے۔

میداس اس بڑے اور مہربان دیوتا کا گرویدہ ہوگیا اور اس کے ساتھ رہنے لگا۔ لیکن پھر بھی مصیبت اُس پر آنے والی تھی۔ سب دیوتاؤں میں بہترین موسیقار اپالو تھا۔ کیونکہ وہ صرف شمس کا دیوتا نہ تھا بلکہ راگ کا بھی دیوتا تھا۔ وہ راگ ایسی بجاتا تھا کہ زمین اور آسمان پر کوئی اس کا ہمسر نہ تھا۔ ایک دن جب سب دیوتا ایک جگہ جمع ہوئے اور ان کے سامنے اپالو نے پین کی بانسری کا مضحکہ اُڑایا جس پر وہ اپنے ملک کی راگنی بجایا کرتا تھا۔ پین نے کہا کہ اُس کی بانسری کی راگ اس کے سرود کی راگ کے برابر ہے۔ اور اس نے اپالو سے مقابلہ کرنے کے لئے کہا۔ اس جلسہ کے لئے میداس نے اپنا درباری کمرہ دیا اور جو بازی لے جائے اس کو ایک قیمتی ہار دینے کا وعدہ کیا۔ ان سب دیوتاؤں نے میداس ہی کو اس مقابلہ کا منصف مقرر کیا۔.... مقررہ دن پر لوگوں کا بڑا مجمع ہوا اور مقابلہ دو دیوتاؤں میں تھا۔

پین نے اپنا صحرائی نغمہ الاپا جو پرندوں کی الحان کی طرح سادہ تھا اس کے بعد اپالو نے اپنی ایسی حیرت خیز راگنی سنائی کہ جس کے سننے کے لئے آفتاب بھی سکتہ میں کھڑا ہوگیا اور سب لوگوں کے دلوں کو اس نے گرویدہ کرلیا لیکن میداس حقیقت میں راگ کے متعلق تصفیہ نہ کرسکا کیونکہ وہ موسیقی سے اچھی طرح واقف نہ تھا۔ اور اس نے جیت کا ہار اپنے دوست پین کو دیدیا۔ اسپر جلسہ میں برہمی پیدا ہوگئی اور اپالو کو اس وجہ سے غصہ آیا کہ کسی کے کان کو بھی پین کا راگ خود اس کے راگ کے مقابل میں مسحور نہ کرسکا۔ اس لئے اپالو نے غصہ میں کہا کہ تم نے مثل ایک گدھے کے اِنصاف کیا ہے۔ اس لئے اُب سے تمہارے

کان گدھے کے کانوں کی طرح ہونگے۔ اس کے بعد میداس کے کان گدھے کے کانوں کی طرح اس کے سر میں نکل آئے۔ اور اس نے شرم سے ایک خاص طرح کی ٹوپی اپنے کانوں کو دبایا سے چھپانے کے لئے بنوائی جب حجام اس کے بال کاٹنے کے لئے آیا تو اس سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ اس راز کو کسی پر ظاہر نہ کرے۔ لیکن حجام کے لئے یہ بہت مشکل تھا اور اس کے دل میں یہ آئی کہ کسی نہ کسی سے وہ ضرور کہے گا۔ اس لئے وہ کھیت میں گیا اور وہاں ندی کے کنارے ایک سوراخ بنا کر اس میں اس نے آہستہ سے کہا کہ شاہ میداس کے کان گدھے کے ہیں اور اُس نے سوراخ کو بھر دیا اور اس اطمینان کے ساتھ گھر چلا گیا کہ اس نے اس راز کو بغیر کسی کے واقف ہوئے اپنے دل سے نکال دیا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ دوسرے سال جب اس جگہ سے بانس اُگی اور ہوا میں ہلنے لگی تو اس سے رہ رہ کر یہی آواز نکلتی تھی کہ "شاہ میداس کے کان گدھے کے ہیں"۔ اور اس آواز کو ادھر سے گذرنے والوں نے سنا۔ اس طرح یہ راز سب پر ظاہر ہوگیا اور سب نے بادشاہ کی ہنسی اُڑائی۔

اس طرح میداس کا نام اس کے باپ گارڈین کی طرح ابتک انگریزی زبان میں یاد کیا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص میں کاروبار کا بہت مادہ ہوتا ہے جس سے وہ روپیہ کماتا ہے تو اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں میداس کی قوت لامسہ ہے۔

(ترجمہ) محمد فصاحت علی

جماعت سکستھ فارم مدرسہ عالیہ

فریب خیال

سندر ایک روز شکار کھیلنے نکلا اور راستہ بھول کر جنگل میں گم ہوگیا۔ ہر طرف اس نے نظر دوڑائی مگر راستہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر تھک کر ایک درخت کے سایہ میں ستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ چونکہ

بہت تھکا ماندہ تھا۔ ہری ہری گھاس پر لیٹتے ہی اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

سندر، نہایت حسین اور خوبصورت جوان تھا۔ آزادی اور میا کی اُس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ وہ قدرتی مناظر کا بیحد دلدادہ اور سیر و شکار اس کا خاص شغلہ تھا۔ اس کی طبیعت اپنے ساتھیوں سے بالکل جُدا تھی۔ اگرچہ وہ ایک بڑے جاگیردار کا لخت جگر تھا۔ لیکن رئیسانہ شان و شوکت، محلات کے تکلفات اور مفت خوروں کی خوشامد اور چاپلوسی سے اسے دلی نفرت تھی۔ وہ بالکل آزاد اور سادہ زندگی کا شیدائی تھا۔ امراء کے توہمات اور بزدلانہ حرکات کو مضحکہ خیز نظروں سے دیکھتا اور ہر موقع پر ان کا خوب مذاق اُڑاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دوست، احباب، امراء، جاگیرداروں اور عہدہ داران عظام کے فرزند نہیں بلکہ زیادہ تر غریب طبقے کے افراد تھے۔ جن کے ساتھ وہ نہایت بے تکلفی سے پیش آتا تھا۔ اور ہر طریقے سے ان کی امداد کرتا تھا۔ اپنی جاگیر کے کئی کسانوں کے بچوں کی تعلیم کے اخراجات اسی کی جیب خاص سے پورے ہوا کرتے تھے۔ جاگیر کے تمام بیکس و مظلوم اپنی فریاد لے کر سندر کے پاس پہنچتے اور وہ حتی الامکان ان سے ہمدردی اور دلجوئی کرتا تھا۔

سینیر کیمبرج کامیاب کرنے کے بعد اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا پسند نہیں کیا اپنے والدین اور دیگر بزرگوں کے اصرار کے باوجود بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج میں شریک ہونے کے بجائے وہ زراعتی تعلیم حاصل کرنے پونہ چلا گیا۔ اور وہاں نہایت محنت و جانفشانی کے ساتھ زراعت کی علمی تعلیم مکمل کر کے اپنی جاگیر واپس آیا۔ یہاں آکر رفتہ رفتہ اپنی جاگیر کو جدید زراعتی اصلاحات سے مزین کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔

شادی کے متعلق بھی اس کا خاص نقطۂ نظر تھا۔ اس کے اوصاف حمیدہ کی شہرت دُور دُور پہنچنے کی وجہ سے بڑے بڑے جاگیردار اپنی لڑکیوں کو اس سے منسوب کرنے کی کوشش کرنے لگے طرح طرح سے سندر کو ورغلایا گیا۔ بڑے بڑے سبز باغ دکھائے گئے اس سلسلہ میں کئی حسین و نازک لڑکیاں جو امارت کے تمام فنون لطیفہ میں طاق اور آداب و شائستگی کی نمونہ تھیں، سندر کی نظروں سے گذریں لیکن ان میں سے ایک بھی اپنے تیر نظر سے سندر کے عجیب و غریب دل کو گھائل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ دراصل سندر کی خواہش یہ تھی کہ اس کی رفیق حیات کوئی ایسی دوشیزہ ہو جو اسی کی طرح سے محنت کی عادی ہو اور زراعت کے کام میں اس کا ہاتھ بٹا سکے۔

شیلا ایک دیہاتی لڑکی تھی۔ اس کا باپ ایک معمولی کسان تھا۔ لیکن اپنے بے لوث اور زبردست کردار کی وجہ سے اپنے گاؤں میں خاص عزت کا حامل تھا۔ شیلا کا بچپن نہایت آرام وچین سے بسر ہوا۔ لیکن بہت جلد قدرت نے اس سے یہ خوشیاں چھین لیں۔ اور اس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ بدنصیب شیلا کی ماں بھی بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہوئی اور اس کے بعد اس پُر فریب دنیا کی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ بارہ برس کی معصوم بچی تن تنہا رہ گئی۔ اس کا کوئی شریک غم نہ تھا۔ دن بھر وہ اپنے کھیت میں خون پسینہ ایک کرتی اور رات کو تھکی ماندی اپنی جھونپڑی میں اکیلی پڑ جاتی۔ اگرچہ اس کے والد کا احترام گاؤں والوں کے دلوں میں تازہ تھا۔ لیکن اپنے پیدائشی وہم کی وجہ سے یہ لوگ شیلا سے زیادہ میل جول بڑھانے سے ڈرتے تھے۔ گاؤں کی عورتیں اپنے بچوں کو اس سے ملنے جلنے نہ دیتی تھیں کیونکہ وہ یہ خیال کرتی تھیں کہ یہ لڑکی اپنے ماں باپ کے لئے منحوس ثابت ہوئی ہے۔

موسم بہار کی ایک دلفریب صبح کو مرغ نے حسب معمول بانگ دی۔ شیلا فوراً اپنے خواب شیریں سے بیدار ہو کر گھر کے کام میں مصروف ہوگئی۔ صبح کی سہانی فضا میں شیلا لکڑیاں لانے کے لئے جنگل کی جانب روانہ ہوئی۔ شیلا میں ہمدردی کا جذبہ بدرجہ کمال موجود تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک درخت پر پڑی جس کے سائے میں ایک نوجوان سر کے نیچے ہاتھ دیئے جوانی کی مست نیند سو رہا تھا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ سندر کا محبت بھرا چہرہ شیلا کو اپنی طرف کھینچنے لگا۔ شیلا نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے قریب کیوں ہوتی جا رہی ہے اور دل خود بخود کیوں پروانہ وار کھنچا جا رہا ہے۔ محبت اور شرم کی کشمکش میں آخر محبت ہی نے فتح پائی اور شیلا آہستہ آہستہ درخت تک پہنچ گئی۔ سورج کی رنگین کرنوں نے سندر کے چہرے کو پسینے کی بوندوں سے ترکر دیا تھا۔ شیلا اس کا سر اپنے زانو پر رکھکر بیٹھے ہوئے آنچل سے ہوا دینے لگی تھوڑی ہی دیر میں نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اگرچہ یہ ان آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کرتی رہی تاہم ایک دو قطرے سندر کے منہ پر ٹپک ہی پڑے۔

سندر چونک پڑا اور اپنے سر کو ایک نازنین کے زانو پر دیکھکر متحیر رہ گیا اور دور کھڑے ہو کر اس سے دریافت کرنے لگا کہ وہ کون ہے اور کیا کہنا چاہتی ہے۔ لیکن شیلا کی زبان سے کچھ نہ نکلا بلکہ دو چار آنسو اور نکل پڑے۔

سندر تاڑ گیا اور اس کو اپنی سرگذشت سنانے پر مجبور کیا۔ شیلا نے کہا "میں ایک مصیبت زدہ

اور بے یار و مدد گار لڑکی ہون۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ مگر قدرت نے مجھ میں پریم کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اسی کو حاصل کرنے میں یہاں آئی ہون؛" سندر کا دل مجروح ہوگیا۔ اور اس کی بھی آنکھوں میں آنسوؤں کے بادل اُمنڈ آئے اور وہ اس کے زانو پر سر رکھکر زار و نزار رونے لگا۔ شیلا نے اس کی حالت دیکھی اور سندر سے اپنی محبت کا اظہار کیا ——— سندر نے جو پہلے ہی سے محبت کا بھوکا تھا، شیلا کو اپنے دل میں جگہ دی ——— آفتاب کی تمازت تیز ہونے لگی۔ شیلا کو گھر جانے کی فکر ہوئی وہ چونک پڑی اور سندر سے کہا "میں اَب گھر جانا چاہتی ہون" سندر ان الفاظ کو سنکر ماہی بے آب کی طرح تڑپ گیا اور شیلا سے وعدہ لیا کہ وہ دوسری شام اُسی جھاڑ کے نیچے ملیگی۔ شیلا رخصت ہوئی اور سندر کی نظر جہانتک کام کرسکتی تھی اپنی محبوبہ کے قدم گنتی رہی۔ جب وہ نظر سے اوجھل ہوگئی تو سندر بھی بے قابو ہوکر شیلا کے قدمون کے نشان پر چلنے لگا ———

اُس رومان انگیز صبح کو گذرے کئی سال ہوگئے اب سندر اور شیلا میاں بیوی کی حیثیت سے اپنی جاگیر میں رشک آمیز زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دونوں کی بے پناہ محبت اور خیالات کی یگانگت سے ان کی جاگیر فردوس کا نمونہ بنی ہوئی ہے ———

دھوپ کی شدت سے دفعتاً میری آنکھ کھل گئی میں نے دیکھا کہ وہی پرانا مکان، وہی کمرہ اور وہی بستر تھا۔ دن کے نو بج چکے تھے۔ اور سب گھر والے ناشتہ سے فارغ ہوکر اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ شیلا اور سندر کی دھندلی سی صورتیں اَب بھی میرے دماغ کے کسی کونے میں رقصاں تھیں لیکن مدرز کے خیال نے مجھے اُٹھا کر بٹھا دیا۔

سیّد ضیاء الحسن جعفری

متعلم سکنڈ فارم

بزم رفتہ

(۱)

وہاں کیا تھا؟ چند سوکھے ہوئے پتے۔ ایک مرجھائی ہوئی کلی اور چند سوکھی ہوئی پنکھڑیاں جو کہ ایک یاد رفتہ کو پھر سے تازہ کر رہی تھیں۔

(۲)

نسیم سحری نے ایک انگڑائی لی اور مسکراتے ہوئے شبنم کے قطروں سے کہا اب تمہاری باری ختم ہوگئی۔ اس نے محو خواب ملاحوں کو گدگدایا اور بولی اٹھو صبح ہوگئی۔ تمھیں اب موجوں کی کشمکش سے لڑنا ہے اور اڑتے ہوئے بگلوں کی قطار کے سائے میں چلنا ہے۔ اس نے نیم باز پھولوں کو بوسہ دیا اور کہا جھک جاؤ اور صبح کا خیر مقدم کرو۔ اس نے پھولوں کی پنکھڑیوں کو منتشر کر دیا۔ ایسا معلوم ہوا کسی کی زلفیں ہوا میں پریشان ہوگئیں۔ اس نے ساغر شکستہ کے ٹکڑوں کو بکھیر دیا۔ بجھی ہوئی شمع کو ایک طرف گرا دیا۔۔۔۔ پروانوں کی راکھ اڑا کر لیجانے لگی میں نے اس کے قدم پکڑ لیئے وہ چونک پڑی اور پوچھا ”ارے مدہوش تو کون ہے؟“

میں نے جواب دیا ”معلوم نہیں“

پوچھا ”کیوں اور کیا لئے کھڑا ہے؟“

جواب دیا ”یاد لئے“

اس پر اس شوخ نے ایک تھپڑ مار کر کہا ”میں راکھ لیئے جاتی ہوں تو ان بکھری ہوئی کلیوں کو جمع کرلے اور ان کا ایک ہار بنا اور محبت کے دیوتا کے گلے میں پہنا دے۔ اور اس ٹوٹے ہوئے ساغر کو ساقی کے قدموں پر ڈال دے۔“

میں نے پوچھا "اس بجھی ہوئی شمع کو کیا کیا جائے؟"
جواب ملا "جب پروانے ہی جل گئے ہیں تو شمع کی کیا ضرورت ہے؟"
میں رونے لگا وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

غزل

حامد انصاری
جماعت ہفتم

بہار آئی چمن میں بلبلیں ہیں شاد گلشن میں
سنائی دیتی ہے ہر سو مبارک باد گلشن میں
گھٹائیں رقص کرتی ہیں ہوائیں گنگناتی ہیں
جب آتا ہے کبھی وہ غیرتِ شمشاد گلشن میں
نہ پہونچے اس کے باغ حسن کو یارب کوئی صدمہ
رہے ہمراہ گل کے خار بھی آباد گلشن میں
گل و بلبل کو گر ہوتا نہ ڈر صیاد و گلچیں کا
بسر کرتے تھے اپنی زندگی آزاد گلشن میں
اڑاتے خاک پھرتے ہیں سدا مثلِ بگولہ ہم
کبھی ناشاد صحرا میں کبھی ناشاد گلشن میں
گل لالہ ہو یا سنبل ہو یا ہو یا سمن سوسن
کسی کی یہ سنا کرتے نہیں فریاد گلشن میں
مجھے کیوں روکتا ہے ہم نفس تو سیر و تفریح سے
بچھا رکھا ہے ہر سو دام کیا صیاد گلشن میں
غضب ہو ہائے خود مصحف کے ارمانوں کے گل بوٹے
بہار آنے سے پہلے ہو گئے برباد گلشن میں

مصحف
صاحبزادہ میر حسین علیخاں

نئی دُنیا کی دریافت

کرسٹافر کلمبس ۱۴۳۵ء میں جنیوا جو شہر اٹلی میں واقع ہے پیدا ہوا۔ وہ بچپن میں شہروں کے نقشے دیکھا کرتا، اور دوسرے ملکوں کی کہانیاں پڑھا کرتا تھا۔ اور اکثر چاقو سے چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنایا کرتا تھا۔

جب اس کی عمر چودہ برس کی ہوئی تو اس نے ملاحوں کی زندگی بسر کرنی شروع کی۔ پہلے تو وہ ایک جہاز پر نوکر ہو گیا جو سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کو بحر روم کے جنگی بیڑے میں ملازمت مل گئی۔ اس نے "بحر اوقیانوس" کا بھی سفر کیا اور بہت سے جزائر بھی دیکھے۔ اس سے اس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی اور براعظم بھی ہے۔ اُسے یقین تھا کہ وہ نئی دنیا کو معلوم کریگا چونکہ وہ غریب تھا۔ اس نے امیروں سے درخواست کی کہ اُسے ایک جہاز بنا دیں لیکن کسی نے اس کی مدد نہ کی۔ آخر کولمبس نے چاہا کہ اِسپین کے بادشاہ اور ملکہ سے ملے۔ وہ اِتنا غریب تھا کہ سارا راستہ روٹی کے لئے بھیک مانگتا ہوا گیا اور شہر قرطبہ پہنچا جہاں شاہ فرڈیننڈ اور ملکۂ اسابلا سے ملاقات ہوئی۔ ملکہ نے اس کی باتوں پر توجہ کی اور رحم دلی سے پیش آئی۔ ۱۴۹۲ء میں ملکہ اسابلا نے کولمبس کو تین جہاز دیئے جو پیلاس بندرگاہ پر لنگر ڈالے ہوئے تھے۔ کولمبس تین جہازوں اور ایک سو بیس بہادر ملاحوں کے ساتھ ۳ اگست ۱۴۹۲ء کو اِسپین سے روانہ ہوا۔ ان لوگوں کو تو واپس آنے کی اُمید ہی نہ تھی اور کہتے تھے کہ اب ہم اپنے بال بچوں کو نہ دیکھینگے اور نہ اپنے دوستوں کو اور اسی دریا میں ڈوب مرینگے۔ آخر ہوا نے اپنا رُخ بدلا اور چونکہ یہ ان کی مخالف تھی اس لئے اِن جہازوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی چڑیاں ان کے سروں پر اڑتی ہوئی نظر آنے لگیں اس سے اُنھیں یقین ہو گیا کہ اَب زمین دور نہیں ہے۔ پھر ہوا چلنی موقوف ہو گئی

اور دریا ساکن ہوگیا۔ تو جہاز رک گئے اب تو لوگوں نے خیال کیا ہم یہیں ٹھیرے رہینگے۔ چند، کولمبس کے خلاف ہوگئے اور اسے جہاز پر سے پانی میں پھینکنے کا ارادہ کیا لیکن دوسروں نے روکا۔ وہ کہنے لگے کیا ہم ہمیشہ کیلئے یہاں رہنے آئے ہیں۔ دوسروں نے کہا کہ ہم نے ابھی تک زمین نہیں پائی اور نہ پائینگے اس لئے ہم آگے نہ جائینگے اور اب ہم کو واپس چلنا چاہیئے۔

کولمبس نے کہا جب ہم اتنی دور آگئے ہیں تو واپس جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ ابھی تمہیں ایک نشانی معلوم ہوگئی کہ زمین نزدیک ہے۔ اس کے بعد انھیں ایک درخت نظر آیا جس کی چوٹی پر کچھ پھل لگے ہوئے تھے۔ جب یہ لوگ آگے بڑھے تو انہیں دھیمی روشنی نظر آئی لیکن پھر غائب ہوگئی۔

ایک دن ان لوگوں کو بندوق چھوٹنے کی آواز سنائی دی جو ابھی کے ایک جہاز والوں نے چھوڑی تھی اس سے سب کو معلوم ہوگیا کہ زمین قریب ہے زمین کا نام سنکر سب لوگ بہت خوش ہوئے اور کولمبس کو مبارکباد دینے لگے۔ وہ لوگ ایک جزیرے کے قریب پہنچے جو سلوڈار کہلاتا تھا اور ساحل پر آموجود ہوئے۔ کولمبس نے اپنا پاؤں رکھتے وقت اسپین کے بادشاہ اور ملکہ کا نام لیا۔ کیونکہ یہ سب انھیں کے طفیل سے تھا۔ جب یہ لوگ ساحل پر پہنچے تو وہاں کے باشندے حیران رہ گئے اور ان کو یہ خیال ہوا کہ ان لوگوں کے جہاز غالباً پانی کی تہہ سے نکلے ہیں۔ وہ لوگ کولمبس اور اس کے ہمراہیوں کے ساتھ خلوص سے پیش آئے۔

پھر کولمبس اور اس کے ساتھی کوریا گئے اور وہاں سے گائینا۔ جاتے وقت کسی ملاح کی کاہلی کی وجہ سے ان کا ایک جہاز ڈوب گیا۔ کولمبس نے ان سب لوگوں میں سے چالیس کو وہاں چھوڑ کر وعدہ کیا کہ وہ اسپین جاکر جلد اور ضرور واپس آئیگا۔ پھر وہاں کی تھوڑی چیزوں اور چند باشندوں کے ہمراہ اسپین روانہ ہوا اور ۱۵ فروری ۱۴۹۳ء کو اسپین پہنچا۔ وہاں کے سب لوگ اس کے واپس آنے پر بہت خوش ہوئے اور ملکہ اور بادشاہ نے اسے بہت سے انعام عطا کئے۔ امریکہ چونکہ بعد کو کولمبس کی کوشش سے دریافت ہوا اس لئے اسے نئی دنیا کہتے ہیں۔ ۱۴۹۹ء میں کولمبس نے امریکہ کا پتہ لگایا۔ ایک کپتان جس کا نام امریکو تھا وہاں کا باشندہ تھا اسی وجہ سے نئی دنیا کو امریکہ کہتے ہیں۔

محمد رونق علی
جماعت ہفتم

بغض وکینہ ایک ایسا قدیم مرض ہے کہ دنیا میں ہر متنفس اس مرض میں مبتلا ہے ابھی تک کوئی ایسا معالجہ معلوم نہیں ہوا جس سے اس مرض کا سدباب ہو۔ ہر شخص جو اس زمین پر سانس لیتا ہے وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسان سے بغض وکینہ رکھتا ہے۔ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ عداوت اور بغض وکینہ دنیا میں ابتدائے آفرینش سے ہیں۔ دنیا کے سب سے پہلے قتل کا سبب بھی یہی بغض وکینہ تھا۔ حضرت آدم کے بیٹے بغض وکینہ ہی کی وجہ سے ایک دوسرے سے لڑے اور جنگ و جدل کی ابتداء ڈالی۔

ہر قوم میں بغض وکینہ کا جذبہ کیوں پایا جاتا ہے؟ جب ایک قوم کسی دوسری قوم کو شاہراہ ترقی پر گامزن دیکھتی ہے تو اس قوم سے حسد کرنے لگتی ہے اور اس قوم کو نیست و نابود کرنے کی سعی کرتی ہے جس کا نتیجہ جنگ وجدل اور قتل وغارت کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔

بغض وکینہ کا جذبہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا جارہا ہے۔ خود حسد کرنے والا تباہ و برباد ہو رہا ہے قوموں کے تنزل کا اولین سبب بغض وکینہ ہے جس کسی قوم میں بغض وکینہ شروع ہوا سمجھ لو کہ اس کا زوال بھی شروع ہوگیا اور وہ قوم بہت جلد قعر مذلت میں گرجاتی ہے قوم تو خیر ایک بہت بڑی چیز ہے اگر ایک چھوٹے سے کنبہ ہی میں یہ تباہ کن مرض پھوٹ پڑے تو آپ دیکھینگے کہ آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے سارا کنبہ ادبار میں ڈوب جائیگا۔

جب کوئی انسان کسی دوسرے کو اپنے کنبہ میں ترقی پر دیکھتا ہے تو وہ حاسد ہوکر اس کو نقصان پہونچانے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن خود نقصان اٹھاتا ہے۔ پھر بھی بغض وکینہ نہیں چھوڑتا ہے۔ ایک چھوٹی مثال ہے اگر کوئی طالبعلم جماعت میں دوسرے لڑکوں سے بازی لیجاتا ہے تو تمام جماعت اُس سے

حسد کرنے لگتی ہے۔ اُس کی ہر بات سے ناراض ہوتی ہے۔ تمام لڑکے اس سے ہر وقت لڑنے کی سوچتے رہتے ہیں۔ اُستاد کے سامنے اُس کی بیجا شکایت کرتے ہیں اور اس کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے ایک کہا تو دس لگاتے ہیں۔ لیکن اس کا حاصل صفر ہوتا ہے۔ بغض وکینہ کرنے والا ہر وقت ناکام رہتا ہے۔ بغض وکینہ قوم، مذہب، فرقے وکنبہ وغیرہ کو برباد کر دیتا ہے۔ کیا بغض وکینہ اچھی چیز ہے؟ نہیں بغض وکینہ ایک بہت ہی بری بلا ہے۔ جس کسی کو بغض وکینہ کا جذبہ ہوتا ہے وہ اُس کو فنا کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ غرض بغض وکینہ ایک بہت ہی نقصان دہ جذبہ ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس سے بچنا چاہیئے۔ پس ہم سب کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم کسی سے حسد اور کینہ نہ رکھیں بلکہ ہر شخص کی کامیابی سے خوش ہوں اور گرمجوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کریں۔

سیّد سراج الحسن جعفری

جماعت ہشتم

دو ڈراؤنی چیزیں

مسٹر ونسٹن چرچل موجودہ وزیر اعظم برطانیہ بڑے بذلہ سنج اور لطیفہ گو ہیں۔ نوجوانی میں وہ مونچھیں رکھتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ایک ڈنر میں ایک دولتمند خاتون نے ہنس کر اُن سے کہا" مسٹر چرچل آپ کی دو چیزیں بہت ڈراؤنی ہیں ایک آپ کی چھڑی اور ایک آپ کی مونچھیں"

مسٹر چرچل نے مسکرا کر جواب دیا" مگر خاتون۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ان دونوں چیزوں سے آپ کو سابقہ نہیں پڑے گا!"

وقت کی اہمیّت

وقت کسی کی ملکیت نہیں۔ اِس میں کسی کا اجارہ نہیں ہوتا۔ ایک مزدور سے لیکر شاہ تک اس سے ایک ہی طرح مستفید ہوتے ہیں۔ وقت اُسی وقت اپنا ہو سکتا ہے جبکہ اس کا استفادہ کما حقہٗ کیا جائے۔ وقت کے صحیح اِستعمال ہی میں زندگی کی کامیابی کا اِنحصار ہے۔ وہ لوگ جو بیش بہا وقت کو فالتو طور پر خرچ نہیں کرتے اور ہر لمحہ سے مستفید ہوتے ہیں ان کی آئندہ زندگی میں انہیں فائدہ پہنچتا ہے۔ خوش بختی ان کے قدم چومتی ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ وقت کی اہمیّت کو نہیں سمجھتے اور اس کو بیکار صرف کرتے ہیں۔ آخر کار ان کو ضروریات اور پریشانیوں میں گھر جانا پڑتا ہے۔ یہ مقولہ کہ وقت دولت ہے اس میں شک نہیں کہ وقت کی اہمیت کو واضح طور پر پیش کرتا ہے مگر اس سے وقت کی حقیقی قدر و قیمت۔ معلوم نہیں ہوتی وقت نہ صرف دولت ہے بلکہ دولت سے بھی زیادہ اس کی قیمت ہے۔ دولت کے ہاتھ سے جانے کے بعد اس کو حاصل کیا جا سکتا ہے اسی طرح کھوئی ہوئی صحت کھوئی ہوئی عزت دوبارہ حاصل کی جا سکتی ہے مگر کھویا ہوا وقت اس کے حصول سے باہر ہے۔ وقت اور موج کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ دولت اور اِقتدار بھی کھوئے ہوئے وقت کے ایک لمحہ کو واپس نہیں لے سکتے۔

جب وقت کی یہ نوعیت ہے اور اس کی یہ اہمیّت ہے تو عقلمندی اسی میں ہے کہ اس کو بیکار نہ صرف کیا جائے۔ ہماری زندگی اس دنیا میں بالکل ہی دو روزہ ہے اس لئے ہم کو چاہیئے کہ ہر ایک لمحہ سے فائدہ اٹھائیں۔ ہم کو چاہیئے کہ بیہودگیوں میں وقت نہ گزاریں مثلاً جوّا کھیلنا، دوسروں کی نکتہ چینی کرنا فضول کتابیں پڑھنا وغیرہ ان کی وجہ سے ہمارا کتنا اَنمول وقت ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ بہتر ہے کہ سود مند مسائل کے حصول میں یہ وقت صرف کیا جائے تاکہ معلومات اچھے ہوں۔

کاہلی اور کام کو ملتوی رکھنے کی عادت وقت کے دو بڑے دشمن ہیں۔ وقت کے بڑے

استعمال سے بچنے کے لئے ہمیں چاہئیے کہ ان دو دشمنوں کو ہمارے پاس پھٹکنے نہ دیں۔

زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے اور زیورِ علم اور دولت سے مالا مال ہونے کے لئے ہمیں چاہئیے کہ وقت کے ہر ایک لمحہ سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ بیکار دماغ شیطان کا آلۂ کار بن جاتا ہے یہ حقیقت ہے۔ کیونکہ کاہل آدمی کا دماغ جب کوئی کام نہیں کرتا تو برائی کے سوچنے میں مصروف ہو جاتا ہے وہ شخص جس کا ہر لمحہ مصروف رہتا ہے وہ صرف اپنے کام ہی میں منہمک رہتا ہے اور ان بکھیڑوں میں کبھی نہیں پڑتا۔

ذی مرتبت ہستیوں کی سوانح حیات ہمیں بتلاتی ہیں کہ انھوں نے یہ درجہ صرف وقت کے صحیح استعمال کی وجہ سے حاصل کیا۔ مثلاً سر سید احمد خاں جو ایک اعلیٰ گھرانے کے چراغ تھے۔ انھوں نے وقت کا صحیح استفادہ کیا اور شمعِ ہند بن گئے اور ان کی ضیاء پاشیاں سارے ہندوستان میں موجود ہیں۔ نپولین کے پاس وقت کی اس قدر اہمیت تھی کہ دوران جنگ میں کبھی نہیں سوتا تھا وہ صرف گھوڑے کی پیٹھ پر چند لمحے آرام لینا کافی خیال کرتا تھا۔ وقت کی اِس قدر قدر کرنے سے وہ شہنشاہِ فرانس بن سکا۔

لہٰذا وقت کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہر دن ایک چھوٹی زندگی ہے اور ساری زندگی دنوں کو دہراتی ہے۔

سیّد محبّ حسین

فارم فورتھ

غریب

غریب جن کے دم سے تہذیب و تمدن وجود میں آئے۔

غریب! دنیاوی عیش و عشرت کے بانی مبانی۔ غریب! تمول اور شاہی جاہ و جلال کے باعث۔ رنگین اور بام فلک سے باتیں کرتی ہوئی اونچی عمارتیں انہیں کی مرہونِ منت ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود ان کی محنت کا ثمرہ کہیں گالی اور کہیں چند تانبے کے ٹکڑے ہیں۔ غریب نہ ہوں تو دنیا کی کل نہ چلے صبح کی شام نہ ہو۔ غریب ہی کی وجہ سے امیروں کی تن آسانیاں ہیں وہ ہل نہ جوتیں تو دنیا فاقوں مرے۔ ہر وہ چیز جو امیروں کے عیش میں اضافہ کرتی ہے، غریبوں کی محنت ہی سے ہے۔ مالدار لوگ، ملک التجار، بادشاہ، اور شہنشاہ غریبوں کے وجود سے ہیں۔

غریب کی تو کوئی دنیا ہی نہیں اُس کو تو کوئی عیش نصیب نہیں۔ دنیا میں وہ اِس لئے آیا ہے کہ صرف محنت کرے اور اَمیروں کی سختیاں جھیلے۔

غریب سے اَمیری ہے، اگر غریب نہیں تو امیروں کی امیری کہاں وہ امیروں کے لئے اعلیٰ محلات تعمیر کرتا ہے ان کے لئے خوشنما باغات لگاتا ہے کپڑا بناتا ہے آرام و آسایش کے لئے موٹر، ہوائی جہاز بناتا ہے ان سب خوبیوں کے بعد بھی دنیا غریب کی قدر نہیں کرتی اگر قدر نہیں کرتی تو کوئی بات نہیں لیکن اس کو حقارت کی نگاہ سے بھی دیکھتی ہے۔ اس کے بازو بیٹھنا اپنے شایان شان نہیں سمجھتی اپنا کوئی معاملہ اس سے نہیں کرتی وہ کتنا ہی شریف کیوں نہ ہو اس کو اپنے گھر کی بیٹی نہیں دیتے اس لئے کہ وہ دولت سے کوسوں دور ہے اور مسرتوں سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

ایک تہذیب کا مدعی موٹر پہ پھرتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کے قصر کے پہلو میں ایک غریب کا

ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہے۔ ایک دنیا کا ستایا ہوا انسان اس میں مقیم ہے جس کو نہ محنت ہی کرنے کا یارا ہے نہ اس کو بھیک ہی ملتی ہے۔ قسمت کا مارا ہوا انسان اپنی کٹیا میں پڑا ہوا کراہتا ہے۔ اور اپنی زندگی پر آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔ کسی وقت اس کی آہ ضبط سے باہر ہو کر دیواروں سے ٹکراتی ہے۔ جس کا تذکرہ اپنے دوستوں سے مالک مکان اِس طرح کرتے ہیں "اِس کمبخت نے تو رات کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیا ہے۔ اَب تو میں نے یہ جی میں ٹھان لی ہے کہ اس کو یہاں سے بڑھا دیا جائے اور ہر روز کی آفت سے چھٹی مل جائے" غرض کہ چشم بینا کے لئے یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں واقعات موجود ہیں۔

آپ نے یہ نہیں سُنا ہو گا کہ مالدار سے دولت چھینی جاتی ہے بلکہ غریبوں کا خون چوسا جاتا ہے غریب کی اس کمائی پر جو دن بھر کی مزدوری کے بعد تانبے کے چند سکوں کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور جو دن بھر کی محنت شاقہ سے حاصل کی جاتی ہے اُس پر ڈاکہ ڈالنے کی مختلف قسم سے کوشش کی جاتی ہے۔ تجارت کی جتنی چیزیں ہوتی ہیں وہ سب صنعت سے متعلق ہیں صنعت اور حرفت غربا کے دَم سے قائم ہے۔

غریب ایک ادنیٰ تاجر گھوڑوں کی خدمتگار کی حیثیت سے ملک و مالک کی وہ وہ خدمتیں کرتا ہے جس کی وجہ سے اِس تاجر کے سر پہ تاج نظر آتا ہے۔ مالک کے اِشاروں پر سَر کٹانا ادنیٰ سی بات سمجھتا ہے۔ غرض اس کی جانبازی اور خون فشانی کا نتیجہ شہنشاہیت ہوتی ہے۔ مگر اس کی قسمت میں جان دینے۔ بھوکے مَرنے۔ قید میں تڑپنے۔ اپنی بیوی بچوں اور عزیز و اقارب کو بھوکا پیاسا دیکھنے کے سوا، اور کیا لکھا ہے۔ روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے محتاج۔ اور سَتر چھپانے کے لئے کپڑوں سے عاری۔ سرمایہ داران کی آہ و بکا کو اور چیخ پکار کو دیوانہ پن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے ان حالات کا اثر ہی نہیں ہوتا اور فریاد کا یہ اثر ہوتا ہے کہ تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی میرے صیاد کی ہے

وہ غریب جو صبح چار بجے اُٹھکر اپنے آقا کی خدمت کے لئے چلا اور دن بھر اُس کو خوش کرنے کے لئے اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالتا رہا۔ شام کے چھ بجے جبکہ سورج غروب، ہو رہا ہے

اور کائنات پر اندھیرا اپنا رنگ جمانے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے۔ جیوش و طیور اپنے گھروں اور گھونسلوں کا رُخ کئے ہوئے ہیں۔ یہ غریب اپنے پرانے جھونپڑے کی طرف کسی سوچ میں چلا آ رہا ہے۔ اس کے پاس ایک پھٹا کوٹ ہے اور اس میں چند تانبے کے سکے ہیں۔ یہی اس کی اُمیدوں کا سامان ہے۔ جب وہ گھر پہونچ جاتا ہے تو اس کی غریب بیوی اور بچے جو چند بوسیدہ کپڑوں میں پلٹے ہوئے ہیں۔ اس کی طرف اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس وقت غریب کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑتی ہے۔ اور وہ ان کو گود میں اٹھا لیتا ہے۔ لیکن اس کی یہ خوشی بہت جلد غمی سے بدل جاتی ہے کیونکہ کچھ عرصہ بعد اس کو پھر اپنے مالک کے گھر لوٹنا ہے۔

دنیا مساوات کی رٹ لگائے ہوئے ہے جو کہیں تو پالسی کی صورت میں اور کہیں اپنی تہذیب کی شکل میں نمودار ہوتی ہے حالانکہ یہ کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر شخص کی غائر نظر تعصب سے علیحدہ ہو کر ان چیزوں کا مشاہدہ کرے۔

کیا خوب! اسی کا نام سرمایہ داروں نے تہذیب و تمدن رکھا ہے ع

"برعکس نہند نام زنگی کافور"

سید محمد خان سید

تھرڈ فارم

لطیفے

ڈاک منشی خط چھانٹ رہا تھا۔ ایک خط پر لکھا تھا "میرے والد کو ملے" ڈاک منشی حیران تھا کہ ایک آدمی آیا اور پوچھنے لگا۔ منشی صاحب میرے لڑکے کا خط نہیں آیا۔ منشی صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور وہ خط اس آدمی کو دیدیئے۔

ماں۔ دیکھو حامد نعمت خانے کو مت کھولنا وہاں جن رہتا ہے۔

حامد۔ نعمت خانے میں رکھی ہوئی چیزیں وہی کھالیتا ہوگا۔ پھر آپ ناحق میرا نام لگاتی ہیں۔

آقا۔ بارش ہو رہی ہے جلدی سے پلنگ اُٹھالو بھیگا جا رہا ہے؟

نوکر۔ صاحب میں پانی کے مٹکے تو اٹھالوں بھیگ جا رہے ہیں بڑی مشکل سے پانی ٹھنڈا ہوا ہے۔

بڈھا۔ صاحبزادے میری عمر (۸۰) اسّی برس کی ہونے کو آئی لیکن مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی میں نے جھوٹ کہا بھی ہے یا نہیں۔

نوجوان۔ قبلہ اِس میں تعجب کی کونسی بات ہے اس عمر میں حافظہ کا یہی حال ہوتا ہے۔

اسد ممتاز
متعلم سکینڈ فارم

بچپن کا خواب

خلیل کی کوئی پانچ سال کی عمر تھی جب کہ وہ اپنی چھوٹی بہن زہرا کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی ایک ہی وقت کھاتے ایک ہی جگہ بیٹھتے اور ایک ہی جگہ سویا کرتے تھے۔ وہ کبھی گڑیوں کا بکس

لاتی اور اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ کبھی چھوٹی ہارمونیم پر ہاتھ صاف ہوتا اور کبھی موٹر اور ریل کی نگران کے بچپن کے کھیل تھے۔ اِس طرح وہ مختلف کھلونوں سے اپنا وقت کاٹتے اور دل بہلایا کرتے تھے۔ ایک لکڑی کا گھوڑا تھا جس پر وہ بیٹھا کرتا تھا۔

ایک دن اِتفاقاً وہ کھیلتے کھیلتے سو رہا۔ اس وقت وہ مزے کی نیند سو رہا تھا لیکن اس کی بہن سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گڑیوں کا بکس تھا اور دوسرا ہاتھ خلیل کے سر پر تھا۔ دوسرے کھلونے اطراف پھیلے ہوئے تھے۔

خلیل خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے لکڑی کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہا ہے گھوڑا تیزی سے دوڑا جاتا ہے۔ وہ اچانک رُک گیا اور خلیل گرتے گرتے بچ گیا۔ گھوڑا اپنی شرارت پر تلا ہوا تھا اور خلیل کو پٹک دینا چاہتا تھا۔ اس وقت زہرا رو رہی تھی اور خلیل دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ دست بدعا ہیں۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو گھوڑے کو قریب پایا اور زہرا کو سر پر ہاتھ رکھے ہوئے دیکھا۔

اَسد ممتاز

سیکنڈ فارم

”مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!“

ایک بار سفر کے دوران میں برنارڈ شا کی ملاقات برّاعظم کی ایک مشہور مصنفہ سے ہوئی۔ تعارف ہوا۔ شا نے رسماً کہا ”آپ سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوئی“ مصنفہ شا کو نیچا دکھانے کی فکر میں تھی۔ اُس نے فقرہ کسا ”لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہی جملہ میں آپ کی شان میں نہیں دُہرا سکتی“

مصنفہ کا چہرہ لال ہوگیا جب شا نے فوراً کہا ”خاتون! کیا آپ میری طرح کسی کا دل خوش کرنے کی خاطر ایک آدھ بار بھی جھوٹ نہیں بول سکیں؟“

مرزا جی

مرزا ہمارے پڑوسی بھی تھے اور ایک زمانہ میں ہمارے روم فیلو بھی رہے تھے۔ گنڈے، تعویذوں کے بڑے پابند۔ نماز روزہ کے مطلق پابند نہیں۔ مرزا محلہ والوں کے لئے ایک آلہ تفریح تھے۔ خشخشی داڑھی۔ پستہ قد، لانبا نقشہ غرض ایک عجیب آدمی تھے۔ مرزا صاحب کو فیشن کا بہت خیال رہتا تھا۔ جب کبھی باہر آتے ہزار بار آئینہ میں صورت دیکھ لیتے۔ مرزا اپنے آپ کو بہت ہی بہادر سمجھتے تھے۔ جب کبھی کسی نئے شخص سے آپ کی ملاقات ہوتی تو اس بیچارہ کو ایسے غپ سُناتے کہ وہ بھی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ باتوں باتوں میں آپ شہر کے بڑے بڑے عہدیداروں سے اپنا رشتہ بتلا دیتے۔ مرزا صاحب کا لباس تو بالکل عجیب و غریب ہوتا تھا۔ غدر کے زمانہ کی ایک دوپلی تھی جس پر ایک دو انچ میل تھا۔ ایک بوسیدہ انگرکھا تھا جو ورثہ میں ملا تھا اور ایک جوتا جس پر دس بارہ پیوند ضرور لگے ہوئے تھے۔ یہ تھا مرزا صاحب کا لباس۔ مرزا نیند کے مُرید تھے۔ جہاں کہیں ذرا آرام ملا سو گئے۔ خاصکر نماز جمعہ میں خطبہ سنتے وقت ضرور سو جایا کرتے تھے۔ شکار کا شوق تو حد درجہ کا تھا مگر گھبراتے بھی بہت تھے۔ عین شکار کے وقت کچھ حیلہ کر کے کہیں نکل جاتے اور اگر کسی نے روک لیا تو کانوں میں انگلیاں ضرور رکھ لیتے۔ یہ اپنے آپ کو بہت ہی بہادر سمجھتے تھے۔ حالانکہ معاملہ اس کے خلاف تھا۔ مرزا صاحب کو کسی نے لفظ (Sorry) رٹا دیا تھا۔ بات بات پر (Sorry) کہا کرتے تھے۔

غرض کہ میرزا جی بڑے مزے کے آدمی تھے۔ جب کبھی اُن کا خیال آتا ہے کچھ دیر کے لئے ضرور تمام افکارات دور ہو جایا کرتے ہیں۔

محمد عبدالغفار سعید

سکینڈ فارم

اردو میں ڈرامہ نگاری

مصنفہ جناب سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی

کسی زبان کے ادب میں صنف ڈرامہ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں اردو زبان کی دوسری اصناف ترقی کے منازل بہت ہی تیزی کے ساتھ طے کر رہی ہیں وہاں ڈرامہ نگاری انتہائی سست رفتار نظر آتی ہے۔ جناب بادشاہ حسین صاحب نے اس کتاب میں فن ڈرامہ نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے اُردو ڈراموں کی حالت پر بصیرت افروز معلومات بہم پہونچائی ہے اپنی قسم کی یہ کتاب ایک ہی ہے۔ اس کا مطالعہ ڈراموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے پُر از معلومات ہوگا

جناب بادشاہ حسین صاحب کی دوسری تصنیفات

- دیوان تاباں
- ناخواندہ مہمان اور دیگر افسانے
- مشاہیر ہند۔

جنوبی ہند کا اولین علمی و ادبی ادارہ مکتبہ ابراہیمیہ ایک عرصہ سے ابنائے وطن کی علمی ادبی، خدمات انجام دیرہا ہے اور بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ جنوبی ہند میں خاصکر یہ فخر اسی مکتبہ کو حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے اردو زبان کی اشاعت اور ترقی کی خاطر ملک میں اردو زبان کے علوم و فنون کی قدیم و جدید کتابوں کا بڑا کتبخانہ قائم کر کے عامۃ الناس میں کتب بینی کا مذاق پیدا کیا۔ تمام نامور مصنفین کی کتابیں یہاں دستیاب ہوسکتی ہیں مکتبہ کی مستعد اور باقاعدہ خدمات کا آج یہ اثر ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض سے یونیورسٹیز، کالجس، مدارس، کتبخانہ جات سرکاری، غیر سرکاری اہل ذوق علمی ادارے ہمارے یہاں سے کتابیں طلب فرماتے ہیں۔ آپ ہمارے یہاں سے جملہ قسم کی فہرستیں طلب فرمائیں اگر آپ اپنے کتبخانہ کیلئے کوئی آرڈر دینا یا کسی کتاب کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ہم سے خط و کتابت کیجئے۔

محمد عبدالحق مہتمم مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

جاؤ! تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ——— !!!

شیلا نے اپنے پریمی سے کہا ——— (محبت کی ٹھوکر)۔ پرنسپل نے طالب علم سے کہا ——— (داخلہ کا دروازہ بند)

حاکم نے درخواست گذار سے کہا ——— (بیروزگاری کی لعنت) سول سروس بورڈ نے امیدوار سے کہا ——— (آرزوئیں خاک میں)

مرض نے مریض سے کہا ——— (عدم آباد جانے کا پاسپورٹ)

——— کیونکہ تمہیں ایک تندرست نوجوان ہونا چاہیئے۔ تم کبھی کوئی کھیل نہیں کھیلتے۔ اسی لئے صحت جیسی نایاب چیز سے محروم رہ گئے!!!

کوکر کمپنی آپ کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتی ہے۔ ہمارے پاس سے ریکٹ خرید کر آج ہی سے ٹینس کھیلنا شروع کر دیجئے۔ اور اپنے اسکول یا کالج کے کپتانوں سے کہیئے کہ ہمارے پاس سے فٹ بال۔ ہاکی۔ کرکٹ۔ والی بال اور بیڈمنٹن وغیرہ کے پائدار اور خوبصورت سامان سستے داموں میں خرید فرمائیں اور پرانے سامان کو درست کروا کر نئے روپ میں دیکھیں

کوکر اینڈ کو (مالک غفور) ترپ بازار۔ حیدرآباد دکن

نظامِ ادب

دنیا کا سب سے خوبصورت پھول۔ کنول۔ ساگر میں کھلتا ہے۔ لیکن ساگر کے پانی سے متاثر ہوئے بغیر اپنی رنگا رنگی سے دلوں کو موہ لیتا ہے

زندگی کا بیمہ بھی مانند کنول کے ہے

(اس لیئے کہ)

(۱) یہ ایک انوسٹمنٹ (شغلِ اصل) ہے لیکن بازار کے اُتار چڑھاؤ سے متاثر نہیں ہوتا

(۲) یہ ایک جائیداد ہے لیکن اور جائیدادوں کی طرح اس کو کوئی گھاٹا نہیں !!

(۳) یہ ایک انمول موتی ہے جو ہر ایک کے لئے باعث فخر ہے۔ لیکن کوئی دوسرا اس کو بطور زر بدلہ طلب نہیں کر سکتا !!!

یہ ہیں زندگی کے بیمہ کی چند خصوصیات

پس اگر آپ جیون ساگر میں کنول کی طرح رہنا چاہتے ہیں تو

آئیے

حیدرآباد کوآپریٹو انشورنس سوسائٹی محدود

بشیر باغ روڈ حیدرآباد دکن سے مزید تفصیلات حاصل کیجئے۔

جلد (۷) بابتہ نومبر ۱۹۴۵ء شمارہ (۱)

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی
کجا عیش بروں آوردنِ لعلے کہ در سنگ است
(اقبال)

نظامِ ادب

طلبائے نظام کالج کا شش ماہی رسالہ

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا (مدیر)

سید ضیاء الحسن جعفری (معتمد)

محمد حامد علی (شریکِ معتمد)

اراکین

میر مقصود علیخاں (سال چہارم) سمپت راؤ (سال سوم)
محمد حامد انصاری (سال دوم) پریم کمار سہگل (سال اول)

دیا وتی استھانہ
(نمایندہ خواتین)

سالانہ چندہ .... تین روپیہ

نرخ نامہ اشتہارات

ٹائٹل پیج صفحہ ۲	۳۵ روپیہ	معمولی پورا صفحہ	۲۵ روپیہ
" " صفحہ ۳	۳۰ روپیہ	" نصف "	۱۵ روپیہ

ربع صفحہ ۱۰ روپیہ

شرائط

(۱) کوئی اشتہار ربع صفحہ سے کم کا قبول نہیں کیا جائے گا۔

(۲) اجرت اشتہارات ہر حالت میں پیشگی آنی ضروری ہے۔

(۳) مخرب اخلاق اشتہار کسی صورت میں بھی شائع نہیں ہوں گے اور کوئی اشتہار جو ادارہ کے لئے ناقابل اشاعت ہو روک دیا جائے گا۔

(۴) لیتھو پرنٹنگ ۶۰ اسکرین کے بلاک قبول کئے جائیں گے۔

(۵) بلاک ڈزائن یا چربہ اور اشتہار کا مضمون مشتہر کو سپلائی کرنا ہوگا۔

ترسیل زر کا پتہ

معتمد نظام ادب نظام کالج فتح میدان حیدرآباد دکن

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

فہرستِ مضامین

طالب علم

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

(اقبال)

مدرسہ

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش!

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش!

اُس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش!

(اقبالؒ)

شذرات

حرکت و انقلاب حیات کی جان ہے۔ ان معنوں میں انسانی جنگ کبھی ختم ہوئی ہے نہ ہوگی ؎

کہ از نیزِ زندگی اندر ستیز است۔ بر اینہم الحمد للہ کہ جنگ شش سالہ اختتام کو پہونچی اور دنیا کو ایک بے مثال بحران سے نجات ملی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ نفسیاتی پہلو سے خاتمۂ جنگ کو امن کا مترادف قرار دینا خوش فہمی سے زیادہ نہیں۔ امن کے بادل میں جنگ کی بجلیاں چھپی ہوئی نظر آ رہی ہیں لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس طرح بظاہر "اٹومک بم" نے مادی جنگ کو دھمکا کر ختم کرا دیا اسی طرح جب تک ایک "ادبی اٹومک بم" کی تخلیق نہ ہوگی ادبی حشرات الارض کے لئے کوئی موثر حربہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ مقصود یہ ہے کہ چند ادیبوں کی نام نہاد ترقی پسندی اُردو ادب کے صحیح ذوق کے لئے مرگِ مفاجات سے کم نہیں۔

اس غائت کے مدِ نظر مناسب ہوگا کہ سنجیدہ ادیبوں کے اجتماع کی شکل میں ایک کانفرنس جو نوعی اعتبار سے "ادبی سان فرانسسکو کانفرنس" ہوگی تشکیل دی جائے جو ایک طرف ادب جدید کے دائرۂ عمل و ارتقاء کو متعین کر کے موجودہ "ادبی تعطل و جمود" کو دُور کرے اور دوسری جانب خدمتِ ادب کے غلط تصور کا انکشاف اور اس کی اصلاح کر کے گویا "ادبی نازیت اور فسطائیت" کو "ادبی جمہوریت اور بالشویت" کے قالب میں ڈھالے۔ اس آرزو میں ہمیں کامیابی ہوئی تو یقیناً "ادبی امن و امان" کا دور دورہ ہوگا ورنہ نام نہاد "ادبیت" نے جو شورش و فساد برپا کر رکھا ہے وہ خاتمۂ جنگ کے ساتھ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔

ادبی پہلو سے قطع نظر نظام تعلیم کو بھی جدید ترین اور صحیح تنظیم میں ڈھالنا ہے۔ ہمارے پاس قوت ہے، سرمایہ ہے، علم ہے، احساس ہے مگر حیرت ہے کہ عمل نہیں ہے یا ذوقِ عمل کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری طویل تعلیمی زندگی "کوہ کندن وکاہ بر آوردن" کا مصداق بن کر رہ جاتی ہے۔

ضرورت ہے کہ ہم ایسے ذرائع اختیار کریں جو برخود غلط تعلیمی عناصر کو فنا کر کے صحیح راستہ بتلائیں اور تخریب کے بعد مکمل تعمیر کا تصور پیدا کریں۔ ہماری تعلیمی شام کی صبح خدا جانے کب نمودار ہوگی۔ کیونکہ ہم ابھی تک کوئی ایسا فرد یورپ اور امریکہ کے مقابل میں نہیں پیش کر سکتے جسے موجد، سائنسٹ یا ماحصل تعلیم کہا جا سکے۔ البتہ اب اُمید ہو چلی ہے کہ ہماری حکومت تنظیم مابعد جنگ کے تحت جن طلباء کو یورپ اور امریکہ زر کثیر صرف کر کے بھیج رہی ہے وہ نہ صرف اپنے لئے، ملک کے لئے بلکہ خدمت علم و فن کے لئے بھی مشعل راہ ثابت ہوں گے اور باہر جا کر قومی کردار اور سیرت کو چمکا کر ہندوستان کا نام روشن کریں گے۔

شمارۂ زیر نظر کے مطالعہ سے ناظرین پر واضح ہوگا کہ ہم بتدریج ادبیات سے اقتصادیات اور معاشیات کی طرف ہٹ رہے ہیں۔ اب یہ امر محتاجِ اظہار نہیں رہا کہ محض گل و بلبل کے افسانے اور ہجر و وصال کے ترانے قومی زندگی کی تعمیر اور عام آسودگی اور فراغت کے اسباب مہیا کرنے میں کام نہیں آسکتے۔ ہمارے اخلاق اور تمدنی جسم و صحت کو کساد بازاری قحط اور وبائیں گھن کی طرح کھاتی جارہی ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے عام رجحان یہ پایا جارہا ہے کہ معاشی مباحث نے "فکرِ نوجوان" کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ چنانچہ "صنعتی دورِ جدید سے قبل ہندوستانی دستکاری کا عروج و زوال" "گھریلو مصنوعات" "مابعد جنگ ہندوستان کی معاشی ترقی" "دیہی قرضہ" "ٹی۔ وی۔ اے" وغیرہ اس رجحان کے مظہر ہیں۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ اس قسم کے ضروری اور مفید مضامین جن کو پہلے ادبی رسالوں کے لئے نہایت خشک اور بے مزہ سمجھا جاتا تھا۔ اب اپنی طرف تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ اور دلچسپی کو بے اختیار کھینچ رہے ہیں اور زمانہ کا اقتضا بھی یہی ہے۔

ساتھ ہی اس کے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ ادبی خدمت کو ان جدید رجحانات کی وجہ سے کوئی صدمہ نہیں پہونچا ہے اور ان کے دوش بدوش مفید اور بلند ادبی موضوعات بھی رسالے کے لئے باعث زیب و زینت ہیں۔ ازاں جملہ او کھلے کی سیر "عید ڈنر" "غالب و داغ" "انیس کی شاعری" "زندگی اور عمل۔ اقبال کی نظر میں" "کبیر اور ان کی شاعری" "فانی کا مقام اُردو شاعری میں" وغیرہ اردو ادب کے مختلف دلکش گوشوں کو آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ نیز نظم کے معیار کو بھی ہم نے بلند تر اور ممتاز تر کرنے کی سعی کی ہے جس میں قابل شعراء نے ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ امید ہے کہ آیندہ قابل شعراء کے تعاون سے ہم معیار کو اور بھی بلند کرسکیں گے۔

اس شمارہ نے روایت قدیمہ کے اس پہلو کو کہ بہنوں کے مضامین بھی رسالے کی افادیت کو بڑھائیں۔ تازہ کرنا چاہا ہے۔ اور محترمہ دیاوتی استھانہ صاحبہ کی تاثر میں ڈوبی ہوئی نظم بعنوان "اقبال کی ایک شام" کا دوسرا منظر اس کی پہلی قسط ہے۔ نیز محترمہ موصوفہ کا تحقیقاتی مضمون "کبیر اور ان کی شاعری" بھی زینت صفحات ہے۔ اور ہماری یہ پرمسرت اُمید ہے کہ اور بہنیں بھی محترمہ موصوفہ کی تقلید کرتے ہوئے اپنے رسالے کو قابلِ التفات تصور فرمائیں گی اور آیندہ شماروں کو اپنے رشحاتِ قلم سے سرفراز کریں گی۔

اُردو زبان و ادب کے لئے یہ امر باعثِ صد طمانیت ہے کہ کلیۂ ہٰذا کی جملہ جماعتوں کے وہ طلباء جو اُردو میں اول رہیں ایک ممتاز اسکولرشپ حاصل کریں گے جو ہمارے ہر دلعزیز اور ادب نواز سابق صدر مرحوم قادر حسین خاں صاحب سے بطور یادگار منسوب ہے۔ مرحوم کی خدمت میں یہ ایک بہترین خراج عقیدت ہے جو کلیہ کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ اور ان مساعی جلیلہ کا عملی اعتراف ہے جو مرحوم محترم نے ترقیٔ اُردو کے لئے "بزم ادب" اور "نظام ادب" کے قیام اور اجرا کی صورت میں فرمائیں۔ ہم اس مبارک اور مستحسن اقدام پر کارکنانِ کلیہ کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں جس سے طلباء

میں باہمی مسابقت اور خدمت زبان اُردو کا صحیح جذبہ پیدا ہوگا جو کیا عجب ہے کہ دوسرے اداروں کے لئے ایک نمونہ ثابت ہو۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ رسالہ کی ہر اشاعت اپنے ادبی اور مادی معاونین کا مکمل نمونہ ہوتی ہے اور الحمد للہ اشاعت ہذا بھی اس باب میں پوری طرح مکمل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس چیز کے لئے معاونین کی خدمت میں ادائے تشکر عملاً اُن کے قیمتی تعاون کا کم از کم اعتراف ہے جو صفحات پر ظاہر ہو یا نہ ہو ہمارا اور جملہ بہی خواہان اُدب کا دل و دماغ یقینی طور پر اس سے لبریز ہے۔

احسانِ دوست درحقِ من بے نہایت است

نیاز کیش

سید ضیاء الحسن جعفری۔ معتمد

ترقی پسند ادب

سرخ سویرا (مجموعۂ کلام)	مخدوم محی الدین	۱۲آر
پرواز (" ")	علی سردار جعفری	عہ/۸ر
رگِ سنگ (" ")	علی جواد زیدی	عہ
نوید (" ")	صاحبزادہ میکش	عہ
پیک سحر (" ")	نظر حیدرآبادی	(زیر طبع)
پگڈنڈی (افسانے)	مترجمہ افضل عابدی	عہ/۸ر
سرخ فسانے (")	مترجمہ ڈاکٹر صادق	۱۲آر
محبت اور آزادی (")	مجنوں گورکھپوری	(زیر طبع)
نورس (")	ڈاکٹر صادق	(")
بیمار کی خاطر (")	شبیر حسین رضوی	(")
منجدھار (افسانے)	مرتبۂ غوث محی الدین	(زیر طبع)
یہ کس کا خون ہے؟ (ڈرامہ)	علی سردار جعفری	عہ/۸ر
یہ امرت ہے (")	خواجہ احمد عباس	۶ر
ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	(زیر طبع)
سویٹ روس	محمد کلیم اللہ	ے
اقبال اور اس کا پیام	علی سردار جعفری	(زیر طبع)
نیا ادب	انجمن ترقی پسند مصنفین کا واحد ترجمان	عہ/۵ر
چند دن لینن کے ساتھ	میکسم گورکی	عہ/۴ر
اجرتی محنت اور سرمایہ	کارل مارکس	۱۲ر
تعارف	جوان فکر حیدرآبادی شعرا کا کلام	۸ر

ملنے کا پتہ: دکن بک ڈپو، عابد روڈ

ناشر: اشاعت گھر، عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

ملنے کا پتہ: اورینٹ بک اسٹال، شاہراہ عثمانی

نواب تراب یار جنگ بہادر سعید

غزل

یہ چمن آرائیاں سارے زمانے کیلئے
کوئی تو بیتاب ہے جلوہ دکھانے کے لئے

یہ غنیمت ہے جفا ہی سے تری ہیں بہرہ ور
کون جیتا ہے محبت آزمانے کے لئے

کیا کریں گے حالِ دل مرا بیاں اہل جہاں
چاہیئے ان کی زباں میرے فسانے کے لئے

بیقراری کا یہ عالم تا بکے اے زندگی
چھوڑ جاؤں کچھ تو دردِ دل زمانے کے لئے

آج پھر یاد آرہے ہیں مجھ کو ایامِ نشاط
آج پھر بے چین ہوں آنسو بہانے کے لئے

موسمِ گل ہے نشیمن کی بنا کا ہے خیال
پھول بھی کچھ چن رہا ہوں آشیانے کے لئے

میں صداقت آشنا ہوں اور پابندِ ضمیر
رنگِ فطرت کس طرح بدلوں زمانے کے لئے

دامنِ اُمید کیا چھوٹے جو ہو اس کا یقین
عزم ہے درکار قسمت آزمانے کے لئے

غم کے پہلو کا عادی ہو چکا ہے قلبِ زار
اب طبیعت کیسے بدلوں مسکرانے کے لئے

جو مشیت کا خدا کی بار اُٹھالے اے سعید
بس وہی مخصوص دل ہے غم اُٹھانے کیلئے

آغا حیدر حسن مرزا
استادِ اردو

اُوکھلے کی سیر

اللہ محمد کے چہیتے صاحب عالم نے محلسرائے میں آنا شروع کردیا۔ کیا ایک بر ایک ہے۔ مقلب القلوب کی تسبیح۔ اب اس کی سُند نہیں کہ ساون سوکھے جائیں۔ سیر ہونی چاہیئے اور وہ بھی اُوکھلے کی۔ باغ تو اپنے ہی ہیں۔ جب چاہا چلیں گے۔ اور آج کل جھڑاں ناسپاتیاں ہی ہوں گی۔ یا امرود اور نیبو۔ قطب صاحب پھر کبھی سہی۔ شرف النسا یہ تمہارا درس سُن کون رہا ہے۔ کہ داغ اپنی جائے جاتا ہے۔ تم اپنا سن دیکھو اور یہ تہوم یہ خوب رہی کہ بڑھیا حال سے گئی احوال سے گئی۔ کیا اب دل کے خیال سے بھی جائے۔ رابعہ خانم نے کہا دلہن بیگم اللہ جانے رت تو ایسی ہی ہو رہی ہے۔ بھلا اس چار دیواری میں کیا مزہ۔ یہ قہقہہ دیواریں اور یہ دریا انگنائی اس پہ اس کالی گھٹا کی چھت نے تو پورا محل بھونرا بنا دیا۔ اللہ جانے وحشت ہونے لگی۔ آپ ذرا سا بڑی سرکار کے سامنے ذکر چھیڑ دیں۔ وہ کبھی انکار نہ کریں گی۔ آبادی خانم سارا انتظام کریں گی۔ اور انتظام کیا۔ آخر اللہ رکھو سے سوا سے کا پکتا ہی ہے۔ یہاں نہ پکا وہاں سہی یہاں نہ کھایا وہاں کھالیا۔ جو وہاں کی بھبڑ میں پکنا ایندھنا دوبھر ہو جائے گا۔ تو سب یہاں سے ہی پکا پکایا ساتھ لے لیا جائے گا۔ کوئلوں کی بوری اور انگیٹھیاں رکھ لیں گے۔ بیسن۔ مصالحہ۔ گھی۔ کڑھائیاں لے لیں۔ تو اب رہا کیا۔ یوں چٹکی بجاتے میں سب ہو جائیگا۔ پرسوں جمعہ ہے۔ مرد سب نماز کو جائیں گے۔ وہاں کوئی جی جم ہوگا۔ صاحب عالم ساتھ ہوئے تو کوئی کھٹکا نہیں۔ دو چوبدار کافی ہیں۔ دونوں بڈھوں کو لے لیں گے۔ لال خاں اور محب اللہ خاں ہیں بھی خوشدل۔ اس موئے عبداللہ خاں کو نہ لیجئے گا۔ نگوڑا بڑا شست رو ہے اور ولایت بیگ بھی نرا جانگلو ہی اجبک کہتیوں کا۔ ہمیشہ تیوری پر تین بل رہتے ہیں۔ صبح ہی صبح صورت دیکھ لی تو سارے دن کھانے کی خیر۔ سلا ہاں فرمائے تو جا کے عرض کر آؤں بڑی سرکار سے۔ انکار تو کسی تریوں کریں گی ہی نہیں۔ اللہ انہیں سوا سو سال سلامت رکھے۔ وہ بھی اُداس اُداس سی رہتی ہیں۔ جب سے منجھلی بیگما اصل خیر سے سدھاری ہیں۔ جی ہاں چلیئگا اچھا بی جاؤ توبہ ہے تم لوگوں نے میرا دماغ چاٹ لیا۔ خوب دل ہیں۔ چٹ چٹ بلائیں لے کر صدقے گئی تھی۔ زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ مُردہ دلوں کا کیا خاک جینا۔ اور اللہ ہماری مزے کرانے والی سرکار کو قیامت تو ڑی رکھے۔ یہ کہ جھپ جھپ جا صدر دالان میں بڑی بیگم صاحب کو ہوکا پیام سنادیا۔ وہ کہنے لگیں کہ سچ مچ دلہن بیگم کا سیر کو جی چاہا۔ اس پر کیچہ جان نے کہا کہ یہ سر سید دھوپ میں نہیں ہوا۔ اپنی

لنگر چھینیوں کا اُشغلا اُٹھایا معلوم ہوتا ہے۔ دلہن بیوی نے کدی نہ کہا ہوگا۔ دلہن بیگم! یہ انہیں لنگالیٹر پل کی پٹی پڑھائی ہے۔ ہاں دواجی کیا ہے بچے ہی کوئی ہرج نہیں۔ کہدو چلیں گے جمعہ کو۔ مگر اتنا کرتا کہ ایک آنکھ انتظام دیکھ لینا۔ میں ابھی آتوں جی سے کہدیتی ہوں۔ وہ باہر داروغہ جی کو کہوادینگی۔ اور بڑی داروغن کو میں حکم دیتی ہوں۔ وہ سب سامان مہیا کر دیں گی۔ چلے گی ساری محلسرائے۔ عمدہ کے طائفے کو بلوالو۔ پریا اس کی بیٹی ضرور آئے۔ اور کہنا نقلیں بھی ہونگی۔ ہواخوری کو جا رہے ہیں۔ فرنگی کی نقل ضرور کرے ڈرے نہیں۔ باہر نقلیں نہیں ہوں گی۔ کالے صاحب سے بنگلے کی اجازت منگوالی ہے۔ جاؤ سب تیاریاں کرو۔ مجھے نقل پڑھ لینے دو۔ تسبیاں بھی باقی ہیں۔ سارے محل میں ایک اُودھم مچ گئی۔ سب نے مہندیاں لگائیں جن کی مہندیاں پھیکی ہوگئی تھیں۔ انہوں نے اور رچائیں۔ سرخ سبز جوڑے پہنے۔ لال سبز ڈاک کے لاکھی جوڑے پہنے۔ سب بن سنور گئیں۔ کل ساماں لیس ہوگیا۔ اندھیرے منہ سب اٹھ کے تیار ہوگئے۔ بیڑے کے دربان پھاٹک کے باہر ہوئے۔ زنانہ پہرا بیڑے میں آگیا۔ عنابی روغن کا گھٹا ٹوپ۔ انگریز کی ولایت کا بنا دروازوں کی مٹھیاں گنگا جمنی۔ ولایتی چار تیلیا کمیت گھوڑے جتے، ہاتھی کے بچے۔ اونچائی میں ٹوپ اوڑھے فرنگی سے بھی دو مٹھی نکلتے۔ ان کا ساز و یراق گنگا جمنی۔ کلغی میں سارس کے گچھے دار پر سبز رنگے لگے۔ بڑی سرکار بہو بیگم۔ صاحب عالم اور بچے اس میں بیٹھے۔ پانوں کی ڈبیا کا کستا پھاگل اور تھالی جوڑ کٹورا ساتھ رہا۔ کیجہ جان بھی اسی میں تھیں۔ ریج گاڑیوں اور پالکی گاڑیوں میں خاندان والیاں اور معزز مصاحبین بیٹھیں۔ رتھوں میں منہ چڑھی مغلانیاں اور اصیلیں۔ بہلیوں منجھولیوں میں خوگیر کی بھرتی۔ ٹھیلوں چھکڑوں میں سامان لدکر پہلے ہی روانہ ہوگیا تھا۔ کوچبانوں نے مجرا عرض کرایا۔ روانگی کا حکم چاہا۔ ادھر کہا ہوں۔ اور ادھر اس نے بسم اللہ مجریہا مرسہا کہا اور کچھ پڑھ دائیں بائیں دم کر۔ ذرا باگ تان کے ڈھیلی کی کہ لگے گھوڑے پوں منہ پہ لئے اور ہوا سے باتیں کرنے۔ سائیسوں کی کرتیاں لال بانات کی اور اسی کے گھٹنے لال سبز بلیوڑے کی مندیلیں سروں پر۔ سفید چونریاں ہاتھوں میں۔ ہٹو بچو کا شور مچاتے۔ کوچبانوں کی لال بانات کے گول پردے کی وردیاں۔ کلابتونی ساز ٹکے۔ سفید سیدھے پاجامے۔ سفید پگڑیاں۔ کالی گرگابیاں روپہلی موٹے موٹے بکل لگے۔ ایک خاص وضع سے بیٹھے۔ سفید دستمال سے باگوں کو پکڑے۔ ایک ہاتھ سے کبھی کبھی چابک کا تڑاخا ہوا میں اُڑاتے گھوڑے طرارے بھرتے۔ آناً فاناً میں چھ سات کوس کی منزل ایک سانس میں طے کر آ پہنچے۔ ابھی محلہ والیاں سلطاں جی آدھے رستے میں ستا رہی تھیں۔ غنیمت ہے کہ پیش خدمتوں کو رات کو ہی روانہ کر دیا تھا۔ ورنہ کیسی کام کی تکلیف ہوتی۔ بنگلہ کی اجازت صاحب کلاں سے مل گئی تھی۔ فراشوں نے دریاں بچھا۔ چاندنیوں کا فرش کر۔ مسند تکیہ لگا دئے اشراق کی نماز پڑھ کے خاصے

کی سواریاں نکلیں تھیں۔ اوکھلے پہنچ کر چاشت کی نماز پڑھی بچے چمنوں میں کھیلتے کودتے پھر رہے تھے۔ مگر حکم تھا نگاہ کے رُوبرو رہیں آنکھ سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ کہ اتنے میں بیج گاڑیاں اور پالکی گاڑیاں آپہنچیں اور چخ چخ چوں چوں کرتی بہلیاں اور ہڑ جلڑ کرتی رتھیں بھی آگئیں۔ ماما اصیلیں۔ لونڈیاں باندیاں اپنی پنڈلیاں سہلاتی اور پاؤں جھٹکتی اتریں۔ کہ اتنی دیر میں قفس کے بیٹھنے سے آدھے دھڑ سُن ہو گئے تھے۔ بعض بچاریوں کو تو سواریوں میں جگہ نہ ملی تو منہ بولی خالہ ممانیوں کی گودوں میں چڑھ بیٹھیں۔ پرانے شیشموں اور پیپلوں کے موٹے موٹے مضبوط گدوں میں اور کہیں آموں کے موٹے ٹہنیوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ دس بارہ جھولے تھے۔ جمنا کا کنارہ۔ اوکھلا پرانا گاؤں بڑے موسیٰ خاں نواب محب الدولہ غلام رسول خاں کی جاگیر میں خانپور سینکڑہ۔ کینڈا کے گاؤں بھی اسی جاگیر میں شامل تھے ان کے بیٹے نواب دلاور الملک دلیر الدولہ محمد علی خاں فیروز جنگ کا زمانہ تھا کہ ۱۸۲۴ء میں کمپنی بہادر نے جاگیروں کی ضبطی کے احکام صادر کئے۔ اور یہ علاقہ ضبط ہو گیا۔ بڑی سرکار ان کی پوتی اور نواب نصیر الملک احتشام الدولہ علی محمد خاں رفعت جنگ کی بیٹی تھیں۔ ان کے باوا کو۔ اور خاندان کے سترہ مردوں کو پرانی عیدگاہ میں سن ستاون میں باڑھ مار کر کھتے میں ڈال دیا۔ خوش لال اوکھلے کا علمبردار تھا سُن کر دوڑا آیا مجرا عرض کرایا۔ دو روپے نذر گزرانے اور دعوت دی۔ بیگم صاحب وسیع الاخلاق اور قدیم الخدمتوں کی قدرداں۔ قبول کیا اور آنے کا وعدہ کیا۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا۔ اور وہاں سے کچھ کیرے۔ کام کاج کو بھجوائے۔ ہرے ہرے دودھیا بھٹے۔ ایک کوری ہنڈیا میں گاڑھی گاڑھی چھاچ۔ صحنک میں بیزاں شکر۔ اور مکھن سے چپڑی ٹھیکرے کی پکی مکئی اور بیجھڑ کی روٹیاں بھجوائیں۔ چولائی کی بھجیا بھی آئی۔ یہ سب چیزیں خاصے پر چنی گئیں۔ من سکھیا اس کی جورو لکڑی ٹیکتی بہوؤں بیٹیوں کو ساتھ لے آئی۔ جمردی کے لہنگے باندھنوں کی چندریاں بہوؤں کے گھونگھٹ شاہ عالمی روپوں کے۔ چاندی کے گہنے گودنی کی طرح لدی بڑھیا کے ہاتھ میں شاہی ہیں ٹھوس پچھلیاں تھیں تو اب بھی خولی کڑے تھے۔ گلے میں جگنی پڑی جوی کی چمپا کلیاں ادھوڑی کے کھوسرے جن پر سوت کی لکڑیاں اور چمڑی پنجے پڑے دور اتار۔ ننگے پاؤں سامنے آئی۔ پالاگن کی بہوؤں بیٹیوں کو پاؤں پڑوایا۔ اپنی پرانی مالکن کو دیکھ دھارم دھار رونے لگی اور اگلے پچھلے زمانوں کے ذکر کرنے لگی۔ لونڈیاں باندیاں آئیں۔ اِن کے برساتی رنگین جوڑے خواص پوڑکی داروغن نے بڑے سلیقے سے پہنوائے تھے۔ جو رنگ جس کے چہرے اور دَرج پر کھلتا تھا۔ وہی پہنایا۔ اندسبھا کا رنگ خوب گھٹا ہوا پکا تھا اور نقشہ تھا کھڑا کھڑا۔ اس کو گلناری جوڑا پہنایا۔ نرگس ہمیشہ کی روگن تھی۔ رنگ تھا یا ملتانی مٹی۔ نقشہ پھڈا پھڈا اس کو شوخ فیروزی پہنایا۔ صورت ہی بے بدل ہو گئی۔ اچھی طرحدار

معلوم ہونے لگی۔ ابی پھیا پھری ناک میں فیروزے کی کیل جو پہنائی تو خاص اونچی اونچی معلوم ہونے لگی۔ شام برن کا سانولا رنگ۔ تیکھا نقشہ۔ شفتی جوڑا پہن اروتا نظر آنے لگی۔ مبارک قدم کا سیبی رنگ تھا آپ پرنا فرمانی جوڑا خوب پھبا۔ کبھی سُرخ و سفید تھی سبز دوپٹہ کھائے جاتا تھا۔ کلچہ گلگو تھنا سی نگت گیہواں۔ اس پر سنگرفی خوب کھلا۔ غرض در وغن کو خوب شاباشی ملی۔ عمدہ اور اس کی بیٹی پریا اور پورا طائفہ خوب بن سنور کر آیا تھا۔ جھولے کی اجازت ملی۔ سب نے جھولنا اور لہک لہک کے گانا شروع کیا۔ مولسری کی چھتر گھیری چھاؤں میں تین کتل کے پتھر رکھ چولہا بنایا۔ کڑھاو چڑھا اور چھوکریوں کے لئے خرچی کا پکوان تلا جانا شروع ہوا۔ گھیٹوں پکڑ کڑھائیاں چڑھیں خاصے کا پکوان تلنا شروع ہوا گرم گرم اترتا جاتا ہے اور بھجوائے جاتے ہیں۔ عمدہ اور پریا نے کیا پنچم کے سُر میں ملہار گایا ہے کہ کوئل کوکتے کوکتے چُپ ہو گئی اور پپہیا سناٹے میں آ گیا۔ تیتری کی رٹ رکی۔ جھونٹے وہ لمبے لمبے لئے کہ درختوں کے ٹہنے چرچڑ کرنے لگے۔ شہر کی طرف سے وہ کالی گھٹا اندھیری دے کے اُٹھی کہ عجبہ مسجد کے مینار اور سفید گنبد اس میں اور بھی براق سے نظر آنے لگے۔ پھر بگلے جو جھڑ پیپل کے ٹنٹ پر بیٹھے تھے قطاریں اُڑے پر جو نکلے تو رام بگلے معلوم ہونے لگے۔ اور اس گھٹا ٹوپ اندھیری میں ان کی ہوا میں قطار تھی یا کپٹی راون کی گود میں سے مجلتی ستونتی سیتا نے اپنی موتی مالا پھینکی۔ جو کسی راچھس کے بل سے بیچ اندھیری میں رہ گئی تھی۔ موروں نے وہ مست ہو کے جھنگارا ہے کہ میگھ راگ مجسم آ گئے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جمنا جی پر تختوں کا بند باندھا ہے کوس بھر کا پاٹ ہو گیا۔ تختوں پر سے پانی کی چادر چھٹتی ہے جگہ جگہ قرینے سلیقے سے چمن بندی۔ مرغزار۔ جو یہاں سے نہریں نکالی گئی ہیں۔ ان کے پھاٹک فولادی سرخ روغن چڑھے۔ ان کی درازوں میں سے پانی ایک خاص قسم کی آوازیں نکالتا۔ گرتا چلا جاتا۔ چھوٹے چھوٹے پل مختلف چمن بند حصوں کو ملاتے۔ نہروں کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے سایہ دار درخت ایک سے ایک ملا ٹھنڈی گھپا بناتا۔ صاحب عالم اور دولہن بیگم چرخی دا چھڑیں لے کر نوکروں سے ذرا اوٹ میں بیٹھے مچھلی کا شکار کر رہے ہیں۔ دولہن بیگم پر ساس کا تعبیہ ہے کہ ماما اصیلوں لونڈیوں باندیوں میں خلا ملا کرنے سے بدرُعبی ہوتی ہے اور سرکاری موجودگی ان کی بے تکلفی اور مزے میں کھنڈت ڈال دے گی۔ اس لئے ایک رسمی طرح دے دی گئی ہے اور وہ سب آسمان سر پر اُٹھائے ہیں۔ بہو بیگم کا جی چاہتا تھا کہ ہم سن سہیلیوں کو دعوت دیکر بلائیں اور ساتھ لائیں۔ بڑے افسروں کی لڑکیاں۔ ان کے رقعوں پر صاحبزادی لکھا۔ بڑی سرکار کو پسند نہ آیا۔ کہا کہ اگر ملازم پیشوں کی لڑکیاں صاحبزادی ہوئیں تو جو صاحبزادیاں ہیں وہ کیا شہزادیاں ہو جائیں گی اور پھر شہزادیاں جو ہیں ان کو کیا لکھا جائے ان کے لئے دختر لکھنا کافی ہے۔ بہو بیگم ان میل جال کی نزاکت کے الجھاؤوں سے گھبراتی تھیں۔ خاندان کی مرجادا کے خلاف کیا نہ جاتا۔ ان قدیم روایات

کا باقی رکھنا جزو ایمان۔ اس لئے نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ آپ بھلے اپنا گھر بھلا۔ آج کل کی بیویاں شاید تیجہ اُٹھم کمنی کہیں۔ لیکن وہ تو اس استہزار کو سمجھ بھی نہ سکتی کیونکہ گھر ہوتا ہی ہے گھسے رہنے کے لئے۔ موٹی موٹی بوندیں جمنا کے پانی میں پڑیں اور پڑ کر اچھلیں سفید سفید بلبلے بنے اور پھوٹے۔ جلدی سے چرخی پہ ڈور دونوں میاں بیوی چڑھا، چمڑیں سنبھالتے بنگلے کی طرف بھاگے۔ لونڈیاں باندیاں ساری محل والیاں اسی طرح جھولوں پہ بھیگتی رہیں وہ موسلا دھار بارش ہوئی کہ توبہ۔ محل میں آیا۔ جن کے جوڑے پڑیا کے رنگ کے تھے وہ تھے کچے۔ بھیگ کے رنگ چھوٹ کے عجیب ان کی ہیکل بن گئی۔ اور جن کے کسوم کی زمین پر تھے وہ ایسے پکے کہ پانی کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر مغرب کی نماز کے بعد گھر لوٹے۔ لوٹتیوں میں دوسرے راستے سے چلے، سلطان جی اور پرانے قلعے کی سڑک بن رہی تھیں۔ گاڑیاں روڑیوں اور بجوا پتھروں میں چل نہ سکیں گھوڑے اڑے گھبرا کے سب اتر پڑے اور کوئی پاؤ کوس پیدل چلنا پڑا۔ اگر وہ پاؤ کوس کیا تھا۔ رستم کے ہفت خواں تھے۔ بیبیو پکڑیو جانے نہ پائے۔ وہ چلا وہ چلا کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ اور بڑے بڑے منڈاسے باندھے گنوار لٹھ لئے لوٹنے آتے بھی دکھائی دیئے۔ بہو بیگم جو گھبرائیں۔ سارا زیور محل میں بڑھا کر آئیں تھیں۔ بے خیالی میں ہیرا تراش کے توڑے پانوؤں میں پڑے رہ گئے جلدی سے اتار وہیں سڑک پر گھبراہٹ میں ڈال دئے۔ توشہ خانے کی داروغن کو خیال آیا۔ وہ اسفندیار بن کر بیس گز پیچھے اکیلی گئیں اور اٹھا کر لے آئیں۔ برسوں ان کی جرأت کے فسانے ہوتے ہیں۔ اس گھبراہٹ اور افراتفری میں جو جو باتیں اور خفیف حرکتیں ہوئیں وہ آج تک اس محل میں نقل محل میں آتے بولتا صندوقچہ بیویوں کی محفل میں سنئے گا۔ اللہ حافظ　　(نشر شدہ)

ارزاں خریداری کا مرکز

مصنوعات ملکی اینڈ جنرل اسٹورز

عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

جناب آفتاب علی صاحب مہر

غزل

ہوں قید اس طرح کہ گرفتار بھی نہیں
دنیا میں رہ کے اس کا طلبگار بھی نہیں

وہ درد ہے جو درخورِ اظہار بھی نہیں
یعنی رہینِ منتِ گفتار بھی نہیں

آغازِ کارِ عشق میں فکرِ مآلِ کار
مشکل وہ آپڑی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ملبوس مستعار ہوا دستبردِ غم
باقی قبائے زیست میں اک تار بھی نہیں

آتی ہے کوہِ طور سے اب تک یہی صدا
دنیا میں کوئی طالبِ دیدار بھی نہیں

ارزاں ہے گر متاعِ گرانِ ہنر تو کیا
اگلی سی اب وہ گرمیٔ بازار بھی نہیں

میرا تو یہ گنہ کہ سراپا خطا ہوں میں
زاہد کی یہ خطا کہ گنہگار بھی نہیں

گھلتا ہوں مثلِ شمع غمِ جانگداز سے
وہ غم نصیب ہوں کوئی غمخوار بھی نہیں

ہوں پائے بندِ کشمکشِ جبر و اختیار
آزاد بھی نہیں ہوں گرفتار بھی نہیں

پایا ازل میں بادۂ غم بھی تو ناتمام
یعنی بقدرِ ظرف قدح خوار بھی نہیں

پیری میں سرد ہوگئے سب دل کے ولولے
مہر اب وہ اگلی گرمیٔ اشعار بھی نہیں

"ناکارہ" حیدرآبادی
سابق طالب علم

غائب دماغ

پروفیسر اسحٰق غدار کھے بڑے غائب دماغ آدمی ہیں۔ غائب دماغی کا کبھی مقابلہ منعقد ہو تو یقین ہے کہ وہ پہلا انعام اگر نہیں تو دوسرا انعام تو ضرور حاصل کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ ان کے دماغ کی ساخت خاص ہے۔ علمی شغف و انہماک نے انہیں اس حال کو پہنچا دیا ہے اور ان پر یہ قول صادق آنے لگا ہے۔

کہتے ہیں "علم" جس کو خلل ہے دماغ کا

ان کی غائب دماغی کے چند واقعات مشتے نمونہ از خروارے یہاں بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اخبار آیا ہے۔ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ عینک ڈھونڈ رہے ہیں۔ کوٹ کی جیبوں میں۔ میز کے خانوں میں پلنگ کے نیچے۔ پلنگ کے اوپر۔ کہتے جاتے ہیں "کمبخت کہاں گم ہوگئی؟ ابھی ابھی یہیں رکھی تھی"۔ اتنے میں بیوی آتی ہیں۔ اس دوڑ دھوپ کی وجہ دریافت کرتی ہیں معلوم ہوتا ہے۔ عینک نے پریشان کر رکھا ہے۔ بیوی ہنس کر کہتی ہیں "واہ! عینک تو آپ نے لگا رکھی ہے"۔ اس انکشاف پر کھسیانی مسکراہٹ طاری کر کے فرماتے ہیں "اوہ! خیال ہی نہ رہا۔ جب ہی تو میں کہوں چیزیں صاف نظر آرہی ہیں"۔

کسی بڑے آدمی سے ملنے جاتے ہیں۔ ملاقات نہیں ہوتی۔ گھر آتے ہیں۔ موٹر سے اترکر اپنے ہی ملازم کو کارڈ دے کر کہتے ہیں۔ "یہ کارڈ صاحب کو دینا" ملازم کو حیرت مطلق نہیں ہوتی۔ ریخ کی طرح اس غائب دماغی کا وہ خوگر ہوگیا ہے۔ وہ مسکرا کر کہتا "صاحب تو آپ ہی ہیں"۔ حیرت سے پوچھتے ہیں۔ "تو کیا میں گھر آگیا؟"

میاں بیوی کہیں جا رہے ہیں۔ جو چیزیں پروفیسر صاحب بھول جائیں یاد دلانا بیوی کا فریضہ ہے۔ چنانچہ بیوی موٹر میں سوار ہو کر کہتی ہیں "ہیٹ تو اندر ہی رہ گئی"۔ "اوہ" کہہ کر اندر جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آتے ہیں۔ ہیٹ اب بھی ندارد۔ بیوی بازپرس کرتی ہیں "اجی صاحب ہیٹ کہاں ہے؟" فرماتے ہیں "ارے! تو کیا تم نے ہیٹ کو کہا تھا؟ میں سمجھا گھڑی کو کہا تھا۔ گھڑی لے کر آرہا ہوں"۔

بیوی اپنی بہن کو خط لکھ رہی ہیں ختم کرنے کے بعد کہتی ہیں "آپ باہر جا رہے ہیں۔ یہ خط ڈاک میں ڈال دیجئے"۔ خط لے کر پڑھتے ہیں۔ پھر بڑے فخر سے نکتہ چینی فرماتے ہیں "بیگم اب تم بھی غائب دماغ ہوتی چلیں۔ آج تاریخ ۱۵ ہے۔ اور تم نے ۲۰ لکھدی ہے"۔ بیوی مسکرا کر جواب دیتی ہیں "تاریخ میں نے سوچ سمجھ کر لکھی ہے۔ یہ خط آپ کو کم از کم پانچ دن بعد یاد آئے گا" فرماتے ہیں "واہ یہ زیادتی ہے۔ کیا میں اتنا غائب دماغ ہوں؟"

جس زمانہ میں موٹر خریدی تھی تب کی بات ہے۔ ایک روز کالج موٹر میں جاتے ہیں۔ کالج پہنچ کر موٹر سے اترتے ہیں اور ڈرائیور کو بڑی تہذیب سے سلام کر کے کہتے ہیں "جناب کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے لفٹ دیا"۔

ایک اور واقعہ مشہور ہے۔ دروغ برگردن راوی۔ بیوی کے ساتھ کسی ٹی پارٹی میں تشریف لے جاتے ہیں۔ یہاں تک تو خیر روایت ملتی ہے۔ مگر اس کے بعد وہ الگ الگ روایتیں ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں۔ پارٹی میں ایک خاتون کو غور سے گھور کر فرماتے ہیں "معاف کیجئے۔ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ یاد نہیں آتا"۔ وہ خاتون قہقہہ مار کر کہتی ہیں۔ "ابھی صاحب۔ میں آپ کی بیوی ہوں"۔ دوسری روایت یہ ہے۔ کسی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں میزبان پوچھتا ہے "کس کی تلاش ہے؟" جواب ملتا ہے "اپنی بیوی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ خدا معلوم کہاں غائب ہوگئیں؟ ابھی ابھی یہیں بیٹھی تھیں"۔ میزبان ہنس کر نشان دہی کرتا ہے "واہ۔ وہ دیکھئے۔ سامنے ہی تو بیٹھی ہیں"۔ شرما کر کہتے ہیں "اب تو واقعی حافظہ کمزور ہوتا جا رہا ہے"۔

غرض یہ کہ پروفیسر اسحق کے بڑے بڑے لطائف مشہور ہیں' ایسے اور اتنے کہ ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

نصرت ایک نوجوان ہے۔ ویسے تو وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ مگر اس کا دماغ ایک سلو موشن کیمرہ ہے۔ مطلب یہ کہ وہ بات دیر میں سمجھتا ہے۔ آج آپ کوئی لطیفہ کہئے۔ کل وہ آپ سے ملتا ہے اور قہقہے مار کر کہتا ہے "واللہ! کل کا لطیفہ خوب رہا۔ ابھی ابھی وہ نکتہ میری سمجھ میں آیا"۔ آپ نے سال گزشتہ گالی دی ہوگی وہ اس سال غصہ میں آتا ہے مثلاً احباب اس کے گھر میں جمع ہیں۔ نوجوانوں کی محفل میں موضوعات بحث پر لڑکیوں کا تذکرہ سرفہرست ہوتا ہے چنانچہ یہاں بھی لڑکیوں کے چرچے ہو رہے ہیں۔ ایک صاحب کہتے ہیں "سنا تم نے؟ فلاں لڑکی جو بورڈنگ میں رہتی ہے اس نے اپنی ماں کو خط لکھا۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس میں یہ بھی لکھا کہ مجھے پنگ پانگ سے عشق ہے۔ یہ سن کر عقل کے دشمن باپ نے اپنی بیوی سے کہا۔ "دیکھا تم نے؟ میں کہتا تھا' لڑکی کو اتنی آزادی نہ دو مگر تمہاری سمجھ میں نہ آیا۔ ناقص العقل جو ٹھہریں۔ اب ہوش آئے گا۔ اب بھگتو تمہاری لاڈلی بیٹی جا کر کسی چینی لڑکے پر عاشق ہوگئی ہے"! قہقہے بلند ہوئے پھر سب ہنسی سے فارغ ہو کر ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ دفعتاً نصرت صاحب زور سے ہنس پڑتے ہیں۔ "ہی ہی ہی!" سب حیران ہو کر پوچھتے ہیں "بھئی کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟" جواب ملتا ہے "ارے وہی پنگ پانگ۔ ہی ہی ہی! کیا مزے کی بات کہی! لطف آ گیا"۔

کوئی دوست کہتا ہے "ارے یار تو بازار جا رہا ہے۔ ذرا میرے لئے مٹھائی لیتے آنا مگر یار تو ذرا جلدی

احمق ہے۔ کوئی اور چیز اٹھا لائے گا۔ نکٹائی چاہیئے نکٹائی۔ لائے گا نا تُو؟ تو میرا بھائی ہے۔" نصرت کہتا ہے۔ "اچھی بات ہے۔ لا دوں گا۔" پھر ایک فرلانگ جا کر واپس آتا ہے اور غصہ سے کہتا ہے۔" نہیں لاتا۔ تیرے باپ کے نوکر ہیں جو تو نے فرسٹ کلاس احمق کہا تھا۔"

نصرت پروفیسر اسحق کے ہاں جاتا آتا ہے۔ ایک روز ایک دوست عقیل کہتا ہے۔" یار نصرت۔ ہم سمجھ گئے۔ تیری آمد و رفت وہاں زیادہ کیوں ہوگئی ہے۔ تو پروفیسر صاحب کی لڑکی کے لئے جاتا ہے۔ ہے نا یہی بات۔ مگر یار تُو ہے بڑا خوش قسمت پروین بڑی خوبصورت ہے۔" خوشی کے مارے نصرت کا چہرہ سُرخی کی دوات بنجاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے:" تجھے اس کا نام کس طرح معلوم ہوا؟"

عقیل ہنس کر کہتا ہے۔" ہم کو کیا نہیں معلوم؟ ہم رتّی رتّی کی خبر رکھتے ہیں۔ ہم چلتی پھرتی خبر رساں ایجنسی ہے۔"

اب نصرت پروین کی تعریفیں شروع کر دیتا ہے۔ اس کے اوصاف و خواص اس طرح بیان کرتا ہے جس طرح زمانہ طالب علمی میں ہائیڈروکلورک ایسڈ یا کاربن ڈائی آکسائڈ گیس کے خواص استاد کے سامنے بیان کیا کرتا تھا۔ پھر کہتا ہے۔" پروفیسر صاحب با تو ولی صفت آدمی ہیں۔ وہ مجھے بہت پسند کرتے ہیں۔ ہر وقت مجھ سے علمی گفتگو کیا کرتے ہیں۔ مگر یار میں بھی ایک گھاگ ہوں۔ سمجھ میں خاک نہیں آتا مگر ہاں ہاں کہتا رہتا ہوں وہ ذرا غائب دماغ تو ہیں۔ مگر بڑے قابل آدمی ہیں۔ بہت کم ان کے پائے کے نکلیں گے۔"

عقیل بول اٹھتا ہے۔" لیجئے اب معشوق کے باپ کے قصیدے شروع ہو گئے۔ اچھا ہے۔ اسی طرح پروپگنڈا جاری رکھو۔ کسی دن ترس کھا کر بیٹی دینے پر راضی ہو جائیں گے۔"

" مگر یار پروین کی والدہ بڑی ظالم ہیں۔ میں ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ میں ان کے دل میں راہ پانے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کرتا ہوں۔ اچھے سے اچھا سوٹ پہن کر جاتا ہوں۔ بہت سعادتمند بنا رہتا ہوں کوئی نہ کوئی نیکی کر کے دکھاتا ہوں۔ مگر وہ عورت ہے کہ کسی طرح قابو میں نہیں آتی۔"

" اچھا تو یوں کہو۔ یہ محنت مشقت کر کے آراستہ پیراستہ بن کر جاتے ہو تو وہ پروین کو نہیں پروین کی ماں کو دکھانے کے لئے ہے۔"

" اور نہیں تو کیا؟ پروین بھولی بھالی لڑکی ہے۔ لنگوٹی لگا کر جاؤں تو بھی اسے اعتراض نہ ہوگا مگر اس کی ماں۔ افوہ! بڑی ہی ــ بڑی ہی ــ کیا کہتے ہیں اسے ــ بہرحال تم سمجھ گئے ہو گے میرا مطلب۔ وہ ہنسی کی بات کہتی ہے تو میں بغیر سمجھے فوراً ہنس دیا کرتا ہوں۔ پھر بھی وہ مجھے خاطر میں نہیں لاتی۔ خدا ہی اس کے دل میں رحم ڈالے تو ڈالے۔ در اصل وہ پروین اپنے ایک دوست کے لڑکے نقیب کو دینا چاہتی ہے۔"

" اچھا وہ ریلوے میں ہے؟"

"ہاں وہی کمبخت۔ بہت اکڑتا ہے۔ بڑی شان کی لیتا ہے پروین بھی اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ مگر ماں کے ڈر سے چپ ہے۔"

اتنے میں اور احباب آجاتے ہیں۔ پوچھتے ہیں "کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ جب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب کا خاندان زیر بحث ہے تو ہنسی مذاق شروع ہو جاتا ہے۔ پروفیسر صاحبان کی غائب دماغی کے لطیفے سنائے جاتے ہیں۔ ایک صاحب کہتے ہیں۔ "ایک غائب دماغ پروفیسر صاحب تھے۔ ان کے کسی دور کے عزیز کا انتقال ہو گیا۔ پروفیسر صاحب جنازہ میں جانا تو چاہتے تھے مگر بھول گئے۔ کئی روز بعد یاد آیا تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر بیوہ کو پرسہ دینے تشریف لے گئے۔ تعزیت کے رسمی جملے کہنے کے بعد فرمایا "افسوس کہ میں شریک نہ ہو سکا۔ دوسری مصروفیات میں بھول گیا۔ لیکن وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسا موقع پیش آیا تو کبھی نہیں بھولوں گا۔"

قہقہوں کی آواز دبنے کے بعد دوسرے صاحب ایک اور لطیفہ سناتے ہیں۔ "ایک ولایتی پروفیسر صاحب بھی غائب دماغ تھے بدقسمتی سے ان کی بیوی بھی غائب دماغ پیدا ہوئی تھیں۔ ایک روز رات کے کھانے کے بعد میاں بیوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بیوی نے گھبرا کر شوہر سے کہا۔ "اوہ! میرے شوہر آ گئے۔ آپ جلدی سے چلے جائیے۔" یہ سن کر پروفیسر صاحب بوکھلا گئے اور فوراً کھڑکی سے کود کر بھاگ گئے۔"

اس شاہکار لطیفہ پر سب (سوائے نصرت کے) لوٹ لوٹ کر قہقہے مارتے ہیں ہنسی کے مارے سب کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہنستے ہنستے سب بے دم ہو جاتے ہیں۔ سکوت چھا جاتا ہے۔ پھر ایک دم سے ایک قہقہہ فضا میں گونجتا ہے۔ یہ نصرت کا قہقہہ ہے جو مشین گن کی طرح سر ہو رہا ہے۔ "ہی ہی ہی! واللہ حد ہو گئی غائب دماغی کی۔ ہی ہی ہی۔ کمال ہے کمال۔"

اب دوست مل کر نصرت کو بنانے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایسے سُست دماغ عاشق صاحب ابھی جوڑی ہے۔

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

ایسے باپ کی بیٹی کو ایسے ہی نوجوان سے شادی کرنی چاہئیے۔ وہ چراغ رخ زیبا لے کر ڈھونڈتی پھرے، پھر بھی ایسا نجیب الطرفین احمق ہمدرست نہ ہوگا۔

اس مذاق کے بعد دوست رخصت ہوتے ہیں۔ عقیل آخر میں جانے لگتا ہے تو نصرت دوڑ کر آتا ہے اور اس کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مار کر کہتا ہے "یار تو بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ عقیل تعجب سے پوچھتا ہے "شکریہ مگر بات کیا ہے؟"

نصرت کہتا ہے "کیا اتنی جلدی بھول گیا؟ میں بھی بھول گیا تھا۔ مگر اب یک بیک یاد آ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے تو نے کہا تھا۔ میں پروفیسر صاحب کے ہاں پروین کے لئے جاتا ہوں۔ یار بتا تجھے یہ کس طرح معلوم ہوا؟"

نصرت پروفیسر اسحٰق سے باتیں کرتا بیٹھا ہے۔ پروفیسر صاحب کہہ رہے ہیں: "تو آپ سمجھ گئے مسٹر قدرت
نصرت نے تصحیح کی۔ جی مجھے نصرت کہتے ہیں۔"

ہاں۔ نصرت نصرت ہو یا قدرت۔ نام میں کیا رکھا ہے؟ ہمارے نام ماں باپ رکھتے ہیں۔ اس کی ذمہ داری ہم پر عاید نہیں ہوتی اسی لئے اکثر انسان اسم بامسمٰی کے بجائے اسم بے مسمّٰی ہوتے ہیں نام کچھ کام کچھ اعمال و افعال کے لحاظ سے نام رکھے جائیں تو وہ کچھ اس قسم کے ہوں گے۔ عیار احمد غنیم الدین۔ ظالم حسین احمق اللہ خاں، منافق علی وغیرہ۔

پھر آپ نے کبھی غور کیا؟ آجکل لڑکے والدین کے اطاعت گذار نہیں رہے۔ نافرمان ہو گئے ہیں۔ اکبر نے کہا تھا ؎

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبرالٰہ آبادی کو آپ نے پڑھا ہے؟ ہاں پڑھا ہو گا۔ پڑھنے کی چیز ہے۔ اکبر ایک طرف اور دوسرے تمام شعرا ایک طرف پھر بھی اکبر کا پلہ بھاری رہے گا۔ کیسی کیسی پتہ کی باتیں ہنسی ہنسی میں کہہ جاتا ہے۔ اپنی قسم کا پہلا اور آخری شاعر ہے۔ ہا! کیا آدمی تھا! کہتا ہے، دیکھئے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

آجکل اردو ہندی کا بڑا جھگڑا ہو رہا ہے۔ لمبے چوڑے مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ مگر دیکھئے ایک شعر میں اس قادرالکلام شاعر نے کیا بات کہدی ہے، کہتا ہے۔

بسکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں
کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

اس موضوع پر اس سے بہتر اور جامع مضمون مجھے آجتک نہیں مل سکا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا، کچھ آپ کو یاد ہے مسٹر عظمت میں کیا کہہ رہا تھا۔
"جی میرا نام نصرت ہے اور آپ کچھ باپ بیٹے کی بات کہہ رہے تھے۔"

"ہاں ہاں۔ یاد آگیا۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ بیٹے ماں باپ کی پسند کی ہر چیز کو ناپسند کرنے لگے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں لڑکے پھر وہ نام کیوں اختیار کئے رہتے ہیں جو ان کے ماں باپ نے انہیں دے رکھے ہیں؟ کیوں نہیں وہ عاقل بالغ ہوتے ہی ان کو بھی بدل ڈالتے، تب یہ سیول نافرمانی مکمل ہو جائے گی۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ نام میں کیا رکھا ہے؟ شکسپیئر کہتا ہے، گلاب کو کوئی نام دے دیجئے۔ پھر بھی اس کی خوشبو ویسی ہی رہے گی۔

آپ کا نام چاہے عزت ہو یا عظمت یا کچھ اور۔ آپ وہی رہیں گے جو ہیں۔ اور میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ آنے والے زمانے میں ناموں کا یہ جھگڑا ختم کر دیا جائے گا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ آدمیوں کے نام کے بجائے نمبر ہوا کریں گے جی ہاں نمبر۔
جناب کا اسم گرامی ——"

"جی مجھے نصرت کہتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ آپ کا نام نہیں پوچھ رہا تھا۔ بلکہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آئندہ زمانے میں جناب کا اسم گرامی پوچھنے کے بجائے یہ پوچھیں گے۔ جناب کا نمبر گرامی؟— —— ہاں تو مسٹر ندرت میں یہ کہہ رہا تھا کیا کہہ رہا تھا؟ کچھ آپ کو یاد ہے؟ بات یہ ہے کہ اب عمر زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ حافظہ وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ غالب نے کہا تھا۔

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

غالب بھی بڑا پایہ کا شاعر گذرا ہے۔ کیا نکتہ رس دماغ پایا ہے ظالم نے! زندگی میں وقتاً فوقتاً مختلف جذبات ہمارے اوپر طاری ہوتے ہیں۔ ایسی ہر کیفیت کے لئے ایک آدھ دل نشین شعر آپ کو غالب کے ہاں مل جائے گا غرض یہ کہ مسٹر وحدت۔ میں یہ کہہ رہا تھا۔ مقدور ہو تو میں بھی ایسے آدمی کو ساتھ رکھوں جو مجھے یاد دلاتا رہے کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں تو مسٹر عصمت۔ آپ کو یاد آیا، میں کیا کہہ رہا تھا؟"

نصرت کو قطعاً کچھ یاد نہیں آ رہا ہے اور وہ سوچ ہی رہا ہے کہ کیا بات بنائے کہ ٹیلیفون آتا ہے۔
ایک صاحب کہہ رہے ہیں۔ "پروفیسر صاحب جلسہ کا وقت ہو گیا ہے۔ سب لوگ آ گئے ہیں۔ آپ ہی کا انتظار ہے آپ کی تقریر کے سب بے چینی سے مشتاق ہیں۔"

"اوہ! میں بالکل بھول گیا تھا کہ میری تقریر ہے۔ اچھا کیا۔ آپ نے یاد دلایا۔ میں ابھی آیا۔" ٹیلیفون رکھ کر نصرت سے فرماتے ہیں۔ "مسٹر عظمت آپ بھی چلئے۔ میری تقریر ہے۔ مگر موضوع کیا ہے؟ یہ تو میں بھول ہی گیا اور دیکھئے۔ یہ بھی یاد نہ رہا کہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے۔"

نصرت کہتا ہے۔ "اخبار میں چھپا ہے۔ آپ کی تقریر 'حافظہ' پر ٹاؤن ہال میں ہونے والی ہے۔"

"خوب! خوب! آپ کا حافظہ ماشاء اللہ بہت اچھا ہے۔ کیوں نہ ہو، جوان آدمی ہیں۔ ایک زمانے میں ہمارے حافظہ کا بھی یہی عالم تھا۔ انسان کا حافظہ کیا چیز ہے؟ اس پر ہمیں غور کرنا ہے حافظہ اس قوت کو کہتے ہیں کہ جس کی مدد سے انسان —— "

نصرت دیکھتا ہے، تقریر سے پہلے تقریر سُننی پڑ رہی ہے۔ وہ قطعِ کلام کر کے کہتا ہے۔ "چلئے دیر ہو رہی ہے۔"

اور پھر اچانک ایک خیال آتا ہے۔" اور میں آپ کا بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے نام کی بحث کے سلسلہ میں مجھے گلاب سے تشبیہ دی تھی۔"

نصرت پروین سے باتیں کرتا بیٹھا ہے۔ وہ پروین کو بتا رہا ہے کہ اس کے والد ماجد کی غائب دماغی پر نصرت کے دوست کیسی کیسی پھبتیاں کہتے ہیں۔ وہ پروین کو یہ بھی بتا رہا ہے کہ خود اپنے "آہستہ خرام بلکہ مخرام" قسم کے اہب دماغ کے متعلق یار لوگوں کے خیالات کیا ہیں۔ پروین اس سیدھے سادے بلکہ سادہ لوح نوجوان کی اس صاف گوئی پر رہ رہ کر مسکرا رہی ہے۔ وہ اپنی لیاقت بگھارتا اور اپنے کارنامے بیان کرتا تو وہ اتنی متاثر نہ ہوتی جتنی اس حماقت مآبی سے متاثر ہوتی ہے۔ پروین کی فطرت ہی کچھ اس قسم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نصرت کے رقیب نصیب سے چڑتی ہے۔ وہ بہت مغرور ہے۔ خود کو ہمہ داں سمجھتا ہے۔ خود بیں، خود نما اور خود پرست ہے۔ وہ اپنی والدہ سے دل میں خفا رہتی ہے کہ کیوں وہ ایسے نوجوان کو طرح دئے جاتی ہیں اور ستم بالائے ستم اس کو دامادی کا شرف بخشنے پر اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔

اتنے میں نصیب حسب عادت شور و غل کرتا ہوا آتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ اسے فوج میں کمیشن مل گیا ہے وہ اب عنقریب محاذ پر جانے والا ہے۔ اس اعلان پر سننے والوں کے تاثرات مختلف طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔

پروفیسر صاحب "ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا" کہہ کر جنگ اور نوجوان پر لکچر دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔

نصرت خوش ہو کر نصیب کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہے۔

پروین اطمینان کا سانس لیتی ہے اور پوچھتی ہے۔" آپ کب جا رہے ہیں؟"

پروین کی ماں بڑی فصاحت و بلاغت سے "لو اور سنو" سے تقریر شروع کر کے ہٹلر کو صلواتیں سناتی ہیں۔ اور رونگٹے کھڑے کر کے جنگ کی ہولناکیوں کا نقشہ کھینچتی ہیں اور بالآخر نصیب کی نادانی کا رونا روتی ہیں اور "باز آ باز آ" پر تان توڑتی ہیں۔

مگر نصیب کا اصول ہے، سب کی سننا اپنی کرنا۔ اسے اپنے مستقبل کی فکر ہے۔ وہ امام ضامن باندھے ہوئے "بسلامت روی و باز آئی" کی قسم کے نعرے سنتا جنگ پر چلا جاتا ہے جس طرح دنیا کے بہت سے مفید اور قوم ساز کام "جنگ کے ختم" کے وعدے سے ملتوی رہتے ہیں اسی طرح وہ پروین کے مسئلہ کو بھی تا اختتام جنگ اٹھا رکھتا ہے۔ اسے پورا بھروسہ ہے کہ پروین کی والدہ ہوتے ہوئے وہ کسی اور کی نہ ہوگی۔

اب میدان رقیب سے صاف ہو گیا ہے اور نصرت اپنی سرگرمی تیز کر دیتا ہے۔ نصیب کے جانے کے دوسرے ہی روز اسے یک بیک خیال آتا ہے کہ نصیب نے کوئی مہینہ بھر پہلے نصرت سے قہقہہ مار کر کہا تھا۔ "نصرت۔ میں سپو چڑیا گھر گیا تھا۔ وہاں ایک گوریلا دیکھا بے اختیار تم یاد آ گئے"۔ اس مسخرے کا آخر مطلب کیا تھا؟ کیا نصرت گوریلا ہے؟

وہ اب اس سے پوچھنا چاہتا ہے۔ مگر وہ بے ہودہ شخص جنگ پر چلا گیا ہے رہ رہ کر غصہ آرہا ہے۔ خیر جنگ کے ختم پر وہ آئے گا تو وہ ضرور اس کی مزاج پرسی کرے گا کہ "دیکھو نصیب۔ اپنے الفاظ واپس لو۔ ورنہ ـــــ ورنہ جانے دو!
ہاں تو وہ پروین کی والدہ کو ہم نوا بنانے کے لئے وہ سب کام کر رہا ہے جو اس کے امکان میں ہیں۔
پروفیسر صاحب کی سفارش پہنچا رہا ہے۔ مگر بیوی بالادست ہے۔ شوہر زد میں ہیں۔ پروین بے بس ہے بس ایک ہی صورت ہے۔ پروین کی والدہ کا انتقال پُر ملال۔ مگر اس کا بھی مستقبل قریب میں کوئی امکان نہیں۔ بھلا ڈکٹیٹر جلد مرتے ہیں۔
اس طرح کئی مہینے گذر جاتے ہیں۔ اور نصرت مایوس و مجبور محض اپنی جگہ سے ایک پانچ نہیں بڑھتا۔

پھر ایک خبر اُڑتی ہے۔ نصیب صاحب میدان جنگ پر چل بسے۔ گڑبڑ میں کسی کو یاد نہیں رہتا کہ یہ خبر کس ذریعہ سے آئی ہے ہر شخص نے یہ خبر دوسرے شخص سے سُنی ہے۔ موت کی تفصیلات کے متعلق بھی مختلف روایتیں ہیں۔ مرحوم بم سے ہلاک ہوئے۔ مرحوم گولی کھا کر شہید ہوئے مرحوم دست بدست لڑائی میں سنگین سے کام آئے۔ مرحوم پر توپ کا گولہ گرا۔ بہر حال یہ طے ہے کہ مسٹر نصیب اللہ کے پیارے ہو گئے۔ اس لئے کہ ایک صاحب بڑے وثوق سے کہتے ہیں "میں نے خود اپنے کانوں سے ریڈیو پر سنا۔ ہلاکین کی فہرست میں مرحوم کا نام بھی تھا" رشتہ دار دریافت اور استفسارات کرتے ہیں۔ مگر کوئی تشفی بخش جواب نہیں ملتا۔
پروین کی والدہ کو سکتہ ہو جاتا ہے وہ نصیب کے بزرگوں کے سامنے آنسو تو بہاتی ہیں مگر دل میں کہتی ہیں "میں اس کے جانے سے پہلے ہی شادی کر دینا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا یہ غلطی نہ ہوئی ورنہ ساری عمر روتی رہتی"۔
پروین کو افسوس ہوتا ہے مگر اتنا شدید افسوس نہیں جتنا اس وقت ہوتا اگر مسٹر نصرت مسٹر نصیب مرحوم و مغفور کی جگہ ہوتے"۔
تھوڑے دن بعد نصرت پروفیسر صاحب سے ملتا ہے اور عرض کرتا ہے "میں شادی کی درخواست لیکر آیا ہوں"۔
"شادی کے محکمہ کا میں صدر نہیں۔ صدر تو میری بیگم صاحبہ ہیں"۔
"جی ہاں میں نے ان سے عرض کر دیا ہے۔ انہیں اب کوئی عذر نہیں ہے"۔
"تو میں بھی متفق ہوں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا مسٹر نجیب ـــــ"
"جی میرا نام ـــــ"
"ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ آپ کا نام چاہے کچھ بھی ہو مگر میرا ذاتی خیال آپ کی نسبت کچھ اچھا نہیں تھا۔ اور اب بھی نہیں ہے۔ وہ دوسرا نوجوان جو جنگ پر چلا گیا اور مارا گیا، کیا نام تھا اس کا قدرت یا عظمت خدا جنت نصیب کرے، بڑا جوان صالح تھا مجھے بہت پسند تھا۔ مجھے زیادہ خوشی ہوتی اگر وہ میرا داماد بنتا۔ مگر خیر مشیت ایزدی

میں کوئی چارہ نہیں ۔"

"جی نصرت یا قدرت یا عظمت میں ہی ہوں اور وہ دوسرا نوجوان نصیب یا نجیب جسے آپ پسند نہیں کرتے تھے وہ مارا گیا ہے۔"

"کیا واقعی ؟ یعنی کہ وحدت تم زندہ ہو اور وہ مجیب مر گیا ؟"

"جی ہاں ۔"

"جب تو مجھے واقعی بڑی مسرت ہوئی تو یہ میں نے تم دونوں کو گڈ مڈ کر دیا تھا ۔ اچھا ہوا تم نے بروقت بتا دیا ورنہ میں عمر بھر کوفت کھاتا رہتا ۔ ندرت میں بہت خوش ہوں ۔ میری بچی — کیا نام ہے اس کا — تم کو یاد ہے ؟"

"جی پروین ۔"

"ہاں پروین ۔ پروین ۔ وہ تمہارے ہی لائق تھی ۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا —"

"اچھا اب اجازت دیجئے ۔"

"جاتے ہو اچھا جاؤ ۔ مجھے بھی کہیں جانا ہے ۔ صبح سے یاد کر رہا ہوں ۔ مگر خیر کوئی نہ کوئی یاد دلا ہی دیگا ۔"

"آداب عرض ۔"

"خدا حافظ ۔"

نصرت موٹر اسٹارٹ کرنے ہی والا ہے کہ ایک دم زور سے ہنس پڑتا ہے ، "واللہ ! نصرت کو نصیب سمجھا اور نصیب کو نصرت سمجھا ۔ ہی ہی ہی ۔ حد ہے ۔" پھر دفعتاً کچھ خیال آتا ہے اور موٹر سے اُتر کر دوڑتا ہوا پروفیسر صاحب کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے ۔ "ابھی ابھی آپ نے میری جو تعریف کی ۔ اس کا شکریہ اَدا کرنے آیا ہوں ۔ میں کِس لائق ہوں ؟"

شادی کے بعد معلوم ہوا کہ نصیب مرا نہیں ، زندہ ہے ۔ البتہ زخمی ہو گیا تھا اور صحت یاب ہونیکے بعد رخصت لے کر گھر آ رہا ہے ۔ یہ سُن کر نصرت اپنے دوست عقیل کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے ۔ "یار تو بڑا احمق نکلا ۔ دیکھ تو نے نصیب کی موت کی خبر پھیلائی تھی وہ غلط نکلی ۔ وہ زندہ ہے اور اب آ رہا ہے ۔"

"وہ افواہ اڑائی ، جب کہیں جا کر جناب کی شادی ہو سکی ۔ یہ تو دیکھتے ہی نہیں ۔"

"اچھا اچھا اچھا ! اب سمجھا ۔ واللہ یار عقیل ۔ تو بڑا ہوشیار آدمی ہے ۔ میں اپنے کو گھاگ سمجھتا تھا ۔ مگر تو بہا گھاگ نکلا ۔"

جناب صدق جائسی

غزل

قول کیا قرآں ہے جھوٹا ہو گیا
آدمی وہ بھی ہیں، دھوکا ہو گیا

زُلف سلجھی، حُسن دونا ہو گیا
آئینہ، حیرت کا پتلا ہو گیا

دفعتہً ہمدم وہ اِک دن آ گئے
مجھ کو تو جیسے اچنبھا ہو گیا

ہو چلا پھر اُن کے وعدوں کا یقیں
پہلی مایوسی کو عرصا ہو گیا

تم کہاں، دشمن کی دِلداری کہاں
میری ہی آنکھوں کو دھوکا ہو گیا

راحتِ گریہ نہ پوچھ، اے ہم نفس
جیسے دِل کا بوجھ، ہلکا ہو گیا

دِل شکستوں سے، ہوا درد آشنا
بت کدہ، ٹوٹا تو کعبا ہو گیا

شمع تربت، جھلملا کر بجھ گئی
چند لمحوں کو، اُجالا ہو گیا

اب وہ کیا آئیں گے اے وعدے کی رات
رنگ بھی تاروں کا پھیکا ہو گیا

ہو چلے غفلت میں، موے سر سفید
آنکھ کھول اے صدقِ تڑکا ہو گیا

سید منظور الحسن ہاشمی
سابق طالب علم

صنعتی دورِ جدید سے قبل ہندوستانی دستکاری کا عروج و زوال

ہندوستان میں عیش و عشرت کی فراوانیوں کا وہ دَور بھی گذر چکا ہے جبکہ یہاں کی دستکاریاں حسن اور آرٹ کی لطافتوں کو آغوش میں لئے ہوئے اہل ذوق سے خراج تحسین وصول کرتی تھیں۔ نازک اندامانِ برطانیہ اور حسینانِ فرانس کے جذبہ حسن پرستی کے لئے ہندوستانی سامان سرمایہ عشرت و ناز تھے۔ یورپ کی قوم میں جو آج علم و عمل کی متحرک تصویریں ہیں اس وقت ایک خاموش پتھر تھیں۔ انہیں ہندوستان کی دستکاریوں میں نفاست اور نزاکت کا پُر کیف حسن نظر آتا تھا۔ وہ حیرت کرتی تھیں کہ قدرت نے ہندوستانیوں کو یہ وصف کیونکر عطا کر رکھا ہے۔ آج وہ حقیقتیں افسانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ برنیز اور ٹورنز جیسے سیاحوں کے سفرنامے ان محیر العقول جھلکیوں کو اب بھی اپنے اوراق میں محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ ماضی کے اس درخشاں دَور کے تاریک ہو جانے پر ماتم کرنا نہیں بلکہ اس غلامانہ ذہنیت کو دور کرنا ہے جو مغربی سیاست کی افسوسناک چالوں کی وجہ پیدا ہو گئی ہے۔ ایک ہندوستانی آج یہ سوچنے کی ہمت نہیں کر سکتا کہ ریڈیو اور ٹیلی وژن جیسی محیر العقول چیزیں وہ بھی ایجاد کر سکتا اور بنا سکتا ہے۔ گذرے ہوئے واقعات اس کی نظروں سے کم گذرتے ہیں اور اگر گذرتے ہیں تو اس طرح گویا حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کی پریوں کے قصے سنائے جا رہے ہوں۔

۱۸۵۱ء کی عظیم الشان نمائش میں جو گریٹ اکزبیشن کے نام سے مشہور ہے ہندوستانی دستکاریوں نے اعلیٰ ذوق رکھنے والوں کو بے انتہا متاثر کیا۔ جے۔ ایف رائل نے ایک تقریر کے دوران میں بیان کیا کہ ہندوستانی دستکار اعلیٰ فنی معیار کو برقرار رکھنے میں افادیت (UTILITY) کے پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ڈاکٹر واٹسن اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں "جہاں تک آرائش اور زیبائی کا تعلق ہے ہندوستان کا مذاق نفاست کا بلند ترین معیار رکھتا ہے ــــ نقش و نگار میں رصع کاری ضرورت سے زیادہ نہیں بڑھنے پاتی جس سے حسن کو صدمہ پہونچے اور ان کا استعمال تکلیف دہ ہو جائے"۔ ایم ملینکی ایک فرانسیسی ماہر فن نے ہندوستانی صنعت کو دیکھ کر اس کی خوب خوب تعریف کی۔ ہندوستان کی صنعتوں میں پارچہ بافی کو ایک خاص مقام حاصل تھا۔ یہ وہ صنعت تھی جس کے حسن کے گیت ہر جگہ الاپے جاتے تھے۔ مینچسٹر کے ایک صناع نے

ڈھاکہ کی صنعت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب حسن اور نزاکت کے حاصل کرنے میں ناکام رہا تو طنزیہ الفاظ میں ڈھاکے کی ململ کے متعلق کہا "یہ تو کسی شئے کا صرف پرتو ہے"۔ ۱۸۵۰ء تک ڈھاکے میں عمدہ ململ تیار ہوتی تھی لیکن زوال شروع ہو چکا تھا۔ مسٹر مکرجی نے اپنی مشہور کتاب "اے ہینڈ بک آف انڈین پراڈکٹس" میں لکھا ہے کہ ڈھاکے کے کاریگر ململ کے ایسے تھان تیار کرتے تھے جو طول میں ۲۰ گز اور عرض میں ایک گز ہونے کے باوجود انہیں گولی بنا کر ایک انگوٹھی کے اندر سے گذارا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسے تھان چھ مہینے میں تیار ہوتے تھے۔ یہ افسانہ نہیں ہے بلکہ واقعہ ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے متعدد صدہا کتابیں ملیں گی جنھیں یورپی محققوں نے سپرد قلم کی ہیں۔ ڈھاکہ یوں تو سب میں ممتاز تھا لیکن چند اور مقامات بھی تھے جو عمدہ قسم کی ململ تیار کرتے تھے مثلاً کرشنا گڈھ۔ چندیری وغیرہ۔

ململ کے بعد دوسری سوتی دستکاریاں آتی ہیں جو تقریباً ہندوستان کے تمام مقامات میں اعلیٰ معیار کی موجود تھیں۔ لکھنؤ کی چھینٹ، احمد آباد کی دھوتیاں اور دوپٹے۔ صوبہ متوسط میں ناگپور، امریہ، پاؤنی ریشمی کوروں کے کپڑے تیار کرنے میں لاثانی تھے۔ صوبۂ مدراس میں پالمپور خصوصیت کے ساتھ بہت مشہور تھا۔ سوتی صنعت کے بعد ریشمی صنعت کا پلہ بھاری تھا۔ مالوہ، بنارس اور احمد آباد میں گلکاری کی صنعت نہایت دلکش تھی۔ دھری بُنت کے کپڑے جو مختلف رنگوں کی بہترین آمیزش کو لئے ہوتے۔ پونا، یولا اور دوسرے مقامات میں خوب تیار ہوتے تھے۔ اُونی صنعت میں کشمیر کی جدت طرازیاں دنیا کے لئے سرمایۂ حیرت تھیں۔ کشمیر کی تیار کی ہوئی شالیں یورپ کی شہزادیوں کے لئے بہترین تحفہ عشرت تھیں۔ امرت سر۔ لدھیانہ اور پنجاب کے دوسرے چند شہر بھی عمدہ قسم کی شالیں تیار کرتے تھے۔ ۱۸۸۰ء کے بعد اس صنعت کو سرعت کے ساتھ تنزل کے اندوہناک دور سے گذرنا پڑا۔ ۱۸۹۵ء تک اس صنعت کی نزاکت اور عمدگی صرف ایک خواب ہو کر رہ گئی۔

پارچہ بافی کی صنعت کے علاوہ دھاتی اشیاء کی صنعت بھی کافی فروغ پر تھی۔ بنارس میں پیتل اور تانبہ کا سامان بہترین قسم کا تیار ہوتا تھا۔ دوسرے اہم شہر ناسک، پونا، حیدرآباد دکن، وزیگاپٹم اور تنجور ہیں جہاں دھات کا نہایت عمدہ سامان تیار ہوتا تھا۔ بیدر ملمع کاری اور پچہ کاری کی صنعت کے اعتبار سے سارے ہندوستان میں خاص اہمیت رکھتا تھا اور آج بھی اس صنعت کی عظمتیں خراج تحسین وصول کر رہی ہیں۔ ہتھیاروں پر نقش و نگار نہایت عمدہ بنائے جاتے تھے۔ بیدر کے علاوہ یہ صنعت کچھ، سندھ اور پنجاب میں بھی موجود تھی۔ زیورات وغیرہ کا عمدہ کام راجپوتانہ میں ہوتا تھا۔ سنگ تراشی حیدرآباد اور راجپوتانہ میں نقطۂ عروج کو پہونچی ہوئی تھی۔ آگرہ میں سنگ مرمر کا کام نہایت خوبصورت ہوتا تھا۔

انحطاط:۔ عہد ماضی کی درخشاں صنعت ۱۸۸۰ء کے بعد اپنی حسین روایتوں کو بھولتی ہوئی۔

تاریکیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انحطاط کے اسباب حسب ذیل تھے۔

(۱) شاہی دربار صفحۂ ہستی سے مٹتے جا رہے تھے۔ بادشاہوں اور امیروں کی زندگی کی تمکنت ہندوستانی دستکاریوں کی سرپرستی کرتی تھی ان کے سجے ہوئے دربار پر شوکت محلات اور زرق برق لباس کے لئے ہندوستانی دستکار اپنی مہارت اور صلاحیت کا بہترین ثبوت دینے کے لئے ہر طرح سے کوشاں رہتے تھے ان کی محنت کا صلہ زر و جواہر سے دیا جاتا تھا۔ ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ لیکن ہندوستان کی بادشاہتیں کلائیو اور .... کی سیاست سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے لگیں تو اس وقت دستکاریوں کا اعلیٰ معیار بھی گرتا گیا۔

(۲) ایک بیرونی حکومت کا تسلط ہندوستانی صنعت کے انحطاط کا دوسرا سبب تھا۔ باہر کی سیاست ایک دوسرے ہی مفاد کو لئے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوی تھی اس کا مطمع نظر اور لائحۂ عمل ہی اور تھا۔ اسے ہندوستان سے کیا ہمدردی ہوسکتی تھی۔

(۳) جدید مغربی فیشن کی وجہ سے بھی صنعت بے انتہا مجروح ہوئی۔ لوگوں نے اس وقت مغربی فیشن کی تقلید کو تعلیمیافتہ ہونے کا معیار قرار دیا۔ یورپ کی طرز رہائش اور یورپ کا مذاق زندگی مشرقیت سے کوسوں دور تھا۔ مشرقیت کے معنی لوگوں نے قدامت پرستی اور مغربیت کے معنی آزاد خیال رکھا۔ مشجر، کمخواب، مشروع، ہمرو وغیرہ رفتہ رفتہ دائرہ استعمال سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔

(۴) مغربی صنعتی انقلاب اور مسابقت کے طوفان جب اٹھنے لگے تو ہندوستان کے صناع بالکل بے بس تھے۔ یورپ میں انسانوں کی محنت کو ہٹا کر کل پرزوں سے کام لیا جانے لگا۔ دس گھنٹے کا کام ایک گھنٹے میں ہونے لگا۔ پچاس نفوس کی جگہ صرف ایک شخص کام کرسکتا تھا۔ ایسی صورت میں قیمت پیدائش میں غیر معمولی طور پر کمی ہوتی گئی حسن اگرچہ ناپید تھا لیکن بہ لحاظ قیمت ہندوستانی اشیاء سے وہ ہر طرح سبقت لے جاتی تھیں۔ ملک میں جب افلاس اور نکبت کے تاریک بادل چھائے ہوئے ہوں تو اس وقت جھوٹی صنعت گری زیادہ فروغ پاسکتی ہے۔

(۵) حکومت کا برتاؤ:۔ حکومت نے ہندوستانی صنعت کی حوصلہ افزائی کے لئے کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جو اس کی بقا اور حیات کے لئے ضروری سمجھا سکتا تھا۔

کشمیری شال کی صنعت میں جو زوال پیدا ہوا اس کی مختصر تاریخ یہاں درج کی جاتی ہے۔ شروع شروع میں کشمیر ہی میں شالوں کی صنعت زور پر تھی لیکن جوں جوں اس کی طلب بڑھتی گئی دوسرے مقامات میں اس صنعت نے پھیلنا شروع کیا جس کی وجہ سے کاریگر مختلف مقامات کو منتقل ہونے لگے سنہ ۱۸۳ء

یں کشمیر میں ایک بڑا زبردست قحط پڑا۔ بہت سے کاریگر پریشان ہو کر بھاگ نکلے۔ کاریگروں کا یوں چھوڑ کر چلا جانا صنعت کے لئے یقیناً بہت مضر ثابت ہوا۔ مرکزیت فنا ہوگئی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار گرنے لگا۔ انیسویں صدی کے وسط میں شالیں یورپ میں بہت مقبول ہو رہی تھیں خصوصاً فرانس میں اس کی مانگ بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ فرانسیسی تاجروں کے قبضہ میں یہ صنعت زیادہ آتی جا رہی تھی ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان فرانسیسی تاجر اس صنعت کو اپنے قابو میں خوب اچھی طرح لے آئے تھے۔ وہ کاریگروں کو قرض دے کر سامان تیار کرواتے تھے۔ اس حد تک وہ تعریف کے مستحق ہیں کہ انہوں نے صنعت کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے کی کوشش کی اور اینلین ڈائی (ایک رنگنے کا مسالہ جو شالوں کے انحطاط کا واحد ذمہ دار ہے) کے استعمال کو ہمیشہ روکا۔ حالات اس وقت ابتر ہوئے جب فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس کی وجہ سے فرانس کی طلب یکلخت رک گئی۔ اور پھر فرانس کے فیشن میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ ۱۸۷۰ء کے بعد ہی تنزل کا دور شروع ہوا اور کاریگروں کی مالی حالت خراب ہوگئی۔ بیزی نے ارزاں اور نقلی شالیں تیار کرنی شروع کیں یہ دوسرا صدمہ تھا جو اس صنعت کو پہونچا۔ اس کے بعد شالوں کی صنعت جانبر نہ ہوسکی۔ کاریگروں نے ارزاں اور معمولی شالیں تیار کرنی شروع کیں اور اینلین ڈای کا استعمال عام ہوتا گیا۔

کشمیر کی شالوں کے ساتھ دوسری صنعتوں کا بھی یہی حال ہوا۔ رفتہ رفتہ فنا ہوتی گئیں اور آج صرف افسانۂ پارینہ بنی ہوئی ہیں۔ بہرحال ماضی کو یاد کرکے ماتم کرنا انتہائی نادانی ہوگی۔ بلکہ ہماری کوشش اب یہ ہونی چاہیئے کہ غلامانہ ذہنیت کو دور کرکے اپنے جذبۂ عمل میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور سیاست اور معیشت کے اصولوں سے ناواقف نہ رہیں ۔

شباب:- اُمید۔ کارِ عظیم، ہمّت، قوت و ترقی کا زمانہ ہے خواہ وہ فرد کا شباب ہو یا قوم کا۔

شباب کے گذرے ہوئے ایام کا تصور ایک مردہ دوست کے قبر کی زیارت ہے جسے ہم نے نقصان پہونچایا تھا مگر اب وہ مُردہ ہے اس لئے ہم اپنے نقصان کی تلافی نہیں کر سکتے۔

شباب کی زیادتیاں اور تعیشات قرضہ کی دستاویزیں ہیں تیس سال بعد قرضہ معہ سود ادا کرنا ہوگا۔

شباب میں اگر پختہ ذہنیت ہو تو وہ قابلِ قدر ہے اور بڑھاپا جس میں شباب کی شوخی نہ ہو قابلِ نفرت ہے۔

جناب سعید شہیدی

غزل

جنونِ دل اگر آمادۂ اظہار ہو جائے
بہار آنے سے پہلے ہی چمن بیدار ہو جائے

عطا کر ہاں عطا کر کائناتِ درد کے مالک
اک ایسا دَرد جو ناقابلِ اظہار ہو جائے

چمکتی ہے کبھی برق اور چلتی ہے کبھی آندھی
چمن لٹنے کو ہے اب باغباں ہشیار ہو جائے

یہ مانا پھر نئے سر سے بہار آئی ہے گلشن میں
پھر اُس کو کیا خزاں جس کے گلے کا ہار ہو جائے

خوشی کیسی۔ خوشی سے واسطہ کیا غم پرستوں کو
مسلسل غم نہ ہو تو زندگی دشوار ہو جائے

یہ طوفاں ہاں یہ طوفاں صرف میری زندگی تک ہے
اگر میں غرق ہو جاؤں تو بیڑا پار ہو جائے

نشیمن پر نشیمن اس طرح تیار کرتا جا
کہ گرتے گرتے بجلی آپ خود بیزار ہو جائے

ابھی قابو ہے دل پر اپنی بربادی پہ ہنستا ہوں
پھر اس کے بعد شائد ضبطِ غم دشوار ہو جائے

اُمیدوں کا سہارا لے رہی ہے میری مایوسی
سعید انکار ہی اس کا نہ اب اقرار ہو جائے

سید بادشاہ حسن حیدرآبادی
سابق طالب علم

عید ڈنر

ایک طنزیہ ریڈیو ڈراما

افرادِ ڈرامہ

(۱) معلن نمبر ۱ و ۲ ۔ (۲) پروفیسر فراموش ۔ (۳) غلمان فردوس نگر
(۴) طوطیٔ سدرہ ۔ (۵) حوّا ۔ (۶) آدم ۔

[ایک منٹ تک غزل کا ریکارڈ بجتا ہے ۔]

معلن ۱ :۔ ابھی آپ حضرت داغ سے عیدن بائی کی غزل سُن رہے تھے ۔۔۔ آں ۔ آں ۔۔۔ معاف فرمائیے۔ میرا مطلب تھا ابھی آپ حضرت داغ کی غزل عیدن بائی کو سنا رہے تھے ۔۔۔ نہ ۔۔ نہ ۔ عیدن بائی سے آپ حضرت داغ کی غزل سُن رہے تھے ۔۔۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہم آپ کو "فردوس کلب" کے ڈنر میں بغیر دعوت کے لئے چلتے ہیں لیکن "راشنگ کارڈ" اپنے ساتھ رکھنا نہ بھولئے ۔۔۔

(½ منٹ کا وقفہ)

معلن ۲ :۔ یہ فردوس کلب کا ڈائننگ ہال ہے۔ کھانا ختم ہوگیا لیکن تقریریں ابھی باقی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آپ پروفیسر فراموش کی تقریریں سنیں گے ۔۔۔ پروفیسر فراموش ! ۔۔۔ [تالیوں کا شور]

فراموش۔ ہاں تو آج کیا پڑھانا ہے ؟ ۔۔ (سارے مدعوین اس بدحواسی پر قہقہہ لگاتے ہیں) ۔ (میز پر ہاتھ مار کے) خاموش ! خاموش !! (کچھ دیر خاموشی) میں اپنی جماعت میں شور و غل پسند نہیں کرتا ۔ (پھر ایک زبردست قہقہہ)

ایک آواز :۔ پروفیسر صاحب یہ کالج کی جماعت نہیں کلب کا ڈنر ہے ۔

فراموش ۔ اوہ ! تو پھر کلاس روم جیسا یہ شور کیوں ؟

وہی آواز : عید کا ڈنر ہے پروفیسر صاحب ۔

فراموش۔ اگر یہ عید کا ڈنر ہے تو میں رمضان کے فضائل پر کیا تقریر کر سکتا ہوں (ایک قہقہہ) ہاہاہا ! ہے نا مضحکہ خیز بات ۔۔۔ البتہ روزے کے فلسفہ پر کچھ بول سکوں گا ۔۔۔ (قہقہہ)

وہی آواز ۔ مگر پروفیسر صاحب ! یہ رمضان کی عید کا نہیں بقر عید کا ڈنر ہے ۔

فراموش ۔ اوہ ! بقر عید کا ڈنر ۔۔ ٹھیک ، تو پھر مجھے ، تو پھر مجھے ۔۔۔ کیا کہتے ہیں بکروں کے فلسفہ پر تقریر کرنی ہوگی (قہقہہ)

وہی آواز۔ قربانی کے فلسفہ پر ! قربانی کے فلسفہ پر

فراموش۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ میرا مطلب بھی تو یہی تھا — بکروں کی قربانی کا فلسفہ! تو پھر سنیئے، مجھے تقریر باضابطہ طور پر شروع کرنی چاہیئے۔

محترم صدر جلسہ! —

وہی آواز۔ صدر ڈنر

فراموش۔ ہاں ہاں محترم صدر ڈنر، بھائیو اور بہنو —

وہی آواز:۔ بہنو کا لفظ پہلے (قہقہہ)

فراموش۔ محترم صدر ڈنر، بہنو اور بھائیو! اجازت دیجئے کہ میں آپ کو بکروں کا آن۔ سمجھاؤں۔ فلسفہ کی اصطلاح میں قربانی اس جذبہ کا نام ہے جو ایک جنس اپنی ہم جنس کی فلاح کے لئے بطیب خاطر دل کی پہنائیوں میں پیدا کرتا ہے۔ یا — یا دوسرے الفاظ میں جو کہا جا سکتا ہے کہ ایک ذی رُوح کے عمیق قلب میں دوسری ذی روح کی بہبودی کے لئے جو جذبہ موجزن ہوتا ہے اسے قربانی کہتے ہیں۔

وہی آواز:۔ آسان زبان استعمال فرمائیے۔

فراموش۔ بہت بہتر۔ ایک آسان مثال پیش کرتا ہوں — فرض کیجئے کہ آپ سب بکرے ہیں [حاضرین میں ہنسنے کا غل اٹھتا ہے]۔ میرا مطلب تھا سب بکرے نہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ آپ میں سے کچھ بکرے ہیں اور کچھ بکریاں۔ (ایک فلک شگاف قہقہہ) دیکھئے تاکہ آپ کس طرح بکروں کی سی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ ایک نے آواز نکالی تھی کہ سب نے مل کر شور مچانا شروع کر دیا۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ آپ سب بکرے ہیں، بالکل بکرے (قہقہہ)۔

وہی آواز: مطلب پر آئیے مطلب پر!

فراموش۔ مطلب، مطلب، مطلب پر کیسے آؤں۔

وہی آواز:۔ جیسے بھی ممکن ہو۔

فراموش۔ اچھا تو سنیئے۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ملک پر بُرا وقت پڑا ہے، بڑی آزمایش کا وقت ہے۔ دشمن کو نیچا دکھانا ہے۔ ہمسایہ ممالک پر جہاں جہاں اس نے چھاپہ مار کر ناجائز قبضہ کر لیا ہے اور ان کی آزادی سلب کر لی ہے ان سب کو آزاد کرانا ہے — میں کہتا ہوں کہ آپ آپس میں مل جل کر رہنے اور ایک قائد کے پیچھے چلنے کا فلسفہ آپ بکروں سے سیکھیں [تالیاں بجتی ہیں، قہقہہ پڑتا ہے] — مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ اس معاملہ میں بکرے بھی نہیں ہیں۔ کاش بکرے ہوتے — بکرے زندہ باد۔
(تالیاں قہقہہ)

معلن نمبر ۲: آپ فردوس کلب سے عید کے ڈنر کی تقریریں سن رہے ہیں۔ آخری تقریر پروفیسر فراموش کی تھی۔ اب حضرت غلمان فردوس نگری سے قربانی کے بکرے پر ایک نظم سنیئے — حضرت غلماں فردوس نگری — (تالیاں)

غلماں۔ (کھانستے، کھنکھارتے اور گنگناتے ہوئے) — اوں — ہوں اوں — عرض کرتا ہوں (پھر گنگناتے ہیں)۔ اوں ہوں اوں۔ یہ نظم میں نے دراصل گذشتہ سال کہی تھی۔

وہی آواز۔ پرانی نہیں کوئی تازہ نظم سنائیے۔

غلماں۔ تازہ؟ تازہ نظم میں نے نئے اسلوب میں کہی ہے، نئے اسلوب سے میرا مطلب مطابق فطرت اسلوب ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شعر ایک فطری جذبہ ہے جو بے اختیار ترجمانی چاہتا ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ فطرت کو ظاہری آرائش و زیبائش کی ضرورت نہیں بلکہ یہ چیزیں دراصل اسکو مقید کر دیتی ہیں۔

وہی آواز۔ نظم سنائیے نظم!

غلماں۔ فریاد کی کوئی لے نہیں ہے		نالہ پابند نے نہیں ہے

[حاضرین واہ واہ کی آوازیں بلند کرتے ہیں]

وہی آواز۔ یہ شعر تو پرانے اُستاد کا معلوم ہوتا ہے۔

غلماں۔ جی ہاں جی ہاں اُستاد غالب کا ہے اور میں تو اپنی تقریر کے سلسلہ میں پڑھ رہا تھا بلکہ اس کو اپنے پچھلے بیان کے ثبوت میں پیش کر رہا تھا کہ شاعری کو قافیہ اور ردیف اور بحر کی پابندیوں میں جکڑ دینا نامناسب ہے کہ لوگ تقاضہ کرتے ہیں "نظم سنائیے، نظم سنائیے۔"

غلماں۔ نظم کا عنوان ہے۔ "قربانی کا بکرا"۔ عرض کرتا ہوں (پھر گنگنانے لگتے ہیں) اوں ہوں اوں —

ایک دن میں دیر تک سوتا رہا
خواب غفلت کے مزے لیتا رہا
صبح نوکر نے جگایا دن چڑھے
اور کہنے لگا "صاحب عید ہے"
شیو کر جلدی میں اور حمام بھی
کپڑے بدلے اور لگایا عطر بھی
وقت جو دیکھتا ہوں ساڑھے دس ہیں بج گئے
اور اب نماز ملنے کی امید ہی باقی نہیں

اس لئے ناچار ملاقاتیوں کا انتظار کرنے لگا۔
اتنے میں یکایک نظر جا پڑی بکرے پر مری
تصویر حیرت تھا بندھا اک درخت کے وہ تلے
اور دیکھتا تھا کس قدر حسرت سے اپنے ساتھی بکرے کو
جو تڑپتا اور لوٹتا تھا خون میں لتھڑا ہوا
یہ نظارہ دیکھ کر میں سوچنے یہ لگ گیا
کیوں نہ میں رکھ دوں اس کی جگہ اپنا گلا
غور بھی پوری طرح کرنے نہ پایا تھا کہ نوکر آگیا
اور آکر دی اطلاع کہ آئے ہیں احباب کچھ
گلے ملنے ملانے میں قربانی کا بکرا ذہن سے جاتا رہا

[واہ واہ کا شور مچتا ہے]

معلن نمبر ۲: یہ فردوس کلب ہے۔ ابھی حضرت غلمان نے آپکو اپنی نظم "قربانی کا بکرا" سنائی۔ ابھی تھوڑی دیر میں آپ طوطی سدرہ کی تقریر سنیں گے — طوطی سدرہ!

طوطی۔ محترم سامعین با تمکین! ایک شعر یاد آرہا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ جب میں محظوظ ہو رہا ہوں تو کیا وجہ ہے کہ آپ کو لطف اندوز ہونے سے روکوں۔ اسی لئے بے اختیار جی چاہ رہا ہے کہ آپ کو سناؤں —

ایک آواز: ع یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔

طوطی۔ شعر آپ نے میرے منہ سے چھین لیا۔ یہی شعر کچھ دیر سے میرے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔

وہی آواز: مگر مولانا یہ تو مصرع ہے شعر پورا کیجئے۔

طوطی۔ بھائیو! یہ کوئی ضروری نہیں کہ دو مصرعوں ہی کو شعر کہا جائے۔ کیا اچھی بات کسی نے کہی ہے اور یقین مانیے جس کسی نے کہی ہے۔ باون تولے پاؤ رتی کی کہی ہے۔ آپ اسے سن کر خوش ہوں گے اور بہت خوش ہوں گے کہ کہا ہے "کُل کا اطلاق جزو پر بھی ہوتا ہے"۔ یہ ایک مسلمہ نظریہ ہے اور کہنے والے نے مزید کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رکھی۔ جب صاحبو! یہ طے ہے کہ کل کا اطلاق جزو پر ہوتا ہے تو کیا شعر کا اطلاق مصرع پر نہیں ہوتا؟ کیوں نہیں ہوتا؟ یقیناً ہوتا ہے — آپ سب مانتے ہیں نا؟ نہیں تو میں آگے بڑھنے سے پہلے ذرا اسی کی وضاحت کر دوں — [تالیاں بجتی ہیں] — آپ کے اس جوش و خروش سے صاف ظاہر ہے کہ آپ میری بات مانتے ہیں — حضرات! اس ذرہ نوازی کے لئے میں بہ دل ممنون ہوں — ہاں تو آمدم بر سر مطلب — مگر صاحبو ایک مشکل ہے اور یہ مشکل بہت بڑی مشکل ہے، ایسی کہ اس کا مناسب حل میری دست رس سے باہر ہے، سچ عرض کرتا ہوں کہ میں کیا

اور میری دست رس کیا، وہی مطلب ہوا نا کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی ۔(تالیاں اور قہقہے)
اور بجائیو مشکل صرف وقت کی قلت کی ہے ورنہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ہاں مضامین کی کوئی کمی نہیں۔ ہزاروں باتیں اس تقریب میں کہنے کی ہیں اور بہت سی تو لب پر آ آ کر رک جاتی ہیں ۔ بمصداق اس شعر کے کہ ع لب پہ آتی ہے فغاں بن کے تمنا میری [قہقہے فضا میں گونجتے ہیں]
یہ واقعہ ہے کہ بقرعید جیسی تقریب سال میں بار بار نہیں آتی اور ہم اور آپ سب یوں یکجا نہیں ہوتے۔ ایک خیال سے ایک ارادہ سے اور ایک مقصد سے! ایسے ہی موقع کے لئے کسی نے کیا خوب شعر کہا ہے ع خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ [قہقہے۔ فلک شگاف تالیاں] اور جب ایسے موقعے کبھی کبھار برسوں میں ایک آدھ دفعہ مل جاتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ یہ شعر پڑھوں ع تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل۔ دوستو! میں حیران ہوں کہ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں بالکل وہی حال ع دل کو روؤں کہ جگر کو روؤں لیکن بہتر طریقہ تو بقول شاعر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ع مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں۔ وقت کی قلت اور مطالب کی کثرت۔ عزیزو وہی بات ہوئی نا کہ جائے تنگ است و مرداں بسیار! [قہقہے اور تالیاں]

وہی آواز : وقت کو کب تک روئیے گا مطلب پر آئیے نا!

طوطی۔ اوہو! رونے کا ذکر چھیڑ کر آپ نے مجھے رُلا دیا۔ حضرات! روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں! خیر آمدم برسر مطلب میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے مختصر تقریر ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس قول پر خدا کو گواہ رکھتا ہوں بمصداق اس شعر کے کہ ع سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے۔ اس لئے معاف کیجئے میں تقریر کرنے سے قاصر ہوں۔ میری تقریر کے لئے وقت چاہیئے وقت! دن چاہیئے دن بلکہ عمر چاہیئے عمر! تقریر ختم کرنے کے لئے اس سے بہتر شعر میری سمجھ میں نہیں آتا :-

ع رونے پہ جو آجاؤں تو دریا ہی بہادوں!

[قہقہے، آوازے، تالیاں، غرض ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے]

معلن نمبر ۲ : یہ فردوس کلب ہے۔ آپ عید کے ڈنر کی تقریریں سُن رہے ہیں ۔
طوطی سدرہ کی تقریر آپ نے سُنی۔ ابھی تھوڑی دیر میں آپ محترمہ حوا کی تقریر سنیں گے۔ محترمہ حوا

حوا۔ عزیز بہنو اور محترم بھائیو! مجھے اعتراف ہے کہ میں کوئی مقرر ہوں اور نہ میرا اس وقت یہ مقصد ہے کہ میں آپکو اپنی زبان کے جوہر دکھاؤں بلکہ آج میں آپ سے چند باتیں صاف صاف کہنی چاہتی ہوں۔ یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ سچی بات کڑوی معلوم ہوتی ہے اور یقیناً اسی وجہ سے میری باتیں آپ کو کڑوی معلوم

ہوں گی لیکن اگر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں تو آپ کو اس میں حقیقت چھپی نظر آئے گی۔ ہمارا کلب سماجی مرکز ہے اور جب ہم نے اسے قائم کیا تھا تو آپس میں یہ عہد کیا تھا کہ یہاں مل بیٹھ کر ہنسنے بولنے کے سوا ہم سماج کی خدمت کریں گے۔ مگر میں پوچھتی ہوں ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے کمزور سماج کو مضبوط کرنے کی کوشش کی یا اس کی برائیوں کو دور کرنے کی فکر کی۔

(Shame! Shame !! کے نعرے فضا میں گونجتے ہیں۔)

میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ آپ میں احساس پیدا ہو رہا ہے اور آپ اپنی ذمہ داری اور فرض محسوس کر رہے ہیں۔ خیر اگر آپ نے اب تک کچھ نہیں کیا تو اب بھی وقت ہے کہ آپ اپنے وعدوں کو پورا کریں۔ میں آج آپ سے دوبارہ عہد لینا چاہتی ہوں کہ ہم سماج کی خدمت کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی آیندہ نہ کریں گے۔

متعدد آوازیں :۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ سماج کی خدمت کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی آیندہ نہ کریں گے

اب میں آپ کو ہماری سماج کی ایک کمزوری بتاتی ہوں اور آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ اس کی اصلاح کی کوشش کریں —— وہ کمزوری ہماری فضول خرچی ہے ——

متعدد آوازیں : بے شک صحیح ہے۔

عید بقرعید کے موقع پر فضول خرچی کے مرض کا حملہ ہم پر بے پناہ ہوتا ہے۔ کیا آپ میں سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ کوئی عید ایسی بھی گذری جب کہ آپ نے نئے کپڑے نہ خریدے ہوں، ٹوپی یا جوتا نہ لیا ہو۔ آپ کے پاس دس پانچ نفیس اچکنیں ہوں گی جن میں ایک آدھ عید کے موقع پر بھی آسانی کے ساتھ کام دے سکتی ہے پھر بھی آپ نئی اچکن ضرور سلواتے ہیں دراں حالیکہ آپ کو معلوم ہے کہ ایسے موقعوں پر کپڑا زیادہ مہنگا ہو جاتا ہے اور سلائی کی اجرت بڑھ جاتی ہے لیکن آپ اپنی فضول خرچی سے باز نہیں آتے میرا کہنا ہے کہ اگر دولت مند اپنا یہی روپیہ کسی نیک کام پر خرچ کریں اور غریب بیچارے فضول خرچی سے محفوظ رہ کر قرض سے نجات پائیں تو سماج کی کتنی بہتری ہو گی ——

[تالیاں بجتی ہیں اور ایک قسم کا جوش مجمع میں ظاہر ہوتا ہے]

معلن نمبر ۲ :۔ فردوس کلب سے آپ عید کے ذکر کی تقریریں سن رہے ہیں ابھی آپ نے محترمہ حوا کی تقریر سنی۔ تھوڑی دیر ہم آپ کو آدم سیٹھ کی تقریر سنوائیں گے ——

آدم سیٹھ!

آدم ۔ محترم بہنو اور عزیز بھائیو! ابھی آپ نے جو کچھ سنا وہ اک طرفہ بیان تھا۔ سماج کی خدمت کا بے شک

ہم نے بیڑا اٹھایا ہے اور یقیناً ہم میں سے کوئی بھی اس خدمت سے منہ نہ موڑے گا لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ پیش کئے جائیں۔ محترمہ حوا نے فضول خرچی کا جو ذکر کیا وہ بیشک لائق توجہ ہے اور مجھے اس سے انکار نہیں کہ فضول خرچیوں کی وجہ سے ہم میں سے اکثر دیوالیہ کے قریب پہنچ چکے ہیں لیکن مجھے اجازت دیجئے کہ جہاں مرد کی فضول خرچیوں کا ذکر آپ نے سنا وہاں عورت کی فضول خرچیوں کا حال بھی آپ کے آگے بیان کروں۔

حوا۔ POINT OF ORDER۔ میں سمجھتی ہوں کہ صنف لطیف کی پیٹھ میں چھرا بھونکا جا رہا ہے۔

آدم۔ جی نہیں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایسا سنگین جرم نہیں کروں گا۔ میں صرف واقعات پر روشنی ڈالوں گا۔ جس طرح سے کہ آپ نے مردوں کی فضول خرچی کا حال سنایا۔ اسی طرح۔ مجھے بھی حق حاصل ہے کہ میں مردوں کی ترجمانی کروں بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ میرا تعلق "انجمن انسداد بیرحمی بر شوہران" سے ہے ——

حوا۔ یہ انجمن خلاف قانون ہے۔

آدم۔ جی نہیں۔ ہرگز خلاف قانون نہیں ہے۔

حوا۔ میں چاہتی ہوں کہ فردوس کلب کے قواعد میں اس کا اضافہ کیا جائے کہ اس کلب کا کوئی ممبر انجمن انسداد بے رحمی بر شوہران کا رکن نہ ہو سکے گا۔

آدم۔ آپ یہ تجویز کلب کی مجلس عاملہ میں پیش کر سکتی ہیں۔ آج تو عید کا ڈنر ہے اور یہاں سب کو آزادئ تقریر حاصل ہے۔

حوا۔ میں PROTEST کرتی ہوں۔

آدم۔ آپ UNDER PROTEST میری تقریر سن سکتی ہیں —— ہاں تو بھائیو میں کہہ رہا تھا آج میں آپ کو عورت کی فضول خرچیوں کا حال سناؤں گا۔ میں جگ بیتی نہیں آپ بیتی کہوں گا کیونکہ آج مجھے اتفاق سے بہترین موقع ملا ہے۔ میری بیوی ڈنر میں شریک نہیں ہے اس لئے میں آپ بیتی کا ایک باب آپ کو سناؤنگا بھلائیو! آپ جانتے ہیں کہ میں کپڑے کی تجارت کرتا ہوں۔ شادی کے پہلے میری دوکان میں مردوں کے پہننے کا کپڑا زیادہ ہوتا تھا لیکن شادی کے بعد زنانی کپڑا زیادہ ہوگیا۔ میری بیوی نے مجھے اس پر مجبور کیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ تجارت نفع بخش تھی بلکہ محض اس وجہ سے کہ وہ چاہتی تھی کہ میری پوری دوکان ان کا ڈریسنگ روم بن جائے۔

حوا۔ جھوٹا الزام ہے۔ بیوی کی غیر موجودگی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جارہا ہے۔

آدم ۔ دوستو! آپ میں سے ہر شخص میری دوکان کی اس تبدیلی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے اور اب بھی دیکھ سکتا ہے ۔ خیر یہ تو ایک ضمنی چیز تھی اصل بات کہنے کی یہ ہے کہ میرے گاہک اب گھٹتے گھٹتے صرف میری بیوی کے سوا اور کوئی باقی نہیں رہا ۔ محترمہ حوا نے عید بقرعید کا ذکر کیا تھا کہ جب مرد کپڑے بناتا ہے لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ میری بیوی روز نئی ساڑی کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتی ۔ ان کے لئے دن عید رات شب برات ہے ۔ یہ صرف میری ہی آپ بیتی نہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ میں بیشمار شوہروں کی ترجمانی کر رہا ہوں میرے ہاں دوکان گھر سے اور دوسروں کے ہاں گھر دوکان سے بدل چکا ہے ۔ اب آپ بتایئے فضول خرچی کون کرتا ہے ۔۔۔ مرد یا عورت ؟ کہو بھائیو ! کہتے کیوں نہیں ؟ کم از کم وہ حضرات تو میری تائید کریں جن کی بیویاں اس وقت ساتھ نہیں ہیں ۔۔۔

ایک دکی آواز :۔ بے شک عورتیں فضول خرچ ہوتی ہیں ۔

حوا ۔ یہ عورتوں کی صریحی توہین ہے ۔۔۔

آدم ۔ فضول خرچی ہی پر بات ختم نہیں ہوتی ۔ اجازت دیجئے کہ میں آپ کو غریب شوہروں پر بیویوں کے مظالم کی داستانیں سناؤں ۔ دوستو! آپ نے سنا ہے کہ کیوپڈ کے ہاتھ میں تیر و کمان ہے ۔۔۔ مگر یقین کیجئے کہ زمانہ بدل گیا ۔ اب یہ بات روز کے مشاہدے سے پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کیوپڈ کے ہاتھ میں کوکھلے کی ارتھمٹک ہے یعنی بیوی اپنے شوہر کی آمدنی کی پائی پائی کا حساب مانگ رہی ہے ۔

حوا ۔ (گلوگیر آواز میں) غلط ۔ بالکل غلط ۔۔ عورت پر بیجا الزام ہے ۔ عورت کو بے بس جان کر تہمت لگائی جا رہی ہے ۔ (رونے لگتی ہے) مرد کی یہ عادت بہت قدیم ہے ۔ میں کہتی ہوں اب میں تقریر نہیں سن سکونگی ۔۔ (سسکیاں اور ہچکیاں) ۔۔۔

آدم ۔ بھائیو ! آنسو عورت کا آخری ہتھیار ہے ۔۔۔

حوا ۔ نہیں ۔ اب میں نہیں برداشت کر سکتی ۔ میں اپنی ساری بہنوں سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ میرے ساتھ walk out کریں ۔۔۔ (کرسیوں سے لوگوں کے اٹھنے کی آوازیں)

معلن ۲ : یہ فردوس کلب ہے ۔ ابھی آپ عید کے ڈنر کی تقریریں سن رہے تھے ۔ آخری تقریر سیٹھ آدم کی تھی آدم و حوا کے جھگڑے کی وجہ سے تقریروں کا سلسلہ منقطع ہو گیا ۔ شورش کے آثار ہیں ۔ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہونے کو ہے ۔۔۔ اس لئے اب ہم رخصت ہوتے ہیں ۔ اجازت دیجئے ۔ آداب عرض ۔۔۔

معلن ۱ : ابھی ہم آپ کو فردوس کلب سے عید ڈنر کی تقریریں سنوا رہے تھے ۔۔۔ ابھی تھوڑی دیر میں آپ اڈیٹر کی مشکلات پر تقریر فرمائیں گے ۔۔ نہیں نہیں ۔۔۔ اڈیٹر آپ کی مشکلات پر تقریر فرمائیںگے ۔۔ نہ ۔ نہ میں بھولا ۔۔۔ اڈیٹر اپنی مشکلات پر تقریر فرمائیں گے ۔

(آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے نشر ہو چکا ہے)

جناب سید ندیم الحسن تاثیر

غزل

عشق ہے اور ایک انبوہ بلا میرے لئے
ایک مصیبت ہے دلِ درد آشنا میرے لئے

ہے تقاضا حق کا باطل کے مقابل میں یہی
اہل حق ہوں ساری دنیا سے خفا میرے لئے

نزع میں جس نے بڑھائی لذتِ آزارِ عشق
تھی وفا سے بڑھ کے وہ تیری جفا میرے لئے

ہے طوافِ کعبہ تیرے آستانے کا طواف
خاک تیرے در کی ہے خاکِ شفا میرے لئے

عشق میں ضبط فغاں ہے پختہ کاری کی دلیل
یعنی ہے ان کی جفا درسِ وفا میرے لئے

موت کے بدلے شہادت ہو مجھے یارب نصیب
وہ فنا میرے لئے ہے یہ بقا میرے لئے

دل یہ کہتا ہے کہ ہوں میں رازدارِ دلبری
عین شوخی ہے وہ اندازِ حیا میرے لئے

وہ تبسم جور کا آغاز میرے واسطے
ابتدائے لطف عنوانِ جفا میرے لئے

نزع کا ہنگام بوئے گل کا اک پیغام ہے
وصل دائم کی خبر لائی صبا میرے لئے

اللہ اللہ ساقیٔ کوثر کی تاثیرِ کرم
موت ہو کر رہ گئی ہے خود فنا میرے لئے

سید صدیق الزماں مدنی
سابق طالب علم

مابعد جنگ ہندوستان کی معاشی ترقی[1]

میرا خیال ہے کہ وہ تمام لوگ جن کا مطمح نظر مابعد جنگ ہندوستانی معاشی تعمیر ہے - چاہے وہ حکومت ہو یا مختلف عوامی اداروں کے ارکان متفقہ طور پر اس بات کو جانتے ہیں کہ عوام کی حالت درست کی جائے اور مجبور لوگوں کو حقوق دلائے جائیں - ان سب کو عوام کی غربت، فلاکت، ان کی انتہائی جہالت اور سب سے زیادہ ان کی بے کیف زندگیوں کا افسوسناک انجام اچھی طرح معلوم ہے - سبھی کو علم ہے کہ ذرایع زندگی کی ترقی، آبادی کی سالانہ ترقی کا ساتھ نہ دینے کی وجہ سے معاشی پستی بڑھ رہی ہے - دولت کی ناموافق تقسیم جو زمینات و جائداد غیر منقولہ کی غلط طریقہ ملکیت، مواقع کی غیر مساوی دستیابی، سماجی تحفظ کی بالکلیہ غیر موجودگی جس کی وجہ سے بے روزگاری اپاہج پن اور ضعیفی کا مقابلہ نہیں ہوسکتا - عام آدمی کی زندگی کو دشوار بنا رہی ہے - شکر ہے کہ زمانہ قدیم کے ادارے رسم و رواج روایات اور مذہبی فلسفہ ایک حد تک زندگی کو خوشگوار بنائے ہوئے ہے - لیکن موجودہ حالات کو بہتر بنانے کے لئے حکومت اور دوسرے مختلف ادارے مشرقی نقطہ نظر سے معاشی اور سماجی ترقی کے لئے کوشاں ہیں - سب یہی چاہتے ہیں کہ ہر انسان کو ایک معیار زندگی نصیب ہو - اس کو کافی غذا ملے ٹھیک طور پر ملبوس ہو، اچھا مکان رہنے کو ملے اور ایک حد تعلیم یافتہ بھی ہو جائے، اور اگر ممکن ہو تو اس کو کام پر بھی لگایا جاسکے، تاکہ وہ اپنے فرصت کے اوقات اچھی طرح بسر کر سکے اور جب بیمار یا ضعیف ہو جائے تو اس کی مناسب دیکھ بھال ہو سکے - اسمیں شک نہیں کہ ہر انسان کی دیکھ بھال، گہوارہ سے لے کر گور تک مشکل ہے اور ایسا انتظام مکمل کرنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہے لیکن مختلف قدرتی اسباب، ان کا بہتر استعمال مالی امداد اور صنعتی رہنمائی کے مدنظر یہ مشکل چند سال کے دوران میں آسان کی جاسکتی ہے - روس کی مثال ہمارے لئے ہمت افزا ہے - اس میں شک نہیں کہ ہمارا مسلہ اپنی خاص نوعیت اور بعض ذیلی نکات کے اعتبار سے روس کے معاملات سے مختلف اور مشکل ہے اس سے میری یہ مراد نہیں کہ ہمیں روسی تجربہ پر حرف بہ حرف چلنا ہوگا بلکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاشی ترقی کی حد تک لوگ ہر جگہ ایک ہی فیصلہ پر پہنچے ہوئے ہیں - قدرتی طور پر ہماری

---

[1] پروفیسر ایس - کے [illegible] - ایم - اے (کنٹب) کا وہ مقالہ جو جانا گیا ہے ... جامعہ پٹنہ کے تیسویں سالانہ جلسہ کے موقع پر پڑھا گیا۔

مختلف اسکیموں میں مختلف نظریوں کی اہمیت پر اختلاف کا اظہار کیا گیا ہے۔

اب دوسرا سوال یہ ہے کہ اس کے حصول کے لئے کونسی راہ اختیار کی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب پر واضح ہے کہ معاشی ترقی کے اور اسباب کے علاوہ سماجی طاقت ساری معاشی ترقی کی اسکیموں کی رُوحِ رَواں بن جائے گی۔ صرف غذا کی زیادتی۔ پوشاک کی فراوانی اور دلبستگی کے مواقع جو یقیناً ہر تمدن اور معاشرت کے لئے ضروری ہیں اپنی طور پر کافی نہیں ہو سکتے۔ ایک چیز صاف طور پر ظاہر ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان چاہتا ہے کہ وہ ایک وحدت کی طرح۔ چاہے خطہ واری خیالات کچھ اور ہی ہوں ایک قوم کی حیثیت سے ترقی کرے' اور اپنا مقام مساوات اور آزادی کے ساتھ متحدہ اقوام میں حاصل کرے۔ چونکہ ہندوستان نے اس جنگ میں مادی ذرائع سے امداد دی ہے ہمیں اُمید ہے کہ ہماری توقع سے بھی بہت جلد اس کو وہ چیز نصیب ہوگی جو ہر قوم و ملت کی واحد منزل مقصود ہے اور جو اس سرزمین پر بود و باش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ انہیں اگر یہ اختیارات مل جائیں عام اس کے کہ ان کی صورت اشتراکی اشتمالی یا محدود سرمایہ داری ہو میرا خیال ہے کہ ان کی حیثیت ترکیبی کا فیصلہ پارلیمانی و دستوری حیثیت ہی سے۔ ہو سکے گا۔ حکومت چاہے کوئی شکل اختیار کرے عوام کے بھروسہ پر مبنی ہونی چاہیئے ورنہ یہ بڑے بڑے پروگرام جو تیار کئے گئے ہیں آسانی سے روبہ عمل نہ لائے جاسکیں گے۔ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ کر ذہن نشین کرلینا ہوگا کہ ہم کسی حالت میں بھی ان اسکیموں کا بار عوام پر زبردستی نہیں ڈال سکتے۔ جمہوریت کے قوانین آمرانہ اختیارات کے مدمقابل ہو جائیں گے۔ ان کو روبہ عمل لایا جائے لیکن عوام کی مرضی کے ساتھ خواہ وہ پوری امداد بھی نہ دے رہے ہوں۔

ہماری زرعی آبادی کے لحاظ سے ایک امر بطور خاص قابل توجہ ہے۔ ایک خاص درجہ تک نرم مزاج ہوتے ہوئے کسان ضدی طبیعت کا ہوتا ہے۔ اسے مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن ایک حد تک۔ لینن کو بھی اس کے روبرو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ ہمارے سامنے افغانستان اور شاہ امان اللہ کی مثال موجود ہے ہمارے کسان اپنی دماغی حالت میں دوسرے کسانوں سے جو سرحد پار بستے ہیں مختلف نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ہم یہ خیال کرنے پر مجبور ہیں کہ آخر کار کسان ہی ہماری معاشی حالت پر قابو رکھتے ہیں۔ اور وہ ہندوستانی معاشی تعمیر کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسان کا دماغ میرے خیال میں ہماری بقاء کی ابتدا ہے۔ ہم شہری اور اسکیمیں تیار کرنے والے لوگوں کو یہ نکتہ اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے اس لئے ہمیں لازم ہے کہ اپنی زرعی آبادی کی پوری امداد حاصل کرنے کی سعی کریں۔ روس اور ترکی نے اس وجہ سے کامیابی حاصل کی کہ وہ خاص طور پر اپنی زرعی آبادی پر بھروسہ کرسکتے تھے۔ کسان کا دماغ اتنا

بیکار اور بند آلہ نہیں جتنا کہ چند لوگوں کا خیال ہے۔ اس کا خاص طور پر ایک حقیقت پسند دماغ ہے۔ وہ اچھائی اور برائی کو ٹھیک طور پر سمجھ سکتا ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ اس کے ساتھ وہ ایک متشکی مزاج رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہماری اسکیموں کو شبہ کی نظروں سے دیکھے گا اور یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے پہل اس کے خلاف ہو جائے گا۔ اس کی یہ عادت پشت ہا پشت سے چلی آ رہی ہے کیونکہ وہ ہر پہلے موقع پر خیال کرتا ہے کہ ہر شخص اوس سے کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ حاصل کرنے آیا ہے۔ اس کے شک کو بھروسہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے گی کیونکہ یہ مابعد جنگ امور کے روبہ کار لانے کے لئے لازم و ملزوم ہے ورنہ ہماری تمام کوششیں مثلاً تعلیم کی وسعت اور دیہاتی صفائی کی ترقی کی خاموشی کے ساتھ سخت مخالفت کی جائے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ زرعی آبادی کی دوستی حاصل کی جائے۔ ہمارے کام کی حیثیت اس پر بہت کچھ مبنی ہے۔ جو قوت یہ دوستی اور بھروسہ حاصل کرے وہی ہمارے سب اسکیموں کو کامیابی کے ساتھ چلا سکے گی۔

یہ بتلایا جا سکتا ہے کہ اس ملک میں جہاں تعلیم کی فراوانی ہے اور ترقی یافتہ بھی ہے جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ ٹی۔ وی۔ اے (ٹینسی ویلی اتھارٹی) اسکیم کو روبہ کار لانے کے لئے پہلے پہل لوگوں کے دماغوں کو جن سے ان کا تعلق تھا تیار کرنا پڑا، اور اون سے امداد حاصل کی گئی۔ امریکی ارباب حل و عقد کا خیال ہے کہ ایسی دماغی تیاریوں کے بغیر یہ تجربہ سعی لاحاصل ثابت ہوتا اور اتنی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی۔

عوام کے شوق اور توجہ کو بیدار رکھنے کے لئے کسی ایک جمہوری یا اشتراکی قسم کے ادارے کو ترجیح دی جائے۔ ویسی کی طرح میرا خیال ہے کہ کارندہ جمہوریت بہتر ہوگی۔ اس کی خرابیوں اور کمزوریوں کو مشہور دستوری اصولوں سے دور کیا جا سکتا ہے۔ ٹی۔ وی۔ اے اسکیم میں جہاں جمہوریت کی وجہ سے کامیابی ہوئی ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ اگرچہ دیہاتی پنچایت کا طریقہ جو نئے خیالات اور حالات کی وجہ سے کمزور پڑ چکا ہے ہمارے دیہاتی رقبوں سے غایب نہیں ہوا۔ اگر ہم واقعی اپنے دیہاتی عوام میں بیداری پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ان کو محض جہلا سمجھ کر نظر انداز کرنا نہیں چاہتے کہ ان سے مال اور کام لے کر انجان ہو جائیں تو چاہئیے کہ طریقہ پنچایت کو خط واری اور نئے سرے سے کار آمد بنا کر فروغ دیں۔ میں مانتا ہوں کہ کچھ دنوں تک یہ طریقہ کار کمزور رہے گا مگر صبر درکار ہے۔ غلطیوں سختیوں اور ممکنہ ناانصافیوں کو برداشت کرنا پڑے گا انسانی جسم میں رگ و پٹھے استعمال کی کمی کی وجہ سے بیکار ہو جاتے ہیں یہی حال سماجی اداروں کا بھی ہے۔ مگر زندگی کی رو امی ہماری ان دیہاتی

وحدتوں میں موجود ہے۔ اگر انہیں ان کی ذمہ داریوں اور اختیارات سے لیس کر دیا جائے تو ہمیں شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ یہ دوبارہ زندہ نہ ہوں گے وہ قوت اور طاقت حاصل کرتے جائیں گے اور ہماری پراگندہ زندگی میں یک جہتی پیدا ہو جائے گی۔ یہ پنچایتیں مقامی وفاداری کے آئینہ دار ہوتے ہوئے موقتی حالات کو بہتر طور پر پیش کریں گے جس کو اکثر آمرانہ یا مرکزی قوت نظر انداز کر دیتی ہے۔ اس لئے گاندھیائی طریقہ تقسیم اختیارات بعض جگہ پر از امکانات ہے جبکہ طریقہ پنچایت کو ازسرنو فروغ دیا جائے۔ شہری رقبوں میں بھی تجارتی انجمنوں، پیشہ واری ادارہ جات وغیرہ کے ذریعہ عمومیتی قوت کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ اگر ہم بنیادی طور پر جمہوریت کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم مابعد جنگ اسکیموں میں واقعی جان ڈال سکتے ہیں ورنہ وہ محض مکینکی ہو کر رہ جائیں گے اور ان کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

اس لئے ضروری ہے کہ ان اسکیموں کے لئے پبلک کی امداد حاصل کی جائے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ صوبہ متحدہ کی حکومت ہز اکسلنسی سر مارس ہیلیٹ کے تحت جو ایک زمانہ میں صوبہ بہار میں گورنر بھی رہ چکے ہیں، مابعد جنگ ترقی کے لئے ایک صوبہ واری ادارہ قائم کر کے ہندوستان کی رہنمائی کی۔ اس نے کئی کمیٹیوں کے ذریعہ تنقید و تبصرہ کو حاصل کیا۔ ان میں ہر وہ مرد اور عورت شامل ہیں جو کوئی خاص شخصیت کے حامل اور جو صوبہ کے مختلف طبقات زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں یہ ذکر کیا جا سکتا ہے کہ بڑی بڑی اسکیمیں تجربہ کار اور قابل افسروں کے تحت بہت محنت سے تیار کی جا رہی ہیں جب یہ تیار ہو جائیں گی تو ان کو کمیٹیوں کے روبرو پیش کیا جائے گا تاکہ وہ اس کو جانچیں اور مناسب کمی و بیشی کر سکیں۔ حکومت ان معاملات میں کچھ پوشیدہ نہیں رکھ سکتی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ تشہیر بہتر ہوا کرتی ہے اور تنقید کی زیادتی ہر زاویہ نگاہ سے مناسب معلوم ہوتی ہے آخر کار ٹیکس کا ادا کرنے والا ہی بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کو روبہ عمل لانے کے لئے بلایا جائے گا۔ پرانے ٹیکس بڑھائے اور نئے ٹیکس لگائے جا سکتے ہیں۔ قرضہ اندرون و بیرون ملک لئے جا سکتے ہیں چاہے قرضہ جات جو زر پر مبنی ہوں جلد یا بدیر یا ایک وقت یا کئی قسطوں میں ادا کر دئے جائیں اور ان کا ذریعہ کرنسی نوٹ ہوں یا وہ مال جو خریدنے والوں سے حاصل کیا جاتا ہے یا بیوپاریوں سے یا ان ذرائع کار سے جو برطانیہ سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ جبکہ ان اسکیموں کو چلانے کے لئے کافی رقم درکار ہوگی ان قرضوں کو بہر حال حاصل کیا جائے۔ چونکہ آخر کار ان کو واپس کرنا ہے اس لئے ٹیکس دینے والے ہی کو ان کا بار اٹھانا پڑے گا۔ برطانوی جمہوری قوانین کے لحاظ سے بغیر نمایندگی کے ٹیکس اندازی نہیں ہو سکتی ضروری ہے کہ ساری اسکیمیں جن پر کروڑ ہا روپیہ صرف کیا جائے گا پبلک کے نمایندوں

کے روبرو تنقید کے لئے پیش کئے جائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام صائب رائے رکھنے والے حضرات میرا ساتھ
دیں گے کہ حکومت جوں ہی ان اسکیموں کی تیاری مکمل کرلے ان کو ملک کے آگے بحث و تمحیص کے لئے بھیجا
جائے۔ میں اس کا صاف طور پر اظہار کروں گا کہ عوام ان اسکیموں کو شکی نظروں سے دیکھ رہے ہیں مگر میں
اس وقت بھی کہوں گا کہ جب یہ اسکیمیں سامنے آئیں جانچ لیا جائے اس وقت تک فیصلہ کو روک رکھے۔

جمہوریت کے نقطۂ نگاہ سے اتنا کچھ کہنے کے بعد ساتھ ہی یہ خیال بھی ہے کہ پبلک پالیسی کے
قیام اور اسکیموں کے قبول کئے جانے کے بعد ان کو روبہ کار لانے کے لئے سررشتہ جات متعلقہ کے حوالہ
کردیا جائے۔ عمومیتی طور پر تیار کرنے اور سررشتہ واری روبہ کار لانے کا طریقہ ہی میرے نزدیک بہتر زیادہ
تشفی بخش اور جلد نتیجہ خیز ہوگا۔ اگر ہم طریقہ سرمایہ داری کے تحت کام کریں تو چند صنعتیں اپنے طبیعی اور
اصطلاحی نقطۂ نظر سے ایسی ہونگی جن کی بجائے حکومت پبلک ٹرسٹ یا کارپوریشن یا خاص عوامی
ادارے کو کرنی ہوگی جو اس غرض کے لئے بنایا گیا ہو۔ پبلک کی ضرورت کو صنعتیں اور بنیادی کام اس قسم
میں آجاتے ہیں۔ یہ ذہن نشین رہے کہ بمبئی پلان کا دوسرا حصہ اس طریقہ معاشی ادارے کو تقویت
بخشتا ہے۔ اس بنا پر مذکورالصدر طریقہ کا خاص لحاظ رکھا جائے صحیح جانب یہ ایک قابل قدر اقدام
ہمیں لازم ہے کہ جرمن مجلسی خیال کو ترقی دیں۔ شاید ایک نئی قسم کی اصطلاحی اور معاشی سول سروس
کو تیار کرکے مقرر کرنا ہوگا۔ ٹکنیکی کام اول لوگوں کے ہاتھ چھوڑ دیا جائے جو ضروری تعلیم اور واقفیت
رکھتے ہوں۔ میرے خیال میں روس میں ہی ایسی ضرورت پیش آئی تھی۔ جمہوریتی دخل خاص طور پر جہاں
تقرر احکامات اور گتوں کی اجرائی کا مسئلہ ہو انتہائی کم رہے۔ شخصی منفعت کا خیال اگر اس کو اس کی
حالت پر چھوڑ دیا جائے تو دنیا میں جنت نہیں بنا سکتا۔ حکومت کے زیر اثر اگرچیکہ اس کی ملکیت اور
اس کا انتظام بھی نہ ہو پھر بھی ممکن رہے کہ صنعت کے ساتھ اس کی مہارت بھی مد نظر ہو جس میں خریداروں
کا نفع اور عمال کے حقوق کا لحاظ رکھا جائے۔ صنعت کی ترقی ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے کوئی
ایسا کام نہ کیا جائے جس سے اس کی رفتار میں فرق آئے اس لئے شخصی کوشش کے لئے بھی ملک میں
کافی میدان چھوڑ دیا جائے۔

یہ مانتے ہوئے کہ ہندوستانی معاشی ترقی کو جس نوبت پر اب ہے صاف طور پر کہنا پڑتا ہے
کہ بہت کچھ شخصی متحدہ اور امداد باہمی کوشش پر چھوڑ دینا پڑے گا۔ ہندوستان کے صاحب اقتدار نہ
کوئی محکمہ نہ آدمی نہ قابلیت نہ تجربہ رکھتے ہیں کہ وہ اتنے وسیع اور سخت پیچیدہ مسائل معاشی ترقی و سماجی
از سر نو تعمیر کا مقابلہ کرسکیں جو مختلف تجاویز میں پوشیدہ ہے۔ شخصی کوشش میں خواہ مخواہ کی رکاوٹیں اس لئے

نہ پیدا کی جائیں جس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔

دوسرا اہم سوال تقدیم کا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ پہلی ضرورت پیداوار کی ہو طرفہ مقدار بڑھانے کی ہے۔ بنیادی ضرورتوں کا پہلے لحاظ کرنا ہے۔ غذا کی فراہمی۔ لباس۔ رہائشی مکانات تعلیم اسی مناسبت سے اور ضروریات زندگی کو بڑھانا ہوگا۔ ٹکنیکی طریقہ جس سے انسان واقف ہے، اور سائنس کی لامتناہی تحقیق کے ذریعہ زمینی اور صنعتی پیداوار کو ترقی دی جاسکتی ہے مختلف تجاویز کے ذریعہ مختلف امور عوام کے روبرو پیش کئے جاسکتے ہیں۔ بیکار زمینوں اور چراگاہوں میں کاشت کی جاسکتی ہے۔ اور جنگل اُگائے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح ہر ایکڑ پر پیداوار بڑھائی جاسکتی ہے۔ آبرسانی، مزراعہ، مصنوعی کھاد، بہتر بیج، اچھی انتظامی قابلیت، طریقہ ھائے پرورش مویشی میں ترقی، صنعتی اداروں کے کارکنوں کی تربیت، سستی قوت برقی کی بہتات، صنعت کی بہتر وقوع پذیری، ذرائع حمل ونقل کی فراوانی، قرضہ جات کی سہولت دستیابی، بیوپار کی سہولتیں، گھریلو صنعتوں کی ہمت افزائی تاکہ مختلف اشیاء کی پیداوار ہوسکے۔ غیر ممالک سے تجارت وہ ضروری طریقے ہیں جن سے معاشی ترقی دی جاسکتی ہے میرے لئے غیر ضروری ہے اور نہ میں اس قابل ہوں کہ اتنے تھوڑے وقت میں جو ملا ہے ان سب پر روشنی ڈال سکوں۔ معاشیات کے متعلم بہرحال اس سلسلے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس کی پہلے ضرورت ہے کہ ٹکنیکی ترتیب ہر شعبہ میں مثلاً معاشیات۔ تعلیمات۔ طب انجینری۔ وغیرہ میں دی جائے اور یہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ روسیوں کو بھی ان کے تجاویز کے عملی جامہ پہنانے میں دقتوں کا سامنا اس لئے کرنا پڑا کہ ان کے پاس ہنرمندوں کی کمی تھی۔ واقعی ہم ان سب چیزوں کو حاصل نہیں کرسکتے جن کا ہم کو خیال ہے جب تک ہمارے پاس تربیت یافتہ ہنرمند نہوں ہنرمند عورتوں کی غیر دستیابی بھی بعض حالتوں میں ہمارے لئے ایک خاص کمی ہوگی۔ مثلاً صرف تعلیم کے میدان میں سارجنٹ اسکیم مستورات کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ اس کے خیال میں اساتذہ کی تعداد پری بیسک، جونیر بیسک، سینیر بیسک، اور فوقانی مدارس کے لئے بیس لاکھ سے زائد ہے۔ ضروری ٹکنیکی اور۔ انجینیری شعبہ جات جیسے جنگلات، معدنیات، برقی۔ ذرایع حمل ونقل، دیہاتی کام وغیرہ میں ان کی مانگ بہت زیادہ ہوگی۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ سرادیشر دلال کو لوگوں کی تعلیم کا زیادہ خیال ہے۔ اس خاص نکتہ پر ہمارے تعلیمی، انجینیری وٹکنیکی ادارے جامعات اور شعبہ جات تحقیق پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہے۔ جامعات کو بہت جلد اپنی سہولتوں کا جائزہ لینا ہوگا کہ اخراجات سامان اور اساتذہ کی فراہمی کا انتظام کیا جائے تاکہ ضروری ٹکنیکی تعلیم اور تربیت دی جاسکے۔ خطہ واری تجاویز حکومت کے سامنے پیش کی جائیں۔ کچھ دنوں پہلے بڑی دلچسپی کے ساتھ میں نے یہ خبر پڑھی تھی کہ

آسٹریلیا میں ٹکنیکی و انجینیری تعلیم کے سارے طریقے شروع سے آخر تک نظرثانی کے بعد بدل دئے جا رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جامعہ ملیہ اور وکٹوریہ جوبلی ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ اسکیمیں تیار کر کے غور و خوض میں لگے ہوئے ہیں جن کے ذریعہ ان کے نصاب تعلیم کو مشرقی رنگ دیا جائے گا۔ دوسری جامعوں کو بھی یہی طرز اختیار کرنا پڑے گا۔ ٹکنیکی تحقیق کا جامعیاتی منشاء اور اس کے حصول کے ذریعہ کے لئے حکومت اور صنعتی اداروں کو فراخ دلی کے ساتھ امداد کرنی ہوگی لیکن اس کے ساتھ یہ ذہن نشین رہے کہ جامعات یا دوسرے سائینسی یا تعلیمی ادارے کافی آزادی کار کے حامل ہوں۔ ہمیں چاہیئے کہ غیر ممالک سے ہنرمندوں کو بلائیں اگر ہم ایسا کر سکتے ہیں تو ہم کو اسی وقت پہل کر دینی ہوگی قبل اس کے کہ جنگ ختم ہو۔ ان کی فراہمی آسان نہیں لیکن کوشش ضروری ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کچھ صنعتی ادارے جن کو ابھی سے مستقبل کا خیال ہے اس مسلہ پر غیر ممالک کے اداروں سے سلسلہ جنبانی کر رہے ہیں۔ ہمیں غیر ممالک میں تعلیم دلانے کے ذرائع حاصل کرنے ہوں گے۔ ظاہرا طور پر یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ ہم نے پہلے خیال کیا تھا مگر اسمیں شک نہیں کہ ہمارے پاس ایسے اشخاص موجود ہیں جن کو تعلیم دلائی جا سکتی ہے۔ ہماری صنعتوں میں ہماری ریلوں پر، بحری و ہوائی فوج میں، آرڈننس اور بارود کے کارخانوں میں ہم نے نوجوانوں کو بھیجا اور انہوں نے خاطر خواہ کام کیا اس لئے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم میں قابلیت ضرور ہے مگر مواقع کی ضرورت ہے جس کا بہم پہونچانا ہمارا فرض ہے ورنہ ہم اپنے فرض کی ادائیگی میں ناکام رہیں گے۔

ٹکنیکی اشخاص کی فراہمی کے بعد دوسری بڑی ضرورت اصلی سامان کی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہم ان کی پیداوار میں مہارت زمانہ قریب تک پیدا نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمیں لازم ہے کہ کہیں نہ کہیں اُس کی ابتدا ضرور کر دیں۔ یہ خبر خوش کن ہے کہ ضروری اصلی سامان مثلاً ریل گاڑی کے انجن کی تیاری ملک میں شروع ہو چکی ہے۔ جہازوں کی تعمیر کی چھوٹے پیمانہ پر ابتدا کر دی گئی ہے اگر ضروری تحفظ اور حکومت کی سرپرستی مل جائے تو جلد ترقی ہو سکتی ہے مگر یہ مسلہ غیر ممالک کے اداروں سے سمجھوتے پر ہے اور یہ کام مشکل ضرور ہوگا۔ لین دین کی پالیسی کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے عوامی اداروں کے اشخاص یہ چیز سیاس بن کر دیکھیں۔ ہمارے کاروباری آدمی میں سمجھتا ہوں ایسے طریقہ کار کی ضرورت سے بخوبی واقف ہیں۔

دوسرا مسئلہ جس کو میں بغیر روک ٹوک کے کہہ دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ملک کو چاہئیے کہ ہر ممکنہ طریقہ سے اون اشخاص کی مدد کرے جو اپنی جان کی بازی لگا کر اور اپنا خون بہا کر جنگ میں ہندوستان کے نام کو جو پہلے سے مشہور تھا چار چاند لگا گئے۔ یہ لوگ حکومت اور عوام پر خاص حقوق رکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت ان کا ساتھ دیگی اسی طرح ملک کو بھی ان کا ہاتھ پکڑنا ہوگا۔ آخر وہ بھی ملک کے

سپوت ہیں جس طرح سے ہم میں سے ہر ایک ہے۔ وہ وطن پرست ہوتے ہوئے حساس بھی ہیں اس لئے کوئی کام ایسا نہ کیا جائے کہ یہ باقی ملک سے علیحدہ ہو جائیں وہ ملک کے دیہاتی اور صنعتی کاروبار کے مختلف پہلوؤں میں محنت اور جفاکشی کے لئے قوت بازو ثابت ہوں گے۔ ہم کو ان کی اور ان کے خاندانوں کی تجاویز کو بخوشی قبول کرنا ہوگا کیونکہ وہ ہمارے سیاسی زندگی کے گوشت و پوست ثابت ہوں گے۔

فوجیوں کے ذکر کے بعد میں بچوں اور بالغ عورتوں میں اشاعت تعلیم کو مقدم سمجھتا ہوں۔ بالغ مرد کی تعلیم کا خیال مجھے گرویدہ نہیں بنا سکتا۔ وہ چاہے تعلیم حاصل کرے یا نہ کرے اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی غلطی ہوگی کہ اگر ہم بالغ عورتوں کی تعلیم کی جانب غفلت برتیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے انجام پذیری کے لئے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اولاً یہ آسان نہیں ہے کہ تعلیم یافتہ عورتوں کو اکٹھا کیا جا سکے۔ دوم یہ اور بھی مشکل ہے کہ ان کو ہمارے دیہات میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے، کیونکہ سماجی زندگی غیر خوش کن ہے۔ سب سے بڑھ کر خرابی یہ ہے کہ ہمارے بھیجی ہوئی عورتوں کو جو دیہات میں کام کریں گی شخصی تحفظ کی کمی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ تنخواہیں جو دی جاتی ہیں اس قدر قلیل ہیں کہ معقول طرز رہائش اختیار کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ گو یہ ایسے مسائل نہیں ہیں کہ جن کا حل نہیں ملتا۔ اگر فوری شوق پیدا کیا جائے تو ان مشکلات کا سدباب ہو سکتا ہے۔ یہ اس کام کا ایسا رخ ہے کہ جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ عیاں ہے کہ ان نوجوان ماؤں کے ہاتھ میں آنے والی پود کی ترقی ہے۔ تعلیم نہ اتنی دقت طلب ہو نہ اتنے اقسام کی جیسا کہ آپ کو مجھے اور ہماری بہنوں کو حاصل کرنی پڑی۔ پرورش اطفال، گھریلو معاشیات پر زیادہ سودمند تعلیم بغیر اوس دقت اور تکلیف کے دی جا سکتی ہے جس کا کہ ہم کو آپ میں سے اکثر لوگوں کو سامنا ہوا تھا۔ ہمارے تعلیمی ماہر اپنی سفارشات پیش کریں کہ ان کو فوراً روبہ عمل لایا جا سکے۔ ہم ایک نسل کو وقت پر بچا سکیں گے اگر ہم ان عورتوں پر اپنی توجہ مبذول کریں تعلیم یافتہ روشن خیال عورتیں ہمارے دیہات میں بڑی قوت کا باعث ہوں گی۔ ان کے ذریعہ اتنی ترقی ہوگی کہ جس کا خیال کرنا بھی مشکل ہے۔ کوشش کا بڑا حصہ ان ماؤں کو سامنے لانے کے لئے صرف کیا جائے جو ہر اسکیم کی پشت پناہ ہیں جس کے ذریعہ ہر قسم کی قومی تعمیر کی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جائے گا چین اور روس اور ہر ترقی یافتہ ملک میں مستورات اپنے خاموش مگر یقینی طرز عمل کے ساتھ ہر قسم کی ترقی و آزادی دلانے والے رجحانات کو قوت بخشتی رہیں۔ اگر ہمارے پاس سرمایہ، عملہ، اور سامان وافر مقدار میں موجود ہو تو میں بالغ مردوں کی تعلیم کی بھی سفارش کروں گا۔ مگر ہمیں پہلے اپنے قلیل سرمایہ کو بڑھانا ہوگا۔ ہم اپنے اخراجات کو غیر معمولی طور پر نہیں بڑھا سکتے۔ اور اپنے محدود سرمایہ اور آمدنی کے ساتھ لازم ہے کہ اوس روایتی رشیلی

بیوی کی طرح ہمارے پاس جو کچھ پونجی ہے اس کو اپنی مختلف ضروریات پر خرچ کریں۔ میں اسی لئے عورتوں کی اسکیم کو مقدم سمجھونگا۔ کیا میں یہاں ڈاکٹر ہیوٹ جانسن واجب التعظیم ڈین کنٹربری کی خیال افروز کتاب "دی سوشلسٹ سکستھ آف دی ورلڈ" سے حوالہ دوں۔ وہ لکھتا ہے کہ غیر معمولی خوشحال گھر اور عقلمند ماؤوں کی وجہ سے میں یہ دیکھ سکتا ہوں کہ کوئی سماجی طریقہ اتنا موثر ثابت نہ ہوسکا جس کو یہ امور زندگی کے بنیادی اصولوں کے طور پر نصیب نہ ہوئے ہوں اور جو گھر تعلیم سے بے بہرہ اور جہاں کی مستورات لیاقت، ہوشیاری، پبلک زندگی سے نابلد رہتے ہوئے مردوں کے ساتھ مساوات کی زندگی بسر کر سکتی ہوں۔ اس لئے جب میں نے زمانہ حال کے جرمنی فرانس اور روس کی حالت دیکھی تو پہلا خیال جو میرے دماغ میں گذرا وہ گھر اور عورت کا تھا۔

سوال کا دوسرا پہلو جس کو میں خاص غور وخوص کے لئے بیان کرونگا وہ صنعتوں کا مسئلہ مقام وقوع ہے۔ کئی وجوہات کی بنا پر جس کو متعلم معاشیات بخوبی جانتے ہیں مقام وقوع کا مسئلہ اس زمانہ میں خاص اہمیت حاصل کرتا جارہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمام معاشیات دان نے مان لیا ہے اور ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر (علیگ) نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو معاشی کانفرنس دہلی کے موقع پر پڑھا گیا تھا یہ ظاہر کیا ہے کہ ملک کے معاشی اتحاد کو برقرار رکھا جائے ان کا خیال ہے کہ ہم اور وسیع نظری سے کام لیں جو ہونا ہے وہ ہوگا لیکن جب ہم ہندوستان کو ایک غیر منقسم وحدت قرار دیتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ نتیجہ خیز اور جلد ترقی خطہ واری طریقہ پر حاصل ہوگی۔ میں نے پہلے ہی ٹکنیکی اساتذہ کی غیر فراہمی، سامان کی کمی اور سرمایہ کی محدودی کی حقیقت بیان کردی ہے۔ اس لئے ہم کوئی ایسا کام جس کے ذریعہ چوطرفہ ترقی ہو فوراً ملک میں روبہ عمل لا نہیں سکتے۔ اور اگر ایسا ممکن ہوتا تو ہم ضرور کرتے مگر ہمیں اپنے ذرائع کو سودمند طریقہ پر برسرکار لانا ہوگا۔ یہ مانتے ہوئے کہ ہماری سب سے بڑی کمی سرمایہ ہے ہمیں اس کو پورے طور پر ترقی دینی ہوگی۔ مجھے اجازت دیجئے کہ میں بیان کروں کہ صوبہ متحدہ میں سر مارس ہیلیٹ نے بڑی کاوش سے صوبہ کے لئے سستی برقی قوت کی فراہمی کے امکانات پر غور کیا ہے۔ انہوں نے اس کو اپنے مالوی خواب سے تعبیر کی ہے اس لئے ہندوستان کے بڑے دریاوی خطوں پر ہم اپنے پروگرام روبہ کار لائیں۔ ممالک متحدہ امریکہ جیسے مالدار ملک کو بھی یہی اختیار کرنا پڑا۔ ٹی۔ وی۔ اے اسکیم کو جنم دے کر اور کامیابی سے چلانے کے بعد ان کا خیال ہے کہ ایم۔ وی۔ اے (مسوری ویلی) اسکیم کی ویسے ہی دوسرے خطہ میں ابتدا کریں۔ روس نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس کے کام بڑے پیمانہ پر رہے جس کی سودمندی اس جنگ میں ثابت ہوچکی ہے۔ ہمارے وجوہات بھی کچھ کم ضروری نہیں مگر ہمارے حالات اسی طرح روس جیسے بھی نہیں ہیں۔ اس پر بھی ہمیں خطہ واری آگے بڑھنا ہوگا سستی برقی قوت قوم کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔ وہ ایک قابل، ہوشیار، نظامت ترقی کے

تحت عوام کی امداد کے ساتھ تھوڑے وقفہ میں بہت کچھ کارآمد بن سکتی ہے۔ اگر خانہ بدوش قبائل جو یورپی پہاڑیوں کے اوس پار اور آرکٹک خطوں میں بستے ہیں ایسی ترقی کے قابل ہیں تو میں اپنے ملک میں بھی اس کے حصول کو ناممکن نہیں سمجھتا۔ ہمارے پاس ویسے حالات ہیں اور اس کا امکان ہے صرف ہم کو اپنے قابلیت پر بھروسہ کرنا ہے' یہ بھروسہ ہم کو پہاڑوں کے ٹکرا دینے میں بھی ہماری مدد کرے گا۔

دوسرا مسئلہ جس کا میں صرف ذکر کروں گا میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں وہ یہ ہے کہ ملک میں مساویانہ معاشی حالات کے پیدا کرنے کا خاکہ تیار کیا جائے۔ ہم سب اور ہمارے اکثر طالب علم فریڈرک لسٹ کے متعلم ہیں۔ ان تمام کے لئے علاوہ صناع اور معاشیات داں نے بھی ایسی مساویانہ معاشی ترقی پر زور دیا ہے۔ ہم دنیا کے دوسرے ممالک کی ہم عصر تاریخ سے بخوبی واقف ہیں کہ اس کی ضرورت واہمیت کو سمجھ سکیں۔ آسٹریلیا دوران جنگ میں بھی ایک صنعتی ملک بن کر سامنے آیا ہے۔ جبتک ہم اپنی صنعتوں کو فروغ نہ دیں گے ہم اپنی زراعت کو ترقی نہیں دے سکتے۔ ہماری زراعتی ترقی جس کے لئے ہم اس قدر پریشان ہیں ہماری صنعت اور تجارت کے مقابلے میں چولی دامن کا ساتھ رکھتی ہے۔ دوسرے وجوہات کی بناء پر اور خاص طور پر فوجی نقطہ نظر سے ہمیں اپنی صنعت کو وسیع پیمانہ پر ترقی دینی ہوگی۔ گاندھیانہ خاکہ میں بھی حفاظتی صنعت کے لئے جگہ رکھی گئی ہے۔ خاکہ مذکور کا یہ مسئلہ عدم تشدد کی پالیسی کے ساتھ ہے یا نہیں۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس پر رائے زنی کر سکوں اور مجھے اس کا بھی علم نہیں کہ آیا یہ گاندھی جی کی مرضی کے مطابق ہے۔ مگر شخصی طور پر مجھے شک ہے کہ دنیا فلسفہ عدم تشدد کو پسند کرتی ہے میں خود سمجھتا ہوں کہ ہندوستان اور دنیا کو اس سے تشفی نہیں ہوئی۔ حفاظت حملہ کا پیش خیمہ ہوگی اس لئے یقینی فوجی تیاری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہم کو بہرحال ماننا پڑے گا کہ ملک کی صنعت کو ممکنہ طور پر وسعت دینے کے بعد پیداوار کا بڑا حصہ چھوٹے درجہ کی اور گھریلو صنعتوں کے لئے باقی رکھتا ہے۔ سستی برقی قوت، مقامی خام اشیاء کی زیادتی فنونی دستگاہیں، کم خرچ عملہ، ترقی یافتہ ذرائع حمل و نقل، مقامی شوق کی قوت، آبادی کی ضروریات کے پورا کرنے میں زیادہ حصہ دار ہوں گی۔ مقامی اہمیت' خوبصورتی اور صحت کے شہری نکتہ نظر سے دیہات کو نیا جنم دینے کا خیال دلکشی رکھتا ہے۔ ہم اس قدر آگے نہیں بڑھ سکتے جیسا کہ گاندھی جی کا خیال ہے۔ لیکن ہم اون کی اسکیم کو قدیم اور ناکارہ سمجھ کر نظر انداز بھی نہیں کر سکتے۔ شہروں کی گنجانی اور بدبختی کو ہر طرح دور کیا جائے۔ ہم کو بہتر دیہاتی گھر اور دوسرے شہری و تفریحی مقامات کی تعمیر کرنی ہوگی۔ گو ہم یہ مانتے ہیں کہ صنعت کی وسعت ہماری کل مردانہ آبادی کے بڑے حصہ کو کام پر نہیں لگا سکتی گو ہمارے

معمولی کام جیسے غذا کی فراہمی وو یگر استعمال کے سامان کی پیداوار تا کہ کم درجہ کے ضروریات زندگی پوری ہوں ہمارے گھریلو و چھوٹے پیمانہ کے صنعتوں کے ذریعہ روبہ عمل لائے جائیں گے۔ اکثر مواقع پر وہ روایتی زراعتی کام کے ساتھ جو مختلف دیہاتی خاندان کیا کرتے ہیں جاری رہیں گے۔ ہمیں اس لئے ہماری ٹکنیکی قوت گھریلو صنعتوں میں استعمال کرنی ہوگی۔ برقی قوت چاہے کسی قسم کی ہو ہمارے سامان کی بہم رسانی میں مفید ثابت ہوگی۔ ضروری کم قیمت مشنری، اوزار اور دیگر سامان کو فراہم کیا جائے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ممالک متحدہ امریکہ کی بین الاقوامی ہارو سٹر کمپنی آج کل اپنے معمولی کسان اور کارندوں کے لئے اوزاروں کی تیاری میں لگی ہوئی ہے۔ ہمیں اس کا علم ہے کہ جاپان نے اس مشنری کے ذریعہ اپنی گھریلو صنعتوں کو فروغ دے کر دنیا کی رہنمائی کی۔ کوئی خاص وجہ نہیں کہ یہ ہندوستان میں بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ایسی اسکیم کی تیاری سے عوام مطمئن نہیں ہو سکتے جس میں سماجی تحفظ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ قدرتی طور پر بہترین تحفظ وہ ہوگا کہ باشندوں کو ان کی زندگی کے کارآمد زمانہ میں سود مند پیشہ پر لگا رکھیں۔ لیکن یہ طریقہ معاشی استحکام ابھی ہمارے ملک میں چلایا نہیں جا سکتا۔ ہماری متنزل معاشی حالت زیادہ تر زراعت پر مبنی ہے جو زندگی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ ہندوستان میں زراعت ابھی تک موسمی حالت پر چل رہی ہے اور یہ غلطی، محاورہ بن گئی ہے۔ مگر ہمیں ایک طرف صنعتی سرد بازاری اور بے روزگاری کا مقابلہ کرنا اور ضروری غور و فکر کے بعد احتیاط اور اعتدال کے ساتھ ان حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔ دوسری طرف زراعتی بے روزگاری یا سچ تو یہ ہے کہ موسمی بیکاری کو تعمیرات عامہ کے ذریعہ دور کرنا ہوگا اگر اس کو زراعتی سرد بازاری کے زمانہ میں جو موسمی حالات کی تکرار کا نتیجہ ہوا کرتی ہے روبہ عمل لایا جا سکے۔ اس کے علاوہ میں صنعتی وظیفہ اور اپاہجی بیمہ فنڈ پر خاص توجہ کے لئے عرض کروں گا۔ کافی اعداد و شمار حقیقی حالات دریافت کنندہ و معاشیات داں کو جمع کرنے ہوں گے قبل اس کے کہ حکومت اس جانب قدم اوٹھائے۔ مگر ان دو فرقوں ضعیف اور اپاہج کی امداد کا خاص خیال ملک کو رکھنا ہوگا۔ امداد کا مسئلہ ذرائع آمدنی، عمر، جنسیات و انتظامی قابلیت، وہ اہم مسائل ہیں جن پر قابل اشخاص کی غور و فکر مرکوز رہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ حکومت نے ابھی سے اس مسئلہ سماجی تحفظ کے بعض پہلوؤں پر پوری توجہ سے عمل پیرا ہو رہی ہے ایسی سب اسکیموں کے لئے کافی روپیہ درکار ہے جو بھی پیداوار میں ترقی ہو اور بچت بڑھتی جائے مساوات بہتر تقسیم کے داعی ہوں گے۔ بمبئی پلان کا دوسرا حصہ اس سماجی تحفظ کی پابجائی کو مانتا ہے۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے قدیم مشترک خاندانی طریقہ کی بنیاد پر تعمیر کرنی ہوگی۔ قبل اس کے کہ وہ خود پسند زندگی کے نئے خیالات اور حالیہ معاشی طریقہ کے برے اثرات کے تحت بالکل

ناپید ہو جائے۔ ہمیں ملک کی خیرات کو جو مختلف مذہبی اداروں کے ذریعہ ملے بہتر طریقہ سماجی امداد پر صرف
کرنا ہے جو ان حالات میں زیادہ ممکن ہے۔ مذہبی سربرآوردہ حضرات کو ملک کی اس ضرورت کے لئے بیدار کرنا
ہوگا۔ وہ زیادہ اقتدار کے مالک ہیں اور ان کے ذریعہ اس نیکی میں مدد مل سکتی ہے۔

ممکن ہے کہ تمام سماجی تحفظ اتفاقیہ طور پر آبادی کی خاکہ بندی پر دلالت کرے مگر تعلیمی نقطہ نظر
سے یہ خاص طور پر عوام کو غور و فکر کی دعوت دی گئی جن کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ
کچھ دنوں تک قابل تعریف اور اطمینان بخش نتائج ظہور پذیر نہ ہوں گے لیکن ہمیں چاہیئے کہ شہری نکتہ نگاہ سے
عام ترقی کی اجازت دیں کہ وہ معیار زندگی اور تعلیم کو اپنے طور پر بڑھنے دے۔

ایک ضروری مسئلہ جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس کا بین الاقوامی پہلو ہے۔ کوئی ملک ہو
علیحدہ گذارا نہیں کر سکتا اور اگر ہم ایسا کرنا چاہیں تو بھی ہمارے ملک کے لئے زیادہ مشکل ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔
ہندوستان ساری دنیا کے معاملات میں پورا حصہ لینا چاہتا ہے اور پوری دنیا کی تجارت میں اپنا حق
مانگ رہا ہے۔ اس سے درآمد و برآمد مراد ہیں مگر اس کے لئے ایک شرط ہے کہ ہم اپنے معاملات میں جو
ہمارے معاشی حالات کا نتیجہ ہوں آپ ہی سلجھائیں۔ ہم دنیا کی مارکٹوں میں اپنا مقام پیدا کرنا چاہتے ہیں
کہ ہم اپنے خام اشیاء و تیار شدہ مال جس کو ہم بین الاقوامی قیمتوں پر فروخت کریں گے بھیج سکیں۔ ہم بیشک
اپنے یہاں ایک بڑی مارکٹ رکھتے ہیں لیکن اس کی قوت خرید کم ہے۔ ہماری آمدنی کی ترقی کے ساتھ ہم میں
زیادہ خریدنے کی سکت پیدا ہو جائے گی جیسے جرمنی قبل جنگ بر اعظم یورپ میں انگلستان کے مال کا سب سے
بڑا خریدار تھا۔ بطانوی اور دوسرے ممالک کے لوگ ہندوستانی صنعت و حرفت اور درآمد مال کی ترقی
کو خوف کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ یہ تمام ترقی اتنی تجارت کو فروغ دے گی کہ ان کو اس کا سنبھالنا مشکل
ہوگا۔ ذہنی تخیل کا نتیجہ سمجھئے یا کہ ان کے اپنے مفاد کا خیال کہ اس جانب ان کی توجہ کم رہیگی اس پر بھی
ہمیں روپیہ کے معاملہ میں اپنے پیر پر آپ کھڑا ہونا ہوگا۔ ہمارے تجارتی معاہدات ایسے ہوں کہ اسمیں
دنیا کی کل بین الاقوامی تجارت میں حصہ کا لحاظ رکھا جائے۔ لین دین کے ذریعہ نہ کہ علیحدگی سے پوری
دنیا کی تجارت میں حصہ لیا جا سکتا ہے۔ اس سے نہ صرف ہمیں بلکہ ہم سے تجارت کرنے والوں کو بھی فائدہ پہونچیگا۔

مجھے یقین ہے کہ تمام ممالک کے مفکر اس بات کو مانتے ہیں کہ ہندوستان اور انگلستان کا چونکہ
خاص اور تاریخی میل ہے امید ہے کہ ضروری بحث و تحیص کے بعد ایسے باعزت شروط تیار کئے جائیں گے
جن کی بناء پر ہر دو ممالک کے باشندوں کی اور تمام دنیا کی بہبودی ہوگی۔ ہم جامعات کے اشخاص
ایسے مسائل کا مطالعہ ان ہی خیالات کے ساتھ شروع کریں۔ (ترجمہ)

سید حسین علی ویراگی
سابق طالب علم

بھکارن کی پکار

دیدے پربھو کی دان داتا۔ دیدے پربھو کی دان

۱۔ ایک ہی سب کا پالن ھارا
جیون نیّا کھیون ھارا
اس کی بھگتی منش سہارا
جگ میں بڑا بھاگوان ــــ داتا دیدے پربھو کی دان

۲۔ بپتا کی ماری میں دکھیاری
صبح سے نکلی کرتی زاری
رین ہووت ہے اب اندھیاری
کوئی نہ دیوے دھیان ــــ داتا دیدے پربھو کی دان

۳۔ جگ پوچھے تو رہتی کہاں ہے
آکاش کے نیچے رہتی جہاں ہے
نردھن کو کٹیا ہی کہاں ہے
کس کا کیسا مکان ــــ داتا دیدے پربھو کی دان

۴۔ دولت میں سکھ پربھو کی اچھا
غربت کیا ہے ایک پریکشا
کون منش کیا اس کی آشا

جیون کیا ہے لگان — داتا دیدے پربھو کی دان

۵۔ پُرش کو بس سُندر تا بھائے
رُوپ پہ ریتھے مَن سے نہ چاہے
دُکھیا جیون کیسے بتائے
کہاں کِس کو دھیان — داتا دیدے پربھو کی دان

۶۔ دُکھ بھی نہ دیوے دِلاسا مَن کو
سُکھ کا ملے نہ سہارا ہسم کو
مر جائیں ہم چنتا کِس کو
جگ ہم سے انجان — داتا دیدے پربھو کی دان

۷۔ ہم جو ہنسیں سنسار ہنست ہے
رُوئیں ہم تو کون رُووت ہے
سچ ہے دُکھی کا کون ہووت ہے
اپنا بس بھگوان — داتا دیدے پربھو کی دان

۸۔ ہم بھی منش سا تن رکھتے ہیں
تن میں اپنے مَن رکھتے ہیں
ہم بن سب کیوں دھن رکھتے ہیں
نیائے کا یہ ایمان — داتا دیدے پربھو کی دان

۹۔ خاک پہ سر ہے سُونا کیسا
تکیہ کہاں کا بچھونا کیسا
سپت نہیں تو سپنا کیسا
جیون سارا تھکان — داتا دیدے پربھو کی دان

۱۰۔ آئے ہیں تو جانا ہوگا
جگ سے رشتہ توڑنا ہوگا
بستی اور بسانا ہوگا
دو دن کے مہمان۔ داتا دیدے پربھو کی دان

۱۱۔ تن من کا ہے سارا بکھیڑا
چار دنا کا جھوٹا جھگڑا
پار یہ اُس دن ہوگا بیڑا
نکلے تن سے پران ۔ داتا دیدے پربھو کی دان

۱۲۔ بھائی بندو کٹم قبیلہ
ڈھونڈے ویراگی کس کا وسیلہ
سُکھ کا ساتھی جگ کا جھمیلہ
دُکھ میں سب انجان۔ داتا دیدے پربھو کی دان

حُسن ایک ظالم بادشاہ ہے جس کے ظلم سے صرف وہی بچتے ہیں جن پر وہ مہربان ہے۔
حُسن ایک دست بستہ اور خاموش مکار ہے۔
حُسن کا سرچشمہ دل ہے۔
حُسن کے ساتھ اگر عصمت ہو تو وہ جنت قلبی ہے اور اگر برائیاں ہوں تو وہ رُوح کے لئے برزخ ہے۔
حُسن بہترین وہی ہے جس کی تصویر نہ اُتاری جاسکے۔
حُسن کا جب ہم نظارہ کرتے ہیں تو وہ ہمارا خود ایک جزو بن جاتا ہے۔

غلام دستگیر رشید
استاذِ فارسی

ایک ہمہ گیر اور ہر دلعزیز پرنسپل

(جناب سید علی اکبر صاحب)

گذشتہ شمارہ میں ہمارے وائس پرنسپل صاحب کو خدا حافظ کہنا پڑا اور اب کی بار تبادلہ و ترقی نے نظام کالج سے ایک ہمہ گیر اور ہر دلعزیز پرنسپل کو جُدا کر دیا۔ میں ان کی بابت اپنے تاثرات ظاہر کرتا ہوں کیوں کہ محاسن کا حق ہے کہ ان کی تعریف کی جائے جھوٹی تعریف کرنی اور سچی تعریف سے رُکنا دونوں انسان کے لئے زہرِ قاتل ہیں۔

خدا بخشے قادر حسین خاں مرحوم، انگریز پرنسپل صاحبان کے ایک بارعب اور نیکنام طویل سلسلہ کے بعد نظام کالج کے پہلے ہندوستانی پرنسپل ہوئے۔ اکبر مرحوم کو ہمیشہ یہ ڈر رہتا تھا کہ ؎

سامانِ طرب یہاں وہاں سے لائیں — انگریز کا رعب ہم کہاں سے لائیں

لیکن قادر حسین خاں مرحوم کی شخصیت میں انگریزوں کے سے رعب و داب کی کچھ کمی نہ تھی۔ اِن سے کالج میں ذرا جگر تھام کر ہی لوگ بات کرتے تھے پھر خوش قسمتی یہ کہ نیکنامی بھی ان کا اقبال بنی رہی۔

ایسے نامور پرنسپل کے خلافِ توقع انتقال کے بعد بڑی چہ میگوئیاں رہیں کہ ع

کِس کے گھر جائے گا سیلاب بَلا میرے بعد

خوش قسمتی سے سید علی اکبر صاحب جیسے دیرینہ ماہر تعلیم اس جلیل القدر عہدہ پر فائز ہوئے۔ نظریں چنداں منتظر رہیں کہ کیا رنگ جمتا ہے۔ آہستہ آہستہ سہمے ہوئے دل کھلنے لگے۔

تعلیمی قیادت علی اکبر صاحب نے برسوں عہدہ دار رہنے کے باوجود بڑی دقتِ نظر اور نکتہ شناسی سے کام لیا کہ اس معروف بلند پایہ تعلیمی ادارہ میں دفتری عہدہ داری کا رنگ قائم نہ رکھا اور عہدہ داری کی کوئی بدبو آنے نہ پائی۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم کو قومی تعمیر کا اہم ذریعہ جان کر اس کے اعلیٰ مقاصد کو آگے بڑھانے میں ایک خیر اندیش قائد کی طرح کام کرنے لگے۔

مشاورت و معاونت اِن کے کام کا رنگ ایسا تھا جیسے ایک قائد اپنے رفقاءِ کار سے قدم قدم پر مشورہ لیتا ہو اور سب کے دلوں میں یہ احساس پیدا کرتا ہو کہ ان میں سے ہر ایک اس ادارہ کی بھلائی اور ترقی کا کسی نہ کسی حد تک ذمہ دار اور حصہ دار ہے۔ ان کے برتاؤ میں انتہائی

جناب سید علی اکبر صاحب
سابق صدر نظام کالج
سنہ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۴۵ء

فرق مراتب کے بعد ایک مساوات، باہمی معاونت اور مشاورت کا جذبہ محسوس ہوتا تھا۔ انھوں نے کالج کے انتظام میں نظام شوریٰ کے پہلو کو قوی کر رکھا تھا۔ ایک باقاعدہ مشورت کی مجلس بھی قائم کی جو ہنوز برسرکار ہے۔ کالج کا کام ایک ٹیم اسپرٹ کے تحت تھا

گرم جوشی و سخت کوشی | ان کے کردار کی دوسری نمایاں خصوصیت گرم جوشی اور سخت کوشی ہے ان کی عمر کے آدمی میں جنوبی ہند کے گرم موسم میں یہ گرمجوشی اور سخت کوشی دلِ زندہ کی علامت ہے خسروؔ کی شوخ زبان میں ہم بھی دعا دیں گے ع

که ایں آوارۂ کوئے بتاں آوارہ تر بادا

عام مسائل پر نظر | بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہیں اپنے فرائض منصبی کے سوا شاید اور مسائل سے کوئی لگاؤ نہیں لیکن جب کسی محفل میں یا مباحثہ میں زبان کھلی تو اچنبھا سا ہوتا کہ انہیں کئی مسائل ملک سے دلچسپی اور خاص واقفیت ہے اور ان کی بابت اپنی خاص رائے بھی رکھتے ہیں۔ ان کو میں نے علمی صحبتوں کا ہمیشہ متمنی پایا۔ انھوں نے نظام کالج میں مطالعہ کے حلقوں کا نظام جاری کیا یہ اسٹڈی سرکل طلباء کے لئے خاص طور پر مفید ہیں اور ان سے علمی فضا کے قیام میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ادارہ کی دلی خیر خواہی | اپنے ادارہ کے ساتھ دلی خیر خواہی اور ہمدردی ایک کامیاب و ذمہ دار عہدہ دار کے لئے شرط مقدم ہے۔ علی اکبر صاحب میں یہ صفت برابر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ انہیں اس کے علم کے باوجود کہ وہ نظام کالج چھوڑ دیں گے۔ نظام کالج کے مفاد سے برابر دلچسپی رہی۔ جب کبھی موقع آیا، نظام کالج کے بلند موقف، اس کے پرنسپل کی تنخواہ، اس کے اسٹاف کی ترقی کی وکالت جاری رکھی۔ یہ سب اس کے مستقبل کے سلسلہ میں تھا جس میں ان کا شخصی مفاد نہ تھا۔ یہ ہے ادارہ کے ساتھ ان کے دلی اخلاص و خیر اندیشی کا ثبوت

ہمہ گیری و ہر دلعزیزی | ان کی کامیابی کا ایک میدان ان کی ہمہ گیری ہے۔ کھیل کے میدان میں دیکھئے وہ ایک کھلاڑی کی طرح موقع بموقع حصہ لے رہے ہیں۔ وہ خود کھلاڑی ہیں۔ ٹینس بھی ان کا خاص شغل ہے۔ رُوحِ عمل بھی میدان جیتنے والوں کی سی ہے۔ دوڑ میں کئی جوان سال اصحاب کو شکست دیتے ہیں۔

گرمی تیز ہو گئی، تیراکی کا موسم آگیا۔ "حمایت سوئمنگ باتھ" میں صبح سویرے پرائمری کے چھوٹے بچے، عالیہ کے نوجوان، کالج کے کھلنڈرے شہر کے بے فکرے جمع ہیں۔ علی اکبر صاحب کو دیکھئے

کو فرصت ملی اور وہ بھی یہاں پہونچ کر ہاتھ پیر مارنے لگے۔

مجھے بھی تیرنے کا بلند شوق ہمت کی پستی کے ساتھ ساتھ ہے، میں بھی ہنوز اس مکتب میں رفت گیا اور بود تھا کا سبق لیتا ہوں۔ لڑکے علی اکبر صاحب کو دیکھ کر اور جوش میں آجاتے۔ رفاقت کی خنکی محسوس ہوتی۔

لڑکوں کے ساتھ ان کے کھیل کود میں شرکت نے علی اکبر صاحب کو نہایت ہر دلعزیز بنا رکھا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ ان کا خلا ملا لیکن رعب میں کمی نہیں وہ ایک باہمہ اور بے ہمہ پرنسپل تھے۔ ان کی ہمہ گیری سے میری مراد یہ بھی ہے کہ آپ اگر علی اکبر صاحب کو کتاب خانہ کے متعلق ہدایات دیتے دیکھیں تو یہ خیال کریں کہ انہیں کتاب خانہ کے مسئلے سے سب سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اسپورٹس کا معاملہ ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے "ان کی دلچسپی کا خاص میدان اسپورٹس ہی ہیں تعلیمی مسائل میں ان کے انہماک سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید انہیں دوسرے مسائل سے اس قدر دلچسپی نہ ہو۔

انسان خطا و نسیان سے کب خالی ہے لیکن اس قدر خوبیاں اگر ایک پرنسپل میں جمع ہوں تو یقیناً اس کا راستہ کامیابی اور کامرانی کا راستہ ہے۔ ان کی جدائی پر طلباء اور اساتذہ کی طرف سے جو وداعی سپاسنامے پیش کئے گئے۔ اور تقریری مجالس منعقد ہوئیں۔ میں نے ان میں ظاہرداری کی بجائے اخلاص اور طلباء کے دلی جذبات کو کارفرما دیکھا خدا کرے ان کی آیندہ زندگی، ان کی اپنی ذات اور ان سے متعلق ادارہ جات کی ترقی درجات کا ذریعہ بنے رہے۔

شباب ذرہ بھر کو اسی لاپروائی سے استعمال کرتا ہے جس طرح بڑھاپا جیفہ اور جیہ کو۔

شباب کی بہار میں اگر پھول نہ ہوں تو اس کی خزاں میں پھل کی تلاش بیکار ہے۔

شباب کے ساتھ عموماً دلیری ہوتی ہے جس طرح بڑھاپے کے ساتھ دانشمندی۔

شباب کی بھول چوک ادھیڑ عمر کی غلطی اور بڑھاپے کا گناہ ہے۔

غلام دستگیر رشید
اُستاذ فارسی

دُعائے اقبال

(زبورِ عجم کی مشہور فارسی دعا اردو پیرایہ میں خفیف تغیر کیساتھ)

یارب ترے گدا کو دِل باخبر ملے
نشہ کو مئے میں دیکھ سکے وہ نظر ملے

بندہ کی زندگی نہیں غیروں کی سانس پر
اِک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر ملے

نکلا ہوں طائرانِ حرم کے شکار کو
تیرِ نگہ سا تیر کوئی کارگر ملے

کرنا ہے گر حریفِ یمِ بیکراں مجھے
پھر اضطرابِ موج و سکونِ گہر ملے

روشن ہو نورِ نغمۂ داؤد سے یہ خاک
ہر ذرّہ کو مرے پر و بالِ شرر ملے

سید مظہر حسین
سابق طالب علم

دیہی قرضہ[1]

ایک شاعر نے کسان کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے -

آہ وہ انسان جن کے تن پہ اک چیتھڑا نہیں
جن کی نظریں غیر کی پوشاک سے ہیں شرمگیں
آہ وہ انسان جن پر زندگی بھی بار ہے
آہ وہ انسان جن سے موت بھی بیزار ہے
حال و ماضی سے نگاہیں جن کی تھرائی ہوئی
جن کے مستقبل پہ ہیں مایوسیاں چھائی ہوئی

کھیتی باڑی کرنے والے کی اسی گئی گذری حالت کو معاشیات جاننے والے "غیر معاشی" کہکر پکارتے ہیں اور ٹھیک بھی کچھ یہی ہے کہ ایک اوسط کاشتکار کی آمدنی سے کہیں بڑھ چڑھ کر اس کا خرچ ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں کے کسان مشکل ہی کے ساتھ اپنا ہر پائی کے باہر رکھ سکتے ہیں۔ وہ کھیتی باڑی اس واسطے نہیں کرتے کہ اس سے روپیہ - آنہ - پائی - کی صورت میں کچھ زیادہ مل جاتا ہے بلکہ اس لئے کہ انہیں کرنے کے لئے کچھ اور کام بھی تو نہیں۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ زراعت اور غربت کا کچھ چولی دامن کا ساتھ ہے حقیقت یوں نہیں بلکہ اور ملکوں کے کاشتکاروں کو جائز اور واجبی آمدنی مل رہی ہے۔ ان کا رہن سہن کافی اونچا ہے اور ہمارے کسانوں کی طرح نردھن ہونا تو رہا ایک طرف وہ دوسرے پیشہ والوں سے بھی آگے نکلے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ میں کھیتی کرنے والوں کو ہندوستانی کسانوں سے (۷) گنا آمدنی ہوتی اور روس والوں کا رہن سہن (۶) چند زیادہ ہے - ان مثالوں سے یہ بات صاف طور پر کھل جاتی ہے کہ ہمارے پیارے دیس کے ایک اوسط کسان کو اس قدر کم آمدنی ہوتی ہے کہ وہ مشکل ہی سے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال سکے۔ کسان کی اس غربت اور مفلسی کی سینکڑوں۔ ہزاروں وجہیں ہیں اور ان ہی میں سے ایک قرضداری بھی ہے جو اس

---

[1] [illegible] لایق پروفیسر ایس۔ کے۔ آئنگار کے لکچروں سے بڑی مدد ملی ہے۔

بھوے سے اُس سرے تک سارے ملک پر پھیلی ہوئی ہے بعضوں کے خیال میں قرضداری غربت کی وجہ ہے اور بعض اسے غربت کا نتیجہ کہتے ہیں ٹھیک دونوں ہی۔ اگر غربت قرضداری کی وجہ ہے تو قرضداری غربت کا سبب۔

ہماری زبان کی بڑی پرانی مثل ہے کہ "قرض بُرا مرض" اور یہ بیماری ہمارے کاشتکاروں میں بُری طرح پھیلی ہوئی ہے۔ مہاجن جن کی طرح ان کے کندھوں پر سوار رہتا ہے۔ مسٹر ولف نے بالکل ہی سچ کہا ہے کہ "سارا دیس مہاجن کے پنجوں میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے اور قرض (کی زنجیریں) ہماری زرعی ترقی کے راستہ میں بڑا روڑا رکاوٹ ہے"۔

"The country is in the grip of the mahagin.

It is the bonds of debt that shakle agriculture."

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کچھ گنے چنے کاشتکاروں کو چھوڑ کر ہمارے تقریباً سب ہی کھیتی باڑی کرنے والے اپنی آیندہ ضرورتوں کے لئے پس انداز نہیں کرتے۔ کسان کچھ بچا بٹور کر نہیں رکھتا چونکہ "وہ قرض میں پیدا ہوتا ہے اور قرض ہی میں پلتا بڑھتا اور مرتا ہے"۔

"He is born in debt lives in debt and dies in debt."

کسان کی اس حالت پر یار لوگ صلواتوں اور اعتراضوں کی خوب بوچھار کرتے ہیں ان کے خیال میں تمام برائیوں اور ساری خرابیوں کا ذمہ دار خود کاشتکار ہی ہے وہ بڑا ہی فضول خرچ اور کام چور ہے۔ لڑائی جھگڑے پر اور پینے پلانے میں اپنی زیادہ تر آمدنی وارے نیارے کرتا ہے۔ وہ مقروض ہے اور بُری طرح مقروض تو اس میں کسی اور کا دوش نہیں بلکہ خود اسی کا پاپ ہے۔ یہ باتیں بالکل جذباتی اور جی کی بھڑاس ہیں ہم ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں تو یہ بات صاف طور پر کھل جاتی ہے کہ ہمارے کاشتکار آڑے وقتوں کے لئے کچھ بچا بچو کر نہیں رکھتے چونکہ وہ رکھ ہی نہیں سکتے۔

رابرٹ سن نے بڑا ہی سچ کہا ہے کہ "بچانے سے بچنا ممکن نہیں"۔

"Saving is the one thing from which the man cannot be saved."

انسان ایک سمجھ بوجھ رکھنے والا جانور ہے۔ وہ فطری طور پر اپنی آیندہ ضرورتوں اور احتیاجوں کو اچھی طرح جانتا ہے۔ انہیں آڑے وقتوں کے لئے وہ کچھ نہ کچھ بچا چھپا کر رکھ لیتا ہے۔ یہ کہنا بالکل ٹھیک ہے کہ "بچانا ہی ایسی چیز ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا" ہمارا کسان بھی انسان ہی ہوتا ہے اور ایسا انسان جسے اپنی بھلائی ترقی کی فکر بھی ہوتی ہے اور آیندہ ضرورتوں کا احساس بھی۔ ظاہر ہے کہ

اسے بھی پیس انداز کرنے کی سدھ بدھ ہوتی ہے لیکن ان کی مالی حالت کچھ ایسی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی اس فطری خواہش کو پورا کر سکے۔ انجیل کے لفظوں میں The spirit wants. But the flesh is weak کسانوں کو بھی ان کی پستی کا تن تنہا ذمہ دار ٹھیرانا کچھ ٹھیک نہ ہوگا کئی ایک ضرورتوں کے لئے کاشتکاروں کو ایک فصل سے دوسری فصل تک بار بار روپے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے اور فصل کٹنے کے وقت کو چھوڑ کر اس کے پاس بہت کم پیسہ ہوتا ہے۔ ان موقتی ضرورتوں کے سوائے زیادہ تر کام آنیوالی چیزوں کے لئے بھی رقم کی سخت ضرورت ہوتی ہے ان دونوں صورتوں میں اسے مانگ تانگ کر کام چلانا پڑتا ہے یہ قرضے تین طرح کے ہوتے ہیں :-

سالانہ قرض :- یہ موقتی ہوتے ہیں اور کاشتکار اپنی سالانہ ضرورتوں کے لئے حاصل کرتے ہیں۔ انہیں فصلی قرضداری کہکر پکارا جاسکتا ہے چونکہ فصل کے کٹنے پر لوٹا دئے جاتے ہیں۔ یہ قرض ہر سال کھاد - بیج - اوزار خریدنے - اُجرت چکانے اور لگان دینے کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اگر فصل خراب ہوجائے تو کسان اپنی اور اپنے گھرانے کی خانگی ضرورتیں بھی انہیں سے پورا کرتے ہیں۔ یہ قرض عام طور موقتی ہوتا ہے اور فصل کٹنے پر لوٹا دیا جاتا ہے۔ انہیں تین جگہوں سے حاصل کیا جاتا ہے :-

حکومت :- اکثر صوبہ واری حکومتیں "تقاوی" کی صورت میں چھوٹی چھوٹی رقمیں نہایت ہی کم سود پر دیتی ہیں۔ ہمارے کسانوں کی ضرورتوں اور احتیاجوں کے سامنے یہ جتنی ناکافی ہیں اتنی ہی شاذ و نادر بھی۔ حکومت کی یہ امداد مقدار اور گنتی دونوں لحاظ سے بہت کم ہے اور اب تو خیر سے انھیں تقریباً بند ہی کردیا گیا ہے چونکہ حکومت زیادہ مدت کے بڑے بڑے قرضوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اس کی جگہ لگان ملتوی کئے جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ معاف -

انجمن ہائے قرضہ امداد باہمی (Co-operative Credit Societies)

بھی موقتی قرض دیتی ہیں لیکن ان کی مقدار اور پھیلاؤ بہت کم اور حد درجہ ناکافی ہے - ان سبھاؤں کی کل پونجی ہندوستان بھر کے لئے صرف ۹.۱ کروڑ روپیہ ہے۔ دیکھنے کو تو یہ رقم بہت بڑی معلوم ہوتی ہے لیکن ہندوستان جیسے زرعی ملک کے کسانوں کی سینکڑوں ہزاروں ضرورتوں کے لئے بالکل ہی ناکافی ہے۔ کاشتکاروں کی سالانہ ضرورتوں کے لئے حکومت اور ان سبھاؤں سے جو قرض مل رہا ہے وہ ۲ یا ۳ فیصد سے کچھ اونچا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مجبور ہوکر کسانوں کو مہاجنوں ہی کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا ہے چھان بین سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سو میں ۹۶ بلکہ ۹۷ قرض انہیں سے لیا جاتا ہے۔ مہاجنوں ساہوکاروں اور دوسرے لین دین کرنے والوں کے ہتھکنڈوں سے تو ہم واقف ہی ہیں بلکہ حقیقت اس

سے بھی کہیں گئی گذری ہے۔

اوسط مدت قرض: - یہ عام طور پر چھ سے دس برس تک کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں اور ان قرضوں کو دس سال کے اندر اندر بیباق کر دیا جاتا ہے۔ کنٹھ باندھنے یا ڈولیاں کھدوانے اور جانور خریدنے کے لئے ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تینوں چیزوں کے لئے جو لاگت آتی ہے وہ اتنی کم نہیں ہوتی کہ اسے ایک دو برس میں لوٹا دیا جائے پس کھیتی باڑی کرنے والے اس ڈھنگ کے قرضوں کو سات سے دس تک کی سالانہ قسطوں میں اُدھیڑتے ہیں۔ اوسط مدت کے قرضوں کے لئے کسانوں کو انہیں تین جگہوں سے اپنا لین دین رکھنا ہوتا ہے۔ حکومت اس سلسلے میں کچھ سرگرم نظر آتی ہے پھر بھی یہ کسانوں کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے سامنے بالکل ہی ناکافی ہے حکومت کی امداد ایک فیصد اور "ایسی امداد کی سبھائیں" زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد ہاتھ بٹا رہی ہیں۔ باقی ۹۴ فی صد کے لئے کسانوں کو انہیں ظالم جابر مہاجنوں سے لین دین رکھنا پڑتا ہے۔

زیادہ مدتی قرض: - پروفیسر انٹگار کے لفظوں میں "یہ اتنا ہی بڑا ہے جتنا ہمالیہ اور شائد ہمالیہ ہی کی طرح پرانا بھی" اس طرح کا قرض ہندوستان بھر کے لئے ۱۰۰۰ کروڑ سے بھی کچھ اونچا ہے ظاہر ہے کہ یہ ملک کے کاشتکاروں کے کندھوں پر ایک بھاری بھرکم بوجھ کا کام کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے ہماری زرعی ترقی کے راستوں میں کئی ایک دشواریاں یا پیچیدگیاں اور رکاوٹیں پیدا ہو چلی ہیں۔ یہ قرض زمین کی زرخیزی بڑھانے۔ یا زمین خریدنے۔ باغات لگانے اور زمین کے اونچان کو کم کر کے خشکی کو تری میں بدلنے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر باپ دادا کا قرض ہے جو موروثی جائداد کے ساتھ ساتھ بیچارے کسان کے حصہ میں آتا ہے۔ کچھ تو اصل قرض اور سود کی زیادتی کے سبب اور اس سے بھی بڑھ کر حساب کتاب کی پیچیدگیوں کے کارن زیادہ مدتی قرضوں کو بیباق کرنے کے لئے عمریں لگ جاتی ہیں پھر بھی یہ قرض جوں کا توں رہتا ہے۔ مصر کے کسان بھی زیادہ مدتی قرض کے ہاتھوں بڑے دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں مگر وہاں یہ قرضہ پچیس برس میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے دیس کی حالت اس سے بھی کہیں گئی گذری ہے چنانچہ پنجاب کے بہتیرے کسان زیادہ مدتی قرضہ کو چھ پیڑیوں سے ادا کرتے چلے آ رہے ہیں پھر بھی یہ قرضہ جوں کا توں ہے۔

اس سلسلہ میں حکومت زمین کی زرخیزی بڑھا کر تھوڑی بہت امداد کر رہی ہے۔ لیکن یہ نہایت ہی ناکافی اور کہیں کہیں ہے۔ ایسی حالت میں سارا کام بنک رہن اراضی LAND MORTGAGE BANKS ہی پر چھوڑ جاتا ہے۔ ان بنکوں نے خاص کر مدراس میں تھوڑا بہت کام کیا ہے چنانچہ اس صوبہ کے

اکیس کروڑ کے قرض میں سے چار کروڑ کے لگ بھگ انہیں بنکوں نے اپنے سر لیا ہے۔ پھر بھی یہ امداد اپنے بھی کچھ کم ہے اور اس طرح سے خود مدد اس میں یہ کام ایسا ہمت افزا اور کافی نہیں۔ دوسرے صوبوں کی حالت تو اس سے بھی گئی گزری ہے اور بعض صوبوں اور اکثر ریاستوں میں تو یہ بنک اب تک سرے سے قائم ہی نہیں ہوئے زیادہ مدتی قرضوں میں تو مہاجنوں کا اور بھی بول بالا ہے کسانوں کا سو میں ۹۹ بلکہ ۹۷ لین دین ساہوکاروں سے رہتا ہے اور یہ مجبور کاشتکاروں کی بے بسی بیکسی سے فائدہ اٹھا کر انہیں طرح طرح سے تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچاتے ہیں۔

زرعی قرضوں کی شدت اور اہمیت کو جاننے کے لئے قرض کی کل گنتی اور اس کے پھیلاؤ کو جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ قوموں اور ملکوں کی عام ترقی کے لئے اور خاص کر دیہات سدھار اور زرعی ترقی کے واسطے یہ اندازہ لگانا نہایت ہی ضروری ہے کہ کل قرض کتنا ہے اور اس کا بوجھ کس پر پڑتا ہے اور اس کے گھٹنے بڑھنے کا کیا رنگ ڈھنگ ہے۔ چنانچہ آسٹریلیا کو قومی سدھار کی سوجھی تو زرعی قرضداری کی جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیشن بٹھایا اور اسے خاص طور پر اس بات کی ہدایت کی کہ وہ ٹھیک طور پر دیہی قرضہ کے بار کا پتہ چلائے۔

اٹھارہویں بلکہ انیسویں صدی کے بیچ تک بھی اس سلسلہ میں معشوقانہ انداز برتے گئے۔ ۱۸۵۰ء کے بعد سے کچھ کام شروع ہوا۔ مختلف کمیشنوں نے بعض دیہاتوں میں چھان بین کی اور ملک کے کل قرضہ کا اندازہ لگایا۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ زرعی قرضداری کا پتہ چلانے کے لئے بھی معاشی چھان بین کے دونوں اصول Inductive اور Deductive کام میں لائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی جانچ پڑتال کو ایک وسیع رقبہ پر پھیلا کر حالات اور واقعات کا حال معلوم کرتے ہیں اور انہی بنیادوں پر عام تاثرات اور نتیجے روشنی میں لاتے ہیں کچھ ماہر ایسے بھی ہیں جو اپنی چھان بین کو ایک مختصر سے رقبہ تک ہی محدود رکھکر ساری ضروری اور تفصیلی معلومات اکٹھا کر لیتے ہیں زرعی قرضداری کا پتہ چلانے کے لئے یہ دونوں طریقے اپنی اپنی جگہوں پر ضروری بھی ہیں اور مفید بھی۔ لیکن سائنٹیفک (Scientific) اور ٹھیک ٹھیک نتیجوں پر پہنچنے کے لئے دونوں طریقے کام میں لائے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ لمبے چوڑے رقبہ کے متعلق ساری معلومات حاصل کرنی بڑا مشکل کام ہے اس لئے ہوتا یہ ہے کہ پہلے پہل چھوٹے چھوٹے رقبوں کی قرضداری کا پورا حال معلوم کر لیتے ہیں اور پھر بڑے رقبوں کے بارے میں جو سرسری اور عام معلومات ہوتی ہیں ان کی مدد سے ملک کی قرضداری کا پتہ چلتا ہے۔

دکن ریٹ کمیشن نے سنہ ۱۸۷۵ء میں احمد نگر کے بارہ گاؤں کی چھان بین کی اور پتہ چلایا
کہ ہر کاشت کار پر اوسطاً ۳۷۱ روپیہ کا قرض تھا اور اس کا اوسط کسان کی آمدنی کا ۱۰ گنا تھا اور
ایک تہائی سے بڑھ کر کاشتکار بری طرح قرضہ میں پھنسے ہوئے تھے۔ سنہ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیٹی نے
بڑی ڈھونڈ ڈھانڈ کے بعد یہ اندازہ لگایا کہ ایک تہائی زمیندار اس بری طرح قرضدار ہیں کہ ان کا
قرض چکانا غیر ممکن ہے اتنے ہی زمیندار اگرچہ کہ مقروض ہیں پھر بھی وہ اپنا قرض ادا کر سکتے ہیں۔
سنہ ۱۸۹۴ء میں تھان برن، گجرانوالہ سیالکوٹ اور شاہ پور کے بارہ گاؤں کے متعلق لکھا ہے کہ ان
گاؤں کے کسانوں کی آمدنی زیادہ ہے پھر بھی وہ بری طرح قرض کا شکار ہیں۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں سر فریڈرک
نکلسن نے مدراس کے قرضہ کی چھان بین کی اور اندازہ لگایا کہ یہ صوبہ ۵۴ کروڑ کے لگ بھگ
قرض دار ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں بہت بڑا کال پڑا۔ اس کی جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیشن بٹھایا گیا جو
اس نتیجے پر پہونچا کہ قرضداری کے سبب بمبئی کے ۱/۴ سے اوپر کسانوں کے ہاتھوں سے زمینیں
نکل چکی ہیں ۱/۵ سے بھی کم قرض کے مرض سے آزاد ہیں اور دوسرے اس بری طرح قرضداری کے
شکار ہیں کہ ان کی زمینیں ساہوکاروں کے شکنجوں سے بچانے کے لئے سرکاری مدد حد درجہ ضروری
ہے۔ سر اڈورڈ نکلسن کی چھان بین سے ظاہر ہے کہ سنہ ۱۹۱۱ء میں پورے ملک کا قرضہ ۳۰۰ کروڑ تھا۔
اور مشہور ماہر مسٹر ڈارلنگ کی جانچ پڑتال کے لحاظ سے ۶۰۰ کروڑ سے بھی اونچا تھا۔

سنہ ۱۹۳۰ء تک حکومت کی پالیسی ابابیل کے گھونسلے کی طرح اپنے فرسودہ اور پرانے ڈگر پہ
چلی آتی تھی لیکن اس سال کے ختم پر ان خیالوں نے ایک ہلکی سی کروٹ لی اور معاشی سدھار کا تھوڑا
سا خیال پیدا ہوا۔ پچھلی جانچ پڑتال سے ہمارے دیس کی قرضداری کا حال معلوم ہوا اور یہ بات
صاف طور پر کھل گئی کہ اگر اس بڑھتی ہوئی قرضداری کی فوری روک تھام نہ کی گئی تو جلد ہی پانی سر
سے گزر جائے گا۔ اسی خیال سے مرکز اور صوبوں میں بنک کھولے گئے اور انہیں خاص طور پر صوبوں
کے قرض کی چھان بین کا حکم ملا۔ اس جانچ پڑتال کا مختصر حال نیچے لکھا جاتا ہے۔

سندھ کو ملا کر بمبئی صوبہ کا کل قرض ۸۱ کروڑ روپیہ ہے اور یہ لگان کا ۱۵ گنا ہے کھیتوں
کی پیداوار سے جو قیمت ملتی ہے اس کا ۵۳ فیصد ہے اس طرح ہر گھر پہ ۳۲۹ روپیوں کا بار پڑتا
ہے۔ گنے چنے گھرانے ہی قرض سے آزاد ہیں۔ ان کی تعداد کونکان میں ۲۹ فی صد۔ دکھنی گجرات
میں ۲۳ فی صد، اتر گجرات میں ۲۱ فی صد اور سندھ میں صرف ۱۳ فی صد ہے۔ کمیٹی کی رائے میں
مدراس بھر کا قرضہ ۱۵۰ کروڑ روپیہ سے بھی کچھ زیادہ ہے اور سال بھر کی ضرورتوں کے لئے

۷۰ کروڑ روپیہ قرض لیا جاتا ہے۔ اس حساب سے یہاں کا قرض پورے صوبہ کے لگان کا ۱۹ گنا ہے۔ بنگال جیسا زرخیز صوبہ بھی قرض سے آزاد نہیں۔ یہ صوبہ ۱۰۰ کروڑ روپیہ کا قرضدار ہے اور ہر گھر پر ۱۶۰ روپیوں کا پڑتل پڑتا ہے۔

کمیٹی نے اندازہ لگایا ہے کہ صوبہ متحدہ کا کل قرض ۱۲۴ کروڑ روپیہ ہے اور پنجاب میں قرض کی گنتی ۱۹۲۱ء میں ۹۰ کروڑ تھی اور ۱۹۲۹ء میں یہ بڑھ کر ۱۳۵ کروڑ سے بھی اونچی ہو گئی۔ اس طرح ۸ سال کے اندر اندر قرض میں ۵۰ فی صد کا اضافہ ہوا۔ پنجاب میں قرض کی مقدار لگان سے ۲،۷ گنا ہے اور ہر شخص پر ۲۷ روپیہ کا پڑتل آتا ہے صوبہ متوسط کا قرض ۲۹½ کروڑ ہے اور ہر گھر کا پڑتل ۲۲۷ روپیہ ہے۔ بہار اور اڑیسہ میں قرض کی مقدار ۱۵۵ کروڑ ہے۔ اس میں سے ۱۲۹ کروڑ تو صرف عام کسانوں کا قرض ہے اور زمینداروں پر ۲۴ کروڑ کا بار ہے اور باقی ۲ کروڑ زرعی مزدوروں پر ہے۔

چھان بین کی کمیٹی نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ آسام کے میدانی علاقوں میں کسانوں کا قرض ۲۲ کروڑ روپیہ ہے۔ یہ قرض سالانہ لگان کا ۱۲ گنا ہے اور سو میں ۱۵ گھرانے ہی قرض سے آزاد ہیں اور ہر کاشت کار گھر پر ۲۴۲ روپے کا پڑتل آتا ہے۔

ان اندازوں سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ ۱۹۲۹ء میں پورے برطانوی ہند کا قرض ۹۰۰ کروڑ کے لگ بھگ تھا۔ اس کے بعد سے زرعی قرض ہر سال کچھ نہ کچھ بڑھتا ہی رہا اور خیر سے اب یہ ۱،۲۰۰ کروڑ روپیوں سے بھی اونچا ہو چلا ہے۔ مزدور کانفرنس کی چھان بین سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پورے ملک کا قرضہ کم سے کم ۱۳،۰۰۰ کروڑ ہے۔ کساد بازاری کے زمانہ میں تو کسانوں کے قرض میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ دنیا کی عام منڈیوں میں ہماری پیداوار کی قیمت آدھی ہو گئی۔ خوش حالی کے زمانہ میں کسان اچھے رہن سہن کے عادی ہو چلے تھے۔ اس لئے اخراجات کا کم کرنا ناممکن تھا اس لئے انہوں نے قرض سے اس گھاٹے کو پورا کیا۔

کساد بازاری کی وجہ سے زرعی قرضداری اس قدر بڑھ گئی کہ کسانوں کے لئے سود دینا بھی مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹر مکرجی کے خیال میں زرعی قرض ۱۹۲۵ء میں ۱،۲۰۰ کروڑ روپیہ تھا اور ۱۹۳۸ء میں مسٹر منین کے اندازہ کے موافق ۱،۸۰۰ کروڑ تک پہنچ گیا اوپر کی ساری باتیں صرف اندازے ہیں ان میں سے کسی کو بھی بالکل ٹھیک نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن سب کی جانچ پڑتال سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ زرعی قرضہ ہر سال بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے ۱۹۲۹ء سے کساد بازاری پھیل گئی اس زمانہ میں رقمی اور حسابی قرضہ سے کہیں بڑھ چڑھ کر بار اصلی قرضہ کا ہو گیا۔ اس جنگ میں اور چیزوں کے ساتھ ساتھ زرعی پیداوار

کی قیمتیں بھی بڑھ چلیں۔ لیکن اس سے کسان کے قرضوں میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی کچھ تو اس لئے کہ قیمتوں کے ساتھ اخراجات اور لاگت میں اضافہ ہو چلا اور اس سے بھی بڑھ چڑھ کر اس واسطے کہ قیمتوں کی زیادتی سے بیچ والوں نے زیادہ فائدہ کمایا۔

ہمارے زرعی قرضوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ چند گنی چنی مثالوں کو چھوڑ کر یہ اکثر غیر پیداوار اور غیر منافع بخش ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے لفظوں میں "قرض عزت کی قینچی کے ساتھ ساتھ دولت کی کنجی بھی بن سکتا ہے" لیکن ہمارے ہاں قرض کھیت سدھار کے لئے بہت کم حاصل کئے جاتے ہیں۔ جو رقم قرض لے کر کھیتی باڑی میں لگائی جاتی ہے اس کا نفع سود کے سامنے کسی شمار قطار میں نہیں آتا ــــــ

کسانوں کی لاعلمی۔ جہالت اور دقیانوسی پن کی وجہ سے قرضہ کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ممکن نہیں پھر بھی یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ملک بھر کا قرض ۵۰۰، ۱ کروڑ سے ہرگز کم نہیں۔ سالانہ سود کم سے کم ۲۰ فیصد ہے اس طرح ہمارے کسانوں کو ۲۵۰ کروڑ کے لگ بھگ صرف سود کا ہی بار اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ تو رہیں صرف حساب و کتاب کی باتیں ان کے علاوہ مہاجن غریب کسانوں سے روپیہ پیسہ کی صورت میں یا مال اور غلہ کی شکل میں بہترا اینٹھ لیتے ہیں جو کسی شمار و قطار میں نہیں آتا۔ ان کا مختصر سا حال بھی ہم نیچے لکھے دیتے ہیں :۔

قرض دیتے وقت ساہوکار ایک سال کی قسط پہلے ہی لے لیتے ہیں، اور اس کی نہ کوئی رسید دی جاتی ہے اور نہ یہ کسی گنتی میں آتی ہے۔ حساب کتاب میں بڑا ہیر پھیر کیا جاتا ہے۔ اگر قرضدار اَن پڑھ ہوا تو رقم اور بھی بڑھا کر لکھ لی جاتی ہے۔ مہاجن ایک سادہ کاغذ پر کاشتکار کے دستخط لے لیتا ہے اور پھر اپنی مرضی کے موافق رقم لکھ ڈالتا ہے رسیدیں تو کبھی کبھار ہی دی جاتی ہیں اس قرضے کا حساب من گھڑت۔ جھوٹ موٹ اور بالکل ہی ایک طرفہ ہوتا ہے۔ اکثر گاؤں میں لین دین سے پہلے ہی گرہ کھلائی کے نام سے مہاجن کو کچھ نذر بھی دینی پڑتی ہے۔ ان باتوں کے علاوہ زرعی قرضے عام طور سے اس شرط پر دئے جاتے ہیں کہ قرض کے اُدھیڑنے میں ذرا بھی تاخیر نہ ہو اگر قرض یا سود کے دینے میں ذرا بھی دیر ہو جائے تو زمین اور جائداد کسانوں کے ہاتھوں سے نکل کر لین دین کرنے والوں کے پھندوں میں چلی جاتی ہیں ــ ادھر مہاجنوں کے یہ اور اسی طرح کے سینکڑوں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں ہتھکنڈے ہوتے ہیں اور ادھر کسان کی مجبوری اور خاموشی شاعر کے لفظوں میں ؎

نہ تڑپنے کی اجازت نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں قرضہ کا بار رقمی اور حسابی قرضہ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہو جاتا ہے۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے مسٹر ولف کے خیال میں "قرض ہماری زرعی ترقی کے راستہ کی سب میں بڑی رکاوٹ ہے" قرض کی اسی شدت اور پھیلاؤ کے کارن خیالوں اور رائیوں میں زمین آسمان کا فرق رکھنے والے بھی اس ایک نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جب تک کسان قرض سے آزاد نہ ہو جائیں کھیتی باڑی میں ہرگز کوئی ترقی اور سدھار ممکن نہیں۔ زرعی قرض کی بعض ایسی خصوصیات بھی ہیں جو اور ملکوں اور دوسرے شعبوں میں ملنی ممکن نہیں۔ ان کا بھی تھوڑا سا حال سن لیجئے ــــ

اس سرے سے اس سرے تک سارا ملک بری طرح قرضہ کا شکار ہے۔ کوئی ایسی جگہ نہیں۔ جہاں کے کسان اس بلا سے آزاد ہوں۔ ہماری کاشت کی پستی اور سود کی زیادتی کے باعث یہ دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے زرعی کمیشن کی رائے میں اصلی اور اولین قرضدار کا پتہ چلانا ایسا ہی ناممکن ہے جس طرح یہ معلوم کرنا کہ دنیا میں پہلے پہل کس نے گناہ کیا قرضداری کی وجہ سے کسانوں کو اس لئے بھی بڑا گھاٹا ہوتا ہے کہ اس ملک کے قرض دینے والے بیوپار بھی کرتے ہیں۔ اس قرضداری سے ایک خرابی اور بھی پیدا ہو رہی ہے وہ یہ کہ کھیت کسانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مہاجنوں ساہوکاروں اور ایسے لوگوں کے قبضہ میں چل دیتے ہیں جو خود کاشت نہیں کرتے۔ قرضداری ایسی ہی جگہوں میں زیادہ عام ہے جہاں کے کسانوں کو مالکانہ حق حاصل نہیں ہے اور وہ اپنی زمینوں کو آسانی کیساتھ مکفول کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مدراس کے قرض کا پڑتل ۴۶ روپیہ ہے اور بنگال کے قرض کا ۳۲ روپیہ۔ پنجاب میں زمین پر مالکوں سا اختیار نہ رکھنے والے کسان ۱۰۵ روپیہ کے لگ بھگ قرضدار ہیں اور مالکانہ حق رکھنے والوں کے قرض کا پڑتل ۶۰۰ روپیہ سے بھی اونچا ہے۔ خاص کر مرہٹواڑی اور پنجاب کے مہاجن جبر کر کے کسانوں کو قرضہ دیتے ہیں۔ پہلے پہل وہ کاشتکاروں کی دوستی کا دم بھرتے ہیں لیکن جب اصل اور سود کسان کی جائداد کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے تو مجبور کسانوں کی زمینیں ان کے ہاتھوں میں آجاتی ہیں۔ مگر پھر بھی ان کسانوں کو اس شرط پر کاشت کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ پیداوار کا آدھا حصہ انہیں دیں۔ پانچ سات برس بعد پرانے کسان نکال باہر کئے جاتے ہیں اور ان کی جگہ کسی اور کو زمین قول پر دی جاتی ہیں مسٹر ڈارلنگ نے سچ کہا ہے کہ "مہاجن ایک ایسا جن ہے جو دوست بن کر خوشحالی میں کسانوں کا ساتھ دیتا ہے اور آہستہ آہستہ ان کا خون چوس لیتا ہے اور جب وہ نردھن ہو جاتے ہیں ان کو اپنا غلام بنا لیتا ہے"۔ اس طرح کی تبدیلیاں ملک بھر میں عام ہیں ان کی وجہ سے کئی ایک خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں چونکہ مہاجن خود ہی کھیتی باڑی نہیں کرتے

بلکہ دوسروں کو قول پر دیتے ہیں۔ اس سے زمین کی زرخیزی پر برا اثر پڑتا ہے۔ معاشی خرابی کے علاوہ سماجی برائیاں بھی پھیل جاتی ہیں جس کی وجہ سے صنعتی نظام اور کارخانے مشہور بھی ہیں اور بدنام بھی۔ جس طرح مزدور اور کارخانہ والوں میں ہمیشہ رسہ کشی رہتی ہے یہی حال اس طرح کی کاشت کا بھی ہوتا ہے مہاتما جی کے خیال میں سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لئے گھریلو صنعتیں جتنی ضروری ہیں اتنی ہی اہم ذاتی کاشت بھی ہے۔ زمینوں پر کسانوں کی جگہ مہاجنوں کے قبضہ کی روک تھام کے لئے حکومت نے سنہ ۱۹۰۰ء میں LANDALIENATION ACT کے نام سے ایک قانون جاری کیا۔ مگر کچھ تو سرکاری عہدہ داروں کی بے پروائی اور بے توجہی کی وجہ سے اور اس سے بڑھ کر مہاجنوں کی نت نئی چالبازیوں کے کارن اب تک زمین کسانوں کے قابو سے نکل کر ساہوکاروں کے قبضہ میں چلی جا رہی ہیں۔

مہاجن اپنے قرضدار کسانوں سے پہلے ہی وعدہ لے لیتے ہیں کہ وہ پیداوار انہیں کی دوکان پر بھیجیں گے۔ اس اجارہ داری کی وجہ سے مہاجن اپنے مقروض کسانوں کے مال کو بازاری قیمتوں کی جگہ اونے پونے خرید لیتے ہیں اس طرح سے حقیقی سود حسابی سود سے کہیں بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسان مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی ضرورت کی چیزیں انہیں کی دوکان سے بازاری اور عام قیمتوں سے زیادہ میں خریدیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لین دین میں کسانوں کو خرید اور فروخت دونوں میں گھاٹا ہوتا ہے اور تو اور اس ظالم قرضداری کی وجہ سے کسان زمین کو اور پیداوار کو سرے سے اپنا مال ہی نہیں سمجھتے۔ چونکہ اکثر دفعہ پیداوار کھیتوں سے کٹ کر سیدھے مہاجن کی دکان پر چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے کھیتی باڑی میں انہیں نہ کچھ زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور نہ وہ تن دہی دکھاتے ہیں جو ذاتی سرمایہ کی سب میں بڑی اور شاید ایک ہی خوبی ہے۔

ہندوستان کی معاشی ترقی ہرگز ممکن نہیں جب تک کہ زرعی قرضداری کی اس عام وبا کو نہ کچل دیا جائے۔ پروفیسر اینگار کے لفظوں میں "دیہی قرض ہماری زرعی ترقی کے لئے سب میں بڑی رکاوٹ ہے اور اس کی وجہ سے سینکڑوں ہزاروں سماجی اور معاشی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں"۔ حکومت نے مختلف طریقوں سے زرعی قرض کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تدبیریں بڑی حد تک ناکام ثابت ہوئیں۔ سرکاری امداد اور قانون سے قرض کم ہوتا رہا تو ایک طرف شاعر کے لفظوں میں

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ~

پچھلے چالیس سال میں حکومت نے کسانوں کے سدھار اور قرضداری کی روک تھام کے لئے چالیس قانون بنائے۔ ان کا تفصیلی حال ہم کسی اور وقت بیان کریں گے یہاں بس اتنا کہہ دینا کافی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب قانون صرف زرعی کھیتی

کی سُوک تمام کے لئے تھے۔ سرکار نے کھیتوں اور پیداوار کی عام ترقی کے لئے کچھ امداد نہیں کی جو
کسانوں کے رہن سہن کو اونچا کرنے اور ان کا قرض گھٹانے کے لئے بیحد ضروری ہے۔ بہاونگر
کے تجربے نے یہ صاف طور پر اجاگر کر دیا کہ ہماری کاشت کی ترقی اور زراعت کو "غیر معاشی" سے
"معاشی" بنانے کے لئے اصل اور سود کو کم کر دینا ہی کافی نہیں بلکہ اچھے بازاروں۔ ضروری
سڑکوں۔ گوداموں۔ اچھے اور بیماری سے پاک بیجوں اور اسی ڈھنگ کی سینکڑوں ہزاروں
چیزوں کی ضرورت ہے۔ حکومت کی مرکزیت اور عہدہ داروں کی لاپروائی کے وجہ سے بھی یہ قانون
ناکام رہے اور بری طرح ناکام۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ انہیں سارے ملک میں جاری نہیں کیا گیا بلکہ مختلف
قانونوں کو مختلف جگہوں پر چلایا گیا اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اصولی طور پر یہ چودہ قانون جتنے اچھے
اور مفید ہیں اتنے ہی ناقابلِ عمل بھی اور موقتی بھی۔ ان ناکامیوں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قرض کے اسباب
پر قابو پانے کی جگہ حکومت نے اپنا سارا کس بل فوری اور موقتی خرابیوں کو دور کرنے کی طرف لگایا۔
ظاہر ہے کہ ان تمام کوششوں کے کارن موقتی خرابیاں تو دور ہوگئیں لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس
بیماری سے چھٹکارا نہیں ملا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ قرضہ کی گنتی اور اس کے پھیلاؤ سے بڑھ چڑھ کر
ضروری وہ وجوہ ہیں جن سے قرض پیدا ہوا اور اب دن دونی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ اگر
ان اسباب پر قابو پا لیا جائے تو زرعی قرض آپ ہی آپ ہلکا ہو جائے گا۔

حکومت نے لین دین کرنے والوں پر بڑی کڑی پابندیاں لگا دی ہیں پھر بھی یہ اپنی
چالبازیوں کے بل بوتے قانون سے بچ بچا کر کسانوں کو اپنا غلام بنالیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ
سرکاری امداد سے قرضداری کا گھٹنا اور کم ہو جانا تو رہا ایک طرف اس میں اور بھی زیادتی ہو رہی ہے
زرعی معاشیات کو دو طرح سے سُلجھایا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مہاجنوں ساہوکاروں اور دوسرے
لین دین کرنے والوں پر کڑی پابندیاں لگا دی جائیں اور انہیں پورے طور پر حکومت کی نگرانی
میں لے لیا جائے۔ دوسری تدبیر یوں ہو سکتی ہے کہ کسانوں سے ٹھیک ٹھیک اور کھرا کھرا لین
دین رکھنے کے لئے مہاجنوں کی جگہ کچھ اور ذریعے فراہم کر دئے جائیں۔ لیکن اکثروں کے خیال
میں دولت کی کمی ہمارے دیس کی روایات اور کسانوں کی جہالت اور دقیانوسی پن کی وجہ سے
کہ یہ کوشش کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوگی۔ اس کے سوائے ان سے حکومت کو بہت گھاٹا ہوگا اور
یہ بھی ممکن ہے کہ معاملات میں سلجھاؤ کی جگہ اور بھی الجھاؤ پیدا ہو جائے۔ ایسی حالت میں یہی
ٹھیک ہوگا کہ لین دین کرنے والے سرکاری دیکھ بھال میں ہوں اور ان پر کڑی پابندیاں لگا دی جائیں۔

بعضوں کی رائے میں حکومت کاشت سدھار کے کاموں کی طرف کافی توجہ کرے تو قرض کا بار ہلکا ہوسکتا ہے۔ بعض قومی جماعتوں نے جن میں کانگریس۔ کسان سبھائیں اور کمیونسٹ پارٹی خاص قابل ذکر ہیں۔ زراعت کو ترقی دینے اور کسانوں کی حالت سدھارنے میں بڑی ہی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ ان تدبیروں کی وجہ سے کسانوں کا قرض تھوڑا بہت گھٹ گیا ہے۔

قرضدار کسانوں کی چار قسمیں ہیں۔ ہر طرح کے کاشتکاروں کی الگ ڈھنگ پر مدد کرنی ضروری ہے۔

پہلی قسم کے کسانوں کا قرض اتنا کم ہے کہ وہ بڑی ہی آسانی کے ساتھ اسے بیباق کر سکتے ہیں۔ انھیں سرکاری مدد کی ضرورت نہیں۔ دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جن کا قرض بہت زیادہ نہیں اور بنکنگ کے معمولی اور عام طریقوں سے ان کی حالت کو سدھارا جاسکتا ہے۔ تیسری قسم کے کاشتکار اس قدر زیادہ قرض میں گھرے ہوئے ہیں کہ بنکنگ کی عام اور معمولی امداد سے ان کی حالت سدھارنی ممکن نہیں۔ ایسے کسانوں کے قرض کو گھٹانے اور چکانے کے لئے خاص قسم کی سرکاری امداد ضروری ہے چوتھی اور آخری قسم میں وہ کاشتکار ہیں جن کا قرض جائداد کی لاگت سے بھی بڑھا چڑھا ہے۔ ان کے لئے حکومت کی امداد ممکن ہے اور نہ مفید اس طرح کے مقروض کسانوں کی حد تک "جا چھوڑ دیا تجھ کو خدا پر" والا اصول ہی زیادہ ٹھیک رہے گا۔

ہماری لاش ہے عصیاں سے بھاری　　اٹھانے والوں کا کندھا نہ چھل جائے

(ولیم جوزف بریٹ)

خوشِ شوقِ اسیری سے پھنسے دام میں صیاد　　شرمندہ ترے ایک بھی دانے کے نہیں ہم

(مس بلیک خفی)

دکھائی کس نے وہ چشمِ میگوں کہ ہوش جاتا رہا ہے میرا　　پڑا ہوں غش میں خبر نہیں کچھ شراب چھڑکو شراب چھڑکو

(جارج پیش شور)

نہیں مرکب ہیں میرے عنصر جدا ہیں فرقت میں تیری وہ بھی　　کہ پانی آنکھوں میں خاک تن پر ہوا ہے سر میں جگر میں آتش

(الگزینڈر ہیڈرلی آزاد)

مے پی کے تجھے دیکھئے تو لطف ہے دونا　　دیکھیں تری آنکھیں تو نشہ اور بھی چمکا

(الگزینڈر ہیڈرلی آزاد)

رائے ہیم چند رپرشاد فہیم
سابق طالب علم

غزل

چشم گریاں دیکھتے چاک گریباں دیکھتے
اپنے عاشق کا کبھی حال پریشاں دیکھتے

یوں ہماری عالم وحشت میں گذری زندگی
رات گذرے جسطرح خواب پریشاں دیکھتے

سر سے ٹل جاتیں بلائیں شام فرقت کی اگر
جلوۂ صبح بہار روئے خنداں دیکھتے

کاش اُٹھ جاتے در دل سے تعین کے حجاب
قطرہ میں دریا تو غنچہ میں گلستاں دیکھتے

بیقراری نے رکھا محروم مجھ کو قتل سے
ورنہ آنکھوں سے نہ ہم یوں خون ارماں دیکھتے

یوں زلیخا پر نہ اہل مصر ہوتے طعنہ زن
آنکھ اگر ہوتی تو حسن ماہ کنعاں دیکھتے

زندہ دل ہوتا فہیم خستہ جاں گر ہمدمو
شاعروں کی بزم میں اُس کو غزلخواں دیکھتے

حضرت میر ببر علی انیس

مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

علی محمد خسرو

انیسؔ کی شاعری

یہ کہنا مشکل ہے کہ اُردو زبان میر انیسؔ کے لئے پیدا ہوئی یا میر انیسؔ اُردو زبان کے لئے۔ اس
ادشاہِ سخن نے جس طرح حقِ شاعری ادا کیا، زبان کو جو وسعت اور الفاظ کو جو جِلا دی اس کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے
۔ انیس اُردو کی خدمت کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ان کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت بیشتر مقامات
یسے آجاتے ہیں کہ آدمی ششدر رہ جاتا ہے۔ زبان کی نفاست، بیان کی نزاکت ہم کو مثلِ آئینے کے
یران کر دیتی ہے اور رہ رہ کر دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بات کسی اور زبان میں پیدا ہو سکتی تھی؟
یا ملٹن باوجود اپنی علمیت، قادر الکلامی اور الفاظ کے شان و شکوہ کے رزم و بزم کی وہ تصویریں کھینچ سکتا
ہے جو انیس کے مرثیوں کے ہر صفحے پر نظر آتی ہیں؟ کیا فردوسی باوصف اپنی بلند پروازی اور لفظی طنطنہ و
طراق کے، اور فنِ شعر میں پیغمبری کا درجہ رکھنے کے ان باریک نکات تک پہنچ سکتا ہے جو انیس کی نگاہ
سے اوجھل نہیں ہونے پاتے؟ کیا وہ لوچ، نزاکت اور شیرینی جو شروع سے آخر تک انیس کے کلام
سے ہویدا ہوتی ہے کسی اور زبان میں پائی جاتی ہے؟ بات یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں کی شیرینی
ور مٹھاس اور بیرونی زبانوں کی علمیت اور گرانمائیگی نے مل کر اُردو کو ہر قسم کی خوبیوں سے مالامال کر دیا
ہے۔ زبان انیسؔ کے گھر کی لونڈی تھی۔ جب ہم اُردو پر ان کے تصرف کو دیکھتے ہیں اور غور کرتے ہیں کہ
نہوں نے اس سے کیا کیا کام لئے تو معاً خیال ہوتا ہے کہ اُردو انیس ہی کے لئے پیدا ہوئی تھی۔

جس طرح ایک قابل اور عاقل فرمانروا اپنی سلطنت کے چپہ چپہ سے واقف ہو، انتظام
لکت میں ہمہ تن مصروف ہو جائے، اور نئی نئی اصلاحات سے ملک کی ترقی کا سامان کرتا ہے اسی طرح
یس بھی سلطانِ قلمروِ سخن تھے کہ اقلیم شعر کا کوئی گوشہ ان کی نگاہ سے مخفی نہ تھا۔ ہر چھوٹی سے چھوٹی
ت پر ان کی نظر رہتی تھی اور نئی تشبیہوں، نئے استعاروں، نئی ترکیبوں اور نئے تخیلات سے وہ شب و
وز زمین شعر میں اصلاحات کرتے رہتے تھے۔ انیس سے پہلے جو شعرا اُردو زبان میں ہو گذرے ہیں،
رچہ ان کے تاجدارانِ سخن ہونے میں کلام نہیں، لیکن انہوں نے اپنی سلطنت کو صرف غزل تک محدود
ھا اور دوسری سرزمینوں پر اپنا پرچم لہرانے کی کوشش نہ کی۔ لیکن انیس کی طبع بلند پرواز سرزمین غزل

تک محدود نہ رہ سکی۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ ع وسعت ہے بہت ملکِ خدا تنگ نہیں ہے۔ کئی اصنافِ سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی اور اپنے دَور میں زمینِ شعر کے مالک الملک لاشریک لہٗ بنے بیٹھے۔ اگرچہ بظاہر وہ صرف مرثیہ کے بادشاہ ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ قلمروِ شعر کا وہ کونسا حصہ ہے جہاں انہوں نے اپنا علم نہ بلند کیا ہو، اپنا سکہ نہ بٹھایا ہو۔ مرثیوں کے سوز و گداز کی نہ پوچھئے کہ لوگ خون کے آنسو روتے ہیں، لیکن انیس جب اپنے ممدوح کی تعریف کرتے ہیں تو قصیدہ کا گمان ہوتا ہے۔ رباعی کہنے میں بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکیں گے۔ سلام اپنی نظیر آپ ہے۔ کلام میں جا بجا جو تغزل ہے وہ تعریف سے بالاتر ہے۔ مختصر یہ کہ انیس نے اپنے عہد میں زمینِ سخن کو آسمان کر دیا ؎

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو　　ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

انیس کے کلام کی سلاست، تسلسل اور سادگی ان کو اپنے لکھنوی معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ لکھنؤ کے شعرا صنعتِ لفظی پر جان دیتے تھے اور معنی کو صنعت کی بھینٹ چڑھا دیتے تھے۔ جیسا کہ نظم طبا طبائی نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے: "وہ صنعت جو بآسانی حسنِ معانی کے ضمن میں آجائے لطف رکھتی ہے لیکن محض صنعت کے لئے جو شعر کہے وہ شاعر نہیں ہے۔ ع صنعت گر نیست اما طبع رواں نہ دارد۔ لفظ کی تازگی کلام میں نگینے جڑ دیتی ہے لیکن ثقیل لفظ کو تازہ سمجھ کر باندھ جانا پتھر ڈھلکانے یا ڈھیلا کھینچ مارنے سے کم نہیں"۔ یہی حال حضراتِ لکھنؤ کا تھا کہ لفظی گورکھ دھندے پر فدا ہوتے تھے اور معنی کو پسِ پشت ڈال دیتے۔ اس ماحول میں انیس کے لئے مشکل تھا کہ صنعت گری سے بھی پرہیز کریں اور حسنِ معنی کو بھی برقرار رکھیں۔ لیکن ان کے نکتہ شناس دماغ اور فکرِ فلک رس کے لئے جس طرح اور مشکلیں آسان تھیں اسی طرح ع سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا۔ انہوں نے صنائع و بدائع کو اپنا تابع فرمان رکھا۔ خود ان کے محکوم نہ بنے۔ ان کے کلام سے کسی قسم کی دماغی الجھن نہیں پیدا ہوتی۔ شعر پڑھو تو ذہن میں معنی اس تیزی سے اتر جاتے ہیں جس طرح آئینہ میں کسی چیز کا عکس پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں صنعتوں کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:-

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں　　قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرہ کی چمک مہرِ منور سے ملا دوں　　خاروں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

تلوار کی تعریف ایک جگہ یوں کرتے ہیں:-

پیاسی بھی خون فوج کی اور آبدار بھی		غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی، ابر تر بھی، طوفان بھی، بہار بھی		تلوار بھی، چھری بھی، سپر بھی کٹار بھی
پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفت جہاں تھی لگانے بجھانے میں

ایک رباعی ملاحظہ ہو:۔

اے سید سادات نبی کے لڑکے		موتی ہو علی و فاطمہ کی لڑکے
بخشایئے محشر میں مجھے یا حسنین		اللہ سے کہہ کے اور نبی سے لڑکے

یہ تو صنعت لفظی ہوئی۔ صنعت معنوی میں بھی انیس کا جواب نہیں۔ حسن التعلیل کی ایک مثال پیش ہے۔ اس سے بہتر مثال چاہے کسی زبان میں ہو مشکل ہی سے ملے گی :۔

تھا بسکہ روز قتل شہ آسمان جناب		نکلا تھا خون ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہر علقمہ بھی خجالت سے آب آب		دریا میں پھوٹ پھوٹ کے روتا تھا ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

" نسیم صبح کا چلنا، جھومتی ہوئی ڈالیوں سے سبزہ پر پھولوں کا بکھرنا اس قدر لطف نہیں رکھتا جس قدر ایک برجستہ شعر سے لطائف کا پیدا ہونا وجد میں لاتا ہے" اور انیس کا کلام اس قول کا ثبوت ہے۔

انیس کے کلام کی خوبیاں قدم قدم پر فکر کا دامن پکڑ لیتی ہیں اور پڑھنے والا کہہ اٹھتا ہے
ع آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر۔ یا بالفاظ دیگر : ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست
وہ باریک اور مشکل مضامین جو دوسروں کی سمجھ سے باہر ہیں، انیس کس صفائی سے باندھتے ہیں۔ وہ دشوار گذار اور ناہموار زمینیں جہاں دوسروں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں وہاں پائے استقلال پر بھروسہ کر کے آگے بڑھنا اور منزل مقصود کا پتہ لگانا انیس ہی کا حصہ ہے۔ مثال کے طور پر ہر سخن فہم اس حقیقت سے اتفاق کرلے گا کہ شعر میں کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا انتہا درجہ مشکل ہے۔ پہلے تو شعر میں وہ لب و لہجہ نہیں لا جاسکتا جو ڈانٹ کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے نہایت سخت اظہار نا راضی منظور ہو تو ایسے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں کہ نظم کی نزاکت ان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ایسی صورت میں کسی کو اس طرح ڈانٹنے کے لئے کہ دلی جذبات کا پوری طرح اظہار بھی ہو جائے، رعب بھی پڑے، کلام کی متانت اور سنجیدگی بھی متاثر نہ ہو اور کوئی خلاف تہذیب بات بھی زبان پر نہ آنے پائے نہ صرف

بیان پر کافی قدرت رکھنے کی ضرورت ہے بلکہ ذوقِ سلیم اور فطرتِ انسانی سے واقفیت کی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری میں ڈانٹ ڈپٹ کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ ہمارے شعرا کو حالانکہ نازنینانِ پری جمال اور معشوقانِ حور تمثال نے قیامت کی تکلیفیں دیں، کسی کو بھری محفل سے اُٹھا دیا تو کسی کے قاصد کو نکلوا دیا، مروا دیا، کسی سے وعدہ خلافی کی تو کسی کو ہجر کی آگ میں جلایا، کسی کو دیوانہ بنا کے آوارہ وطن کر دیا تو کسی کا دل چرا لے گئے، کسی پر خنجرِ ابرو کے وار چلائے تو کسی کو شمشیرِ زبان سے گھائل کیا، کسی کو تیرِ مژگان کا نشانہ بنایا تو کسی کو تیغِ نظر سے شہید کیا، لیکن کسی اللہ کے بندے کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ نہیں تو ایک آدھ ڈانٹ ہی بتا دیتا۔ شاید یہ کہا جائے کہ ہمارے شعرا پاسِ ناموسِ عشق سے یا سوئے ادبی کے خوف سے لب پر مہرِ سکوت لگا لیتے ہیں، لیکن رقیب کو بھی تو وہ نہیں ڈانٹتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شعر میں ڈانٹنا کتنا مشکل ہے۔

گلزارِ نسیم میں جب شہزادہ گل کو لے کر فرار ہو جاتا ہے تو بکاولی لونڈیوں پر یوں غضبناک ہوتی ہے

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل — سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا — شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا

اور جب اپنے ہاتھ پر نگاہ کرتی ہے تو:

ہاتھوں کو ملا کہا کہ ہیہات — خاتم بھی بدل گیا ہے بد ذات
جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا — وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا

مرزا داغ اپنے معشوق سے چوچلے کرنے میں بہت مشہور ہوئے، لیکن ڈانٹ نہیں سکتے۔ گلے شکوے کرتے ہیں، زیادہ سے زیادہ کوس لیتے ہیں:-

تم نے تمام عمر جلایا ہے داغ کو — کیا لطف ہو جو وہ بھی جلائے ذرا سی دیر!
ہاں ہاں تڑپ تڑپ کے گذاری تمہیں نے رات — ہاں تم نے انتظار کیا ہم نے کیا کیا؟

مرزا غالب غصہ میں آپے سے باہر ہو گئے تو صرف اتنا کہہ سکے:

بس چُپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے۔

اب ان سب کے مقابلہ میں انیس کو ملاحظہ کیجئے۔ حضرت عباسؑ نے شمر اور اس کے طرفداروں کے سامنے تقریر کی اور صلح کا پیام دیا:

تب شمر نے کہا کہ فصاحت سے کیا حصول — بیعت انہیں تو صلح ہمیں بھی نہیں قبول

غازی پکارا او نجس و مُرتدِ و جہول لیجیو نہ منہ سے نام جگر گوشۂ رسول
سمجھا ہے کیا امام عراق و حجاز کو
گدّی سے کھینچ لونگا زبانِ دراز کو

ایک اور موقعہ پر حضرت عباسؑ شمر کو اس طرح ڈانٹتے ہیں:۔

- - - - - - - - - - - تو کاٹے گا سیّد کا گلا او سگِ ناپاک
آگے مرے یہ بے ادبی منہ میں ترے خاک بے بس ہوا ایسا پسرِ سیّدِ لولاک
کیوں رکھدوں لبِ نحس پہ انگشتِ بنان کو
دکھلا دوں ابھی چھید کے نیزے سے زبان کو

حق یہ ہے کہ اس کٹھن کام کو اس خوش اسلوبی سے انجام دینا کہ مقصد بھی پورا ہو جائے اور کوئی ناگوار بات بھی نہ ہو انیسؔ ہی کا حق تھا۔

یورپی شعرا نے منظر نگاری کے فن کو نہایت بلند درجہ عطا کیا۔ ورڈسورتھ اس بارے میں امام کا مرتبہ رکھتا ہے، لیکن اردو کے شعرا نے نیچر سے بہت کم استفادہ کیا اور نیچرل شاعری ہماری زبان میں ابھی گھٹنوں کے بل چل رہی ہے۔ تاہم انیس وہ شاعر ہے جس نے جابجا مناظرِ قدرت کو اپنے کلام میں باندھا اور خوب باندھا کہ اس کی نظیر اردو میں نہیں ملتی:۔

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ نہر کی روانی وہ موجوں کا پیچ و خم سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

ایک اور جگہ منظر ملاحظہ ہو:۔

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤس آسماں
ذرّوں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
ہر نخل پُر ضیائے سرِ اوج طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

میدان کارزار کا نقشہ انیس پر ختم ہے۔ ان سے بہتر مصور آج تک پیدا نہ ہو سکا۔ دیکھنا وہ میدانِ جنگ نظر آرہا ہے۔ کتنا شور و شر برپا ہے۔

اک سمت زرہ پوش سواروں کے رسالے
تحت الحنکین باندھے لئے ہاتھوں میں بھالے
تولے کوئی شمشیر کوئی گرز نکالے
اور تیس ہزار ایک طرف برچھیوں والے

کوسوں ہی دفورِ سپہ شام ہوا تھا
اک پیاسے کی خاطر یہ سَرانجام ہوا تھا

انیس نے سینکڑوں مقامات پر میدانِ جنگ کی جو تصویریں دکھائی ہیں ان میں سے چند نثر کی صورت میں پیش کرتا ہوں۔ انیس کو داد دیجئے۔

کوئی شہ زور جوان حسین وجمیل اس طرف سے نکلا۔ حُسن خود اس پر فدا ہے۔ تناسب اعضاء کا یہ عالم کہ جو عضو ہے کانٹے میں تلا، نور کے سانچے میں ڈھلا۔ اس کا گھوڑا وہ صَبا رفتار کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ خبر نہیں چھلاوا ہے پَری ہے، سحر ہے یا کبک دری ہے۔ گھوڑا تو ایک طرف اس کا سایہ بھی نظر نہیں آتا۔ ہَوا بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچتی۔ سبک روی میں نسیم سحری، بانکپن کے ساتھ قدم اُٹھانے میں کبکِ دری، کاوے میں پَرکار تو اڑنے میں پری۔ سم کیا ہیں گویا ماہ کامل، نعل مانندِ ہلال۔ صَبا کی طرح پاس سے نکل جائے تو جسم سے پھولوں کی سی مہک آنے لگے گویا گھوڑا عطر میں بسا ہے جس غول کے پاس سے گذرتا ہے بس یہ غل ہوتا ہے کہ کوہِ قاف سے پَری اتری۔ طاوس اس کی آن بان کو دیکھے تو شرم سے زمین میں گڑ جائے۔ دبدبہ ایسا کہ شیر کو خاطر میں نہ لائے ایک ہی دو قدم میں ہرن چوکڑی بھُول جائیں۔ اگرچہ آب ودانہ اس پر بند ہے پھر بھی تیزی کا یہ عالم کہ دم بھر کو قرار نہیں۔ کبھی سوار کی زلفوں کا سایہ اور کبھی نبض کی حرکت اس کے لئے کوڑے کا کام دیتی ہے۔ کہیں تارِ نفس تازیانہ بنے جاتا ہے۔ انتہا ہے کہ

گدِل گئی ہَوا سے ذرا باگ اُڑ گیا
پتُلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مُڑ گیا

اِدھر نوجوان نے تلوار نیام سے نکالی اِدھر عالم بالا تہ و بالا ہوگیا۔ آسمان نے سورج کی سپر سنبھالی، جبرئیل نے ڈر کر آنکھوں پر پَر رکھ لئے۔ مخالفین کے پسینے چھوٹ گئے نبضیں ساقط ہوگئیں۔ اُس نے مبارزطلبی کی تو ایک کے پیچھے ایک چھپنے لگا۔ خیر بعض روئیں تن ہمت کرکے گئے تو پلک جھپکتے میں تیرِ اجل کا نشانہ بنے۔ اہل فوج نے دیکھا کہ ایک ایک کرکے تلوار کے دھنی مرتے جاتے ہیں تو تیروں کا مینہ برسانے لگے ہر طرف سے گھیر لیا۔ پھر تو وہ بہادر بھی غیض میں آیا، گھوڑا ڈپٹا کے فوج کے دل میں گھُس گیا۔ ایک ہی ہاتھ میں صفِ اول صاف ہوگئی، اب تیغ دو دم سے دم بھر کے لئے دم لینے کی فرصت نہیں۔ کیا گھمسان کا رن پڑ رہا ہے۔ آبِ دمِ شمشیر سے ایک طوفان بپا ہے سروں کی بارش ہو رہی ہے، خون کی

ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ڈھالیں مارے ڈر کے سواروں کی پشت سے لپٹ گئیں۔ اچھے اچھے سورماؤں کی یہ حالت کہ ہاتھوں میں رعشہ، زبان میں لکنت۔ کسی نے تلوار کو ترکش میں رکھا ہے۔ کسی نے تیروں کو نیام میں داخل کیا ہے، کسی نے گھبرا کر سپر پھینک دی۔ اللہ ری بوکھلاہٹ کہ کوئی بجائے تلوار کے ڈھال کا وار کر رہا ہے۔ دو ہوں کہ چار ہوں، ایک وار میں ختم۔ ششدر ہیں کہ موت سے کیونکر دو چار ہوں۔ تیغ کبھی برق ہے کبھی بادوباراں۔ خود بجلی کو دھوکا ہے کہ یہ تلوار ہے یا میں ہوں۔ اس قدر جلد تو سیغ نہیں چلتی اس کو روکنے کی سب تدبیریں عبث۔ بھلا مرگِ مفاجات کہیں ڈھالوں سے رکتی ہے۔

خیر یہ تو انیسؔ کی تیغ زبان کے جوہر ہیں۔ فطرتِ انسانی کا ایسا رازداں اور کردار سے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی جامعیت اور اثر کے ساتھ بیان کرنے والا چراغ لے کر ڈھونڈھیے تو نہ ملے گا۔ مثلاً حضرت حسینؑ کی صاحبزادی جناب کبرا کا عقد حضرت حسنؑ کے صاحبزادے حضرت قاسمؑ کے ساتھ ہوا۔ لیکن عقد کے دو ہی تین دن میں حضرت قاسم نے کربلا میں جام شہادت نوش کیا۔ اب امام حسینؑ کے رفقا میں صرف حضرت عباسؑ اور حضرت علی اکبر باقی رہ گئے۔ حضرت عباسؑ بیتاب ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے حضرت حسینؑ سے رن کی اجازت حاصل کر لیں، لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں وہ انکار نہ کر بیٹھیں۔ ادھر خیمۂ اہلبیت میں حضرت قاسمؑ کی شہادت سے کہرام بپا ہے۔ سب کے ساتھ حضرت عباسؑ کی بیوی بھی آہ و بکا کر رہی ہیں، نہ صرف اس لئے کہ حضرت کبرا بیوہ ہو گئی ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ اب ان کے شوہر ان کو داغِ مفارقت دئے جائیں گے۔ حضرت عباسؑ اجازت کے لئے امام حسینؑ کی طرف بڑھتے ہیں۔ بیوی کو روتا دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اگر وہ اس طرح امام حسینؑ کی طرف دیکھ کر روئیں تو مبادا امام یہ سمجھیں کہ یہ التجا کر رہی ہیں کہ ان کے شوہر کو میدان کارزار کی رضا نہ دی جائے۔ اس لئے بیوی سے کہتے ہیں :-

ہر بار نہ آقا کی طرف دیکھ کے روؤ　　روتی ہو تو کبرا کی طرف دیکھ کے روؤ

کیرکٹر نگاری میں میر صاحب کا کمال مسلمہ ہے۔ کوئی شخص ایک آدھ مثال کے ذریعہ ان کی تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر شعرائے عالم کی کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہو سکتی تو جہاں انگریزی زبان کا نمائندہ شکسپیر ہوتا، فارسی کا فردوسی، یونانی کا ہومر، لاطینی کا ورجل، جرمنی کا گوئٹے، سنسکرت کا کالی داس وہاں اردو کی نمایندگی میر انیسؔ کر سکتے۔ خیر اب ان کی تعریف میں قلم کے لب خشک ہوئے جاتے ہیں۔ ان کے کمال کی داد دینے کے لئے مطالعہ شرط ہے ہر چند یہ بیساختہ یہی کہنے کو جی چاہتا ہے۔

نظم ہے یہ یا دُرِ شہوار کی لڑیاں انیسؔ
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

محمد عبدالولی
سال چہارم

ٹی - وی - اے

"ٹی، وی، اے" تین چھوٹے حروف جن کے پیچھے ایک کہانی ہے، ایسی داستان جو اعجاز مسیحائی سے کم نہیں، ایسا قصہ جو "طلسم ہوشربا" میں ہوتا تو شائد ہم یقین بھی نہ کرتے، لیکن آج یہ داستان حقیقت کا جامہ پہن کر معرض وجود میں آچکی ہے۔ 'ٹی' سے مراد (TENNESSE) دریائے ٹینیسی جو امریکہ کا ایک بڑا دریا ہے 'وی' سے مراد (VALLEY) یعنی وادی اور 'اے' سے مراد (AUTHORITY) یعنی حکومت ہے۔ وادی ٹینیسی کی یہ داستان ایک صنعتی انقلاب عظیم ہے اسکیم کی عظمت اور وسعت کا مقابلہ کرتے ہوئے ترقی کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ کسی ملک کی معاشی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ اس دریا کی ستم کاریوں کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف طغیانی اور بہاؤ کے ساتھ عمدہ زرخیز مٹی دریا برد ہوجاتی تھی اور دوسری طرف گاؤں کے گاؤں زیر سیلاب ہوجاتے تھے۔ گویا قدرت کی یہ نعمت بظاہر زحمت اور سخت مصیبت کا باعث تھی۔ دریاؤں کی وادیوں میں آبادیاں کہاں نہیں؟ لیکن ہر جگہ یہی صورت ہے کہ طغیانی سے اتنی جانیں تلف ہوتی ہیں کہ دنیا کی ساری لڑائیوں میں اتنی جانیں ضائع نہیں ہوئیں۔ ٹی وی اے کی مثال ہمیں سبق دیتی ہے کہ یہی تباہ کاری یہی طغیانی کس طرح بنی نوع انسان کے لئے مصیبت نہیں راحت بن سکتی ہے۔ دس سال قبل وادی ٹینیسی کا اور ہی عالم تھا۔ آج جہاں عمدہ عمدہ مکانات کھڑے ہیں وہاں گھاس کی جھونپڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آج جہاں بجلی کے پمپ (REFRIGERATORS) ریفریجریٹر اور متعدد کارخانے قائم ہیں وہاں دس سال پہلے سوائے اجڑے ہوئے کھیتوں کے کچھ نہ تھا۔

دریائے ٹینیسی کے پانچ معاون ہیں جن کا کل رقبہ انگلستان اور اسکاچستان کے مساوی ہے۔ اس پورے رقبہ میں ۲۱ تالاب تعمیر کئے گئے ہیں ایک لاکھ پچھتر ہزار ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک ہزار دو سو میل لمبی سڑکیں اور ایک سو چالیس میل لمبی ریلوے لائن تعمیر کی گئی ہے تالابوں کے بند میں کنکریٹ اور مٹی اس قدر استعمال ہوئی ہے جو مصر کے سات اہرام سے بارہ گنی زیادہ ہے۔ ان تالابوں کی وجہ سے ساڑھے چھ سو میل پر اندرونی جہاز رانی ہوسکتی ہے۔

آج وادی ٹینیسی تباہ کن سیلابوں سے محفوظ ہے۔ لیکن صرف طغیانی پر قابو پالینے سے یہ شاندار

اسکیم پایۂ تکمیل کو نہ پہونچتی۔ وہ زبردست قوت جو مصیبتیں ڈھاتی تھی جو ہر سال زراعت، صنعت وحرفت آبادی اور ریلوے کے لئے مستقل خطرہ تھی آج زبردست مشنری چلا رہی ہے جس کی وجہ سے سالانہ بارہ ارب کیلو واٹ برقی قوت فراہم ہو رہی ہے۔ ایک کیلو واٹ کی قوت ایک گھنٹہ میں اس قدر کام کر سکتی ہے جو دس گھنٹوں میں انسانی قوت کر سکتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان قدرتی ذرائع پر کس قدر قابو حاصل کر چکا ہے۔ خوش قسمتی سے اکثر جگہ دریا تین سو فٹ سے لے کر ۲ ہزار فٹ کی بلندی سے گرتا ہے اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک وسیع برقابی اسکیم بنائی گئی اور جب برقابی میسر ہوگئی تو ماہرین کا مشورہ ہوا کہ کان کنی بھی کی جائے کیونکہ کئی ایک معادن اسی وادی میں موجود ہیں۔ اس طرح سے تعمیری شوق بڑھتا گیا اور ماہرین کی صبر آزما اور انتھک کوششیں بالآخر بار آور ہوئیں۔ اسی برقی قوت نے امریکی ہوائیہ کے لئے کثیر مقدار میں المونیم فراہم کیا۔ اسی قوت کے سہارے دھاتوں کے کئی کارخانے، چوبینہ اور ادویہ سازی کے سینکڑوں کارخانے جی رہے ہیں۔ پچاسی ہزار گھروں میں برقی قوت استعمال ہو رہی ہے ہر گھر میں بجلی کے ریفریجریٹر، پمپ اور غلہ صاف کرنے کی مشینیں چالو ہیں۔

صرف برقابی کی فراہمی ' ٹی وی اے ' کا مقصد نہیں۔ بلکہ معادن جنگلات وغیرہ سارے قدرتی وسائل کو یکساں طور پر کارآمد بنانا مقصود ہے۔ زرعی وسائل بھی بہتر سے بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ تالاب بنانے سے قبل ہی زیر آب آنے والے تمام دیہاتیوں کو نئی آبادی میں بسانے اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام مکمل ہو چکا تھا۔ آٹھ ہزار سے زائد کسان خاندانوں نے معاوضہ اراضی حاصل کیا اور اس سرمایہ سے نئی آبادیوں میں نئے اصول کے تحت کاشت کر کے وہ بے حد مسرور ہیں۔ پرانی ڈگر کو خیرباد کہہ کے اب وہ زراعت کے فنی طریقوں پر چل رہے ہیں۔ کسان اپنی امداد باہمی انجمنوں کے ذریعہ سارا کاروبار چلاتے ہیں۔ دو ہزار کسان سالانہ مجالس میں سارے اُمور کا تصفیہ کرتے ہیں اور اب بھی پچھلے دنوں کی تباہ کاریوں کا عجیب انداز میں تذکرہ کرتے ہیں۔ کسان اپنی ہی جمعیت میں زرعی مسائل پر غور کرتے ہیں۔ اور کئی کسانوں نے بخوشی اپنے کھیتوں پر تجربے کرنے کی اجازت دیدی جس کی وجہ سے کوئی بیس ہزار کھیت زرعی مدارس اور تجربہ خانے بن گئے۔ سینکڑوں کسانوں نے ان نت نئے تجربوں سے استفادہ کیا۔ قدرت کا پہلا قانون یہی ہے کہ انسانوں کی وحدت اور قدرتی ذرائع کی وحدت قائم ہو اور انسان اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے زمین، دریا، جنگلات معادن غرض ہر جگہ حکومت کرے۔

ٹی وی اے کے لئے پہلا سوال انتظامی دشواریوں کا تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی کام

انسان کی مدد کے بغیر نہیں چل سکتا عظیم الشان کارخانے عجیب و غریب میکانی آلات وغیرہ یہ سب انسانی عظمت کو گھٹاتے نہیں، بڑھاتے ہیں۔ سائنس اور مشین کی بڑی سے بڑی دنیا پھر بھی انسانوں کی دنیا ہے۔ سوال اس بات کا تھا کہ یہ ساری اسکیم حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لے یا انفرادی جدوجہد کے حوالے کر دے؟ ان دونوں طریقوں سے بہتر ایک درمیانی راستہ تھا، چنانچہ طے یہ پایا کہ ایک کارپوریشن قائم کی جائے جس کو حکومت کی پوری تائید حاصل ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس میں انفرادی کاوشوں کی سی لچک اور اپچ بھی ہو۔ اس طرح "ٹی وی اے" ایک مجلس نظامت پر مشتمل ہے جس کا صدر منجانب صدر جمہوریہ امریکہ نامزد ہوتا ہے اور جو حکومت کے آگے ذمہ دار ہوتا ہے۔ قانون ٹی وی اے کے تحت نئے تعمیری امور معاہدہ کے مکمل اختیارات اور جملہ امور حسابات کا مقتدر اس مجلس کو قرار دیا گیا۔ اس طرح "ٹی وی اے" ہمہ اغراض کے لئے کانگریس سے آزاد اور سیاسی مدوجزر سے بالاتر ہے۔ لیکن یہ آزادی مطلق العنانی نہیں، ایک لحاظ سے پھر بھی کانگریس کا قابو موجود ہے وہ یہ کہ ہر سال مصارف کی منظوری کانگرس دیگی اور سالانہ مباحثہ میں ٹی وی اے کی کارکردگی پر روشنی ڈالی جائیگی اب تک کانگریس نے ۲۵۰ کروڑ روپئے منظور کئے (تقریباً ایک ملین ڈالر سالانہ)۔

اب ذرا پوری اسکیم کے معاشی نتائج پر غور کیجئے۔ برقی قوت کی پیداوار میں پندرہ گنا اضافہ ہوا جس کی وجہ سے صارفین کی تعداد میں ایک ہزار گنا اضافہ ہوا۔ صرف برقابی سے خالص منافعہ اس قدر ہوتا ہے کہ فاضل رقم اگر ۲ فیصد شرح سود پر لگا دی جائے تو پوری اسکیم کا صرفہ ساٹھ سال میں ادا ہو جائے گا۔ برقابی سے صنعتوں کو فروغ ہوا، وادی کے باشندوں میں صنعتی کاریگری اور مہارت روز افزوں پیدا ہوتی گئی۔ مالیاتی مفاد کے قطع نظر سماجی خوشحالی کے لحاظ سے دیکھئے۔ لوگوں میں نئی زندگی، نئی امیدیں نئی امنگیں پیدا ہوئیں۔ اغذیہ کی پیداوار میں دوگنا اضافہ ہوا، آبادی دس فی صد بڑھ گئی اور آمدنی فی کس اسی فیصد بڑھ گئی، اموات اور بالخصوص بچوں کی شرح اموات میں نمایاں کمی ہو گئی اور یہ سب کچھ صرف دس سال کے قلیل عرصہ میں۔ مزدور کام میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ پچھلے زمانہ کی یاد ابھی تازہ ہے، اور بڑے مطمئن بھی ہیں کہ یہ سب کچھ اپنے وطن ہی میں انہیں نصیب ہوا۔

وادی ٹینسی میں جو کچھ کام کیا گیا دنیا کی ہزاروں وادیوں میں کیا جا سکتا ہے جہاں دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور سمندر میں جا گرتے ہیں۔ دنیا کے ہر خطہ سے اب تک گیارہ کروڑ اشخاص نے ٹینسی وادی کے کارناموں کا معائنہ کیا اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سائنس، منظم مہارت، زمین، جنگلات معاون نے انسانی ہمدردی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ یہی وہ اپنے لئے بھی چاہتے ہیں یہی کام وہ

اپنے یہاں بھی کر سکتے ہیں۔ بس یہی آرزو یہی بیداری عصر حاضر کا حقیقی انقلاب ہے۔ وہ دن گئے کہ غربت و افلاس لابدی اور ناگزیر سمجھی جاتے یا کڑی مشقت کو وبائیں گندگی، قحط، سیلاب، طوفان دیوؤں کی کارستانیاں یا دیوتاؤں کی سزائیں سمجھی جائیں۔ اگر قدرتی ذرائع کام میں نہ لائے جائیں تو نتیجہ وہی ویران زمین، ویران جنگل، بیکار نہریں اور صنعتی بدحالی ہوگا۔ امن اور آزادی کا انحصار ہمارے ذرائع کی افادیت کو کام میں لانے پر ہے۔ الغرض جملہ مسائل کا دارومدار سائنس اور جدید وسائل کے ذریعہ ہوا، پانی، زمین اور معدن کے ذرائع کو کام میں لانے پر ہے۔ غریب ہندوستان کے لئے "ٹی وی اے" میں بڑا سبق ہے۔ ہمیں اپنی غذای پیداوار بڑھانی ہے، ہندوستان ایک زرخیز ملک ہونے کے باوجود مفلوک الحال ہے۔ ہندوستان امیر ہے ہندوستانی غریب۔ ہمیں شہری اور دیہی صنعتوں کے لئے سستی برقابی درکار ہے۔ "ٹی وی اے" کی مثال بتلاتی ہیکہ یہ سب کچھ بہت کم عرصہ میں ممکن ہے۔ ہمارے یہاں دریاؤں کی کمی نہیں۔ دریائے سون کی تحقیقات ہو چکی ہے جس سے کئی برقابی اسکیمیں تیار ہو کر یو پی، بہار اور متصلہ رقبہ میں برقی قوت فراہم ہو سکتی ہے۔ دوسرے صوبوں میں بھی یہ ممکن ہے۔ پنجاب میں ستلج ہے، آسام میں برہم پترا، حیدرآباد اور مدراس میں تنگبھدرا ان ساری اسکیموں سے نہ صرف سستی برقابی میسر ہو سکے گی بلکہ آبپاشی، تنظیم جنگلات، عمدہ زراعت اور گھریلو صنعتوں کا فروغ بھی ممکن ہو گا۔ الغرض وہ دن دور نہیں جبکہ ہندوستان متمول ممالک سے آگے نہیں تو کم از کم پیچھے بھی نہ رہے گا۔

حسن ظاہری حسن باطنی کا باعث ہے۔ ہم بعض عورتوں سے محض اُن کے اخلاق و عادات کی وجہ سے محبت کرتے ہیں اگرچہ کہ وہ زیادہ حسین نہیں ہوتے اور بعض کو بالکل پسند نہیں کرتے حالانکہ وہ بہت زیادہ حسین ہوتے ہیں۔

حسن ہر وقت نیک اور پاک نہیں ہوتا مگر نیک اکثر حسین ہوتا ہے۔

حسن جو شریف اور باعصمت عورت میں ہے مثل آگ کے ہے جو دور ہے یا ایک تیز تلوار ہے جو ہماری گرفت سے باہر ہے نہ وہ جلا سکتی ہے اور نہ یہ زخمی کر سکتی ہے جب تک کہ ہم بالکل قریب نہ جائیں۔

علم نہ صرف ملل اقوام کے بقائے دوام کا باعث ہے بلکہ متفرق ہستیوں کو بھی
ان کی زندگی کا رشتہ قطع ہوجانے کے بعد ابد تک زندہ رکھتا ہے

انڈیا بک ھاؤس کی چند زندہ جاوید مطبوعات

(۱) اسلام کے معاشی تصورات (تاریخ) مرتبہ غلام دستگیر رشید ... کلدار
(۲) سیاسی نصب العین (سیاست) کرشن چندرائے سکسینہ
(۳) ابن خلدون (تاریخ) عبدالقادر
(۴) مسلمانوں کا سیاسی نصب العین (سیاست) انعام اللہ خاں
(۵) عہد نبوت میں سیاست کاری کے اصول (سیاست)
(۶) اپنے محل (افسانے) ظفر قریشی
(۷) ساز حیات (") ظفر بانو انصاری
(۸) تاریخی رومان (") شبلی۔ بی۔ کام
(۹) افادات سلیم (ادب)
(۱۰) اقبال ریزے۔ منتخب کلام پاکٹ اڈیشن
(۱۱) چوراہا (ناول) قیسی رامپوری
(۱۲) محبوبہ (") عطیہ شوکت
(۱۳) ہما خانم (") سجاد حیدر یلدرم
(۱۴) حقیقت علم (ادب) حافظ سخندر تجتا
(۱۵) جنگ اور روپیہ (مسائل حاضرہ) امتیاز حسین
(۱۶) جنگ اور مالیہ (")
(۱۷) جنگ اور راتب بندی (") سعید احمد مینائی
(۱۸) اشتراکی روس (") محمد عبدالقادر
(۱۹) جنگ اور اغذیہ (") ڈاکٹر انور اقبال قریشی
(۲۰) تنظیم مابعد جنگ (")

نوٹ:۔ ان مطبوعات کے علاوہ ہندوستان کے تمام مشہور ناشرین کی کتابیں خواہ وہ انگریزی کی ہوں یا اردو کی آپ ہم سے طلب کیجئے۔

انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ حیدرآباد دکن

سید عابد حسین
نائب صدر "بزم ادب"
۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۶ء

رشید الدین احمد خاں
سال چہارم

لیل و نہار گلستان

بہار کے جاں بخش جھونکے اپنے اندر سبزہ زار کی ہزار نیرنگیوں اور گلستان کی صد ہزار رنگ رلیوں کو پنہاں رکھتے ہیں۔ بادِ بہاری کی رفتار خرامہ گل و گلستان کی دلبستگیوں اور خوشنمائیوں کو اور تیز گام کر دیتی ہے۔

پہلی لہر کے چلتے ہی درختوں میں کونپلیں پھوٹیں، شگوفے کھلے اور ایک غنچۂ ناشگفتہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھول بنا ــــ اور ٹہنی پر جھومنے لگا، گویا رقص و سرود کا مرقع مجسم پیش کر رہا ہے: جوبن میں لچکتا نکہت میں مہکتا، عطر میں بہکتا، بادِ سحری سے اٹھکیلیاں کرتا، مست ناز اور مخمور جوانی تھا۔ آٹھوں پہر سہانے روپ رنگ میں بیتتے۔ تاروں بھرے سماں کا آخری شب چراغ جوں ہی ٹمٹما کر گل ہوتا، تاریکی اُفق سے نور کی پہلی کرن پھوٹتی اور بیاباں و نخلستان، گلستان و بوستاں سب پر سے تاریکیٔ شب کا نقاب ظلمت اُلٹ دیتی اور صبح امید کی اُمنگوں بھری روشن آمد کی پیش رسی کرتی۔ رات بھر کملائے غنچوں میں جان نوبہار پڑتی، پژمردہ کلیوں میں رُوح بیداری پیدا ہوتی اور خوابیدہ سبزہ لہلہا اُٹھتا۔

سویرے سویرے نور کے تڑکے میں شبنم کے موتی گلزار کو گہربار کر دیتے۔ سبزے کا منہ دھوتے، کلی کا من کھولتے، پھول کے آغوش میں آبستے ...... پھر کچھ دن چڑھتے جانفزا موج نسیم کے پَون جھونکے کبھی آشفتہ سر کے پیام یاس ہجر اور شوق وصال کی شناسائی کرتے نہ معلوم کیا دل کی حالت ہوتی کہ نسیم کی آمد آمد ہی سے شاخِ گل جھومتی، لچکتی، بل کھاتی پھر سروقد ہو جاتی گویا انگڑائی لے کر سیدھی ہوئی ہے یا اس اَدائے دلنواز سے کوئی نوید دلبر دیتی ہے ــــ ایک جھونکا آتا، سندیس سُنا جاتا، قاصد کا روپ بدلتا اور پیام مخفی لے جاتا: نہ معلوم کیا سندیس سُنا گیا، نہ جانے کیا پیام لے گیا۔ پھر ایسے سہانے وقت میں صرصر کے تند جھونکے ٹہنی کو ایسا ہلاتے جیسے ساون کی رُت میں کسی سیم تن کا من لبھانے اور جی بہلانے کوئی چنچل سہیلی جھولا جھلا رہی ہے۔ پھر آفتاب عالمتاب اپنی پوری ضوفشانی و تابانی سے جلوہ فرما ہوتا، جس ذرہ بے مایہ پر روشنی پڑتی، وہ جگمگا اُٹھتا، جن بیاباں پر نور افشانی ہوتی وہ دمک اُٹھتا، اجالے کی بھری چادر پھول بن کے نظارہ کو اور دلکش کر دیتی۔

پتہ پتہ، ٹہنی ٹہنی جھلملانے لگتی اور سبزے سے دھوپ چھاؤں کا نظر فریب کھیل کھیلتی پنکھڑی پنکھڑی پر اوس کے دانوں کو سورج کی کرن چمکانے لگتی اور پھول کو چراغ گلستاں بنا دیتی ——— چار پہر اسی طرح آسائش و زیبائش میں گزر جاتے ۔ اپنے فطری روپ سنگھار کو چشمۂ شفاف کے آئینۂ بے کدورت میں دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیا کیا خیال پھول کے من میں سماتا ہوگا۔ کیا کیا جذبات بھڑکتے ہوں گے کیونکہ اپنے حسن کی خود تاب لاسکتا ہوگا۔ نہ معلوم دل میں کیا گزرتی ہوگی اور دل کس بات پر آمادہ خاطر ہوتا ہوگا ؟

شاخ گل کے عشوے عندلیب کی نالہ کشی کا باعث کیوں نہ بنیں۔ عندلیب کی کیا خطا، کبھی صبا کے معنی خیز جھونکوں سے یوں سر ہلاتی گویا ناراضی ہے اور کبھی یوں لچکتی کہ رضامندی کا اشارہ ہے۔ مگر نہ اظہار آمادگی بے محابہ، اور نہ انکار صاف صاف ۔

دن بھر یوں ہی کٹ جاتا مگر رات کا بیتنا ۔ خلمت کا چھٹنا ۔ بلبل کے عشق کا امتحان صبر و شکیب ہوتا ہے ۔ یہی وہ وقت ہے کہ دھڑکتے دل کا نالہ لبو ترنگ کا ساز چھیڑتا ہے اور دل کا رنگ خون جگر بن کر ٹپکتا ہے ۔ یہی وہ مقام ہے کہ اہل دانش کی نظر ظاہر بین کم دیکھتی اور کم تر سمجھتی ہے ، لیکن اہل دل کی چشم دور رس اس رمز محبت کو نہ صرف پہچانتی ہے بلکہ اس راز سربستہ کو اپنے حالات سے ہم آہنگ پاتی ہے۔

بیچارہ بلبل دن بھر یہ تماشہ گلزار دیکھتا ، مگر دن دھاڑے کیونکر من کی بات مکھ تک لاسکتا۔ کیسے لب کشائی کرتا ، دل ہی دل میں گھٹتا ۔ مچلتا ، پھڑکتا مگر چپ چاپ رہتا کہ ہزار قہقہوں میں ایک آہ کون سنے ؟ غرض شام کے سناٹے میں وارفتۂ عشق ، گرویدہ محبت ، ناشاد و نامراد بلبل شیدا کی آہ سرد و نالۂ دل سوز کی ہمنوائی چمن کا بوٹا بوٹا کرنے لگتا ہے ۔ مگر اسی طرح جوں جوں دن ڈھلتا جاتا ہے ، بلبل کی آرزوئیں بھی موہوم تر ہوتی جاتی ہیں ۔ ہر نالۂ پُر درد کی نارسائی باعث نالۂ مکرر ہو جاتی ہے اور ہر نالۂ آواز بازگشت بن کر شش جہت عالم میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ساری فضائے بسیط میں فریاد کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے ——— فلک کے سینہ پر تاروں کے داغ ، باغ کے پتہ پتہ پر شبنم کے آنسو اور کلی کا خونیں دل اسی نالۂ اثر آگین کی غمازی کر رہے ہیں ——— کیا دھڑکتے دل کی صدائیں اتنی تاثیر بھی نہ ہوگی؟ مگر مسکراتا پھول مسکراتا ہی رہا اور مسکراہٹ کی مجسم تعریف بن گیا ——— تڑپتے مچلتے بے قرار ہوتے بلبل کی کیفیت حرماں ، خندہ دہن گل پر شکن فکر و آثار افسردگی تو کجا جستجوئے پرسش احوال تک نہ لاسکی ۔ اس سے بڑھکر ہمت شکن و آرزو فگن مسکراہٹ اور کیا ہوسکتی ہے ۔ یہی مسکراہٹ تو شیوۂ

نازنین ہے .... رات بھر اسی طرح بیت جاتی۔ بلبل شکوہ کرتا، شکایت کرتا، وہ چاسی میں تڑپ کر فلک بوس نالۂ شب گیر کھینچتا، صبح ہوتے ہوتے مجبوری میں بے کل ہو کر آہ سحرگاہی بھرتا۔ پھر تھک کر خاموش ہو بیٹھتا۔ سستاتا، دم لیتا کہ طبعاً پھر اسی دام ابدی میں ناچار پھنستا ہے۔ مگر گل کی مستقل مزاجی کی داد دیجئے کہ ایک ہی انداز غیر التفات پر قائم ہے — غیر متاثر، غیر مذبذب۔

رات کٹی دن نکلا — دن ڈھلا شام ہوئی اندھیرا چھایا — پھر وہی گلستان — گلستان کی بہار آب و تاب: شمشاد و بنفشہ، چنبیلی، نسترن، نرگس و سوسن، سرو و صنوبر، لالہ و سبزہ اور وہی گل — گل کا چڑھتا جوبن، اس پر خاموش مسکراہٹ، بلبل کی حسرت بھری نگاہیں، امنگوں بھرا دل، بے چین جوانی ناکامیٔ الفت، پر درد شکوہ اور لگاتار آہ و فغان .... بلبل چلاتا ہے کہ اس کی فطرت میں فغاں اور قسمت میں سوز ہے، پھول ہنستا ہے کہ اس کی ازلی ودیعت ہنسی ہے اور ہنسی ہی اس کی زندگی کا مقصد۔ بلبل مسکرا دے تو پھول بن جائے، پھول نالہ کش ہو تو بلبل ہو جائے — وہ ہنسے کیونکر جس کا دل درد آشنا ہو، جو چوٹ کھانے کا عادی ہو اور ستم سہنے کا خوگر، ہنسی ان کا شیوہ ہے جن کے پہلو میں دل نہیں، دل میں احساس نہیں، تڑپ نہیں۔ جو عاشق سے واقف اور عشق سے بے خبر: ظاہر بیں اور کور باطن ہیں — پھول سراپا حسن و زینت، غمزہ و عشوہ، ناز و ادا۔ نا آشنائے دردِ عشق، بے خبر فراق یار — اور — پر اسرار ابدی خاموشی —

بلبل سراپا عشق: ظاہر و باطن، جینا، مرنا، مقصد و مقصود، حاصل و حصول، ہر انداز، ہر خیال، ہر فعل، ہر عمل عشق اور مکمل تفسیر و تشریح عشق! .... پھول اتراتا ہے اپنے جمال رنگین و حسن دل آگین پر، جانفزائی اور دلنوازی پر — بلبل بھی اپنے سودائے عشق میں مگن ہے، مست ہے بے ہوش ہے — ایک سراپا ناز تو دوسرا مجبور نیاز! وہ اس کی تقدیر یہ اس کا مقدور — دونوں صناع ازل کے نقوش جاودانی کے کرشمہ اور اسی مصور فطرت کی تصویریں ہیں — بلبل کی کیا خطا اگر وہ مجسم آہ و فغاں ہے، اور گل کا کیا قصور اگر وہ خاموش تبسم ہے، نہ وہ اس کی شومی قسمت اور نہ یہ اس کی خوش بختی — نہ وہ اپنے ارادہ سے عاشق وارفتہ ہوا اور نہ یہ اپنے منصوبہ سے معشوق ہرجائی بنا۔

اختر رضوی
سال سوم

بُدھ مت

قرون اولیٰ و وسطیٰ میں نہ کسی کو تاریخ لکھنے کا شوق تھا اور نہ کوئی لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ انہیں اپنی زندگی میں بہت کم خطرات سے دوچار ہونا پڑتا تھا ان کی زندگیاں مسرت سے لبریز ہوتی تھیں۔ ان ادوار میں راجاؤں امیروں اور درباریوں کے عموماً اور محبت کے قصے خصوصاً بیان کئے جاتے تھے قصوں کا مواد عام طور پر یہی ہوا کرتا تھا کہ ایک بادشاہ نے ایسا بڑا خوبصورت شہر بسایا اور فلاں بادشاہ نے اتنے ہاتھی پالے تھے اور فلاں نے اتنے شیر مارے وغیرہ۔ اس قسم کے قصے جن سے بہادری اور شان ظاہر ہوتی ہو۔ آریاؤں میں مشہور اور خاص خاص قصے یاد کر لئے جاتے تھے کیونکہ وہ لوگ پڑھنا نہ جانتے تھے تاہم ان مشرقی آریاؤں کے ذہنوں میں نہایت گہرے اور فلسفیانہ خیالات پرورش پا رہے تھے جو اب بھی تربیت اور سلیقہ کے ساتھ پائے جاتے ہیں چنانچہ جہاں تک بدھ کے حالات بھی مورخین کو انہیں آریاؤں سے حاصل ہو سکے ہیں جہاں سینہ بہ سینہ روایات منتقل ہوتی چلی آتی ہیں۔

گوتم بُدھ کی پیدائش ۶۰۰ اور ۵۰۰ قبل مسیح کے درمیانی کسی حصہ میں جب کہ کروسس لڈیا میں ترقی کے مدارج طے کر رہا تھا اور سی رس بابل کو نبا نیڈس سے چھین لینے کی فکر میں تھا بانیٔ بُدھ مت گوتم ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست میں پیدا ہوا جو بنگال کے شمال اور ہمالیہ کے دامن میں واقع تھی اور آج کل نیپال کی سرحد میں جنگلوں سے پٹا ہوا علاقہ ہے اس چھوٹی سی ریاست پر ایک خاندان حکمراں تھا جس کا نام سکایا تھا۔ گوتم اسی خاندان کا ایک فرد تھا اس کا اصلی نام سدھتا تھا اور گوتم خاندانی نام اور سکایا قومی نام تھا۔

اس زمانہ میں ذات پات کی تفریق ابھی ہندوستان میں اتنی مستحکم نہ ہوئی تھی۔ برہمن اگرچہ کافی رسوخ رکھتے تھے لیکن اپنے اصول کی تکمیل کے لئے وہ اتنے سخت نہ تھے تاہم وہ اپنے آپ کو اعلیٰ آریہ جان کر مقامی سیاہ فام نسل سے بالکلیہ علٰحدہ رکھتے تھے۔ اعلیٰ آریوں اور عام لوگوں میں بہت بڑا فرق تھا۔ گوتم بدھ بھی اعلیٰ قسم کے آریاؤں میں سے تھا۔ اس کی تعلیم جیسا کہ ہم کو معلوم ہوگا "آریائی حقیقت" یا "آریائی طریقہ" کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ یہ صرف گذشتہ نصف صدی میں پالی زبان کے معلوم کرنے کی وجہ تھی کہ گوتم بدھ

کی زندگی کے کچھ حقیقی واقعات روشنی میں آسکے۔ ابتداءً تو اس کی زندگی اور تعلیم کے حالات قصے کہانی کے طور پر سینہ بسینہ منتقل ہوتے جاتے تھے جن میں سے اکثر واقعات کی صورت مسخ ہو جایا کرتی تھی لیکن اب ہمیں اس کے بحیثیت انسان اعلیٰ صفات کا تذکرہ دستیاب ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ میں زندگی حقیقتاً تسکین بخش اور مطمئن نہیں ہوا کرتی تھی ویدوں کے قصوں کے سوائے کوئی ادب موجود نہ تھا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ دنیا صرف ہمالیہ کے برفانی پہاڑوں سے لیکر ہندوستان تک ہی محدود ہے۔ شہر بنارس گوتم کی راجدھانی سے سو میل کے فاصلہ پر تھا۔

گوتم بدھ وہ حسین، صاحب ثروت، اور فریس تھا اور انتیس سال تک اپنی زندگی رئیسانہ طرز پر عیش وعشرت سے بسر کرتا رہا۔ لیکن اس کی زندگی میں آئندہ پیش آنے والے غیر معمولی انقلابات اس کے بچپن ہی سے نظر آتے تھے چنانچہ باوجود ناز ونعمت سے پرورش پانے کے زندگی کی مجازی مسرت اس سے ناپید تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے انتیس برس کی عمر تک امیرانہ زندگی بسر کی لیکن پھولوں کے جھرمٹ اور حسینوں کے قہقہوں میں بھی خوشی اس کے لئے عنقا تھی۔ اس کی شادی انیس سال کی عمر میں اس کی چچازاد بہن سے ہوئی تھی۔ وہ باغوں میں جاتا کھیلتا اور شکار کرتا تھا لیکن باغیچے اور سبزہ زار اور نغمہ و شباب کی محفلیں اس کے متلاشی قلب کو کسی طرح سکون واطمینان نہیں بخشتی تھیں۔ وہ اس طرز زندگی سے ناخوش تھا حالانکہ اس کے سامنے تعیشات کے جملہ اسباب موجود تھے لیکن اس کی روح کو چین اور سکون حاصل نہ تھا۔ بعض وقت اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قسمت انسانی اُسے پکار رہی ہے، اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ حقیقت سے بہت دور ہے۔ اس کا قلب زندگی کی صداقت معلوم کرنے کے لئے مضطرب تھا۔ اس کی روح بنی نوع انسان کی نجات کا ذریعہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھی۔

ایک مرتبہ وہ انہیں خیالات میں غرق رتھ میں بیٹھا چلا جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک بوڑھا شخص دکھائی دیا جو بہت ہی نحیف اور ناتوان تھا اور جس کی کمر خمیدہ ہو گئی تھی۔ اس وقت چنا نے جو اس کا رتھ بان تھا کہا کہ "زندگی اسی کا نام ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو اس زمانہ سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ کچھ آگے بڑھا تھا کہ اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جو مرض جذام کے سبب مضغۂ گوشت بنا سڑک کے کنارے راہ گیروں کے رحم وکرم پر پڑا تھا۔ تھوڑی دور اور راستہ طے کرنے کے بعد اُسے ایک نہایت عبرت انگیز اور اندوہگیں منظر دکھائی دیا جس نے اُس کی زندگی کی کایا پلٹ دی۔ ایک مزبلہ پر اس نے دیکھا کہ ایک لاش بے گور وکفن پڑی ہوئی تھی جو پھول گئی تھی اور جس کی آنکھیں غائب ہو چکی تھیں اور گدھ اور چیلیں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے پھر دوبارہ چنا نے گوتم کو مخاطب کر کے کہا کہ "یہی ہماری زندگی کا راستہ ہے"۔

گوتما کے دل پر ان مناظر کا بہت ہی خاص اثر ہوا۔ اسی وقت اسے ایک جوگی نظر آیا۔ جوگی نہایت سخت اصولوں کے پابند ہوتے ہیں۔ اپنا وقت زیادہ تر عبادت اور مذہبی گفتگو میں گزارتے ہیں اُن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ زندگی کی حقیقت معلوم کر رہے ہیں جوگی کو دیکھ کر گوتما کے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ اُس جیسا بن جائے۔ ابھی گوتم اس سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے چلے اتنے میں اطلاع ملی کہ اس کی بیوی کے بچہ پیدا ہوا ہے۔ گوتم کے لئے یہ مصیبت کی دوسری کڑی تھی۔ کیونکہ "اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے" کے مصداق ابھی وہ چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ سماج کے ایک اور بندھن میں گرفتار ہو گیا۔ چاروناچار شہر کا رُخ کیا۔

گوتم کا گھر چھوڑنا

تمام خاندان والے خوشیاں منا رہے تھے۔ ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا گیا تھا اور محفل رقص آراستہ تھی لیکن گوتم کے دل کی آنکھیں روشن ہو چکی تھیں۔ وہ بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا جب نصف شب گزر چکی تو اس شخص کی طرح جسے یہ کہا جاوے کہ اس کے گھر کو آگ لگی ہے وہ پریشان ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی بیوی کے کمرے کی طرف گیا اور چاند کی روشنی میں دیکھا کہ اس کی بیوی پھولوں کے بستر پر ننھے بچے کو اپنی آغوش میں لئے سو رہی ہے۔ اس کے بعد وہ چنا سے مخاطب ہوا اور حکم دیا کہ گھوڑے پر زین کس دے۔ وہ چلے جانے سے پیشتر چاہتا تھا کہ پہلی اور آخری بار اپنے ننھے بچے کو چھاتی سے لگائے لیکن بیوی کے بیدار ہو جانے کے ڈر سے اُس نے ایسا نہیں کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکل گیا۔ چنا اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ رات تمام وہ چلتے رہے۔ صبح میں ایک دریا کے کنارے اُتر پڑے۔ وہاں گوتم نے اپنے جسم کے سب زیورات اتارے اور وہ زیورات اور گھوڑا چنا کے حوالے کر دیا کہ گھر پہنچا دے اور پھر اپنے سفر پر پیدل روانہ ہو گیا۔ راستہ میں وہ ایک غریب شخص سے ملا جس سے اُس نے اپنے کپڑے بدل لئے۔ وہ جوگیوں اور سادھوؤں کی تلاش میں جنوب کی طرف ان پہاڑیوں میں چلا گیا جو سلسلہ بندھیاچل سے بنگال کی جانب شہر راجگیر کے قریب واقع ہیں جہاں اس زمانہ میں بڑے نامور جوگی آباد تھے اور جن کا علم معراج کمال پر پہنچا ہوا تھا۔

ہندوستانیوں کا خیال ہے کہ روحانیت یا روحانی قوت اور علم، ریاضت کرنے روزے رکھنے اور ہمیشہ بیدار رہنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ خیالات سقراط کی تعلیم سے مشابہہ معلوم ہوتے ہیں جو تقریباً دو ہزار سال قبل یونان میں رائج تھی۔ گوتما نے اپنے زمانہ کے مابعد الطبیعیاتی مسائل میں ریاضت کی لیکن اس کا بے چین دل اس سے تسکین حاصل نہ کر سکا وہ بندھیاچل کی پہاڑیوں میں جا بیٹھا اور فاقہ کشی اور ریاضت میں مستغرق رہنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا چرچا دور دور ہونے لگا لیکن اُسے اس

ریاضت میں بھی حقیقت کی کچھ جھلک نظر نہ آئی ۔ ایک دن وہ کسی عمیق فکر میں گشت لگا رہا تھا کہ ایک دم اس کے پاؤں لڑکھڑائے اور وہ بالکل بے حس ہو کر زمین پر گر پڑا جب آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ اُس کے خیالات فاسدہ اُس سے دور ہو چکے تھے اور حق وصداقت کا جلوہ اس کی نظروں کو خیرہ کر رہا تھا۔ اس کے پانچ ساتھیوں کو جوان کے ساتھ غار میں رہتے تھے تعجب ہوا اُس نے اُن سے معمولی غذا مانگی اور آئندہ بھو کا رہنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے کہا کہ اگر حقیقت کا پتہ چلایا جا سکتا ہے تو صرف صحت مند جسم اور اچھے دماغ سے لیکن یہہ خیال سب کے لئے انوکھا اور اچھوتا تھا۔ اس کے پیروؤں اور ساتھیوں نے اس کے اس عقیدہ کو نہیں مانا اور چاروناچار گوتم کو بنارس کے ایک گوشہ میں چلا جانا پڑا۔ اب اس کی شہرت کم ہو گئی اور گوتم راہِ سعادت میں اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا لیکن جذبۂ حقانیت اُسے آگے بڑھائے جاتا تھا۔

گوتم کو تجلی کا نظر آنا

جب دماغ کسی اُلجھے ہوئے مسئلے کے سُلجھانے میں حقیقی اصول نفسیات کیساتھ مصروف ہوتا ہے اور بمرآز ما کوشش کے ساتھ اُس کے حل کرنے میں مستغرق ہوتا چلا جاتا ہے تو آخر میں کامیابی قدم چوم لیتی ہے اور خصوصی طور پر تلاش حق میں جب کوئی شخص اپنی ہستی کو گم کر دیتا ہے تو بعض اوقات ایک نوری تجلی یا روشنی کی صورت میں اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے جس سے پوری حقیقت واضح ہوتی ہے یہی حال گوتم کا بھی ہوا۔ ایک مرتبہ وہ دریا کے کنارے درخت کے نیچے کھانا کھانے کے لئے بیٹھا ہوا تھا کہ اُسے تجلی نظر آئی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے انسانی زندگی کی حقیقت پالی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک رات اور ایک دن مسلسل اسی خیال میں بیٹھا رہا اور اس کے بعد اس تجلی کے اثرات کو دنیا پر ظاہر کرنے کے لئے اُٹھ بیٹھا۔

اس عہد میں یہ خیال نہیں کیا جا سکتا تھا کہ صفحہ عرض پر کوئی ایسی ہستی بھی پیدا ہو سکتی ہے جو ماضی حال اور مستقبل کے حالات پر غور کر کے زندگی کا صحیح راستہ اختیار کر سکے۔ اگر کوئی ایسی ہستی نظر آجاتی تھی تو اُسے مافوق الفطرت خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ پالی زبان کے ایک نوشتہ کی تحریر ملاحظہ ہو "جب نجات دہندۂ عالم (گوتم بدھ) اور شر کے شہزادے سے جنگ چھڑی تو ہزاروں شہاب ثاقب ٹوٹ ٹوٹ کر گرے۔ دریائیں اپنا رُخ پلٹ کر واپس اپنے سرچشمہ کی طرف بہنے لگیں۔ پہاڑ کی زبردست چوٹیاں جہاں صدیوں سے بیشمار درخت اگے تھے چکنا چور ہو کر زمین پر آرہیں۔ آفتاب عالمتاب نے رنج وافسوس کی سیاہ چادر اوڑھ لی اور فضا بے سر کے فرشتوں سے بھر گئی"۔ یہ اور اسی قبیل کے ایسے نوشتہ جات پائے جاتے ہیں جو مافوق الفطرت ہیں اور یہاں تاریخ بالکل خاموش ہے۔ اس کے عوض تاریخ کے صفحات میں ہمیں ایک ہستی بنارس کی جانب جاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

بُدھ کا خطاب بنارس میں اس نے اپنے پانچ شاگردوں کو ڈھونڈھ نکالا جو عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایک بیان سے پایا جاتا ہے کہ جب وہ اُن کی طرف آتا نظر آیا تو وہ بہت ہچکچائے۔ لیکن چونکہ گوتم میں فراست بدرجۂ اتم موجود تھی اور وجاہت کا بھی کافی اثر رکھتا تھا اس لئے اُس نے ان کو پانچ روز تک مسلسل اپنے سامنے بٹھا کر اپنے اعتقادات اُن کے سامنے بیان کئے۔ جب آخری دن اس نے اُن سب سے کہا کہ خدا نے مجھے حقیقی راستہ بتلادیا ہے اور خدا کا نور میرے دل میں پیوست ہوچکا ہے تو ان شاگردوں نے پکار پکار کر کہا کہ تو بُدھا ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ عقل یا بدھی تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد زمین پر آتی ہے۔ اور وہ شخص جو پرماتما کا پرستار ہوتا ہے وہ اُس سے سرفراز ہوتا ہے ایسے شخص کو لوگ بدھا کہتے تھے ہندوستانیوں کے اعتقاد کے مطابق بہت سے بدھا ہندوستان میں پیدا ہو کر فنا ہو چکے تھے۔
لیکن صرف گوتم بدھ ہی کو ان سب میں قبولیت اور شہرت دوام حاصل ہوئی۔ یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ اُس نے یہ خطاب خود اپنے لئے انتخاب کیا تھا کیونکہ جہاں تک ہمیں پتہ چلتا ہے اس نے گفتگو اور درس دینے کے دوران میں کبھی اپنے آپ کو بدھا نہیں کہا۔ وہ اور اس کے شاگرد دل نے بنارس میں "ڈیئر پارک" کے مقام پر ایک درس گاہ قائم کی وہاں اُنہوں نے جھونپڑیاں بنائیں اور تبلیغ سے حلقۂ ارادت کو وسیع کرلیا اور پھر سب نے مل کر تبلیغ حقیقت شروع کی۔

گوتم کی تبلیغ گوتم کی حقیقی تعلیم جو ہمیں اصلی سرچشموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ بالکل سادہ اور صاف ہے۔ اور زمانۂ حاضرہ کے خیالات سے ملتی جلتی ہے۔ اس کی تعلیم کے وہ کلیات اس کے پانچوں چیلوں کے ذریعہ معلوم ہوئے ہیں جن کے سینے اس کی تعلیم سے معمور تھے۔ وہ تمام مصائب اور بے چینیوں کی وجہ خود غرضی اور ہوس رانی بتلاتا ہے۔ درد و غم کا سبب وہ انفرادی خواہشاتِ نفس کی پیروی قرار دیتا ہے جب تک کوئی شخص اپنے نفس کو قابو میں نہ لے آئے اس کی زندگی دردناک اور اس کا انجام افسوس ہے۔ خواہشات کی تین قسمیں ہیں اور وہ تینوں "شر" ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم اپنے احساسات کو لذت پہنچانا ہے۔ دُوسری فنائیت سے محفوظ رہنے کا جذبہ۔ تیسرا دنیوی ترقیوں اور تعیشات سے متمتع ہونا۔ زندگی کو پُرسکون بنانے کے لئے ان تمام پر قبضہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ ایک شخص کو صرف اپنے لئے ہی نہیں جینا چاہئے اور جب کسی نے ان پر قابو حاصل کرلیا اور اُن کے قبضہ میں نہیں رہا اور جب اس کے خیال سے لفظ ضمیر "انا" غائب ہوگئی تو پھر اس کو عقل کا وہ درجۂ کمال حاصل ہو جاتا ہے جسے "خود انا" کہتے ہیں۔

دنیا کی ہر نام آور قوم اور ہر کامیاب مکتب خیال کا یہ تصور رہا ہے کہ جب تک کوئی اپنی ہستی کو اپنے سے بڑی ہستی میں گم نہ کر دے اس وقت تک وہ روحانی سکون حاصل نہیں کر سکتا اور یہی چیز بُدھا کی تعلیم میں خصوصی طور پر پائی جاتی ہے۔ اس کا ایقان تھا کہ جب تک خواہشات نفسانی کو نہ مٹایا جائے اور نفس کے شر اور برائیوں پر قابو نہ حاصل کر لیا جائے اس وقت تک انسان اپنی شخصی قوت حاصل نہیں کر سکتا۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ گوتم بُدھ صرف اپنے ماحول اور اپنے زمانہ سے متاثر ہوا تھا اور اس کی قلبی تمنا اس وقت کی بے چینیوں کو دور کرنا تھی نہ کہ عالم کے دوامی سکون کی اس لئے اس نے جو راہ معلوم کی وہ صرف ایک ہی دور کے لئے نفع بخش ہو سکتی تھی۔ اب ہم ذیل میں بدھا کے ان اصولوں کو اختصاراً عرض کئے دیتے ہیں جو "آریائی طریقہ" کے آٹھ اصولوں کے نام سے موسوم ہیں۔ پہلا اصول صحیح فکر۔ گوتما نے اپنے خیالات و فکر کی جانچ کو نہایت ضروری خیال کیا۔ چنانچہ اس نے اپنے پیروؤں کی صداقت کی کافی چھان بین کی۔ صحیح فکر کے بعد دوسرا درجہ اُس نے صحیح تمناؤں کو دیا۔ اس لئے کہ فطرت کسی مقام پر بھی خلا باقی نہیں رہنے دیتی اور جب بری خواہشات کو نکال دیا جائے تو پھر دوسری خواہشات کو اُن کی جگہ یقینی ملنا چاہیئے جیسے دوسروں کی خدمت کا ذوق، انصاف کرنے کی خواہش۔ تیسرا اصول صحیح گفتگو، چوتھا نیک چال چلن اور پانچواں جائز ذریعہ معاش کا پیدا کرنا تھا۔ اس فہرست میں چھٹا اصول صحیح سعیٔ عمل تھا۔ اس راستہ کا ساتواں عنصر باخبر رہنا تھا جس کا منشا یہ تھا کہ انسان غفلت میں نہ پڑ جائے اور ہمیشہ ہر پہلو سے ہشیار رہے اور سب سے آخری صحیح جوش یا جذبہ یا ایقان تھا جو مرکز خیال کی آخری حد سمجھا جاتا ہے۔ اس کے اصولوں میں "کرما" نہایت اہمیت رکھتا تھا لیکن اب یہ خیال جاتا رہا۔ خیال یہ کیا جاتا تھا کہ ہر فرد بشر جو اس زندگی میں کرتا ہے وہ دوسرے جنم میں راحت یا رنج، خوشی یا غم، مسرت یا کلفت کی صورت میں ظہور پذیر ہوا کرتا ہے اور جس سے سابقہ زندگی کا بھی پتہ چل سکتا ہے۔ اس زمانہ میں مسئلہ تناسخ ہندوستان میں کامل طور سے ہر ایک کے ذہن میں گھر کئے ہوئے تھا اور آج بھی اہل ہنود میں باقی ہے برخلاف اسلام کے جس میں انسانی حیات کے مقررہ ایام ہیں جہاں انسان کو خیر و شر کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے اور اُسے اختیار دیا جاتا ہے کہ اس میں سے جس کسی کو چاہے اختیار کر لے اور اس دُنیا سے گذرنے کے بعد اسے ایک ایسی حیات ابدی حاصل ہوتی ہے جو کبھی ختم نہ ہونے والی ہوتی ہے اسے ان تمام اعمال کا جواب دہ ہونا پڑتا ہے جو وہ یہاں کرتا ہے لیکن جہاں شکلوں کی تبدیلی مذہبی عناصر کا جزو لازم بن گئی ہے وہاں سزا و جزا صرف اس دنیا میں مختلف روپ بدلنے سے وقوع پذیر

ہوتے ہیں جو ایک گونہ فطرت سے ہٹی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔

بُدھ مت کی تعلیم اس کے کچھ ہی عرصہ بعد کچھ اس طرح مسخ ہو کر رہ گئی کہ اصولِ فطرت کے مغائر بن گئی چنانچہ ان کے ایک فرقہ کو ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اپنی ناکوں پر کپڑا اس وجہ سے ڈھانک لیتے ہیں کہ فضا کے منتشر جراثیم ان کی ناک کے ذریعہ اُن کے جسم میں داخل ہو کر ہلاک نہ ہو جائیں یہ واقعہ ہے کہ جب تک انسان دُنیا کے حوادث کا مقابلہ نہ کرے اپنی مقابل قوتوں کو پست نہ کر دے اس وقت تک وہ زندہ نہیں رہ سکتا تو پھر ہر چیز سے بچ کر اور کسی کو گزند پہنچائے بغیر زندگی بسر کرنا انسانیت کے درجہ سے انسان کو گرا دیتا ہے۔ ایک اور خبر جو قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ گوتم بدھ نے انسان کو جس پستی اور ذلت سے نکال کر رفعت و بلندی تک پہنچانے کی سعی کی تھی اس کے پیروؤں نے اس تعلیم کو بھلا دیا اور اس درخت کے پتے بطور تعظیم بلکہ بطور پرستش اپنے گھروں میں رکھنے لگے جس کے نیچے گوتم بیٹھا کرتا تھا نہ صرف اسی پر اکتفا کی بلکہ ہر پیپل کے درخت کی عظمت کی جانے لگی۔ اس لئے کہا گیا کہ مہاتما بُدھ پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے اور اسی کے نیچے انہیں خداوند تعالیٰ کی تجلی نظر آئی تھی۔

بودھی درخت

جس درخت کے نیچے گوتم بدھ کو تجلیٔ حق نظر آئی تھی اس درخت کا ایک زمانہ تک خاص خیال رکھا جاتا تھا اور وہ درخت "بودھی درخت" کہلاتا تھا لیکن اُس کا اب کہیں پتہ نہیں البتہ اس کی ایک شاخ لنکا میں بمقام انورادھا پور ۲۴۵ ق۔م میں لگائی گئی تھی جو اب بھی وہاں موجود ہے۔ یہہ درخت تاریخی حیثیت سے دنیا کے تمام درختوں میں قدیم ترین مانا جاتا ہے اب تک اس درخت کی خاص طور سے نگہداشت کی جاتی ہے چنانچہ اس کی بڑی شاخوں کو ستونوں کا سہارا دے کر کھڑا کیا گیا ہے اور اس کی جڑوں میں سے نئی نئی کونپلیں اب بھی پھوٹتی ہیں۔ ہم اگر حقیقت پر نظر ڈالیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ دُنیا اصل کو پیچھے ڈال کر اس کی ضمنی چیزوں کی بہت قدر کیا کرتی ہے جیسا کہ گوتم بدھ کے اصولوں کو تو لوگوں نے ایک طرف رکھ دیا لیکن اس درخت کی شاخ کی اتنی حفاظت اور نگہداشت کی جا رہی ہے۔

گوتم نے برہمنوں کے خود ساختہ دیوتاؤں سے عالمِ انسانیت کو محفوظ رکھنے کے لئے مخالفت کی آواز بلند کی تھی لیکن اس کے پیروؤں نے خود مہاتما بدھ کے بُت بنا کر اُس کی پرستش شروع کر دی۔

"ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا"

محمد حامد علی
سال سوم (آنرز)

نسوان آباد

ہماری دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ نہ اس کی ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم۔ اگر ہمیں کچھ معلوم ہے تو صرف اتنا کہ یہ سورج کے اطراف مسلسل چکر کاٹ رہی ہے۔ اس نے اب تک اپنے کتنے چکر ختم کرلئے ہیں یا اس کے ابھی اور کتنے چکر باقی ہیں یہ سوچنے ہی سے ہمیں چکر آجاتی ہے لیکن یہ عقدہ حل نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں رہنے سے ہمیں ایک اور تجربہ یہ بھی ہوا ہے کہ یہاں ہمیشہ ایک چیز کا راج نہیں رہتا ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض چیزیں جلدی بدل جاتی ہیں اور بعض دیر میں۔ یہاں دن طلوع ہوتا ہے تو رات کو دور کرکے اور رات آتی ہے تو دن کو شکست دے کر۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ یہ تبدیلی ایک دم نہیں ہوتی بلکہ رفتہ رفتہ ایک چیز دوسری چیز پر مسلط ہوتی جاتی ہے۔ دن رات کو شکست دے کر پھولا نہیں سماتا۔ اس کے چہرے پہ ہلکی سی خوشگوار مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے، جو آہستہ آہستہ ہنسی میں بدل جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ نصف النہار پر پہنچ کر قہقہے لگانے لگتا ہے گویا کہہ رہا ہو کہ دیکھو میں نے کیسی شاندار کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن اس کے یہ قہقہے ابھی فضا میں گم ہونے بھی نہیں پاتے کہ رات اور دن کی کشمکش پھر شروع ہوجاتی ہے دن کو محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت اس کو اپنی حکومت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اداس ہوجاتا ہے، اور جیسے جیسے اس کی حکومت اس سے چھنتی جاتی ہے وہ غمگین ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ رات اپنی فتح کا اعلان کردیتی ہے اور وہ سسکیاں لیتا ہوا غائب ہوجاتا ہے۔ یہ تبدیلی چونکہ صرف چوبیس گھنٹوں میں ہوتی ہے اس لئے ہم کو بہت جلد اس کا احساس ہوجاتا ہے لیکن بعض تبدیلیاں ایسی بھی ہیں جو لاکھوں اور کروڑوں برسوں سے آہستہ آہستہ عمل میں آرہی ہیں اور اسی لئے ہمیں انکا احساس نہیں ہے اب عورت اور مرد کے تعلقات ہی کو لیجئے۔ جب عورت اور مرد نے اس دنیا میں جنم لیا تو اس وقت ان کے باہمی تعلقات ایسے ہی تھے جو ایک پجاری اور دیوتا میں ہوتے ہیں۔ عورت مرد کے سامنے اسی طرح سر جھکاتی تھی اور اس کو اسی طرح دیوتا مانتی تھی جس طرح کہ آج ایک پجاری اپنے بھگوان کو مانتا ہے اور اس کے آگے سربسجود ہوتا ہے۔ دن گزرتے گئے، جس کا مطلب ہے کہ صدیاں گزرتی گئیں اور عورت اور مرد کے تعلقات میں بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ عورت کو اپنی قابلیت کا احساس ہونے لگا اور نتیجہ کے

طور پر اس کے نزدیک مرد کا درجہ کم ہوتا گیا حتیٰ کہ آج کل آپ دیکھ رہے ہیں کہ عورت مرد کی برابری کا دعویٰ کر رہی ہے۔ اسی طرح چند صدیاں اور گذر جائینگی اور آہستہ آہستہ ممکن ہے کہ عورت کو مرد پر فضیلت حاصل ہو جائے۔ جب وہ زمانہ آئے گا تو لازمی طور پر مردوں کی طرح عورتیں بھی اپنی اپنی حکومتیں قائم کریں گی اور مردوں کی طرح راج کریں گی۔ ان ریاستوں میں مردوں کا وہی درجہ ہوگا جو اب عورتوں کا ہے۔ یہاں ایک چیز یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ شروع شروع میں جب عورتوں کی ریاستیں قائم ہوں گی تو دنیا میں مردوں کی ریاستیں بھی باقی رہیں گی۔ کیونکہ ایک دم ساری دنیا میں عورتوں کا راج قائم ہو جانا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں تبدیلیاں آہستہ آہستہ ہوتی ہیں۔

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ عورتوں کی ریاستیں کیسی ہونگی اور وہاں کے انتظامات کیسے ہوں گے تو یہ اسکیچ ملاحظہ فرمائیے۔ سہولت کی خاطر پہلے یہ فرض کر لیجئے کہ ہندوستان میں عورتوں کی یہ پہلی ریاست ہے جس کا نام نسوان آباد ہے اور جس کا پایہ تخت نور جہاں پور۔

پہلا سین

[نسوان آباد کی ٹرین معمولی رفتار سے نور جہاں پور کی طرف جا رہی ہے اور اسٹیشن کی بلڈنگ دور کچھ دھندلی سی نظر بھی آ رہی ہے۔ اس ٹرین میں ہندوستان کے مشہور سیاح مسٹر ناصر سفر کر رہے ہیں۔ وہ پہلی بار اس ریاست کا دورہ کر رہے ہیں اس لئے نسوان آباد کی حکومت کی طرف سے ان کا استقبال کیا جانے والا ہے۔ یکایک ٹرین اسٹیشن سے ایک دو میل کے فاصلے پر رک جاتی ہے اور مختلف ڈبوں سے عورتیں اتر کر ادھر ادھر دوڑنے لگتی ہیں۔ مسٹر ناصر کی سمجھ میں نہیں آتا۔ مجبوراً ایک گزرتی ہوئی بوڑھی عورت کو روک کر اس سے دریافت کرتے ہیں۔]

ناصر۔ کیوں بڑی بی یہ ٹرین کیوں رک گئی کہیں کسی شخص نے خودکشی تو نہیں کر لی۔

عورت۔ خدا نہ کرے میاں! بھلا کوئی خودکشی کیوں کرے؟

ناصر۔ اوہ! میں نے خیال کیا کہ شاید کسی غیرت مند شخص نے اپنی بیوی کے سلوک سے تنگ آ کر یا اپنی بے عزتی برداشت نہ کر کے پٹری پر اپنا سر رکھ دیا ہو۔

عورت۔ میاں تم ہوش میں بھی ہو؟ اگر کوئی پولیس کی عورت یہ سن لے کہ تمہارے خیالات ایسے ہیں تو ابھی تم جیل میں نظر آؤ گے۔ کان کھول کر سن لو۔ اس ریاست میں تم جیسا سر پھرا اور باغی خیالات کا مرد نہیں رہتا۔ یہاں تو وہی مرد رہتے ہیں جو عورتوں کی برتری کو مانتے ہیں۔ اور فرمانبرداری

ہے امن کے ساتھ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔

ناصر۔ آخر میں نے ایسی کیا خلاف قانون بات کہہ دی کہ تم مجھے باغی خیالات کا کہہ رہی ہو؟

عورت۔ اے لو! ایسا بھی کیا بھولا پن۔ ابھی تم نے کہا کہ کسی غیرت مند نے اپنی بے عزتی کی وجہ سے خودکشی کی ہوگی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم ہماری حکومت میں رہنے کو بے غیرتی اور بے عزتی سمجھتے ہو۔ اگر یہی خیالات تم نے اور دوسرے بھولے بھالے مردوں سے کہہ دیئے تو معلوم ہے کیا ہوگا؟ ریاست میں ایک نہ ایک دن بغاوت ہو جائے گی۔

ناصر۔ اچھا بھئی اس چیز کو جانے دو اور یہ بتلاؤ کہ اب یہ اور کیا نئی آفت آگئی کہ گاڑی پانچویں بار اس طرح راستے میں ٹھہرائی گئی۔

عورت۔ اے ہے! تم یہ آفت، مصیبت اور نہ جانے کیا کیا کہے جا رہے ہو۔ آخر بات کیا ہے جو اتنے برہم اور پریشان نظر آ رہے ہو۔

ناصر۔ بڑی بی۔ پریشان تو میں اس وقت سے ہوں جب سے کہ اس ریاست کی سرحد میں قدم رکھا ہے تم اس کی فکر نہ کرو اور اپنی شاعری چھانٹنے کی بجائے صرف اتنا بتا دو کہ ٹرین یہاں کیوں روکی گئی ہے۔

عورت۔ اے لو! کیا میں نے گناہ کیا کہ تمہاری حالت تم ہی سے کہہ دی۔ تم خفا ہوتے ہو تو جانے دو ہاں تو گاڑی اس لئے روکی گئی ہے کہ گارڈ صاحبہ کا ننھا بہت رو رہا ہے اور وہ اس کو چپ کروانے کی کوشش کر رہی ہیں اصل میں بات یہ ہے کہ یہ ننھا انجن چلانے والی سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ کسی بات پر اتفاق سے اس کی یاد آ گئی اور اس کے پاس جانے کے لئے ضد کر کے رونے لگا گارڈ صاحبہ بہت دیر تک اس کو منانے کی کوشش کرتی رہیں لیکن وہ بھی اپنی ماں کا بچہ ہے! کسی طرح سے چپ نہ ہوا۔ مجبوراً گاڑی کو روک کر انجن چلانے والی کو بلانا پڑا۔ اب وہ بیچاری گارڈ صاحبہ کے ڈبے میں گئی ہے۔ بچے کو منا کر سلانے کے بعد وہ انجن واپس جائے گی اور تب گاڑی چلے گی۔

ناصر۔ لاحول ولا قوۃ! یہ بھی کوئی بات ہے۔

عورت۔ واہ میاں۔ اسمیں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ ایسی چھوٹی موٹی باتیں تو ہمیشہ ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اگر اس طرح سے ہر کوئی لاحول پڑھنے لگے تو کام کیسے چلے گا۔

ناصر (کچھ سنبھلکر) ارے بڑی بی تم غلط سمجھیں۔ میں تو لاحول اپنے اوپر پڑھ رہا تھا کہ اتنی معمولی

سی بات بھی نہ سمجھ سکا۔ تم سچ کہتی ہو اگر انسان دوسروں کا خیال نہ رکھے تو وہ انسان ہی کیا
اب میں سمجھا کہ ٹرین اس سے پہلے چار پانچ بار راستے میں کیوں رک گئی تھی۔ واقعی تمہارے
ملک کا کتنا اچھا قانون ہے کہ جو چاہے اور جہاں چاہے گاڑی رکوا سکتا ہے۔

عورت۔ تم کسی دوسرے ملک کے معلوم ہوتے ہو اور شاید پہلی بار ہماری ریاست میں آئے ہو۔

ناصر۔ یہی تو میری بدنصیبی ہے!

عورت۔ جب ہی تو تم برقعہ نہیں اوڑھتے۔

ناصر۔ (تعجب سے) بڑی بی تمہاری آنکھیں کمزور تو نہیں؟ میں مرد ہوں۔

عورت۔ اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ تم کو اصولاً برقعہ اوڑھنا چاہیئے۔ یہاں کے تمام باعزت مرد برقعہ
اوڑھتے ہیں۔ شاید تم اب تک اس چیز سے بھی بے خبر ہو۔

ناصر۔ (جل کر طنزیہ لہجہ میں) یہی تو میری بدقسمتی ہے کہ اس ریاست کے متعلق بغیر کسی قسم کی معلومات کے
میں یہاں چلا آیا۔ اگر پہلے ہی تمام چیزوں سے واقف ہوتا تو تم لوگوں کو اس طرح تکلیف
دینے کی نوبت نہ آتی۔

[گاڑی سیٹی دیتی ہے اور عورتیں بدحواسی سے دوڑتی ہوئی اپنے ڈبوں میں داخل ہو جاتی ہیں]

ناصر۔ (اپنے آپ میں) اپنے ان تمام دوستوں کو دعائیں دیتا ہوں جنہوں نے مجھے یہاں جانے پر
مجبور کیا۔ واللہ جب سے اس ریاست میں داخل ہوا ہوں اپنے آپ کو کچھ بے وقوف سا
محسوس کر رہا ہوں۔ اگر اپنے وطن پہنچتے پہنچتے پاگل ہو گیا تو فوراً اپنے ان دوستوں پر دعویٰ
دائر کر دوں گا۔ آخر انہوں نے مجھے سمجھا کیا ہے۔

(گاڑی نور جہاں پور کے پلیٹ فارم پر رکتی ہے اور پلیٹ فارم پر ٹھہری ہوئی عورتیں اپنے
شوہروں کو لے کر مردانے ڈبے کی طرف دوڑتی ہیں۔ تمام مرد برقعے اوڑھے ہوئے ہیں اور
چونکہ ٹرین میں مردانی ڈبہ صرف ایک ہی ہے اس لئے وہاں کثیر مجمع ہے۔ قلی عورتیں اسباب
اٹھانے کے لئے ڈبوں کے پاس آکر اندر جھانک رہی ہیں۔ دو تین عورتیں ناصر کے ڈبے پر بھی آتی ہیں)

پہلی عورت۔ (ناصر سے مخاطب ہو کر) صاب سامان اُتاروں؟

ناصر۔ (ادھر ادھر بےچینی سے دیکھتے ہوئے جیسے کسی کو تلاش کر رہا ہو) ہاں۔ ہاں! یہ دیکھو دو ٹرنک
ہیں اور ایک بستر۔ جلدی سے ان کو نیچے اتارو۔

دوسری عورت۔ (ڈبے میں داخل ہو کر اور ٹرنکس کو دیکھ کر جو معمولی سائز کے ہیں اور عموماً ہر جگہ استعمال کئے جاتے ہیں)

ارے باپ رے! یہ سامان ہے آپکا! یہ آپکے ٹرنک ہیں یا..... ! اور یہ ہولڈال! ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کے سارے خاندان کا بستر اسی میں بندھا ہوا ہے۔ نا با با نا! ہم سے تو یہ سامان نہ اٹھایا جائے گا.... اور ہم ہی پر کیا موقوف ہے اور کوئی قلی عورت بھی اس کو نہ اٹھائیگی۔ صاحب ہم کو تو معاف کیجئے۔ (دونوں عورتیں ایک دوسرے کو تعجب سے دیکھتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور ناصر کچھ پریشان سا کھڑا رہتا ہے کہ آٹھ دس عورتیں نہایت بھڑکیلے لباس پہنے اور سنگھار سے آراستہ مسکراتی ہوئی ناصر کے پاس پہنچتی ہیں۔ ان میں سے ایک جو سب سے آگے آگے ہے ناصر سے مخاطب ہوتی ہے)

عورت ۔ معاف کیجئے۔ اگر میں غلطی پر نہیں تو میں مسٹر ناصر سے مخاطب ہوں۔

ناصر ۔ آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ ناچیز ہی کو ناصر کہتے ہیں۔

عورت ۔ اور مجھے آپ مس نسیم شرافت اللہ کے نام سے یاد فرما سکتے ہیں۔ میں حکومت نسواں آباد کی طرف سے آپ کا استقبال کرتی ہوں اور اُمید کرتی ہوں کہ آپ اپنی سیاحت سے زیادہ سے زیادہ محظوظ ہوں گے۔

ناصر ۔ بہت بہت شکریہ گذشتہ چند گھنٹوں میں ٹرین میں بیٹھکر میں نے جو سیاحت کی ہے اس سے تو قوی اُمید ہے کہ آپ کی اُمید بالکل صحیح ثابت ہوگی۔

نسیم ۔ مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ میں ٹھیک وقت پر آپکا استقبال نہیں کر سکی۔

ناصر ۔ اوہ! شاید ٹرین وقت سے پہلے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔

نسیم ۔ (جلدی سے) جی ہاں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے بڑا افسوس ہے آپ کو چند منٹ یہاں کھڑے رہنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑی۔

ناصر ۔ یہ کیا فرما رہی ہیں آپ بھلا تکلیف اور آپ کے ملک میں یقین جانئے جس گھڑی آپ کی ریاست میں داخل ہوا ہوں۔ اس وقت سے ایک گونہ فرحت اور راحت محسوس کر رہا ہوں۔

نسیم ۔ شکریہ۔ راستے میں کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہوئی آپ کو؟

ناصر ۔ جی بالکل نہیں۔ ماشاء اللہ آپ کے پاس کا ریلوے انتظام اس قدر عمدہ اور باقاعدہ ہے...

نسیم ۔ (مسکراتے ہوئے) شکریہ! بہرحال یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپکا سفر اچھا گذرا....... اچھا تو اب تشریف لے چلئے۔ آپ یقیناً بہت تھک گئے ہوں گے۔

(ناصر اپنے کندھوں کو ہلکی سی جنبش دے کر اور ایک لمبی سانس لے کر گویا کہہ رہا ہو کہ سے

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا' نسیم اور دوسری عورتوں کے ساتھ جاتا ہے)

دوسرا سین

[نسواں آباد کا کونسل ہال جہاں ریاست کے تمام وزرار ایک اہم اجلاس کی وجہ سے جمع ہیں۔ اس اجلاس کی صدارت ریاست کی وزیر اعظم مس زرینہ ناہید کر رہی ہیں۔ مسٹر ناصر کو بھی اس اجلاس میں خاص طور پر شریک کیا گیا ہے تاکہ وہ اس حکومت کی پالیسی اور اس کے انتظامات کو سمجھ سکیں]

ناہید۔ (وزرا کو مخاطب کرکے) معزز خواتین جیسا کہ آپ لوگوں کو اطلاع دی گئی ہے آج ایک نہایت ہی اہم مسئلہ میں مشورہ دینے کے لئے آپ لوگوں کو تکلیف دی گئی ہے۔۔۔۔ (ایک وزیر کی طرف دیکھکر) ۔۔۔کیوں مس کپاڈیا تم کچھ بے چین سی نظر آرہی ہو۔ خیریت تو ہے؟

کپاڈیا۔ کیا عرض کروں۔ میری قسمت میں تو چین لکھا ہی نہیں ہے۔ جب دیکھئے کوئی نہ کوئی مصیبت ہمیشہ پیچھے لگی رہتی ہے۔

ناہید۔ چونکہ تم حال میں وزیر ہوئی ہو اس لئے شاید کام میں دشواری پیش آرہی ہے۔

کپاڈیا۔ یہاں پچھلے ایک ماہ سے مجھے گھر کی پریشانیوں سے کب چین ملا ہے جو میں اپنے کام کی طرف توجہ کرتی۔ اپنے نئے عہدہ کا جائزہ لینے کے بعد سے مجھے اتنی بھی فرصت نہیں ملی کہ کم از کم اپنے فرائض جان سکوں۔

شانتی۔ ہاں بہن۔ سچ کہتی ہو۔ یہاں تقریباً ہم سب کا یہی حال ہے۔ چار روز سے میری بچی کو بہت سخت بخار ہے اور میں اسی کی فکر میں لگی ہوئی ہوں۔ خدا نے مجھے ایک ہی بچی دی ہے اور اسی سے میرا نام روشن ہونے کی ساری توقعات وابستہ ہیں۔ آپ لوگ بھی دُعا کیجئے کہ اُس کو جلد شفا ہو جائے۔

پروین۔ آمین بہن آمین۔

شانتی۔ الزبتھ بہن بہت خاموش بیٹھی ہیں۔

الزبتھ۔ کیا کہوں بہن آجکل میں اپنے لڑکے کی شادی کی فکر میں لگی ہوئی ہوں لیکن کوئی موزوں لڑکی نہیں مل رہی ہے۔

کپاڈیا۔ واہ بہن واہ۔ تم نے اس سے پہلے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہ کیا ورنہ میں یوں چٹکیوں میں

لڑکی تلاش کر دیتی۔ اب بھی میری نظر میں دو چار لڑکیاں ہیں جو تمہارے لڑکے کے لئے یقیناً موزوں ثابت ہوں گی۔ تم کہو تو ان کے والدین سے بات چیت شروع کر دوں۔

(ابھی یہ گفتگو جاری ہی رہتی ہے کہ ناصر بے چین ہو کر ناہید سے مخاطب ہوتا ہے)

ناصر۔ معاف کیجئے۔ آج کے اجلاس میں شاید کونسل کے ممبر اپنے خانگی معاملات پر گفتگو کرنے والے ہیں۔

ناہید۔ (کچھ جھینپ کر) جی نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اتفاقاً گفتگو شروع ہوگئی تو میں نے خیال کیا کہ چند منٹ اس میں صرف ہوں تو کوئی ہرج نہ ہوگا۔

ناصر۔ جی ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔ اس کے علاوہ کونسل کے ممبر بھی شاید بہت دنوں کے بعد ایک جگہ جمع ہوئے ہیں اس لئے اپنی اپنی آپ بیتی سنانا تو ان کے لئے ایک فطری چیز ہے۔

ناہید۔ جی ہاں۔ آپکا اندازہ بھی ٹھیک ہے۔ ایک زمانے کے بعد آج تمام ممبر میٹنگ میں شریک ہوئے ہیں ورنہ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ بعض ممبر کسی نہ کسی مجبوری کی وجہ سے میٹنگ میں شریک نہیں ہو سکتے (سب کو مخاطب کر کے) معزز خواتین! اب باضابطہ اجلاس کی کارروائی شروع کی جاتی ہے۔ آج اصل میں آپ تمام کو ہماری شہزادی صاحبہ کی شادی کے مسئلہ میں مشورہ کے لئے بلایا گیا ہے آپ میں سے اکثروں کو شاید ابھی تک اس بات کی اطلاع نہیں ہے کہ اس شادی کا معاملہ اب بہت پیچیدہ ہوگیا ہے اور آپ تمام مدبرین اور سیاست دانوں کی رائے کے بغیر اس کا سنبھلنا ذرا مشکل نظر آتا ہے۔

پروین۔ صدر صاحبہ۔ مجھے تو اب تک اس کی بھی اطلاع نہ تھی کہ شہزادی صاحبہ کی شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔ کیا آپ یہ بتلانا گوارا کریں گی کہ شادی کس ملک کے شہزادے سے ہونے والی ہے۔ اور اس میں اب کس قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں؟

ناہید۔ مجھے سخت تعجب ہے پروین کہ تم اپنی ریاست کے اہم ترین معاملات سے بھی اس طرح بے خبر رہتی ہو! خیر۔ مجھے مسٹر ناصر کی خاطر اس مسئلہ کو شروع سے بیان کرنا ہی تھا۔ تم بھی سن لو... .. ہم کوئی تین ماہ سے اپنے پڑوسی ملک . . . سے شہزادی صاحبہ کی شادی کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں۔ وہاں کا شہزادہ ماشاء اللہ سے جوان ہوگیا ہے اور بہت حسین و جمیل بھی ہے ہم نے خیال کیا کہ اگر ہم نے بات چیت میں دیر کی تو کسی دوسرے ملک والے اس پر ڈورے ڈال کر پھانس لیں گے اور ہمارا زرین موقعہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

شانتی۔ لیکن اس شہزادے میں ایسی کونسی خاص بات ہے کہ سوائے اس کے ہماری شہزادی صاحبہ

کی شادی کسی اور سے نہیں ہو سکتی۔

ناہید۔ شانتی تم تو ہمیشہ کی بیوقوف ہو۔ بھلا تم اتنا بھی سوچ سکتیں کہ آس پاس کی ریاستوں میں یہ ملک ہی ایسا باقی رہ گیا ہے جہاں کے ولیعہد کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی اور تم جانتی ہی ہو کہ اگر دوسرے ملک میں شادی کرنا ہو تو سوائے وہاں کے ولیعہد کے اور کسی دوسرے شہزادے سے شادی کرنا بیکار ہے۔

کپاڈیا۔ لیکن کیا شہزادہ ہماری شہزادی صاحبہ کے لئے موزوں بھی ہے۔

ناہید۔ ہاں ہاں۔ ہر طرح سے موزوں ہے۔ نہایت اعلیٰ کردار اور نہایت اچھے اخلاق کا حامل ہے۔ اور اس کے علاوہ گانے اور پینٹنگ کا بھی بہت شوقین ہے۔ جب شہزادی صاحبہ اپنی والدہ کے بعد تخت و تاج سنبھالیں گی اور دن تمام حکومت کے کام کرتے کرتے تھک جائیں گی تو شہزادہ اپنے گانے اور پینٹنگ سے شہزادی صاحبہ کا دل بہلایا کرے گا ۔۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ حکومت کے کاموں میں بھی بہت مشاق ہے اور وقتاً فوقتاً اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔

بلقیس۔ لیکن میرے خیال میں اس آخری چیز کی ہم کو ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہماری شہزادی صاحبہ خود ماشاءاللہ سے بہت ذہین اور ہوشیار ہیں اور بخوبی اپنی حکومت کا کام کر سکتی ہیں۔

پروین۔ بلقیس ٹھیک کہتی ہیں۔ ہماری شہزادی صاحبہ کو اپنے شوہر کی رہنمائی اور رائے کی مطلق ضرورت نہ ہوگی اور میرے خیال میں اگر شہزادہ کچھ دخل دینا بھی چاہے تو وہ اسے پسند نہ فرمائیں گی۔

ناہید۔ ہاں یہ سب تو ٹھیک ہے اور ہماری حکومت اس شادی کو پسند بھی کرتی ہے لیکن پیچیدگیاں شہزادے کے ملک کی طرف سے ہو رہی ہیں۔

شانتی۔ آخر پیچیدگی کس بات کی؟

ناہید۔ اس ملک کی حکومت کا یہ کہنا ہے کہ شادی کے بعد وہاں کے رواج کے مطابق شہزادی صاحبہ ان کے ملک جائیں گی اور وہاں کی شہزادی بن کر رہیں گی۔

پروین۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے!

ناہید۔ یہی تو سوال ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ شادی کے بعد شہزادہ ہمارے ملک آ جائے کیونکہ ہمارے پاس کا یہی قانون ہے۔ شہزادی صاحبہ ایک تو اس وجہ سے وہاں نہیں جا سکتیں کہ انہیں

ہمارے ملک کی توہین ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اس ملک کی ولیعہد ہیں ۔ وہاں کی حکومت اس کا یہ جواب دیتی ہے کہ شہزادہ بھی اپنے ملک کا ولیعہد ہے ۔ اس لئے وہ اپنا ملک نہیں چھوڑ سکتا ۔

شانتی ۔ تو پھر آخر اس مسئلہ کو کس طرح حل کرنا چاہیئے ؟

ناہید ۔ اسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے یہ اجلاس منعقد کیا گیا ہے اور اس کے باوجود تم مجھ ہی سے سوال کرتی ہو کہ اس کو کس طرح حل کیا جائے اب تم ہی کہو کہ اپنے متعلق خود تمہاری کیا رائے ہے ۔

(شانتی جھینپ جاتی ہے اور سب مسکرانے لگتے ہیں)

بلقیس ۔ جب یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ ہو گیا ہے تو میرے خیال میں اس کو ختم ہی کر دینا چاہیئے ۔ اگر صدر صاحبہ اجازت دیں تو ایک تجویز پیش کروں ۔

ناہید ۔ آپ لوگوں کو پوری آزادی ہے کہ اپنی اپنی تجاویز پیش کریں ۔

بلقیس ۔ کیوں نہ شہزادی صاحبہ کی شادی ہماری ہی ریاست کی کسی بڑی رئیس کے لڑکے سے کر دی جائے ۔

پروین ۔ واقعی بلقیس بہن ٹھیک کہتی ہیں ۔ مجھے بھی ان کی رائے سے اتفاق ہے اور .... صدر صاحبہ ..... اگر اجازت ہو تو ...... میں ایک نام پیش کر سکتی ہوں ۔

ناہید ۔ لیکن اس معاملے میں مجھے تمام ممبروں کی رائے لینا ضروری ہے (تمام سے مخاطب ہو کر) کہیئے آپ لوگوں کو اس رائے سے اتفاق ہے ؟

سب ۔ (ایک زبان ہو کر) ہم کو اتفاق ہے ۔

ناہید ۔ اچھا تو پروین تم کوئی نام پیش کرنا چاہتی تھیں ۔

پروین ۔ (کچھ جھجکتے ہوئے) جی کیا عرض کروں ...... آپ تو میرے بیٹے شاہد سے بخوبی واقف ہی ہیں ۔

بلقیس ۔ واہ پروین واہ ۔ تجویز تو سب سے پہلے میں نے پیش کی اور مجھ سے پہلے ہی موقعہ دیکھکر تم نے نام پیش کر دیا ۔ اصولاً سب سے پہلے میری رائے لینی چاہیئے تھی ۔

ناہید ۔ بلقیس تم خفا کیوں ہوتی ہو ۔ تم کو بھی آزادی ہے ۔ تم بھی کوئی نام پیش کر سکتی ہو ۔

بلقیس ۔ اور صدر صاحبہ میں پروین سے پوچھتی ہوں کہ میرے لڑکے کے مقابلہ میں ان کا شاہد کس شمار میں ہے ۔ نہ صورت شکل ہی اچھی نہ عادات و اطوار ہی اچھے اس صورت پر یہ چلی ہیں اس کا نام پیش کرنے ۔

پروین ۔ صدر صاحبہ ۔ یہ میری توہین کر رہی ہیں ۔ ان کو سمجھا دیجئے کہ میرے منہ لگنا ان کے لئے

اچھا نہ ہوگا۔

بلقیس - اے ہے۔ ان کا منہ تو دیکھو۔ آخر کیا کریں گی یہ میرا۔

ناہید ذرا ٹھہریئے تو . . . . . .

پروین ۔صدر صاحبہ اب آپ بیچ میں نہ آیئے حقیقت میں اب یہ بہت آگے بڑھ گئی ہیں اور میں ان کو کبھی معاف نہیں کر سکتی ۔

بلقیس - کون پروا کرتا ہے تمہاری جو کوئی تم سے معافی بھی چاہے گا۔ منہ دھو آؤ کہیں سے تب کہیں بات کرنا۔

شانتی ۔(بلقیس سے مخاطب ہوکر) بہن تمہارا لڑکا بھی کونسا پری پیکر ہے جو تم بیچارے شاہد کو اور اس کی ماں کو اس قدر برا بھلا کہہ رہی ہو ۔

کپاڈیا۔ شانتی تم بیچ میں کیوں پڑتی ہو۔ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا تو تمہاری پرانی عادت ہے۔

شانتی ۔اے لو اب یہ بنو بھی چہکنے لگیں۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ میری گفتگو میں آن کودو۔ میں نے جو صحیح بات تھی وہ بلقیس سے کہی۔ شاید تم بھی بلقیس کے لڑکے کی طرفدار ہو۔

کپاڈیا۔ تو اس سے تمہارا مطلب ؟ یقیناً میں بلقیس کے لڑکے کو شاہد پر ترجیح دیتی ہوں۔ تم کیوں نہ ترجیح دوگی۔ بلقیس ہی نے تو سفارش کرکے تمہیں ترقی دلوائی تھی ۔

ناہید۔ یہ آپ لوگ آپس میں اس طرح لڑتی رہیں گی تو کام کیسے چلے گا۔

کپاڈیا۔ نہیں صدر صاحبہ ہمیں آپ معاف کیجئے۔ جب تک اس جھگڑے کا تصفیہ نہ ہو جائے گا اس وقت تک ہم اور کوئی کام نہیں کر سکتیں ۔

ناہید۔ اگر یہی بات ہے تو جلسہ برخاست کیا جاتا ہے۔ آپ لوگ تشریف لیجا سکتی ہیں۔

[سب کی سب اٹھ کھڑی ہو جاتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کو غصہ سے گھورتی اور جلے کٹتی ہال سے باہر چلی جاتی ہیں۔ صرف ناہید اور ناصر ہال میں رہ جاتے ہیں۔ کچھ سکنڈ کی خاموشی کے بعد ناصر ناہید سے مخاطب ہوتا ہے]

ناصر۔ کیا میں ایک سوال کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں ۔

ناہید۔ شوق سے ارشاد فرمایئے۔

ناصر۔ آپ شہزادی صاحبہ کی شادی کسی ملک کے ولیعہد ہی سے کیوں کرنا چاہتی ہیں؟ میرے خیال میں کسی اور شہزادے سے کرنے میں تو کوئی قباحت نہیں ہے۔

ناہید۔ جی نہیں قباحت ہے . . . . . ہماری موجودہ پالیسی میں ایک بہت بڑا راز ہے جو کسی سے

نہیں کہا جا سکتا۔ ... لیکن خیر اگر آپ وعدہ کریں کہ اس کو اپنی حد تک ہی رکھیں گے تو میں وہ راز بھی بیان کر سکتی ہوں۔

ناصر۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ مجھ پر پورا بھروسہ کر سکتی ہیں۔

ناہید۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم اپنی ریاست کو رفتہ رفتہ بڑھانا چاہتے ہیں اور ایسا کرنے کا ایک راستہ یہی ہے کہ ہماری ولیعہد شہزادیوں کی شادیاں آس پاس کے ملکوں کے ولیعہدوں کے ساتھ کریں ہماری ریاست کے قانون کے مطابق جب اس شہزادے کے والد کا انتقال ہو جائیگا تو بجائے شہزادہ وہاں کا بادشاہ بننے کے ہماری شہزادی وہاں کی حکمران ہو جائیگی۔ اس طرح ہم دوسری ریاستوں کو اپنی ریاست میں شریک کرتے جائیں گے اور اگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو آپ دیکھیں گے کہ ہماری ریاست جلد ہی دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جائے گی۔

ناصر۔ (مسکراتے ہوئے) آپکی پالیسی تو بہت دوراندیشانہ ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اس میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوگی ... اچھا ایک سوال اور۔

ناہید۔ فرمائیے۔

ناصر۔ آپ نے ابھی ابھی کونسل میں فرمایا تھا کہ کسی ملک سے شادی کی گفت و شنید جاری ہے۔ اگر وہاں سے آپ کو نفی میں جواب ملجائے تو اس ملک کے ساتھ آپکی پالیسی آئندہ کیا ہوگی۔

ناہید۔ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ لازمی طور پر ہم اس ملک سے اعلان جنگ کر دیں گے۔

ناصر۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ پہلے ہی سے جنگ کے لئے تیار ہیں اور آپ کو آپکو کامیابی کی بھی اُمید ہے۔

ناہید۔ یقیناً! ہماری فوج کی ٹریننگ اتنی باضابطہ اور اس قدر نئے طریقوں پر ہوی ہے کہ ہم کو اپنی کامیابی کی سولہ آنے اُمید ہے۔ شاید ہماری فوج کا معائنہ آپ نے ابھی تک نہیں کیا۔

ناصر۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کا مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ اور اب تو وقت بھی نہیں ہے کیونکہ کل مجھے آپکا سب سے مشہور کالج دیکھنا ہے اور پرسوں صبح میں یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔

ناہید۔ اگر کچھ دیر اور آپ ٹھہر سکتے ہیں تو میں مختصر طور پر اپنی فوج کے متعلق کچھ بیان کر سکتی ہوں۔

ناصر۔ میں آپ کا مشکور رہوں گا

ناہید۔ آپ کے ملک میں تو فوج مردوں کی ہوتی ہے لیکن ہمارے پاس تمام فوج عورتوں پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ سنا جاتا ہے کہ آپ کے پاس روز بروز نئے نئے سائنٹفک حربے ایجاد ہوتے رہتے ہیں لیکن ہم سائینسدانوں کی بجائے ہندوستان کے قدیم شاعروں کے مرہون منت ہیں۔ انہوں نے اپنے دیوانوں میں دشمن کو مغلوب کرنے کے ایسے مفید اور کارآمد نسخے چھوڑے ہیں کہ ہماری ریاست ان کو قیامت تک نہیں بھلا سکتی۔ آپ کے اور ہمارے آباؤ اجداد نے بھی ان دیوانوں کو پڑھا لیکن ان کو کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

ناصر۔ لیکن میرے خیال میں ہندوستان کے اکثر شاعروں نے سوائے عشقیہ اشعار کے اور کچھ نہیں کہا۔

ناہید۔ یہی تو آپ لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد بھی ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ ہندوستان کے شاعروں نے سوائے دروغ گوئی اور مبالغہ آمیزی کے اور کچھ نہیں کہا چنانچہ لفظ شاعری اتنا بدنام ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی مبالغہ کیا تو فوراً کہہ دیا گیا کہ جناب شاعری کر رہے ہیں۔ لیکن میں ثابت کر سکتی ہوں کہ جو لوگ ہمارے شاعروں کو برا بھلا کہتے ہیں وہ سراسر غلطی پر ہیں۔

ناصر۔ میں آپ کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں۔

ناہید۔ اگر آپ نے شاعروں کے دیوان کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے تیکھی چتون اور آنکھوں سے تیر برسانے کا ذکر بار بار کیا ہے۔

ناصر۔ عشقیہ اشعار سے میرا بھی یہی مطلب تھا کہ انھوں نے سوائے اس قسم کے لغو اشعار کے اور کچھ نہیں لکھا۔

ناہید۔ یہی تو آپ کی غلطی ہے کہ آپ ان اشعار کو لغو سمجھتے ہیں حالانکہ ان اشعار میں ان کا ایک زبردست پیغام چھپا ہوا ہے وہ ان اشعار میں ہم کو تعلیم دیتے ہیں کہ اپنی آنکھوں کو کام میں لا کر اپنے دشمن کو مغلوب کرو۔

ناصر۔ میرے خیال میں یہ بھی بالکل غلط بات ہے۔ کم از کم جنگ میں صرف اپنی آنکھوں سے دشمن کو مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔

ناہید۔ جی نہیں آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔ ہم نے اپنے شاعروں کی تعلیم سے فائدہ اٹھا کر ان کی تجاویز کو عملی جامہ پہنایا اور تجربہ کے طور پر ایسے فوجی ٹریننگ اسکول کھولے جہاں صرف آنکھوں سے لڑنا سکھایا جاتا ہے۔ کافی مشق کے بعد جب فوجی طالبعلموں کا امتحان لیا گیا تو نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ چنانچہ اب ہر جگہ ایسے اسکول کھول دیئے گئے

ہیں اور تمام فوجیوں کو یہی تعلیم دی جاتی ہے۔ کافی مشق کے بعد آنکھوں کے یہ تیر اتنے زہریلے ہو جاتے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط دل والا دشمن بھی پسیج جاتا ہے اور اپنے ہتھیار ڈال دیتا ہے ..... ہمارے اس مشہور حربے کو آئندہ جنگ میں بہت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جائے گا۔

ناصر۔ ابھی آپ نے فرمایا کہ مضبوط' دل' والا شخص بھی ہتیار ڈال دیتا ہے اگر کسی شخص کا دل ہی نہ ہو یا اگر وہ اپنا دل پیچھے اپنی بیوی کے پاس چھوڑ آیا ہو تو شاید ایسے دشمن کو زیر کرنے میں آپ کی فوج کو بہت دشواری ہوگی۔

ناہید۔ اس صورت میں بھی ہم کو مطلق دشواری نہیں ہوتی کیونکہ اس حربے سے انسان کے دماغ کو بھی ہلاک کیا جاسکتا ہے اور یہہ تو آپ مانتے ہیں کہ انسان اپنا دماغ کہیں چھوڑ کر نہیں آسکتا ___ ہاں ہماری جنگ کے اصول بھی آپ کے ملک سے مختلف ہیں۔ یہاں بھی ہم اپنے شاعروں کی طرح اپنے ملک کے ایک بہت بڑے مفکر کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں۔ آپ لوگ جنگ کرتے ہیں تو اپنے دشمن کی جان لے لیتے ہیں لیکن ہم اپنے ہتیاروں کو کام میں لاکر صرف ان کے دل و دماغ کو ہلاک کر دیتے ہیں مگر ان کی جان نہیں لیتے۔ اس سے بڑھ کر رعایت اور اپنے ملک کے سب سے بڑے مفکر کی پیروی اور کیا ہوسکتی ہے۔

ناصر۔ مس ناہید۔ آپ لوگ حقیقت میں قابل ستایش ہیں کہ اتنے اچھے اصولوں پر جنگ کرتے ہیں۔ مجھے صحیح معنوں میں اب افسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے ملک کے اتنے بڑے مفکر کو اپنے جیتے جی اپنے اصولوں کی کامیابی دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی ریاست اب ان اصولوں کو کامیابی سے استعمال کر کے یقینی طور پر ان کا نام روشن کر رہی ہے۔

ناہید۔ یہی تو فرق ہے ہم میں اور آپ میں۔ اچھا کیا آپ ہمارے ٹرینڈ کئے ہوئے سپاہی سے آنکھیں ملا کر اس کا امتحان کرنا پسند کریں گے۔

ناصر۔ (سٹپٹا کر) مجھے تو معاف ہی کیجئے۔ بغیر امتحان کئے ہی آپکی باتوں پر مجھے پورا پورا یقین ہے... اچھا تو اب مجھے اجازت ہے؟

ناہید کیا میں اُمید کرسکتی ہوں کہ اپنے ملک پہنچ کر ہماری ریاست کے متعلق آپ اپنے تاثرات سے ہمیں آگاہ کریں گے۔

ناصر۔ یقیناً۔ بلکہ میرا تو ارادہ ہے کہ اس ریاست کے متعلق ایک کتاب بھی لکھوں اور اپنے ان

نرگس ۔کس قدر بھولی بنتی ہو جیسے کچھ معلوم ہی نہیں بیچاری کو! مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے کہ یہ فیشن پرستی صرف اس لئے ہے کہ لڑکوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جائے

صبیحہ ۔ لاحول ولا قوۃ۔کس قدر نامعقول خیال ہے۔۔۔۔مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ ان لڑکوں کو اپنی طرف متوجہ کروں۔اس کے علاوہ ہماری جماعت کے لڑکے ایسے کونسے خاص ہیں کہ کوئی خواہ مخواہ ان سے دوستی کی کوشش کرے۔

پربھا ۔(باتوں کا رخ بدلتے ہوئے) یہ پروفیسر صاحبہ اب تک کیوں نہیں آئیں۔کہیں آج بھی ان کو رخصت تو نہیں لینی پڑی؟

جون ۔ ہاں بہت ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔بیچاری کو اکثر کسی نہ کسی وجہ سے رخصت لینی ہی پڑتی ہے۔ کبھی شوہر نے وقت پر ناشتہ نہیں دیا، کبھی شوفر نے وقت پر گاڑی نہیں لائی، کبھی کچھ ہوا کبھی کچھ۔چھ سات روز پہلے بھی وہ کالج نہیں آئی تھیں۔میں نے دوسرے روز مل کر وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ ان کا روز اور پاؤڈر ختم ہو گیا تھا اور باوجود اپنے شوہر کو اس طرف متوجہ کرنے کے انہوں نے وقت پر اس کا انتظام نہیں کیا۔مجبوراً ان کو رخصت لینی پڑی۔

(اتنے میں ایک لڑکی جماعت میں داخل ہوتی ہے)

پربھا ۔اے لو مایا سے پوچھ لو کہ وہ آج بھی آئی ہیں یا نہیں۔

مایا ۔ میں یہی دریافت کرنے گئی تھی کہ پروفیسر صاحبہ آئی ہیں کہ نہیں۔معلوم ہوا کہ وہ آئی ہیں لیکن بارش کی وجہ سے اپنی کار سے اتر کر بلڈنگ میں پہنچتے پہنچتے وہ کچھ بھیگ گئیں۔اس کے علاوہ چہرے پر پانی کے چند قطرے گرنے کی وجہ سے پاؤڈر جا بجا سے اتر گیا ہے اس لئے وہ ٹائیلٹ روم میں دوبارہ ٹائیلٹ کرنے گئی ہیں۔

(پروفیسر صاحبہ جماعت میں داخل ہوتی ہیں۔ہاتھوں میں دو تین موٹی موٹی کتابیں ہیں جن کو وہ بڑی مصیبت سے اٹھائے ہوئے ہیں اور اس بار کی وجہ سے ان کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے بھی آگئے ہیں۔ ان کے پیچھے آٹھ دس لڑکے داخل ہوتے ہیں اور پہلی صف میں بیٹھ جاتے ہیں۔لڑکیوں میں کانا پھوسی شروع ہوتی ہے)

صبیحہ ۔(آہستہ سے نرگس کو مخاطب کر کے) نرگس دیکھ رہی ہو آج تو یہ لڑکے بھی بہت بن ٹھن کے آئے ہیں۔

نرگس ۔ہاں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے باپوں نے آج خاص اہتمام سے ان کو تیار کیا ہے۔

(پروفیسر صاحبہ ایک کتاب کھولتی ہیں اور تمام لڑکیوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے۔

ایک لڑکی سے مخاطب ہوتی ہیں۔)

پروفیسر صاحبہ۔ کیوں زہرہ تمہاری کتاب کہاں ہے؟ میں نے توسب کو تاکید کی تھی کہ کم ازکم آج اپنی کتابیں ضرور لائیں۔ آج مسٹر ناصر آنے والے ہیں اور اگر انہوں نے اتفاقاً دیکھ لیا کہ تم لوگوں کے پاس کتابیں بھی نہیں ہیں تو وہ کیا خیال کریں گے۔

زہرہ۔ پروفیسر صاحبہ۔ مجھے تو آپ معاف ہی کیجئے۔ میں تو ایسی کتابوں سے باز آئی جو کمبخت آٹھ آٹھ سو صفحوں کی ہوں اور ہم سے اُٹھائی بھی نہ جائیں۔

نرگس۔ یقین مانئے پروفیسر صاحبہ مجھے تو ان مصنفین پر سچ مچ غصہ آتا ہے جو اتنی موٹی موٹی اور نامعقول کتابیں لکھ گئے۔ آخر کو مرد ہی تھے نا! جاہل کہیں کے!

صبیحہ۔ آپ ہی بتلایئے، ہمارے ملک میں کسی نے اتنی ضخیم اور بیکار کتابیں لکھی ہیں؟

جون۔ میری بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری وزیر تعلیمات نے باوجود اتنی عقلمند ہونے کے ایسی بیکار کتابیں نصاب میں کیوں داخل کردیں۔

پروفیسر صاحبہ۔ اس میں ان بیچاری کا کیا قصور! اصل میں ہم چاہتے ہیں کہ ہماری یونیورسٹی کا معیار بھی وہی ہو جو دوسرے ممالک کی یونیورسٹیوں کا ہے۔ اور باہر والے ہماری یونیورسٹی کے معیار کو تسلیم بھی کریں اسی لئے تم کو وہی نصاب کرنا پڑتا ہے جو باہر کے ممالک میں رائج ہے لیکن فرق یہ ہے کہ دوسری جگہ بی۔ اے۔ کے دو سال ہوتے ہیں لیکن ہمارے پاس چار سال کیونکہ ہم بیجا طور پر تم پر بار ڈالنا نہیں چاہتے۔ اسی وجہ سے ہمارے پاس بچیوں کی تعلیم دس سال کی عمر سے پہلے شروع نہیں ہوتی۔ دیر سے تعلیم شروع کرنے میں ہوتا یہ ہے کہ کم عمر دماغوں پر بار نہیں پڑتا اور بعد میں چل کر وہ ہر چیز کو آسانی سے سیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

پربھا۔ لیکن پروفیسر صاحبہ اتنی دیر میں تعلیم شروع کرنے سے ہوتا یہ ہے کہ ہم اوسطاً ۲۸، ۲۹ سال کی عمر میں بی۔ اے پاس کرتی ہیں جبکہ دوسری یونیورسٹیوں میں طالب علم ۱۸، ۱۹ برس ہی میں ڈگری حاصل کرلیتے ہیں۔

پروفیسر صاحبہ۔ تو اس میں برائی ہی کیا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو بی۔ اے پاس کرنے کی صحیح عمر بھی ۲۸، ۲۹ سال ہی ہے۔ اسی عمر میں تم تمام چیزوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے قابل ہوتی ہو اور اسی وقت ریاست کیلئے اپنی خدمات پیش کرسکتی ہو۔۔۔۔۔ اور اگر میری رائے پوچھتی ہو تو شادی کرنے کے لئے بھی یہی عمر موزوں ہے۔۔۔ لڑکوں کے لئے البتہ دوسری بات ہے۔ میرے خیال میں تو لڑکوں کی شادی زیادہ سے زیادہ ۱۹ سال تک کردینی چاہیئے۔ ایک صحت مند ۱۹ سال کے مرد اور ایک تندرست ۲۸ سال کی عورت کی

شادی ہی سے ہم کو تنومند اور خوبصورت لڑکیاں حاصل ہوسکتی ہیں جو آیندہ چل کر اپنی رعایا کو ترقی کے زینوں پر پہنچا سکتی ہیں۔

[لڑکے شرما کر گردنیں نیچی کر لیتے ہیں اور لڑکیاں مسکرانے لگتی ہیں]

نجمہ۔ پروفیسر صاحب آپ چاہے کچھ بھی کہیں ہمیں تو شانتی بنرجی اور مس زینت کی کتابیں بہت پسند ہیں۔ آپ ہی دیکھئے نا کہ ان کتابوں میں چالیس پچاس صفحوں میں پورا پورا کورس آجاتا ہے اور ہر چیز تفصیل کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور سب سے بڑی چیز تو یہ ہے کہ ہم ان ہی کتابوں کو پڑھ کر درجہ اول میں کامیاب بھی ہوسکتی ہیں۔ ان تمام سہولتوں کے باوجود کونسی لڑکی ان موٹی موٹی کتابوں کو پڑھنا گوارا کرے گی۔

مایا۔ پروفیسر صاحبہ اس بحث کو اب جانے ہی دیجئے اور اپنا لکچر شروع کیجئے۔

نرگس۔ نہیں پروفیسر صاحبہ آج تو لکچر وکچر سننے کو جی نہیں چاہتا۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہی ہوں تو اچھا

پروفیسر صاحبہ۔ نہیں نرگس یہ بیکار بات ہے۔ آج ہم کو کچھ نہ کچھ کام کرنا ہی چاہئیے تمہیں معلوم ہے ہم نے پچھلے ہفتے بالکل کام نہیں کیا! پرسوں منگل کو تو خیر پرنسپل صاحبہ کی لڑکی کی بسم اللہ تھی اور ہم سب وہاں مدعو تھیں اس لئے کالج بند تھا لیکن پیر کو بھی ہمیں مجبوراً کالج بند کرنا پڑا۔

نجمہ۔ وہ کیوں پروفیسر صاحبہ؟

پروفیسر صاحبہ۔ (تعجب سے) کیا تمہیں نہیں معلوم؟ اوہ! شاید تم غیر حاضر تھیں.... پیر کو ہمارے کالج کی ایک چپراسن رحیمن کے لڑکے کا عقیقہ تھا اس لئے تمام چپراسنوں نے چھٹی لے لی تھی بغیر چپراسنوں کے کالج کا کام چلنا دشوار تھا اس لئے ہم پروفیسروں نے پرنسپل صاحبہ کو مشورہ دیا کہ ایک روز کی تعطیل دے دی جائے۔ پہلے تو وہ کچھ رکیں کیونکہ اپنے اختیارات کی بنا پر وہ صرف ایک روز کالج بند رکھ سکتی تھیں اور وہ چاہتی تھیں کہ منگل کے روز اپنی بیٹی کی بسم اللہ کی خوشی میں تعطیل دیں لیکن ہم نے انہیں سمجھایا کہ وہ اپنی ذمہ داری پر پیر کو تعطیل دیدیں اور منگل کو بھی کالج بند رکھیں۔ چونکہ ناظم تعلیمات خود بسم اللہ میں شریک ہونے والی تھیں اور وہ ہماری پرنسپل صاحبہ کی خالہ بھی ہیں اس لئے کسی اعتراض یا استفسار کا ڈر نہ تھا.... کل چہارشنبہ کو کالج تو تھا لیکن بدقسمتی سے پیرا گھنٹہ نہ تھا.... (اپنی گھڑی میں وقت دیکھ کر) اچھا! دیکھو یہ گھنٹہ بھی آدھے سے زیادہ ختم ہوگیا۔ اب میں لکچر شروع کرتی.... (اتنے میں ایک چپراسن نوٹس لئے جماعت میں داخل ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحبہ سب کو نوٹس سناتی ہیں)

پروفیسر صاحب ۔ چونکہ ابھی ابھی بارش ختم ہوئی ہے اور موسم بہت سہانا ہو گیا ہے اس لئے لکچر جاری رکھنا قطعاً ناموزون ہے۔ سیر و تفریح کے لئے روز روز ایسے مواقع نہیں ملتے اور اس کے علاوہ گزشتہ ہفتے طالباۃ کو بہت زیادہ کام بھی کرنا پڑا ہے اس لئے اب کالج کو تعطیل دی جاتی ہے ۔ طالباۃ کو چاہیئے کہ اس چھٹی سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں ..... نوٹ ... آج مسٹر ناصر کالج دیکھنے کے لئے آنے والے تھے لیکن ان کے آنے میں آدھے گھنٹے کی دیر ہوگئی ہے اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ..... (ایکدم کالج کی گھنٹی بجتی ہے، جماعت میں شور بلند ہوتا ہے، کرسیاں اور میز بے ترتیب ہو جاتے ہیں اور ایک دو منٹ میں کمرے میں خاموشی چھا جاتی ہے ۔)

ادارہ اشاعت اردو (عابد روڈ حیدرآباد دکن) کی ہر دلعزیز مطبوعات

مقام اقبال ۔ سید اشفاق حسین	تین روپیہ چودہ آنہ
روح اقبال ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں	پانچ روپیہ بارہ آنہ
آثار اقبال ۔ غلام دستگیر رشید	تین روپیہ بارہ آنہ
تنقیدی جائزے ۔ سید احتشام حسین	تین روپیہ بارہ آنہ
تنقیدی حاشیے ۔ مجنوں گورکھپوری	تین روپیہ بارہ آنہ
ترقی پسند ادب ۔ عزیز احمد	دو روپیہ چودہ آنہ
ادب اور انقلاب ۔ ڈاکٹر اختر حسین رائپوری	تین روپیہ آٹھ آنہ
داستان اردو ۔ نواب نصیر حسین خیال	ایکروپیہ بارہ آنہ
افادات محمد علی ۔ رئیس احمد جعفری	تین روپیہ بارہ آنہ
نگارشات محمد علی ۔ "	تین روپیہ بارہ آنہ
مقالات محمد علی اول ۔ "	تین روپیہ بارہ آنہ
مقالات محمد علی دوم ۔ رئیس احمد جعفری	تین روپیہ بارہ آنہ
مکاتیب محمد علی " "	دو روپے آٹھ آنہ
مکالمات ابو الکلام ۔ عقیل احمد جعفری	تین روپے بارہ آنہ
فیصلہ ہندوستان ۔ عبد القدوس ہاشمی	پانچ روپیہ
تقاریر جناح ۔ عثمان صحرائی	تین روپے چار آنہ
ان پڑھ ہندوستان ۔ فخر الحسن	تین روپیہ چار آنہ
اسلامی تہذیب کیا ہے ۔ غلام دستگیر	دو روپیہ آٹھ آنہ
قصص و مسائل ۔ مولانا عبد الماجد دریابادی	ایک روپیہ بارہ آنہ
ابوذر غفاریؓ ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی	دو روپیہ بارہ آنہ
شخصیت و کردار ۔ شیر محمد اختر	دو روپیہ چار آنہ
میخانۂ ریاض ۔ تسنیم مینائی	تین روپیہ چار آنہ

ملنے کا پتہ سید عبد الرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدرآباد دکن

نظام ادب
سید علی برتر
سالِ چہارم

غزل

دِل کی بستی ہے وہ بستی کہ جو آباد نہیں
لاکھ خوشیوں کے ہوں سامان پہ دِل شاد نہیں

عشق کے جور اُٹھانے کو تو موجود ہیں ہم
دیکھئے غیر پہ اب کیجئے بیداد نہیں

دِل کی حالت کا بتانا تو ہے مشکل لیکن
میری اُجڑی ہوئی آنکھیں بھی تو آباد نہیں

پھول گلشن میں کِھلے بادِ بہاری آئی
ہم بیاباں میں رہے یار کا گھر یاد نہیں

وہ کبھی خواب میں آتے ہیں دلاسا دینے
میری دُنیا ابھی آباد ہے برباد نہیں

رات آنکھوں میں کٹی ہجر نے سونے نہ دیا
اب بھی کہیئے گا ہماری تو یہ بیداد نہیں

قلبِ برترؔ ہدفِ جور و جفا لاکھ بنا
پھر بھی شکوہ نہیں آمادۂ فریاد نہیں
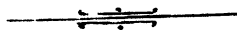
دیاوتی استھانہ
سال چہارم

کبیر اور ان کی شاعری

کبیر کا جنم اس زمانہ میں ہوا جبکہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں انتہائی روحانی کرب و مصیبت کا دور دورا تھا۔ اس روحانی بے چینی اور سراسیمگی کو دُور کرنے کے لئے شمالی ہند میں رامانند نے کٹر مذہبیوں کے خلاف پُر زور تحریک شروع کی تھی۔ کبیر ان ہی کے چیلے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام شروع سے آخر تک اس مایا جال کی دنیا کی بھول بھلیوں کی مذمت سے پُر ہے اور جگہ جگہ وہ لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ اس فریب کے جال سے اپنا دامن بچائے رہیں۔

ان کی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہوتی ہیں باوجود اس کے وہ اپنے مسحورکن گیتوں کی وجہ سے زندہ جاوید ہیں۔ ہر گاؤں اور ہر شہر میں ان کے گیت اور دوہے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔

ان کا جنم ۱۴۴۰ء میں بنارس کے ایک غریب جولاہے خاندان میں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان میں یوگ مت کا کافی پرچار تھا۔ گو وہ اس مت کے پیرو نہیں ہیں لیکن ماحول کے اثر سے بچ نہ سکے جگہ جگہ اپنے گیتوں میں اودھت یوگی کو مخاطب کیا ہے ؎ اودھو یوگی جگ سے نیارا

ان کے نزدیک اودھت یوگی وہ ہے جو دنیا میں بے ہما و با ہمی زندگی گذار دے بھیک مانگے : بھوکا سوئے۔ گرہست جیون بسر کرے اور اس زندگی کی الجھنوں سے آزاد رہے۔ ہندو انہیں براہمن بتاتے ہیں۔ مسلمان، صوفی پیر تقی کا شاگرد کہتے ہیں حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جہاں انہوں نے اپنے آپ کو جولاہا کہا ہے وہاں اکثر کوری بھی کہہ گئے ہیں ؎

(۱) تو بامن میں کاشی کا جولاہا
(۲) ہری کو ناو ابھے پد داتا کہے کبیرا کوری

اسی بنا پر بعض کا خیال ہے کہ اسلام قبول کرنے والی ذات کوری ہی جولاہے ہیں جنہوں نے تبدیلِ مذہب اپنی سماجی زندگی کو بلند کرنے کی غرض سے کیا۔ لیکن جولاہا ذات کو خود کبیر نے کمینی ذات کہا ہے ؎ ہماری کاہ کروگی ہم تو جاتی کمینہ

حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ محض قیاس آرائیاں ہیں۔ کبیر جیسی شخصیت کو، جس نے اپنے آپ کو ذات پات کے بکھیڑوں اور ہر قسم کی جماعت بندیوں سے آزاد کر لیا تھا، ان زنجیروں میں جکڑنا اُس ہستی کی توہین کرنا ہے۔

کبیر نہ کسی مت کے بانی بننا چاہتے تھے، نہ ہی انہوں نے شاعری کسی خاص مقصد کے مدِنظر کی۔ پھر بھی ان کے کلام میں ایک دائمی پیغام ہے جو رہتی دنیا تک لوگوں کو صحیح راستہ بتائے گا۔ اُن کے چیلوں نے کبیر پنتھی، مت کی جتھا بندی کر کے اُن ہی دیواروں کو ازسرِنو تعمیر کر دیا جن کو انہوں نے مسمار کیا تھا۔

رامانند نے انتہائی کوشش کی کہ اسلامی فلسفہ اور ہندو فلسفہ کو گھلا ملا دیں لیکن یہ کبیر ہی کا کام تھا کہ سعدی، رومی، حافظ کے فلسفہ اور ہندی فلسفہ کو ایک دوسرے میں پیوست کرنے میں کامیاب ہے ان کی شاعری عالمگیر ہے۔ اُن کے کلام سے علم معرفت کا چشمہ اُبلا پڑتا ہے اور اُن کے گیت پریم رس میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

باوجود اس کے کہ وہ نیچ قوم سے تعلق رکھتے تھے، کچھ پڑھے لکھے نہ تھے اس پر زبان بھی عوام کی تھی، وہ دقیق سے دقیق مضمون اور پیچیدہ سے پیچیدہ فلسفہ کو سادہ اور سُلجھی ہوئی زبان میں ادا کرتے ہیں زبان پر انہیں پورا قابو تھا۔ ان کا تخیل محض فرضی ہی نہیں ہے بلکہ دنیائے حقیقی سے تعلق رکھتا ہے وہ اپنے تخیلات کی بلند ترین پروازمیں قدرت کے راز کو فاش کرتے ہیں۔ خدا کے حقیقی جلوہ کو عریاں کرتے ہیں۔ طرزِ بیان ہندو مسلم، دونوں مذہب کے مروج اعتقادات سے پُر ہے۔ جن رسم و رواج کی مذمت کرتے ہیں اُن ہی روایات میں اپنا مطلب بھی ادا کرتے ہیں تاکہ عوام انہیں بآسانی سمجھ سکیں۔ اس کے باوجود انہیں ہندو، مسلم، صوفی یا کچھ اور کہنا بالکل ناممکن ہے ان کی ہستی دنیا و عالم میں بالکل آزاد ہے۔ وقت واحد میں وہ رام رحیم اور کرشن کریم کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

وہ خیالی دنیا کے بسنے والے نہ تھے بلکہ عملی دنیا کے رہنے والے ہیں۔ مع آل و عیال کے زندگی بسر کرتے تھے۔ گانے میں استادِ فن تھے اور کپڑا بن کر اپنی روزی کماتے۔ اُن کی خود تصنیف کی ہوئی کتاب بیجک ہے۔ ان کی زبان پوربی تھی۔ پوربیوں کا عام طور پر مذاق اُڑایا جاتا ہے لیکن انہیں اپنے پوربی ہونے پر فخر تھا۔ ؎

ہم پورب کے باسی سنتو ہمری لکھے نہ کوئی
ہمری باتیں وہ لکھے جو کھرا پوربیا ہوئے

انھوں نے ہر قسم کے بندھنوں کو ٹھکرانے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ انھیں توڑ کر ایک نیا راستہ اختیار کیا اور ہمت اور استقلال کے ساتھ اس پر گامزن ہوئے۔ گیان کی تلوار لے کر تمام مصیبتوں کا مقابلہ کیا اور شیر کی طرح نڈر ہو کر اپنے راستے پر تن تنہا چلتے رہے ؎

اک سمیہ اکسار بجتی رہے
کھیل کوئی سورمانست جھیلے

ان خیالات کے پرچار کی وجہ مذہبی لوگ انہیں کافر کہتے او خطرناک خیال کرتے۔ آخر یہ لوگ اُن کے اس بُری طرح سے پیچھے ہو گئے کہ وہ اپنے وطن کاشی کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور در بدر ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ سخت مصیبتیں جھیلیں اور آخر کار ۱۵۱۸ء میں گورکھ پور کے قریب کسی گاؤں میں اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

ان کا درجہ صوفیوں سے بھی بلند تر ہے۔ برخلاف صوفیوں کے جو دنیا کو تیاگ کر گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں وہ اپنی شاعری میں جگہ جگہ گرہست جیون کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ اُن کی نظروں میں زندگی بے معنی نہیں ہے۔ دنیا میں بھی کچھ حقیقت پنہاں ہے جس کی تلاش میں انسان سرگرداں رہتا ہے۔ اقبال کی طرح وہ انسان کی انسانیت پر فخر کرتے ہیں وہ اس امر کو تسلیم نہیں کرتے کہ انسان کی روح اس دنیائے فانی میں بھٹک کر بالآخر اپنے اصلی مبدا میں مل جائے گی اور انسان کی نامکمل ہستی خدا کی کامل ہستی میں پیوست ہو جائے گی۔ ؎

جھگڑا ایک بڑو جیہ جان — جو نروارے سو نربان
برہما بڑا کی جہاں سے آیا — بید بڑا کی جن اپجایا
یہ من بڑا کہ جیہی من مانا — رام بڑا کی رام ہی جانا
بھرمے بھرمے کبیرا پھرے اُداس — تیرتھ بڑا کی تیرتھ کے داس

پوچھتے ہیں کہ برہما بڑا یا وہ جہاں سے برہما آیا۔ وید بڑا یا وید کو بنانے والا' رام بڑا یا من جس نے رام کو مانا ہے۔ تیرتھ بڑا یا تیرتھ کو بنانے والا۔

کبیر نے پیر پیغمبر' قاضی' ملا' روزہ نماز' پنڈت' تیرتھ برت غرض ہر قسم کے رسم و رواج کا خوب مضحکہ اُڑایا ہے کہتے ہیں ؎

پوتھا پڑھی پڑھی جگ موا — پنڈت بھیتا نہ کوئی
ڈھائی اکشر پریم کا — پڑھے سو پنڈت ہوی

پریم ہی ان کی سادھنا ہے۔ پریم ہی منزل مقصود کو پہنچاتا ہے۔ وید نہیں شاستر نہیں روزہ نہیں، نماز نہیں۔ تیرتھ نہیں برت نہیں۔ یہ سب بے کار کے ڈھکوسلے ہیں۔ ؎

ایک نرجن اللہ میرا ہندو ترک دھنو نہیں میرا
راکھوں برت نہ محرم جانا تس ہی سومروں جو رہے ندانا

کہتے ہیں اگر مسلمانوں کا خدا مسجد میں ہے اور ہندوؤں کا بھگوان مندر میں تو جہاں مندر ہے نہ مسجد وہاں کس کی خدائی ہوگی؟ کہتے ہیں اے مسافر تو مسجد اور مندر کے جھگڑوں میں نہ پڑ۔ اپنی راہ لگ۔ تیرے لئے رام رحیم اور کرشن کریم سب برابر ہیں ؎

ترک مسیتی دیہو رہے ہندو دہنو ٹھا رام خدائی
جہاں مسیتی دیہو رانا ہیں تہاں کا کی ٹھکرائی

. . . .

کہے کبیرا داس فقیرا اپنی رہی چلی بھائی
ہندو ترک کا کرتا ایکے تا گتی لکھی نہ جائے

؎ دنیاوی رسم و رواج خدا کی حقیقت کو پہچاننے میں مانع ہوتے ہیں کہتے ہیں

تیرتھ میں تو سب پانی ہے ہوئے نہیں کچھ انیائے دیکھا

. . . .

اکھیو کی بات کبیر کہیں یہ سب ہے جھوٹی پول دیکھا

ان کے گیت محبت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں وہ کیف و نشاط کے سمندر میں غوطے لگاتے ہیں لیکن ان کا کلام ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہے۔

ناچو رے مورے من مست ہوئے
پریم کو راگ بجائے رین دن شبد سنے سب کوئی
راہو کیتو نوگرہ ناچے جنم جنم آنند ہوئی
گری سمندر دھرتی ناچے لوگ ناچے ہنس روئی

یہ دنیا ایک مایا جال ہے۔ انسان لوبھ لالچ میں مبتلا ہو کر زندگی کے اصل مقصد کو بھلا بیٹھا ہے۔ کہتے ہیں اے کبیرا یہ دنیا طلسم ہے اور شعبدہ باز ہے۔ سوچ سمجھ کر پانسا پھینک تاکہ جیت ہو۔ ورنہ پھر وہی دنیا کے بھنور میں پھنس جائے گا۔

سو بھاگے کہی کارن لوبھ لاگے رتن جنم کھوئے
جیون کے جنی آشا راکھو کال گہے ہے سواسا
پاپی ہے سنسار کبیرا چت چیتی ڈارو پاسا

ان کے نزدیک انسان کی طاقت لامحدود ہے۔ اگر اُسے اپنے آپ پر کامل اعتقاد ہو تو وہ مشکل سے مشکل مرحلہ کو بھی بآسانی طے کر سکتا ہے۔

ڈھاڈہس دیکھ ہو مرجیوکا　　دہی کے پیٹھو پتال
جیو انک مانے نہیں　　گھی سے نکالا لال

یعنی غواص کا اعتقاد دیکھو کہ اپنی جان پر کھیل کر پاتال لوک میں غوطہ لگاتا ہے اور آخر کار موتی ڈھونڈہی لاتا ہے۔

جگہ جگہ اپنی شاعری میں وہ لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ دنیا ریاکاروں سے بھری ہوئی ہے۔ انسان مایا جال میں اس بُری طرح جکڑ گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے مقصد زندگی کو بُھلا بیٹھا ہے اور امرت کو چھوڑ کر زہر پیتا ہے۔

بابو ایسو ہے سنسار تھارو　　اِسے کلی ہے بیوھارا
کہہ کبیر جھوٹھو ملی جھوٹا　　ٹھگ ہی ٹھگ بیوھارا
تن لوک بھری پور رہو ہے　　ناہیں ہے پتیارا (اعتبار والا)

غرض کبیر نے اپنی شاعری سے لوگوں کو مقصدِ حیات اور منشائے تخلیق سے پوری طرح آگاہ کیا ہے۔

تجھے خُدا کی قسم ہے جو ظلم سے باز آئے　　کمال مجھ کو ہے مشقِ ستم خدا کی قسم
(ایس ایمن کرسچیا ناگا رڈنز)

مسکرا کر وہ شوخ کہتا ہے　　آج بجلی گری کہیں نہ کہیں
(امیر مینائی)

وہ مسکرا کے مرنے پچھڑنے کو کہتے ہیں　　کہاں چمک کے یہ بجلی گری خبر لینا
(امیر مینائی)

مرزا آصف علیخاں
سال چہارم

گھریلو مصنوعات

اٹھارویں صدی کے ابتدائی چند سالوں تک ہندوستان ایک صنعتی ملک مانا جاتا تھا۔ بیسیوں قسم کی تیارشدہ اشیا، یورپ اور دیگر مغربی ممالک کو برآمد ہوتی تھیں۔ ڈھاکے سے تارعنکبوت کا سا باریک ململ، کشمیر کے خوبصورت شال اور دہلی کا کارچوبی ریشم اُن نازنینوں کو زیب تن کرتا تھا جو ہمیشہ قیصر روم کے دربار میں رہا کرتے تھے۔ اس وقت جبکہ لندن کا نام تاریخ میں پایا بھی نہ جاتا تھا۔ ہندوستان دنیا کا ایک مالدار تجارت گاہ تھا لیکن یہ ممتاز حیثیت کچھ ہی عرصے تک رہی اور صنعتی انقلاب کے بعد یورپ سے مشین کی تیارشدہ ارزاں قیمت اشیا ہندوستانی بازاروں میں آنے لگیں اور چونکہ حکومت ہند نے دوراندیشی سے کام نہیں لیا یہاں کی صنعتیں بیرونی ارزاں قیمت مال کا مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ سے ختم ہوگئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے صناع مجبوراً زراعت کی طرف متوجہ ہو گئے۔

گھریلو صنعتوں سے مراد وہ مختلف صنعتیں ہیں جو معمولی سرمایہ سے تیار کی جاتی ہیں۔ ان صنعتوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہیں آمدنی کا ایک ذیلی ذریعہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔ چونکہ مصنوعات گھر ہی میں بنائی جاتی ہیں اس وجہ سے عورتیں اور بچے بھی ان کی تیاری میں مدد دے سکتے ہیں جس کی وجہ سے ایک غریب مزدور کی مجموعی آمدنی میں بہت کچھ اضافہ ہوسکتا ہے۔ ہندوستان جیسے کثیر آلآباد ملک میں علاوہ افلاس، بیکسی اور غربت کے بیروزگاری کا مسئلہ بھی بہت کچھ اہمیت حاصل کرچکا ہے۔ حکومت ہند اس اہم مسئلہ پر غور و خوص کر رہی ہے اور ایسے طریقے اور ایسے اسکیم مرتب کئے جانے والے ہیں جن کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو کام پر لگایا جاسکے۔ چونکہ ہندوستانی زراعت کا زیادہ تر دار و مدار بارش پر ہے اور چونکہ بارش کی یہاں قلت ہے ہندوستانی کاشت کار سال میں تقریباً چار ماہ بیکار رہتا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں گھریلو مصنوعات کی تیاری کا انتظام باقاعدہ طور پر شروع کردیا جائے تو اس سے کاشتکار اپنی فرصت کے اوقات اُن مصنوعات کے بنانے میں صرف کریں گے۔ اس طرح سے ایک طرف تو ان کی بیکاری کا انسداد ہوگا اور دوسری طرف ان کی آمدنی میں اضافہ ہونے کی وجہ سے معیار رہائش میں بھی اضافہ ہوگا۔ ہندوستان کی اہم گھریلو صنعتیں حسب ذیل ہیں اگر ان کو ترقی دی جائے تو

سینکڑوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔

(۱) چرخے کی صنعت ہندوستان کی گھریلو صنعتوں میں اس صنعت کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ ملک میں چھ ملین افراد دستی پارچہ بافی کے ذریعے روزی حاصل کرتے ہیں صنعتی کمیشن نے اندازہ لگایا اب تقریباً تین ملین چرخے زیر استعمال ہیں اور ان سے تیار شدہ مال کی قیمت پانچ کروڑ روپے سے زیادہ ہے ۲۷-۱۹۲۶ء میں دستی چرخوں کے ذریعے جس قدر کپڑا تیار ہوا وہ ہزار ملین گز سے زیادہ تھا۔ لیکن چونکہ بیرونی مقابلہ بہت بڑھ گیا ہے اس وجہ سے یہاں کی پارچہ بافی کچھ اچھی حالت میں نہیں ہے اور ہمارے صناع آجکل بہت پریشان ہیں۔ چونکہ ہمارے صناع مالدار نہیں ہیں اس وجہ سے وہ ساہوکاروں وغیرہ کے ہاتھوں میں بُری طرح سے پھنسے ہوئے ہیں علاوہ اور وجوہات کے یہ بھی ہمارے چرخے کی صنعت کی پستی کی ایک وجہ ہے۔ دستی پارچہ اور چرخے کی تحریک پر گاندھی جی اور اُن کے ہم خیال بہت زور دے رہے ہیں لیکن اس کو کامیاب بنانے کے لئے ہم کو چاہیئے کہ ہر طرح کی کوشش کریں۔ اس کے علاوہ ہم کو چاہیئے کہ صناعوں کی ہمت افزائی کریں اور زیادہ سے زیادہ سہولتیں ان کو بہم پہنچائیں ملک کے ہر شخص کا یہ قومی فرض ہونا چاہیئے کہ ملکی صناعوں کا تیار کردہ سامان خرید کر اس کو فروغ دیں اور ہندوستان کی عام زبوں حالی اور بیروزگاری کا سدباب کریں تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ۶-۱۹۰۵ء میں دستی کرگھوں کے ذریعہ ۸۰ اکروڑ گز کپڑا تیار کیا گیا تھا۔ اس صنعت میں گوناگوں ترقی کی وجہ سے ۱۹۳۶ء میں یہ مقدار بڑھ کر ۱۴۹ کروڑ گز ہوگئی۔

(۲) اون کی صنعت ہندوستان میں اون کی صنعت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مختلف قسم کے اعلیٰ کمبل، عمدہ قالین اور خوبصورت شال تیار کئے جاتے ہیں اس صنعت کو ہم اس وقت فروغ دے سکیں گے جبکہ ہمارے تمام ہم وطن یہ ٹھان لیں کہ دیسی صنعت کی ہر طرح مدد ہونی چاہیئے۔ سرمایہ کی سہولتیں اور صناعوں کی سرپرستی یہاں کی گھریلو صنعتوں کے فروغ کے لئے ضروری ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ تیار شدہ اشیاء کے فروخت کے لئے مناسب انتظامات بھی کئے جانے چاہیئے۔ قالین اور شال بافی کی صنعتیں بہت محدود حیثیت رکھتی ہیں لیکن کمبل بافی کی صنعت خاصکر جنوبی ہند میں بہت عام ہے۔ اکثر علاقوں میں یہ کافی تعداد میں بنے جاتے ہیں لیکن ان کی فروخت کا ابھی کوئی منظم انتظام نہیں ہوا ہے۔ اس صنعت میں تقریباً تین لاکھ کاریگر کام کر رہے ہیں۔ چونکہ مقامی اون آسانی سے مل سکتا ہے۔ اور دیہات میں ان کمبلوں کی کافی مانگ ہے اس وجہ سے اس صنعت کی ترقی کے کافی مواقع ہیں۔ غریب کسان، مزدور، دھوبی، درزی وغیرہ دیہات میں دیسی کمبلوں ہی کا استعمال

کرتے ہیں کیونکہ یہ مضبوط اور کم قیمت ہوتے ہیں۔ شال بافی اور قالین بافی کی صنعتیں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں اور اگر مواقع دئے جائیں تو یہ صنعتیں بھی بہت کچھ ترقی کر سکتی ہیں۔

(۳) ریشم کی صنعت ہندوستان کے ایسے علاقے جہاں شہتوت کے درخت ہیں وہاں ریشم کے کیڑوں کی پرورش کی جا سکتی ہے اور جن علاقوں میں ان درختوں کی افراط نہیں ہے وہاں پر بھی کچھ تھوڑے بہت سے درخت لگا کر ریشم کے کیڑوں کی پرورش ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں ریشم زیادہ تر بنگال کشمیر اور میسور سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر ان مقامات پر ریشم کی صنعت کو منظم طور پر چلایا جائے تو نہ صرف صنعت کو فروغ ہوگا بلکہ بہت سے غریبوں کو کام مل جائیگا اور اس طرح سے بے روزگاری کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو جا سکے گا۔ چنانچہ حکومت بھی کوشش کر رہی ہے کہ ان علاقوں میں ریشمی کپڑے کی تیاری بڑے پیمانے پر کی جائے۔ دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹-۴۵ء کے قبل اس صنعت کو کافی فائدہ ہو رہا تھا لیکن جب جاپان نے انگلستان اور امریکہ کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ اور جب امریکہ سے باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی تو اس سے ہندوستانی ریشم کی صنعت کو نقصان ہوا کیونکہ اس جنگ نے ہندوستان کے ہاتھ سے ایک خام پیداوار کے مرکز کو ہٹا لیا۔ چند سال ہوئے حکومت نے تقریباً ایک کروڑ روپے کی منظوری دی تاکہ بنگال، مدراس، بہار، اور اڑیسہ وغیرہ میں ریشم کی صنعت کی ترقی کے متعلق اسکیمات تیار کی جائیں

(۴) کھلونے کی صنعت مٹی کے کھلونے اور مختلف دوسری کارآمد چیزیں بھی آجکل کافی تعداد میں بنائی جانے لگی ہیں۔ اس صنعت نے بھی آجکل بہت فروغ پایا ہے اور یہ ایسی صنعت ہے جس کو زوال صرف اُس وقت ہو سکتا ہے جبکہ ملک میں بچوں کی تعداد کم ہو جائے نہ صرف مٹی بلکہ لکڑی، کپڑے، کاغذ وغیرہ سے بھی کھلونے تیار کئے جاتے ہیں۔ چونکہ ان مصنوعات کی قیمت بہت کم ہوتی ہے اس وجہ سے ہر غریب آدمی اپنے بچوں کی خواہش پوری کرنے کی خاطر انہیں خریدتا ہے۔

(۵) لوہے کی صنعت دیہات وقصبات میں لوہے کا کام چھوٹے پیمانے پر بھی کیا جاتا ہے بہت سی معمولی چیزیں مثلاً زرعی آلات وغیرہ یہ گھر ہی پر تیار کرتے ہیں ان کے وجود سے کاشتکار کو بہت فائدہ ہوتا ہے اور وہ آلات واوزار کی درستی میں ان سے اکثر مدد لیتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تیار کردہ اشیاء بھدی ہوتی ہیں لیکن ایک غریب دیہاتی کے کام کی تکمیل کے لئے کافی ثابت ہوتی ہیں۔

(۶) صابن سازی کی صنعت اس صنعت کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۴۲ئہ میں ہزار سے زیادہ فیکٹری تھے اور ان سے ۵۰۰۰، ٹن صابن حاصل ہوا جس کی قیمت تین کروڑ روپے کے قریب ہوئی۔

(۷) چینی کی صنعت چینی کے سامان کی صنعت کو بھی اب اہمیت حاصل ہو چکی ہے اعلیٰ اور خوبصورت چیزیں تو گھر میں نہیں بنائی جاتی ہیں البتہ معمولی چیزیں بہ آسانی تیار کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً چوڑی کی صنعت۔ ہر شہر اور گاؤں میں کئی لوگ اسے اپنا پیشہ بنائے ہیں۔ گھر میں مختلف قسم کی خوبصورت چوڑیاں بنائی جاتی ہیں۔ ان میں رنگ برنگ کے نگ نہایت ہی عمدگی سے بٹھائے جاتے ہیں اور جب انہیں بازار میں بھیجا جاتا ہے تو ان کی قیمت کافی حاصل ہو جاتی ہے گھر کی تیار شدہ چوڑیاں مشینوں سے تیار کردہ چوڑیوں سے بہت زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں تقریباً ۱۵۰۰ چینی کے سامان کے گھریلو ورک شاپ قائم ہیں۔

گھریلو صنعتوں کی امداد سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ پہلے تمام صنعتوں کی تحقیق کی جائے اور معلوم کیا جائے کہ کونسی ایسی مصنوعات ہیں جو آیندہ ترقی کرسکتی ہیں اور کونسی ایسی ہیں جو بہ آسانی اور بغیر کسی نقصان کے اب شروع کی جاسکتی ہیں اور اس تحقیق کے نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی مدد کی جانی چاہیئے۔ حکومت کی جانب سے دستکاروں اور صناعوں کو مالی امداد دی جانی چاہیئے تاکہ وہ ابتدأ میں اپنی حالت کو مستحکم کرلیں۔ باضابطہ اعداد و شمار رکھے جانے چاہیئے تاکہ معلوم ہوسکے کہ کس صنعت نے اس حکومتی امداد سے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے صناعوں اور دستکاروں کو فنی اور تجارتی تعلیم دی جانی چاہیئے تاکہ یہ لوگ بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دے سکیں اور اپنی بہتری کے لئے جو کچھ ممکن سمجھیں کریں حکومت کو چاہیئے کہ ان کی تیار کردہ اشیاء کثیر سے کثیر تعداد میں خریدے اور ان دستی مصنوعات کی نقل و حمل میں سہولتیں پیدا کرے۔ انجمن امداد باہمی کے خیال نے اس شدید مسئلے کو بہت کچھ آسان بنادیا ہے۔ صناعوں کے لئے اچھے اور کم قیمت اوزار اور خام اشیاء فراہم کئے جارہے ہیں تاکہ انہیں صنعت شروع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ان کا شوق بڑھے۔ نمونہ کے طور پر انہیں اچھی اچھی چیزیں دی جارہی ہیں تاکہ انہیں اچھی مصنوعات بنانے میں ترغیب ہو۔ حکومت نے اب مختلف ایسی دوکانیں کھولی ہیں جہاں پر ان گھریلو مصنوعات کو رکھا جاتا ہے اور اس طرح سے فروخت پیداوار کے اہم مسئلہ کو بھی کسی قدر حل کردیا گیا ہے حکومت نے مختلف قسم کی گھریلو صنعتوں کی امداد اور ان کی ترقی کے مسائل پر غور کرنے کے لئے کئی ایکٹ

نافذ کئے۔ ۱۹۳۷ء میں جب کانگریس کو صوبوں کی حکومتوں پر اقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے گھریلو صنعتوں کی طرف توجہ کی۔ کانگریس کی "کھدر تحریک" کا مقصد یہی ہے کہ یہاں کی مصنوعات کو ترجیح اور مدد دی جانی چاہیئے۔ حکومت نے کئی مقامات پر انجمن امداد باہمی کے ذریعے صناعوں اور دستکاروں کی مدد کی ہے۔ دستکاروں کو ارزاں شرح پر چرخے فراہم کرنے کے لئے ہر طرح کی کوشش کی جارہی ہے۔ چرخوں کی فراہمی کے سلسلے میں حکومت کامیاب تو رہی لیکن سرمائے کی فراہمی کا سوال اب بھی باقی ہے۔ حکومت کی جانب سے مختلف جگہوں پر صناعوں اور دستکاروں کی تعلیم کی خاطر صنعتی مدارس قایم کئے گئے ہیں لیکن اب بھی ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس سے دستکار بہت مستفید ہو رہے ہیں لیکن چونکہ ابتدائی زمانہ ہے اس وجہ سے یہ مدارس اس قدر کامیاب ثابت نہیں ہوئے جس قدر کہ آیندہ ہونے کی اُمید ہے۔ فروخت کے سلسلے میں حکومت کی جانب سے مختلف دوکانیں بنوائی گئی ہیں جن میں یہ تمام مصنوعات رکھی جاتی ہیں۔ یہ بھی ابھی ابتدائی حالت میں ہے لیکن اُمید ہے کہ آیندہ اس قسم کی بڑی بڑی دوکانیں قائم ہونگی۔

ریاست حیدرآباد میں یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ ہماری دیہی مصنوعات کی جانب فوری توجہ ضروری ہے۔ چنانچہ ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے جس کے سپرد نمائش کا کام ہے۔ گذشتہ سات برس سے یہاں پر ملکی مصنوعات کی نمایش ہورہی ہے۔ اس سے ایک طرف تو صناع اور دستکار کو اچھی مصنوعات بنانے کا خیال ہوتا ہے اور دوسری طرف عوام بھی اپنے ملک کی مصنوعات سے بے خبر نہیں رہتے ہیں۔ حکومت سرکار عالی کی جانب سے بہترین صنعت کو انعام ملتا ہے۔ موجودہ گھریلو صنعتوں میں اورنگ آباد کا ہمرو اور کمخواب، پٹن کی ساڑیاں۔ بیدر کے بٹن اور دیگر چیزیں، کریم نگر کا چاندی کا سامان، نرمل کا لکڑی کا کھلونا، سنگاریڈی کا ریشمی کپڑا، ورنگل کے قالین اور شطرنجیاں، گلبرگہ کے کپڑے اور لنگیاں، ورنگل، سیوم پیٹ، دولت آباد اور سرپور کا کاغذ، ناندیڑ کا کپڑا اور نظام آباد کے برتن ہیں۔ حیدرآباد کی گھریلو مصنوعات کو کافی فروغ ہوچکا ہے۔ خاص کر ۱۹۳۹-۴۵ء کی جنگ عظیم کے دوران میں ہمارے دستکار اور صناع جاپان اور یورپ سے درآمد کے بند ہونے کے بعد کافی فائدہ اٹھا لئے ہیں۔

حیدرآباد میں سب سے اہم گھریلو صنعت کپڑے کی ہے۔ آبادی کا تقریباً تین فی صد حصہ اس میں مشغول ہے اور کپڑے کی مقدار اس قدر ہوتی ہے کہ وہ آبادی کے تقریباً نصف حصہ کو زیب تن کر سکتا ہے۔ یہاں کا کپڑا جو نہایت عمدہ ہوتا ہے لیکن قیمت کے زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی طلب زیادہ نہیں ہے پیٹھاں کی ساڑیاں بھی بہت خوبصورت اور خوش رنگ

ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ، دہلی اور پٹنہ کی ہندوستانی نمائشوں میں حیدرآباد کے کپڑوں کی بہت تعریف کی گئی اور یہ رائے ظاہر کی گئی کہ اگر شوق سے کام کیا جائے تو اس کی ترقی کے بہت امکانات ہیں۔ حیدرآباد میں کمبل بھی بہت اچھے اور مضبوط بنائے جارہے ہیں۔ اور اندازہ لگایا گیا کہ تقریباً تین لاکھ دس ہزار روپئے کی مالیت کے کمبل یہاں سے برآمد کئے جاتے ہیں۔ یہاں پر رنگ سازی کی صنعت کو بھی کافی فروغ حاصل ہوچکا ہے اور شہر کے اُن حصوں میں جہاں پارچہ بافی ہوتی ہے رنگ سازی کی صنعت بہت کثرت سے ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ باہر سے جو رنگ اور کیمیائی اجزا منگوائے جاتے تھے اُسکی قیمت تقریباً ۹۰۰۰۰ روپئے سالانہ ہوا کرتی تھی۔ ورنگل میں ۱۹۳۰ء میں صرف ۸ مشینیں قالین بنانے کے کام میں مشغول تھیں۔ حکومت کی جانب سے ایک EXPERIMENTAL CARPET FACTORY قائم ہوئی جس کی وجہ سے ان مشینوں میں آہستہ آہستہ اضافہ ہونے لگا اور ان کی تعداد بڑھ کر ۱۹۳۷ء میں ۳۵۰ ہوگئی۔ دو سال قبل حیدرآباد سے سالانہ ۱۲۰۰۰۰ روپے کے قالین اور کمبل برآمد کئے گئے ورنگل کی قالین کی صنعت ہندوستان کی دوسری صنعتوں کا بہت اچھی طرح سے مقابلہ کر رہی ہے۔ بیدر کی مٹی کے سامان کی صنعت بہت قدیم ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بہمنی بادشاہوں کے دور حکومت میں بھی اس صنعت کا وجود پایا جاتا تھا۔ شروع زمانے میں حقے بنائے جاتے تھے۔ اس کے بعد سے آہستہ آہستہ مختلف دوسری چیزیں بھی بنائی جانے لگیں۔ آجکل تو اس صنعت کو اس قدر وسعت ہوچکی ہے کہ گلدان چوڑیاں، انگوٹھیاں، سگریٹ کے ڈبے، بٹن، تھالیں غرض ہر کارآمد چیز نہایت ہی سلیقہ کے ساتھ بنائی جارہی ہے۔ نرمل کے کھلونے کی صنعت بہت مشہور ہے۔ یہاں پر مختلف قسم کے لکڑی کے جانور سپاہی، موٹر، پتلے غرض ہر وہ چیز جو ایک ننھے سے دل کو خوش کرسکتی ہے بنائی جاتی ہے۔ حیدرآباد میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو نرمل سے واقف نہ ہو۔ اسی طرح کی اہمیت کریم نگر کو دی جاتی ہے جہاں پر لوگ چاندی کی نفیس چیزیں تیار کرتے ہیں۔ آجکل تو اس صنعت کو بہت فروغ حاصل ہوچکا ہے اور یہاں کی تیار کردہ اشیاء کی طلب بہت بڑھ گئی ہے۔

حکومت حیدرآباد کی جانب سے ۱۹۳۰ء میں ریاست کی تمام صنعتوں نیز رنگ سازی اور پارچہ بافی کے متعلق تحقیقات کی گئیں اور حکومت نے ان تحقیقات پر غور کرنے کے بعد کئی اسکیموں پر عمل شروع کردیا ہے۔ ایک مرکزی فنی ادارہ قائم کیا گیا جہاں پر پارچہ بافوں، رنگ سازوں اور دوسرے دستکاروں کو نئے طریقے پر صنعتی اور حرفتی کام کرنے کی تعلیم دی جارہی ہے۔ مختلف صنعتی مدارس قائم کئے گئے ہیں جہاں عورتوں اور مردوں کو کام سکھایا جاتا ہے کم عمر لڑکوں کو بھی چھوٹے موٹے کام

سکھائے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے والدین کی مدد کرسکیں اور خاندان کی مجموعی آمدنی اور معیار رہائش کو بڑھاسکیں۔ ادارۂ مصنوعات ملکی کے مختلف ذیلی ادارے قائم کئے گئے ہیں جس میں کپڑا بننا، رنگ کرنا، چھاپا کرنا، اونی کپڑے بننا، اون کاتنا اور کمبل کاتنا، سوزن کاری اور بیل کاری اور کھلونے وغیرہ بنانا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارے میں ایک ورک شاپ بھی قائم کی گئی ہے جہاں پر مختلف استعمال کرنے کے اوزار تیار اور درست کئے جاتے ہیں۔ عورتوں کو بھی ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ بھی کام کریں۔ چنانچہ انھیں IMPERIAL TRUST FUND کے ذریعے مدد دی جارہی ہے چونکہ دستکاروں اور صناعوں کو یہ گلہ رہتا ہے کہ اُن کے تیار کردہ اشیاء کے خریدار نہیں ہوتے حکومت نے اپنی جانب سے ایک SALES DEPOT قائم کیا ہے۔ ریاست کی تمام تیار شدہ چیزیں یہاں پر فروخت کے لئے بھیج دی جاتی ہیں اسی مقصد کے پورا کرنے کے لئے ایک عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ اس قسم سے حیدرآباد میں اب لوگ یہ جاننے لگے ہیں کہ ہمارے پاس کیا کیا چیزیں کس خوش اسلوبی اور سلیقہ سے بنائی جارہی ہیں۔ اور چونکہ خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہوچکا ہے اور اشیاء کی طلب بہت بڑھ گئی ہے اس وجہ سے اچھی اچھی چیزیں بنوائی جانے لگی ہیں۔ گذشتہ چند سالوں سے نمائش بھی کی جارہی ہے۔ حکومت حیدرآباد نے ایک پنج سالہ منصوبہ بنایا ہے جس کے ذریعے یہاں کی چرخے کی صنعت کو ترقی دی جائیگی۔ اس اسکیم کے تحت ریاست میں بارہ MAIN CENTRES اور چوبیس SUB-CENTRES. قائم کئے جائیں گے۔ جہاں پر کاریگروں کو تعلیم دی جائیگی اور نئے طریقوں سے رنگ سازی اور چھاپے کا کام سکھایا جائے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس اسکیم کے پورا کرنے میں ......۱۲ روپئے صرف ہوں گے۔ اب جبکہ غارتگریٔ انسان ختم ہوچکی ہے، جنگ وجدل نے خود اپنا خاتمہ کردیا ہے اور دنیا ایک نئے دور، نئی زندگی، نئے کام اور نئے انسان کی منتظر ہے کوئی عجب نہیں کہ زندگی کے اس شعبے میں بھی معتدبہ ترقی ہو اور ہندوستان اپنی اس دیرینہ صنعت کو دوبارہ عالم صنعت و تجارت میں اجاگر کردے۔

گر پتہ سب کو ترا کوچۂ جاناں ملتا ایک ہی راہ میں ہر گبر و مسلماں ملتا

(الگزینڈر ہیڈرلی آزاد)

واعظوں سے جو سنا کرتے تھے جنت کا بیاں جبکہ تحقیق کیا کوچۂ جاناں نکلا

(الگزینڈر ہیڈرلی آزاد)

سراج احمد
بی۔ایس۔سی (ابتدائی)

دو تارے

۱۔ دُرِ یتیم

"گناہ گاروں کے لئے بڑے عذاب ہیں"

——— امام خطبہ پڑھ رہا تھا۔

میرے گناہ۔!! ——— مجھے خیال آیا۔

امید و بیم کی جانگسل ٹکروں سے میں یاس کی گہرائیوں میں کھو گیا۔ - - ——— گناہوں کے مقابل ثواب کا پلہ ہلکا ہوا جا رہا تھا ——— اور اس کے ساتھ میری روح تھی ——— جو جا رہی تھی ——— اپنے پروردگار کے سامنے سربسجود ہونے کے لئے ——— ہلکی فضاؤں اور نیلگوں آسمانوں سے پرواز کرتی ———

میں چلا جا رہا تھا ——— لطیف طبقات میں ——— بہت تیز!۔ آسمانوں کی تاریکیوں میں!

دل میں ایمان کا دیا جلاتا ہوا ——— ——— ضمیر کی روشنی میں!

فرشتے میری بے وقت آمد پر غضبناک ہو کر میری طرف بڑھے ——— لیکن ان کے قدم رُک گئے - - - وہ میری طرف متحیر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ——— مگر ———

میں چلا جا رہا تھا ——— لطیف طبقات میں ۔ بہت تیز!۔ آسمانوں کی تاریکیوں میں۔

دل میں ایمان کا دیا جلاتا ہوا ——— ——— ضمیر کی روشنی میں۔!!

پیغمبر حیران تھے ——— وہ بھی دم بخود رہ گئے ——— مجھے اتنا دلیر دیکھ کر ——— لیکن ———

میں چلا جا رہا تھا ——— لطیف طبقات میں ۔ بہت تیز! آسمانوں کی تاریکیوں میں!

دل میں ایمان کا دیا جلاتا ہوا ——— ——— ضمیر کی روشنی میں!

میں آگے بڑھا ——— خود بخود سر نیچا ہو چلا ——— ——— ———

تعظیماً نظروں نے اوپر دیکھنے سے قطعی انکار کر دیا ———

یکایک آواز آئی ——— "بندے!"

"میرے پروردگار" ــــــــ میں سجدہ میں گر پڑا ــــ

ــــ کیوں آیا ہے ــ میرا بندہ !

میں نے سر اٹھایا ــــ پلکوں پر آنسو تڑپ رہے تھے ! ــ اور التماس کی نظروں سے ــ دیکھتے ہوئے ــ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"حسرت بخشش ــ اور ــ عقیدت کا دُرِ یتیم ــــ پاک پروردگار"

ثواب کا اونچا ہوتا ہوا پلہ ــــ نیچے ہو رہا تھا ــــ اور ساتھ میری روح تھی ــــ

ــــ پاک ہوکر ــــــــ ــ

آسمانوں میں ایک آواز گونجی ــــ ہر ذرہ چلّا اُٹھا ــــ

"بے شک اللہ بڑا بخشنے والا ہے"

اُمیدوں کے سہارے ناامیدی کی گہرائیوں سے اوپر آرہا تھا

فرشتوں کے سر تعظیم سے نیچے ہوگئے

پیغمبروں نے کہا:۔ سلام ہو تم پر اے بندہ خدا !! ــــــ

ــــــ میرے کانوں میں آواز آئی ــــــ

"سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے"

امام خطبہ پڑھ رہا تھا ــــ

۲۔ گوہرِ نایاب

یقیناً ــــ تمہارا نازک بدن دسمبر کی سرد اوس سے علی الصبح دُھلی ہوئی کلی کی مانند صاف و شفاف ہے۔ اور تمہارا دراز قد ــ بانکپن قابلِ قدر ہیں۔

درست کہ ــــ تمہارا چہرہ مہِ درخشاں سے کہیں زیادہ پُر ملاحت اور نورانی ــــ اور وہ آبِ بقا کے چند قطرے جو تمہارے ماتھے پر شرم سے نمودار ہوتے ہیں ــ دُرِ یتیم ہیں۔

بجا کہ ــــ تمہارے ابرو ہلالِ عید سے بھی باریک ہیں اور تمہاری متوالی آنکھیں نرگس سے بھی زیادہ مست ......

صحیح کہ ــــ تمہارے رخسار پر گلاب کو بھی رشک آتا ہے اور تمہارے لبوں پر تبسم کا بحرِ بیکراں مدام جوش مارتا رہتا ہے۔

اور ——— تمہاری رفتار۔ ہاں وہ نازک خرامی ——— جس سے تمہاری گردن کے ڈورے کو ہلکی ہلکی حرکت ہوتی ہے ——— جو تمہارے پیروں کی تھاپ پر داد دیتی ہوئی فضا میں سما جاتی ہے ——— تمہارے حُسن میں چار چاند لگا دیتی ہے۔

اور وہ ——— تمہارا ناز ——— قابل احترام ——— اور جس فخر حُسن سے تمہارا سر اونچا ہوتا ہے ——— یقیناً بجا ہے۔

اور چونکہ میں ان تمام خوبیوں سے بے نیاز ہوں ——— تم مجھے ہیچ سمجھتے ہو۔
لیکن یاد رکھو کہ

میرے پاس بھی ایک "گوہر نایاب" ہے ——— ساری دنیا سے عزیز ترین ——— جس سے میں آراستہ ہوں ——— اور ——— جو مجھ میں وہی ——— ہاں وہی جذبہ فخر پیدا کر دیتا ہے جس کے تم حامل ہو۔

اور جانتے ہو وہ کیسا ہے؟

وہ ہے ———

تمہارا تصور ——— تمہارا تخیل۔ تمہاری یاد

ہم سے افتادہ بھی چھو لیتے بہ ہنگام خرام ‌ ‌ ‌ اِک ذرا اور بھی نیچا ترا داماں ہوتا

(الگزینڈر ہیڈرلی آزاد)

خاک ہو کر میں دریار پہ پہنچا آزاد ‌ ‌ ‌ ہے رسائی پہ مرا بخت رسا میرے بعد

(الگزینڈر ہیڈرلی آزاد)

جنگل میں رُلا نہ جوشِ وحشت ‌ ‌ ‌ پھر خاک کہاں اُڑائیں گے ہم

(الگزینڈر ہیڈرلی آزاد)

مجھ سے کیسا حساب ہے یارب ‌ ‌ ‌ تری رحمت کا کچھ حساب نہیں

(الگزینڈر ہیڈرلی آزاد)

میں نے کہا کہ عشق میں جلئے تو جلئے کس طرح ‌ ‌ ‌ خس کو اُٹھا کے اس نے جھٹ آگ پہ رکھدیا کہ یوں

(الگزینڈر ہیڈرلی آزاد)

"شارق"
سالِ چہارم

حسو بھائی کی شادی؟

آج ہم آپ کو حسو بھائی کی شادی کا قصہ سنانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ قصہ شادی سے پہلے کا ہے موجودہ سماج میں شادی کا مسئلہ جتنا نازک اور پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے اتنا ہی دلچسپ بھی۔ ہمارے حسو بھائی کی شادی ان تمام موجودہ سماجی خرابیوں کی بولتی تصویر ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۳۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ ہم آپ کو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ۱۹۳۵ء میں دو بڑے اہم واقعات ہوئے۔ ایک تو برطانوی سرکار کی جانب سے ہندوستانیوں کو نیا دستور دیا گیا جو "قانونِ حکومت ہند ۱۹۳۵ء" کے نام سے مشہور ہے۔ اور دوسرے یہ سال ہمارے حسو بھائی کی شادی کا نقطۂ آغاز ہے سارے واقعات سننے کے بعد آپ ان دو باتوں کے حسنِ اتفاق کی داد دیں گے۔

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ۱۹۳۵ء کے مبارک سال میں حسو بھائی اساتذہ اور ساتھی طلبہ کے فضل و کرم سے ففتھ فارم میں آچکے تھے۔ جو اہم مسئلہ انہیں درپیش تھا وہ مضمونِ اختیاری تھا۔ آپ کہیں گے کہ مضمونِ اختیاری کو شادی سے کیا تعلق ہے؟۔ ہمارے خیال میں شادی بھی ایک قسم کا مضمون اختیاری ہوتا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے آپ اپنے خاندان اور محلے کے شادی شدہ حضرات کی فہرست پر نظر دوڑائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ داماد کے مضمونِ اختیاری کا تعلق خسر یا چچا خسر کے عہدے سے رہتا ہے۔ مثلاً داماد کے مضامین اعلیٰ ریاضی ہوں تو خسر افسر تعمیرات ہوگا۔ یا یہ کہ اگر داماد کے مضامین تاریخ ہوں تو خسر افسر تعلیمات ہوگا۔ یا یہ کہ داماد کے مضامین اُردو ادب ہوں تو خسر کسی مشاعرے کا صدر ہوگا پس یہ ثابت ہوگیا کہ داماد کے مضامین اختیاری کا تعلق راست خسر کے پیشے سے ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے ہمارے حسو بھائی کی شادی اور مضمون اختیاری کا دشوار مرحلہ درپیش ہوا تو ہمارے خاندان کی مجلسِ شوریٰ نے کافی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے کیا کہ اس معاملہ کو حسو بھائی پر چھوڑ دینا چاہئیے۔ حسو بھائی کو مُردوں سے خاص نفرت ہے۔ چنانچہ وہ غسالوں سے اور کفن چوروں سے کافی دور بھاگتے ہیں۔ انھوں نے طے کیا کہ تاریخ مُردوں کا علم ہے اس لئے وہ کسی ایسے مضمون کو پسند کریں گے جس میں بجائے موت کے حیات پائی جائے۔ حیات کی ابتدائی کیفیت کا مظاہرہ پودوں میں ہوتا ہے اس لئے طے پایا کہ مضمونِ اختیاری

نباتیات ہو۔ اب اس فارمولا کے تحت کہ شادی کا تعلق راست مضمونِ اختیاری سے ہوتا ہے، خسر کی تلاش شروع ہوئی۔ حسو بھائی نے "دفترِ پیامات شادی" کے ذریعہ اخبار میں اعلان کروایا کہ ہمیں ایک ایسا خسر چاہیئے جس کو جنگلی جڑی بوٹیوں میں یدطولیٰ حاصل ہو۔ خدا خدا کر کے حسو بھائی کی محنت ٹھکانے لگی اور معلوم ہوا کہ جنگلی جڑی بوٹیوں کے چودھری صاحب کی دو صاحبزادیاں ہیں۔ اب حسو بھائی نے مضمون اختیاری میں دلچسپی لینا شروع کی اور ۱۹۳۶ء میں امتیازی نمبرات کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ اس فتحیابی کی خوشی میں حسو بھائی نے اسکول کے بچوں میں شیرنی تقسیم کی۔

اس کامیابی کے فوراً بعد ہی چودھری صاحب کی صاحبزادی نمبر ۱ سے حسو بھائی نے سلسلہ جنبانی شروع کردی۔ چودھری صاحب کہتے تھے کہ چونکہ نجومیوں کا خیال ہے کہ جنگ دو سال چھ مہینے کے اندر شروع ہونیوالی ہے۔ اس لئے حسو بھائی آنے والے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے انٹرمیڈیٹ کامیاب کرلیں۔ حسو بھائی نے اُسی مضمونِ اختیاری کے اصول پر پابند رہتے ہوئے اپنے مضامین سیاسیات ہی رکھے۔

یہاں پر قارئین کو یہ سُن کر دلچسپی ہوگی کہ حسو بھائی کے سامنے وہی مسئلہ پیش ہوا جو شملہ کانفرنس کے وقت غیر جانبدار پارٹی کے رپورٹروں کو پیش ہوا تھا وہ یہ کہ آیا کانگریس کی تائید میں خبریں دیں یا مسلم لیگ کو بُرا بھلا کہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ چودھری صاحب کے گھر میں دو پارٹیاں ہوگئیں تھیں۔ ایک پارٹی صاحبزادی نمبر ۱ کے لئے کوشاں تھی اور دوسری صاحبزادی نمبر ۲ کے لئے اس خانہ جنگی کے باعث حسو بھائی کی شادی معرضِ خطر میں آچکی تھی۔ حسو بھائی بار بار اعلان کرتے کہ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ کیوں نہ اس مسئلہ کو انتخاب کے ذریعے طے کرلیا جائے۔ وہ حق خودارادیت کے نظریۂ کی بھی تشہیر کرتے۔ مگر چودھری صاحب کا یہ اٹل اعلان تھا کہ جب تک ہر دو پارٹی آپس میں سمجھوتہ کرکے کوئی متفقہ فارمولا پیش نہ کریں ہم نہ دارالعوام کو ہندوستانیوں کے ہاتھوں حکومت منتقل کرنے کی سفارش کرسکتے ہیں اور نہ ہی حسو بھائی کی شادی خانہ آبادی کا اعلان کرسکتے ہیں۔

حسو بھائی اسی کشمکش میں تھے کہ نشرگاہ سے بچوں کے پروگرام میں اعلان کیا گیا کہ حسو بھائی نے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ اس خوشی میں ہر دو پارٹیوں نے حسو بھائی کو پھولوں کے ہار پہنائے اور ایک میل لانبا جلوس بھی نکالا گیا تاکہ حسو بھائی کی کامیابی کے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ ان تمام ہنگاموں اور بدتمیزیوں کے باوجود خانہ جنگی کے ختم ہونے کے اسباب کا فقدان تھا چودھری صاحب نے اعلان کیا کہ قرائن یہ بتلاتے ہیں کہ عنقریب قانون

توسیعات نافذ ہونیوالا ہے اس لئے حسو بھائی خود کو اس خانہ جنگی سے دُور رکھتے ہوئے گریجوایشن کی تکمیل کرلیں۔ ایسا معلوم ہوتاہے کہ حسو بھائی کو ہر دو صاحبزادیوں کی بہ نسبت چودھری صاحب کا زیادہ خیال ہے۔ اس لئے انھوں نے تعلیم میں دلچسپی لینی شروع کی اور بالآخر ایک زبردست عالمانہ خطبہ کے بعد انہیں سند کامیابی دیدی گئی۔

یہاں سے حسو بھائی کی شادی نے ایسی کروٹ لی جس طرح جرمن فوجوں نے اسٹالن گراڈ میں ناکامی کے بعد لی تھی۔ وہ یہ کہ خانہ جنگی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ رکتے دیکھکر حسو بھائی نے ایک نئی مہم شروع کی۔ اب آپ حسو بھائی کو ایسے دلچسپ مشغلہ میں مصروف پائیں گے کہ آپ بھی مسئلہ تناسخ کے قائل ہوجائیں گے یعنی یہ کہ وہ اب کامن سنس کراس ورڈ کے حل کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ حسو بھائی نے خاص طور پر اس کے لئے تین گریجویٹ بیافت تیس تا ساٹھ ماہوار نوکر رکھ لئے تھے جن کا کام یہ تھا کہ وہ حسو بھائی کو اس مہم کے سر کرنے میں مدد دیں۔ حسو بھائی کا کمرہ انگریزی کے تمام ڈکشنریوں اور کامپیٹیشن کے حل شدہ رسالوں و نیز مہاتما گاندھی کے عدم تشدد، ہٹلر کی مین کیف اور فرائڈ کے ورکس سے بھرا ہوا رہتا اس زمانے میں حسو بھائی کے ذہن میں سوائے معمائی مسائل کے اور کوئی چیز داخل نہیں ہوسکتی تھی۔ مگر جب نتیجہ شائع ہوتا تو کم از کم پندرہ بیس غلطیاں تو ضرور رہتیں۔ اس کے باوجود حسو بھائی ہمت نہیں ہارتے تھے۔

ہٹلر کے یورپی ممالک پر قبضہ نے اگر کوئی انقلاب پیدا کیا تو وہ یہ تھا کہ حسو بھائی نے خیال کیا کہ اب اس کراس ورڈ پزل کے بجائے کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کرنا چاہیئے کیونکہ جب انگلستان پر جرمنی کا قبضہ ہوجائے تو پھر یہ کراس ورڈ معمہ خود بخود منقطع ہوجائیگا۔ مختلف پیشوں اور ذرائع معاش کے وسائل کے اختیار کرنے کی نسبت غیر جماعتی لیڈروں کی کانفرنس طلب ہوی اور انہوں نے متفقہ طور پر رائے دی کہ حسو بھائی کے لئے موجودہ بین اقوامی صورت حال میں موزوں ترین ذریعہ معاش گھوڑ دوڑ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ حسو بھائی کے بمبئی، پونا، کلکتہ کے موسمی دورے برابر ہوتے رہتے۔ اس ضمن میں کئی فلم کمپنیوں کے حسین اداکاروں سے ملنے کا موقع ملا۔ حسن اتفاق سمجھئے یا حسو بھائی کی بدنصیبی کہ یہ جس گھوڑے کے لئے شرط لگاتے وہ پیچھے سے اول رہتا۔ حسو بھائی پریشان کہ آخر یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ لیکن کوئی مفید مطلب برآری نہ ہوسکی بالآخر حسو بھائی نے اخبار میں پڑھا کہ فیڈرل سروس کمیشن کا امتحان مقابلہ ہے۔ حسو بھائی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس میدان میں کود پڑے۔ نتیجہ خلاف توقع اچھا نکلا۔ یعنے حسو بھائی کا نام فہرست میں سب سے اول تھا۔ اب کیا تھا ہندوستان کے ہر گوشے سے مبارکباد کے تار آنے شروع ہوئے۔ ملک کے تمام بیروزگاروں کی انجمن نے تہنیتی رزولیشن پاس کئے اور نہایت شاندار پیمانے پر "یوم حسو بھائی" بھی منایا گیا۔ جس میں

من چلوں کی انجمن نے کافی زور وشور سے حصہ لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اتحادیئں نے مغربی یورپ پر یورش
کی اور ہٹلر کے فتح کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ اور ادھر چودھری صاحب کا ستارۂ اقبال تخریب کی طرف
تیزی سے جا رہا تھا۔ حسو بھائی کو اچانک یہ اطلاع ملی کہ صاحبزادی نمبر (۲) فوت ہوگئیں اور خانہ جنگی کے ختم
ہونے کے آثار قدرتی طور پر پیدا ہو گئے۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ حسو بھائی چین سے زندگی گذاریں اور
انہیں خانہ جنگی سے جب چھٹکارا ملا تو بین اقوامی جنگ میں مبتلا کر دئے گئے۔ بین اقوامی جنگ کی اصطلاح
کو سمجھنے کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حسو بھائی کے فیڈرل سروس کمیشن کے امتحان مقابلہ میں اول آنے
کے بعد "دفتر پیامات شادی" اتنا مصروف ہوگیا جتنا کہ شملہ کانفرنس کے موقع پر شملہ کا تپہ خانہ۔ حسو بھائی
کی نسبت کے سلسلے میں تمام مفادات نے اپنی نمایندگی کرنا اخلاقی فرض سمجھا۔ مزدور، کاشتکار، جاگیردار،
وکیل، تاجر، صناع، وظیفہ یاب، عہدہ دار، مذہبی پیشوا، طوائف، غرض کہ کوئی ایسا مفاد نہیں تھا جس
نے اپنی نمایندگی نہ کی ہو۔ اور ایک دلچسپ عنصر جو اہل بصیرت کے لئے سامانِ عبرت رکھتا ہے وہ حسو
بھائی کے موافق اور مخالف پروپگنڈا تھا۔ طوالت کے خوف سے ہم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ
بعضے حسو بھائی کو جمہوریت کا دلدادہ سمجھتے تھے تو بعضے محوری حکومتوں کا کٹ پتلی نمایندہ۔ بعض کا خیال تھا
کہ حسو بھائی کا راست تعلق سرمایہ داروں سے ہے۔ اور بعض کہتے تھے کہ وہ دراصل مزدوروں کے مفاد کو پیش
کرنا چاہتے ہیں ایک پارٹی یہ اندیشہ ظاہر کرتی تھی کہ حسو بھائی ہندوستان میں دو قومی نظریہ کے قائل ہیں
تو دوسری پارٹی کا خیال تھا کہ حسو بھائی متحدہ ہندوستان کے سنہرے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک پارٹی
نے اپنی کوشش سے یہ ثابت کیا تھا کہ حسو بھائی کے آبا و اجداد قطب شمالی سے آئے ہیں تو دوسری پارٹی
کے محنت کے نتیجہ کا حاصل یہ تھا کہ حسو بھائی ہجرت کر کے قطب جنوبی چلے جائیں گے جہاں آجکل ہر ہٹلر مقیم
ہے۔ بیچارے حسو بھائی پریشان کہ یہ متضاد پروپگنڈا کیوں کیا جا رہا ہے۔ کوئی انہیں شرابی۔ جواری اور
چوروں کا سردار بتلاتا تو کوئی یہ کہتا کہ وہ دراصل سوباش بابو کی خفیہ پارٹی کے رکن۔ بعض یہ کہتے کہ حسو بھائی
کو دہی کی کڑی اور سریندر کے گانے پسند ہیں تو بعض کہتے ہیں حسو بھائی کی غذا انگارے بیگن ہے جو سہگل
کے ریکارڈ سنتے ہوئے مرغ پلاؤ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ اسی طرح یہ ثابت کیا جاتا کہ وہ دراصل
VEGETARIAN نہیں بلکہ گوشت خوار ہیں۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ان کی آخری زندگی میں
HIGH BLOOD PRESSURE کا ہونا لازمات سے ہے۔ قارئین کو اندازہ ہو رہا ہوگا کہ پروپگنڈا کن کن
عنوانات سے کیا جا سکتا ہے اور اگر ہم پر کسی راز کے افشا کرنے کا الزام نہ لگایا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر گوبلز مرحوم نے
اپنی ابتدائی عملی ٹریننگ ایسے ہی موقعوں پر حاصل کی تھی۔ ان تمام ہنگاموں میں حسو بھائی کیلئے کوئی چیز اطمینان دلانے والی تھی تو یہ تھی کہ وہ

بالآخر ایسا" اٹومک بم" تیار کریں گے جو ان سارے پروپگنڈوں کو نیست و نابود کر دے۔ ہم نے حسو بھائی کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ صداقت کمپنی میں" اٹومک بم" تیار کر رہے ہیں۔ قصہ مختصر ہندوستان کے سیاسی تعطل ختم ہونے کے امکانات پیدا ہو چلے ہیں۔ لیکن حسو بھائی کی شادی کا تعطل نہ ختم ہوا ہے اور نہ ہوگا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری سماج خود ایک ذہنی تعطل میں مبتلا ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔

ہم گرفتاروں کو کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
(فغاں)

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
(مظہر جانجاناں)

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا
(مظہر جانجاناں)

بانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی لپک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا
(انیس)

جب دیکھئے جی رہا ہے فانی
اللہ رے اسکی سخت جانی
(فانی)

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے
(حالی)

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
(حالی)

ہزار بار ہوی گو مآل گل سے دوچار
کلی سے خو نہ گئی پھر بھی مسکرانے کی
(جوش)

میرے جوش طلب کی شان استغنا کوئی دیکھے
کہیں رہبر سے آگے مجھ سے آگے ہی قدم میرا
(فانی)

یوں سب کو بھلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے
دنیا ہی میں رہنا ہے تو دنیا سے گذر جا
(فانی)

رفعت اللہ حسینی
بی۔ ایس۔ سی (آخری)

اکابر پرستی

اکابر' اکبر' کی جمع ہے جس کے معنی 'بڑے' کے ہیں۔ یہ لفظ اکثر ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو فطری یا خداداد قابلیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ اور جن کی زندگی اور سیرت انہیں سوسائٹی میں ایک نمایاں اور ممتاز مقام دے دیتی ہے۔ اسی لئے اکابر اور مشاہیر مترادف الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔ تاہم لغوی معنوں کا اعتبار کرتے یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص مشہور ہو اور بڑا نہ ہو جیسے مشہور چور یا ڈاکو یا کوئی شخص بڑا ہو اور مشہور نہ ہو جیسے کوئی گمنام شخصیت۔ تقریباً دنیا کے تمام زبردست حکمراں، فاتح، رہنما، پیشوا، معلم، مقرر، مصنف موجد، فلسفی اور شاعر وغیرہ اکابر اور مشاہیر میں گنے جاسکتے ہیں۔ لیکن بعض یوروپین مصنفین کی طرح انبیاء علیہم السلام پر بھی ان الفاظ کا کہنا جس مفہوم میں کہ وہ اکثر استعمال ہوتے ہیں غلط ہے کیونکہ انبیاء علیہ السلام کا درجہ اور مرتبہ اکابر سے کہیں ہزاروں اور لاکھوں گنا بڑا ہے۔ انبیاء علیہ السلام معصوم ہوتے ہیں۔ اکابر معصوم نہیں ہوتے۔ انسانوں کیلئے انبیاء علیہم السلام کے اسوہ اور سیرتوں کی من وعن تقلید کرنا جائز اور باعث رحمت اور نجات ہے۔ لیکن اکابر کی من وعن اتباع ناجائز اور مضرت رساں ہے۔ انبیاء علیہم السلام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سناتے اور اس کے بتلائے ہوئے طریق زندگی پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اکابر پر بھی ان ہی کی اتباع لازم ہے۔ اکابر کو کوئی حق حاصل نہیں اور نہ وہ اس کے لائق ہیں کہ اسی دماغی اور ذہنی کاوش سے انسانی زندگی کے اصول وضوابط مرتب کریں کیونکہ انسان کو ایک کامل اور جامع ضابطۂ حیات تو وہی دے سکتا ہے جس نے اسے پیدا کیا اور اس کا پالنے والا ہے۔ دنیا میں اکابر کی سب سے بڑی خدمت یہی ہوسکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین یعنی انبیاء علیہ السلام کی تعلیمات پر پہلے خود کاربند ہوں اور پھر انہیں قابلیتوں کے اثر وتاثر سے دوسروں کو بھی اس کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اپنے نفس کی فرسودہ خواہشات اور عقل کی ناقص ہدایات کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دنیا میں ایک انتشار اور خلفشار نمودار ہوجاتا ہے۔

اکابر کی خدا داد قابلیتیں اپنے اندر ایک ایسا جادو رکھتیں ہیں کہ معاصرین کی عقلوں کو مسحور کر کے انہیں ان کا گرویدہ اور گرفتہ بنا دیتی ہے۔ اس لئے اکابر کی راہ روی میں دنیا کے تہذیب و تمدن، اقوام و ملل کی سلامتی اور ترقی کا راز پنہاں ہے۔ اور ان کی گمرہی میں انسانیت کے لئے پیام موت ہے۔
اکابر کی عزت و تعظیم کرنا۔ ان کی تقلید اور پیروی کرنا ان کی زندگیوں کو کتابوں کی صورت میں محفوظ کرنا اور ان کی سیرتوں کی یاد کو تازہ رکھنا ایک حد تک درست اور سود مند ہے لیکن انسان جب اس میں اندھا دھن کام لیتا اور غلو کرنے لگتا ہے تو وہ اکابر پرستی کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے جو ایک طرف اس کو معیار انسانیت سے گرا دیتا تو دوسری طرف اکابر کو اپنے حقوق اور اختیارات سے تجاوز کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

۱۔ اکابر پرستی کی وجہ

اکابر پرستی اصل میں انسان کی عقل کے ایک دھوکے اور فریب کا نتیجہ ہے۔ دیکھنے والی نظر کے لئے تو کائنات کا ذرہ ذرہ حسین و جمیل ہے۔ اور اپنے اندر ایسی کشش اور جاذبیت رکھتا ہے کہ انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چاند سورج اور تاروں بھری رات کو دیکھکر تو وہ وجد کرنے لگتا ہے۔ دریاؤں اور پہاڑوں کی عظمت اور شوکت اس کی عقل کو اس طرح مسحور و مسخر کر دیتی ہے کہ اس کے سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ لیکن تاڑنے والی عقل فوراً تاڑ جاتی ہے کہ یہ ساری کرشمہ سازیاں جو انسان کو مسحور کر کے اپنا پرستار بنا لیتی ہیں کسی کی اپنی نہیں بلکہ صرف اس کارساز حقیقی کی ہیں جو سارے عالموں کا خالق و پروردگار ہے اور شاید اسی لئے قرآن مجید نے بھی انسان کی ہدایت و سعادت کے خاطر اس مضمون کو بار بار دھرایا کہ "یہ زمیں، یہ آسماں یہ جگمگاتے تارے، اور یہ چمکتے ہوئے آفتاب و ماہتاب اصل میں اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو عقل و بصیرت رکھتے اور سوچ بچار کیا کرتے ہیں" لیکن جب انسان کی عقل اس سوچ بچار اور غور و فکر کی عادی نہیں ہوتی تو کائنات کا یہی حسن و جمال جو معرفت الہی کا خزانہ ہے۔ گمرہی اور جہالت کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں عقل، خالق اور مخلوق، صنعت اور صانع میں فرق اور امتیاز کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اور انسان کو کسی ایک عظمت اور قدرت والے خالق کا عبد بنانے کی بجائے بیشمار بے روح اور ناقص الصفات موجودات اور مخلوقات کا غلام بنا کے اسے ذلیل و حقیر کر دیتی ہے شاید یہی وجہ تھی کہ کسی زمانے میں انسان چاند، سورج اور پہاڑ کا پرستار تھا۔ اور یہی وجہ ہے جس نے اسے اکابر پرستی کے پھندے کا بھی گرفتار کر دیا۔ اکابر کی قابل ستائش خصوصیات اصل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ جب چاہتا ہے دیتا ہے اور جب چاہتا ہے واپس بھی لے لیتا ہے۔ اگر یہ کسی کو مل جائے تو وہ شکر بجا لائے۔ اور نہ ملیں تو فکر کرنے کی کوئی ضرورت

نہیں۔ اور یہ بدترین غلطی ہے کہ انسان اکابر کو دیکھ کر بجائے خدا کے سامنے رکوع و سجود میں استقامت پیدا کرنے کے ۔خود ان ہی کی تعریف تقدیس اور پرستش میں کھو جائے ۔

۲- اکابر پرستی کی تاریخی کیفیت

اکابر پرستی دنیا کی بہت پرانی رسم ہے۔ قدیم یونان، مصر، روم اور ہندوستان میں اس کو ایسی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگئی تھی کہ انسان کی زندگی کا کوئی شعبہ اور اس کے مسائل کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہا تھا جس کو اس نے متاثر نہ کیا ہو۔ اکابر کی اتنی تعظیم و تکریم کی جاتی اور ان کے جلوس اس شکوہ و احتشام سے نکالے جاتے تھے کہ وہی اُن کے ربِ اعلیٰ معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے سامنے سجدہ کرنا ، نذر و نیاز، تحفہ تحائف سے ان کے دلوں کی تالیف کرنا، ان کے مجسموں کی پوجا پاٹ کرنا اور یہاں تک کہ ان کا دیکھ لینا بھی داخل عبادت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن نہ اکابر کو اور نہ اکابر پرستوں کو یہ توفیق تھی کہ انسان کے محاسن و محامد دیکھکر اس کے خالق کے عظمت اور قدرت کی داد دیتے ۔ اکابر اپنی تعریف سن کر پھولے نہیں سماتے تھے۔ وہ غرور اور تکبر سے اتراتے اور اپنی عظمت اور شوکت کی نمائش کر کے لوگوں کے دلوں میں اپنے رعب داب کا سکہ بٹھانے کی دُھن میں رہتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے بادشاہ اور حکمران ہی نہیں بلکہ ان سارے اختیارات کے مالک سمجھتے تھے جو صرف کسی خالق ارض و سماں کے لئے ہی سزاوار ہو سکتے ہیں۔ لوگوں کی غیر معمولی عزت اور تعظیم نے تو گویا ان کو ربوبیت کا مقام دے دیا تھا۔ ان ہی کے حکم و فرماں سے شہر کے تمام قوانین کا اجرا ہوتا۔ ان ہی کی مرضی و منشا انسانی زندگی کے اصول و ضوابط مرتب کرتی اور ان ہی کے ایما اور اشارہ پر دنیا کے تمام تہذیب و تمدن۔ معاشرہ و آداب قصرہائے فلک بوس تعمیر ہوتے تھے۔ لوگوں کے سجدوں نے ان کے نخوت اور غرور کو اس قدر بے انتہا کر دیا تھا کہ ان میں سے اکثروں کو فرعون کا ہمزبان ہو کر وَاَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی کا دعوی کرنے اور نمرود کی ہمسری کرتے ہوئے اپنے معصوم و بیباک حق پرستوں کو آگ کے شعلوں کی نذر کرنے میں کوئی باک نہ ہوتا تھا۔ ان سارے مظالم سے ان کا مقصد یہی تھا کہ انسانوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں جانوروں کے گلوں کی طرح زیر اثر رہ کر بے چوں و چرا ان کی اطاعت اور بندگی بجا لاتے رہیں اور وہ اس طرح اپنی حکمرانی کی ہوس اور اقتدار کی پیاس کو بجھا سکیں تاہم ان الزامات کا ان اکابر پر کوئی اطلاق نہیں ہو سکتا جو صالحین میں سے تھے۔ اور جو اپنے خواہشات نفس کی پیروی سے پرہیز کرتے تھے۔ اور لوگوں کو بھی اسی کی تعلیم و تلقین کرتے تھے۔ لیکن اکابر پرستی کے نقائص اور برائیاں اتنی ہمہ گیر ہیں کہ وہ ہر قسم کے اکابر کی افادیت کو تہ خاک کر دیتی اور ان کے وجود کو دنیا کے لئے اور انسان کے لئے

لعنت اور نکبت کا ذریعہ بنا دیتی ہیں۔ اکابر پرست اکثر اکابر کی موت کے بعد بجائے اُن کے اسوہ اور سیرت کا مطالعہ کرنے کے اُن کے مجسموں کی تیاری اور اُن کے قبور کی آرایش اور زیبائش میں مشغول ہو جاتے ہیں اور ان بے رُوح اشیاء کی تعظیم اور احترام میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے ہیں۔ شاید یہیں سے صنم پرستی اور قبر پرستی کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔

۳۔ اس کی موجودہ کیفیت

اکابر پرستی دنیا کی پرانی رسم ہی نہیں بلکہ آج کا بھی جیتا جاگتا رواج ہے۔ اس کی صورت اور شکل اور اس کے نام اور القاب اس طرح بدل گئے ہیں کہ ہم شناخت نہیں کر سکتے شناخت کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کے معنی اور مفہوم، علامات اور اشارات کو پوری طرح ذہن نشین کر لیں۔ اور پھر دیکھیں کہ موجودہ تہذیب، تمدن۔ معاشرہ آداب کے وہ کونسے شعبہ اور پہلو ہیں جن میں ان کا ظہور ہوتا ہے۔ پرستی کا لفظ جہاں کہیں آئے وہاں انسان کی عبودیت کا رشتہ کسی نہ کسی کی ربوبیت اور الوہیت سے جڑ جانے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اکابر پرستی۔ انسان کے اکابر کا عبد اور غلام بنجانے کو کہتے ہیں۔ عبد بن جانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اکابر کے سامنے سجدہ کیا جائے یا اُن کے ناموں کی تسبیح پڑھی جائے۔ بلکہ عبد بننے کی واحد شرط یہ ہے کہ ان تمام احکام و فرامین کی جو وہ اپنی طرف سے دیتے ہوں۔ بلا تامل پابندی کی جائے۔ خدا پرست یا توحید کے معتقد ساری برائیوں اور تمام تعریفوں کے لائق صرف ایک ہستی کو مانتے ہیں جو کل کائنات کا خالق اور پروردگار ہے۔ وہ اپنی عبودیت کا رشتہ اسی ذات واحد سے جوڑتے ہیں۔ اور اسی کے احکام و فرامین کی پابندی کرتے۔ اللہ کے احکام پہنچانے والے انبیا علیہم السلام ہیں۔ جو انتہائی معصوم اور سچ گو ہوتے ہیں اور جنکی سیرتوں میں ان کی یہ صفات، روز روشن کی طرح نمایاں ہیں اس طرح خدا پرستوں کے پاس ایک شریعت (دستور حیات) پوری طرح مرتب رہتی ہے۔ وہ اس کے سوائے دوسروں کے بتلائے ہوئے طریقوں سے پرہیز کرتے ہیں یعنی انکے نزدیک دنیا کے کسی انسان کو خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ ذہن اور زبردست طاقت کا حامل ہو زندگی کی قانون سازی (LEGISLATION) کا حق حاصل نہیں۔ وہ اپنے امیر، سردار، بادشاہ، حکمران کے اسی وقت تک مطیع اور فرماں بردار رہتے ہیں جب تک کہ وہ اللہ کے قوانین کو چلاتے یا (EXECUTE.) کرتے رہتے ہیں۔ اور جونہی وہ اللہ کے ہدایات کی بجائے اپنے ایماء، اشارے، مرضی و منشاء کو دنیا پر مسلط کرنا چاہتے ہیں تو خدا پرست انہیں ٹھکرا دیتے اور ان کو اپنے مقام سے نکال دیتے ہیں اس کی بے شمار مثالیں خصوصاً اسلامی تاریخ میں اکثر و بیشتر ملتی ہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا موجودہ

زمانے میں بھی انسان خدا کی شریعت کا پابند ہے یا اکابر کے بتلائے ہوئے طور طریق کا پیرو ہے۔ آج انسان اللہ تعالیٰ کی شریعت کو بھلا چکا ہے جو کامل، جامع اور اس کو راہ یاب کرنے والی ہے اور وہ سراپا اپنی زندگی گذارنے میں اکابر کا غلام اور محکوم ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ آج عجیب وغریب مصائب و آلام سے دوچار ہو رہا ہے۔ ترکی میں اتاترک کا مرتب کردہ نظام جاری و ساری ہے۔ روس میں کارل مارکس لینن و اسٹالین کی شریعت نافذ ہے۔ کچھ دن پہلے جرمنی میں ہٹلر کی مرضی و منشا کارفرما تھی اٹلی میں مسولینی مختارِ کُل بنا ہوا تھا۔ اور دوسرے ممالک میں جہاں ایک شخص کی حکومت و سلطنت نہیں وہاں اشخاص کا ایک گروہ، پارلیمنٹ کے نام سے، لیجلیٹو کونسل کے نام سے یا دوسرے ناموں سے۔ انسان کی زندگی کا صحیفہ مرتب کرتا ہے۔

بہرحال آج بھی وہی اکابر پرستی جاری ہے جو گذشتہ زمانوں میں تھی۔ ایک طرف اکابر لوگوں کی عبودیت کو اپنے ذات سے جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں تو دوسری طرف لوگ ان کے احکام کو تسلیم کر کے اُن کے ہاتھوں میں کٹ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ اکابر کے دئے ہوئے اصول انسان کی فلاح سعادت اور اتحاد اور اخوت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ اُن کی نفسانی خواہشات مثلاً ملک گیری کی ہوس زر کی حرص، رنگ، نسل، اور ملک اور قوم کی تفریقوں۔ عزت حشمت، حکومت اور اقتدار کی تمناؤں پر منحصر ہوتے ہیں اور یہی چیزیں جنگوں اور لڑائیوں کے اسباب ہیں۔ روس کا اشتراکی نظام بلاشبہ رنگ نسل، خون، ملک کی تفریقوں سے بالاتر ہے لیکن اتنا اکمل اور اعلیٰ نہیں جتنا ایک مذہبی شریعت ہو سکتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ مذہبی شریعت ایک ایسی ہستی کی مرتب کردہ ہے جو عالم کل ہے۔ غیب اور حاضر دونوں کا علم اس کو حاصل ہے انسان غیب کا علم نہیں رکھتا۔ اس کا علم ناقص ہوتا ہے اسی لئے اس کے علوم میں روزمرہ ترقی اور تبدیلیاں ہوسکتی ہے۔ اشتراکیت انسانوں کا تراشیدہ نظام ہے۔ اسی لئے وہ ہر لحظہ تغیر پذیر ہے ہر وقت اس میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایسے نظام سے انسان کو کوئی نجات اور سکون حاصل نہیں ہوسکتا۔ آج روس میں خدا کے وجود سے تو انکار کیا جاتا ہے لیکن اسٹالین کے جبر و استبداد کی خدائی کے سامنے سرِ تسلیم خم ہو جاتا ہے۔ اسٹالین کی انتہائی عزت و تعظیم کی جاتی ہے۔ اس کا حکم و فرمان اٹل قانون ہے۔ وہ اپنی قوت اور قہاریت سے ٹراٹسکی اور تقریباً چودہ ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ محض اس جرم پر کہ انہوں نے اس کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا۔ یہ تمام اکابر پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟

۴۔ نتائج اور عواقب

غرض اکابر پرستی نے دنیا میں کوئی بار آور نتائج نہیں پیدا کئے۔ وہی انسان جو زمین پر اللہ کا نائب بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس رسم کی بدولت خدا سے غافل اور خود سے

ناآشنا ہو کر اپنی ہی خدائی کرنے لگا۔ اور وہی انسان جس کے سامنے کبھی فرشتوں اور ملائکہ کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تھا۔ بجائے خدائے کامل الصفات کے آستانے کی جبہ سائی کرنے کے چند ناقص و ناچیز انسانوں کے سامنے جھک کر اپنے آپ کو ذلیل وخوار کر لیا۔ اکابر پرستی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے انسانوں کو جنہیں ایک ہی بھائی چارے اور رشتۂ اخوت میں منسلک رہنا چاہیئے بشدید تفرقہ بندیوں کا شکار کردیا۔ دنیا میں ایک طرف اکابر کے مغرور و متکبر گروہ نمودار ہوئے تو دوسری طرف ان کے پرستاروں، محکوموں اور مظلوموں کی غریب وستم رسیدہ جماعتیں عالم وجود میں آئیں۔ پرستاروں کو تو خیر اکابر کی تعریف اور خوشامد سے فرصت ہی نہیں ملتی لیکن ان کے محکوموں ومظلوموں کے خیالات اکثر ان کے قوت اور اقتدار سے ٹکر لیتے ہیں اور جب کبھی یہ تصادم نمایاں صورت اختیار کر لیتا تو تاریخ شاہد ہے۔ کہ ایسی ایسی خون آشام اور تباہ کن لڑائیاں وقوع پذیر ہوئیں جن کی یاد سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پوپ کا فتنہ، قیصر کا فساد فرانس کی شورش اور روس کا ہنگامہ سب کے سب اسی اکابر پرستی کے مرہونِ منت ہیں۔

۵۔ قوموں کا زوال اور انحطاط

قوموں اور سلطنتوں کے زوال اور انحطاط کی جہاں بے شمار وجوہات میں وہیں ایک بڑی وجہ اکابر پرستی بھی ہے کسی قوم یا سلطنت کی زندگی اور بقا کا سارا انحصار اس کے افراد کے افکار اور خیالات کی وحدت، مضبوطی اور استحکام پر ہے۔ جب افراد کے نزدیک کوئی واحد مطمحِ نظر یا نصب العین متعین نہیں رہتا اور انسان کی زندگی کے کوئی مستقل اور مرتب شدہ اصول وضوابط ان کے پیش نظر نہیں رہتے ان کا زوال پذیر ہونا ایک مسلمہ امر ہے، اکابر پرستی افراد کے ذہن سے ان کے نصب العین اور زندگی کے تصور اور اس کے اصول وضوابط کو بالکل نکال لیتی ہے، نتیجتہً ان کے نزدیک کوئی ایسی کسوٹی باقی نہیں رہتی جس پر بھلے اور برے، مفید اور مضر کو پرکھ سکیں وہ یہ پہچاننے سے بالکل قاصر ہوتے ہیں کہ آیا کوئی چیز ان کے نصب العین کے حصول میں مخل ہے یا ممد و معاون وہ اکابر کی محض ایک اندھی تقلید میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ خود اکابر کے خیالات اور طریق زندگی ان کے معیار حیات اور مرتب شدہ اصول وضوابط پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ اس کی وجہ سے افراد میں علم کم ہو جاتا اور جہل پھیل جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی عقل وبصیرت کو شاذونادر ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال رومی عوام (ROMAN MOB.) کی مل سکتی ہے۔ یہ رومی عوام کا جہل ہی تھا جو سلطنت رومیہ جس مضبوط اور مستحکم طاقت کے زوال کا سبب بنا۔ جہل کے ساتھ ہی افکار کی وحدت فنا ہو جاتی ہے اور ان میں مضبوطی اور استحکام کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وحدت افکار ہی اصل میں کسی قوم کی اجتماعیت کی اساس ہے

جب یہ ختم ہو جاتی ہے تو اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ کس طرح روما کی عظیم الشان سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی اور اس کی طاقت میں اضمحلال آگیا۔ اکابر پرستی اقوام کو جاہل ہی نہیں بلکہ عمل کی سرگرمی سے بھی آسودہ کر دیتی ہے۔ قوموں اور سلطنتوں کی ساری قوت چند خاص انسانوں میں مرکوز ہو جاتی ہے اور ان کے سارے کاروبار اور معاملات ان ہی چند انسانوں کے محور کے اطراف گھومتے رہتے ہیں۔ اگر ان شخصیتوں کی نظر و بصیرت صحت مند ہو تو قومیں ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہیں ورنہ ان کو زوال آجاتا ہے۔ ایسی صورت میں اقوام و ملل کی ترقی کا ستارہ اسی وقت تک جگمگاتا رہتا ہے جب تک اس کے اکابر زندہ ہوتے ہیں۔ اکابر کی موت کے ساتھ بھی اقوام پر بھی موت طاری ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اکابر کے سوا اقوام میں جو کچھ ہوتا ہے وہ جاہل عوام کا خس و خاشاک کے سوا کچھ نہیں۔ دنیا میں بہترین سے بہترین تحریکیں اٹھی ہیں لیکن صرف اس لئے فنا ہو جاتی ہیں کہ ان کی زندگی اور حرکت کا سارا دارومدار ان کے شاندار نصب العین پر نہیں بلکہ ان کے پر جلال لیڈروں پر تھا۔ اُن کے جتنے ارباب کار تھے وہ لیڈروں کے خاطر کام کرتے تھے۔ نصب العین کے لئے نہیں۔ انہیں محبت رہنماؤں سے تھی اور منزل مقصود سے نہیں۔

۶۔ انسان کی خودی

انسان کا اصلی جوہر جو اسے ساری کائنات میں اشرف اور اعلیٰ کر دیتا ہے اس کی اپنی خودی یا اس کی حفاظت کرنے کی صلاحیت ہے۔ جب اس کی خودی مٹ جاتی ہے تو اس میں اور جمادات، نباتات اور حیوانات میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

انسان کی خودی اللہ کی ایک نعمت اور قیمتی امانت ہے جو اس کے سپرد کی گئی۔ اِس لئے انسان کا سب سے مقدس فریضہ ان کی حفاظت کرنا ہے۔ اسی سے اس کی عرش تک رسائی ہے اور وہاں منہ دکھانے کے قابل ہے ورنہ وہ وہاں سے دھتکار دیا جاتا اور تحت الثریٰ میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان پر خودی کی حفاظت کا بوجھ ہی نہیں ڈالا بلکہ اس کے ذرائع بھی بتلا دیئے چنانچہ اس کو توحید کی تعلیم کی۔ توحید کا اعتقاد ہی انسان کی خودی کی معراج ہے۔ کیونکہ انسان لا اِلٰہ کے نشہ سے ہی دنیا کے سارے جھوٹے خداؤں کی خدائی پر ضرب کاری لگا سکتا اور پھر اِلا اللہ کی مدد سے ہی ایک سچے وصادق پروردگار کا نیا شوالہ بنا سکتا ہے۔ لیکن جب انسان اکابر پرست ہو جاتا ہے تو دوسروں کا غلام ہو کر اپنی خودی کو فنا کر لیتا ہے۔ وہ جانور اور پتھر ہو جاتا ہے اس کے قویٰ پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ وہ کان رکھتا ہے لیکن اپنے کانوں سے نہیں سنتا، وہ آنکھ رکھتا ہے لیکن اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا۔ وہ عقل رکھتا ہے لیکن اپنی عقل سے نہیں سوچتا۔ اکابر اپنے پرستاروں کے گرہوں کو بکریوں کے

ریوڑ کی طرح ہانکتے اور اکثر گمراہ کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود اپنے علم میں، عمل میں صفات میں اور کمالات میں کامل نہیں ہوتے۔

اختتام | انسان کی سلامتی اور فلاح کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ وہ اپنے کو اسی صراط مستقیم کا پابند کرلے جس کی ایک علیم و خبیر ہستی نے اپنے انبیا علیہم السلام کے ذریعہ تعلیم و تلقین کی ہے۔ ان تعلیمات میں انسان کی ان تمام گمراہیوں ضلالتوں اور اندوہناکیوں کا علاج ہے جو اسے اپنے مقام سے گرا دیں اور تنزل کی طرف لے جاتی ہیں۔ ان میں انسان کے خودی اور ان کی حفاظت ہی نہیں بلکہ انسان کی سیرت کو اس طرح سنوارنے کی صلاحیت بھی ہے کہ وہ اپنے عالمگیر رشتۂ برادری کو قائم رکھ کے خوش و خرم زندگی بسر کرسکتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر انسان اکابر کے خود بتلائے ہوئے اصول و ضوابط، طور و طریق کا پابند ہو جائے تو وہ ہر قسم کی واہی تباہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

رسم خودداری سے گو واقف نہ تھی دنیائے عشق
پھر بھی اپنا زخم دل شرمندۂ مرہم نہ تھا
(فانی)

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو کد
ہر شاخ ہر شجر پہ میرا آشیاں نہ تھا
(فانی)

مفہوم کائنات تمہارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا
(فانی)

زباں کٹتی ہے ذکر آشیاں پر
تمنا بھی بہت تھی آشیاں کی
(فانی)

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
(فانی)

خوں کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسم گل آگیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں
(فانی)

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
(غالب)

ہر چند بگولا مضطر ہے اک جوش تو اسکے اندر ہے
اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بیچین سہی برباد سہی
(اکبر)

میر محمد علیخاں کلیم
سال اول

غزل

تقدیر میکشوں کی بھی کیا لاجواب ہے　　ساقی کی ہر نگاہ میں لطفِ شراب ہے

دل کو بنا لیا ترے جلوے نے جلوہ گاہ　　یا بارگاہِ حسن میں دل باریاب ہے

یہ تو سوالِ وصل پہ وہ مسکرا دئے　　واللہ یہ جواب بھی کیا لاجواب ہے

تیرے شعاعِ حسن کی تعریف کیا کروں　　ہر ذرہ مری نظروں میں اک آفتاب ہے

پہلو کو دل دیا ہے تو دل کو دیا ہے درد　　کچھ تیری رحمتوں کا بھی یارب حساب ہے

دل میں ہی تو دماغ میں تو سامنے ہی تو　　اس پر بھی تیرے رخ پہ ستمگر نقاب ہے

رکھا نہ اے کلیم کہیں چین سے مجھے
کتنا خراب یہ دلِ خانہ خراب ہے

سید عبدالحی منیر
سالِ سوم (آنرز)

فانی کا مقام اُردو شاعری میں

شیلےؔ نے کہا ہے کہ "ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جو ہمارے ٹوٹے ہوئے تاروں کی جھنکار سے پیدا ہوں" لیکن وہ جھنکار جو اُردو شاعری کے ایک مشہور اور معروف تار کے ٹوٹنے سے پیدا ہوئی ہے اور اس سے جو سریلا نغمہ نکلا ہے وہ ہمارے کانوں میں ابتک گونج رہا ہے اور آئندہ بھی جبتک کہ اُردو شاعری کا وجود باقی ہے اس کی جھنکار ہماری آنیوالی نسلوں کے کانوں میں ہمیشہ گونجتی رہے گی۔

فانی دورِ حاضرہ کے ان معدودے چند غزل گو شعراء سے تھے جن کا مقام اُردو شاعری میں ہمیشہ ہمیشہ بلند و بالا رہا ہے۔ فانی اس دور میں پیدا ہوئے جبکہ "میر"۔ "مومن" اور "غالب" جیسی باکمال ہستیاں عالم وجود میں آچکی تھیں۔

فانی کا پورا نام محمد شوکت علیخاں تھا۔ ابتداء میں شوکت تخلص کرتے تھے بعد میں بدل کر "فانی" کرلیا تھا۔ یہ افغانی النسل تھے۔ آپ کے والد محمد شجاعت علیخاں (بن غلام نبی خاں بن اکبر خاں بن داؤد خاں) رئیس اعظم بدایون کے فرزند ارجمند اور شرفائے افغانستان کے ایک سابق فرمانروا قبیلہ "اٹھ مٹر" کے چشم و چراغ تھے۔ فانی کے پرنانا نواب بشارت علیخاں گورنر صوبہ بدایوں تھے جن کی کل جائداد کوئی سوا لاکھ روپیہ سالانہ کی تھی لیکن بدقسمتی سے یہ غدر ۵۷ء کے نذر ہوگئی اور صرف تیرہ (۱۳)۔ چودہ (۱۴) سو ماہانہ کی جائداد رہ گئی تھی جو خود فانی کے ہاتھوں بھی آئی۔ لیکن کچھ تو ان کی لاابالی طبیعت اور کچھ ناتجربہ کاری نے اس رہی سہی جائداد پر بھی پانی پھیر دیا اس جائیداد سے محروم ہونے پر انہیں زندگی کی کشمکش سے کچھ ایسا دوچار ہونا پڑا کہ انہیں وطن کو خیرباد کہنا پڑا اور روٹی کی فکر نے اٹاوہ۔ لکھنو۔ آگرہ اور حیدرآباد میں انہیں زندگی کے اتار چڑھاؤ دکھائے۔ وہ اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے یوں بھی زندگی کی بہت سی راحتوں سے محروم ہوگئے تھے اس پر غربت تو گویا جلتی لکڑی پر تیل کا کام کرگئی۔ فانی کی اس کس مپرسی کی حالت کا ایک مکمل نقشہ ان کے اس شعر میں ملتا ہے۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانی ان شعراء سے تھے جو پیدا ہوتے ہیں بنتے نہیں۔ فانی کو ہم آج شاعری کے جس بلند مقام پر دیکھ رہے ہیں اس کے آثار تو ان کے بچپن ہی سے رونما ہونے لگے تھے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" فانی کے دل میں شعر گوئی کا جذبہ گیارہ[1] سال کی عمر سے پیدا ہوگیا تھا۔ حسن اتفاق سے جو استاد ان کو ابتدا میں تعلیم دیتے تھے وہ خود بھی شعر و سخن میں ذوق سلیم رکھتے تھے۔ فانی پر ان کی صحبت کا ایسا اثر ہوا کہ انٹرنس پاس کرنے تک ۱۸۹۸ء انہوں نے اپنا پہلا دیوان مرتب کرلیا تھا چونکہ ان کے والد کو اس شاعری کے فطری جذبہ سے تعلیم خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے انہوں نے فانی کی شاعری کے اس پہلے ثمرہ کو نذر آتش کرکے راکھ کردیا۔ لیکن یہ عملاً فانی کے اس جذبہ کا غلط اندازہ تھا۔ انہوں نے دیوان جلا کر گویا طوفانی سیلاب کو سنگ ریزوں سے روکنا چاہا تھا۔ انھوں نے سمندر میں مٹھی بھر ریت پھینک کر سمجھا کہ سمندر کو پاٹ دیا انہوں نے فلک بوس آگ کے شعلوں پر چلّو بھر پانی پھینک کر سمجھا کہ آگ کو ٹھنڈا کردیا۔ لیکن آگ کی جو چنگاریاں فانی کے دل میں دبی ہوئی تھیں اور جو اندر ہی اندر شعلہ زار بن جانے کے لئے تڑپ رہی تھیں آخر کار اپنا کام کرنے لگیں فانی نے ۱۹۰۶ء میں اپنا دوسرا دیوان مرتب کرلیا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ چوری گیا۔ اس کے بعد انہوں نے جو کچھ بھی کہا اور ضائع شدہ کلام جس قدر بھی حافظہ کی مدد سے مل سکا وہ رسالہ "نقیب" بدایون سے ان کے پہلے دیوان کی صورت میں شائع ہوا۔

فانی قدیم رنگ کے پیرو تھے۔ انھوں نے جب شاعری شروع کی تو قدیم و جدید رنگ کے پرستار صف آرا ہو چکے تھے۔ فانی نے قدیم رنگ کو جدید پر ترجیح دی اور اس رنگ سے اپنی شاعری کو رنگ لیا۔ یہ رنگ یاس و حرمان ہے یا مایوسی و ناکامی کا ایک مجسمہ۔ فانی کی شاعری کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں آپ کو فلسفہ محبت، تدبیر، مجاز و حقیقت، بقاء و فناء اور نظریات و مسلمات کے بہترین نمونے ملیں گے۔

فانی نے اپنی پوری روداد زندگی صرف اپنے تخلص میں پیش کرکے گویا دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مقولہ کو صحیح ثابت کیا ہے ان کا اپنے کو فانی کہنا گویا اپنے آپ کو بصورت تصویر پیش کرنا ہے۔ چونکہ فانی کی زندگی خود ایک مجسم غم والم بن کر گزری اس لئے رنج و غم ان کی رگ رگ میں سرایت کرگیا تھا۔ ایک تو طبیعت کو غم سے فطری لگاؤ، اور مناسبت پھر انکی دکھ بھری زندگی نے تو گویا شراب کو دو آتشہ بنا دیا تھا۔ غم ان کی فطرت میں اس قدر سمو گیا تھا کہ وہ غم کے نئے نئے پہلو ڈھونڈ نکالنے غم کی انتہا عشق اور عشق کی انتہا حسن میں فنائیت ان کا ایمان ہوگیا تھا۔ گو 'فانی' کی زندگی ناکامیوں

میں گزری لیکن ان ناکامیوں نے ان کے کردار میں ایک خاص تغیر پیدا کر دیا تھا۔ دنیوی لباس میں وہ ایک فلسفی سے کہیں زیادہ درویش دکھائی دیتے تھے۔ زندگی کی متواتر چوٹوں نے انہیں ایک مجسم غم بنا دیا تھا۔ مسلسل رنج و غم سے ان کی مسکرانے کی کوشش میں بھی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ ذیل میں فانیؔ کے کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں آپ کو شب فرقت۔ الم جانگداز۔ یاس و حرمان مایوسی و ناکامی کی مکمل تصویریں بولتی چالتی ملیں گی۔

شب فرقت کٹی یا عمر فانی　　　اجل کے ساتھ آمد ہے سحر کی

دَیر میں یا حرم میں گذرے گی　　　عمر تیرے ہی غم میں گزرے گی

اجل کی آرزو ہو دل میں فانی اور دنیا ہو　　　خدا رکھے یہی رونق ہے اس اجڑے ہوئے گھر کی

فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود　　　شیرازہ آج دفتر غم کا بکھر گیا

نامرادی حد سے گزری حال فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

آتی رہے گی خیر اب زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت میری زندگی ہوئی

آ۔ اب اے مرگِ ناگہانی آ
سخت منتظر ہیں تیرے شیدائی

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے
ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ میرے مرجانے کا

موت آئے تک نہ آئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا

میری اک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبت نے میری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

کفن اے گرد لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کر بدلے

غرض غم کی اتنی صحیح اور حقیقی ترجمانی دنیا کے بہت کم شاعروں نے کی ہوگی۔ مختصر یہ کہ فانی کا کلام رنج و غم میں ڈوبا ہوا ہے اور غم ہی ان کی شاعری کا مستقل موضوع بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے فانی نے خود کو پرستار شب ہجر، دل سوگوار، دفتر غم، کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور اپنی زندگی کو شب فرقت، الم جانگداز، جنازہ آہ بے تاثیر، داستان غم شب انتظار، اضمحلال رنگین، وجود درد بتایا ہے۔ لیکن رنج و غم میں راحت و تسکین کی تلاش بھی ایک بڑا کام ہے اور یہ اک ایسا آرٹ ہے جو کہ صرف جوہر شناس یا اک سچے طالب ہی کی نظر میں جچ سکتا ہے۔ غرض دنیا میں جب تک کہ غم کا وجود ہے فانی کو فنا نہیں گویا "فانی" لافانی" ہیں۔

"فانی کو عام طور سے یادگار میر۔ و غالب بھی کہا جاتا ہے۔ وہ اس لئے کہ "فانی" کی شاعری میں میر اور غالب جیسی باکمال شخصیتوں کا ایک لطیف رنگ پایا جاتا ہے۔ گو ان کے کلام میں مومن اور مرزا داغ دہلوی کا رنگ بھی جستہ جستہ ملتا ہے۔ لیکن ان کا کلام میر اور غالب سے بہت متاثر ہے۔ مثلاً ذیل میں میر اور فانی کا ایک ایک شعر درج ہے۔ جس سے آپ کو خود بھی فانی کے کلام میں میر کے رنگ کا خاکہ نظر آئے گا۔

میر کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

فانی یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اس نے کہا کہئے
تو چپ ہیں کہ کیا کہئے کھلتی ہے زبان کوئی

اسی طرح فانی کے اکثر و بیشتر اشعار ایسے ہیں جو میر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ذیل میں فانی کے کچھ اشعار درج ہیں جو کہ میر کے رنگ میں کہے گئے ہیں:۔

اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانہ کا

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کے ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

اب بھی تیرا وعدہ وفا ہو نہ ہو
موت کا وعدہ تو وفا ہو گیا

چارہ تپ ہجر کا کیا کروں
زہر بھی تو کمبخت دَوا ہو گیا

فانی کی شاعری غالب سے بھی اتنی ہی متاثر رہی جتنی کہ میر سے یوں تو فانی کے اکثر اشعار پر غالب کی تقلید کا گمان ہوتا ہے لیکن بعض پوری پوری غزلیں غالب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ فانی کے کچھ اشعار ذیل میں درج ہیں جو غالب کے رنگ میں ہیں:۔

ہو بھی چکے تھے دامِ محبت میں ہم اسیر
عالم ابھی بقید زمان و مکان نہ تھا
اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک
اس مرحلہ معنی تماشا سے گزر جا
کاش پوچھو تو کچھ بتائیں ہم
حاصل شکوہ ہائے باہم کیا

مختصر یہ کہ میر اور غالب سے، فانی اس قدر متاثر ہیں کہ اگر میر اور غالب کے درمیان

کوئی کرمی الگ سکتی ہے تو وہ فانی کا کلام ہے۔ آیئے اب فانی کی شاعری میں کچھ نقش عمل یا زندگی تلاش کریں
فانی کی نظروں میں زندگی ہمیشہ ایک معمہ بن کر گذری اور وہ بھی ایک ایسا معمہ جو نہ خود سمجھنے کا
ہے اور نہ سمجھانے کا یا بقول ان کے "دیوانے کا خواب"۔

ایک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

فانی انسان کی زندگی کو حباب آسا سمجھتے تھے جس کے فنا ہو جانے کا اندیشہ ہر گھڑی اور ہر منٹ لگا
ہوا ہو۔ انسان کو انہوں نے مادّی اور روحانی دونوں طریقوں سے جانچا اور آخر کار اس نتیجہ پر پہونچے۔

برق دم لینے کو ٹھہرے تو رگِ جاں ہو جائے
فتنۂ حشر مجسم ہو تو انسان ہو جائے

میر مسئلہ جبر و قدر کے قائل تھے اور انھوں نے اپنے اکثر و بیشتر اشعار اسی موضوع پر کہے ہیں۔ فانی
بھی مسئلہ جبر و قدر کے قائل تھے۔ ان دونوں کی نظر میں زندگی جبر مسلسل یا پیہم درد و کرب کا دوسرا نام تھا۔
وہ زندگی کو جبر اور انسان کو مجبور سمجھتے تھے چنانچہ زندگی کی تعریف جبر و قدر کی روشنی میں انہوں نے
یوں کی ہے کہ

میر

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہمکو عبث بدنام کیا
یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

فانی

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل
غریب کشمکش جبر و اختیار میں ہے

تقدیر اور تدبیر کے معمہ کو فانی نے یوں حل کیا ہے۔

ے میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر
کیا یہ ساری عمر منہ تکتی رہیں تقدیر کا

دیکھ فانی وہ تیری تدبیر کی میت نہ ہو
جا رہا ہے اک جنازہ دوش پر تقدیر کے

مذہبی نقطۂ نظر سے فانی ایک سچے مسلمان تھے۔ دیگر شعراء کی طرح بتان باطل کے آگے جبین خم کرنا ان کے لئے ایسا ہی حرام تھا جیسا کہ ایک سچے مسلمان کے لئے ہوتا ہے وہ خدا کے قائل تھے اور انہوں نے اس کے وجود کی یوں دلیل دی ہے۔

ے تجھ سے انکار بن نہیں پڑتا
اپنی ہستی گواہ ہوتی ہے
مجھے بلا کے یہاں آ کے چھپ گیا کوئی
وہ مہمان ہوں جسے میزبان نہیں ملتا
آپ اپنی ہی آڑ میں تو ہے
تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

وہ سوائے خدا کے دوسرے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا حرام جانتے تھے اور کہتے تھے۔

ے جھک گیا تیرے آستاں پہ جو سر
پھر کسی آستان پہ خم نہ ہوا

قصہ مختصر فانی آج دنیائے فانی میں موجود نہیں ہیں وہ دور بہت دور ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں دنیا کی ہر بےچینی کو چین مل جاتا ہے اور ہر بیماری کی شفا کا غیب سے سامان ہو جاتا ہے۔ ے موت کی نیند آ گئی بیمار کو
غیب سے سامان شفا ہو گیا

فانی کو اپنی موت کا حال بہت پہلے ہی سے معلوم ہوگیا تھا۔ مرنے سے کچھ عرصہ قبل یہ کہنا ترک کر کے۔

؎ اللہ رے بڑی سخت جانی　　　جب دیکھئے جی رہا ہے فانی

یہ کہنا شروع کر دیا تھا۔

؎ چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید
کچھ اَب کے بوئے کفن دامنِ بہار میں ہے

اس لئے انہوں نے اپنا کتبہ مزار مرنے سے ایک سال قبل ہی لکھوا لیا تھا۔ اس وقت لوگوں نے یہ سمجھا کہ اپنی اہلیہ محترمہ کے انتقال کے صدمہ سے ان کا دماغی توازن ٹھیک نہیں رہا لیکن آج جبکہ ہماری نظریں ان کے کتبہ مزار پر پڑتی ہیں تو منہ سے بے ساختہ ایک آہ نکل جاتی ہے اور کتبہ کے یہ اشعار ہماری آنکھوں کو تر کرتے ہوئے دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

"اِس دارِ فنا میں جو تھا بدنامِ حیات　　　اِک عمر رہا موردِ الزامِ حیات"
"فانی جس کی حیات تھی حسرتِ مرگ　　　اِس خاک میں دفن ہے وہ ناکامِ حیات"

اتوار کا دن ٢٧ر اگست ١٩٤١ء کی شام کو پونے چھ بجے دو ماہ کی مسلسل علالت کے بعد مادرِ وطن کے اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت فرزند کی رُوح یہ کہتی ہوئی پرواز کر گئی۔

؎ آج روزِ وصالِ فانی ہے　　　موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

دوسرے دن (١١½) بجے اس مجسمہ یاس واندوہ اور پیکرِ رنج و الم کو درگاہ یسفین میں جہاں امیر اور داغ مدفون ہیں سپردِ خاک کیا گیا اور اس طرح وہ شمع جو مسلسل (٦٢) سال تک ہماری ادبی محفلوں کی رونق بنی رہی یکایک ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ اور پروانوں کو داغِ مفارقت دے گئی۔

سچ ہے کہ :-

؎ موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس　　　یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

6

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لئے　　　شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لئے (انیس)

دلِ بستگی قفس میں یہاں تک ہوئی مجھے　　　گویا مرا چمن میں کبھی آشیاں نہ تھا (افقر)

سید محمد خاں
سال دوم

افکارِ پریشاں

۱۔ نگاہِ مست

صبح کا سہانا وقت، نسیم سحری کے جھونکے شبنم کے موتی سبز گھاس کی مخمل پر بکھرے پڑے تھے۔ سفیدی سحر افق آسماں پر پھیلی جا رہی تھی۔ سیاہی شب کافور ہو رہی تھی باد نسیم اٹھلاتی ہوئی چمن کے غنچوں اور کلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی، حرم کے پردوں کو اڑاتی ہوئی اس پیکر مستی تک جا پہونچی جس کو غنچہ شگفتہ کہتے ہیں اور تلوے سہلانا شروع کیا ——

دوشیزہ جس کی مست خواب آنکھیں، اشک چشم آہو بے چین تھیں —— اپنی نیم و امخمور آنکھیں جس سے اس کی دوشیزگی اور دوشیزگی کی امنگیں ظاہر ہو رہی تھیں۔ کچھ کچھ کھلیں۔ آنکھوں سے نیم خوابی ٹپک رہی تھی، جوانی انگڑائی لیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی جس کی نظر ان آنکھوں پڑتی اور نگاہوں سے نگاہیں ملتیں وہ بھی مست آنکھوں کی مستی سے مست و بیخود ہو جاتا ——

اس نے لیٹے ہی لیٹے کلی کو دیکھا۔ جو اس کو دیکھ مسکرایا چاہتی تھی۔ دوشیزہ کی نظر کلی پر پڑی —— ساتھ ہی آسماں سے شبنم کا ایک قطرہ بھی ٹپکا —————— کلی نے چٹکنا شروع کیا ـ

کھِلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

۲۔ تبسم

دوشیزاؤں نے عین دوشیزگی میں اس رنگین دنیا سے کنارہ کیا اور عالم غیر محسوس میں بسیرا کیا۔ اُن کے ساتھ اُن کا پُر لطف اُمیدوں بھرا دل بھی عالم محسوسات کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونے کی تمنا لئے سنوں مٹی میں دفن ہو گیا —————— —————— !!

پھولوں کا لباس، نورانی حلہ، سراپا نور بلکہ نور علی نور، چمن لاعین رات ولا اذن سمعت میں گلگشت کرتے ہوئے فانی مقام کا خیال آجاتا ہے ایک کہہ اٹھتی ہے "بوا! بھلا دیکھو تو یہ کلی بھی اتراتی ہے اور پھول بننے کے شوق میں پھولوں نہیں سماتی ہے۔ بتاؤ اس کا ثبات اور قیام بھی ہے"۔

ہاں بہن! پوچھیں کہ "کس مسرت نے تجھے اس مقام پر پہونچایا کہ تو جامہ سے باہر ہوئی جاتی ہے"۔

کلی دونوں کو سراپا سوال دیکھکر بول اٹھی "آؤ میری بھولی بھالی بہنو! تم کو میں سمجھاؤں سوال کا جواب دوں اور عالم تحیر میں مستغرق کردوں ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

۲۔ عالم سے ...

اے عالم تجھے چاہیئے کہ دنیا کو اپنے علم سے منور کردے۔ یاد رکھ! تو کبھی فنا نہیں ہوگا چونکہ تو جس دولت کا مالک ہے وہ ہمیشہ رہنے والی ہے —— اس میں شک نہیں کہ تجھ کو اپنی بھی فکر کرنی چاہئیے —— مگر زیادہ فکر علم کے اشاعت کی —— تیرا سینہ خزانہ ہے انمول موتیوں کا —— اُس سے بڑھکر —— تیرے سینے کے مدوجزر دریاؤں کی موجوں سے زیادہ وقعت رکھتے ہیں —— اُٹھ اپنی ہستی سے باخبر ہو اور دنیا کو خبر دار کردے۔ ہند کے رہنے والوں کو آزادی کا پیام دے۔ اُن کو اس کی سخت ضرورت ہے —— اُٹھ اور اُٹھ کے ہندوستان کے ان تمام جھگڑوں کو مٹا دے۔ علم کے دریا بہادے —— جس کی موجوں میں میرے ہندوالوں کے فسادات اور افراتفری —— جو مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے —— ڈبو دے!

تو ہی تو وہ ہے جو سینکڑوں معلومات اپنے سینے میں محفوظ رکھتا ہے —— تیرے سینے میں قدرت کے کئی راز پوشیدہ ہیں۔

تیرا ہر حکم الہام سے کچھ کم نہیں ہوتا —— تیرا قلم سلطنتوں کے تختے الٹ دیتا ہے۔ مذہب کو انتہائی ترقی دی۔ ہاں یاد رکھ کہ تیرے قلم کی ذراسی جنبش نے مذہب کو بہت بھیانک بھی بنا ڈالا۔

تو ہی تو وہ ہے کہ جس کی سیاہی کا قطرہ شہیدوں کے خون کے قطرہ سے بڑھ کر ہے اور تو ہی

تو وہ ہے جس کا مقام عرش کے قریب ہوگا۔

ہاں! مگر یاد رکھ تجھ سے سختی سے پوچھا جائے گا تیرے اعمال کے متعلق ــ تجھ کو چاہیئے کہ بہت سوچ سمجھکر قلم چلاسے!

دنیا کو خصوصاً ہند کے رہنے والوں کو پیغام آزادی دے اتحاد اور اتفاق کے پیغام کے ساتھ۔

۴۔ اقبالؒ سے

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق تری استاذ کے ساتھ سعادت مندی اور پھر یہ شعر اتنی کم عمری میں کہنا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے　　قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

اس بات کی دلیل ہیں کہ تو مستقبل کا نامور شاعر ہوگا ــــ اور ہو کر ہی رہا ــــ

تو نے رومیؒ کو اپنا استاذ مانا ــ کیوں نہ بناتا ــــ تصوف سے جو خاندانی لگاؤ چلا آرہا ہے تو نے اپنا ایک لائحہ عمل بنایا ــ ایک ضدی کے مانند نہیں ــــ بلکہ ایک فراغ دل کی طرح ــــ تو نے جب اچھائیاں دیکھیں تو ان کو اپنا بنانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی ــــ والٹ ۔ وھٹمین ۔ برگسان اور نطشے کے وہ نظریے جس کو تو اچھا سمجھتا تھا ــــ اپنا شعار بنایا۔ تو نے عمیق فکر کے بعد ایک لائحہ عمل ترتیب کے ساتھ پیش کیا ــــ اور اس کو ملحوظ رکھا کہ اختیار کرنے والے کو اس میں تکلیف نہ ہو۔ شاید یہ قرآن حکیم کے غائر مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

اگر تو عہد جاہلیت کا شاعر ہوتا تو متنبی کی طرح ایک مذہب کا پیغمبر سمجھا جاتا اور اس مذہب کے اصول اسلام سے بہت مشابہت رکھتے۔ لیکن تو عہد نبوت کے بعد کا شاعر ہے ۔ تو نے دنیا کے مذاہب کا عمیق مطالعہ کیا اور اسلام میں وہ سب کچھ پایا ــــ بلکہ اُس سے زیادہ ہی ــــ جس کا تو طالب تھا ــــ تو مذاہب کی وادی میں کسی چیز کی تلاش میں تھا اور تجھے وہ اسلام کی وسیع ترین وادی میں نصیب ہوئی تو نے اول اول ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھا ــــ مگر جب تجھ کو معلوم ہوگیا کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوسکتی ــــ تو نے اپنا مقام پیدا کر لیا۔

اب تری نظر وسیع تھی۔ اب تو اسلام کی صداقت کا قائل ہوگیا تھا ــــ اور اسی کے طفیل دلیر بھی اب تو اظہار حقیقت میں بیباک تھا ۔ دُنیا کے بڑے بڑے نام تجھ پر رعب نہیں ڈال سکتے تھے ۔ تو نے بڑے سے بڑے فلسفی کا مطالعہ کیا اور اس کی غلطیوں کے اظہار کرنے میں اس کے شدائد ہو

اور اُس کی شہرت سے مرعوب نہیں ہوا ــــــ جو ہزاروں سال سے چلی آ رہی تھی ــــ تب ہی تو افلاطون جیسی ہستی کے متعلق کہتا ہے

راہبِ دیرینہ افلاطونِ حکیم ۔۔۔ از گروہِ گوسفندانِ قدیم

کیوں نہ ہو وہ خیال پرست جو ٹھیرا اور تو عمل کا طالب ــــــــــ!

آرزو اور اُمید انسان کے لئے کیا اہمیت رکھتے ہیں ـــــ وہ ظاہر ہے ــــ بغیر ان کے ترقی ناممکن ــــ وہ جاندار ہی نہیں جسمیں آرزو اور اُمید نہ ہو ـــــ اور تو ــــ تو بے جان کو بھی آرزو اور امید کا حامل پاتا ہے

سوتوں کو ندیوں کا شوق بحر کا ندیوں کو عشق ÷ موجۂ بحر کو تپش ماہ تمام کے لئے

تو جنگ اور جدل کو پسند کرتا ہے ــــ مگر ــــ اخلاق کی دُرستی کے لئے۔ اس سے غلط استغنا مراد نہ ہو ــــ جنگ انسانیت کے لئے جتنی ضروری ہے۔ وہ پوشیدہ نہیں اور پھر اخلاق کیلئے تو نہایت ضروری۔

تو نے سکون کو موت کے مترادف قرار دیا ہے اور چلا اٹھا کہ ہر وہ شئے جو حالت سکون میں ہے موت پا سکنے کے عالم میں ہے ــــ زندہ قومیں اِس کی دلیل ہیں اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حرکت میں برکت ہے

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی ۔۔۔ یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ان تمام چیزوں کے باوجود ترا لائحہ عمل نامکمل سا رہتا اگر عشق کی اس میں کارفرمائی نہ ہوتی ــــ عشق بغیر جہاں اور اُس کے فروعات نامکمل۔ انسانیت ادھوری۔ تعلیم تشنہ۔ مگر یہ بوالہوس کا کام نہیں ہے۔ زندہ دلوں اور روشن ضمیروں کا کام ہے عشق مترادف بوالہوسی نہیں عشق باعث تکمیل لائحہ عمل اور ترقی پزیری زندگی ہے اسی لئے تو کہتا ہے

حدیثِ عشق بہ اہلِ ہوس چہ میگوئی ۔۔۔ بچشمِ مور مکش سرمۂ سلیمانی

اور یہ کہ

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم ۔۔۔ جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ترا ارتقاءِ ذہنی بھی خوب ہے کبھی تو وطن کے گیت گاتا نظر آتا ہے ــــ ہمالہ میں کبھی ــــ تو نیا شوالہ میں کبھی اِس کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور دوسری نظمیں بھی اس چیز کی حامل ہیں۔ کبھی قوم کے ترانے گاتا ہے اور قومیت کو وسیع کرتا ہے۔ ہمالہ۔ بچے کی دعا۔ ایک آرزو۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت۔ ترانۂ ہندی وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ کبھی اس کی شکایت کرتا ہے اور پکار اٹھتا ہے

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اِس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور کہتا ہے ع
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اسی سے

آخر اسلام پر آن کر رُکتا ہے ـــــ جو دراصل انتہا ہے ہر چیز کی ـــــ ترے نزدیک اسلام کے ہر فرد کا مقام "چرخ نیلی فام" سے "پرے" ہے ؎

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

کبھی تو انہیں ماضی کی یاد دلاکر جگاتا ہے ؎

بتا یا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؛ زور حیدر فقر بو ذر صدق سلمانی

دیگر

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تو کبھی خدا کے دربار میں "شکوہ" کرتا ہے اور اِس شکوے میں بھی دنیا والوں کے لئے ایک مثال ہے کہ "شکوہ" ہو تو ایسا ہو ـــــ اور پھر کبھی "جواب شکوہ" بھی دیتا ہے جس میں مسلمانوں کے کارناموں کو مانتے ہوئے اُن کے زوال کی وجہ بتائی ہے۔

کہیں تو انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اجتماعیت کی تلقین کرتا ہے جس میں "خودی" کو ٹیس نہ لگ جائے ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

سچ ہے فرد سے افراد ہیں اور افراد سے اقوام ـــــ انفرادی ترقی اجتماعی ترقی کی وجہ ہے۔

ترا کلام قرآن و حدیث کی تفسیر ہے اور خود کے خواب کی تعبیر ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دلسوزئ پروانہ ہے

تشبیہات و استعارات ترے غلام ہیں ـــــ تو اردو کا خدائے سخن ہے ـــــ جس لفظ کو چاہے معراج کمال پر پہونچائے ـــــ یہ ترے لئے معمولی بات ہے ترا کلام "پیام مشرق" ہے نہ صرف یہی بلکہ ترے یہاں "ارمغان حجاز" ہے اور تھکے ماندے مسافروں کے لئے "بانگ درا" بھی ـــــ بعض دفعہ تو سراپا سوال بن کر پوچھتا ہے "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" اور کہیں خودی اور بیخودی کے رازہائے سربستہ کو افشاں کرنا چاہتا ہے اور تو اس کی رمز اسے بھی نہ آشنا نہیں تب ہی تو کہتا ہے

ع آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس ـــــ !

عمیق مطالعہ کے بعد جو بات دل سے نکلتی ہے وہ امر بنجاتی ہے تب ہی تو ترا کلام

"جاوید نامہ" ہے ۔
جب خدا نے سوتی قوم کو جگانا چاہا تو اُس میں تجھ جیسا شاعر پیدا کر دیا اور ترے کلام میں اُس نے وہ خوبی بخشی جو سوتی قوم کو جگانے کے لئے الارم کا کام کرے ـــــ ترا کلام عربی کے زور فارسی کی شیرنی اور ہندی کی دل نشینی سے مالا مال ہے۔ جسمیں فلسفی کی غواصی۔ معاش کی دنیاوی بہبودی۔ ماہر تعلیم کی تعلیمات۔ سیاس کی سیاست۔ صوفی کا تصوف ـــ پنہاں ہیں۔
زمانہ کا یہ دستور چلا آیا ہے کہ ہر بڑے آدمی پر اہل زمانہ نے اعتراض کیا چنانچہ تجھ پر بھی زمانہ نے اپنا قدیم حربہ استعمال کیا اور تو نے بہادروں کی طرح زندہ دلی سے اس کا مقابلہ کیا۔
شہرت اور نمود سے تجھے واسطہ نہ تھا۔ لیکن ترا کلام کیا اہل نظر کو گرویدہ بنانے کے لئے کم ہے ؟ اس نے اپنا عمل کیا اور لوگ تیرے والا و شیدا ہو گئے اور ایک حد تک تجھ پر بے پناہ ـــــ فریفتہ ! مگر تیرا دروازہ سب کے لئے کھلا تھا ـــــ کیا استاذ اور کیا شاگرد۔ کیا عالم اور کیا مبتدی کیا گدا اور کیا شہنشاہ ـــــ یہ نتیجہ تھا ترے تبحرِ علمی کا ـــ تو فارسی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اُردو تری مادری زبان تھی۔ سنسکرت پر تجھے عبور تھا انگریزی میں کمال اور جرمن زبان پر کامل دستگاہ ـ ساتھ ساتھ عربی تری مذہبی زبان تھی
ترے کلام میں لغزشیں بھی ہیں مگر یہ لغزشیں ہی ترے کلام کی خصوصیات ہیں اور کیوں نہ ہوں جبکہ تو خود کہتا ہے کہ لغزش ترقی کے لئے ضروری ہے اور یہی نقص تو اہل فرنگ میں دیکھتا ہے کہ اُن کے یہاں لغزش نہیں ہے ؎

در ہوائش گرمی یک آہ بیتابانہ نیست　　　رند این میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست

سچ تو یہ ہے بقول گرامی ؎

در دیدہ معنی نگراں حضرت اقبال　　　پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

کاش ہندوستان والے ترے کلام سے استفادہ کریں ترے کلام اور ترے بتائے ہوئے لائحہ عمل کو اپنا لائحہ عمل بنا کر اُس پر عمل پیرا ہوں ورنہ نتیجہ معلوم ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

۵ - ابر

اے ابر! تو آزادی سے چاروں طرف اُڑا پھرتا ہے ـــــ کبھی ترا گزر پُر فضا وادیوں سبزہ زاروں، خوشنما باغوں، کوہساروں اور آبادیوں پر سے ہوتا ہے تو کبھی خوفناک غاروں، ریگستانوں اور چٹیل میدانوں پر سے ـــــ کبھی تو دریا میں طوفان برپا کر دیتا ہے کبھی پہاڑ کی چوٹیوں سے ٹکرا کر خاموشی میں موسیقی کی لہر پیدا کر دیتا ہے ـــــ شاید ہی کوئی سیاح ترا مقابلہ کر سکے کونسا خطہ ہے جہاں ترا گزر نہیں ـــــ دنیا والے تری بہت قدر کرتے ہیں مگر تری زیادتی سے گھبراتے ہیں اور کمی سے پریشان ہوتے ہیں ـــــ تو ان تمام چیزوں سے بے نیاز کہیں زیادہ برس گیا اور کہیں کم ـــــ کہیں برستے برستے رہ گیا اور کہیں یکایک برس گیا ـــــ تری زیادتی سے فصلیں برباد ہو گئیں ـــــ تجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ـــــ تیری کمی کی وجہ سے قحط پڑ گیا ـــــ تجھے احساس نہیں -

جس طرح دنیا والے خود مقید ہیں بالکل اُسی طرح وہ آسمانی قوتوں کو بھی قید کرنا چاہتے ہیں ـــ وہ اُنھیں غلام بنانا چاہتے ہیں ـــــ ہاں ـــ اے اپنی خودی سے بے خبر! اے آزاد سیاح! ہوشیار ہو جا ـــــ !!

تو ہی تو وہ ہے جو قدرت کے اشاروں سے دنیا کی تجارت کو درہم برہم کرتا رہتا ہے تاکہ دنیا والوں کو یکسوئی حاصل نہ ہو ـــــ دنیا والے آسمان پر اپنی ہوس ملک گیری کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے حملہ آور ہوں تو ـــــ تو ہی اُن کا پہلا نشانہ ہوگا ـــــ یاد رکھ! اے سیاح اعظم! اُن کے حملے کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں کہ کس طرح تجھ کو غلام بنایا جائے اور اپنے قابو میں کیا جائے۔

جس طرح فاتح قوم کے باشندے مفتوح باشندوں سے غلامانہ کام لیا کرتے ہیں اور وہ غلام قوم کو معاشی، تجارتی اور زرعی ذریعوں سے اپنی ضروریات کو پورا کیا کرتے ہیں اسی طرح وہ تجھ کو بھی غلام بنا کر اپنی ضروریات کو پورا کرنا چاہتے ہیں ـــــ تو انسانوں کے دست برد سے نہیں کبھی نہیں بچ سکتا ـــــ یہ تری آزادی اور آوارہ گردی ہی تری گرفتاری کا سبب ہو گئی ـــــ !

دنیا والے تجھے قابو میں محض اس وجہ سے لانا چاہتے ہیں کہ جب چاہیں تیرے موتیوں بھرے دامن سے موتی اُڑالیں

آہ! کتنے خود غرض ہیں یہ دنیا والے ـــــ اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کا مطلق

خیال نہیں رکھتے۔

۶۔ طالب علم اور دُنیا

طالب علم درس گاہ سے نکلا ——— انسانی جامعیت کی تعلیم پاکر ———

اُس نے دیکھا دنیا منہ پھاڑے بیٹھی ہے ——— اس کی جامعیت کو برباد کرنے، اُس کے اخلاق کو بگاڑنے اور اس کی شہرت کو داغدار کرنے کے لئے۔

اور ——— دنیا نے اُسے اپنانا چاہا ——— تاکہ ——— اس کی جامعیت سے غلط استفادہ کرے اور اُس کے علم سے دوسروں کو گمراہ اور اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رسوا کردے ——— لیکن طالب علم پھندے میں نہیں آیا۔

دنیا نے روپ بدلا ——— ایک خوفناک روپ۔ طالب علم سہم گیا۔ علم نے اس کی پیٹھ ٹھونکی ——— دُنیا نے غضب نازل کیا ——— طالب علم سہ گیا۔ دنیا نے ناکامیوں اور مفلسیوں کو بھیجا ——— علم نے کہا "اہل کمال ہمیشہ آشفتہ حال رہتے ہیں" ———

طالب علم برداشت کرگیا

دنیا نے پھر ایک کروٹ بدلی ——— حسن دولت کے دروازے کھول دئے۔ طالب علم کے پاؤں ڈگمگا گئے ——— مگر علم نے سنبھال لیا۔

حسن وعشق دنیا کی طرف سے آئے ——— طالب علم نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

دنیا نے تخت شاہی کو پیش کیا ——— طالب علم قبول کرنے کے لئے جھکا ——— لیکن علم نے روک لیا۔

دنیا نے پھر ایک اور روپ بدلا ——— مصیبتوں کے پہاڑ لاکھڑا کئے ———

طالب علم دل برداشتہ ہوگیا ——— مگر علم اور تجربہ نے دلاسا دیا ———

دنیا جھنجھلا گئی ——— زمین گردش کرنے لگی۔ آسماں تھرا اٹھا ——— دُنیا نے اس کا ساتھ دینا چھوڑدیا ——— طالب علم جارہا۔

دنیا نے پلٹا کھایا ——— اور ——— سرنگوں ہوگئی،

علم گلفشاں ہوا اور تجربہ مسکرادیا۔

۷۔ خیالات[1]

اتفاقاً مصور کے موئے قلم سے ایک شاہکار بن جاتا ہے اور اُس شاہکار کی بے انتہا شہرت کی وجہ سے خود مصور کو اُس سے نفرت اور بغض پیدا ہوجاتا ہے اور اس جذبہ سے متاثر ہوکر وہ اپنی پوری کوشش دوسرے نقش کی تیاری میں صرف کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ یہ نقش اُس شاہکار کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ ہی شہرت دوام کا تاج اُس کے سر پر رکھا جاتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر کلی کھلتے ہی مرجھائی جائے بعض دفعہ کلی کھلنے کے کچھ دیر بعد مرجھائی جاتی ہے اور بعض کھلنے سے پہلے ہی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کلی کھلتی ہی اِس لئے ہے کہ مرجھائی جائے۔

وہی آدمی دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرسکتا ہے جو اس دنیا میں آن کر اپنا ایک لائحہ عمل تیار کرتا ہے اور اس پر سختی سے کاربند ہوتا ہے۔

بڑے بڑے اور اونچے اونچے مکانات میں رہ کر عالیشان فلک بوس ایوانات کی جبہ سائی کرنا، اِس سے یہ کہیں بہتر ہے کہ چھوٹی سی کٹیا میں اور آزادی کی فضا میں کچھ اس طرح بسر کریں کہ ماحول ہر وقت تعظیم کے لئے جھکتا نظر آئے۔

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی ۔۔۔ نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی (جگر)

حدودِ کوچۂ محبوب ہے وہیں سے شروع ۔۔۔ جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگائے ہوئے (جگر)

ہم سے دل آپ نے اٹھا تو لیا ۔۔۔ پر کہیں اور بھی لگا نہ سکے (جرأت)

مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی ۔۔۔ تم آئے تو گھر بے سروساماں نظر آیا (جوش)

---

[1] یہ خیال کا صحیح ہونا اور اس سے ہر شخص کا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ مضمون نگار

دیاوتی استھانہ
سالِ چہارم

اقبالؔ کی "ایک شام" کا دوسرا منظر

مدہوش کر رہی ہے کیا چاندنی قمر کی　　　مستی سے جھومتی ہیں شاخیں ہر اک شجر کی

وارفتگانِ فطرت دھومیں مچا رہے ہیں　　　جھرنے پہاڑیوں کے کیا گنگنا رہے ہیں

کل کائنات غش ہے منظر کھلا ہوا ہے　　　ہر سو بہار کا اک دفتر کھلا ہوا ہے

ایسا سماں فسوں کا مسحور کر رہا ہے　　　سیلاب بحر سب کو مخمور کر رہا ہے

تاروں کے قافلے بھی تیزی سے اب رواں ہیں　　　آثار زندگی کے چاروں طرف عیاں ہیں

لہریں مسرتوں کی ہر شئے سے ہیں ہویدا　　　ہو جائے دل بھی میرا لہروں میں گم خدایا

اے مردہ دل! خدارا بیدار تو بھی ہو جا

ان بادہ نوشیوں سے سرشار تو بھی ہو جا
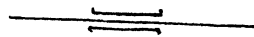
میر مقصود علیخاں
سال چہارم

زندگی اور عمل ــــ اقبال کی نظر میں

زندگی کا مفہوم کائناتِ عالم کا غائرانہ مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ یہاں کے مرکبات کی تین قسمیں ہوسکتی ہیں، ایک جماد، دوسری نبات اور تیسری حیوان۔ انھیں کو فلسفہ کی زبان میں موالیدِ ثلاثہ کہا جاتا ہے۔ ان میں کا ہر ایک اپنا ایک علٰحدہ امتیاز رکھتا ہے۔ جمادات کو لیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُن کی خصوصیات وزن، جسامت اور شکل ہیں۔ جمادات کے بعد نباتات کی باری آتی ہے یہہ جمادات سے افضل ہیں کیونکہ قوتِ نمو یا بالیدگی سے یہہ سرفراز کئے گئے ہیں۔ مرکبات کی تیسری قسم ہے حیوانات جو جمادات ونباتات کی ساری خصوصیات رکھنے کے بعد احساس اور حرکتِ ارادی کا بھی امتیاز اپنے اندر رکھتی ہے۔ حرکتِ ارادی ہی ایسی قوت ہے جو کسی شئے میں ودیعت کی جائے تو وہ شئے حیوان یعنی زندہ کہلائی جاتی ہے۔ مرکباتِ عالم کے سلسلۂ ارتقار کی آخری کڑی یا بالفاظِ دیگر حیواناتِ عالم کی آخری سرحد انسان پر آکر ختم ہوجاتی ہے۔ انسان میں وہ تمام خصوصیات اور امتیازات پائے جاتے ہیں جو جماد ونبات وحیوان میں ہمیں ملتے ہیں۔ وزن، جسامت اور شکل، قوتِ نشوونما اور احساس وحرکتِ ارادی سب کچھ اسمیں ہے مگر ان تمام اوصاف سے بالاتر ایک ایسا وصف اور خصوصی امتیاز بھی اسے عطا کیا گیا ہے جو ہمیں دنیا کی کسی اور شئے میں نظر نہیں آتا اور وہ ہے اس کا نطق وادراک۔ ادراک ہی کی قوت سے انسان اشیار کی حقیقت جانتا ہے، مسائل استدلال اور استنباط کرتا ہے۔ گویا سوچ بچار، تفکر، تعقل سب ادراک ہی کے کرشمے ہیں یہہ خوب واضح رہے کہ حیات انسانی کی حقیقت سمجھنا اور مقصدِ حیات کا متعین کرنا سب ادراک ہی کا کام ہے۔

کچھ دیر پہلے زندگی کے مفہوم کی ہم نے اس طرح وضاحت کی کہ وہ شئے جو متحرک بالارادہ ہو۔ زندہ ہے۔ اسی وجہ سے ہم ہر اس چیز کو جس میں حرکتِ ارادی مفقود ہو مردہ کہتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی ــــ یہہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے

آرزو محرک عمل ہے

مگر کیا انسان کی زندگی کی دلیل یہی ہے کہ وہ ہمیشہ جانوروں کی طرح حرکت کرتا رہے؟ بزوگوسفند بھی تو حرکت کرتے ہیں مگر کیا یہ انہیں معنوں میں زندہ ہیں جن معنوں میں کہ انسان زندہ ہے؟ اقبال کی عمیق نظر اور بلیغ فکر ایسی نہیں کہ حیات انسانی کو حیاتِ حیوانی سے ممیز و ممتاز نہ کرے۔ عرفِ عام میں زندگی کا جو بھی مفہوم تھا اس کو اقبال نے اوپر کے اشعار میں واضح کر دیا ہے مگر وہ زندہ اسی فردِ انسانی کو تصور کرتے ہیں جس کا دل آرزوؤں سے معمور اور جس کا قلب امیدوں سے لبریز ہو۔ گویا زندگی کی دلیل آرزو کا پایا جانا ہے۔ لیکن کیا اقبال نے زندگی کا یہ اچھوتا تصور اس لئے پیش کیا ہے کہ ہر چیز میں جدت ڈھونڈنے والی نگاہیں معاً ان کی طرف متوجہ ہو جائیں؟ نہیں! بلکہ نظر ذرا سطح کو چھوڑ کر عمق کی طرف بڑھے تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے زندگی کی دراصل حقیقت آشکار کر دی ہے۔ علم النفس سے واقفیت رکھنے والی نگاہ ضرور اس اصلیت پر پڑتی ہے کہ وہ شخص اپنے اعمال و افعال کے لحاظ سے بالکل ماؤف و معطل ہو جاتا ہے جس کا جامِ دل شرابِ آرزو کا ایک قطرہ بھی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ خودکشی کا راز فی الحقیقت یہی ہے کہ انسان اپنی بعض دلی آرزوؤں کے بر نہ آنے سے یہ سمجھنے لگتا ہے کہ زمانہ کا ظالم ہاتھ آئندہ کبھی اس کے قصرِ امید کو ڈھا دینے سے گریز نہ کرے گا۔ بالفاظِ دیگر قنوطیت کا انجام عموماً خودکشی ہی ہوتا ہے۔ "قنوطیت" کا اثر جس شخص پر بھی پڑتا ہے وہ رزم گاہ حیات میں سب سے زیادہ اپاہج اور بے دست و پا نظر آتا ہے۔ حقیقت میں اقبال نے اسی نکتہ کو پیش کیا ہے کہ زندگی بنتی ہے عمل سے اور عمل محتاج ہے آرزو کا۔ ع

زندگی سرمایہ دار از آرزوست

مذاہبِ عالم میں سے اگر کسی نے ہر بڑی سی بڑی مصیبت اور کڑی سی کڑی صعوبت میں دامنِ اُمید کو مضبوطی سے تھامنے کی تاکید کی ہے تو وہ اسلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مومن سے اگر ساری خدائی مخالف ہو جائے اور دونوں جہاں خفا ہو جائیں تو لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ پر اس کا ایقانِ کامل اس کے دامنِ آرزو کو خدائے تعالیٰ کے دستِ کرم کے سامنے پھیلا دیتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں ؎

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار ہر زماں پیشِ نظر لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَاد دار

انسان کا بے عمل رہنا اور یہ سوچتے بیٹھنا کہ کیا کام کرے محض بے سود ہے۔ اگر دل میں کسی چیز کی تڑپ اور آرزو پیدا ہو جائے تو خود بخود راستے کھلتے جاتے ہیں ؎

زندگی سرمایہ دار از آرزوست　　عقل از زائیدگانِ بطن اوست

موانع عمل

یہ بتا دینے کے بعد کہ آرزو ہی سے عمل کی ابتدا ہوتی ہے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ آرزو کی نوعیت اور موانع عمل پر کچھ بحث کی جائے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد یہی ہے کہ وہ اس دار الامتحان میں خدائے تعالیٰ سے محبت کرے، اس کی رضاجوئی کو اپنا مسلک بنائے اور اپنی اس محبت اور تلاش رضا کی بدولت خدائے تعالیٰ کا قرب حاصل کرے۔ ایسا نہ ہو کہ زمین و آسمان کی کوئی شئے اپنا دامِ فریب بچھا کر انسان کے طائرِ عشق کو گرفتار کرے۔ چونکہ اس کا جوہر ذاتی نوری ہے اور اس کا اصلی مقام وہ ہے جہاں صرف جلوۂ حق ہو۔ اس لئے یہ بڑا ظلم ہوگا اور اپنی حقیقت سے ناواقفیت ہوگی اگر انسان فرشتہ حور کے حصول کی آرزو کرے ــــ اس فرشتہ و حور کی جس کا وجود محض انسان کی تخلیق کی وجہ سے ہے ؎

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو　　فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور　　کہ شاہینِ شہِ لَوْلَاكَ ہے تو

انسان کی آرزو جتنی پست ہوگی اسی درجہ اس کا عمل بھی پست ہوگا۔ اگر وہ فرہاد بن کر شیریں کی آرزو کرنے لگے تو شیریں کی موت کی خبر اس کے دل پر بجلی بن کر گرے گی اور وہ بھی اپنے سر پر تیشہ کی ایک ضرب لگا کر رخصت ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے انسان کسی اعلیٰ آرزو کے درپے ہو تو یہ کبھی ممکن نہ ہوگا کہ عمل کی پستی کا وہ شکار ہو جائے۔ مومن کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تجلیات اس پر ظاہر فرمائے اور چونکہ تجلیات حق بے پایاں ہیں اس لئے جب ایک برق تجلی مومن کے خرمن دل پر گرتی ہے تو وہ مضطر و بے چین ہو جاتا ہے کہ دوسری تجلی پھر اس کی نظروں کو خیرہ کر دے۔ بہر حال حصولِ تشنہ لبی شدید تشنہ لبی کا باعث بن جاتا ہے ؎

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

انسان کی حرکت و عمل کو جو چیز سب سے زیادہ مسلوب کرتی ہے وہ دوسروں کا دست نگر ہوتا ہے۔ ہر آدمی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے نفس کا احساس پیدا کرے یا بقول اقبال اپنی خودی کو پہچانے اسی آدمی کو زندہ کہا جا سکتا ہے جو عرفانِ خودی کی دولتوں سے مالا مال ہو ؎

زندگی از طوفِ دیگر رستن است　　خویش را بیت الحرم دانستن است

ایک دوسری جگہ اقبال خدا کے پاک بندوں کی منزہ زندگی کے لئے جس شئے کی ضرورت بتاتے ہیں وہ استغنا ہے انسان واقعی جب اپنے میں ایک شان بے نیازی پیدا کر لیتا ہے تو دیکھنے والی نگاہیں دیکھتی

ہیں کہ دنیا اس کی ہو کر رہتی ہے ؎

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغناء

اقبال کے نزدیک انسان کی تمنا یہ ہونی چاہیئے کہ اس کی تمام بلندیاں اور سرفرازیاں خود اس کی کوششوں اور جد وجہد کا نتیجہ ہوں۔ دوسروں کے آستانے کی دریوزہ گری کر کے اگر کوئی شخص کسی مقام رفیع پر متمکن ہو جائے تو یہ بلندی اور رفعت قابل رشک نہیں بلکہ قابلِ ملامت ہے۔ اسی خیال کو اقبال نے پروانہ اور جگنو کی دل نشین گفتگو میں ظاہر کیا ہے

پروانہ

پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو؟

جگنو

اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

انسان کی خودداری کو اسی وقت اچھی طرح پرکھا جاسکتا ہے جب وہ تلاشِ معاش کے لئے سرگرداں ہو۔ کتنی ہستیاں ایسی ہیں جو اپنی خودداری اور انفرادیت کو ٹھوکر مار کر دوسروں کے دسترخوان کے ٹکڑوں پر اپنا گزارا کر لیتی ہیں۔ انسان جب اپنی انفرادیت کو اس طرح رزق کے چند دانوں کے عوض بیچ دیتا ہے تو شجاعت اور بلند ہمتی کی اعلیٰ صلاحیتیں اس سے چھن جاتی ہیں اور دوں ہمتی، ذلت اور پریشانی اس کے دل کو مسلط کر لیتی ہے۔ اسی واقعہ کو اقبال چیونٹی اور عقاب کے مکالمہ سے ظاہر کرتے ہیں چیونٹی عقاب سے پوچھتی ہے ؎

میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند؟

عقاب کہتا ہے ؎

تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

انسان طائرِ لاہوت ہے۔ یہ عالم ناسوت اس کے رہنے کا مقام نہیں، اسے تو چاہیئے کہ ہر دم پرواز کرتا رہے۔ سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

اور ایسے رزق کو ٹھوکر مارے جو اس کی پرواز میں حائل ہو ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

انسان کا مقصدِ حیات یہ بھی نہیں کہ وہ دولتوں کے ڈھیر جمع کرے اور چاندی سونے

کے بدلے اپنی 'انا' کو ہاتھ سے دیدے ؎

خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض   نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض

سیم و زر کا حصول تو محض ایک حقیر مقصد ہے اور اس کے لئے وہ خودی جو جوہر زندگی ہے کیسے دی جا سکتی ہے!

مردِ آزاد کی شان یہ ہے کہ وہ ہر دم عمل کرتا رہے اور کبھی اس کو قرار نہ ہو ؎

دم بہ دم نو آفرینی کارِ حر   نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حر

یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب انسان اپنے منصب عبدیت کو پہچانے (خادم اور غلام میں یہ فرق ہے کہ خادم کے کام مقررہ ہوتے ہیں اور غلام کے غیر متعین۔ غلام کو جس چیز کا بھی حکم دیا جائے اس کی تعمیل اس پر ضروری ہو جاتی ہے) وہی غلام اپنے آقا کی نگاہ میں سما سکتا ہے جو ہمیشہ اس کی رضا جوئی کے لئے عمل ہی عمل کرتا ہے۔ بہرحال جب مومن پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ یعنی ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں تو وہ بے حد ریاضتیں اور عبادتیں کرتا ہے اور ہمیشہ خدائے تعالیٰ کے قرب کی تمنا کرتا ہے۔ اقبال اپنی شاعرانہ زبان میں مومن کی اسی شان کو واضح کر رہے ہیں کہ اس کی زندگی کا تمام سوز، تمام تڑپ اور بے قراری صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ خدائے لم یزل کے قرب کی آرزو کرتا ہے "دعا" میں کہتے ہیں ؎

تجھ سے میری زندگی سوز و تب و درد و داغ   تو ہی مری آرزو تو ہی مری جستجو

ایک اور چیز جو مومن کی قوتِ عمل کو مسلوب کرتی ہے وہ اس کا غیر اللہ سے ڈرنا ہے۔ مومن کا کام تو یہ ہونا چاہیئے کہ جب اس نے خدائے برتر و اعلیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریزی کی تو پھر کسی اور کے آستانے پر جبہ سائی نہ کرے۔ صرف ایک ہی سجدہ ایسا ہو جس سے ہزاروں دوسرے سجدے اس پر حرام ہو جائیں۔ جب مسلمان اپنے دل سے اس بات کی تصدیق کرتا ہے اور زبان سے اس کا اقرار کرتا ہے کہ دنیا میں خدائے واحد کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں تو پھر اس کا عمل اس بات کی غمازی نہ کرے کہ وہ کسی دوسرے کو خدائے تعالیٰ کی صفتوں سے متصف سمجھتا ہے۔ اس کا عمل اس بات کی کھلی شہادت ہو کہ وہ کسی غیر کو اپنا رب، اپنا حافظ، اپنا رازق یا اپنا مالک نہیں سمجھتا۔ یہ واقعہ ہے کہ انسان جب دنیا کے سارے علائق اور رشتوں کو توڑ کر صرف خدائے لم یزل سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے تو وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا اور کسی سے ڈرتا نہیں ؎

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است   کاروانِ زندگی را رہزن است

مسلمان کو جب اپنے مسلک و مذہب سے محبت ہو جاتی ہے تو وہ کبھی کسی ایسی بات کو

روا نہیں رکھتا جو اس کے دین کے خلاف ہو۔ وہ جب کبھی یہ دیکھتا ہے کہ مخالفوں کے تیر ان کے ترکش سے برابر نکلے چلے آرہے ہیں تو اپنے کو دفاع کے ہتیار سے لیس کرکے میدان جنگ میں کود پڑتا ہے۔ اس کی حمیت و غیرت کبھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ بیجا مروت کو شعار بنایا جائے اور سچ تو یہ ہے کہ بیجا عفو ہی اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان کا خون سرد پڑ گیا ہے۔

عفوِ بیجا سردئ خونِ حیات سکتہٗ در بیتِ موزونِ حیات

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر نرا نفس ہے اگر نالہ ہو نہ آتش ناک

عشق اصل حیات ہے

انسان کی آرزو میں جب شدت پیدا ہوتی ہے تو وہ منزلِ عشق میں قدم رکھتا ہے اور یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچکر انسان اپنے عمل کے لحاظ سے پیکرِ حرکت بن جاتا ہے، دنیا کی کوئی قوت اور کوئی طاقت اسے اپنے محبوب سے جدا نہیں کرسکتی اس کا دماغ تمام تر جذباتِ عشق سے مغلوب ہوجاتا ہے، اس کے پائے عمل استقامت کے ساتھ راہِ مطلوب پر گامزن ہوجاتے ہیں۔ راہِ عمل کی تمام دشواریاں ایک عاشقِ صادق کے لئے آسانیاں بن جاتی ہیں اور ہر ناممکن، ممکن ہوجاتا ہے۔ ع ۔ عشق را ناممکن ما ممکن است

مومن کا خاکستر جسم صرف شرر لا الٰہ الا اللہ سے شعلہ ریز ہوتا ہے اور وہ کسی ذات غیر اللہ سے عشق نہیں کرتا ؎

عشق از سوزِ دلِ ما زندہ است از شرارِ لا الٰہ تابندہ است

خدائے تعالیٰ سے سچی محبت اور عشق اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب انسان ساری کائنات کی نفی کرکے صرف وجودِ باری تعالیٰ کا اقرار کرے۔ جو محبت سے ناواقف ہیں وہ اس حقیقت پر ہنسیں گے کہ مجنوں پر ایک کیفیت ایسی بھی طاری ہوئی تھی جب کہ وہ ریگ صحرا پر اپنی انگلی سے لیلیٰ کا نام لکھ رہا تھا اور اسی نام سے وصلِ لیلیٰ کا لطف اٹھا رہا تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ محبت کی کیفیت جب کسی پر طاری ہوتی ہے تو اس کی نظر کے سامنے بس مشاہدہ معشوق ہی ہوتا ہے۔ بہرحال جب خدائے تعالیٰ سے عشق ہو تو ایسا کامل ہو کہ عاشق کی نظر پھر کسی دوسری ہستی کی طرف نہ اٹھے ؎

عشق را از شغلِ لا آگاہ کن آشنائے رمز الا اللہ کن

عشق کی کاملیت کی دلیل یہ ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے لئے متاعِ جاں تک کی پروا نہ کرے اگر موت کی وجہ سے ذرا سی بھی کھٹک اس کے دل میں پیدا ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ابھی داغِ جگر

پوری طرح فروزاں نہیں۔ موت کا کھٹکا تو صرف عقل کی عیاری کا نتیجہ ہے اور اس کے برخلاف عشق جانتا ہی نہیں کہ موت کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دل شعلۂ عشق سے داغ داغ تھا، اسی وجہ سے انھوں نے آتش نمرود میں کود پڑنے سے دریغ نہ کیا اور ان کی اس جرأت پر عقلِ مصلحت کوش حیران رہ گئی۔ کس اچھوتے انداز میں اقبال اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

بہرحال عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل ہوتا ہے اور عقل کی غلامی اُسے سزاوار نہیں ہوتی، کیونکہ عقل موت وحیات کے ادھیڑ بن میں لگی رہتی ہے اور بازوئے عمل کو مفلوج کرتی ہے ؎

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل　　　　عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

اسی وجہ سے ایک جگہ اقبال اس تعلیم کی تلقین کرتے ہیں ؎

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں　　　　عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عشق کا تعلق راست رُوح سے ہے، اس جسدِ عنصری سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہیدِ عشق کسی کے تیر و تفنگ کو خاطر میں نہیں لاتا اور ہزار ترہیب و تنبیہ کے بعد بھی اپنے عمل سے ایک بر مو انحراف نہیں کرتا ؎ عشق را از تیغ و خنجر باک نیست　٭　اصل عشق از آب و باد و خاک نیست

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان آرزوؤں کی منزلوں سے گزر کر عمل کرتے ہوئے بامِ عشق پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اصلِ زندگی کو پالیتا ہے اور موت اس کے حریمِ حیات میں قدم ہی نہیں رکھ سکتی۔ اسی شخص کی زندگی باشرف ہے جس کی راہیں فروغِ شعلۂ جگر سے نورانی ہوں ؎

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل　　　　حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

حقیقی علاج اقبال حکیم ملت ہیں اور اسی وجہ سے مسلمانوں کی موجودہ فلاکت و نکبت کی علت یہ بتاتے ہیں کہ ان کے دل اب اُس آرزو اور عشق سے معمور نہیں جس سے کہ قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کے قلب لبریز تھے۔ میدان جہاد کے لئے کمربستہ ہو جانا، عبادت و ریاضت میں مستغرق رہنا، نظمِ ملت کا خیال رکھنا اور تفریقِ ملت سے ڈرنا، آج کہاں نظر آتا ہے؟ یہ یہ سب کچھ تگ و دو اور سب کچھ جد و جہد اس وقت کے مسلمانوں میں اسی وجہ سے تھی کہ خدائے تعالیٰ کا عشق ان کی رگ و پئے میں سرایت کر چکا تھا اور اسی کی آرزو ان کے ریشے ریشے میں بس گئی تھی۔ بہرحال یہی جذب اندرون ہے جسکے فقدان کی وجہ سے آج ملت اسلامیہ کی رگوں میں خونِ زندگی نہیں دوڑ رہا ہے اسکے رکوع و سجود بے حضور ہیں اور اسکے افراد میں نفاق و جدائی کی ایک خلیج حائل ہے۔ ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے　　　　وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج　　　　یہ سب باقی ہے تو باقی نہیں ہے

ریاض احمد انصاری،
سالِ چہارم (آنرز)

موت کا رقص

میں جا رہا تھا۔ میرے دونوں طرف ہرے بھرے میدان تھے۔ مشرق میں شفق چمک رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سورج اپنے روزانہ کے سفر کو شروع کرنے میں جلدی کر رہا ہے۔ دھان کے پودوں پر شبنم طلوع ہوتے ہوئے سورج کی شعاعوں سے چمک رہی تھی۔ میرے سامنے چھوٹی چھوٹی چڑیاں چہچہاتی ہوئی اُڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ طلوع ہوتے ہوئے سورج کو خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔ میں بہت خوش تھا۔ میں دور ــــ بہت دور جا رہا تھا۔ نہ معلوم کہاں اور شاید یہی وجہ تھی جو میرے چلنے کی خوشی میں اور اضافہ کر رہی تھی۔ میرے چلنے کی وجہ سے اور جو خیالات میرے دماغ میں آ رہے تھے اُن کی وجہ سے میں ایک عجیب قسم کی روحانی فرحت محسوس کر رہا تھا۔ میں چلتا گیا ـــــــ!!

دو فرلانگ چلنے کے بعد ایک مندر دکھائی دیا جو نہایت ہی شکستہ حالت میں تھا۔ معلوم وہ کونسی غیبی قوت تھی جو مجھے اُس کی طرف کھینچے لئے جا رہی تھی۔ صرف میں اس کی بوسیدہ دیوار تک جانا چاہتا تھا۔ میں مندر کے اندر داخل نہ ہونا چاہتا تھا۔ چند منٹ گذرے۔ میں اُس مندر کے دیواروں کے سایہ میں چل رہا تھا۔

یکایک اندر مجھے ایک ہلکی اور موہوم سی آواز سنائی دی۔ میں رک گیا۔ میں خاموش کھڑا ہو کر اُس آواز کو سننے کی کوشش کرتا رہا۔ "یہ کونسی پُراسرار ہستی ہے جو اِس بھگوان کو پکار رہی ہے جو بہت دور ہے؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ میں پیچھے گھوما اور مندر کے اندر داخل ہوا۔ وہاں کوئی پجاری بھگوان کے گُن گاتا ہوا مجھے دکھائی نہ دیا۔ وہاں صرف ایک عورت تھی جو بھگوان کی ایک ٹوٹی ہوئی مورتی کے سامنے جھک کر پوجا کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ـــــ "تم پوجا کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ وہ میری طرف گھومی اور مجھے دیکھا "ہاں" اُس نے سرد مہری سے جواب دیا اور پھر پوجا میں محو ہو گئی۔ میں کھڑا ہو کر اُس کی طرف گھورنے لگا۔ سرو قد جو مناسبت سے ڈھلا ہوا تھا، خوبصورت چہرہ، رنگ گندمی اور بال کالے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں عجب قسم کی کشش تھی جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں نے اپنا حلق صاف کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "تم دوسرے مندر میں کیوں نہیں

جاتیں ؟ میں نے دوسرا سوال کیا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی " یہ کیوں نہیں ؟" اُس نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے دریافت کیا۔ " یہ تباہ و برباد ہے۔ یہاں مچھر بھرے ہوئے ہیں اور تم جانتی ہو بھگوان بھی ملیریا سے گھبراتے ہیں تم دوسرے مندر کو جاؤ۔ وہ نہایت ہی صاف و ستھرا ہے" میں نے جواب میں کہا۔ وہ کھڑی ہوگئی اُس نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر جما دیں اور کہنے لگی " جس طرح روح ایک تباہ حالت میں زیادہ روشن نظر آئے گی اسی طرح بھگوان کا جلوہ ایک بوسیدہ مندر میں ملیگا۔ دوسرے مندر میں بھگوان کو اکثر بھلا دیا جاتا ہے۔ جب ہم مندر کی مصنوعی دیواروں اور چھتوں کی شاندار صناعی کو دیکھتے ہیں۔ جب مندر کے پجاری کی شان اور بے اعتنائی کو دیکھتے ہیں اور جب ہمارے کانوں میں بھگوان کے مارے ہوئے مخلوق کی دردناک صدائیں آتی ہیں تو ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اصلی بھگوان کو بھول جائیں یہی وجہ ہے کہ میں اس جگہ کو بہت پسند کرتی ہوں۔ یہاں میں اکیلی رہتی ہوں۔ یہاں کی ہوا بھی بھگوان کی شکتی سے معطر ہے۔" " لیکن یہاں تو اُس کی مورتی نہیں ہے ؟" میں نے پوچھا اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے صرف اُس ٹوٹی ہوئی مورتی کی طرف اشارہ کیا۔ میں تھوڑی دیر تک پریشانی سے اُس طرف گھورتا رہا۔ اُن ٹکڑوں کی طرف دیکھتا رہا جو کبھی بھگوان کی مورتی کا حصہ تھے جس کے گلے کے اطراف عورتوں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے ہار ڈالے ہوں گے۔ اور جن کے قدموں پر آدمیوں نے اپنے تمام دن کے محنت کے پسینے نچھاور کئے ہوں گے۔ میں نے اپنی آنکھیں اُس کی طرف پھیریں۔ " یہ مورتی ٹوٹ گئی ہے اور اس کا حلیہ بگڑا ہوا ہے" " یہ اس کی صحیح تصویر ہے"۔ اُس نے جواب دیا۔ " کیا یہ صحیح ہو سکتا ہے ؟"۔ میں نے پوچھا۔ " یہ خواب کی طرح سچ ہے" اُس نے جواب دیا۔ " خواب کبھی سچ نہیں ہوا کرتے" میں نے کہا اُس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا " صرف خواب ہی اس دنیا میں سب سے بڑی سچائی ہیں" میں چند لمحوں کے لئے پہاڑ کی مانند ساکت کھڑا رہا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کتنی پراسرار اس مندر میں تھی ! وہ میری طرف سے گھوم کر پھر وہیں جاکر پوجا کرنے لگی۔ میں نے آہستہ سے پوچھا " کیا میں پوجا کر سکتا ہوں ؟" " ہر شخص پوجا کر سکتا ہے۔ یہ مندر میرا ہے اور نہ بھگوان کا۔ وہ ہر چیز ہے اس لئے کوئی چیز اس کی نہیں"۔ میں نے کوئی لفظ اپنی زبان سے نہ نکالا کیونکہ اس کی ضرورت نہ تھی اور ایک بچے کی طرح اُس کے بازو دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔۔۔ ہم دونوں نے مل کر پوجا کی !

تھوڑی دیر بعد ہم اُٹھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں شباب چھلک رہا تھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ میں اس کے

سیدھے گال والے تِل کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ بات کرتی تو چھوٹی سی تِل کی حرکت مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیتی۔ "تمہارا گھر کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ "یہ شکستہ مندر میرا مکان ہے" "تم سوتی کہاں ہو؟" "وہاں اس بوسیدہ دیوار کے پیچھے دھرتی ماتا کے آغوش میں سوتی ہوں" "کیا تم خوشی محسوس کرتی ہو؟" "میں اتنی ہی خوشی محسوس کرتی ہوں جتنی کے ایک بچے کو ہوتی ہے۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اُس ٹوٹے ہوئے بُت کو بتاتے ہوئے پوچھا "تم اُس میں کیا پاتی ہو؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا" اُس نے اپنا سَر اٹھایا اور سنجیدگی سے میری آنکھوں کی طرف دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا "میں اُن ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں بہت سی چیزیں پاتی ہوں۔ اُس میں میں اپنے آپ کو پاتی ہوں ان میں مجھے ایک ٹوٹا ہوا دِل نظر آتا ہے۔ ایک کھویا ہوا ستارہ! —— نہیں —— بلکہ ایک شکستہ اور برباد دنیا۔ مجھے ان میں غم و یاس کے دریا نظر آتے ہیں جن میں ہمارے چھوٹے موٹے غم نہ معلوم کہاں کھو جائیں۔ اور وہ غم سب سے بڑا بھگوان ہے۔ اور میں اُس ہی کو پوجتی ہوں"۔ اُس کی آواز جذبات سے بھرپور معلوم ہوتی تھی۔ میں خاموشی سے اُس کے الفاظ کو سنتا رہا۔ میں یہ کہنے ہی والا تھا کہ "کل پھر آؤں گا" لیکن میں رُک گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں مندر کے باہر تھا۔ میں نے اُس کو پلٹ کر تک نہ دیکھا اور نہ مجھے اُس کی خواہش تھی۔ میں آہستہ آہستہ اپنے گھر کی جانب چلا گیا۔

دوسرے دن صبح پھر میں مندر کی دیوار کے تلے کھڑا تھا۔ پھر اُس دھیمی سی آواز نے میرا خیر مقدم کیا۔ میں اندر داخل ہوا۔ وہ اپنے گھٹنوں پر بت کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھتا گیا اور اس کے بازو بیٹھ گیا میں نے اس ٹوٹے ہوئے بت کو عقیدت سے پرنام کیا جو بھگوان کی قائم مقامی کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں اُٹھے اور ایک دوسرے کو دیکھا۔ "تم؟" اس نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں پوجا کرنے کے لئے آیا ہوں" میں نے جواب دیا۔ "کس کی پوجا کے لئے؟" اُس نے پوچھا۔ "تمہاری پوجا کے لئے تم اس ٹوٹے ہوئے مندر کی زندہ اوتار ہو۔"

وہ مسکرائی۔ اُس کے چھوٹے سے کالے تل نے جو اُس کے سیدھے گال پر تھا میری توجہ اپنی طرف مبذول کرلی۔ "تمہارے ماں باپ نہیں ہیں کیا" میں نے دریافت کیا۔ "میرے کبھی ماں باپ ہی نہ تھے" "تم کیا کرتی ہو"؟ میں نے دریافت کیا۔ اپنا پیٹ پالنے کے لئے میں دن میں کام کرتی ہوں رات کی سردی میں میں واپس آتی ہوں ایک بھوکے تیرتھی کی طرح اور یہاں بیٹھ کر اپنی نجات کے لئے پوجا کرتی ہوں" "تم دنیا سے بالکل جدا ہستی ہو" میں نے کہا۔

"فرق صرف ظاہری ہوتا ہے۔ آپ آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس لئے آپ کو اتنا فرق

معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ اپنے دل کی آنکھ سے دیکھیں گے تو تمام فرق غائب ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہم اس سے آپ محض دوسروں ہی کو نہیں دیکھتے بلکہ اپنے آپ کو بھی دیکھ سکتے ہیں"۔

"کیا تم اس تنہائی میں رہتے ہوئے نہیں گھبراتیں؟ میں نے پوچھا۔ "کوئی نہیں گھبراتا۔ در اصل قدرت ہم کو تنہا رکھتے ہوئے گھبراتی ہے۔ کیونکہ ہم اس کے راز معلوم کرکے اس کو فتح کر لیتے ہیں" اس نے جواب دیا۔

"کیا تم کو موت سے ڈر نہیں لگتا"؟ میں نے دریافت کیا۔

"زندگی کا خوف موت کے ڈر سے زیادہ ہے ہم ڈرتے ہیں اس لئے کہ کہیں ہم اپنے زندگی کے چند دنوں کو بیکار نہ ضائع کر دیں۔ کئی انسان اس ڈر سے مر جاتے ہیں۔ میں موت سے نہیں گھبراتی کیونکہ مجھے زندگی سے کوئی خوف نہیں۔ صرف وہی موت سے گھبراتا ہے جو زندگی سے ڈرتا ہو"

میں نے اس کی طرف اشتیاق سے دیکھا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں پلٹا اور مندر کی جانب دیکھا۔ وہ وہاں کھڑی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں مندر کو برابر جاتا رہا۔ میں اب اس کی طرف حقارت کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ میں اس کے ساتھ پوجا کرنے میں مسرت حاصل کرتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ بات کرنے میں ایک خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔ اس کے زبان سے جو فلسفہ نکلتا تھا وہ مجھے بہت ہی پسند تھا۔

ایک مہینہ گذر گیا۔ ایک بھیانک رات تھی۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور زوردار بارش ہو رہی تھی۔ بجلی آسمان پر زور و شور سے چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برستے ہوئے پانی کے قطرے اپنا انتقام لینے کے لئے زمین پر کوڑے برسا رہے ہوں۔ میں لیٹا ہوا تھا لیکن اس اکیلی عورت کا خیال مجھے ستا رہا تھا۔ میں اس کا بے خوف و خطر آسمان کے نیچے اور شکستہ دیوار کے بازو سوتے ہوئے تصور کر رہا تھا۔ وہاں سے وہ ان تمام خطرات کو محسوس کر رہی ہوگی۔ وہ اپنی آنکھوں سے بجلی کی چمک کو خوش آمدید کہتی ہوگی۔ بادل کی خوفناک گرج سے اس کا ننھا سا دل دہل جاتا ہوگا۔ اس کو ہوا ایک غم کے بلبلے کی طرح اڑا لے جاتی ہوگی اور اس کے وہ الفاظ "میں موت سے نہیں ڈرتی" میرے کانوں میں گونجنے لگے وہاں اس سے باتیں کرنے یا سننے والا کون ہوگا؟ —— بھگوان! لیکن مجھے وہ بھگوان کے ٹکڑے بھی انسانی ہمدردی چاہنے والے نظر آنے لگے۔ وہ اس کی دلجوئی کس طرح کر سکتا ہے —— اس طرح میں خیالات کے سمندر میں بہتا گیا۔

دوسرے دن علی الصبح میں مندر کی جانب تیزی سے روانہ ہوگیا۔ ایک لمحہ کے لئے میں ساکت کھڑا رہا۔ وہ شناسا آواز مجھے سنائی نہ دی نہ اُس نے میرا خیر مقدم کیا میں مندر کے اندر داخل ہوا ٹوٹا ہوا بت وہاں تھا لیکن وہاں کوئی عورت عقیدت سے جھکی ہوئی نہ تھی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ میری نظر ایک خون سے لت پت چہرہ پر پڑی۔ میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔ یہ وہی لڑکی تھی۔ رات کی آندھی میں وہ شکستہ دیوار اس پر گر پڑی تھی۔ اُس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ اس خوفناک منظر سے میرے جسم میں ایک جھرجھری سے پیدا ہوئی۔ میں وہاں ٹھہر نہ سکا۔ فوراً ہی بجلی کی طرح ایک عجیب قسم کا خیال میرے دل میں آیا۔ میں نے اس کے شکستہ چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے بعد اس شکستہ مورتی کی طرف میں اُن کے سامنے دوزانو ہوگیا "عورت اور بھگوان دونوں شکستہ ہوتے ہیں" یہ خیال میرے دل میں آیا۔ اس کے بعد میں باہر چلا گیا۔

تھوڑی دور جا کر میں ٹھیر گیا۔ میں نے گھوم کر اس ٹوٹے ہوئے مندر کی طرف دیکھا۔ مجھے پاؤں کے تال پر پٹکنے کی مدہم سی آواز سنائی دی۔ اِسے میں نے سنا یا ہوسکتا ہے وہ محض وہم ہو۔ "وہاں موت کا رقص ہو رہا ہے" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ میں بہت تیزی سے اپنے گھر کی جانب چلتا گیا۔ میرے پیچھے سوائے غم اور اشکوں کے کچھ نہ تھا۔

(ترجمہ)

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی　　وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر خودی　　یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

(اقبال)

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور　　تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(اقبال)

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم　　عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور!

(اقبال)

مقام فقر ہے کتنا بلند شاہی سے　　روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیے

(اقبال)

قطب الدین عزیز
سال سوم (آنرز)

طلوعِ امن

جنگ کی شبِ تار دورِ امن کے سپیدے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ افقِ عالم پر صلح و آشتی کا سورج منور ہے جس کی ضیا پاشیاں قلوبِ انسانی کو حیاتِ تازہ بخش رہی اور خوش آئند توقعات سے معمور کر رہی ہیں۔ چھ سال کی خون آشام جدوجہد کے بعد خالقِ عالم نے حق و تہذیب کی علمبردار قوتوں کو فتح سے ہم کنار کر دیا جو ایک جنگ زدہ کائناتِ انسانی کے لئے نوید جانفزا ثابت ہوئی، جس نے کروڑہا انسانوں کے کمھلائے ہوئے چہروں پر مسرت کی ایک لہر دوڑا دی اور بارگاہ رب العزت میں شکر و سجود پر مجبور کیا۔ تاریخ کی ہولناک ترین جنگ کا اختتام واقعی ایک عنایت الٰہی اور امن و اماں کی بحالی ایک نعمت عظمیٰ ہے کیونکہ سرزمین آدم کے لئے امن اسی قدر عزیز ہے جتنا ایک بچہ اپنی ماں کے لئے۔ لہٰذا امن کی حفاظت ایک انسانی فرض ہے جس کی ہمہ تن و کامیاب انجام دہی انسانی دلوں کو خوشی و انبساط کے جذبات سے پُر کر دیتی ہے اور ترقی و تمدن کی اُن دبی ہوئی چنگاریوں کو فروزاں کر دیتی ہے جو کاروانِ زندگی کی راہِ ارتقاء میں شمع ہدایت بن کر چمکتی ہیں اور اشرف المخلوقات کو بام عروج پر پہنچنے کی تحریک دیتی ہیں۔

فتح و نصرت کے شادیانوں کی گونج میں ہمیں ان اعلیٰ تصورات و نظریات کو نہ بھول جانا چاہیئے جن کی خاطر یہ جنگ لڑی گئی اور ظفر مندی کے طنطنوں میں مدہوش ہو کر ہمیں وہ ذہنی احساسات نظر انداز نہ کرنے چاہیئے جنھیں پیش نظر رکھ کر لوگ جوق در جوق جمہوریت کے جھنڈے تلے جمع ہوئے۔ خون کی بھینٹ دے کر غنیم کو شکستِ فاش دی اور جمہوریت کا بول بالا کیا۔ آمریت کے امڈتے ہوئے دریا کی روک تھام، جس کی لاٹھی اس کی بھینس "کے راج کا خاتمہ اور ہمیشہ کے لئے جنگ کا تدارک۔ یہ تھے وہ تحسین آفریں مقاصد جو" آزادی کی جنگ "کے اساس قرار پائے اور ان ہی تصورات کی دلنشین تابانی نے حق پرستوں کا دل موہ لیا اور چہار دانگ عالم سے سر بار متحدین کی صفوں میں آکر شامل ہوئے جن کے فوجی قدموں کی بھاری چاپ نے لوگوں کے دلوں کو گرما دیا اور جن کے عسکری نعروں کی صدائے بازگشت نے وطنی محاذ پر ایک نئی روح پھونک دی، ایک نئے

جوش و ولولہ کی تخلیق کی ـــ کامل فتح حاصل کرنے کا جذبہ عمل ـــ اور آخر چھ سال کی صعوبتوں کے بعد خون پانی ایک کر کے "سر دھڑ کی بازی لگا کر" اب فتح کی دیوی آزادی کے متوالوں کی سرخروئی پر مسکرا رہی ہے۔ یہ فتح کی صبح ہے ـــ طلوع امن ہے۔

جب ایک ماں کا لال، ایک بیوی کا خاوند، بچوں کا باپ، بہن کا بھائی ۔جمہوریت کا نبرد آزما اپنے گھر بار، اعزاء و اقرباء کو خیر باد کہہ کے حق و آزادی کی جنگ میں شریک ہوا تو اس کو یقین واثق تھا کہ اس کی انتھک قربانیاں دنیا کو ہمیشہ کے لئے شر و فساد سے محفوظ کر دیں گی، زندگی کو بہتر بنا دیں گی اور اس کے جانشیں امن و آزادی و خوشحالی کے اثمار سے بہرہ مند ہو سکیں گے اس کے ذہنی تصور اور تخیل نے اس کی نظر میں ایک ایسا ارض موعود آباد کر دیا تھا جو قتل و جدال خونریزی و غارت گری سے پاک ہوتا اور اقوام عالم کے لئے اجتماعی ترقی و ارتقاء، تمدن و تہذیب فلاح و بہبودی کا گہوارہ بنتا ۔ یہ تھے جمہوریت کے سپاہی کے وہ ہمت آفریں تصورات جنھوں نے اسے شمالی افریقہ کی چلچلاتی دھوپ، شعلہ ریز ریت اور بادسموم کے دم گھٹنے والے تھپیڑوں میں جادۂ استقامت سے ہٹنے نہ دیا اور اس کے صبر آزما عزم میں لغزش نہ آنے دی ۔یہی تھے وہ جانکاہ اور بطل شکن عزائم جنھوں نے جمہوریت کے عساکر کو طیاروں سے برستی ہوئی آگ کی چھاؤں میں، اطالیہ کی برفپوش پہاڑیوں نارمنڈی میں دشمن کی وحشیانہ مقاومت کے مقابلہ میں، برما کے ہیبتناک جنگلوں اور بحر الکاہل و ظلمات کی عمیق گہرائیوں میں نصرت و کامیابی سے ہم آغوش کیا۔

ہم ان ظفر مند افواج کی فتح پر فرحاں و شاداں ہیں لیکن مسرت کے ان جذبات میں کچھ اور بھی مضمرات ہیں۔ وہ عظیم قربانیاں جو دنیا کو پُر امن بنانے اور مغلوب ممالک کو آزاد کرانے کے لئے متحدین نے کیں ان کا اہم ترین مقصد کسی عارضی اور سراب آمیز امن کا حصول نہیں تھا بلکہ کائنات انسانی میں ایک ایسے امن کی بنا ڈالنا تھا جو ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ اس لئے فتح کی حقیقی خوشی صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب دیرپا امن کے قیام کا نیک مقصد پورا ہو سکے ۔گذشتہ جنگ عظیم کے خاتمہ پر ولسن کے چودہ نکات اور انجمن اقوام کو عالم وجود میں لانے کی سعی نے اس کرۂ ارض کی تمام مخلوق انسانی پر ایک ایسا سحر آفریں اور سکون بخش منتر پھونکا تھا کہ ہر متنفس اپنی جگہ تصور کرتا تھا کہ تن، من، دھن کی قربانیوں کے صلہ میں نئی دنیا ایک بہشت ارضی کا نمونہ پیش کرے گی لیکن وہ خوش آگین خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ فاتحین جنگ نے جب معمار امن کا روپ بدلا تو صلح کو ایک ایسے قالب میں ڈھالا

جو چند ہی سال بعد فریب آگیں ثابت ہو گیا۔ اور جن مقاصد کو بہ بانگ دہل پکارا گیا تھا وہ قصرِ ورسائی کی گونج بن کر رہ گئے اور بین قومی تعلقات پھر اسی طرح ملک گیری کی حرص و آز اور تجارتی رقابت کا شکار بنے جس طرح گذشتہ جنگ عظیم سے پہلے دول یورپ کی خارجی حکمت عملی اِن عیوب اور ریشہ دوانیوں سے ملوث تھی۔

اُن لاتعداد انسانوں کے قلوب جو اِس خونی ہولی میں اپنے عزیز ترین اقارب و احباب کی ہلاکت کے باعث مجروح ہو چکے ہیں اپنی خاموش آہوں کے ذریعہ پُر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ دنیا کا خرمنِ امن اب دوبارہ شعلہ فگن نہ ہو۔ اس بوڑھی ماں کے آنسو جس کا لختِ جگر میدان میں کھیت رہا، اُس باپ کی نمناک آنکھیں جس کا سپاہی بیٹا داغِ مفارقت دے گیا، اُس بیوہ کی سسکیاں جس کا سرتاج رزم گاہ میں ابدی نیند سو گیا اور اُن بچوں کے اُداس چہرے جن کی توتلی زبانیں "ابا" کے محبت آگیں لفظ سے محروم کر دی گئیں۔ غم و الم کے یہ اظہار' نقاشانِ امن کو یاد دلاتے ہیں کہ یہ جنگ ایک بہتر اور پُر امن دنیا کے قیام کے لئے لڑی گئی تھی لہٰذا صلح و آشتی کی عمارت ایسی منصفانہ بنیادوں پر رکھی جائے جو مستحکم و دیرپا ہوں۔ ہر قوم و ملت کو اپنی دیرینہ آرزوؤں اور حوصلوں کو پورا کرنے کے مواقع دئے جائیں اور کمزور قوموں پر طاقت و حکم برداری' استبداد و انتداب کی آمریت مسلط نہ ہو بلکہ ملل عالم' اپنے معینہ حدود میں رہتے ہوئے' شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں۔ حریت و آزادی' اخوت و مساوات اس دور سعید کی نمایاں خصوصیات ہونی چاہئیں۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں ہوتی　　　ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

(اقبال)

یسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو　　　نہیں ہے بندۂ حر کے لئے جہاں میں فراغ

جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف　　　تعلیم ہو گو فرنگیانہ!
شاخِ گل پر چہک ولیکن　　　کر اپنی خودی میں آشیانہ

(اقبال)

محمد عبدالرحمٰن
سال اول

فرشتۂ رحمت

شام اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ آ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اپنی ٹھنڈک سے ہر ذی روح کو تھوڑی دیر کے لئے فردوس کی یاد دلا رہی تھیں۔ اور خورشید عالم تاب اپنی منزل کی جانب بڑی سرعت سے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ پرندوں کی خوش الحانی نے باغ کو جنت بنا رکھا تھا اور جمال فطرت کا عکس جمیل ذرے ذرّے پر مستولی تھا۔

ایسے سہانے وقت پر ایک امیر اپنے اعلیٰ پائیں باغ کی گیٹ کے قریب ایک خوش نما آرام کرسی پر دراز تھا۔ اس کی نگاہیں جن میں امارت کا نشہ جھلک رہا تھا نہایت شان سے اٹھی ہوئی اپنے ماحول کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ دولت و ثروت نے اس کے دماغ میں ایسا کبر و نخوت اور اتنا احساسِ تفوق پیدا کر دیا تھا کہ اگر سڑک پر سے کوئی غریب یا اپاہج گزرتا تو وہ انتہائی نفرت سے اپنا چہرہ پھیر لیتا۔ اُسے یہ امر نہایت شاق گزرتا تھا کہ ایک غریب آدمی اس کو اپنا مغموم چہرہ دکھلائے اور کراہت و بدمزگی کا باعث بنے افسوس! عقل کے اندھے نے امارت کا کتنا غلط مفہوم لیا تھا اور قوت کا کتنا بے جا استعمال کیا!!

وہ امیرانہ آن بان سے بیٹھا حقہ کے کش پر کش لگا رہا تھا کہ ایک غریب مسافر کا وہاں سے گذر ہوا۔ بال پریشان، چہرہ اپنی غبار آلودگیوں میں ایک انتہائی تلخ حزینہ عنصر لئے ہوئے اعضا تکان کے مظہر، اور گرد آلود لباس سفر طویل کا مکمل آئینہ دار۔ امیر نے اس کو دیکھا اور احساسِ تنفر نے اس کے دل میں چٹکیاں سی لینی شروع کر دیں۔ چہرہ کی تمتماہٹ اور مد و جزر نے دل کی کیفیتوں کا انکشاف شروع کر دیا۔ سادہ لوحی مسافر کو دھکیل لائی اور اُس نے امیر کو پاس آ کر سلام کیا۔ امیر کا پیمانۂ صبر اب چھلکنے سے نہ بچ سکا۔ اس کی ایک معنی خیز حقارت بھری نظر کے ساتھ خود بخود اس کی زبان سے یہ الفاظ احساسات اندرونی کی تلخ سامانیوں کی عکس برداری کرتے ہوئے نکل پڑے کہ "تمہیں کیا چاہیے؟ نکل جاؤ سامنے سے" شائد اس نے مسافر کو بھکاری سمجھ رکھا تھا!۔

غریب مسافر۔ اس نے انسانی ہمدردی کی خاطر امیر کو سلام کیا اور بات کرنی چاہی۔ لیکن کیا اس کا مقصد بھیک یا طلب امداد ہو سکتا تھا؟ پھر امیر کی یہ نگاہیں اور سوال کیا معنے رکھتے ہیں؟

بیچارہ کی خودداری کو زبردست ٹھیس لگی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا اس کے کسی نے سینکڑوں ہتوڑے لگائے ہیں، گویا ساری دنیا استفہامیہ صورت بنائے اس سے سوال کر رہی ہے کہ "تمہیں کیا چاہیئے؟" گویا اس نے سلام کر کے ایک ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے جس کی پاداش میں اسے ان تلخیوں کا سامنا کرنا پڑا اور ایسے دل شکن سوالات سننے پڑے۔

دوسرے لمحہ میں اس کی زبان سے بے اختیاری میں یہ الفاظ نکل رہے تھے :۔

"مجھے آج معلوم ہوا کہ دنیا والوں نے عزت و توقیر کا کیا معیار قائم کر رکھا ہے۔ ایک غریب کے سلام کا جواب دینا اُن پر اس لئے گراں گزرتا ہے کہ وہ غریب ہے۔ اُس کی غربت کو انہوں نے بھیک سمجھا اور اس کے سلام کو طلبِ امداد کا بہانہ! حالانکہ میرا مقصد سلام کرنے سے بھیک مانگنا نہیں تھا بلکہ انسانی ہمدردی کہ میں آپ سے چند باتیں کروں اور اپنی راہ لوں لیکن نہیں امیروں میں انسانیت نہیں ہوتی۔ اُن میں قوت احساس بالکل مردہ ہو چکی ہے۔ اُن کے سینہ میں دل نہیں دھڑک رہے ہیں بلکہ سنگ ہچکولے لے رہے ہیں ــــ ایسے سنگ جو انسانیت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ وہ غریبوں کے دلوں کو ساز سمجھ کر نے نوازی کرنی جانتے ہیں لیکن سینۂ نَے پر جو کیفیت گذرتی ہے اُس کا انہیں علم نہیں ہوتا۔ وہ انسانیت کا چولہ اوڑھے ہوئے خونخوار بھیڑیئے ہیں جو انسانیت کا شائبہ تک باقی نہ رکھیں گے۔ غریب خاطی ہے، غریب مجرم ہے، غریب سزاوار ہے اس لئے کہ وہ غریب ہے اور اس نے مفلس ہو کر ایسے خونین جرم کا ارتکاب کیا ہے جس کا تدارک ناممکن ہے اور جس کا مداوا غیر آسان!۔ کاش انسانوں میں انسانیت ہوتی ... ... "۔

وہ نہ معلوم غیظ و غضب کی حالت میں کیا کیا کہتا رہتا اور نہ معلوم جذبات کی روانی اسے اپنی طوفانی لہروں میں کب تک بہاتی رہتی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس کے منہ سے شرارے نکل رہے ہوں، اس کی نظریں انگارے برسا رہی ہوں اور اس کا ہر عضو آتشیں چنگاریاں اُگل رہا ہو۔ ایسے شرارے، انگارے، اور چنگاریاں جن کا اگر بس چلے تو دولتمندوں اور اُن کی حویلیوں کو جلا کر بھسم کر ڈالیں۔

اتنا کہنے کے بعد مسافر نے اپنی راہ لی اور جاتے جاتے وہ یہ گنگنا رہا تھا ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
اُخوت کی زباں ہو جا، محبت کا بیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیل تند رو کوہ بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے ....

امیر بالکل ساکت وصامت بیٹھا تھا حتیٰ کہ اندھیرے نے دُنیا پر پورا قبضہ کر لیا اور اس عجیب وغریب مسافر کی آواز بھی فضا کی خموشی میں گم ہو کر رہ گئی۔ یکایک اُسے اپنے ماحول کا احساس ہوا اور اُس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے سنائی دیئے :۔

خوابِ غفلت سے چونکانے والے فرشتۂ رحمت! لے آج میں بیدار ہو چکا۔ کاش پہلے مجھ میں انسانیت ......"

اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں درخشندہ آنسو چھلکنے لگے۔

جب وہ اپنی حویلی میں جا چکا تو باہر دربان بڑا حیران ہو رہا تھا کہ اس کے اُس مالک نے جس نے اس کو کبھی ڈانٹ ڈپٹ سے گریز نہیں کیا تھا آج اس پر غیر معمولی مہربان نظر آ رہا تھا۔

اُسے کیا خبر کہ اس کے بحرِ دل میں انقلابات کے کتنے ہنگامہ خیز طوفان اُٹھ رہے ہیں اور ہمدردی کی موجوں کا کیا عالم ہے۔

ع بگڑی بن جاتی ہے جب فضلِ خدا ہوتا ہے

واقعی وہ ایک ہمدرد انسان بن چکا تھا !!!

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے! یورپ سے نہیں ہے

(اقبال)

سید علی برتر
سالِ چہارم

اِنشا پردازی

عالم کائنات کے حیوانوں کی تقسیم دو بڑی جماعتوں میں ہوسکتی ہے — (۱) حیوانِ ناطق اور (۲) حیوانِ مطلق۔ حیوان ناطق انسان کو کہتے ہیں کیونکہ اسے "نطق" سے سرفراز کیا گیا ہے اور حیوانِ مطلق اِن تمام حیوانات کو کہا جاتا ہے جو انسان نہیں ہیں۔ اس طرح نطق انسان اور حیوان کے درمیان ایک امتیازی فرق ہے۔ حیوانِ ناطق اور حیوان مطلق دونوں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرسکتے ہیں — انسان نطق کے ذریعہ اور دوسرے حیوانات مختلف حرکات و اشارات سے۔ چنانچہ کُتا اپنی دُم ہلا کر مالک سے محبت کا ثبوت دیتا ہے۔ گائے بچھڑے کو نہ دیکھ کر اپنی آواز سے پریشانی کا اظہار کرتی ہے۔ جیسے نطق انسان اور حیوان کے درمیان حدِ امتیاز ہے اسی طرح انشا بھی اَن پڑھ اور پڑھے لکھے انسان کے درمیان فرق بتاتا ہے۔ نطق توسبھی رکھتے ہیں۔ جاہل، عالم، دیہاتی، شہری سب اس قدرتی عطیہ سے مالامال ہیں لیکن ایک ہی چیز کے اظہار بیان میں ایک شخص دوسرے شخص سے مختلف ہے اور یہ اختلاف ان اشخاص کے انشا پردازانہ اور غیر انشا پردازانہ طریقۂ اظہار کی وجہ پیدا ہوا ہے۔

لفظ "انشا" "نشا" سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی اُبھرنے اُبھارنے یا بلندی کے ہیں چنانچہ "انشا" کے مجازی معنی شعر کہنے یا خطبہ دینے کے لئے گئے۔ اس لئے کہ شاعر اور خطیب خود جذبات مشتعل سے پُر ہوتے ہیں اور اپنے کلام و بیان کے زُور سے دوسروں کے احساسات کو اُبھارتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ لفظ اِنشا جذبات انگیز نثر نگاری کے لئے بولا جانے لگا کیونکہ اس قسم کی تحریریں مناسب اتار چڑھاؤ پایا جاتا ہے۔

ابھی واضح کیا گیا ہے کہ "انشا" خطابت اور شاعری کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور پھر رفتہ رفتہ متوازن تحریر کے لئے بھی، اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم ان تینوں کا فرق مختصر طور پر بیان کردیں تاکہ لفظِ انشا پردازی کے معنی زیادہ واضح طور پر ہمارے ذہن نشین ہوجائیں۔

خطابت میں فوری جوش و اثر کا پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن اس جوش و اثر کا جیسا ہنگامی

چڑھاؤ ہوتا ہے ویسا ہی فوری اس کا اُتار بھی۔ خطیب کو ایک شاطر کی طرح بالکل نت نئی سوچنی پڑتی ہے وہ ایسے مقام پر ہے کہ ذرا چال چوکا اور معاملہ الٹا ہو گیا۔ اس کے لئے فضول تشبیہیں اور استعارے بیکار ہیں۔ زیادہ تر وہ سامنے کے مناظر اور معمولی چیزوں کی مثالوں سے بہت فائدہ اُٹھاتا ہے جو عام انسانوں کے دماغ بہت جلد سمجھ سکتے ہیں۔ اس کو مجمع کے احساسات کا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے اور سامعین کا لحاظ کرتے ہوئے تقریر کرنی ہوتی ہے۔ کامیاب مقرر ان تمام چیزوں کا خیال رکھتا ہے اور اپنی تقریر سے جو اثر پیدا کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

شاعری کا مفہوم کلام موزوں ہے۔ اس میں وزن کا ہونا لازمی ہے۔ قوافی و ردیف کی شرط بھی آجاتی ہے۔ شاعر کو اپنے مخاطب یا سامع سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ خود جن جذبات و احساسات سے متاثر ہے انھیں کو شعر میں ظاہر کر دینا اس کی غرض اصلی ہے۔ قیود شعری کو بہت کم لوگ گوارا کرتے ہیں شاعری میں صحت واقعات اور اظہار حقیقت کی شرط لازمی نہیں۔ شعر اپنی بے انتہا اثر انگیزی کی وجہ سے خطابت اور انشا پردازی پر فوقیت رکھتا ہے۔

انشا پردازی خطابت اور شاعری سے بالکل جدا ایک مستقل بالذات شئے ہے۔ اس کا مقصد نہ خطابت کی طرح جوش و خروش کا اُبھارنا اور موقتی اثر پیدا کرنا ہوتا ہے اور نہ شاعری کی طرح اظہار جذبات اور خیال آرائی ہوتا ہے۔ اس کا مخاطب نہ کوئی انسانی مجمع ہے اور نہ وہ تمام تر متکلم ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ اس کی مناسب اثر انگیزی میں ایک ثبات پایا جاتا ہے۔ انشا پردازی اس اثر انگیزی کی حامل ہے جو نہ بالکل وقتی ہوتی ہے اور نہ ضرورت سے زاید۔ اس میں اثر انگیزی پیدا کرنے کے لئے کسی عجلت کی ضرورت نہیں جس بنا پر انشا پرداز اپنے گرد و پیش ہی کی چیزوں پر اکتفا کر سکے۔ اس میں اوزان و قوافی کی قید بھی نہیں جس سے غیر ضروری اور نا مناسب الفاظ کی بھرتی کرنی پڑتی ہے۔ غرض انشا پردازی سے مراد ایسی تحریر ہے جو الفاظ کی بے جا نمائش اور معانی کے مبالغہ و غلو سے پاک ہے۔ ایک انشا پرداز کے لئے جتنی آسانیاں ہیں خطیب اور شاعر کو نصیب نہیں۔ انشا پرداز اگر کچھ لکھنا چاہتا ہے تو اس کو کامل غور و فکر کا موقع ملتا ہے اور جب وہ لکھ پاتا ہے تو اس کو اپنی تحریر پر نظر ثانی اور رد و بدل کی گنجایش رہتی ہے۔ یہ آسانی مقرر کو نہیں ملتی۔ ایک انشا پرداز زبان کے عام طرز میں اپنے خیالات ادا کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ شاعر سے زیادہ آزاد ہے۔ غرض شاعر و خطیب پر انشا پرداز سے زیادہ پابندیاں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شعر گوئی اور خطابت انشا پردازی سے زیادہ مشکل چیزیں ہیں۔ انشا پردازی ایک ایسا طریقۂ تحریر ہے جو ہر معمولی شخص کے لئے ممکن الحصول اور قابل عمل ہے۔

انشا پردازی سے مطلب جیسے پہلے بیان کیا گیا ہے ایسی تحریر ہے جس میں جذبات کا مناسب توازن ہو۔ ہر تحریر میں دو امور قابلِ غور ہوتے ہیں۔ پہلی چیز اس تحریر کے الفاظ ہیں جن کا انتخاب اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ بنانے میں مدد دیتا ہے۔ دوسری چیز اس تحریر کے معانی ہیں جو ان منتخب الفاظ سے واضح ہوتے ہیں۔ چنانچہ فنِ انشا پردازی ان دونوں چیزوں سے متعلق ہے۔ اس ضمن میں یہ بتا دینا بیجا نہ ہوگا کہ اس مسئلہ پر دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ انشا پردازی نام ہے بہترین الفاظ کے بہترین طریقۂ استعمال کا کہ نئے معانی اور جدید خیالات روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ایک ہی خیال ہوتا ہے جو مختلف انشا پرداز مختلف طریقوں سے ادا کرتے ہیں یعنی ان تحریروں میں جو فرق ہوتا ہے وہ انتخاب الفاظ اور طرز ادا کا ہی ہوتا ہے۔ کوئی اسی خیال کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے پر کچھ اثر نہیں پڑتا، کسی کا طرزِ بیان اور انتخابِ الفاظ ایسا دلکش ہوتا ہے کہ پڑھنے والے پر ایک مخصوص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ غرض یہ گروہ محض تحریر کے ظاہری رُخ کو انشا پردازی قرار دیتا ہے اٹھارہویں صدی عیسوی کے انگریزی ادبا نے صرف اسی خیال کے تحت یونانیوں اور رومیوں کے بیان کئے ہوئے نظریوں پر ہی خامہ فرسائی کی اور کہا کہ ان کا کام صرف اِن نظریوں کو بہتر سے بہتر زبان میں پیش کرنا ہے۔

برخلاف اس کے دوسرا گروہ محض تحریر کے معنوی جز کو انشا پردازی قرار دیتا ہے اس گروہ کا خیال ہے کہ انشا پردازی موقوف ہے اعلیٰ معانی اور حسنِ خیالات پر۔ جب تک معانی میں ندرت اور خیالات میں جاذبیت نہ ہوگی نرے الفاظ کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ تحریر کو پر اثر بنانے کے لئے خیالات کا پُر اثر ہونا ضروری ہے۔

اگر غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں اور ہر ایک جز کو کل قرار دے رہا ہے۔ انشا پردازی محض تحریر کے ظاہری حسن کا ہی نام نہیں نہ وہ محض اعلیٰ خیالات کو پیش کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ الفاظ و معانی کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان کا تعلق جسم و روح کا تعلق ہے۔ جس طرح تنہا روح یا خالی جسم پر زندگی کا اطلاق نہیں ہو سکتا اسی طرح لفظ کو معنی سے اور معنی کو لفظ سے جدا کر کے انشا پردازی کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ انشا پردازی ان دونوں کی باہمی اور مشترک خوبی اور موزونیت کا نام ہے۔

چونکہ الفاظ و معانی کا تعلق لاینفک ہے اسی بنا پر علمائے ادب نے انشا پردازی کی دو بڑی جامع خصوصیات بیان کی ہیں۔ (۱) فصاحت (۲) بلاغت جن میں سے فصاحت کا تعلق

الفاظ کی ظاہری شان و شوکت، تلفظ کی خوبی و سہولت اور عبارت کی سلاست سے ہے اور بلاغت کا رشتہ معنی آفرینی اور بلند خیالی اور کثیر مطلب کو قلیل الفاظ میں عطا کرنے سے ہے چونکہ یہی وہ دو چیزیں ہیں جن پر انشا پردازی کا انحصار ہے اس لئے ان پر کسی قدر صراحت سے غور کرنا چاہیئے۔

فصاحت میں تحریر کی لفظی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے۔ یعنی الفاظ کی ظاہری حیثیت کیا ہے۔ بولنے یا سننے میں ان کا کیا مقام ہے، صرفی قاعدے سے وہ کس درجہ پر پہنچتے ہیں اور بحیثیت مجموعی تحریر کیسی ہے۔ فصاحت کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تحریر کے الفاظ نہایت صاف اور شستہ ہوں اور ان کے بولنے میں آسانی اور سننے سے بھلا معلوم ہو۔ اس کے برعکس کریہہ اور ثقیل الفاظ وہ ہوتے ہیں جن کے بولنے اور سننے میں گرانی اور ناگواری ہو۔ گو الفاظ کی صفائی شستگی، کراہت اور ثقل کی تمیز تو بہتر طور پر انسان کا لطیف سامعہ ہی کر سکتا ہے لیکن اس کے کچھ اصول بھی مقرر ہیں۔ بعض حروف کے کہنے اور سننے میں بار محسوس ہوتا ہے جیسے ٹ ڈ ڑ۔ چنانچہ یہ حروف ثقیل سمجھے جاتے ہیں۔ برخلاف ان حروف کے ب ت س ن کے تلفظ میں آسانی محسوس ہوتی ہے اس لئے یہ شستہ حروف سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی لفظ کا بار بار دہرانا عبارت کو کریہہ اور ثقیل بنا دیتا ہے۔

فصاحت کی بڑی خوبی روزمرہ بول چال کا استعمال ہے۔ روزمرہ اور عام بازاری زبان میں فرق ہے۔ روزمرہ سے مراد وہ زبان ہے جو نہایت سادہ اور عام فہم ہو اور جسے خواندہ اور اہل زبان استعمال کرتے ہوں۔ سادگیٔ بیان اور سہل زبان سے مراد سوقیت اور ابتذال نہیں ہے۔ فصاحت اسی روزمرہ میں ہے جسے اہل زبان استعمال کریں۔

مجموعی حیثیت سے عبارت کی فصاحت کے دو اصول بتائے جاتے ہیں:-

(ا) مضامین اور تمثیلیں دل پسند اور خوش کن ہوں (ب) تحریر مضمون کا اعتبار کرتے نہ اتنی طویل ہو کہ پڑھتے پڑھتے جی گھبرا جائے اور نہ اتنی کوتاہ کہ مطلب خبط ہو جائے۔ ان دو خصوصیات کا صحیح اندازہ انسان کے مذاقِ سلیم پر ہی منحصر ہے۔

بلاغت تحریر کی معنوی خوبی سے بحث کرتی ہے۔ اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ تحریر میں فصاحت کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ چونکہ معانی کا تمام تر انحصار الفاظ پر ہی ہے اس لئے جس قسم کا مضمون بیان کرنا ہو اسی قسم کے الفاظ بھی استعمال کئے جائیں نازک اور لطیف مضامین کے لئے ایسے ہی الفاظ کے سانچے کی ضرورت ہے۔ شاندار واقعات کو ظاہر کرتے پُرشکوہ الفاظ کا استعمال چاہیئے

اظہار رنج کے لئے غمناک اور مسرت و خوشی کے لئے سرور بخش و فرحت زا الفاظ کا استعمال بہتر ہوگا۔ غرض مضمون نگار جس مضمون کو پیش کر رہا ہو اس کا پورا نقشہ ناظر کے سامنے کھینچ جائے۔ واقعات کو پیش کرنا ہو تو اس طرح پیش کیا جائے کہ ناظر یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ مضمون نگار اس خاص موقع پر خود موجود تھا جس کا ذکر وہ کر رہا ہے۔ چونکہ ایک ہی معنی کے مختلف لفظ پائے جاتے ہیں۔ بلاغت کی خوبی یہ ہوگی کہ تحریر کے لحاظ سے سب سے زیادہ موزوں لفظ منتخب کیا جائے۔ چنانچہ بہترین انشاپرداز اپنی تحریروں میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کی وضاحت کے لئے سطور کافی نہیں ہوتیں۔

المختصر انشاپردازی نام ہے بہترین تحریر کا جس کے دو وصف ہیں فصاحت بلاغت۔ جو شخص بھی ان دونوں جزئیات کا خیال رکھ کر مضامین لکھے اس کے انشاپرداز بن جانے میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ انشاپردازی اس قدر آسان اور قابل عمل شئے ہے کہ ہر تعلیمیافتہ کو انشاپرداز بننے کی فکر کرنی چاہیئے۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات ۔ خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے
(اقبال)

تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو ۔ کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
(اقبال)

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے ۔ مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس
(اقبال)

قوموں کے لئے موت ہے مرکز سے جدائی!! ۔ ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے خدائی!
(اقبال)

گذر اوقات یہ کر لیتا ہے کوہ و بیاباں میں ۔ کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی!
(اقبال)

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جبتک ۔ نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری
(اقبال)

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں ہیں ۔ غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن ۔ کسی جمشید کا ساغر نہیں میں
(اقبال)

سلیمان احمد مینائی

سال دوم

حضرت ثاقب لکھنوی

مرزا ذاکر حسین قزلباش ثاقب لکھنوی کا شمار اُن اساتذۂ کرام میں ہے جن کا کلام آج بھی دورِ گذشتہ کے مشاہیر شعرا کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ مرزا کا مولد بھی وہی خطۂ زرخیز ہے جس کی خاک سے غالب و میر اٹھے اور چار دانگ عالم میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔ لیکن جس طرح غالب کو آج ہر شخص غالب دہلوی کے نام سے جانتا ہے اسی طرح ثاقب بھی ثاقب لکھنوی کے نام سے معروف ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جنم تو اس شاعر معجز بیان نے اکبرآباد میں لیا مگر نشو و نما، تعلیم و تربیت اور شعر و شاعری تمام تر سرزمین اختر نگر کی رہینِ منت رہی۔

ثاقب کے بیشتر افراد خاندان جلیل القدر عہدوں پر فائز رہے اور ان کے والد ماجد نے ایک زمانہ تک دولت برطانیہ کی خدمات باحسن الوجوہ انجام دیں۔ مستقبل کا یہ عظیم المرتبت شاعر ہنوز ایک طفل شیرخوار تھا کہ گردش زمانہ نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا اور میرزا کے والد نے معہ اہل و عیال لکھنؤ کا رخ کیا۔ اس شعر نواز زمین نے ایسا دامن پکڑا کہ وہیں مستقل سکونت ہو گئی۔ اس دوران میں فکر معاش کے ہاتھوں ان کے والد نے مختلف مقامات کی خاک چھانی لیکن آل کار لکھنؤ آکر اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اور یہیں مدفون ہوئے۔

مرزا صاحب کی تعلیم قدیم اسلوب پر ہوئی۔ فارسی عربی و اُردو میں دستگاہ حاصل کی اور اس طرح لوازمات شاعری سے آراستہ ہو کر اپنے اشہب فکر کی جولانی کے لئے میدان سخن کو منتخب کیا۔ طبیعت فطرتاً شاعرانہ پائی تھی اُس پر لکھنؤ کے قیام نے اور بھی جلا کر دی۔ ۱۸۹۱ء میں میر مومن حسین صاحب صفی مرحوم سے شرف تقرب حاصل ہوا۔ مرحوم فارسی کے ایک عالم متبحر، عربی کے فاضل اجل اور اُردو کے ماہر جید تھے اور تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر اچھی قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی صحبت نے مرزا کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیا اور یہ ہر طرح مکمل شاعر کہلانے کے مستحق ہو گئے۔ اُس زمانہ میں شاعری کی راہ بڑی کٹھن تھی اور بڑی عرق ریزی و جانفشانی کے بعد منزل کا نشان ملتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جادۂ منزل ایسا از بر ہو جاتا تھا کہ بھٹکنے کا امکان نہیں رہتا تھا۔ اب تو شاعری ہنسی ٹھٹھا ہو گئی ہے۔ ہر وہ شخص جو چار حرف اُردو کے صحیح بول لیتا ہے وہ تک بندی کر کے اپنی دانست میں شاعر بے بدل بن بیٹھتا ہے اور ہماری نام نہاد ترقی پسند شاعری نے تو اس چار حرف کی قید اور قافیہ ردیف کی پابندی سے بھی آزاد کر دیا ہے۔ نہ الفاظ

کا کوئی متعین مفہوم باقی رہ گیا ہے نہ لوازمات شعر کی خاص ضرورت۔ خیر یہ تو ایک مستقل موضوع ہے جس پر بشرط فرصت انشاء اللہ روشنی ڈالی جائے گی۔

۱۸۹۱ء میں مرزا تاہل کی زندگی میں داخل ہوئے لیکن والد کی حیات تک اس زندگی کی ذمہ داری اور دردسری سے گویا کہ بری الذمہ رہے مگر تا بہ کے ؟ آخر کار معاش کی فکر میں برسوں سرگرداں پھرنا پڑا۔ اسی سلسلے میں بڑے پیمانے پر لکھنؤ میں ایک تجارت کا آغاز کیا۔ مگر ناکامی سے دوچار ہونا پڑا اور بہت خسارہ ہوا۔ ناکامیاں اور کامیابیاں یہی نشیب و فراز انسان کی زندگی پر غیر شعوری طور سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر شاعر کی حساس طبیعت، اثر پذیر فطرت اور دوررس نگاہ تو معمولی معمولی واقعات میں ایک جہان معنی پنہاں دیکھ لیتی ہے۔ دوران تجارت میں حسن اتفاق سے ثاقب کو سابق مہاراجہ محمود آباد سے تعارف حاصل ہوگیا۔ مہاراجہ کی مردم شناس طبیعت نے اس جوہر قابل کو پہچان لیا۔ ثاقب وہاں کے ملک الشعرا اور مستقل وثیقہ دار ہوگئے۔ کچھ عرصہ کے لئے بسلسلہ ملازمت کلکتہ میں بھی رہنا پڑا مگر وہ جو شاعر نے کہا ہے ع

رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

بالآخر یہاں کی کشش پھر کھینچ لائی۔ مہاراجہ محمود آباد نے میر منشی کے عہدہ پر فائز کیا مگر یہاں کام برائے نام تھا اور سچ پوچھئے تو یہ علم نوازی کا ایک بہانہ تھا۔ اس کے بعد ثاقب کی احسان شناس، خود دار، وطن دوست طبیعت نے لکھنؤ سے قدم نکالنا گوارا نہ کیا۔

شاعر کا کلام ایک حد تک اُس کے عادات و اخلاق، معائب و محاسن کا آئینہ ہوتا ہے جس میں اُس کے خد و خال پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ کسی شاعر کے تذکرے میں اس پہلو کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ ثاقب کے اخلاق ان کی فکر کی طرح بلند ہیں۔ شہرت کے باوجود ان کی سادگی و منکسر المزاجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اُن کی خود داری اور خلوص نے انہیں تصنع سے کوسوں دور اور تحسین و ستائش سے بالکل بے نیاز کر رکھا ہے۔ وضع کی پابندی، دوستی کی پاسداری ایثار و اخلاص ان کا شیوہ ہے۔ شاعر ہیں اس لئے ذکی الحس اور عالی ظرف بھی ہیں۔ تعصب اور ہٹ دھرمی سے ہمیشہ عار رہا ہے اور میانہ روی و روشن خیالی کو شعار بنایا ہے۔ پرانے لوگوں کی طرح متین و سنجیدہ واقع ہوئے ہیں۔ شعر کی دھن میں اکثر محو رہتے ہیں لیکن اس میں واقعہ کو دخل ہوتا ہے تصنع کو نہیں۔

ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی شاعری سے مختصر طور پر روشناس کرائیں کیونکہ اس ترقی پسندی کے دور میں بساط قدیم کے شاعروں کی حیثیت قصۂ پارینہ کی سی ہوگئی ہے۔

گاہے گاہے بازخوانی سے یاد تازہ ہوتی رہتی ہے۔ نوجوانوں کی بغاوت پسند طبائع کے لئے ہر انقلاب جاذب نظر ہوتا ہے اور کم سواد لوگ ہر انقلاب کو چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا ترقی کے نام سے موسوم کرتے ہیں
شعر میں جذبات و کیفیات کی کارفرمائی ہوتی ہے اور جذبات دل کی پیداوار، لہٰذا اس کی منطقی توضیح اور فلسفیانہ تشریح ناممکن ہے۔ ان من الشعر لحکمہ و ان من البیان لسحرا، میں اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر ہم اُن فرومایہ اصحاب کو بھی جواب دے سکتے ہیں جو شعر کو محض بیکار اور دماغی عیاشی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بقول صفی ؎

شاعری کیا ہے دلی جذبات کا اظہار ہے
دل اگر بیکار ہے تو شاعری بیکار ہے

شعر کی اس مختصر تعریف کے بعد ہم جناب ثاقب کی شاعری پر ایک اجمالی نظر ڈالیں گے اور تشریح و توضیح سے قطع نظر کرکے محض انتخاب اشعار پر اکتفا کریں گے کہ صاحبان ذوق پر شعر کا تجزیہ گراں ہوتا ہے اور بقول شخصے شعر کے تجزیہ سے اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو گلاب کے پھول کا اس کے تجزیہ سے ہوتا ہے پھر مضمون کا مقصد بھی یہی ہے کہ ثاقب صاحب کے ان اشعار کا ایک انتخاب دیا جائے جو لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں۔ بعض اشعار ممکن ہے اس میں ایسے ہوں جو آپ نے سُنے ہوں مگر شاعر کا نام پس پردہ ہی رہا ہو۔ اس طرح ممکن ہے یہ مضمون غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کردے۔

ایک بات اور بھی توجہ کے قابل ہے اور وہ یہ کہ ثاقب صاحب کے والد مشغلہ شعر و سخن کے سخت خلاف تھے اور شاعر کی طبیعت کا ولولہ اور زور روکنے سے اور زیادہ جوش و رنگ کے ساتھ نمایاں ہوتا تھا۔ ان کی ابتدا سے ان کی انتہا جھلکتی تھی اور منشی ذکاء اللہ مرحوم نے تو یہاں تک کہا تھا کہ "میاں صاحبزادے اگر زندہ رہے تو اپنے وقت کے میر ہو گے" اس قول میں مبالغہ سہی مگر اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ثاقب کا شمار اپنے وقت کے اکابر شعراء میں ہے اور وہ اسی صف میں نظر آتے ہیں جس میں صفیؔ اور عزیزؔ ہیں۔

موجودہ دور میں ایک وبا اور بھی فیشن میں داخل ہوگئی ہے کہ قدیم شاعری کو بطور خاص اور کل اُردو شاعری کو عام طور سے ہدف ملامت بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نقاد بزعم خود غریب اُردو شاعری کو اپنی مشق اولین کے لئے منتخب کرتا ہے اور بغیر مطالعہ و تحقیق اُس کو محض کنگھی چوٹی، گل و بلبل، قیس و لیلےٰ جیسی اصطلاحات میں محدود کردیتا ہے۔ اس کے سوا ان کے نزدیک مشاطۂ سخن کو اور کسی زیور سے آراستہ نہیں کیا گیا اور اگر کہیں حقیقت و گہرائی نظر بھی آتی ہے تو خال خال اس لئے بہتر ہوگا اگر ہم ثاقب صاحب کے اس مشہور و معروف شعر سے ان کا انتخاب آغاز کریں جس میں حقیقت اور سوز و اثر کا ایک دریا بند ہے ؎ بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اسی طرح اُن کے اور دو شعر ہیں جو اثر اور درد کے لحاظ سے میرؔ اور دردؔ کے معلوم ہوتے ہیں۔

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقت دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

اِن دو شعروں میں بیکسی و حرماں نصیبی کی جو تصویر کھینچی ہے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔

ایک غم نصیب پیکر یاس کا دل ہر لمحہ روتا رہتا ہے اور مسرت و رنج، خواب و بیداری کسی حالت میں بھی گریہ زاری سے باز نہیں آتا۔ اسی بدیہی اور ناقابل انکار حقیقت کی طرف مندرجۂ ذیل شعر میں اشارہ کیا ہے:

بند تھیں آنکھیں مگر دل گریۂ وزاری میں تھا
خواب میں بھی تھا وہی عالم جو بیداری میں تھا

اثر ہر شعر میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے معلوم ہوتا ہے دل کے ٹکڑے سامنے رکھدئے ہیں۔ کتنی سادہ زبان اور کتنے سادہ اسلوب کیا سوز ہے ؎ پرسش حال اس نے کی تو مجھے یہی کہتے بنا کہ اچھا ہوں یا

یہ دو شعر:- دل تھا غم کا فسانہ خواں نہ رہا
اب کوئی لطف داستاں نہ رہا

ہم کہیں کس سے اور سمجھے کون
جب کوئی اپنا ہم زباں نہ رہا

کیوں نہ ہو میر صاحب بھی تو آخر اکبرآبادی تھے۔ دنیا دیکھیں، اچھا دیکھیں کی زمین میں غزل کہی ہے دو شعر خاص طور سے قابل غور ہیں

دل غم عشق میں اڈا ہے تماشا دیکھیں
آؤ آنکھوں سے یہ بہتا ہوا دریا دیکھیں

چشم عبرت نہیں کھلتی ہے کہ غفلت والے
موت آتی ہوئی جاتی ہوئی دنیا دیکھیں

شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے جملے میں یا ایک لفظ میں وسیع مفہوم و معانی ظاہر کرے۔ ان کا حسب ذیل شعر اسی قدرت و عبور کا مظہر ہے ؎

وہ نزع کی خموشی جام جہاں نما تھی
اک عمر کی کہانی دم بھر میں کہہ گیا میں

جہاں نما کے لفظ نے شعر میں جان ڈال دی اور اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اسی طرح ذیل کے شعر میں چراغ بزم کہکر معنویت میں کیسا اضافہ کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جو آنکھ ہو تو دیکھئے نہ پوچھئے کہ کیا کیا
چراغ بزم ہو گیا جلا کیا، ہنسا کیا

ایک حسرت زدہ دل کی بیچارگی کو کتنے عمدہ پیرایہ میں پیش کیا ہے، ملاحظہ فرمائے ؎

قید غم بھی دلگی ہے ہنسنے والوں کے لئے
عندلیب آکر قفس میں اک تماشا ہو گئی ع

حسن تعلیل کا لطف اس شعر میں دیکھئے:- ملا کے دست دُعا ظرف اک بنایا ہے ٭ لئے ہوں ہاتھ میں کاسہ خدا کرے بھر جائے

دردؔ کا ایک فارسی شعر ہے ؎ نالہ ام تا بہ فلک رفت و لے تا بگوشش تو رسیدن باقی ست

ثاقبؔ نے اسی کو اُردو میں کیسے دلپذیر انداز میں کہا ہے ؎

ناداں بھی ہو گئے مرے نالوں سے ہوشیار
اب آپ کے سوا کوئی غافل نہیں رہا

اس شعر میں ایک مسئلہ بیان کر گئے ہیں ؎

اس کے نیرنگ کا تماشا ہوں　　جز فریب نگاہ میں کیا ہوں

حمد میں ایک شعر کہا ہے ؎

اک لب خاموش بنکر شوقِ گویائی رہا　　حمد کرتا کون عالم محوِ یکتائی رہا

دور تھا، حضور تھا، اس زمین میں متقدمین نے بڑی عمدہ غزلیں کہیں ہیں اور یہ تقریباً پامال ہو چکی ہے مگر مبدا رفیاض سے ہر شخص اپنا حصہ لے کر آتا ہے ؎

پیدا کیا ہے جو مری ہستی نے انقلاب　　دل کا کیا دھرا تھا مجھے کیا شعور تھا

میں تھا اسیرِ دام بلا ہنس رہے تھے پھول　　سمجھا میں اب یہ عشق نہیں تھا قصور تھا

شرک سے انحراف کا سبب ملاحظہ ہو ؎

کیا ربط شرک سے مجھے ہوتا کہ دہر میں　　خوش قسمتی سے دل وہ ملا جو غیور تھا

کتنا لطیف طنز اس شعر میں پایا جاتا ہے ؎

صیاد چھیڑ چھیڑ کے سُن مجھ سے ذکرِ گل　　جو دل کا مدعا تھا وہ افسانہ ہو گیا

ایجاز اور کنایہ کا لطف ملاحظہ ہو ؎

اے کردگارِ عشق کدھر جا رہا ہوں میں　　ہر سمت یہ صدا ہے کہ دیوانہ ہو گیا

گناہ اور رحمت کے مضامین بیشمار باندھے گئے ہیں مگر ثاقبؔ نے نرالے انداز سے کہا ہے ؎

پسینہ آگیا مجھ کو گناہوں کی ندامت سے　　ذرا اے ابرِ رحمت اپنے دامن کی ہوا دینا ع

بندش غور طلب ہے ؎

چل اے ہمدم ذرا سازِ طرب کی چھیڑ بھی سن لیں　　اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ آئیں گے محفل سے ع

یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ صرف وہی اشعار انتخاب کئے گئے جو بیک نظر سامنے آگئے ورنہ اُن پر تو ایک مستقل تصنیف ہو سکتی ہے۔

ہاں! لکھتے لکھتے اُن کا ایک معرکتہ الآرا قطعہ یاد آیا۔ وہ بھی دیکھئے ــــ دنیا کی بیگانگی اور انسان کی کس مپرسی کی جیتی جاگتی تصویر شاعر کے زورِ بیان کا نادر نمونہ

دنیا میں کہیں لُجیئے دمساز نہیں آتی　　اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

بیگانہ ہوا عالم رسم و رہ الفت سے　　اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

محمد جلال الدین صدیقی
سال سوم

ترقی پسند افسانہ نگار

ترقی پسند افسانہ نگاروں کی نمایاں خصوصیت ان کا علمی شعور ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو، حیات کے ہر شعبہ کا جائزہ علم کی روشنی میں لیتے ہیں۔ وہ دنیا اور خصوصاً ہندوستان کی بدحالی کو بدنصیبی نئی تہذیب، قہرِ یا قیامت کے آثار نہیں سمجھتے بلکہ انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ موجودہ بدعنوانیوں کے اسباب سامراجیت، سرمایہ داری اور رجعت پسندی ہیں۔ لیکن یہ دنیا کے مستقبل سے ناامید نہیں ہیں۔ انہیں ارتقار پر اعتقاد ہے انسانی سماج جاگیرداری اور سرمایہ داری کے منازل طے کرتے ہوئے ایک ایسی منزل کی طرف گامزن ہے جہاں سے ایک نئے آدم، ایک نئے نظام اور ایک نئی دنیا کے راستے ملتے ہیں —— ترقی پسند ادیب اپنی حقائق کو اپنی تحریروں میں سموتا ہے —— زندگی کیا تھی اور کیا ہے۔ اس پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ لیکن ترقی پسند ادیب یہ بتاتا ہے کہ زندگی کو کیا ہونا چاہیئے۔ اس وقت تک ادب کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے —— ترقی پسند ادیب زندگی کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔

جہاں تک افادیت کا تعلق ہے ہمارے افسانوں کا معیار دنیا کے زبردست ترین افسانوں کے برابر ہو سکتا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ہمارے افسانے ایک ایسی زندگی کے آئینہ دار ہیں جو پست ہے نڈھال ہے، زخمی ہے مگر پھر بھی آگے بڑھنے کے لئے بے تاب ہے، منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے بے چین ہے۔

یوں تو اردو افسانے کے کئی مکاتب ہیں مگر سہولت کی خاطر تین مکاتب قرار دینے کی جرأت ہو سکتی ہے کچھ کمی و بیشی سے ہر ترقی پسند افسانہ نگار ان میں سے کسی ایک مکتب کا رکن تصور کیا جا سکتا ہے:- (۱) کرشن چندر مدرسۂ فکر (۲) احمد ندیم قاسمی مدرسۂ فکر (۳) سعادت حسن منٹو مدرسۂ فکر۔

کرشن چندر کرشن چندر اس مکتب کی نمایندگی کرتا ہے جس میں خواجہ احمد عباس، ابراہیم جلیس، راجندر سنگھ بیدی اور حیات اللہ انصاری شامل کئے جا سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے تاریخی، سیاسی اور ثقافتی حالات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ یہ لوگ ہر چیز کو علم و عمل کی روشنی

میں دیکھتے ہیں۔ ان کا طنز کبھی کبھی جذباتی ہو جاتا ہے مگر یہ "شعور" کی حد سے نہیں بڑھتے۔ یہ
بھوک، پستی اور غلامی کے بنیادی مسائل" کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ انہیں اس حقیقت کا شدید احساس ہے
کہ سامراجیوں کے حریصانہ منصوبے، سرمایہ داری اور رجعت پرستی نے دنیا کو بری طرح زخمی کر دیا ہے۔ چنانچہ
ان برائیوں کی ذمہ دار جو تحریکیں ہیں اُن کی مخالفت کرتے ہیں ان کے افسانوں میں ایک ایسے نئے
نظام کی طرف اشارات ہوتے ہیں جو محنت کش طبقہ کو زندگی میں اُن کا صحیح مقام دینگے۔ جو ظلم، جبر اور
ناانصافی رَوا نہیں رکھیں گے۔ جو انسانوں کو ایک "انسانی" زندگی بخشیں گے۔ ان تمام چیزوں
کے باوجود ان کے افسانے خشک نہیں ہوتے۔ ان کے افسانوں میں افادیت اور دلچسپی کا ایک
خاص امتزاج ہوتا ہے۔ کرشن چندر کا افسانہ "ان داتا" احمد عباس کا "چڑھاؤ اُتار" ابراہیم جلیس
کا "زرد چہرے"، بیدی کا گرم کوٹ اور حیات اللہ انصاری کا "آخری کوشش" اس کی بہترین مثالیں
ہیں۔ اس اسکول کے بعض لکھنے والوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اشتراکیت کا پروپگنڈا کرتے ہیں
یہ اس انداز میں کہا جاتا ہے جیسے دنیا بھر کی بدمعاشیاں اور بدکاریاں اشتراکیت میں بھری ہوئی ہیں
پہلے تو ان میں سے کوئی ادیب کھلم کھلا سوائے انسانیت کے کسی "ملت" کا پرچار نہیں کرتا۔ البتہ
یہ چیز اُن کی سمجھ میں آگئی ہے کہ "بسم اللہ کی شیروانی شادی میں نہیں پہنائی جا سکتی" چنانچہ آج سے
سینکڑوں برس پہلے کے طریقے اُس دنیا کے لئے موزوں نہیں جہاں سائنس نے قدامت کی سینکڑوں
برس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ وہ اشتراکیت سے زیادہ اُس دوزخی نظام کی مخالفت کرتے
ہیں جس کے تحت ذرائع پیداوار پر مٹھی بھر سرمایہ داروں کے قبضے نے سائنس اور صنعت پر گھناونا
اثر ڈال کر ان کی اصل افادیت کو معدوم کر دیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ چند آدمیوں کے لئے عیش، آرام
دولت اور حکمرانی اور کروڑوں کے لئے تنگ دستی، آفت، افلاس اور غلامی ہے ——

کرشن چندر زندگی کے بنیادی مسائل سے بحث کرتا ہے، احمد عباس آزادی و حریت کا علم بردار ہے
جلیس ہندوستانی نوجوان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔ بیدی محنت کشوں کے دُکھ
سکھ کا ترجمان ہے اور حیات اللہ انصاری بے کسوں اور بے بسوں کا حقیقت نگار ——

اس اسکول کے بعض لکھنے والوں نے فسطائیت کی بھی سخت مخالفت کی ہے۔ یہ چیز اُن
کے علمی شعور کی زبردست مثال ہے۔ ہندوستان کی سیاسی افراتفری کا ردِ عمل تو یہ ہونا چاہئے
تھا کہ وہ فاشسٹ دوست ہوتے۔ لیکن انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ فاشسٹیت کی کامیابی
سے اقبال، اور ٹیگور کے حیات بخش نغمے جمہور دشمن اصولوں کی گڑبڑ میں ڈوب جائیں گے

بہرحال زندگی کی کسی بنج اور دنیا کے کسی حصے میں بھی ظلم و جبر کے آثار دکھائی دیں تو یہ اُن کی مخالفت کرتے ہیں۔ بھوکے بنگال کو دیکھ کر یہ لوگ تڑپ اُٹھے ـــــ یہ کال قدرت کا نہیں بلکہ انسان کا لایا ہوا تھا۔ کھیت لہرا رہے ہیں۔ مگر بنگال کے پچاس لاکھ مرد، عورتیں اور بچے روٹی نہ ملنے کی بدولت موت سے ہم آغوش ہو رہے ہیں۔ اس جیتی حالت کے کون ذمہ دار ہیں؟ ذخیرہ اندوز، نوکر شاہی اور سامراجی۔ یہی تلخ حقائق کرشن چندر کے افسانے "ان داتا" اور جلیس کے "مچھو" میں نظر آئے ہیں۔ بہرحال اِن ادیبوں نے صحیح معنوں میں ایک تخلیقی ادب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ادبی کارنامے اُردو ادب میں اپنا موزوں مقام پائیں گے۔

احمد ندیم قاسمی | اس مدرسہ میں جس کی نمایندگی احمد ندیم قاسمی کرتا ہے وہ افسانہ نگار شامل کئے جاسکتے ہیں جو ہندوستان کی دیہاتی زندگی کے متعلق کہانیاں لکھتے ہیں یہ افسانہ نگار دیوبندر ستیارتھی، سہیل عظیم آبادی اور اوپندر ناتھ اشک ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار کسی ندی کے کنارے، کسی پہاڑ کے دامن میں پنگھٹ کے پاس، کھیتوں میں مینڈوں پر، بنسری بجاتے ہوئے ڈھولک کے گیت گاتے ہوئے معصوم زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ پریم چند کے بعد اُردو افسانے میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کی ترجمانی کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ پریم چند نے کردار کو بہت اہمیت دی۔ انہوں نے کردار کا عمیق مطالعہ کرکے کہانی کا سانچہ بنایا۔ کبھی کبھی ان لاچار دیہاتیوں کی تکالیف کے بھی نقشے کھینچے۔ مگر آج کل کا لکھنے والا کردار سے زیادہ اُس کے خارجی حالات کو اہمیت دیتا ہے۔ پریم چند صرف اصلاح کو دیہات کے تلخ مسائل کا حل سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اگر دیہاتی ایمان دار، محنتی اور نمک خوار ہو اور زمیندار رحم دل و نیک اور خدا ترس ہو تو زندگی سنور سکتی ہے۔ لیکن ترقی پسند افسانہ نگار کھیتوں، چوپال الاؤ اور پنگھٹ کے اطراف جاگیردارانہ نظام کی پیدا کردہ لعنتیں دیکھتا ہے ـــــ بہرحال پریم چند کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر یہ لوگ ہندوستان کی ستیاسی (۸۷) فیصد آبادی کی زندگی کے مسائل اور اُن کا حل معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس مکتب کے افسانوں میں اکثر شخصی رنگ بھی جھلکتا ہے۔ قاسمی کے افسانوں میں شہری اکثر گاؤں کی پُرکیف زندگی کو بگاڑنے والا ہوتا ہے۔ سہیل کی علمیت دیہات میں ظلم و جبر کو کبھی برداشت نہیں کرتی۔ ستیارتھی دیہاتیوں کے لطیف احساسات کو چمکاتا ہے۔ اشک اِن لوگوں کے ارمانوں اور آرزوؤں کا خون ہوتے دیکھ کر مغموم ہو جاتا ہے۔ قاسمی کا افسانہ

"طلوع و غروب"، سہیل کا "آلاؤ"، "ستیارتھی کا "دھان اُگنے سے پہلے" اور اشک کا "ڈاچی" اپنے اپنے انفرادی اسٹائیل کے بہترین نمونے ہیں۔ لیکن ان سب میں ایک چیز مشترکہ ہے وہ یہ کہ یہ ادیب ہندوستان کی دیہاتی زندگی سے خوش نہیں ہیں اُن کے افسانوں میں ایسے اشارے، کنائے اور ابہام ہوتے ہیں جو ہندوستانی دیہاتوں کے نظامِ حیات کو بدلنا چاہتے ہیں۔

سعادت حسن منٹو | یہ مکتب جتنا مقبول ہے اتنا بدنام بھی ہے۔ مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ جتنے لوگوں نے منٹو کا افسانہ "ہتک" اور عصمت کا "لحاف" پڑھا ہے اتنوں نے کرشن چندر کا "موبی" اور جلیس کا "زرد چہرے" نہیں پڑھا۔ اور بدنامی کا یہ حال ہے کہ ترقی پسند ادب کے خلاف ہر قلم اُٹھانیوالے کے لئے اِن کی "بداخلاقی" زبردست مواد ہے۔ عصمت شاہد لطیف، ممتاز مفتی، ہاجرہ مسرور اور ھندرا ناتھ "منٹو مکتب" میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ اسی اسکول کی وجہ ترقی پسند ادب کو عریاں ادب کا خطاب ملا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ لوگ بعض مرتبہ بہت بے لگام ہو جاتے ہیں۔ اِن کے ہاں اپنی صفائی کے لئے یہ جواب ہے کہ تہذیب کے زخموں پر پردہ نہیں ڈالنا چاہیئے۔ اگر انہیں چھپایا گیا تو یہ ناسور بن جائیں گے۔ مگر غرض یہ ہے کہ یہ زخم رستے ہوئے ناسور بن چکے ہیں۔ فرائیڈ کے نظریے ان کی مرہم پٹی نہیں کرسکتے ہمیں اُن جراثیم کو ختم کرنا ہے جو ان ناسوروں کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ یہ جراثیم بھوک، جہالت اور غلامی ہیں —— یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "ہر انسانی فعل کی محرک جنس ہے"۔ چنانچہ جنسی تعلیم ضروری ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ترقی پسند افسانے نہیں ہوئے بلکہ تربیتِ جنسی پر مستند مضامین —— اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں اِن لوگوں کی فنی قابلیت کو بھول رہا ہوں۔ اِن کا طرزِ بیان بہت بلند ہے۔ اِن کی تحریریں پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہے ہیں۔ لیکن بعض مرتبہ اِس مکتب کے لکھنے والوں میں "اشاریت" اور "ابہام" تکلیف دہ ہوجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر منٹو کا "بو" عصمت کا "تل" اور مفتی کا "پل" بہت "دقیق" افسانے ہیں —— لیکن اِن کے ایک دو افسانوں کی وجہ ہم اِن کے اعلیٰ ادبی کارناموں کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ اِن کے بعض افسانوں نے اُردو ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ عصمت اور ہاجرہ ہندوستانی گھروں کی زبان، کلچر اور طور و طریق سے اچھی طرح واقف ہیں۔ منٹو اور ھندرا اپنے افسانوں میں نوجوانوں کے احساسات و نفسیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس مدرسۂ فکر کے لکھنے والوں کے پاس قدرتی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے اگر یہ لوگ

"جنسیات" کی بجائے زندگی کے دوسرے مسائل پر قلم اٹھائیں تو ان کی تحریروں سے اردو افسانے میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

اقبال

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور و سوز و ثبات

حریم تیرا خودی غیر کی! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات

اقبال

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گذر جا
ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے!

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے!

اقبال

اِک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری!
اِک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری!

اِک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری!
اِک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری!

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری!
میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری!

اقبال

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی

تو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

اقبال

کل اپنے مریدوں سے کہا پیرِ مغاں نے
قیمت میں یہ معنی ہے دُرِ ناب سے دہ چند

زہراب ہے اس قوم کے حق میں مئے افرنگ
جس قوم کے بچے نہیں خوددار و ہنرمند

اقبال

تلاطم بحر میں کھو کر سنبھل جا
تڑپ جا، پیچ کھا کھا کر بدل جا

نہیں ساحل تری قسمت اے موج!
اُبھر کر جس طرف چاہے نکل جا

اقبال

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

اقبال۔

خواجہ حامد علی
سال اول

آرزوئیں

ایک ڈراؤنا خواب... نہیں ... زندگی کے افسانے کا ایک حسین ورق، نہ جانے کب سے دیکھ رہا تھا کہ میری آنکھ اچانک کھل گئی.... کائنات اپنی جگہ موجود تھی... وہی رعنائی... اور وہی اضطراب...... لیکن میرا خواب...؟ وہ اب نہیں.. لیکن اس کے نہ مٹنے والے اثرات... اس کے پریشان مناظر، وہ سب اپنی جگہ ایک ناقابل فراموش یادگار چھوڑ گئے جو میرے دل میں ہمیشہ مرکوز، میرے دماغ میں ہمیشہ موجزن رہے گی.... وہ یہ کہ میں افلاس کی فضا میں پل کر اپنے تخیل کی پرواز کو کم نہ کروں... اپنی محنت اور عزم مصمم کو ہم رکاب سمجھوں۔ جذبات کو قابو میں رکھ کر دکھی دل کے صدمے برداشت کروں حوادث زندگی کو اتفاقات سے تعبیر کروں۔ زندگی کی آخری تمنا، اپنے ماں باپ کی خدمت اور ان کی دعائیں۔ ساری کامرانیوں اور ساری سربلندیوں کو ان کے قدموں پر بھینٹ چڑھاؤں.... پریشانیوں سے گھبرا کر تنہائی پسند نہ بنوں.... تمام دوستوں کو... اپنے تمام ملنے والوں کو ہمدرد... ہرگز، ہرگز... خیال نہ کروں... من کی بات من میں... ہونٹوں پر تبسم... چہرے سے متانت... جذبات سے اعلیٰ کرداری... دل میں بے پایاں ہمدردی... آنکھوں میں غیرت اور مستقبل کی چمک۔

مگر یہ سب اے خدا! میرے بس کی بات نہیں.. تو توفیق دے تاکہ میں یہ سب حاصل کرسکوں، اپنے ہی بازوؤں سے ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کروں... ورنہ... ؎

...... اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

... مجھے ابھی، اسی وقت اپنے پاس بلالے تاکہ میں اپنی آرزوؤں کا دردناک خون... ان کا حسرتناک انجام تجھ پر... صرف تجھ پر تنہائی میں، اپنے پرجوش جذبات کے ساتھ اظہار کرسکوں تاکہ تیری رحمت کو جوش آجائے اور میں ابدی دنیا میں سکھی رہوں... صرف تیرے ہی حضور میں۔

امجد علی سلیم
سال دوم

شکایات

پردہ رخِ حسین سے اٹھاتے نہیں ہو تم | رنگینیٔ حیات بڑھاتے نہیں ہو تم
اپنا جمال آہ دکھاتے نہیں ہو تم | بجلی جہانِ دل پہ گراتے نہیں ہو تم
ہے وقت آخری مگر آتے نہیں ہو تم | مجھکو یقین زیست دلاتے نہیں ہو تم
فرقت کی رات، بخت کی تاریکیوں کا خوف | کیوں نوربن کے دل میں سماتے نہیں ہو تم
غم میری زندگی کے لئے آسرا سہی | لیکن یقینِ غم بھی دلاتے نہیں ہو تم
گو مسکرا رہے ہیں شگوفے بصد سرور | خنداں مگر کہیں نظر آتے نہیں ہو تم

شاکی غمِ حیات سے کیا خاک ہو سلیم
دنیائے انبساط بساتے نہیں ہو تم